تالیف

أبو عبد الله محمد بن أحمد الأنصاري القرطبي

جلد اوّل

(تعارف، مقدمہ، سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ آیت ۱-۲۹)

ترجمہ و تحقیق

ڈاکٹر حافظ اکرام الحق یٰسین

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

الجامع لأحكام القرآن والمبيّن لما تضمّنه من السنّة وآي الفرقان

تفسیرِ قرطبی

تالیف

أبو عبدالله محمد بن أحمد الأنصاري القرطبي

المتوفی ۶۷۱ھ

جلد اوّل

(تعارف، مقدمہ، سورۂ فاتحہ، سورۂ بقرہ آیت ۱۔۲۹)

ترجمہ و تحقیق

ڈاکٹر حافظ اکرام الحق یٰسین

شریعہ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

نام کتاب	:	تفسیرِ قرطبی
مصنف		ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاري القرطبي
مترجم	:	ڈاکٹر حافظ اِکرام الحق یٰسین
رہنمائی	:	پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی
	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی
نظر ثانی	:	ڈاکٹر علی اصغر چشتی
پروف ریڈنگ وحتمی تصحیح	:	عرفان خالد ڈھلوں ، مفتی منظور احمد
نگرانِ منشورات	:	حافظ حبیب الرحمٰن
ناشر	:	شریعہ اکیڈمی ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی' اسلام آباد
مطبع	:	اظہار سنز پرنٹرز ریٹی گن روڈ لاہور
سرِ وَرق	:	سید مبین الرحمٰن
کمپوزنگ	:	عمران کمپوزرز اِسلام آباد
تعداد	:	۱۰۰۰
اشاعتِ اول	:	دسمبر ۲۰۰۴ء
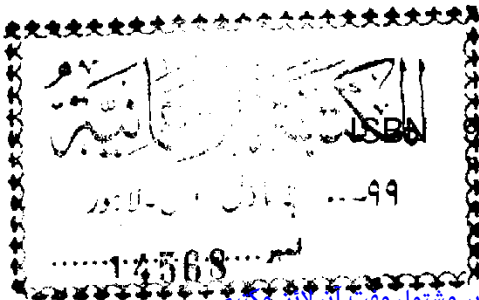
ISBN 969-8263-24-1

قرطبیؒ کی تفسیر اس قدر عظیم ہے کہ قافلے اپنے سفر میں اسے ساتھ لے کر چلتے تھے۔

حافظ ذہبیؒ

تفسیر "الجامع لأحکام القرآن" میں تمام علماء سلف کے نقطہ ہائے نظر پر گفتگو کی گئی ہے اور یہ بے شمار فوائد کی حامل ہے۔اس کے مصنفؒ ایک امام، بلند پایہ عالم، حدیث کے معانی میں غوطہ زن، اعلیٰ پائے کے مصنف اور روایت و اقتباس کے ماہر تھے۔

ابن العماد الحنبلی

فہرست مضامین

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

باب: ۱

مضمون	صفحہ

الله أكبر

الله

جل جلاله

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ والصلاۃ والسلام علی سید الأنبیاء وعلی آلہ وصحبہ أصحاب الفضل والتقیٰ ومن تبعھم باحسانٍ إلی یوم البقاء.

قرآنِ مجید علوم ومعارف کا وہ سمندر ہے جس کا کنارہ تلاش کرنا تو دور کی بات، اس میں غوطہ لگا کر اس کے دُررِ بے بہا تک رسائی حاصل کرنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ جب سے قرآنِ حکیم نازل ہوا بڑے بڑے فصحاء اور باریک بین علماء بھی اس کے علوم ومعارف کی تہہ تک پہنچنے کا دعویٰ نہیں کر سکے۔ البتہ یہ بات اس کے اعجاز میں شامل ہے کہ جو حاجت مند بھی اس سے رہنمائی لینے آیا خالی ہاتھ واپس نہیں گیا۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی بھی اس سے نصیحت حاصل کرتا ہے اور بڑے بڑے علماء، محدثین، فقہاء، صوفیہ، حکماء، فلاسفہ، سائنس دان اور نکتہ وَر بھی اسی کے بحرِ بے کراں میں غوطہ زن ہوکر اپنے اپنے ذوق کے مطابق گوہر ہائے بیش بہا چن لاتے ہیں۔ انہی ذوقہائے رنگارنگ کی بنیاد پر عمومی تفاسیر کے علاوہ انواع واقسام کی موضوعاتی تفاسیر کثیر تعداد میں کتب خانوں کی زینت بنی نظر آتی ہیں۔

ان موضوعات میں سے ایک نہایت اہم موضوع فقہی تفسیر بھی ہے۔ ایسی تفاسیر عام طور پر ''احکام القرآن'' (Legal study of Quran) یا ''تفسیر آیات الاحکام'' (Commentary of the Quranic verses of legal nature) کے عناوین سے پہچانی جاتی ہیں۔ احکام القرآن کا موضوع بہت قدیم ہے۔ دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح فقہی اور قانونی معاملات میں بھی ہمیشہ سے قرآن ہی بنیادی رہنما رہا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے لے کر آج تک تعلیماتِ قرآنِ حکیم کی روشنی میں دستوری و قانونی احکام کا مطالعہ ایک تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اس مطالعہ میں مسائلِ طہارت سے لے کر ملکی نظم ونسق اور قوانین بین الممالک تک ہر قسم اور ہر سطح کے انفرادی واجتماعی مسائل میں قانونی، اخلاقی اور انتظامی رہنمائی حاصل کرنا شامل ہے۔ امام شوکانیؒ (م ۱۲۵۵ھ) کے بقول قرآنِ مجید کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو احکامِ شرعیہ کے متعلق رہنمائی سے خالی ہو حتیٰ کہ قرآنی قصص اور امثال بھی دراصل احکام ہی کے بارے میں رہنمائی کی مختلف شکلیں ہیں۔ [أدب الطلب ومنتھی الأرب/ شوکانی ص ۱۱۶-۱۱۷]

فقہی تفاسیر میں باقاعدہ تصنیف و تالیف کا آغاز غالبًا دوسری صدی کے وسط میں ہوا۔ اب تک اس موضوع پر کم وبیش ایک سو دس تالیفات کا ذکر ملتا ہے جن میں سے بعض چھپ چکی ہیں، بعض کے قلمی نسخے مختلف مقامات پر محفوظ ہیں اور بعض زمانے کی دست برد میں کہیں کھوگئی ہیں اور ہم تک صرف ان کا نام ہی پہنچ سکا ہے۔ شاید ''احکام القرآن'' کے عنوان سے سب سے پرانی تالیف وہ ہے جو محمد بن سائب کلبی (م ۱۴۶ ھ) کی طرف منسوب ہے۔ کہاجاتا ہے انہوں نے آیاتِ احکام کی تفسیر کے متعلق روایات حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہیں۔اس کے بعد اس موضوع پر تالیفات کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں امام مقاتل بن بشیر الخراسانیؒ (م ۱۵۰ھ)، امام محمد بن ادریس الشافعیؒ (م ۲۰۴ھ)، امام القراء ابوعمر حفص بن عمر الدوریؒ (م ۲۴۶ھ)، فقیہِ دوراں محمد بن سحنون التنوخیؒ (م ۲۵۶ ھ)، امام ظاہریہ داود بن علیؒ (م ۲۷۰ھ)، قاضی منذر بن سعید البلوطی المالکیؒ (م ۳۵۵ ھ)، امام ابوبکر احمد بن علی الجصاص الحنفیؒ (م ۳۷۰ ھ)، ابوالحسن علی بن محمد الکیاہراسی الشافعیؒ (م ۵۰۴ھ)، ابوبکر محمد بن عبداللہ المعروف ابن العربی المعافریؒ (م ۵۴۳ھ) اور دیگر بڑے بڑے ائمہ کے نام شامل ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں بھی اس موضوع پر کسی نہ کسی انداز میں کام ہوا۔اس سلسلہ میں شیخ احمد بن ابوسعید المعروف ملاجیونؒ (م ۱۱۳۰ھ) کی ''التفسیرات الأحمدیة'' خاصی مشہور ہوئی۔ نواب محمد صدیق حسن خان قنوجیؒ (م ۱۳۷۵ھ) کی ''المرام مِن تفسیر آیات الأحکام'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کاوش ہے۔ حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ کی رہنمائی میں ''أحکام القرآن'' کے عنوان پرایک طویل تحقیقی منصوبہ شروع کیا گیا تھا جس میں مولانا ظفر احمد عثمانیؒ (م ۱۳۹۴ھ)، مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م ۱۳۹۵)، مفتی محمد شفیعؒ (م ۱۳۹۶ھ)، مفتی جمیل احمد تھانویؒ (م ۱۴۱۵ ھ) نے بہت علمی انداز میں فقہی مسائل پر اصولی بحثیں کی ہیں۔ بعد میں مفتی عبدالشکور ترمذیؒ (م ۱۴۲۱) بھی اس منصوبے میں شریک ہوگئے۔ یہ اپنے موضوع پر نہایت عظیم الشان مجموعہ ہے اور آج کل اس کی آخری جلدیں شائع ہورہی ہیں۔ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ) نے تفسیرِ مظہری میں اور مفتی محمد شفیعؒ (م ۱۳۹۶ھ) نے تفسیر معارف القرآن میں بھی قرآن کے فقہی احکام پر خصوصی توجہ دی ہے۔

یہ تمام کام اپنے اپنے مقام پر قابلِ قدر کاوشیں ہیں مگر اب تک جامعیت، وسعت اور قبولِ عام کے لحاظ سے جومقام ابوعبداللہ محمد بن احمد الانصاری القرطبیؒ (م ۶۷۱ ھ) کی ''الجامع لأحکام القرآن'' کو حاصل ہوا ہے وہ شاید اس موضوع کی کسی دوسری تفسیر کو حاصل نہیں ہوسکا۔

شریعہ اکیڈمی کے اختصاص کی بنا پر اس کا دائرۂ کار فقہ، اصولِ فقہ اور اسلامی قانون سے وابستہ دیگر موضوعات تک محدود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہمیں اس بنا پر جہاں شعبہ ہائے قانون اور عدل

وانصاف سے وابستہ اعلیٰ فوجی اور سول افسران سے لے کر وکالت پیشہ فضلائے قانون تک کے لیے تربیتی پروگرام منعقد کرنے اور ملک بھر کے ہزاروں گریجویٹس کو خط وکتابت کے ذریعے گھر بیٹھے اسلامی قانون کے تعارفی کورسز مکمل کروانے کا موقع میسر رہا ہے وہاں ہمارا شعبۂ مطبوعات بھی اس اختصاص سے متعلقہ کتب کی نشرواشاعت میں کسی صورت پیچھے نہیں رہا۔شریعہ اکیڈمی کے شعبۂ مطبوعات سے اب تک دورِ حاضر کے جدید مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے رہنمائی مہیا کرنے والی بہت سی کتب شائع ہوچکی ہیں۔ اکیڈمی کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ یہاں جدید موضوعات کے علاوہ فقہ و اصولِ فقہ کی امہاتِ کتب کے اردو تراجم شائع کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے جن میں قرآن وسنت کے قانونی مطالعہ کی کتب سرفہرست ہیں۔ قرآنِ مجید کے قانونی مطالعہ میں اس سے قبل اکیڈمی امام ابوبکر احمد بن علی الجصاص (م ۳۷۰ھ) کی مقبولِ عام کتاب ''احکام القرآن'' کا اردو ترجمہ چھ جلدوں میں شائع کرچکی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی امام ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی المالکیؒ (م ۶۷۱ھ) کی ''**الجامع لاحکام القرآن**'' ہے۔ اس کے اردوترجمہ کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ امام قرطبیؒ ان دنوں کی یادگار ہستیوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے سرزمینِ یورپ میں اندلس کے نام سے آٹھ سو سالہ اسلامی حکومت کے دوران سپین کے شہر قرطبہ میں آنکھ کھولی، وہیں کے علمی مراکز سے سیراب ہوئے اور اسی گلستاں کی رنگارنگ کلیوں سے اپنی تالیفات کوسجایا۔تفسیرِ قرطبی ایک ایسا نام ہے جو گزشتہ آٹھ صدیوں سے اہلِ علم کے ہر طبقہ میں یکساں مقبول ہے۔ اس کی جامعیت اور علمی وسعت کے پیشِ نظر اگر اسے مسلم سپین کی تہذیب وثقافت کی درخشاں یادگارتالیف کہاجائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اصل کتاب عربی زبان میں بیس جلدوں میں ہے۔ کہنے کو تو یہ بھی قرآنِ کریم کے قانونی مطالعہ کی کتاب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مطالعۂ قرآنِ مجید کا قانونی پہلوہو یا عام تفسیری انداز، تفسیرِ قرطبی علومِ اسلامیہ کے تمام پہلوؤں پر ایک جامع دستاویز ہے۔ فقہ واصولِ فقہ میں تمام مروجہ مکتب ہائے فکر کاتقابلی مطالعہ اس کا امتیاز ہے۔اس طرح قانون دان طبقہ کے لیے یہ کتاب حوالہ (Reference book) کادرجہ رکھتی ہے، علماء ومحققین کے لیے علومِ دینیہ کادائرۂ معارف ہے، خطباء اور واعظین کے لیے لاتعداد موضوعات کاخزینہ ہے اورصوفیہ وذاکرین کے لیے فضائل ومعارف کا مجموعہ ہے۔

ہماری یہ کوشش رہی ہے کہ اس بیش قیمت علمی خزانہ کی اردو دانوں تک رسائی کے لیے اس کے مؤلف امام قرطبیؒ کی عبارات و الفاظ کی حتی الامکان صحیح ترجمانی کی جائے۔اس مقصد کے لیے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے اربابِ حل وعقد سے لے کر شریعہ اکیڈمی کی انتظامیہ اوراصحابِ علم تک سب نے مخلصانہ کردار ادا کیا۔ اس کے ترجمہ کے بنیادی خاکہ، ترجمہ وتحقیق، رہنمائی، نظر ثانی، اور پروف ریڈنگ تک کے لیے

ایسے اہلِ علم کی خدمات شاملِ کار رہیں جو درسِ نظامی کی ٹھوس بنیادوں اور علوم عصریہ میں اعلیٰ تعلیم سے بہرہ مند تھے ۔ اس عظیم الشان کتاب کو اردو کے قالب میں ڈھالنے کا فریضہ شریعہ اکیڈمی کے فاضل رفیقِ کار محترم ڈاکٹر حافظ اکرام الحق یٰسین صاحب نے انجام دیا ہے۔انہوں نے بڑی محنت ،لگن اور خلوص کے ساتھ یہ مشکل کام مکمل کیا ہے ۔اللہ تعالیٰ ان کی مساعی کو قبول فرمائیں، ان کے عزم وہمت میں برکت عطا فرمائیں اور ان کی اس علمی کاوش کو دین وشریعت کی اشاعت کا ذریعہ بنادیں.آمین۔

اس ترجمہ میں آسان اردو محاورہ استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔احادیث کی تخریج حتی الامکان مستند کتب سے کی گئی ہے اور حسبِ ضرورت توضیحی حواشی کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے ۔ امام قرطبیؒ کے حالات عام طور پر کتبِ سیَر وتراجم میں نہایت مختصر ملتے تھے ۔ان کے علمی مقام کے بارے میں جو مواد ملتا تھااس میں اکثر روایتی توصیفی جملے تھے۔ اس کتاب میں ان کے تعلیمی مراحل اور علمی مقام کا ایک مربوط خاکہ ان کی اپنی تالیفات کے شواہد کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مسلم سپین میں ان کے وطنِ مالوف قرطبہ کی مرکزی حیثیت اور اس کے علمی وثقافتی مقام پر بھی ایک مضمون اس کی ابتدا میں منسلک کردیا گیا ہے اورخود تفسیرِ قرطبی کی جامعیت اور اسلوبِ تالیف کا تعارف بھی کروادیا گیا ہے۔

اس سب کے باوجود یہ ایک انسانی کاوش ہے جس میں کسی بھی ترمیم واصلاح کی گنجائش باقی ہونا ایک فطری امر ہے۔اس سلسلہ مین محترم قارئین کے مفید مشورے ہمارے لیے سرمایۂ اعزاز ہوں گے۔

ھذاماعندنا واللہ یتولی السرائر

محمد یوسف فاروقی

ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی

تفسیرِ قرطبی (اردو) کی خصوصیات

☆ تفسیر کے مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کو مؤلف نے ابواب میں تقسیم کر کے ہر باب کو ایک عنوان دیا تھا۔ ترجمہ میں ان میں سے ہر ایک کے ابواب کو تسلسل سے نمبر لگا دیئے گئے ہیں۔

☆ اکثر آیات کی تفسیر کے مختلف پہلوؤں کو مؤلف نے خاص تعداد میں مسائل کے عنوان سے لکھا ہے۔ ترجمہ میں مسائل کو ''مباحث'' کا نام دیا گیا ہے اور ہر بحث کو ایک مستقل عنوان دیا گیا ہے جو پہلے موجود نہیں تھا۔

☆ متن کی عبارات کا ترجمہ کرتے وقت اہم مضامین کو ذیلی عناوین کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔

☆ مقدمہ اور سورۂ فاتحہ کے ہر باب کا عنوان جب کہ سورۂ بقرہ کی ہر آیت کا نمبر اس کے متعلقہ تمام صفحات کے بالائی حصہ (Header) پر ثبت کیا گیا ہے۔

☆ تفسیر کے شروع میں امام قرطبیؒ کے وطنِ مالوف قرطبہ کا تعارف کروایا گیا ہے اور مسلم دورِ حکمرانی میں اس کی مرکزی حیثیت اور علمی، ثقافتی، اجتماعی اور سماجی ترقی کا مختصر اور جامع ذکر کیا گیا ہے۔ کچھ تذکرہ اس ماحول کا بھی ہے جس میں امام قرطبیؒ کی ولادت ہوئی اور جن حالات میں انہوں نے پرورش پائی۔

☆ امام قرطبی کے حالات کے بارے میں کتبِ سِیَر وتراجم میں بہت کم مواد میسر آتا تھا۔ ترجمہ کے شروع میں قرطبہ کے ذکر کے بعد آں جناب کی مؤلفات کی مدد سے ان کے کچھ حالات بیان کیے گئے ہیں اور ان کا علمی مقام واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆ امام قرطبیؒ کے تعارف کے بعد ان کی کتاب ''الجامع لأحکام القرآن'' (تفسیرِ قرطبی) کے علمی مقام اور اسلوبِ تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

☆ آیات، احادیث اور عربی اشعار کی اصل عبارات مع ترجمہ شامل کی گئی ہیں۔

☆ آیات کا ترجمہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ، مولانا فتح محمد جالندھریؒ اور مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ کے ترجمہ ہائے قرآنِ مجید کی مدد سے آسان اردو میں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

☆ احادیث کا ترجمہ سیاق وسباق اور مستند شروحِ حدیث کی مدد سے کیا گیا ہے ۔

☆ تخریجِ احادیث میں مصادرِ اصلیہ تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے اور جہاں میسر ہوا حدیث کے ایک سے زائد حوالے دیئے گئے۔

☆ بعض مقامات پر متن کی کسی عبارت میں کوئی لفظ چھوٹا ہوا یا تبدیل شدہ محسوس ہوا تو اس کی تحقیق کر کے تصحیح کر دی گئی ہے اور حاشیہ میں اس کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔

☆ حسبِ ضرورت رواۃ اور دیگر شخصیات کا جامع تعارف حواشی میں لکھ دیا گیا ہے۔

☆ بعض مقامات پر حسبِ ضرورت فقہی احکام سے متعلق حواشی کا اضافہ بھی کیا گیا ہے۔

☆ تفسیرِ قرطبی کے متن کی احادیث کو شروع سے آخر تک مسلسل نمبر دے دیا گیا ہے۔

☆ ہر صفحہ کے نیچے احادیث کے حواشی اور عمومی حواشی کو الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔

☆ جلد کے آخر میں اس کے ایک جامع اشاریہ شامل کیا گیا ہے جس میں کتاب کی شخصیات، قبائل وجماعات ، ادیان ومذاہب ،کتب ، سورتوں کے حوالہ جات اور فقہی احکام اور قانونی مواد کی الگ الگ فہارس شامل کر دی گئی ہیں۔

☆☆☆

رمزِ شناسائی

امام قرطبیؒ کا وطن اور اس کا دینی وثقافتی پس منظر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِی بِنِعْمَتِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ أَمْجَدِ الموجودات، أَشْرَفِ الْمَخْلُوْقَاتِ وَأَفْضَلِ الْكَائِنَاتِ وَعَلٰى آلِهٖ مراكز الأنوار ومهابط البركات وَصَحْبِهٖ نجوم الهدى شموس في الظلمات وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِإِحْسَانٍ إِلٰى يَوْمِ الْمَعَادِ۔

قُرْطُبَہ جس کی نسبت سے اس تفسیر کے مؤلف کو قرطبیؒ کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں عام مسلمانوں کو شاید زیادہ معلومات نہ ہوں کیوں کہ حوادث زمانہ سے بچھڑنے والوں کی یادیں اگر مٹیں نہیں تو مدھم ہو ہی جایا کرتی ہیں مگر علم وثقافت اور فن ولطافت کے دامن سے وابستہ مسلمانوں کے دل اس کا نام سنتے ہی آج بھی دھڑکنے لگتے ہیں۔ مسلم اندلس میں شعور وآگہی کے اس گلشن کی عظمت رفتہ کے نقوش ان کی آنکھوں کے سامنے یوں تیرنے لگتے ہیں جیسے کسی بااثر خاندان کے دولہے پر نچھاور کی جانے والی گلاب کی بکھری ہوئی پتیاں۔ دِل ودماغ موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کے انقلابی کاروان سے لے کر ابوعبداللہ محمد کے غرناطہ سے رسوا ہوکر نکلنے تک عالم عروج وزوال کے طویل راستوں میں کھوجاتے ہیں۔ دورِ جدید کی ترقی، فضاؤں میں لپکتی، سمندروں کی لہروں کو چیر کر گہرائیوں کو چھوتی، زمین کی دھرتی پر دھاڑتی، مریخ وقمر کی سطح کو روندتی اور ستاروں پر کمند ڈالتی حرکتِ حیات بھی امت مسلمہ کے دلوں سے مسلم اندلس کی حسین یادوں کو محو نہیں کرسکی جس میں قرطبہ کو دھڑکتے دِل کی حیثیت حاصل تھی۔ اس خطۂ مرحومہ کی اسلامی تاریخ میں کہیں علم ومعرفت، ذوق وبصیرت اورفن ولطافت کی کہکشائیں چمکتی دمکتی نظر آتی ہیں اور کہیں خودغرضی ونفس بینی کے نشے میں چور تنگ نظر وعاقبت نااندیش اربابِ حل وعقد سے ملاقات ہوتی ہے جن کی کوتاہ بینی وعیش کوشی نے ہنستے بستے گلشن کو ویراں اور مہکتے لہلہاتے چمن کو جلاکر خاکستر کردیا اور بقول شاعر:

باغبان نے آگ دی جب میرے آشیانے کو جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

یہ آٹھ سوسالہ طویل داستان ہے جو سرزمین یورپ کے اس خطہ میں خلافت الٰہیہ کی منظرکشی، عدل گستری

کی چہل پہل، انسانی اقدار کے تحفظ اورتہذیب وثقافت کے عروج کے لحاظ سے اپنی تابناکیوں میں بھی بے مثال ہے اورنعیم وفیر کی آرائشوں اورآسائشوں میں کھوکرمنعم حقیقی کوبھول جانے اورمقصدیت چھوڑکر طاؤس ورباب،طبل وشباب، غناء وشراب ،اورحرص وحساب کے گرداب میں پھنس کرعقل وبصیرت سے عاری بن جانے والی قوموں کے لیے نشان عبرت بھی ہے ۔اس داستان کی ابتدا موسیٰ بن نصیر اورطارق بن زیاد کے اللہ اکبر کے نعروں کی گونج میں بحیرۂ روم عبور کرنے کے منظر سے ہوتی ہے۔ پھربنوامیہ کی خداداد سیاسی بصیرت کے مظاہر اوران کے عمرانی ذوق جمال کے مناظر سے ہوتے ہوئے مختلف نشیب وفراز کے مختلف مراحل طے کرتے کرتے اس کی تانت اس وقت ٹوٹتی ہے جب غرناطہ میں بنو احمر کے تاجدارابوالحسن علی کا بیٹا ابوعبداللہ محمد قومی وملّی مفادات سے بے نیاز ذاتی حکومت کے شوق میں عیسائیوں کی شہہ پر اپنے باپ سے حکومت چھین لیتا ہے اور چند سال اپنے حلیف دشمن کی زیرِ سرپرستی تخت بادشاہت سے لطف اندوز ہونے کے بعدلاچارومجبور ہوکرمسلم اندلس کا آخری گوشہ بھی اپنے ہاتھوں سے ان کے سپرد کردیتاہے اور اس کے بدلے میں جان کی امان پر راضی ہوکرحسرت ویاس کا مجسمہ بنے ، سرجھکائے ،منوں وزنی قدموں کے ساتھ،آنسو بہاتا اپنے خاندان اور ساتھیوں سمیت شمالی افریقہ کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے ۔

قوموں کے عروج وزوال میں ممالک کاہاتھ آجانایا چھن جانا ایک معمول ہے مگر اندلس کی بربادی ایک ایسازخم ہے جس سے اٹھنے والی ٹیسیں صدیاں گزرنے کے باوجودکرۂ ارض پر ہرسو بسنے والے مسلمان اب تک محسوس کررہے ہیں۔اس زخم نے نہ صرف ایک ہنستے بستے معاشرے کوگھائل کردیا بلکہ دنیا کے لیے ترقی کی مثال بننے والی ایک تہذیب اور انسانی اقدار کے تحفظ پر مبنی نظام ایک باوقاراور غیرمعمولی ثقافت کی بساط اس سرزمین سے ایسے لپیٹ دی کہ آج تک وہ روشنی دیکھنے کو نہ ملی۔

تاریخ وسیر کے علاوہ ادب وشعر کے ذخیرہ پر اک نظر طائرانہ ڈالی جائے تو اس حادثۂ جانکاہ سے لے کر آج تک آنسوؤں کا ایک نہ تھمنے والا سیلاب رواں دواں نظر آتا ہے۔شاعرمشرق علامہ محمد اقبالؒ بھی کرب والم کے اپنے مخصوص انداز میں اسی صف میں کراہتے نظر آتے ہیں۔ یہ گلستاں اجڑنے کے صدیوں بعد۱۹۳۳ء میں اقبالؒ قرطبہ کی مرحوم جامع مسجد میں پہنچے توانہوں نے اپنی ایک طویل نظم میں کہا[1]:

اے حرمِ قرطبہ: عشق سے تراوجود عشق سراپادوام جس میں نہیں رفت وبود
رنگ ہو یا خشت وسنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

....

۱۔ کلیاتِ اقبال ، بالِ جبریل ص۹۳،نظم مسجدِ قرطبہ

کعبۂ اربابِ فن ! سطوتِ دینِ مُبیں
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

ہے تہِ گردوں اگر حسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار!
حاملِ خُلقِ عظیم ، صاحبِ صدق ویقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہلِ دِل فقیری ہے شاہی نہیں!

جن کی نگاہوں نے کی تربیت شرق وغرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دِل وگرم اختلاط ، سادہ و روشن جبیں

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دِل نشیں

بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

آنسوؤں کا یہ سیلاب بے جانہیں،اہلِ ذوق کا سپین کو براعظم یورپ کے لیے باب الاسلام کہنا بھی بجا ہے اور اقبال کی رمزِغریب'' سلطنتِ اہلِ دِل فقیری ہے شاہی نہیں!'' بھی بے معنی نہیں۔ یہی وہ مقصدیت ہے جو خلافتِ الٰہیہ کا ابدی دستور اور مسلمانوں کی عظمت کا راز ہے جس سے سرِ موانحراف بربادی کی طرف بڑھنے والا قدم شمار ہوتا ہے۔اندلس کی تاریخ اس کی عینی شاہد ہے جس کا مختصر تعارف درج ذیل ہے:

محلِ وقوع اور تاریخی پس منظر

یورپ کے جنوب مغرب میں **جزیرہ نما آئی بیریا**(Iberian Peninsula) کے نام سے خشکی کا ایک وسیع وعریض ابھار ہے جس کی شکل تقریباً پنج گوشہ ہے۔ اس کے شمال کی جانب پیری نیز (Pyrenees) کا پہاڑی سلسلہ ہے جو اسے براعظم یورپ سے ملاتا ہے اور باقی تینوں اطراف میں بحر اوقیانوس اور بحیرۂ روم موجزن ہیں۔ پیری نیز کے کوہستانی سلسلہ کو''جبال البرانس،جبال البرتات اور جبال الحاجز'' بھی کہا جاتا ہے ۔ اس کا سطحی رقبہ **تقریباً دولاکھ انتیس ہزار مربع میل** ہے[1]۔یوں تو اس علاقہ میں انسانی تمدن کی اثری تاریخ لاکھوں سال پرانی ہے مگر براعظم یورپ میں واقع ہونے کے باوجود''پیرنیز'' کے بلند پہاڑوں نے اس جزیرہ نما کو صدیوں تک یورپ

ا۔ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ۳:۳۲۳،۳۲۴(الأندلس)

سے علیحدہ کیے رکھا۔ یورپ کے دوسرے علاقوں کے ساتھ اس کا رابطہ آٹھویں صدی ق.م. میں اس وقت جا کر قائم ہوا جب سلطنت روما کے معتوب چند یورپی قبائل وہاں سے بیرنیز کے پہاڑوں کو عبور کر کے اس علاقے میں داخل ہوئے۔ پھر ۲۱۸ ق.م. میں رومی فوج نے ان قبائل کو زیر کر کے سپین کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔

کہا جاتا ہے کہ تقریباً ۱۵۰۰ ق.م. میں شمالی افریقہ (غالباً موجودہ لیبیا) سے مختلف ''آئی بیری قبائل'' **جبل الطارق** (Gibraltar) کو عبور کر کے اس جزیرہ نما میں آباد ہوگئے تھے جن کی وجہ سے علاقے کا یہی نام مشہور ہوگیا۔ پھر یہاں **آریائی نسل** کے کلٹ (Celt) قبائل کا ورود ہوا اور ان دونوں قوموں کے باہمی ملاپ سے کلٹی بیریائی (Celtiberains) قوم وجود میں آئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کئی سو برس پہلے شام سے **فنیقیوں** (Phoenicians) کی آمد ہوئی۔ اسی زمانے میں یہاں یونانی آباد کاروں کا ورود ہوا۔ فینیقیوں کی یونانیوں کے ساتھ جنگ رہتی تھی۔ ان کی مدد کے لیے قرطاجنہ (Carthaginians) آگئے اور انہوں نے پورے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اسی زمانے میں رومیوں اور یونانیوں کے درمیان سرحدی تنازع کے نتیجے میں دوسری پیونک جنگ (Punic War) ہوئی تو **رومیوں** کو فتح حاصل ہوئی۔ دوسری صدی قبل مسیح ان کی قوت نے یہاں خوب زور پکڑا اور ان کی سلطنت بڑی شان و شوکت سے تقریباً چھ سو برس تک قائم رہی۔

رومیوں کی قوت ٹوٹی تو سپین کے ایک حصے پر شمال مغربی علاقے کی **شیوائی قوم** (Suevi) اور دوسری طرف بحیرۂ خزر کے مغربی ساحل یعنی دریائے دون (The Don) کے نواح سے آئی ہوئی **الانی قوم** (Alan) نے اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کرلیں۔ ۴۱۴ء میں **ویسی گاتھ** یا **مغربی قوطی** (Visigoths) یہاں پہنچ گئے جنہوں نے تقریباً ۴۱۹ء میں شیوائی اور الانی حکومتوں کو غارت کر کے جنوبی سپین سے لے کر فرانس میں دریائے لوائر (The Loir) تک اپنی حکومت بنالی۔ تھوڑے ہی عرصے بعد یورپ میں بحرِ بالٹک کے کناروں یعنی جرمانیہ کے علاقوں سے وَاندال (Vandal) اُٹھ کر فرانس سے گزرتے ہوئے سپین میں داخل ہوگئے اور تقریباً چالیس برس تک جنوبی سپین کے ایک حصہ پر حکومت کی۔ پھر وہ مغربی قوطی قابضین کے ہاتھوں مغلوب ہو کر افریقہ چلے گئے۔ چھٹی صدی کے آخر تک قوطی قوم کا پورے جزیرہ نما آئی بیریا پر مکمل قبضہ ہوگیا اور ان کو خوب استحکام حاصل ہوا۔ انہوں نے تقریباً تین سو برس تک یہاں بادشاہی کی۔ انہی کا دور تھا کہ ۹۲ ھ / ۷۱۱ء میں اندلس میں مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوگئیں[1]۔

اس وقت اس جزیرہ نما کے پورے علاقہ میں تین جزیروں کیوٹا (Ceuta)، ملیلا (Melilla)، انڈورا (Andorra) اور **جبل الطارق** کے علاوہ تقریباً پانچویں حصے (۹۲،۳۹۱ کلومیٹر) پر موجودہ **جمہوریہ پرتگال** ہے جس کا ۵ فیصد علاقہ پانی پر مشتمل ہے۔ یہاں دوسرا مشہور ملک **سپین** ہے جو کہ یورپ کے جنوب مغربی کونے پر واقع

۱۔ www.csudh.edu/global_options,spain,history، اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۵۷-۵۸

ہے۔اس کا رقبہ ۵۰۴،۷۸۲ کلومیٹر ہے اور اس کا ۱.۰۴ فیصد علاقہ پانی پر مشتمل ہے۔

آج کا سپین سترہ خود مختار ریاستوں (Autonomous Communities) اور دو خود مختار شہروں (Autonomous Cities) پر مشتمل ہے۔ سپین میں پچاس صوبے ہیں جو انہی سترہ خود مختار ریاستوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔انہی سترہ خود مختار ریاستوں میں سے ایک اندلس/ اندلوسیا (Andalusia/Andalucia) بھی ہے جس کا دارالریاست اشبیلیہ (Sevilla) ہے۔مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں سپین، پرتگال اور فرانس کے وہ حصے جو ان کے ماتحت تھے سب کو ملا کر اندلس کہا جاتا تھا۔ جدید سپین میں ریاست اندلوسیا تو موجود ہے مگر اس کے ماحول اور ثقافت کی طرح اس کے علاقوں اور حدود میں بھی یقیناً تبدیلی آ چکی ہے[1]۔

اندلس کے نام کا پس منظر یہ بتایا جاتا ہے ازمنۂ وسطیٰ کے خاتمہ تک تو پورا علاقہ جزیرہ نمائے آئی بیریا (Iberia) ہی کہلاتا تھا مگر جب اس کے ایک حصے پر جسے بیٹکا (بتیقا Paetica) کہا جاتا تھا، وندالوں (**Vandals**) کا تسلط قائم ہوا تو اس کا نام بیٹکا کی بجائے واندلیکیہ یا واندالیسیہ Vandalicia مشہور ہو گیا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ الاندلیش یا فندلیش بنا اور چلتے چلتے الأندلس ہو گیا۔ آج بھی اسے ''اَندلسیہ'' (Andalucia) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد موجودہ سپین میں وہ جغرافیائی خطہ ہے جو ساحلی علاقوں اور مرتفع خطوں پر مشتمل ہے اور شرقاً غرباً صوبۂ المریہ (Almera) سے صوبۂ ولبہ (Huelva) تک چلا گیا ہے، اس کے باشندے **Andalucis** (واحد **Andaluz**) کہلاتے ہیں[2]۔

صوبۂ قرطبہ

یہ صوبہ سپین کی خود مختار ریاست اندلوسیا کے اندر واقع ہے۔ اس کے شمال میں صوبۂ سوداد ریال (Ciudad Real)، مشرق میں صوبۂ جیان (Jaen) جنوب میں صوبۂ مالقہ (Malaga) اور صوبۂ غرناطہ (Granada) اور مغرب میں صوبۂ اشبیلیہ (Sevilla) اور صوبۂ بطلیوس (Badajos) ہیں۔ موجودہ صوبۂ قرطبہ کے اضلاع مسلم صوبۂ قرطبہ کے اضلاع سے کسی قدر کم ہیں۔اس کے بیچ سے سپین کا مشہور دریا الوادی الکبیر (**The Guadalquivir**) مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے جس سے یہ صوبہ جنوبی اور شمالی دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ جنوبی حصے کو عرب جغرافیہ نویسوں نے اقلیم الکنبانیہ لکھا ہے اور سپین والے اب تک اسے ''لاکمپینا'' (La Campina) کہتے ہیں۔ یہ علاقہ بہت سرسبز و شاداب ہے اور ہمیشہ انگور، زیتون اور غلہ جات کی اچھی پیداوار کے لحاظ سے مشہور رہا ہے۔ الوادی الکبیر کو نہر قرطبہ، نہر اشبیلیہ یا نہرِ اعظم بھی کہا جاتا ہے۔

۱۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ۹، Encyclopaedia.thefreedictionary.com/spain

۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ: اندلس ۳: ۲۲۲، ۲۲۳، اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۴۵

شہرِ قرطبہ

قرطبہ اسی صوبے کے مرکزی شہر کا نام بھی ہے۔ یہ شہر جدید سپین کے جنوب میں سطح سمندر سے ۳۷۰ فٹ کی بلندی پر الوادی الکبر کی وسطی گزرگاہ کے دائیں (شمالی) کنارے پر ۳۷.۸۸ شمالاً اور ۴.۷۷ غرباً جبلِ قرطبہ کے دامن میں واقع ہے جو کہ مشہور سیرامورینا پہاڑی سلسلہ کا ایک حصہ ہے۔ یہ سلسلہ شہر قرطبہ کے شمال کی طرف بڑھتا چلا گیا ہے۔ جبلِ قرطبہ کو جبل العروس بھی کہا جاتا تھا۔

قرطبہ کا نام

اسے فرانسیسی زبان میں (Cordoue)، انگریزی، اطالوی اور جرمن میں (Kordova/Cordova)، لاطینی میں (**Corduba**) اور عربی میں قاف کے پیش کے ساتھ ''قُرطُبَة'' کہا جاتا ہے۔ بعض یورپی مصنفین نے اس نام کو عبرانی الفاظ سے مرکب بمعنی ''اچھا گاؤں'' قرار دیا ہے۔ نفح الطیب میں ابوعبداللہ البکری سے اس کا قوطی (**Gothie**) تلفظ ''ط'' کی بجائے ''ظ'' کے ساتھ منقول ہے۔ الحجاری نے اسے ''طاء'' کے ضمہ کے ساتھ ''قُرطُبَة'' اور مشرق کے مصنفین نے ''طاء'' کی زیر کے ساتھ ''قُرطِبَة'' لکھا ہے۔ ابن غالب اسے یونانی الفاظ سے مرکب مانتے ہیں۔ ابن سید کے خیال میں قرطبہ قرطاجنی زبان کے الفاظ کا مرکب ہے جس کا معنی ''اس کے رہنے والوں کا صلہ'' ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق اس کا اصل نام ''کوردوبہ'' تھا جو کہ پرانی ہسپینی یا ایبیری زبان کا لفظ ہے۔ اس کی شہادت دورِ جدید میں ملنے والی ایبیری طرز کی بعض مورتیوں سے بھی ملتی ہے [1]۔

تاریخی پس منظر

قرطبہ ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ ابن سید کہتے ہیں کہ اسے عمالقہ نے بسایا تھا [2]۔ ہسپانیہ کی تاریخ میں کوردوبہ (**Corduva/Cordoba**) کا نام پہلی مرتبہ عمالقہ یعنی قرطاجنۂ افریقہ (**فینیقین**) اور اہلِ روما کے درمیان قرطبہ کے قریب ہونے والی دوسری جنگ (**Punic**) میں سامنے آیا۔ اس وقت یہ بہت مال دار شہروں میں شمار ہوتا تھا اور اس کی تجارت ترقی پر تھی۔ ۱۵۲ ق.م. میں روما کے سپہ سالار مارکوس کلاڈیوس مارکیلوس (Marcellus) نے اس شہر پر قبضہ کر کے اسے رومی مقبوضاتِ ہسپانیہ کے جنوبی علاقوں کا دارالریاست قرار دے دیا۔ ۴۵ ق.م. میں جنگِ منڈا (**Munda**) کے بعد میں یولیوس قیصر نے خود آکر اسے اپنی قیام گاہ

۱۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (قرطبہ)، قرطبة حاضرة الخلافة في الأندلس / د۔ عبدالعزیز سالم ص ۱۵

۲۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۴۲-۳۴۴، قرطبة حاضرة الخلافة في الأندلس / د۔ عبدالعزیز سالم ص ۱۶-۱۷

بنالیا۔رومی شہنشاہی دور میں یہ مدت تک ہسپانیہ میں رومیوں کا پایۂ تخت رہا۔ اوگسٹ قیصر کے دور میں جنوبی سپین کو مزید دو حصوں میں تقسیم کر کے مشرقی صوبے کو پیٹکا اور مغربی کو لشدانیہ کا نام دیا گیا۔اس وقت بھی **قرطبہ** بدستور "اقلیم پیٹکا" کا دارالریاست رہا ۔ ۴۱۱ء کے لگ بھگ جب اس وقت کے قابض جرمانی قبائل الان اور وندال میں پھوٹ پڑ گئی تو بھی اقلیم پیٹکا کا مرکزی شہر قرطبہ ہی رہا جس میں وندالوں کی ایک کثیر تعداد اقامت پذیر رہی [1]۔

۴۱۴ء اور بعد کے زمانے میں ویسی گاتھ (مغربی قوطی) سپین کے اکثر علاقوں پر قابض ہو گئے۔قوطی بادشاہ اَخیلا (۵۴۹-۵۵۵ء) کے دور میں ایک قوطی سردار اتاناجیلد و بیزنطی شہنشاہ جستنیان کی مدد سے اندلس کا خود مختار حاکم بننے میں کامیاب ہو گیا تو اسے اپنے معاہدے کی رو سے پیٹکا کا علاقہ بیزنطیوں کے حوالے کرنا پڑا جس سے قرطبہ بھی ان کے قبضے میں چلا گیا۔یہ علاقہ کافی عرصہ بیزنطیوں (Bysanties) کے قبضہ میں رہا مگر ۵۶۸ء میں قوطی بادشاہ لیوی جلد اس پر دوبارہ قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا [2]۔

قوم قوط کے بعد اندلس میں مسلمانوں کی حکومت ہوئی۔قرطبہ کو اسلامی لشکر کے سپہ سالار طارق بن زیاد کے حکم سے ولید بن عبدالملک کے آزاد کردہ غلام مغیث رومی نے اوائل ۹۳ھ / اکتوبر ۷۱۱ء میں سات سو سواروں کی مختصر جماعت کے ساتھ فتح کیا۔ اہلِ شہر کے ساتھ مسلم فوجیں بہت رعایت سے پیش آئیں ۔شروع زمانہ میں مسلمانوں نے اشبیلیہ کو دارالحکومت قرار دیا تھا مگر جب مرکزی خلیفہ سلیمان بن عبد الملک بن مروان کے زمانہ یعنی ۱۰۰ھ / ۷۱۹ء میں اندلس کی امارت پر السمح بن مالک الخولانی مقرر ہو کر آئے تو انہوں نے اشبیلیہ کی بجائے قرطبہ کو دارالحکومت بنالیا۔اس وقت سے لے کر مروانی سلاطین وخلفائے اندلس کے پورے دور میں یہ شہر نہ صرف صوبۂ قرطبہ کا بلکہ تمام اندلس کا دارالسلطنت رہا ۔اس کی مرکزی حیثیت ۶۳۴ھ/ ۱۲۳۶ء میں قشتالہ کے عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ کے قبضہ تک برقرار رہی [3]۔

قرطبہ کا دینی وثقافتی پس منظر

جزیرہ نمائے آئی بیریا کا خطہ ہمیشہ اضطرابات اور مہم جوؤں کی باہمی چپقلش کی نذر رہا۔بہت کم اسے امن و استقرار نصیب ہوا۔سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ یقیناً ہر طالع آزما قوم نے یہاں اپنے دین اور اپنی ثقافت کو رواج دینے کی کوشش کی۔آئی بیریا کے دیگر علاقوں کی طرح قرطبہ بھی یقیناً ان انقلابات سے متاثر ہوتا رہا۔

۱۔ قرطبة حاضرة الخلافة في الأندلس / د.عبدالعزيز سالم ص۱۶-۱۹

۲۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص۳۴۵، قرطبة حاضرة الخلافة في الأندلس / د۔عبدالعزیز سالم ص۱۹-۲۰

۳۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص۳۴۵-۳۴۶،اردو دائرہ معارف اسلامیہ، الاندلس ۳:۳۳۷-۳۳۹

علامہ مقریؒ کا کہنا ہے کہ پرانی تواریخ کے مطابق طوفانِ نوح (علیہ السلام) کے بعد اندلس میں جو قوم آباد ہوئی اسے ''اندلش'' کہاجاتا تھا۔ یہ لوگ مذہباً مجوسی اور فطرتاً بہت شریراور فسادی تھے۔ایک سوسال سے زائد عرصہ یہاں آباد رہنے کے بعد فساد اور خشک سالی کی وجہ سے ان میں سے کچھ لوگ مر گئے اور کچھ ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ ایک سوسال کی ویرانی کے بعد یہ علاقہ کچھ افریقی قبائل نے آکر آباد کیا۔یہاں خوب ہریالی چھائی اور آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔یہ لوگ بھی مجوسی تھے۔تقریباً ایک سو ستاون سال کے بعد روما کے اہلِ عجم نے اپنے قائد ''اُشبان بن طیطش'' کی سرکردگی میں ان کوختم کردیا۔اس نے افارقہ کا دار الحکومت برباد کرکے اس کی جگہ ''اِشبیلیہ'' شہر آباد کیا پرانے دارالحکومت کے قیمتی پتھر اور دیگر قابلِ قدر اشیاء بھی اس نے وہیں منتقل کرلیں۔کچھ عرصہ بعد بادشاہ اشبان نے ایلیا(بیت المقدس) پر حملہ کیااور ایک لاکھ یہودیوں کوقتل کیا،ایک لاکھ کو غلام بنایااور وہاں سے سنگ مرمر اور دیگر قیمتی اشیاء اٹھاکر اشبیلیہ لے آیا[1]۔

میلادِ مسیح علیہ السلام سے کئی سوبرس قبل فنیقی تاجروں نے اس ملک کے جنوبی ساحل پر تجارت کی غرض سے کئی بستیاں بسائی تھیں۔ ان کے بعد یونانی آباد کاروں نے سپین کے مشرقی ساحل پر روساس (Rosas) ، امپوریاس (Ampurias) اور ساگونتو (Sagunto) وغیرہ کئی شہر آباد کیے۔انہوں نے ان علاقوں میں یقیناً اپنا اپناطرززندگی بھی متعارف کرایاہوگا۔مگر اس پوری تاریخ میں دینی اور ثقافتی لحاظ سے جس قوم کوسب سے زیادہ پنپنے کا موقع ملا وہ رومی تھے۔ دوسری صدی قبل مسیح میں جب ان کی قوت نے یہاں خوب زور پکڑا۔اسی دوران حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت ہوئی توبشتولقات نامی ایک رومی گروہ نے ادھر کا رخ کیا۔حضرت مسیح علیہ السلام نے تبلیغ کے لیے یہاں اپنے حواریوں کو بھیجاجن میں سے بعض کوقتل کردیا گیامگر بعد میں بہت سے لوگوں نے دینِ مسیح علیہ السلام کو قبول کرلیا۔یہاں رومی سلطنت بڑی شان وشوکت سے تقریباً چھ سو برس تک قائم رہی۔ اس دوران انہوں نے جزیرہ نما کوتقریباً مکمل طور پر رومی تہذیب وثقافت کے رنگ میں رنگ دیا۔انہوں نے سپین میں چار طاقت ور معاشرتی عناصر چھوڑے: لاطینی زبان ، رومی قانون(Roman law)،شہری ریاست کانظام (The muncipality)اور عیسائی مذہب۔اس عرصہ میں اس قوم کے بڑے بڑے نام ور لوگ اس ملک میں پیدا ہوئے[2]۔

رومی دور میں قرطبہ نے بہت ترقی کی ،اس کی حدود میں وسعت آئی اوراس کی تعمیرات کی شان وشوکت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ۱۵۲ ق.م. میں جب روما کے سپہ سالار مارکوس کلاڈیوس مارکیلوس نے کوردوبہ پر

۱۔ نفح الطيب، أول من استوطن الأندلس

۲. www.csudh.edu/global_options,spain,history،اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۵۷-۵۸، نفح الطيب. دخول عجم رومة والقوط الأندلس ودخول النصرانية اليها.

قبضہ کیا تو اس نے اس شہر کی تعمیر وترقی میں بہت اہم کردار ادا کیا، اس کو رومی طرز پر مضبوط فصیلوں کے ذریعے قلعہ نما بنایا اور روما کے اشراف خاندانوں کو یہاں لاکر بسایا۔اس دور میں کوردوبہ (Colonia Patricia) کے نام سے رومی مقبوضاتِ ہسپانیہ (Espana Ulterior) کے جنوبی علاقوں کا دارالریاست رہا۔ اوگسٹ قیصر کے دور میں اس کا شمار جنوبی سپین کے چار اہم عدالتی شہروں میں ہونے لگا۔

ایک وقت آیا کہ رومیوں نے انتظامی ضروریات کے تحت شہر قرطبہ کو مشرقی اور مغربی دو حصوں میں تقسیم کردیا جن کے درمیان ایک بڑی فصیل بنائی گئی۔اس کے مشرقی حصے میں عوام کی آبادی تھی جب کہ مغربی حصہ حکومتی اداروں کے لیے مخصوص تھا۔ اسی میں حاکم کا محل اور فوجی بارکیں وغیرہ بھی تھیں۔ یہ شہر کا وہی حصہ ہے جو اسلامی دور میں شہر قرطبہ کہلاتا تھا[۱]۔

قومِ قوط میں سے سب سے پہلے ان کے بادشاہ خشندش نے عیسائیت قبول کی اور بہت خلوص سے نہ صرف اس پر عمل پیرا رہا بلکہ اس کی دعوت کو بھی عام کیا۔اس نے عدل وانصاف کی عمدہ مثالیں قائم کیں[۲]۔

۴۲۹ء میں قرطبہ وندالوں کے ہاتھوں ملیا میٹ ہوگیا۔ کافی انقلابات کے بعد ۵۶۸ء میں جب قوطی بادشاہ لیوی جلد کا اس علاقے پر قبضہ ہوا تو اس نے قرطبہ کو دینی مرکز کی حیثیت دی مگر اس کے باوجود قوطی عہدِ حکومت میں اس کو کچھ عروج حاصل نہ ہوسکا بلکہ رفتہ رفتہ طلیطلہ کو حکمرانوں کا شہر (La Ciudad Regia) اور کنیسہ کی مجلس اعلیٰ کا مرکز بنادیا گیا[۳]۔

مسلمانوں کی آمد کے وقت قرطبہ کے سیاسی ودینی حالات

جزیرہ نما آئی بیریا مسلمانوں کی آمد سے قبل ویسی گاتھ (مغربی قوطیوں) کا دورِ ظلم واستبداد کا دور شمار ہوتا ہے۔ پانچویں صدی عیسوی کے اوائل میں انہوں نے یہاں پہلے سے آباد ''وندالوں'' کو بے دخل کرنے کے بعد مملکت میں ظلم واستبداد کی انتہا کردی جس کا نشانہ اکثر یہاں کے اصلی باشندے بنے۔انہوں نے اپنے علاوہ دیگر قوموں کو غلاموں کی حیثیت سے رکھا یہاں تک کہ مسلمانوں کے ہاتھوں یہاں سے بے دخل ہوئے۔

علاقے کی دینی حالت یہ تھی کہ یہاں کے اصل باشندے اور قوطی حاکم طبقہ سب زمانۂ قدیم سے بت پرست تھے۔ تیسری صدی عیسوی میں یہاں عیسائیت کا رواج ہوا۔ چوتھی صدی میں یہاں کے لوگوں نے ''آریوس''

۱۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۴۵، قرطبة حاضرة الخلافة في الأندلس د۔عبدالعزیز سالم ص ۱۶-۱۸

۲۔ نفح الطیب. دخول عجم رومة والقوط الأندلس ودخول النصرانية اليها

۳۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۴۵۔قرطبة حاضرة الخلافة في الأندلس د۔عبدالعزیز سالم ص ۱۹-۲۰

کے نظریات کے مطابق عیسائی مذہب قبول کرلیا جس کی بنیاد توحیدِ باری تعالیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت پر تھی۔ تثلیث کو اس میں کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ کچھ عرصہ بعد حکامِ طلیطلہ نے بھی یہی مذہب قبول کرلیا اور اسے سرکاری مذہب کی حیثیت دے دی گئی۔ ۴۰۰ء میں طلیطلہ کی مذہبی قیادت نے تثلیثی افکار کو اپنانے کا فیصلہ کرلیا مگر وہ عوام کو اپنے اس فیصلے سے مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے جس کی وجہ سے ملک میں تثلیثی اور موحد عیسائیوں کے درمیان ایک مستقل کشمکش کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اس تناؤ نے آگے چل کر طویل خانہ جنگی کی شکل اختیار کرلی۔ اشرافیہ اور مذہبی رہنماؤں کی اکثریت تثلیث کی حامی بن چکی تھی اور قوم کی غالب اکثریت آریوی عقیدۂ توحید پر قائم رہی۔ ۸ مئی ۵۸۹ء کو ایک فیصلہ کے تحت تثلیثی عیسائی عقیدہ کو سرکاری مذہب قرار دے دیا گیا جس کے نفاذ کی آڑ میں موحد عیسائیوں کو سخت ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔ جزیرہ نما آئی بیریا کے جنوب میں بسنے والے اہلِ اندلس کسی صورت اس نئے قانون کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ جب حکمران طبقہ اور اشرافیہ کا ظلم حد سے گزر گیا تو عوام نے اپنے عقیدہ کو چھپانے میں عافیت سمجھی[1]۔

پورا علاقہ اجتماعی بدامنی و انتشار (Disorder, Confusion) اور سیاسی بدحالی کا شکار تھا۔ پورا معاشرہ مختلف طبقات میں بری طرح منقسم تھا۔ ان کے درمیان اکثر کینہ پروری اور سازش بازی کا بازار گرم رہتا تھا۔ اس انتشار کو ہوا دینے میں اس وقت کا مذہبی طبقہ پیش پیش تھا۔ عیسائی مذہبی رہنماؤں اور اشرافیہ نے گویا پورے ملک کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ملک کے تمام محاصل اور ذرائع آمدن پر بھی انہیں لوگوں کا قبضہ تھا جسے وہ اپنے مخصوص مقاصد کے لیے خوب استعمال کرتے تھے۔ ہر طرح کا بوجھ عوام الناس کو برداشت کرنا پڑتا تھا اور اکثر معاملات میں وہ اسی طبقہ کے دستِ نگر اور اسی کے رحم وکرم پر ہوتے تھے۔ اشرافیہ اور مذہبی قیادت کی سینہ زوری یہاں تک پہنچ گئی کہ ۹۱ھ/ ۷۱۰ء میں جب ملک کا قانونی بادشاہ گیٹشا وفات پا گیا تو انہوں نے اس کے بیٹے وقلہ کو جبراً حکومت سے بے دخل کردیا اور اپنے مفادات کی خاطر پڈیکا کے دارالحکومت قرطبہ سے اس کے گورنر لذریق (راڈرک) کو طلیطلہ بلا کر بادشاہ بنا دیا۔ اس طرح ملک کی سیاسی قوت دو حصوں میں تقسیم ہوگئی اور ملک میں امن وامان کی صورت حال مزید خراب ہوگئی[2]۔

یہودیوں اور غلاموں کی حالت

ملک کے مظلوم طبقات میں غلاموں کی کثیر تعداد تھی جنہیں ہر طرح سے تختۂ مشق بنایا جاتا تھا۔ غلاموں کی طرح وہاں کے یہودیوں کو بھی بری طرح مذہبی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ۶۹۱ء سے جزیرہ نما کے تمام یہود کو غلام

۱۔ انبعاث الإسلام في الأندلس / علي المنتصر الكتاني ۲۹-۳۱

۲۔ قرطبة في العصر الإسلامي ص ۹-۱۰

قرار دے دیا گیا تھا، ان کے مال اور جائداد پر قبضہ کرلیا گیا اور بچے چھین لیے گئے (۱)۔

یہودیوں کے لیے آبادی سے الگ تھلگ بستیاں قائم کی جاتی تھیں جن کے اندرانہیں پابند رہنا پڑتا تھا۔ آبادی بڑھ جانے کی صورت میں ان لوگوں کو اپنی بستی سے باہر جگہ حاصل کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ عام طور پر ان کی گلیاں تنگ، مکانات اونچے اور رہائشی لوگ گنجائش سے زیادہ ہوتے تھے۔ بستیوں کے آس پاس دیواریں بنائی جاتی تھیں جن کے دروازے کسی یلغار کی صورت میں یا عیسائی مذہبی تہواروں پر بند کردیئے جاتے تھے۔ان لوگوں کو بستیوں کی حدود سے باہر جانے کے لیے باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا۔تیرہویں صدی عیسوی میں جرمنی ، سپین اور پرتگال میں ایسے محلوں کے لیے مخصوص نام گھیٹو (Ghettos) استعمال ہونا شروع ہوا۔ کچھ مصنفین یہ لفظ ان مخصوص آبادیوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں جن کی طرف شہنشاہِ روم نے یہودیوں کو پہلی صدی اور چوتھی صدی عیسوی کے درمیان دھکیل دیا تھا۔ قرطبہ میں بھی مسلمانوں کی آمد کے وقت وہاں ایک مستقل علاقہ ''حي اليهود'' (یہودیوں کا محلہ) کے نام سے مشہور تھا جو غالباً اسی سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ یہ ماحول ان کے لیے اجتماعی قید خانوں سے کم نہ تھا۔ ان کی تذلیل کا یہ سلسلہ مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دور میں اسلام کی وسعت ظرفی اور نظریۂ آزادی کی وجہ سے موقوف رہا مگر ان کے اندلس سے بے دخل ہونے کے بعد پھر پہلے سے زیادہ شدومد سے شروع ہوگیا اور انیسویں صدی میں فرانسیسی انقلاب تک یہی حال رہا۔ دوسری عالمگیر جنگ سے کچھ پہلے اور اس کے دوران نازیوں نے مشرقی یورپ میں ایسی بستیاں دوبارہ بنادیں (۲)۔

اس زمانے میں مسلمان فاتحین شمالی افریقہ تک پہنچ چکے تھے اور ان کی رواداری وعدل گستری کی کافی شہرت تھی۔ اس بدامنی اور انتشار کی حالت میں اہلِ اندلس سے مدد مانگنے کا فیصلہ کیا۔یہ سپین میں غاصب عیسائی بادشاہ لذریق (راڈرک) کا دور حکومت تھا۔ راڈرک بہت ظالم تھا۔وہ اپنی رعایا کے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو شاہی تربیت کے بہانے اپنے زیرِ اثر رکھتا تھا اور ان سے اپنی ہوس پوری کرتا تھا۔ مراکش کے ساحلی علاقے سبتہ پر ایک بربری عیسائی سردار'' کاؤنٹ جولین'' کی حکومت تھی جسے راڈرک نے مذہب وملت سے بے نیاز ہوکر اپنا باج گزار بنا رکھا تھا۔ جولین کی ایک نوعمر لڑکی بھی تربیت کے نام پر اس کی ہوس کا نشانہ بن گئی جس سے اس کے دِل میں راڈرک کے خلاف سخت نفرت کے جذبات بھڑک اٹھے ۔ وہ ایک وفد لے کر شمالی افریقہ میں مسلم کمان دار موسیٰ بن نصیر کے پاس گیااور سپین پر حملہ کرکے لوگوں کو راڈرک کے ظلم وستم سے نجات دلانے کی درخواست کی ۔ موسیٰ نے خلیفۂ وقت ولید بن عبدالملک سے اندلس پر چڑھائی کی اجازت چاہی۔ خلیفہ نے احتیاط کی تاکید کرتے

۱۔ قرطبة في العصر الإسلامي/ دكتور احمد فكری، مؤسسة شباب الجامعة بالإسكندرية ص ۹

۲۔ Encyclopaedia,The free dictionary

ہوئے اجازت دے دی تو موسیٰ نے اللہ کا نام لے کر اس کے لیے حکمتِ عملی وضع کی اور اندلس میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وادیٔ لکہ کے آٹھ روزہ تاریخی معرکہ میں راڈرک بھی مارا گیا اور مسلمانوں کے لیے آگے بڑھنے کے راستے بھی آسان ہوگئے۔ اس طرح اہلِ اندلس کا یہی مظلوم طبقہ اس جزیرہ نما میں مسلمانوں کے داخلے کا ظاہری ذریعہ بنا۔ ۹۲ھ سے ۹۵ھ (۷۱۱ء سے ۷۱۴ء) صرف تین سال کے قلیل عرصہ میں پورا جزیرہ نما تثلیثی گاتھوں کے تسلط سے آزاد ہوگیا(۱)۔

اندلس میں مسلمانوں کا قیام

اندلس پر مسلمانوں کی حکومت کو تین بڑے ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱۔ **عہدِ ولایت**: شوال ۹۲ھ/ جولائی ۷۱۱ء تا ذی الحجہ ۱۳۸ھ / مئی ۷۵۶ء۔ اس عرصہ میں طارق بن زیاد سے لے کر یوسف بن عبدالرحمٰن الفہری تک ۴۶ برس تک محیط عرصے میں ۲۲ گورنروں نے یکے بعد دیگرے خلیفۂ دمشق کی ماتحتی میں اندلس کا نظم و نسق سنبھالے رکھا۔

۲۔ **خلافت**: ۱۳۸ھ/ ۷۵۶ء تا ۴۲۲ھ / ۱۰۳۰ء۔ اس عرصہ میں دمشق کے ساتویں خلیفہ ہشام اول بن عبدالملک کے پوتے ابو المطرف عبدالرحمٰن بن معاویہ المعروف عبدالرحمٰن الداخل سے لے کر ہشام ثالث المعتز باللہ تک ۳۳۱ برس خلفائے بنو امیہ کی حکومت رہی۔ البتہ اسی مدت کے آخری سالوں میں اندلس کے آخری اموی بادشاہ ہشام ثالث المعتز باللہ کی تخت نشینی سے پہلے گیارہ سال کے اندر مختلف موقعوں پر تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے خاندانِ بنوحمود کے چار آدمی بھی تختِ قرطبہ پر بادشاہ بن کر رہے۔

۳۔ **طوائف الملوکی**: ۴۲۳ھ/ ۱۰۳۱ء تا ۸۹۸ھ / جنوری ۱۴۹۲ء۔ اس عرصہ میں بنوجہور، بنوعباد، مرابطین، موحدین نے باری باری ۶۳۴ھ/ ۱۲۳۶ء تک تختِ قرطبہ پر حکومت کی اور اسی آخری سال قرطبہ پر قشتالہ کے عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ کے قبضہ کے بعد اندلس میں مسلمانوں کی حکومت سمٹتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ ۸۹۸ھ / جنوری ۱۴۹۲ء میں غرناطہ میں بنو نصر کے آخری تاجدار ابوعبداللہ محمد بن ابوالحسن علی بن ابو نصر سعد نے غرناطہ کی حکومت بھی قشتالہ کے عیسائی بادشاہ فرڈیننڈ اور اس کی ملکہ ازابیلہ کے سپرد کر دی جس سے اندلس میں ۸۰۶ برس حکومت کرنے کے بعد مسلمانوں کی نہ صرف حکومت ختم ہوگئی بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی تہذیب کا جنازہ بھی نکال دیا گیا(۲)۔

۱۔ نفح الطیب ج ۱، باب فتح الأندلس وأسبابه، روایة ابن خلدون، انبعاث الإسلام في الأندلس ۲۹-۳۱

۲۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۲۶-۳۲۸، ۳۴۵-۳۴۹

مسلم فاتحین کی ہمہ جہت رواداری اور سیاسی حکمت عملی

ہسپانوی عوام کی حالتِ زار، قوطی حکام کے ظلم وجور سے ان کی بے زاری، حکام کی پادری نوازی، خود مذہبی پیشواؤں کی عوام سے بے اعتنائی اور اشرافیہ کی بے لگام دخل اندازی ایسے ظاہری اسباب تھے جنہوں نے بنیادی طور پر مسلمانوں کے اندلس میں داخلے کی راہ ہموار کی۔ یہاں تک کہ ہسپانیہ کے یہودی جو عرصۂ دراز سے مسیحیوں کے مظالم تلے دبے ہوئے تھے، انہوں نے بھی مسلمانوں کا خیر مقدم کیا مگر ان سب سے بڑھ کر عوام سے مسلمانوں کا حسنِ سلوک اہلِ ہسپانیہ کے لیے باعثِ کشش ثابت ہوا۔

مسلمانوں کی رواداری اور سیاسی حکمتِ عملی یہ تھی کہ انہوں نے مظلوموں کی نہ صرف یہ کہ داد رسی کی بلکہ انہیں اپنے انسانی وجود کا احساس دلایا چناں چہ یہودی جو ایک عرصہ سے قابلِ نفرت اور ازلی مجرم سمجھے جاتے تھے، مسلمانوں نے انہیں تحفظ فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ مفتوحہ علاقوں کی حفاظت میں مسلمان سپاہیوں کے برابر کا مقام دیا۔ جب غرناطہ فتح ہوا تو تھوڑے بہت مسلمانوں اور باقی علاقہ کے یہودیوں کو جمع کر کے انہیں یہاں کی حفاظت پر مامور کیا گیا اور خود اسلامی افواج نے دوسرے علاقوں کا رخ کیا۔ اس کے بعد جب بھی کوئی علاقہ فتح ہوتا وہاں کے یہودیوں کو کچھ مسلمانوں کے ساتھ ملا کر علاقہ کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ قرطبہ کی فتح کے بعد بھی مسلم افواج کے کمان دار مغیثؒ نے یہودیوں کو اس کی حفاظت پر مامور کیا[1]۔

مغیث رومیؒ نے صرف سات سو مجاہدین کی مختصر جماعت کے ساتھ قرطبہ فتح کیا۔ اس میں ایک مقامی چرواہے نے اندرونِ شہر کی دفاعی پوزیشن کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات فراہم کیں اور دیوار پناہ کے شگاف کا پتہ بھی بتایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے عام آدمی کو مسلمانوں میں ہی امید کی کرن نظر آ رہی تھی[2]۔

ہسپانیہ میں رومیوں کے تسلط کے زمانے میں قرطبہ شہر میں ایک بہت بڑا بت خانہ تھا۔ جب سپین میں عیسائی مذہب پھیلا تو رومیوں نے اس کو ختم کر کے ایک بہت بڑا کلیسہ بنجنت (Vincnet) نامی ایک مسیحی شہید کی یاد میں تعمیر کیا جو کہ کلیسائے شنت بنجنت کے نام سے مشہور ہوا۔ قوطی بادشاہوں نے اس کی عمارت میں کافی تکلفات پیدا کیے۔ جب قرطبہ فتح ہو گیا تو مسلمانوں نے نہ تو دیگر فاتح اقوام کی طرح ان کی عبادت گاہوں کو ختم کیا، نہ ان کی مذہبی رسومات پر کوئی پابندی لگائی، نہ ہی انہیں مسلمان بننے پر مجبور کیا۔ یہاں مسلمانوں کو سب سے پہلے مسجد کا معاملہ درپیش آیا تو نئے نئے قبضہ کے بعد فوری طور پر مسجد بنانے میں خاصا وقت لگ سکتا تھا لہٰذا انہوں نے

۱۔ نفح الطیب ج ۱، روایۃ الرازی فی شأن الفتح

۲۔ قرطبۃ حاضرۃ الخلافۃ فی الأندلس ص ۲۰-۲۳

یہاں بھی فتحِ دمشق کے وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فیصلہ کی روشنی میں عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کر کے عبادت کے لیے وسعت کے لحاظ سے اس وقت کی موزوں ترین جگہ کلیسائے شنت بنجنت کو دوحصوں میں تقسیم کرلیا۔ اس کے ایک حصہ پر عیسائیوں کا کلیسہ قائم رہا اور دوسرے کو مسلمانوں نے اپنی مسجد کے لیے مخصوص کرلیا۔ مدت تک مسلمان اور عیسائی اپنے اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرتے رہے۔

جب السمح بن مالک الخولانی کے دورِ ولایت میں قرطبہ مسلمانوں کا دارالحکومت ہوگیا تو وہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھی اور بہت سے امراءِ عرب نے بھی وہاں سکونت اختیار کرلی تو رفتہ رفتہ مسجد نمازیوں کے لیے کم پڑ گئی۔ اس میں گنجائش نکالنے کے لیے بہت سی ترکیبیں کی گئیں۔ مسجد کے اندر بہت سی معلق چھتیں بھی بنائی گئیں جن کی تعداد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا مگر مشکل حل نہ ہوسکی۔ ایک تو مسجد میں نمازیوں کی تعداد دن بدن بڑھتی چلی گئی اور دوسرے دریائے وادی کبیر کی طرف سے شمال کی طرف بنائی جانے والی چھتیں سطحِ زمین بلند ہونے کی وجہ سے اس قدر نیچی تھیں کہ ان کے نیچے سے نمازیوں کا گزرنا محال ہوگیا۔ اس سب کے باوجود مسلم فاتحین نے معاہدہ کی پاسداری کرتے ہوئے جب تک بن پڑا عیسائیوں کے کلیساوالے حصہ کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ کافی مدت کے بعد جب امیر عبدالرحمٰن بن معاویہ (الداخل) نے ۱۴۸ھ / ۷۵۶ء میں اندلس کی حکومت سنبھالی اور قرطبہ کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا تو دیگر ترقیاتی کاموں کے ساتھ ساتھ انہوں نے مسجد کی توسیع کا پروگرام بنایا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے شہر کے بڑے بڑے عیسائی رؤساء کو بلایا اور نہایت گراں قیمت پر گرجے والا حصہ خریدنے کی پیش کش کی۔ انہوں نے پہلے تو یہ جگہ بیچنے سے قطعی طور پر انکار کردیا مگر پھر کچھ سوچ کر آئے اور اس جگہ کی قیمت کے ساتھ ساتھ اس شرط پر یہ حصہ فروخت کرنے پر تیار ہوئے کہ ان کے جو گرجا گھر شہر سے باہر پہلے سے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے انہیں بنانے کی اجازت دی جائے۔ امیر نے وہ قیمت بھی ادا کردی اور باہر کے گرجا گھر بنانے کی اجازت بھی دے دی، تب جا کر مسجد کی نئی تعمیر کا پروگرام شروع ہوا(۱)۔

یہ مسلم فاتحین کی رواداری اور انسانی حقوق کی پاسداری کی چند ایک مثالیں ہیں۔ اندلس میں ان کے پورے آٹھ سوسالہ دورِ حکومت میں آپس کے اختلافات تو دیکھنے میں آتے ہیں مگر رعایا کے ساتھ جبر واستبداد کی مثالیں کم ہی ملتی ہیں۔

مسلم اندلس کی صنعت وپیداوار پر ایک نظر

یوں تو اللہ تعالیٰ نے سرزمینِ اندلس کو زرخیز زمین اور وافر قدرتی وسائل سے نوازا تھا اور یہاں پہنچنے والی

۱۔ نفح الطيب ذكر بعض من دخل الأندلس من التابعين، قرطبة حاضرة الخلافة في الأندلس ص ۳۲-۳۳

ہر قوم نے اس کی سرسبزی وشادابی سے حصہ بقدرِ جثہ فائدہ اٹھایا مگر مسلمانوں کے دور میں غیر آباد زمینوں کی آباد کاری ، معدنیات اور دیگر قدرتی وسائل کا استعمال جس حسن وخوبی سے کیا گیا مغربی مفکرین ومؤلفین بھی آج تک معترف ہیں کہ عیسائی غلبے اور مسلمان خواص کے ساتھ محنت کشوں کی بے دخلی کے بعد اس علاقے کو وہ ترقی کبھی حاصل نہیں ہوسکی ۔اس وقت کے اندلس کی **ترکاریوں** اور **اناج** میں: چاول ، گندم ، جو، چنا، رائی، مکئی اور زیتون وغیرہ ۔ **پھلوں** میں: شفترے ،لیموں، انجیر، بادام ،انار ، کیلا، سیب، اخروٹ، بلوط، بعض علاقوں میں کھجور، نیشکر، انجیر، آڑو، شفتالو، تربوز اور انگور وغیرہ۔**خوشبودار** پودوں کے لیے اندلس ہندوستان کے بعد سب سے زیادہ مشہور تھا۔ یہاں سنبل الطیب (بالچھڑ)، قرنفل (لونگ)، صندل، عود، زعفران، دارچینی، ادرک، محلب (کھیونی) وغیرہ پچیس قسم کے خوشبودار پودے اور چھالیں مشہور تھیں ۔مزید خوشبودار مواد میں یہاں کے کہربا، عنبر اور قرمز بہت مشہور تھے۔**معدنیات** میں سونا، چاندی ، پارا، قلعی ،زرد اور سرخ گندھک، توتیا، سرمہ ،پھٹکری ، لوہا، مگنیشیا، چونے کا پتھر اور ابرق جن میں چاندی، گندھک، توتیا اور پھٹکری وغیرہ قرطبہ میں وافر مقدار میں تھے۔**قیمتی پتھروں** میں بلور، یاقوت، سنہری پتھر مرقیشیتیا، مقناطیس، لاجورد، زاج ، عمارتی پتھروں میں سرخ ،سبز، زرد اور دیگر مختلف رنگوں کے قیمتی پتھر نکالے جاتے تھے۔اندلس کے ساحلی علاقوں میں **موتی** اور مونگا نکالنے کا کام عام تھا۔ **پالتو جانوروں** میں بھیڑیں ، گائے ، بیل ،اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور عمدہ قسم کے خچر بکثرت پالے جاتے تھے۔سمور، قنلیہ اور دبر وغیرہ کی قیمتی کھالوں سے پوشاکیں تیار کرنے کی **صنعت** کو بھی یہاں مسلمانوں نے ترقی دی۔ یہاں **مچھلی** کی تجارت کو بہت ترقی دی گئی جس میں مشہور مچھلیوں کے علاوہ بھری بھرکم اور نہایت خاص قسم کی اندلسی مچھلیاں الگ مقام رکھتی تھیں۔ **تجارت وصنعت** کے بارے میں ایک عرب مؤرخ کا کہنا ہے کہ عمدگی اور نفاست اندلس کی مصنوعات پر ختم تھی۔رنگ برنگ بیل بوٹوں والے بوریئے، کمخواب، زربفت ،ریشمی کپڑے، دھوپ چھاؤں کا ایک سفید پھول دار کپڑا، بنائی کے ذریعے لکھائی والے کپڑے ،شیشے ،لوہے ،مٹی اور تانبے کے برتن، لکڑی کی مصنوعات، پھول دار برتن، نمک صاف کرنے اور چمڑے صاف کرنے اور رنگنے کے کارخانے ،تکیے کے غلافوں میں استعمال ہونے والی جالی دار بیلیں، فیتے اور سوئی کی دیگر مصنوعات، قالین بافی ، سوزنی کا کام اور کیڑوں کے ذریعے ریشم کی صنعت۔ وہاں **کاغذ** کی صنعت ایک منفرد صنعت تھی جس کی پیداوار پورے یورپ میں جاتی تھی۔سونا صاف کرنے اور پتھر تراشنے کے کارخانے ،مرصع تخت، چھریاں ، قینچیاں اور سونے چاندی کے جڑاؤ والے دیگر اوزار۔ قرطبہ شہر پوستین بنانے میں خاص طور پر مشہور تھا یہاں کشتیاں اور جہاز بھی وسیع پیمانے پر تیار کیے جاتے تھے۔**تعمیراتی زیبائش** میں بھی مسلمان معماروں نے کمال کام کیے۔ فرش اور دیواروں پر خوب صورت سنگریزوں کے ذریعے چتر کاری اور گل سازی جس کو المفصص یا الفسیفساء کہا جاتا ہے، اندلسی مسلمانوں کا ایک منفرد فن تھا۔ایسے فن پاروں کی نفاست اور چمک دمک ایسی تھی کہ

آج کے ترقی یافتہ دور کی تعمیرات بھی اس کے سامنے شرما جائیں۔ باریک قسم کی روغنی ٹائلیں جیسی قصرالحمراء وغیرہ میں استعمال ہوکر آج تک فن ہندسہ کو ورطۂ حیرت میں ڈالے ہوئے ہیں اندلسی مسلمانوں کا امتیاز تھیں[1]۔

قرطبہ کی تعمیر وترقی میں مسلمانوں کا کردار

مسلمانوں نے جب قرطبہ فتح کیا تو مدتوں سے وہ اپنی مرکزی حیثیت کھوچکا تھا بلکہ قوطی دور میں تو دار الحکومت طلیطلہ کے مقابلے میں بے اعتنائی کا شکار تھا۔ اس کی حیثیت محض ایک عام شہر کی رہ گئی تھی، اکثر سرکاری عمارتیں سنسان اور دیواریں بوسیدہ ہوچکی تھیں۔ شہر کو دوسرے علاقوں سے ملانے والا اہم ذریعہ دریا کا پل بھی ٹوٹ چکا تھا۔ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں کچھ تعمیراتی کام بھی ہوئے اور گورنر اندلس السمح بن مالک الخولانی نے خلیفۂ دمشق حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اجازت سے دریا کے پل کی مرمت بھی کروادی۔ قرطبہ مسلم اندلس کا **دارالسلطنت** بھی بن گیا مگر اس کی **اصل ترقی** کا زمانہ اس وقت شروع ہوا جب **عبدالرحمٰن بن معاویہ الداخل** نے یوسف بن عبد الرحمٰن الفہری سے اندلس کی حکومت لی اور اپنے خاندان میں دولتِ بنی امیہ اندلس کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۸ھ بمطابق ۱۵ مئی ۷۵۶ء کو حکومت سنبھالنے کے بعد قرطبہ کی جامع مسجد میں پہلا خطبۂ جمعہ دیا جس کے بعد سب لوگوں نے بطورِ امیر اندلس ان کی بیعت کی۔ اس وقت ان کی عمر صرف پچیس سال تھی[2]۔

مسلم قرطبہ کا تکوینی خاکہ

قرطبہ کی بستیاں مغربی جانب اشبیلیہ کے محلّوں سے جاملتی تھیں اور ساٹھ میل کی مسافت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ مشرق کی طرف اس کی آبادی صوبۂ جیان کی آبادی کے ساتھ خلط ملط ہوچکی تھی جب کہ شمال میں اس کی آبادی جبل عروس کی بلندیوں پر جاکر رُکی تھی۔ اس کی یہ بستیاں ہرسوباغات، زیتون کے درختوں، قلعوں اور پانی کے چشموں سے پررونق تھیں۔ ادریسی کا کہنا ہے کہ قرطبہ پانچ ذیلی شہروں پر مشتمل تھا۔ ہر شہر کی الگ فصیل تھی اور وہ مستقل شہر شمار ہوتا تھا۔ درمیان میں قرطبہ کا مرکزی شہر تھا جس میں دریا کا پل اور جامع مسجد واقع تھے جب کہ اس کے آس پاس باقی چاروں شہر تھے۔ جنوب میں دریائے وادی کبیر کے پار شہر شقندہ مشرق میں زاہرہ، شمال میں رصافہ اور مغرب میں زہراء تھا۔ شہر کے مرکزی حصے کو ''المدينة العتيقة'' (پرانا شہر) یا ''القصبة'' (مرکز) کہا جاتا تھا۔ اس میں بنیادی طور پر دو ہی محلے تھے۔ ایک کو جامع مسجد والا محلّہ اور دوسرے کو شمالی محلّہ کہا جاتا تھا۔ ہر محلے کا اپنا نمبردار اور چوکی دار ہوتے تھے۔ دار الخلافہ بننے کے بعد یہ شہر امراء واشراف کا مسکن ٹھہرا تو اس کی آبادی تیزی

۱۔　اندلس کا تاریخی جغرافیہ، باب پنجم، ص ۷۳-۸۶

۲۔　قرطبة في العصر الإسلامي ص ۳۱، ۱۶۸

سے بڑھی اور اس قدر ترقی ہوئی کہ ایک شہر کے پانچ شہر بن گئے جن میں سے ہر شہر عمدگی، خوب صورتی اور سہولیات میں دوسرے سے بڑھا ہوا نظر آتا تھا[1]۔

قرطبہ کے محلے اور بستیاں

علامہ مقری نے ابن بشکوال کے حوالے سے قرطبہ کے اس دور کے حالات نقل کیے ہیں جب وہ انتہائے عروج پر تھا۔اس کے اکیس محلے/ ربض تھے۔ہر محلے میں مسجدیں، بازار وغیرہ اس قدر تھے کہ اہلِ محلّہ کے لیے کافی ہو رہتے، عام ضروریات کے لیے کوئی محلّہ کسی دوسرے محلے کا محتاج نہیں تھا۔اس وقت قرطبہ کی آبادی بھی بہت زیادہ تھی۔ابن سعید کا قول ہے کہ اگر شہر کی تمام فصیلوں اور چار دیواریوں کا طول جمع کیا جائے تو میزان چوبیس میل بنتا تھا۔

مسلم قرطبہ کی آبادی کی ایک جھلک

خلیفہ ہشام المؤید (۳۶۶ ھ تا ۳۹۹ ھ/۹۷۶ء تا ۱۰۰۹ء) کے دور میں ایک مرتبہ قرطبہ کے مکانات کی گنتی کی گئی تو عام باشندوں اور پیشہ وروں کے مکانوں کی تعداد دولاکھ ستر تھی۔امراء، رؤساء، شاہی خاندان کے ارکان، فوجی سرداروں اور سپاہیوں کے مکانات ومحلات ساٹھ ہزار تین سو تھے۔ان میں لکڑی کے مکان، سرائیں، حمام اوردکانیں شامل نہ تھیں۔دکانوں کی تعداد اسی ہزار چارسو اور بازاروں کا شمار چار ہزارتین سو تھا۔صرف شہر کی چاردیواری کے اندرشاہی اہلکاروں کے مکانات ۴۳۰ سے زیادہ تھے۔مساجد کے بارے میں کہاجاتاہے کہ عبدالرحمٰن الداخل کے وقت قرطبہ کی مساجد کی تعداد ۴۹۰ اور بعد میں یہی تعداد ۸۳۷ بتائی گئی ہے۔شہر کے اندر باہر حماموں کی تعداد ایک وقت میں ۳۰۰ اور ایک زمانے میں ۷۰۰ بیان ہوئی ہے[2]۔ایک اندازے کے مطابق آج سے دس صدیاں قبل اس کی آبادی نولاکھ نفوس پر مشتمل تھی[3]۔

فنِ تعمیر

اگرچہ عبدالرحمٰن الداخل کے دورمیں شام کے اموی فنِ تعمیر کارنگ غالب رہا مگرمختلف شعبہ ہائے زندگی میں ترقی اور اندلس کی عمدہ آب وہوا سے جہاں فن ولطافت میں دیگر پہلوؤں سے ترقی ہوئی وہاں فنِ تعمیر میں بھی

۱۔ تفصیل کے لیے :قرطبة في العصر الإسلامي ص ۱۷۰-۱۷۳

۲۔ قرطبة في العصر الإسلامي ص ۱۸۵

۳۔ www.frommers.com/destinations/Cordoba

جدت آئی جس نے قرطبہ کو دمشق، قاہرہ، بغداد اور دنیا کے مہذب ترین اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ شہروں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ دنیا کا کوئی شہر اپنی ظاہری و معنوی رعنائیوں میں قرطبہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مسلم حکمرانوں خصوصاً بنوامیہ اندلس نے مساجد، شاہی محلات، مہمان گھروں، بازاروں، حمامات، پلوں اور سڑکوں کی صورت میں فنِ تعمیر کے بہت سے شاہکار کھڑے کیے جن میں جامع مسجد قرطبہ، قصرِ شاہی، قصرِ الرصافة، الروضة، قصر الزاهر (پھولوں والا محل)، قصر المعشوق، قصر المبارک، قصر الرشق، قصر السرور، قصر التاج، قصر البديع اور قصرِ دمشق وغیرہ مادی نفاست، شاہی شان وشوکت اور ذوقِ لطافت کے شاہکار ہیں۔ ایسی عمارات آج بھی سپین کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کی خاص توجہ اور اہتمام کا مرکز ہیں۔ ان سب تعمیرات میں بڑی بات ان کی نقشہ نویسی اور ہر تعمیر کے ہر حصے کی خاص مقصد کے تحت خاص انداز سے بناوٹ تھی۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی اکثر عمارات کو بعد کے آنے والے حکمرانوں نے ارادی طور پر ختم کیا بلکہ ان کے نشانات بھی مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ صرف **جامع مسجد قرطبہ** ایسی عمارت ہے جسے کلیسا قرار دے کر باقی رہنے دیا گیا۔ مسجد کے اندر اگرچہ جابجا بے ہنگم تعمیرات اور ترمیمات کے ذریعے اسے کیا سے کیا بنا دیا گیا مگر اس کی عمومی عمارت اب بھی مسلم فنِ تعمیر کا عمدہ نمونہ اور ان کی عظمت رفتہ کا نشان ہے۔ اس کا مختصر حال درج ذیل ہے:

قرطبہ کی جامع مسجد

جامع قرطبہ کو بادشاہِ قشتالہ کے قبضے کے بعد دوسری مساجد کی طرح اگرچہ کلیسا بنا دیا گیا تھا مگر آج بھی وہ ''مسکیتا'' کے نام سے ہی مشہور ہے جو ''مسجد'' کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ مسجد کا عظیم الشان نقشہ امیر عبدالرحمٰن الداخل نے دمشق کے ایک ماہرِ فن سے تیار کروایا تھا۔ مسجد کی تعمیر شروع ہونے کے دو سال بعد ہی (۱۷۲ھ / ۷۸۸ء) میں امیر عبدالرحمٰن تو فوت ہو گئے مگر ان کے بیٹے امیر ہشام نے اپنی بادشاہت کے چھٹے سال (۱۷۷ھ / ۷۹۳ء) میں اسے مکمل کر لیا۔ اس پر تقریباً نو برس کی مدت صرف ہوئی۔ امیر عبدالرحمٰن نے صرف دو برس کی تعمیر میں اسی ہزار دینار سرخ صرف کیے تھے۔ امیر ہشام نے اپنے دور میں سات برس کے مالِ غنیمت کا خمس خرچ کیا۔

مسجد کے گرد ایک **چاردیواری** تھی جس کی مضبوطی کے لیے باہر کے رُخ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چہار پہلو پشتی بان دیواروں سے ملا کر بنائے گئے تھے جن پر کنگرے تھے۔ اس منظر سے مسجد ایک گول قلعہ معلوم ہوتی تھی۔ مغرب کی سمت مسجد کا چہار پہلو مینار تھا جس پر مؤذن اذان دیتا تھا۔ مسجد کے گرد شمال اور مشرق و مغرب کی طرف خوبصورت محرابوں والے اکہرے دالان تھے۔ درمیان میں وضو کے لیے ایک حوض تھا جس میں مسجد کے باہر ایک کنویں سے پانی بھرا جاتا تھا۔ اس حوض کو ''میضاۃ'' یا ''سقایة'' کہا جاتا تھا۔

مسجد کی پہلی تکمیل کے بعد اس کے اندرونی حصہ کی شکل یہ تھی کہ اس کے اندرونی حصہ میں دس دس ستونوں کی قطاریں یا گیارہ گیارہ دہانوں والے آٹھ دالان تھے۔ قبلہ کی دیوار والے دالان میں ایک خوشنما گنبد کے نیچے دیوار سے کچھ اندر کو بڑھا ہوا مسجد کا محراب تھا جہاں ایک طرف امام کے کھڑا ہونے کی جگہ اور دوسری طرف منبر رکھا ہوا تھا۔ دائیں بائیں اس سے ملے ہوئے دروں میں مقصورہ تھا جہاں بادشاہ نماز پڑھتے تھے۔ مسجد کے باہر مغربی جانب قصرِ شاہی تھا۔ دالانوں کے ستونوں کی ہر قطار پر ایک ہی وضع کے محرابوں کی ایک قطار تھی۔ ہر ستون کی بلندی تقریباً سات ذراع (۱۲ فٹ) تھی۔ پھر ہر ستون پر ایک اور ستون تھا جس سے ستونوں کی پہلی قطار پر ایک دوسری قطار قائم ہوتی تھی اور اس دوسری قطار پر بھی محرابوں کی ایک صف تھی۔ کہیں کہیں ان محرابوں کی پہلی اور دوسری صفوں پر اسی طرح کی ایک تیسری صف قائم کر کے نہایت خوب صورت چھت بنائی گئی تھی جس کی اونچائی مسجد کے فرش سے بیس ذراع (۳۵ فٹ) تھی۔ محرابوں کے درمیانی جگہ خالی چھوڑی ہوئی تھی۔ ان میں جس رخ سے دیکھا جاتا تا حد نظر قطار اندر قطار ستونوں کا ایک مچھلی جال سا نظر آتا۔

عبد الرحمٰن الداخل کے پڑپوتے امیر عبدالرحمٰن الاوسط نے اپنے دور میں مسجد کے قبلہ کی طرف والے دالانوں کے ساتھ دس دس ستونوں کی قطاروں والے سات دالان در دالان بڑھائے جس سے مسجد کے ہال میں دس ستونی قطاروں والے پندرہ دالان در دالان ہو گئے۔ عبدالرحمٰن الناصر لدین اللہ (۳۰۰ھ/ ۹۱۲ء) نے پہلے مینار کی جگہ جسے زلزلہ سے سخت نقصان پہنچ چکا تھا، نیا عظیم الشان مینار بنوایا جس کی کل اونچائی ۷۲ ذراع تھی۔ وہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ زمین سے ۵۴ ہاتھ اونچا لے جا کر اس کے چاروں طرف ایک چوڑا چھجا نکالا گیا۔ اس چھجے پر ستون قائم کر کے ان کے اوپر ایک برج بنایا گیا۔ اس چھجہ پر کھڑے ہو کر مینار کی دیوار کی طرف پشت کر کے مؤذن اذان کہتا تھا۔ برج کے اوپر ایک کلس تھا جو اوپر نیچے سیب کی شکل کے تین گولوں پر مشتمل تھا جن میں درمیان والا گولہ چاندی کا اور اوپر نیچے والے دونوں خالص سونے کے تھے۔ ان میں سے ہر گولے کی گولائی تین ہاتھ تھی۔ ان سب کے اوپر چھ پنکھڑیوں والا سونے کا ایک سوسن کا پھول بنایا گیا تھا جو اوپر کے لٹو سے ایک ہاتھ اونچا تھا۔ اس مینار میں دو زینے بنائے گئے تھے۔ ہر زینے کی ایک سو سات سیڑھیاں تھیں۔

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کے فرزند الحکم المستنصر باللہ (۳۵۰ھ/ ۹۶۱ء) کو موقع ملا تو انہوں نے مسجد کے چھتے ہوئے حصے کو تقریباً دوگنا کر دیا جس سے وہاں دس دس ستونوں والے ۲۹ دالان در دالان ہو گئے اور بالائی محرابوں کی قطاریں بھی دوگنا ہو گئیں۔ ستونوں اور محرابوں کی کثرت سے مسجد کی عمارت سنگِ مرمر کا خیابان نظر آتی تھی اور اس کے قطار در قطار ستون کسی باغ کی الجھی ہوئی شاخوں والے درختوں کا منظر پیش کرتے تھے۔

مسجد کا محراب قبلہ کی دیوار سے ملا ہوا سات پہلو ایک کمرہ تھا جو دودھ سے زیادہ اجلے اور برف سے

زیادہ چمکتے سنگِ مرمر سے بنایا گیا تھا۔اس کے اوپر ایک برج تھا جس کے اندر کی گولائی میں بے مثل سنگ تراشی سے گل کاری کی گئی تھی۔ اس کا طول شمالاً جنوباً ساڑھے آٹھ ہاتھ ، عرض شرقاً غرباً ساڑھے سات ہاتھ اور بلندی ساڑھے تیرہ ہاتھ تھی۔ دیوار میں اس کے ایک طرف لگے منبر میں آبنوس ، صندل، بقم،شوحط اور اسی قسم کی نہایت قیمتی لکڑی استعمال کی گئی تھی ۔اس منبر کی تیاری پر پینتیس ہزار سات سو سات دینار سرخ خرچ آیا تھا۔ایک مؤرخ کے بقول اس منبر کو لکڑی کے چھتیس ہزار پرزوں سے بنایا گیا تھا۔ہر پرزہ سونے اور چاندی کی کیلوں سے جڑا ہوا تھا۔کہیں کہیں اسے جواہرات سے مرصع بھی کیا گیا تھا۔لکڑی کے ہر پرزے پر سات درہم چاندی کے خرچ آئے تھے ۔اسے آٹھ کاری گروں نے سات برس میں مکمل کیا تھا اور ان میں سے ہر کاری گر کی مزدوری روزانہ نصف مثقال محمدی تھی۔اس منبر پر ایک زمانہ تک ایک قرآن شریف رکھا رہتا تھا جس کی نسبت مشہور تھا کہ یہ امیرالمؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا تھا۔اس پر آں جناب رضی اللہ عنہ کے خون کے نشانات بھی تھے ۔اس کی جلد سونے کی تھی جس میں موتی اور یاقوت جڑے ہوئے تھے ۔اس کا جزدان دیباج کا اور رحل عود کی تھی ۔

مسجد کے محراب میں داخل ہونے سے پہلے ایک سہ درہ آتا تھا جس کے نیچے کے دوستون سبز سنگِ مرمر کے اور اوپر کے دوستون لاجورد کے تھے۔ان کے اوپر نیچے کے ستونوں پر تین قطاریں خوب صورت محرابوں کی تھیں۔دیواروں پر سونے کا کام تھا۔ایک یورپی مصنف اس محراب کے بارے میں لکھتا ہے:''اس محراب کی حیرت انگیز خوب صورتی کو بیان کرنے کے لیے نہ الفاظ کام دیتے ہیں نہ فنِ تعمیر کی اصطلاحات کچھ مدد کرتی ہیں۔اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ انسان اسے خود دیکھے اور دنگ رہ جائے''۔ یہ محراب اب تک بدستور قائم ہے۔

خلیفہ الحکم باللہ کے بیٹے ہشام المؤید باللہ کا دور آیا تو انہوں نے مسجد کی مشرقی سمت میں اس کے پورے مسقف حصۂ صدر کے طول میں شمالاً جنوباً سات سات ستونوں (آٹھ آٹھ دہانوں) کے انتیس دالان در دالان پہلے دالانوں سے ملا کر بنوا دیئے ۔اس سے مسجد کی چھت کے نیچے ستونوں کی دس قطاریں طول میں اور اٹھائیس قطاریں عرض میں زاویۂ قائمہ پر باہمی تقاطع کر کے اس عمارت کی صورت قائم کرتی تھیں۔علامہ مقری نے مسجد کے ستونوں کی تعداد ایک ہزار چار سو نو ستون نقل کی ہے ۔ یہ تمام ستون سنگِ مرمر، سنگِ سماق اور زبرجد کے تھے۔یہ زیادہ تر اندلس کی کانوں سے پتھر حاصل کر کے بنائے گئے تھے ۔ان ستونوں کو کہیں کہیں سونے اور چاندی کے جڑاؤ سے بھی سجادیا گیا تھا۔سنگِ مرمر کا کوئی رنگ سفید، نیلگوں، سرخ، سیاہ، سبز،رنگ برنگ کی ابریوں اور چتیوں والا ایسا نہ تھا جس کے ستون اس مسجد میں نہ لگائے گئے ہوں۔شہنشاہ لیو چہارم نے امیر عبدالرحمٰن کو کئی ہزار من بلور، رنگین پتھر اور نگینے اس مسجد میں استعمال کے لیے تحفے کے طور پر بھیجے تھے۔ستونوں کی طرح محرابوں میں بھی دو تین رنگ کا پتھر لگایا گیا تاکہ ان کی خوب صورتی بڑھ جائے۔المنصور نے اپنے دور میں مسجد میں جو توسیع کی اس میں ہر جگہ

سنگِ مرمر پر طلائی کام بنوایا جس سے یہ حصہ حسن وخوب صورتی میں پہلے تمام اضافوں سے بڑھ گیا۔مسجد کا تمام فرش سفید پتھر کا تھاجس کے ساتھ ستونوں اور محرابوں کی کثرت اور ان پر سونے کی میناکاری اور جواہرات کی پچی کاری دیکھنے والے کو مزید ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ایک یورپی مصنف نے اس منظر کو ایک دلفریب نخلستان سے تشبیہ دی ہے جس میں کھجوروں کے ہزارہا درخت کھڑے ہیں مگر ان کے سیدھے تنوں اور پھیلی ہوئی شاخوں کو کسی ساحر نے اپنے سحر سے سخت پتھر کا بنادیا ہے۔

مسجد کی تمام توسیعات کے بعداس کے دروازوں کی تعداد اکیس ہوگئی۔نو دروازے مغرب کی طرف تھے اور نو مشرق کی طرف جن میں سے ہر طرف آٹھ آٹھ دروازے مردوں کے داخلے کے لیے اور ایک ایک دروازہ عورتوں کے داخلے کے لیے مختص تھا۔باقی تین دروازے شمال کی طرف تھے جن میں سے دو مردوں کے لیے اور ایک چھوٹا دروازہ عورتوں کے لیے تھا۔مسجد کا قبلہ رخ جنوب میں آتا تھا۔اس طرف صرف ایک دروازہ تھا جس سے بادشاہ مقصورہ میں داخل ہوکر نماز ادا کرتے تھے۔یہ دروازہ اکیس کی تعداد میں شامل نہیں تھا۔ان تمام دروازوں کے کواڑوں پر صیقل کیے ہوئے پیتل کی چادریں چڑھی تھیں البتہ مقصورہ والے دروازے کے کواڑ سونے کے تھے۔یہ دروازے ہر وقت شعلوں کی طرح چمکتے رہتے تھے۔

مسجد کا طول وعرض

نفح الطیب کی عبارت کے مطابق آخری توسیع کے بعد مسجد کے **اندرونی حصہ** کا طول ۳۳۰ ذراع (تقریباً پانچ سو ساڑھے ستترفٹ) اور عرض ۱۸۵ذراع(تین سو تیئیس فٹ)ہوگیا۔بعض تواریخ میں یہ عرض ۲۳۶ذراع بھی مذکور ہے۔صحنِ مسجد کا طول شرقاً غرباً ۱۲۸ذراع (۲۲۳فٹ) اورعرض شمالاً جنوباً ۱۰۵ذراع(تقریباً ایک سوچوراسی فٹ)ذکرکیاگیاہے۔قبلہ کی سمت کو چھوڑ کرصحن کے تین طرف دالان بنائے گئے تھے، ان کا عرض دس ذراع (ساڑھے بارہ فٹ) اور چاردیواری کارقبہ ۳۳۱۵مربع ذراع بیان ہوا ہے۔انسائکلو پیڈیا بریٹانیکا میں پوری بنی ہوئی مسجد کاطول ۵۷۰فٹ اورعرض ۴۲۵فٹ ہے۔اس رقبہ میں غالباً دوتہائی حصہ سمتِ قبلہ کے دالانوں کا اور باقی ماندہ ایک تہائی مسجد کے صحن، صحن کے تینوں طرف کے دالانوں اورمسجد کے مینارکاہے۔شاید مسجد کی موجودہ حالت کی یہی پیمائش زیادہ صحیح ہے۔مسجدکاکل رقبہ تینتیس ہزار ایک سوپچاس مربع ذراع تھا۔بعض تاریخوں میں مذکور ہے کہ اس کی چھت میں تین سوساٹھ طاق اس ترتیب سے بنائے گئے تھے کہ سورج اپنی سال بھر کی گردش میں ہر روز ایک طاق میں داخل ہوتا تھا(1)۔

ا۔ نفح الطیب، ابواب متفرقۃ، تاریخی جغرافیہ ص ۳۷۴

مسجد میں روشنی کا انتظام

رات کے وقت مسجد میں پیتل کے دوسو اسّی فانوس روشن ہوتے تھے۔ دروازوں کے اندر جلائے جانے والے جھاڑ اس کے علاوہ تھے۔ان کے اندر جلائے جانے والے چراغوں کی کل تعداد دس ہزار آٹھ سو پانچ تھی۔ ان چراغوں کے لیے تیل کا سالانہ خرچ ۲۵۱،۱/۴ قنطار یعنی ۳۱۴ من کے قریب تھا۔پیتل سے بنے انواع واقسام کے فانوسوں میں چاندی کے تین بڑے فانوس بھی تھے۔ان بڑے جھاڑوں میں نونو سیر تیل رات بھر میں جل جاتا تھا اسی طرح چار بڑے جھاڑ صرف مسجد کے محراب سے متصل حصے میں تھے۔سب سے بڑا فانوس محراب کے کمرے میں تھاجس کا گھیراؤ ساڑھے بارہ گز کے قریب تھااور اس میں ایک ہزار چار سو چون چراغ تھے۔اس پورے فانوس پر سونے کا ملمع تھا۔رمضان المبارک میں مسجد میں روشنی کا خاص اہتمام ہوتا تھااس لیے تیل کی مذکورہ مقدار میں سے نصف سے کچھ کم صرف رمضان میں خرچ ہوجاتا تھا۔بڑے جھاڑ صرف رمضان المبارک کے آخری عشرے میں روشن کیے جاتے تھے۔ تیل کے اس خرچ کے علاوہ مسجد میں موم بتیاں بھی روشن کی جاتی تھیں ۔سال بھرمیں ساڑھے تین من موم اور ساڑھے چونتیس سیرسوت موم بتیاں بنانے میں صرف ہوتا تھا۔سب سے بڑی موم بتی جو محراب کے اندر امام کے قریب روشن کی جاتی تھی اس کاوزن پچیس سے تیس سیر تک ہوتا تھا۔یہ رمضان کا پورا مہینہ رات دن روشن رہتی تھی اور اس اندازے سے بنائی جاتی تھی کہ عید کی رات کوختم ہوجائے ۔ہر جمعہ کو مسجد میں آدھا سیرعود اور پاؤ بھرعنبر جلایا جاتا تھا-اسی طرح رمضان کے آخری دن آدھ پاؤ لوبان اور پاؤ بھرعود مسجد میں جلایاجاتا تھا۔ابن بشکوال نے بیان کیا ہے کہ خلفاء قرطبہ کے دور میں اس مسجد کے ائمہ، موذنین، قراء، محافظین، روشنی کرنے والوں اور دیگر خدام کی تعداد ۳۰۰ تھی[1]۔

رفاہِ عامہ اور شہری سہولیات

مسلمانوں نے اپنے دورِحکومت میں پورے اندلس ہی کو زندگی کی ہر شعبے میں اس قدر ترقی دی تھی کہ وہ واقعی وادیٔ جنت نظیر کہلانے کا حق دار تھا۔قرطبہ چوں کہ کم وبیش پانچ سوسال تک ان کا دارالحکومت رہا اس لیے اسے تعمیروترقی سے جو حصہ ملا وہ بھی سب شہروں سے ممتاز تھا۔وہاں کے باغات ، سیر گاہیں اورمحلات بے مثال تھے ۔ وہاں کے خوب صورت محلات پرفضا باغات کے اندر بنائے گئے تھے۔قرطبہ میں دریائے الوادی الکبر کا پل بھی اندلس کے عجائبات میں سے ہے۔ اس کی سترہ محرابیں ہیں اور ہر محراب پچاس ہاتھ چوڑی ہے۔ان محرابوں

۱۔　نفح الطيب ج ١ عبد الرحمن بن الحكم ، ج٢ من رسائل لسان الدين الخطيب،جامع قرطبة ، مسجد قرطبة، اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ٣٦٠- ٣٧٥

کے درمیان پایوں کی چوڑائی بھی اسی قدر ہے۔ مسلم حکمرانوں نے اپنے اپنے وقت کی ضروریات کے مطابق اس میں ترمیم وتوسیع کا کام کیا جن کے ذوقِ تعمیر کے عمدہ نشان، آج بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔ اس پل کے علاوہ دریا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ ایک پختہ سڑک بنائی گئی تھی جسے ''الرصیف'' کہا جاتا تھا۔ شہر کے شمالی جانب باب اشبیلیہ یا باب العطارین کے قریب ایک بہت بڑا بازار تھا اور اسی طرح کا ایک اور بازار مشرقی سمت میں مسجد اور رصیف کے درمیان میں تھا۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں اس انداز سے بنائی گئی تھیں کہ آج کی ترقی یافتہ دنیا ان کے تصور سے حیران ہے۔ ان کے علاوہ جابجا سرائیں، حمام اور دکانیں بنائی گئی تھیں۔ ایک وقت میں صرف قرطبہ کی دکانوں کی تعداد ۸۰۴۰۰ (اسی ہزار چار سو)، بازاروں کا شمار ۴۳۰۰ (چار ہزار تین سو) اور شہر کے اندر باہر حماموں کی تعداد ۷۰۰ بیان ہوئی ہے[1]۔

عوامی مہمان خانہ / دارالصدقہ

مسجد کے غرب کی طرف المستنصر باللہ نے ایک دارالصدقہ بنوایا تھا۔ یہاں ایسے مفلس نوواردوں کے لیے جو شہر میں راستہ بھول جاتے یا تھے یا گزارے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ رہتا تھا، کھانے پینے، رہنے سہنے اور ہر قسم کا ضروری سامان اس کثیر سرمایہ سے مہیا کیا جاتا تھا جو خلیفہ نے اس کام کے لیے منظور فرما رکھا تھا[2]۔

آب رسانی یا واٹر سپلائی کا نظام

خلفاءِ بنی امیہ نے اپنے دور میں طرح طرح کی عجائبات تخلیق کیں: اپنے محلات، جامع مسجد اور دیگر اہم مقامات میں آب رسانی کے لیے وہ جبالِ قرطبہ سے میٹھے پانی کی نہریں کاٹ کر محل میں لائے اور پھر ان نہروں کا پانی جست کے نلوں میں جاری کر کے شہر کے چپے چپے کو شاداب کیا۔ انہیں نلوں سے یہ پانی ایک حوض سے دوسرے حوض میں منتقل ہوتا۔ یہ حوض مختلف مقامات پر کہیں خالص سونے، کہیں سچی چاندی اور کہیں پیتل کے چمک دار پتروں سے تیار کیے گئے تھے۔ پھر یہی پانی ان حوضوں سے گزرتا گزرتا بڑی پر فضا جھیلوں اور خوش نما تالابوں میں جمع ہو جاتا تھا۔ اس پورے سفر میں جابجا نہایت صاف شفاف یونانی سنگِ مرمر سے فوارے بنائے گئے تھے جن میں اچھلتا کودتا یہ پانی شاداں و رقصاں اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتا تھا۔ ان فواروں میں سے ایک کو خاص اونچائی میں تعمیر کیا گیا تھا جس سے اڑتی پانی کی دھاریں اور فواریں اس قدر بلند جاتی تھیں کہ اس کی مثال

۱۔ قرطبة في العصر الإسلامي ص ۱۸۵، تاریخی جغرافیہ ص ۳۵۸

۲۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۶۸

مشرق ومغرب میں کہیں نہیں ملتی تھی۔ جامع قرطبہ میں پہلے ایک وضوخانہ تھا، خلیفہ الحکم مستنصر باللہ نے وضو کے چار حوض مزید بنوائے جن میں دو بڑے وضوخانے مردوں کے لیے مسجد کے شمال مغربی گوشے میں تھے اور دو چھوٹے عورتوں کے لیے مسجد کے شمال مشرقی گوشے میں تھے۔ نئے وضوخانے میں شیریں اور عمدہ پانی کے لیے ایک نئی اور پختہ نہر جبل قرطبہ کو کاٹ کر مسجد تک لائی گئی جس کا پانی رات دن جاری رہتا تھا۔ یہ پانی مسجد کی ضرورتوں کو پورا کرنے اور مسجد میں پتھر کے دو بڑے حوضوں کو بھرنے کے بعد تین زمین دوز نالیوں کے ذریعے مسجد کی شمالی، مغربی اور مشرقی سمتوں سے مسجد کے باہر تک آتا تھا۔ یہ دونوں حوض جبلِ قرطبہ کے اوپر ہی سنگِ مرمر کے دو بڑے سالم ٹکڑوں سے سنگتراشوں نے تیار کیے تھے اور پھر خاص انتظامات کر کے سینکڑوں باربردار جانور لگا کر کئی دنوں میں انہیں مسجد تک لایا گیا تھا۔ قرطبہ کے قریب ایک گاؤں کے لوگ اب تک پہاڑوں میں وہ جگہ بتاتے ہیں جہاں خلیفہ کے حکم سے یہ حوض تیار کیے گئے تھے[1]۔

تعلیمی ادارے

مختلف ادوار میں قرطبہ میں مساجد کی تعداد مختلف رہی ہے جو زیادہ سے زیادہ ۳۸۷۷ (تین ہزار آٹھ سو ستتر) بتائی گئی ہے۔ ان میں چھوٹی بڑی سب مساجد شامل ہیں۔ قرطبہ میں تعمیرِ مساجد کا یہ عالم تھا کہ کوئی شاہی محل، کوئی باغ، کوئی محلہ اور کوئی قبرستان مسجد سے خالی نہیں تھا۔ بعض اوقات مقامی ضرورت کے مطابق ایک ایک جگہ میں قریب قریب دو دو مساجد بنائی جاتی تھیں۔ اندلس کی مساجد کا دائرہ کار صرف نماز اور اقامتِ شعائر ہی تک محدود نہ تھا بلکہ ہر مسجد اپنی وسعت، مرکزیت اور شیخِ مسجد یا خطیب کے لحاظ سے ایک مدرسہ، دارالعلوم یا یونیورسٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ علم کی اشاعت اور تعلیم و تعلم میں یہ امتِ مسلمہ کا عام مزاج تھا اور اہلِ اندلس نے اس مزاج کا خوب مظاہرہ کیا۔ قرطبہ کو بحیثیت مرکز اس میں نمایاں مقام حاصل رہا۔ اس عمومی مزاج کی بنا پر حکام وخلفاء اس عمومی نظام تعلیم کی خوب سرپرستی کرتے تھے اور امراء واشراف علمِ دین سیکھنے میں نمایاں رہتے تھے۔ جو جتنا بڑا عالم ہوتا اس کی اتنی زیادہ تعلیمی قابلیت مانی جاتی۔ اس کے ساتھ ساتھ قرطبہ کے حکام نے اگرچہ ''تعلیم سب کے لیے'' کا نعرہ تو نہیں لگایا مگر عملی طور پر اس کا مربوط اور سنجیدہ (Fool Proof) انتظام کیا۔ خلیفہ حکم المستنصر باللہ نے ۳۵۶ھ/ ۹۶۷ء میں غرباء کے بچوں کے لیے **ستائیس مدارس** قائم کیے جن میں سرکاری خرچ پر مدرسین کا انتظام کیا اور ان کی تنخواہیں مقرر کیں۔ ہر مدرس سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ محنت سے کام کرے گا، خیرخواہی کو اپنا وطیرہ بنائے گا اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو پیشِ نظر رکھے گا۔ ان ستائیس مدارس میں سے جامع مسجد کے

۱۔ تاریخی جغرافیہ ص ۳۵۳، ۳۶۷

ساتھ ملحق تین مدارس تھے اور باقی شہر کے ہر محلے میں ایک ایک مدرسہ تھا[1]۔

تعلیمی اداروں کا یہ سلسلہ اموی خلیفہ حکم المستنصر باللہ کی اس کوشش پر ختم نہیں ہوگیا بلکہ ہر آنے والی حکومت نے اس کو اور آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر قصی زلط اس سلسلہ میں اپنی تحقیق کا نتیجہ یوں بیان کرتے ہیں :معلوم ہوتا ہے ان تعلیمی حلقات کے ساتھ ساتھ وہاں باقاعدہ تعلیمی ادارے بھی تھے۔ مذکورہ حلقات اور یہ ادارے دونوں ہی ہمارے دور کی جامعات کی طرح تھے اسی لیے عام طور پر شہروں میں بنائے جاتے تھے ۔ دیہاتوں اور مضافات میں اسی طرح کے حلقات کے ساتھ ساتھ ایسے ادارے تھے جو ہمارے دور کے پرائمری اور سیکنڈری سکولوں کی طرح تھے۔ پروفیسر کرد علی اپنی کتاب ''الإسلام والحضارة العربية'' میں لکھتے ہیں :اہلِ اندلس نے ہرسو مدارس اور کتب خانے قائم کیے ۔انہوں نے شہروں میں یونیورسٹیاں قائم کیں جوایک لمبے زمانے تک پورے یورپ میں تعلیم کے منفرد ادارے شمار ہوتے رہے۔ ڈاکٹر جودت رکابی کہتے ہیں:خلفاء موحدین کے زمانے میں مغرب اور اندلس میں تعلیمی ادارے خوب پھولے پھلے ۔اندلس کے یہ تعلیمی ادارے اشبیلیہ ، قرطبہ، غرناطہ، بلنسیہ اور مرسیہ میں تھے۔ان میں تعلیم حاصل کرنے ہر سمت سے لوگ آیا کرتے تھے[2]۔

نصابِ تعلیم اور شرح خواندگی

جہاں تک ابتدائی تعلیمی نصاب کا تعلق ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لغتِ عرب (شعر، نثر اور لغت وغیرہ) اور قرآنِ مجید ساتھ ساتھ تھے۔اس کی تائید اہلِ اندلس کے منفرد نصابِ تعلیم سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لوگ دوسرے علاقوں میں طریقۂ تعلیم کے برعکس ابتدائی درجات کے طلبہ کو قرآنِ مجید اور لغت وادب ساتھ ساتھ پڑھاتے تھے۔ علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ) نے قاضی ابوبکر ابن العربیؒ (م ۵۴۳ ھ) کی طرف سے اس نظامِ تعلیم پر تنقید نقل کی ہے کہ ان کے خیال میں بچوں کو پہلے شعروادب سکھایا جائے اوراس کے بعد قرآنِ مجید پڑھایا جائے تاکہ ان کے لیے سمجھنا آسان ہو ۔ابن خلدونؒ نے ابن العربیؒ کی رائے کی بنیادی طور پر تائید کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس طریقِ تعلیم میں یہ خطرہ ضرور رہے گا کہ شعر وادب پڑھتے پڑھتے بچوں کے ذہن اسی میں پختہ ہوجائیں اور وہ بعد میں قرآنِ مجید پڑھنے کے لیے تیار ہی نہ ہوں[3]۔

امام قرطبیؒ نے سورۂ آل عمران میں ارشاد باری تعالیٰ : ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتًا

۱۔ قرطبة في العصر الإسلامي ص ۱۸۶

۲۔ القرطبي ومنهجه في التفسير ص ۱۰

۳۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۵۳۸

"......الخ﴾[1] کے تحت ۶۲۷ھ میں اپنی ابتدائی تعلیمی دور کے ایک شیخ ابن ابی حجہؒ (م ۶۴۳ھ / ۱۲۴۵ء) کا ذکر کیا ہے جنہیں انہوں نے "شیخنا المقرئ" کہا ہے جس سے اس ابتدائی نصابِ تعلیم کی تائید ہوتی ہے۔خیرالدین زرکلی نے ابن ابی حجہ کے تعارف میں لکھاہے :"فاضل من أهل قرطبة.تصدّر لإقراء القرآن وتعليم العربية" (قرطبہ کے فضلاء میں سے تھے۔انہوں نے قرآنِ مجید اور لغتِ عرب کی تعلیم کے لیے اپنے آپ کو وقف کیاہوا تھا)[2]۔ڈاکٹر طفیل ہاشمی لکھتے ہیں:اسلامی عہد میں سپین میں تعلیم عام ہوگئی تھی اور تعلیم کے مختلف درجات تھے۔ پرائمری سطح پر قرآن حکیم،عربی زبان کے منتخب ادب پارے،خطوط نویسی، انشاء پردازی اور عربی گرائمر کی تعلیم دی جاتی تھی۔سپین کی ہر بڑی بستی میں کئی بڑے مدارس تھے جن میں ثانوی تعلیم کا انتظام تھا[3]۔

قرطبہ کے نصابِ تعلیم کا ایک عمومی خاکہ پروفیسرڈوزی کی نظرمیں یوں ہے:اس شہر میں ہر قسم کے علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی تھی ۔اعلیٰ درجہ کے ابتدائی مدارس بکثرت موجود تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسیحی یورپ میں سوائے پادریوں یاایسے لوگوں کے جوحکومت میں بڑے عہدے رکھتے تھے ، سب ناخواندہ ہوتے تھے لیکن اندلس کے مسلمانوں میں تقریباً ہر متنفس پڑھا لکھاتھا۔نحو، معانی وبیان کی تعلیم تمام مدارس میں ہوتی تھی[4]۔

تاریخ اندلس کے مزید مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں عمومی تعلیم (General Education) تو دینی اور عربی علوم ہی تھے ۔ان میں عمومی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم یا تخصص(Specialization) کا نظام بھی رائج تھا جیساکہ ایک مشہور قاضی اور مذہب امام مالکؒ کے ممتاز فقیہ کے تعارف میں ابن العماد الحنبلی لکھتے ہیں: ابوالحسن بن قطرال علی بن عبداللہ بن محمد الانصاری القرطبیؒ(م ربیع الاول ۶۵۱ھ) عبدالحق بن توبہ اور ابوالقسم بن الشراط کے شاگردوں میں سے تھے ۔علی بن ابی العباس بن مصا کے ساتھ ان کا مناظرہ بھی ہوا۔انہوں نے عربی پڑھی۔ پھر کچھ عرصہ قرطبہ میں منصب قضاء پرفائز رہے۔انہیں کئی علوم پر عبور حاصل تھامگر بلاغت کے میدان میں خاص طور پر ممتاز تھے[5]۔ اسی طرح قرطبہ میں پڑھائے جانے والے علوم کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ لوگ زیادہ تر وہاں فقہ کا علم حاصل کرنے آتے تھے[6]۔

قرطبہ میں بھی دیگر مسلم ممالک کی طرح لفظِ علم سے مراد تو دینی علوم ہی لیے جاتے تھے مگرصنعت یا اضافی قابلیت کے طور پر فلسفہ،طب ، فلکیات اور دیگر سائنسی علوم بھی بہت عام تھے ۔

۱۔ تفسیر قرطبی ، آل عمران : ۱۶۹- ۱۷۰
۲۔ اعلام الزرکلی ۱:۲۱۹
۳۔ مسلمانوں کے سائنسی کارنامے / ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی ص ۸۷
۴۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۸۳
۵۔ شذرات الذھب ج۵
۶۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۸۴

اساتذہ کا معیار

قرطبہ کا دارالعلوم دنیامیں سب سے زیادہ مشہور تھا۔اساتذہ جامع قرطبہ میں بیٹھ کر طلبہ کو پڑھاتے تھے۔ یہاں علامہ ابوبکر بن معاویہ القریشی حدیث کا درس دیتے تھے۔علامہ ابوعلی القالی البغدادی ایام جاہلیت (قدیم باشندگانِ عرب کے حالات ، ان کی زبان اور شاعری) پر خطبے دیتے تھے۔انہی خطبوں کا مجموعہ بعد میں ''امالی القالی'' کے نام سے شائع ہوا۔یہیں ابن القوطیہ نحو پڑھاتے تھے۔علامہ ابوعلی القالی کہتے تھے : اندلس میں ابن القوطیہ سے بڑا کوئی نحوی نہیں ہے۔اس کے علاوہ دیگر علوم کا درس دینے والے بھی اپنے زمانہ کے مشہور لوگوں میں سے تھے۔ طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہوتی تھی اور لوگ زیادہ تر قرطبہ میں فقہ میں تخصص کے لیے آتے تھے کیوں کہ اس زمانہ میں عظیم مناصب کے حصول کے لیے قابلیت (Qualification) اسی کو شمار کیا جاتا تھا(۱)۔

حَکَم ثانی کے عہد میں جامعہ قرطبہ کو جو عبدالرحمٰن ثالث کی بنائی ہوئی مسجد میں قائم کی گئی تھی دنیا کے تعلیمی اداروں میں نمایاں مقام حاصل ہوگیا تھا۔ یہ جامعہ ، قاہرہ کی جامعہ ازہر اور بغداد کی جامعہ نظامیہ دونوں سے شہرت میں سبقت لے گئی تھی ۔ یہاں نہ صرف سپین کے مسلمان، نصرانی اور یہودی طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے بلکہ یورپ ، ایشیا اورافریقہ سے بھی تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھانے کے لیے یہاں آتے تھے (۲)۔

یونیورسٹی کا دارالاقامہ(Hostel)

مسجد کے عالیشان مغربی دروازے کے سامنے کئی عمارتیں ضرورت مندوں کے قیام کے لیے بنوادی گئی تھیں۔قرطبہ کا ایک مشہور شاعر احمد بن خالد کافی عرصہ تک ان مکانات میں مقیم رہا۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقام بالخصوص تنگدست طلبہ اور علماء کے لیے تھا جو اندلس کے مختلف اضلاع سے فقہ پڑھنے کے لیے قرطبہ میں آتے تھے ۔بڑے درجہ کے ادباء، شعراء ،خطباء اور مؤرخین کو بھی یہاں سکونت کی اجازت تھی۔ یہاں ان لوگوں کی بہت خاطر مدارات کی جاتی تھی ۔علماء اور طلبہ کے لیے کھانا اور دیگر ضروریات یہیں مہیا کی جاتی تھیں اور اس کے علاوہ وظیفہ کے طور پر کچھ رقم بھی دی جاتی تھی۔باقی لوگوں کو خزانہ سے ان کی لیاقت کے مطابق وظیفہ دیا جاتا تھا۔ خلیفہ المستنصر باللہ نے ان مکانات اور مسجد کے اضافوں میں جو رقم خرچ کی اس کی نسبت علامہ مقری نے ابن حیان سے نقل کیا ہے کہ وہ ایک لاکھ انسٹھ ہزار دینار سرخ تھی (۳)۔

۱۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۸۴

۲۔ مسلمانوں کے سائنسی کارنامے ص ۸۷-۸۸

۳۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۶۸

اہل قرطبہ کا ذوقِ علم اور کتب کی فراوانی

اہلِ قرطبہ بڑے خلیق و شائستہ ہوتے تھے۔ ان کی خوبیوں میں جو باتیں شمار ہوئی ہیں ان میں لباس کی عمدگی و خوشنمائی، تراش وخراش، دینداری کا اظہار، نماز روزہ کی پابندی اور جامع مسجد کی تعظیم تھی۔ سپاہیانہ فنون اور علوم میں ان کو کمال حاصل تھا۔ تمام بلاد اندلس میں قرطبہ کے شہر میں سب سے زیادہ کتابیں جمع تھیں۔ کتب خانے رکھنے کو یہاں کے لوگ شانِ ریاست سمجھتے تھے۔ بہت سے رئیس ایسے تھے جن کے پاس زیادہ علم تو نہ تھا لیکن وہ اس پر فخر کرتے تھے کہ اُن کے گھر میں کتب خانہ ہے۔ رئیسوں کا تذکرہ بھی ہر رئیس کے کتب خانہ کے لحاظ سے ہوتا تھا۔ ہیرے جواہرات خریدنے کی بجائے عمدہ کتب خریدنے پر لوگوں کی مشہوری ہوتی تھی۔ قرطبہ کے تمام خلفاء علم کے بہت قدر دان تھے مگر خلیفہ الحکم ثانی مستنصر باللہ کا کتب خانہ بھی عجائب روزگار میں سے تھا۔ وہ خود بھی علامہ اور اہل علم کے بہت بڑے قدردان تھے جس کی وجہ سے دربارِ خلافت میں علماء بکثرت جمع ہو گئے تھے۔ سپین میں کوئی بادشاہ ان کے الحکم کے پائے کا ماہرِ علوم وفنون نہیں گزرا۔ انہوں نے اور ان کے بھائی امیر عبداللہ بن عبدالرحمٰن الناصر نے اپنے والد کی زندگی میں اپنی اپنی لائبریریاں قائم کی تھیں۔ خلیفہ الحکم نے ان کو ملا کر شاہی لائبریری قرار دے دیا اور اس کو مزید اس قدر ترقی دی کہ ان کے کتب خانے میں چار لاکھ کتابیں جمع ہوگئیں۔ ان کی طرف سے کثیر تعداد میں اہل کار صرف اس مقصد کے لیے مختلف ممالک کے سفر پر مامور تھے کہ جو کتاب منظرِ عام پر آئے، سب سے پہلے اسے حاصل کر کے قرطبہ پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ خود خلیفہ کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ ہر نئی کتاب کا سب سے پہلے مطالعہ کرنا ان کی ترجیحات میں شامل تھا۔ اس کتب خانہ میں کئی شعبے تھے۔ **انتظامی شعبہ** میں کتب خانہ کے کئی طرح کے ملازمین تھے۔ مؤلفین، مترجمین، کتب ساز جس میں لکھائی کرنے والے، پروف پڑھنے والے، جلد کرنے والے اور تزئین وآرائش والے، فنی پہلوؤں سے کتب خانہ کی دیکھ بھال اور خدمت کرنے والے، محافظین، کتب بردار اور صفائی وترتیب کے منتظمین شامل تھے۔ **شعبۂ ترجمہ** میں مختلف زبانوں خصوصاً یونانی اور لاطینی میں تصنیف شدہ مختلف علوم وفنون خصوصا طب، ہندسہ، فلک اور دیگر سائنسی علوم کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیا جاتا تھا۔ اس شعبہ میں کام کرنے کے لیے اجنبی لغات اور فنون کا بیک وقت ماہر ہونا ضروری تھا۔ اس میں خدمات سرانجام دینے والے حضرات میں عبداللہ الصقلی، محمد النباتی، محمد بن سعید، عبدالرحمٰن بن اسحاق بن الہیثم وغیرہ کے نام ملتے ہیں۔ اس کتب خانہ کا تیسرا شعبہ **تحقیق وتالیف** کا تھا جس میں مختلف علمی موضوعات کے ماہر علماء جماعتوں کی صورت میں کام کرتے تھے۔ بعض علماء کو اس مکتبہ کی طرف سے خاص موضوعات پر کتب تصنیف کرنے کا کام بھی سونپا جاتا تھا۔ اسی طرح کے کچھ منصوبے محمد بن الحارث الخشنی کو دیئے گئے تھے جن میں ''تاریخ قضاة قرطبة''، ''فضائل الإمام مالکؒ'' اور دیگر موضوعات شامل تھے۔ اس کتب خانہ میں ایک شعبہ

تدقیق و مراجعت کا بھی تھا۔ اس شعبہ میں مکتبہ کے لیے تصنیف یا ترجمہ کی جانے والی کتب کا بغور مطالعہ اور علمی یا املا کی اغلاط کی تصحیح یا کسی فنی خرابی کی نشان دہی تھا۔اس میں تمام علوم کے متخصص اور ممتاز علماء کرام خدمات سرانجام دیتے تھے۔ شیخ محمد بن یحییٰ بن عبد السلام الازدی، ابومحمد ابن ابی الحسن الفہری القرطبیؒ محمد بن معمر الجیانی اور دیگر مقتدر علماء خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔اس دور میں فراہمی کتب کے لیے بیرونی فضلاء کی خدمات بھی حاصل کی گئیں تھیں جن میں مصر کے ابن سابان،بغداد کے یعقوب الکندی اورمحمد بن طرحان زیادہ مشہور ہوئے۔قرطبہ کی شاہی اور نجی لائبریریوں کی بربادی کے بعد بھی بارہویں صدی عیسوی تک قرطبہ میں سپین کے دیگر شہروں کی بہ نسبت زیادہ کتابیں موجود تھیں[1]۔

قرطبہ کے مشہور علماء

قرطبہ پانچ سو سال سے زائد عرصہ تک علم اور علماء کا مرکز رہا ہے۔ وہاں کے تمام علماء کا ذکر تو شاید ناممکنات میں سے ہو مگر یہاں نمونہ کے طور پر چند مشہور علماء کا ذکر کیا جارہا ہے :علامۂ حدیث ابوالقاسم خلف بن القاسم المعروف ابن الدباغ الازدی القرطبیؒ(م۳۹۳ھ/ ۱۰۰۲ء)،محدث وفقیہ ابوعبدالملک احمد بن محمد بن عبدالبر (م۳۳۸ھ/۹۴۸ء) ،عظیم محدث ومؤرخ ابوبکر احمد بن محمد بن موسیٰ بن شبرالرازی الکنانی (م۳۴۴ھ/۹۰۶ء) ، امام الاندلس خالد بن سعید القرطبیؒ(م۳۵۲ھ/ ۹۶۳ء)، ابوبکر حسن بن الولید بن نصر(م چوتھی صدی ہجری)۔یہ بڑے فقیہ اور مسائلِ نحو کے علامہ تھے، ابوغالب حباب بن عباد الفرضی القرطبیؒ : علم الفرائض میں نابغۂ روزگار تھے، امام اہلِ ظاہر ابومحمد علی بن احمد بن سعید بن حزم (م۴۵۶ھ/ ۱۰۶۴ء)۔متعدد اموی خلفاء کے وزیر رہے مگر آخری عمر میں سارا وقت تصنیف وتالیف اور اشاعتِ علوم میں گزارا۔وہ بڑے مشہور فقیہ ، مؤرخ اور شاعر تھے، ابوبکر یحییٰ بن سعدون بن تمام الازدی القرطبیؒ (م ۵۶۷ھ/ ۱۱۷۱ء)بڑے ادیب، فاضل ،نحوولغت کے عالم اورعلمِ قراءت کے ماہر تھے،ابوالولید محمد بن احمد بن محمد بن رشد(م ۵۹۵ھ)کے والد اور دادا اپنے اپنے وقت میں قرطبہ کے قاضی رہے۔خود انہوں نے فقہ اور طب میں بہت اعلیٰ مقام پایااور ہمیشہ خلفاء و ملوک کے مقرب رہے ۔ان کی تصانیف آج تک بہت اہم سمجھی جاتی ہیں۔انہی کو اندلس کا سب سے بڑا فلسفی کہا جاتا ہے[2]۔

اندلس کے ایک شاعر نے قرطبہ کے بارے میں کہا ہے:

بأربعٍ فاقت الأمصارَ قرطبة　　　منهن قنطرة الوادي وجامعها

۱۔ مقالہ: مکتبۃ قرطبۃ،Rowad.al-islam.com/Rowad،مسلمانوں کے سائنسی کارنامے ص۸۳-۸۵،۸۶

۲۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص۳۸۴-۳۸۷

هاتان ثنتانِ والزهراء ثالثة والعلم أعظم شيئ وهورابعها[1]

چار چیزوں میں قرطبہ دوسرے شہروں سے بازی لے گیا۔ان میں سے ایک اس کے دریا کا پل ہے ،ایک اس کی جامع مسجد ہے ۔یہ دو ہوئے اور تیسرا قصرِ زہراء ہے ۔ان سب سے اعلیٰ وہاں کا علم ہے جوشمار میں چوتھا ہے ۔

قرطبہ میں سائنسی ترقی

مسلم سپین کے خلفاء میں عبدالرحمان ثانی(۸۲۲-۸۵۲ء) آرٹ اور تعمیرات کے دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ سائنس اور ادبیات کی بھی سرپرستی کرتے تھے۔انہوں نے عباس بن ناصح کو یونانی کتب سائنس کے عربی تراجم کی خریداری کے لیے عراق کے کتب فروشوں کے پاس بھی بھیجا۔لیکن سائنسی علوم کی حقیقی بنیاد عبدالرحمان الناصر(۹۱۲-۹۶۱ء)کے عہد میں پڑی۔اندلس کے اطباء نے علمِ طب کے مختلف شعبوں میں کارنامے سرانجام دیئے جن میں نبض اور قارورہ کے ذریعے تشخیصِ امراض،عورتوں اور بچوں کے مخصوص امراض، تشریح وجراحت (Surgury) ، طب العیون(آنکھوں کا علاج)،بخار، چیچک ، متعدی امراض کے تدارک اور دواسازی میں نمایاں ترقی کی۔ انہوں نے علمِ ریاضیات،علمِ کیمیا ،علمِ نباتات و زراعت،علمِ جغرافیہ کو اپنے ہاں رواج دیااور خوب ترقی دی۔ یہاں کے مشہور اطباء میں قرطبہ کے خالد بن یزید بن رومان،ماہر تاریخ وطب عریب بن سعد(م بعد۹۶۴ء)، ابوداود سلیمان بن حصاب بن جلجل(بعد ۳۸۴ھ/ بعد۹۹۴ء)،یہودی طبیب اور عبدالرحمٰن الناصر وحکم الثانی کا وزیر ابویوسف حسدائی بن اسحاق(م ۹۷۰یا۹۹۰ء)، ابوالقاسم الزہراوی(م ۴۰۴ھ/ ۱۰۱۳ء) ابوالعلاء زہربن ابومروان (م۵۲۵ھ/ ۱۱۳۰ء) ، ان کا بیٹا ابومروانعبدالملک بن زہر(۵۵۷ھ/ ۱۱۶۲ء)، اور ان کا فرزندابوبکر محمد بن عبدالملک بن زہر(م۵۹۵ھ/ ۱۱۹۹ء) اور قاضی ابوالولید محمد بن احمد بن رشد(۵۹۵ھ/ ۱۱۹۸ء)۔مسلم سپین کے سائنس دانوں نے علمِ ہیئت کو خاصی ترقی دی ،انہوں نے آلات رصد اسطرلاب وغیرہ کے کارخانے لگائے اورجداول فلکی میں مہارت حاصل کی ۔ہیئت میں ان کی تحقیقات کا خلاصہ یہ ہے : دسویں صدی عیسوی سے حسابات میں مماسہ کااستعمال،اجرام سماوی کی حرکات کی زیجیں مرتب کرنا،منطقۃ بروج کے زاویئے کی نہایت درست تحقیقات، استقبالِ معدل النہار کا ٹھیک معلوم کرنا،سب سے پہلے سال کی درست مدت قرار دینا،چاند کے زیادہ سے زیادہ ارتفاع کا اختلاف دریافت کرنا،حرکت القمر(چاند کے اس تیسرے اختلاف کومعلوم کرنا جو سورج کے

۱۔ نفح الطیب ، نبذة من قرطبة وشهرتها

فاصلہ سے پیدا ہوتا ہے)۔اس کا اکتشاف ۱۶۰۱ء میں ''ٹیکوبر'' کی طرف منسوب کیا جاتا ہے،مثلثات کی پیائش کے حساب میں مماسہ کا استعمال،اوجِ شمس کی حرکت اور اس کے فلک کا دیگر کواکب کے افلاک میں تداخل معلوم کرنا۔صرف قرطبہ کے ماہرینِ ہیئت میں ابوالقاسم مسلمہ المجریطی (یا المرجیطی)(م ۳۹۸ھ/ ۱۰۰۷ء)، ابوالقاسم احمد بن عبداللہ بن عمر ابن الصفار(م۴۳۵ھ / ۱۰۳۴ء)،ابوالحسن علی بن ابی الرجال الشیبانی(م بعد ۴۳۲ھ / ۱۰۴۰ء)،ابوالحسن ابراہیم بن یحییٰ الزرقالی (م۴۹۳ھ/ ۱۰۹۹ء)،ابومحمود جابر بن افلح (م ۵۴۰ھ/ ۱۱۴۵ء) کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ قرطبہ میں علمِ ریاضیات کا پہلا باقاعدہ عالم ابوعبیدہ مسلم بن احمد بن ابوعبیدہ البلنسی (م ۲۹۵ھ/ ۹۰۷ء) ہے اور اس کے بعد ریاضی دانوں کی ایک طویل فہرست ملتی ہے ۔ نباتات میں ابوعبید البکری(م ۴۸۷ھ/ ۱۰۹۴ء)شریف الادریسی　　(م۵۶۱ ھ/ ۱۱۶۶ء)، یوسف بن اسحاق بن کلارش، زراعت میں ابن بصال ، ابن حجاج اور ابن العوام وغیرہ۔ جغرافیہ میں اہلِ اندلس نے خوب کمال حاصل کیا ۔ان کے ہاں اس کے دو پہلو تھے ، ایک کو خالص جغرافیائی ادب کہا جاسکتا ہے جب کہ دوسرا پہلو سیاحوں کے سفرناموں پر مشتمل ہے ۔اس میدان میں قرطبہ کے علماء میں سے ابوعبید البکری(م ۴۸۷ھ/ ۱۰۹۴ء)،شریف الادریسی (م ۵۶۱ ھ/ ۱۱۶۶ء)اور ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ لسان الدین الخطیب (م ۷۷۶ھ/ ۱۳۷۴ء) قابلِ ذکر ہیں۔

صنعتی میدان میں اہلِ اندلس نے بہت کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ۔اہلِ قرطبہ کا بھی اس میں بڑا حصہ ہے۔میدانِ صنعت میں ایک چیز جس نے ذرائع نقل وحمل میں انقلاب بپا کیا وہ ہوائی جہاز کی ایجاد ہے ۔ اگرچہ جدید دنیا میں اس کام کا سہرا رائٹ برادرز (Right Brothers) کے سر سجایا جاتا ہے مگر سچ یہ ہے کہ اس سلسلہ کی سب سے پہلی کامیاب کوشش **قرطبہ** کے مسلم سائنس دان اور بنوامیہ کے غلام ابوالقاسم عباس بن فرناس (م ۲۷۴ھ/ ۸۸۷ء)نے خلیفہ عبدالرحمٰن الثانی بن عبدالحکم کے دور میں نویں صدی عیسوی میں کی۔اس نے پروں کی طرح کا ایک لباس بناکر پہنا ،جس کی مدد سے فضا میں دور تک اڑتا چلا گیا مگر آخر میں اترنے کی کوشش کرتے ہوئے گر پڑا اور اس کی کمر میں چوٹ آگئی ۔ یہ پہلا سائنس دان ہے جس نے فضاؤں کا سینہ چیر کر اڑان بھری[1] ۔

اندلس میں مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں رشد وہدایت اور تعمیر ترقی کی یہ ہلکی سی جھلک ہے۔

اس موضوع پر کئی قدیم وجدید مصنفین نے قلم آزمائی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ومعرفت کی دنیا میں خواہ اس کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہو یا دنیا کی زندگی سے مسلمانوں کا نمایاں کردار ہے مگر جب بھی انہوں نے ترقی کی اوجِ کمال پر پہنچ کر اپنے اصل مقصد کو چھوڑا ، بہت نقصان اٹھایا۔

۱۔　مسلمانوں کے سائنسی کارنامے ص ۹۴-۲۳۹ (خلاصہ)

سقوطِ قرطبہ

جب تک مسلمان دین کی اشاعت اور انسانیت کے وسیع تر مفاد کو مدنظر رکھ کر بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ان کے لیے ممالک کے راستے آسان کرتے اور خزانوں کے دہانے کھولتے گئے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

﴿وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِینَ آمَنُوا مِنکُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْأَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِینَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ لَھُمْ دِینَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِن بَعْدِ خَوْفِھِمْ أَمْنًا. یَعْبُدُونَنِی لَا یُشْرِکُونَ بِی شَیْئًا. وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَأُولٰئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُونَ﴾[النور ۲۴:۵۵]

تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ وعدہ کرتا ہے کہ انہیں زمین میں حکومت عطا کرے گا ،جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دے چکا ہے اور جس دین کو ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کی خاطر قوت دے گا اور ان کے خوف کے بعد اس کو امن میں تبدیل کردے گا بشرطیکہ میری عبادت کرتے رہیں ،کسی کو میرا شریک نہ بنائیں۔اور جو کوئی اس کے بعد بھی کفر کرے گا تو ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں ۔

اندلس میں بھی جب تک رضائے الٰہی مقصودِ زندگی رہی ترقیاں ملتی رہیں اور جب مقصود حصولِ جاہ ہوا تو آپس میں رقابتیں بڑھیں اور یہی جنتِ ارضی ان کے ہاتھوں سے چھن کر دیکھتے ہی دیکھتے برباد کردی گئی اور وہ کچھ بھی نہ کرسکے۔سقوطِ قرطبہ کے وقت بھی دولتِ اندلس پارہ پارہ ہوچکی تھی، سپین اور یورپ کی متحدہ افواج کے مقابلے میں موحدین کی شکست کے بعد بہت سے علاقوں پر غیر مسلم اتحادی افواج کا قبضہ ہوچکا تھا اور باقی ماندہ کو مسلم حکمرانوں نے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کردیا تھا۔قرطبہ اپنے آخری ایام میں محمد بن یوسف بن ہود کے زیرِ انتظام تھا۔قشتالوی بادشاہ فرڈیننڈ ثالث نے جب قرطبہ پر چڑھائی کی تو اس سے پہلے بنو احمر کے حکمران محمد بن یوسف کے ساتھ اس کا معاہدہ ہوچکا تھا اور ابنِ ہود اس وقت بلنسیہ میں تھا۔ حملے کی اطلاع پاکر وہ بڑی فوج کے ساتھ قرطبہ کی طرف روانہ ہوا مگر شہر کے قریب جاکر رک گیا اور آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی حالاں کہ مؤرخین نے لکھا ہے کہ بادشاہِ قشتالہ کے مقابلے میں ابنِ ہود کی افواج کی تعداد زیادہ تھی اور اگر وہ مقابلہ کرتا تو عیسائی لشکر کو ٹھیک ٹھاک سبق دے سکتا تھا مگر وہ کسی دھوکے میں آگیا اور ڈوبتے قرطبہ کو بچانے کی ہمت نہ کی ۔ایک روایت میں اس کی وجہ یہ بھی منقول ہے کہ ابن ہود کا ایک قریبی وزیر عیسائی تھا جس نے اسے دھوکے میں رکھا اور بتایا کہ بادشاہ فرڈیننڈ کے ساتھ بہت بڑا لشکر ہے اور اس کا مقابلہ کرنا آپ کے بس میں نہیں۔ چناں چہ اس نے وہاں سے حرکت نہ کی اور ۲۳ شوال ۶۳۳ھ / ۲۹ جولائی ۱۲۳۶ء کو پانچ سو سال سے زیادہ مدت تک اسلامی حکومت کی

شان وشوکت اور علوم ومعارف کا منفرد مرکز رہنے والا قرطبہ آناً فاناً لُٹ گیا، اس کی رونقیں غبار ہوگئیں اور شان وشوکت مٹی میں مل گئی۔ مجموعی طور پر مسلمانوں نے اس شہر پہ ۵۴۳ برس حکومت کی (۱)۔

ارشادِ باری تعالیٰ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ . وَاللهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾[البقرة۲: ۲۱۶] (تم پر قتال فرض کیا گیا ہے اس حال میں کہ وہ تم پر گراں ہے۔ لیکن کیا عجب کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور کیا عجب کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو اور وہ تمہارے حق میں خرابی کا سبب ہو۔ اور علم تو اللہ ہی رکھتا ہے اور تم علم نہیں رکھتے) کے تحت امام قرطبیؒ اس شکست اور خفت کا سبب یوں بیان کرتے ہیں: ابوعبیدہؒ کہتے ہیں: اس آیت کا معنی یہ ہے کہ شاید تم جہاد کے اندر پائی جانے والی مشقت کو ناپسند کرو حالاں کہ وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اس طرح کہ تم غالب آجاؤ، کامیاب ہوجاؤ، مالِ غنیمت حاصل کرو اور اجر کے مستحق قرار پاؤ۔ اور جو مرجائے اسے شہادت کا درجہ ملے۔ اور اس کے برعکس ہوسکتا ہے تم آرام طلبی کو پسند کرو اور جہاد چھوڑ دو حالاں کہ یہ تمہارے حق میں برا ہو کہ تم مغلوب ہوجاؤ اور ذلیل ہوجاؤ اور تمہاری حالت گئی گزری ہوجائے۔

میں کہتا ہوں (امام قرطبیؒ): یہ بات صحیح ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ یہی معاملہ ہمارے وطن اندلس میں ہوا کہ انہوں نے جہاد چھوڑ دیا، لڑائی سے بزدلی دکھائے اور راہِ فرار اختیار کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن ہمارے ملک پر قابض ہوگیا۔ اس نے کچھ لوگوں کو قیدی بنالیا، کچھ کو قتل کردیا، عورتوں کو باندیاں اور مردوں کو غلام بنالیا: ''إِنَّا لِلهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُون'' یہ اسی کا نتیجہ ہے جو ہمارے ہاتھوں نے کمایا اور جو کچھ ہم نے خود آگے بھیجا(۲)۔

یہی وہ رمزِ غریب ہے جو علامہ اقبالؒ نے قرطبہ میں جا کر پائی اور کہا:

آہ وہ مردانِ حق! وہ عربی شہسوار! حاملِ خُلقِ عظیم، صاحبِ صدق ویقیں

جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب سلطنتِ اہلِ دِل فقیری ہے شاہی نہیں!

اسلامی حکومت کے بعد جامع مسجد قرطبہ کی حالت

۶۳۳ھ یا ۶۳۴ھ میں قرطبہ پر قشتالیہ کے عیسائی بادشاہ فرڈینڈ ثالث کا قبضہ ہوا تو مسلمانوں پر فتح پانے کے صلہ میں اس کی قوم نے اس کو مسیح کا ولی مانا اور وہ ''سان فرڈینڈو'' کے لقب سے پکارا جانے لگا۔ اس کے

۱۔ مقالہ سقوط قرطبة: تآمر العدو والصديق، Islam On line

۲۔ تفسیرِ قرطبی ج ۳، البقرة۲: ۲۱۶

بعد اس نے حکم دیا کہ جامع مسجد قرطبہ کو (نعوذ باللہ) عیسائی مذہب کے لیے پاک کیا جائے۔ چناں چہ اسپین کے مشہور عیسائی معماروں نے اپنی مذہبی ضروریات کے لیے جس میں مسجد کی بے حرمتی بھی شامل تھی، اس کی صورت بگاڑنا شروع کی۔ جس کے مطابق مسجد کے اندر سب سے پہلا کابیلہ اسی بادشاہ کے مذہبی لقب "سان فرڈینڈو" کے نام سے بنایا گیا۔ پھر اسپین کے عیسائی امیروں اور رئیسوں نے اپنے خرچ سے اس خانۂ خدا کے اندر تثلیث پرستی کے لیے کلیسائی عمارتوں کی بھرمار کردی۔ اس پر مزید یہ کہ مسجد کی صورت کو مکمل طور پر تبدیل کرنے کے لیے عیسائیوں کی طرف سے چندہ کی ایک خطیر رقم جمع کر کے کلیسہ کی انجمنِ انتظامیہ کے سپرد کی گئی۔ انجمن نے اس مقصد کے لیے مشہور عیسائی معماروں اور انجینئروں کی خدمات حاصل کیں جس کے نتیجے میں مسجد کے احاطہ کے اندر توڑ پھوڑ کر کے بڑے بڑے نصرانی عابدوں اور زاہدوں کی یادگاریں قائم کی گئیں۔ شاید ہی نصرانی مذہب کے مشاہیر میں سے کوئی ہی اعلیٰ طبقہ کا راہب یا ولی بچا ہو جس کے نام کی کوئی قربان گاہ یا کابیلہ یا عزبہ یا ہیکل مسجد کے اندر تعمیر نہ کیا گیا ہو۔ مسجد کے دالانوں، حجروں اور صحن کے حجروں میں شنت کلیمنت، شنت انیز، شنت بارتولیمی، شنت یوحنا، شنت یاگو، شنت پبلو اور شنت بطرس کے نام کی قربان گاہیں بنادی گئیں۔ اس کے در و دیوار اور چھتوں کے حاشیوں پر جہاں جہاں آیات قرآنیہ لکھی ہوئی تھیں انہیں چھیل ڈالا گیا(۱)۔

جدید سپین کا قرطبہ

جنوبی سپین کی ریاست اندلوسیا میں واقع شہرِ قرطبہ وہاں کے صوبۂ قرطبہ کا صدر مقام ہے۔ صوبہ کا کل رقبہ تیرہ ہزار سات سو انسٹھ مربع کلو میٹر ہے جو ۷۵ میونسپلٹیوں (Municipalities) میں تقسیم ہے۔ اس کی کل آبادی ۲۰۰۲ء کی مردم شماری کے مطابق سات لاکھ اکہتر ہزار ایک سوائتیس نفوس ہے۔ اس میں اکتنازِ آبادی (Density) ۵۶ افراد فی مربع کلومیٹر ہے اور صوبہ کے ۴۰ فی صد لوگ اس کے صدر مقام میں رہتے ہیں۔ قرطبہ شہر کی آبادی ۲۰۰۴ء کی مردم شماری کے مطابق تقریباً تین لاکھ چھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس وقت یہ جدید نقشے کے مطابق بنا ہوا سپین کا ترقی پسند (Moderate) شہر ہے جس کی میئر ایک کمیونسٹ خاتون ہے(۲)۔ جدید دنیا میں سپین کے قرطبہ کے علاوہ ارجنٹینا، کولمبیا اور میکسیکو میں بھی اس نام کے شہر یا صوبے پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نیکاراگوا کی کرنسی کا نام بھی کوردوبا (Cordoba) ہے۔ امریکہ میں ان سب کا تلفظ (Cordova) کیا جاتا ہے(۳)۔

۱۔ اندلس کا تاریخی جغرافیہ ص ۳۷۵-۶۷۷

۲۔ Dhimmi Watch,April 19,2004;Cordoba Cathedral may see return of Muslims
Cordoba '·Encyclopaedia the free Dictionary.com

۳۔ encyclopedia.thefreedictionary.com/Cordoba

جدید قرطبہ کے مسلمان

انیس اپریل ۲۰۰۴ کے تازہ ترین مضامین کے مطابق قرطبہ نسبتاً غریب اور پس ماندہ علاقے میں واقع ہے۔ شہر کا قیمتی ترین ثقافتی ورثہ، صدیوں تک علم وثقافت کا مرکز اور ذکر و عبادت سے آباد رہنے والی جامع مسجد قرطبہ ہے۔ وہ ۶۳۳ھ میں بادشاہِ قشتالہ کے قبضے کے بعد سے بدستور رومن کیتھولک چرچ (Cathedral) ہے۔ ۱۹۷۳ء میں قرطبہ میں مسلم مسیحی مشترکہ کانفرنس ہوئی۔ اس موقع کی مناسبت سے مسلم مندوبین نے جامع قرطبہ میں نماز جمعہ ادا کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ مقامی حکومت نے حق میزبانی ادا کرتے ہوئے اس کی اجازت دے دی اور ۱۳ ستمبر ۱۹۷۳ء کو یہاں نماز جمعہ ادا کی گئی۔ شاید سقوطِ قرطبہ کے بعد یہ اپنی نوعیت کا پہلا موقع تھا اس لیے بہت جذباتی مناظر دیکھنے میں آئے۔ اجازت کی اطلاع ملتے ہی مراکش سے طیاروں کی پروازوں کا تانتا بندھ گیا اور مسلمان جوق در جوق قرطبہ پہنچنے لگے۔ سپین میں مسلم ممالک کے سفراء بھی آٹھ سو سال بعد اس کی زمیں پر بارگاہِ الٰہی میں جبینِ نیاز رکھنے آپہنچے[1]۔ اس وقت تک وہاں مقامی مسلم آبادی کا کہیں نشان نہیں ملتا تھا۔ وہاں احیاءِ اسلام کی ابتداء شاید ۱۹۷۶ء میں ہوئی جب شہرِ قرطبہ کے پانچ نوجوان داعیِ اسلام شیخ عبدالقادر الصوفی کی دعوت پر مسلمان ہوئے اور شیخ کی ہدایات کے مطابق دعوتِ دین کا بیڑا اٹھایا[2]۔ ان نوجوانوں کی محنت کی برکت سے صرف قرطبہ میں مسلمانوں کی تعداد پانچ سو ہوچکی ہے۔ پورے سپین میں اب یہ تعداد لاکھوں میں ہے۔ ان میں سے کچھ مسلمان تو شمالی افریقہ سے آکر یہاں مقیم ہوئے ہیں اور باقی سپینی نومسلم ہیں۔ جامع قرطبہ میں نماز پڑھنے کا شوق دیگر ممالک کے مسلمانوں کو تو تھا ہی، یہاں کے نومسلموں میں یہ شوق کئی گنا زیادہ ثابت ہوا۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کا اظہار کرتے رہے اور ملکی قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اس کی اجازت کے لیے تگ و دو بھی کرتے رہے مگر بہت کم ہی ان کو یہ سعادت حاصل ہوسکی۔ ایک مرتبہ طویل جدوجہد کے بعد بشپ آف اشبیلیہ کی طرف سے اجازت مل گئی تو ۱۹۸۰ء میں عید الاضحیٰ کی نماز جامع مسجد میں ادا کی گئی۔ اس پر پوپ کے براہِ راست احکامات صادر ہوئے اور آئندہ ایسی کسی اجازت کو سختی سے روک دیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں جامع مسجد کو عالمی ورثہ قرار دے دیا گیا۔ ۲-۳ مارچ ۲۰۰۲ء میں قرطبہ میں مسلم خواتین کانفرنس ہوئی جس کے پندرہ بیس شرکاء جامع مسجد گئے اور باقاعدہ اجازت کے بغیر وہاں نماز پڑھنے کی کوشش کی۔ مسجد کے ایک سوگارڈ ان پر ٹوٹ پڑے اور زائرین کو زدوکوب کیا۔ اس میں کئی لوگ زخمی ہوئے اور کئی خواتین کو سخت چوٹیں آئیں[3]۔ اپریل ۲۰۰۴ء میں مسلمانوں نے ویٹی کن

۱۔ آرٹیکل: "بحث عن جامع قرطبة"/احمد ناصر بالعبید، yoogee.com/search/qurtuba

۲۔ Ummah.Com,discussion forum, The Muslim Community in Spain.

۳۔ islam on line,Spanish news agency La Vanguardia,BBC's News, March 04' 2002 , Net,PetitionOnline.com ,The Campaign to Preserve the Cordoba Mosque

(Vetican) کی اعلیٰ عیسائی قیادت کو درخواست دی کہ جس طرح جامع قرطبہ کے آس پاس عیسائی ، یہودی اور مسلمان مل جل کر رہ رہے ہیں اسی طرح عیسائیوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی اس میں باقاعدہ نماز کی اجازت دی جائے۔ ان کی اس درخواست کو شہر کی سوشلسٹ سیاسی قیادت کی حمایت بھی حاصل تھی مگر عیسائی مذہبی حلقوں نے اس کی سخت مخالفت کی۔ ویٹی کن کی مذہبی قیادت نے بھی کچھ عرصہ غور و خوض کے بعد یہ اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ آج کل عوام مسلمانوں کی طرف سے ایک درخواست پوپ جان پال ، یونیسکو اور شاہِ سپین کو بھیجنے کے لیے دستخطوں کی مہم جاری ہے جس پر اب تک سینکڑوں دستخط حاصل کیے جاچکے ہیں۔ درخواست دہندگان کا موقف یہ ہے کہ جامع قرطبہ ایک عالمی ورثہ ہے۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کے جذبات بھی شدت سے وابستہ ہیں ۔ اس لیے اسے یونیسکو (UNESCO) کی نگرانی میں دے دیا جائے ، عیسائیوں کے ساتھ مسلمانوں کو بھی اس کے ایک حصے میں نماز پڑھنے کی اجازت دی جائے اور مزید تعمیرات کے لیے اس میں توڑ پھوڑ پر پابندی لگائی جائے۔

جامع مسجد میں نماز کی جدوجہد کے ساتھ ساتھ ماڈرن قرطبہ کے مسلمانوں نے رائج الوقت سیکولر نظام کے تحت حاصل شدہ حقوق کی روشنی میں اپنے لیے عبادت گاہ کے حصول کی کوششیں بھی جاری رکھیں۔ بیس بائیس سال کی جدوجہد اور قانونی چارہ جوئی کے بعد بالآخر شہر کے ایک پارک میں انہیں مسجد بنانے کی اجازت دی گئی ۔ کہا جاتا ہے کہ آزادیِ فکر کے اس دور میں مطالعۂ اسلام کے نتیجے میں دیگر ممالک کی طرح قرطبہ میں بھی مسلمانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے جس کی وجہ سے موجودہ مسجد نمازیوں کے لیے ناکافی ہوچکی ہے۔ یہ نہ صرف قرطبہ کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات ہیں بلکہ ان کے اپنے ثقافتی ورثہ کے ساتھ جذباتی لگاؤ کی ایک جھلک بھی ہے۔ اس جذبہ میں وہ اکیلے نہیں بلکہ مقامی سوشلسٹ انتظامیہ بھی ان کی مؤید ہے۔ یہاں اسلامی ثقافت کے بعض دیگر مظاہر کے احیاء کے لیے بھی فرانسیسی نومسلم مفکر راجر گیراڈے (RogerGaraudy) کے ثقافتی ادارے نے ایک کوشش کی ہے۔ اس کی کوششوں سے ۲۰۰۲ء میں قرطبہ کی ایک تاریخی عمارت کو مرمت کر کے Alive liberary یعنی زندہ مکتبہ کے نام سے ایک لائبریری قائم کی گئی جس میں محیی الدین ابن عربی، موسیٰ بن عمران اور ابن رشد وغیرہ کی کتب رکھی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ یہاں ابوزکریا یحیی کی کتاب الزراعۃ اور گیراڈے کی **''قرطبہ : روحانی مرکز''** کے نام سے ایک کتاب بھی رکھی گئی ہے۔ اس موقع پر قرطبہ کی میئر روسا آغیلار اور ادارۂ روجر گیراڈے کے وائس چیئرمین پال بینو یوبی دانو نے اندلس کے مسلم ثقافتی ورثے کے تحفظ کی ہر ممکن کوشش کرنے کا عہد کیا ہے[1]۔

۱۔ www.azzaman.com/azzaman/articles،''منجزات الماضي يتواصل مع المستقبل ،المكتبة الحية للأندلس تفتح أبواب الحوار في قرطبة '' جريدة الزمان ۔شمارہ ۱۳۷۷، مؤرخہ ۲۹۔۱۱۔۲۰۰۲ء ، ASIA NEWS.IT,Muslims seek to use Cathedral alongside Catholics

امام قرطبیؒ کا تعارف اور علمی مقام

امام قرطبیؒ کا زمانہ اور ماحول

پانچ سو سال تک اندلس کے افق پر سورج کی طرح چمکنے والا قرطبہ اب آہستہ آہستہ مسلم حکام کے داخلی انتشارات اور نفس بینی کے خلفشارات سے اٹھنے والی گھنگور گھٹاؤں میں چھپتا چلا جا رہا تھا۔ بنی امیہ اندلس کی قائم کردہ تعمیراتی اور ثقافتی یادگاریں جو آنکھوں کو خیرہ اور عقول کو دنگ کر دیا کرتی تھیں، ایک ایک کر کے اجڑتی جا رہی تھیں۔ یورپ کی ظلمتوں میں راہ بین بننے والی عقل پر پردہ پڑتا جا رہا تھا اور شرق و غرب کو درسِ انسانیت دینے والی نگاہیں آج بینائی کھوتی نظر آ رہی تھیں۔ ۶۰۹ھ/ ۱۲۱۲ء میں ہسپانوی اور یورپی اتحادی فوجوں سے ذلت آمیز شکست کھانے کے بعد موحدین کی سیاسی ساکھ آخری سانسیں لے رہی تھی کہ اسی مایوسی وانحطاط اور قومی وملی انتشار کے دور میں کہیں چھٹی صدی ہجری کے آخری سالوں میں امام قرطبیؒ نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ ایک اندازے کے مطابق یہ موحد خلیفہ یعقوب بن یوسف ابن عبد المومن (۵۸۰-۵۹۵ھ) کا دورِ حکومت ہوگا[1]۔

امام قرطبیؒ نے ایک عام طالبِ علم کی حیثیت سے اپنے تعلیمی سفر کی ابتداہی کی ہوگی کہ اندلس کے سیاسی افق پر ایک انقلاب آیا اور موحدین کی کشتی کو ہچکولے کھاتے دیکھ کر محمد بن یوسف بن ہود (م ۶۳۵ھ) میدانِ سیاست میں اترا۔ اس نے ۶۲۵ھ/ ۱۲۲۸ء میں موحدین سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کر دیا۔ اسی تحریک کے زور میں وہ موحدین کے دارالحکومت اشبیلیہ سمیت اندلس کے مرکزی شہروں شاطبہ، جیان، غرناطہ، مالقہ اور المریہ وغیرہ کو اپنے ماتحت لانے میں کامیاب ہوگیا۔ پھر اس نے یہ تدبیر کی کہ ۶۳۰ھ/ ۱۲۳۳ء میں بغداد کے عباسی خلیفہ المستنصر باللہ کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر مرکزِ خلافت سے اندلس کی گورنری کا پروانہ بھی حاصل کر لیا۔ ابن ہود کو مرکزی خلیفہ کی تائید تو حاصل ہوگئی مگر جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے جانے والے قشتالوی عیسائیوں کے علاوہ مشرقی اندلس میں حاکم بلنسیہ ابوجمیل زیان بن مردنیش اور وسطی و جنوبی اندلس میں محمد بن یوسف الاحمر کی صورت میں دو مضبوط مسلمان حریف اس کے سیاسی استحکام کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنے رہے۔ ان حالات میں قرطبہ جو مسلم دورِ عروج کا مینارِ عظمت وشوکت شمار ہوتا تھا، اعصابی طور پر مفلوج ہو جانے والے لاعلاج مریض کی طرح کچھ عرصہ تک ابن ہود اور ابن احمر کے درمیان لڑھکتا لڑکھڑاتا رہا یہاں تک کہ ۲۳ شوال ۶۳۳ھ/ ۲۹ جون

ا۔ قرطبة في العصر الإسلامي ص ۱۴۹، القرطبي و منهجه ص ۸، ۱۰

۱۲۳۶ء کو سخت بے چارگی کے عالم میں اپنی ولایت کے دعوے دار ابن ہود کی راہ تکتے تکتے راہی ملک عدم ہوگیا(۱)۔

سقوطِ قرطبہ سے قبل کے دورِ انحطاط میں بھی جب کہ امن غارت اور سکون برباد ہو چکا تھا وہاں کے لوگوں کی علم دوستی قابلِ رشک تھی۔عوام میں تو علم وعمل کا ذوق تھا ہی، اس دور کے حکام اور امراء کے لیے بھی فخر و امتیاز کا معیارِ علمِ دین ہی سمجھا جاتا تھا۔یہ میلان نہایت تسلسل سے جاری رہا۔ دولتِ موحدین کا بانی ابو عبداللہ محمد بن تومرت مصمودی المعروف مہدی الموحدین (۴۸۵ - ۵۲۴ھ/ ۱۰۹۲- ۱۱۳۰ء) (۲) اپنے دور کا بڑا علامہ اور حصولِ علم کا سب سے بڑا داعی شمار ہوتا تھا جس کی بہترین دلیل اس کے سرکاری خطوط کے یہ الفاظ ہیں:

أعز ما يُطلب و أفضل ما يُكسب و أنفس ما يُدَّ خرو أحسن ما يُعمل العلم الذى جعله الله سبب الهداية إلى كل خير،هو أعز المطالب و أفضل المكاسب و أنفس الذخائر و أحسن الأعمال .

قیمتی ترین چیز جو طلب کی جا سکتی ہے ، اعلیٰ ترین چیز جسے محنت کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے ، نفیس ترین دولت جسے ذخیرہ بنایا جا سکتا ہے اور حسین ترین عمل جسے بجالایا جا سکتا ہے ......وہ علم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ہر بھلائی کی طرف رہنمائی کا ذریعہ بنایا ہے ۔ وہی سب سے قیمتی مطلوب ، وہی سب سے بہتر کمائی ، وہی نفیس ترین ذخیرہ اور وہی بہترین عمل ہے ۔

ابو حفص عمر بن اسحاق بن یوسف بن عبدالمؤمن المرتضی باللہ (۶۴۶-۶۶۵) جس کے دور میں دولت موحدین کا شیرازہ بکھر گیا،اس کے تعارف میں اصحابِ سیَر لکھتے ہیں:"**كان فقيها أديباشاعرا ......وكان شغوفا بجمع الكتب و التصانيف**"(۳) (وہ فقہ کا ماہر، ادیب اور شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تصانیف اور کتب جمع کرنے کا شغف رکھتا تھا) ۔موحدین کے بعد محمد بن یوسف ابن ہود اگرچہ خود تو عالم نہ تھا ، نہ اس کی شخصیت علمی لحاظ سے معتبر تھی مگر اس کو بغداد کے عباسی خلیفہ کی طرف سے جو پروانۂ ولایت ملا اس میں بھی یہی دستور العمل درج تھا:

ہر حال میں تقویٰ اختیار کرو،اللہ کی کتاب اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رہو،علماء اور فقہاء کی مجالس میں کثرت سے حاضری دیا کرو،اہلِ عقل و دانش سے مشورہ کیا کرو،رعیت کے ساتھ اچھا رویہ رکھو اور کفار کے ساتھ جہاد کا خاص اہتمام کرو۔(۴)

۱۔ اعلام زرکلی ،تعارف ابن ہود ۷:۱۴۹، تاریخ ابن خلدون ج ۴، ثورة ابن هود على الموحدين بالأندلس، سقوط قرطبة : تآمر العدو و الصديق،احمد تمام ،اسلام آن لاین.

۲۔ اعلام زرکلی ۶:۲۲۸

۳۔ اعلام زرکلی ۵: ۴۱، القرطبی و منهجه ص ۲۶

۴۔ نفح الطيب ج ا، لمحه من تاريخ الحكم في الأندلس ، سقوط قرطبة : تآمر العدو والصديق ، اسلام آن لاین.

بار بار شکست و ریخت کا شکار ہونے اور آخری دور کے قومی وملی جذبات سے عاری طالع آزماؤں کے ہاتھوں میدانِ جنگ بننے کے باوجود بھی قرطبہ سب سے بڑا علمی مرکز رہا۔ اس کے باشندے کتابوں کے ذخائر جمع کرنے اور ان کی حفاظت میں خصوصی شہرت رکھتے تھے۔ جگہ جگہ کتب کے خزانے پائے جاتے تھے۔ تعلیمی ادارے عام تھے اور علمی وادبی میلوں کا خوب رواج تھا۔ مساجد ہمیشہ علمی حلقات سے پررونق رہتی تھیں۔ اس باب میں شہر و دیہات سب برابر تھے، البتہ شہروں کو ان حلقات کے علاوہ دینی اداروں اور علمی معاہد کی وجہ سے ایک امتیاز حاصل تھا [۱]۔ اس کے ساتھ ساتھ علماء وطلبہ کی ایک خاصی تعداد ایسی بھی ملتی ہے جنہوں نے ان پرآشوب حالات میں اپنے علمی مستقبل کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے حبِّ وطن کو حب علم پر قربان کیا اور اندلس چھوڑ کر مشرقی اسلامی ممالک کی طرف ہجرت کی [۲]۔

علامہ قرطبیؒ نے بھی سیاسی انتشار سے بے نیاز اس علمی شوق اور دینی ذوق کے ماحول میں آنکھ کھولی، اسی کے سرچشموں سے سیراب ہوئے اور اسی میں عمر کا ایک حصہ گزارا۔مگر جب سقوط قرطبہ کا جاں گداز حادثہ پیش آیا تو انہوں نے بھی وطنِ عزیز کو خیر باد کہا اور نہ معلوم کہاں کہاں صعوبتیں برداشت کرتے بالآخر سرزمین علم و معرفت مصر پہنچ گئے جہاں ایوبیوں کی حکومت تھی۔ وہ بھی بہت علم دوست لوگ تھے۔ وہاں بھی انہیں اپنی علمی پیاس بجھانے کا خوب موقع ملا [۳]۔ اس طرح شہر شہر اور ملک ملک گھر سے بے گھر ہوتے سال ہا سال کے علمی سفر کے بعد ابوعبداللہ محمد بن احمد صرف ایک عالم بن کر ظاہر نہ ہوئے بلکہ ''ابوعبداللہ القرطبی المفسر، الإمام'' کے لقب سے حیاتِ جاوداں پاگئے۔علامہؒ کی شخصیت کی مرحلہ وار تشکیل اور علمی سفر کا مختصر خاکہ درجِ ذیل ہے:

نام ونسب

ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری الخزرجی القرطبی الاندلسی [۴]۔

ابتدائی زندگی اور تعلیم وتربیت

امام قرطبیؒ کی تاریخ پیدائش ،نشوونما اور ابتدائی تعلیم کے حالات واضح طور پر کہیں نہیں ملتے مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد گرامی کھیتی باڑی کرتے تھے۔انہوں نے ہی اپنے بیٹے کی پرورش کی اور اندلس کے

۱۔ القرطبی و منهجه ص ۲۱۔۲۲
۲۔ علامہ مقری نے نفح الطیب کا پانچواں باب انہی علماء وطلبہ کے تعارف کے لیے مختص کیا ہے۔
۳۔ القرطبی و منهجه فی التفسیر ص ۲۱۔۲۲
۴۔ اعلام زرکلی: ۵:۳۲۲، معجم المؤلفین ۳:۵۲، هدیة العارفین ۲: ۱۲۹

رواج کے مطابق ان کی باقاعدہ تعلیم وتربیت ہوئی ۔ارشاد باری تعالیٰ :﴿وَلاَ تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوافِي سَبِيلِ اللهِ أَمْوَاتاً﴾(۱) کی تفسیر کے ضمن میں امام قرطبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ ۳ رمضان المبارک سن ۶۲۷ھ کی صبح کو دشمن نے قرطبہ پر اس وقت حملہ کر دیا جب لوگ اپنے کھیتوں میں فصلوں کی کٹائی میں مصروف تھے ۔ اس حملے میں ان کے والدِ گرامی شہید ہوگئے ۔ قرطبیؒ کہتے ہیں : میں نے اس موقع پر اپنے استاذِ گرامی ابوجعفر احمد المعروف ابن ابی حجہ سے اپنے والدکی تجہیز وتکفین کے بارے میں رہنمائی چاہی تو انہوں نے فرمایا: انہیں غسل دو اور جنازہ پڑھو کیوں کہ ان کی شہادت دشمن کے مقابلے میں صف بندی کر کے لڑتے ہوئے نہیں ہوئی ۔میں نے یہی بات استاذِ گرامی ربیع بن عبدالرحمٰن بن احمد بن ربیع بن ابی(۲) سے پوچھی تو انہوں نے فرمایا: ان کا حکم جنگ کے شہداء کا ہے۔اس کے بعد میں قاضیِ مذہب ابوالحسن علی بن قطرال(۳) کے پاس چلاگیا، ان کے پاس دیگر فقہاء بھی حلقہ بنائے بیٹھے تھے ،میں نے اپنامسئلہ ان حضرات کی خدمت میں پیش کیا توانہوں نے فرمایا: اپنے والد کوغسل بھی دو ،کفن بھی پہناؤ اورپھران کا جنازہ پڑھو۔اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد علامہ ابوالحسن لخمیؒ (۴)کی کتاب :''التبصرۃ ''اوربعض دیگرکتب میں یہ مسئلہ میری نظر سے گزرا تو مجھے احساس ہواکہ کاش! مجھے بروقت اس مسئلہ کی تحقیق ہوجاتی تو میں اپنے والدِ گرامی کوغسل نہ دیتا اورخون آلود جسم اور کپڑوں میں ہی دفن کر دیتا۔

یہاں امام قرطبیؒ نے ابن ابی حجہ کے لیے''شیخنا''(ہمارے استاذ) اور''المقرئ''(استاذِ قراء ت)

۱۔ تفسیر قرطبی ، آل عمران : ۱۶۹- ۱۷۰

۲۔ ڈاکٹر قصی زلط نے ان کا تعارف ابوسلیمان ربیع بن عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالرحمٰن ابن ربیع الاشعری القرطبیؒ لکھا ہے ۔ قرطبہ کے قاضی رہے ۔۲۳شوال ۶۳۳ھ(۲۹ جون ۱۲۳۶ء) بروز اتوارجب قشتالوی عیسائیوں نے ان کے وطن پر قبضہ کرلیا تو یہ اشبیلیہ منتقل ہوگئے اور اس کے بعد جلد ہی وہاں وفات پائی۔القرطبی ومنهجه ص ۱۳۔ عمر رضا کحالہ نے ابوعامر یحییٰ بن عبدالرحمٰن بن احمد بن عبدالرحمٰن بن ربیع الاشعری القرطبی المعروف ابن ابی(۵۶۳-۶۳۹/ ۱۱۶۸-۱۲۴۱ء)لکھا ہے اور یہی تفسیر قرطبی والی عبارت کے قریب تر ہے ۔ فقیہ ، اصولی اورعلمِ کلام کے ماہر اور دیگر علوم عقلیہ ونقلیہ میں دسترس رکھتے تھے۔قرطبہ اور غرناطہ میں قاضی رہے اور مالقہ میں وفات پائی۔ معجم المؤلفین ۴:

۳۔ ابوالحسن بن قطرال علی بن عبداللہ بن محمدالانصاری القرطبی(م ربیع الاول ۶۵۱ھ) بڑے فقیہ اور عربی دان تھے۔ علاقۂ آمد کے قاضی بھی رہے مگر ۶۰۹ھ میں جب آمد پر عیسائیوں کا قبضہ ہوگیاتو یہ گرفتار ہوئے۔وہاں سے جان چھوٹی توشاطبہ چلے گئے اور وہاں کے قاضی بنے ۔ پھر کچھ عرصہ قرطبہ میں منصبِ قضاء پرفائز رہے۔اس کے بعد فاس کے قاضی رہے اورمراکش میں۸۸سال کی عمر میں وفات پائی۔انہیں کئی علوم پرعبور حاصل تھامگر بلاغت کے میدان میں خاص طور پر ممتاز تھے۔شذرات الذهب ج۵

۴۔ ابوالحسن علی بن محمد الربعی اللخمی(۴۷۸ھ/۱۰۸۵ء) کاوطن اصلی قیروان تھامقام سفاقس میں مقیم رہے اور وہیں وفات پائی۔ مذہب مالکی کے فقیہ تھے ۔ ان کی کتاب ''التبصرۃ'' فقہ مالکی کی مشہور کتاب ''المدونة''پر ان کی تعلیقات کا مجموعہ ہے ۔ اس میں انہوں نے ایسی آراء ذکر کی ہیں جو ان کے مذہب کی مشہور آراء سے مطابقت نہیں رکھتیں۔اعلام زرکلی ۴:۳۲۸

کے الفاظ ذکر کیے ہیں جن سے درجِ ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ قرطبیؒ، قرطبہ کے ایک کسان کے گھر میں پیدا ہوئے اور بچپن اپنے والد کے سایۂ عاطفت میں گزارا۔

۲۔ والدِ گرامی کی زیرِ سرپرستی ہی ان کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی تھی۔

۳۔ ۶۲۷ھ میں اپنے والد کی شہادت کے وقت قرطبیؒ شیخ ابنِ ابی حجہؒ کے باقاعدہ شاگرد تھے۔

۴۔ ابنِ ابی حجہؒ کے تعارف میں خیر الدین زرکلی نے لکھا ہے :"فاضل من أهل قرطبة.تصدّر لإقراء القرآنِ وتعليم العربية"[1] (قرطبہ کے فضلاء میں سے تھے۔انہوں نے قرآنِ مجید اور لغتِ عرب کی تعلیم کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا ہوا تھا)۔ قرطبہ میں یہ ابتدائی درجہ کا نصابِ تعلیم تھا جیسا کہ علامہ ابنِ خلدونؒ نے قاضی ابوبکر ابن العربیؒ سے نقل کیا ہے[2]۔

۵۔ یہ امام قرطبیؒ کی ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا اور ان کی عمر زیادہ نہ ہوئی تھی۔

۶۔ علمی پختگی اور فقہی فطانت ان کو اس وقت تک حاصل نہ ہوئی تھی۔اسی لیے ایک سے زائد اساتذہ سے سوال کیا اور کچھ عرصہ بعد علامہ ابوالحسن لخمی کی کتاب :" التبصرة "اور بعض دیگر کتب میں یہ مسئلہ پڑھا تو بروقت اس کی تحقیق نہ ہوسکنے پر اظہارِ افسوس بھی کیا۔

۷۔ دین داری اور شریعت کی پابندی کا جذبہ امام قرطبیؒ کی بنیادی تربیت میں ہی ان کو حاصل ہوگیا تھا۔ مسائل کی تحقیق میں ان کی لگن بھی بے مثال تھی جس کو ان کی بعد کی زندگی میں خوب جلا ملی اور وہ اپنے دور کے عظیم ترین مفسرین ، محدثین اور فقہاء میں شمار ہوئے ۔

۸۔ علامہ ابوالحسن لخمی چوں کہ مجتہد فی المذہب تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب "التبصرة" میں فقہ مالکی کی مقتدر کتاب "المدونة الكبرىٰ" پر تعلیقات مرتب کی ہیں۔ انہوں نے فقہِ مالکی کی متفقہ آراء کے خلاف دوسرے فقہاء کی رائے کے مطابق بھی کچھ باتیں ذکر کی ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ عمومی طور پر فقہِ مالکی کی پیروی کے ساتھ ساتھ امام قرطبیؒ کے فقیہانہ توسع کی بنیاد شاید علامہ لخمیؒ کی کتب کے مطالعہ سے بنی ہوگی۔

امام قرطبیؒ کے والد کی شہادت (۶۲۷ھ) کے وقت قرطبہ میں محمد بن یوسف بن ہود (م ۶۳۵ھ) کی

۱۔ ابوجعفر احمد بن محمد القیسی المعروف ابن ابی حجہ (م ۶۴۳ھ/ ۱۲۴۵ء) قرطبہ میں قرآنِ مجید اور لغتِ عرب کی تعلیم دیتے رہے۔ بعد میں اشبیلیہ منتقل ہوگئے اور عیسائیوں کے ہاتھوں قید ہوئے ۔ دورانِ قید تشدد کی وجہ سے میورقہ کے مقام پر ان کی وفات ہوئی۔ اعلام زرکلی ۱:۲۱۹

۲۔ مقدمہ ابن خلدون ص ۵۳۸

حکومت تھی جو ۶۲۵ھ / ۱۲۲۸ء میں موحدین سے علیحدگی اختیار کر کے اپنی مستقل حکومت کا اعلان کر چکا تھا۔اس سے یہ اندازہ تو لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ قرطبی موحدین کے دور میں پیدا ہوئے ہوں گے مگر صحیح تاریخ کا تعین پھر بھی نہیں ہوسکتا۔ڈاکٹر قصبی دزلط کا اندازہ یہ ہے کہ اگر ان کی پیدائش چھٹی صدی ہجری کے آخر میں سمجھی جائے تو غالباً موحد خلیفہ یعقوب بن یوسف ابن عبد المومن (۵۸۰-۵۹۵ھ) کے دورِ حکومت کی ہوگی (۱)۔

امام قرطبیؒ نے ارشادِ باری تعالیٰ :﴿مَنْ ذَاالَّذِی یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًاحَسَناً﴾[البقرۃ ۲:۲۴۵] کی تفسیر میں اپنے ایک شیخ ابوعامر یحییٰ بن عامر بن احمد بن منیع الاشعریؒ کا ذکر کرتے ہوئے کہاہے کہ میں نے قرطبہ میں ربیع الاول ۶۲۸ھ میں بطریقِ قراء ت ایک روایت پڑھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ۶۲۸ھ میں ان کی تعلیم قرطبہ ہی میں جاری تھی۔ ابن ہود ہی قرطبہ کا حاکم تھا کہ قشتالوی عیسائیوں نے ۲۳ شوال ۶۳۳ھ / ۲۹ جولائی ۱۲۳۶ء میں اس پر قبضہ کرلیا (۲)۔ اس کے علمی مراکز ختم کردیئے ۔مسلمانوں کو ماردیا یا نکال دیا اور مساجد کو گرجا گھر بنادیا جس کے بعد قرطبہ میں ان کی تعلیم جاری رہنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔امام قرطبیؒ نے ارشادِ باری تعالیٰ:
﴿وَإِذَاقَرَأْتَ الْقُرْآنَ جَعَلْنَابَیْنَکَ وَبَیْنَ الَّذِینَ لاَ یُؤْمِنُونَ بِالآخِرَۃِ حِجَاباً مَّسْتُوراً﴾ [الاسراء ۱۷:۴۵]
(اور جب آپ قرآن پڑھا کرتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان لوگوں کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ، حجاب پر حجاب کردیتے ہیں) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مجھے بھی اپنے ملک اندلس میں قرطبہ کے مضافات میں قلعۂ منثور میں اسی طرح کا اتفاق ہوا۔واقعہ یہ ہے کہ میں دشمن کے آگے بھاگتے بھاگتے ایک طرف کو ہوگیا ۔ ان کے دوسپاہی میری تلاش میں نکلے۔ میں ایک میدان میں بیٹھا سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات اوردیگر چیزیں پڑھتا رہا۔ میں ایک کھلے میدان میں بیٹھا ہوا تھا،کوئی چیز میرے اور ان کے درمیان حائل نہ تھی مگروہ دونوں میرے پاس سے گزر گئے اور میں انہیں نظر نہ آیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا۔ وہ واپس جارہے تھے کہ میں نے ان میں سے ایک کو یہ کہتے سنا:''دیبلۃ'' یعنی یہ تو کوئی جن ہے ۔میں نے اس فضل ومہربانی پر اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کیا۔بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام قرطبیؒ کو یہ واقعہ اسی آخری عیسائی قبضہ کے موقع پر پیش آیا۔

اس کے بعد معلوم نہیں ہوسکا کہ قرطبیؒ اپنے وطنِ مالوف سے نکل کر کہاں گئے۔مصر میں ان کی موجودگی اور پھر وفات تک وہیں قیام کا ثبوت تو تمام مراجع میں ملتاہے مگر وہاں پہنچنے کا زمانہ متعین کرنا بہت مشکل ہے۔مصر میں ان کی موجودگی کی واضح ترین تاریخ وہی ہے جو انہوں نے اپنی کتاب ''التذکرۃ '' میں ایک روایت کے تحت ذکر کی ہے کہ یہ روایت انہیں جمعہ ۱۳ رجب ۶۴۷ھ کو امام ابوالحسن علی بن محمد بن محمد بن

۱۔ قرطبۃ فی العصر الإسلامی ص ۱۴۹، القرطبی و منہجہ ص ۸، ۱۰
۲۔ مقالۃ سقوط قرطبۃ: تآمر العدو والصدیق/ احمد تمام، Islam On line

عمرو البکری التیمی (۱) نے ، جن کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، مصر میں ''منصورۃ'' کے قریب ''صنورۃ'' یا ''جزیرۃ'' کے مقام پر بتائی (۲)۔ مگر ۱۳رجب ۶۴۷ھ کوان کے مصر پہنچنے کی تاریخ قرار نہیں دیاجاسکتا کیوں کہ آں جناب بیناء اسکندریہ میں شیخ ابو محمد عبدالمعطی کے درس میں بھی شریک رہے (۳) اور شیخ مذکور کی تاریخِ وفات ۶۳۸ھ ہے (۴) ۔امام قرطبی ان کی تاریخِ وفات سے یقیناً کچھ عرصہ قبل ہی اسکندریہ میں ہوں گے ورنہ ان کے حلقہ درس میں شامل نہ ہوسکتے۔

مصر میں ''ثغر الإسكندرية'' (بیناء اسکندریہ) کے علاقے میں امام قرطبی کا قیام کافی طویل معلوم ہوتا ہے ۔ انہوں نے وہیں رہ کر شیخ ابو محمد عبدالوہاب بن ظافر (۵) سے استفادہ کیا (۶) ، شیخ ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم الانصاری (۷) سے بھی وہیں پڑھا (۸) اور شیخ ابوالعباس احمد بن عمر الانصاری القرطبیؒ (۹) سے بھی وہیں کسب فیض کیا۔ شیخ ابوالعباس امام قرطبی کے اساتذہ میں سے وہ شخصیت ہیں جن کا ذکر انہوں نے اپنی تفسیر اور تذکرہ وغیرہ دیگر کتب میں

۱۔ کتبِ مراجع میں ان کی کنیت ابوعلی اور نام حسن بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن عمر البکری التیمی النیشاپوری (۵۷۴-۶۵۶ھ/ ۱۱۷۸ - ۱۲۵۸ء) اور لقب صدرالدین ہے ۔ وہ بیک وقت محدث، مؤرخ، صوفی اور حساب دان تھے ۔حصولِ علم کے لیے انہوں نے بہت سے مشہور مقامات کا سفر کیا۔انہوں نے تاریخِ ابن عساکر کا ایک تکملہ بھی لکھا مگر ان کا مسودہ کہیں ضائع ہوگیا۔ان کی وفات مصر میں ۱۱ ذی الحجہ کو ہوئی۔معجم المؤلفین ۱:۵۹۰،تفسیر قرطبی: الصافات :۱۸۰ میں بھی ان کا نام ابوعلی الحسن......ابن عمروک ہے ۔

۲۔ التذكرة : باب مايرجى من رحمة الله تعالیٰ ومغفرته وعفوه يوم القيامة .

۳۔ تفسیر قرطبی: آل عمران ۳:۱۳۵﴿وَالَّذِينَ إِذَافَعَلُوا فَاحِشَةً﴾،الکهف:۵۰،۸۲

۴۔ ابومحمد عبدالمعطی بن محمود بن عبدالمعطی ابن عبدالخالق ابن ابی الثناء اللخمی الاسکندری (۵۶۳-۶۳۸ھ/ ۱۱۶۸-۱۲۴۱ء) اسکندریہ میں پیدا ہوئے اور وہیں رہے۔ وہاں ان کا مشہور حلقہ ہوتا تھا۔ ان کی وفات مکہ مکرمہ میں ہوئی اور جنۃ المعلیٰ میں دفن ہوئے ۔ نابینا تھے مگر فقہاء مالکیہ میں ایک مقام رکھتے تھے اور تصوف سے ان کا گہرا شغف تھا۔اعلام زرکلی ۴:۱۵۵

۵۔ رشید الدین ابومحمد عبدالوہاب بن ظافر بن علی بن فتوح الاسکندرانی (۵۵۴ھ-۶۴۸ھ) المعروف ابن رواح بڑے فقیہ اور عابدزاہد تھے ۔ انہوں نے طویل عمر پائی اور اسکندریہ مصر میں کافی عرصہ تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ شذرات الذهب.

۶۔ التذكرة: باب مايسأل عنه العبد و كيفية......باب في قوله تعالىٰ :وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ.

۷۔ ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن عبدالرحمٰن الخزرجی التلمسانی المالکی (۵۸۴-۶۵۶ھ/ ۱۱۸۸- ۱۲۵۸ء) بڑے محدث اور فاضل تھے ۔ ساحلِ اسکندریہ کے علاقے میں مقیم رہے اور وہیں تدریس کی خدمات سرانجام دیں.معجم المؤلفین ۸:۲۰۶

۸۔ التذكرة: باب ماينجي المؤمن من أهوال القبر وفتنته وعذابه.

۹۔ ابوالعباس احمد بن عمر بن ابراہیم الانصاری القرطبیؒ (۵۷۸-۶۵۶ھ/ ۱۱۸۲-۱۲۵۸ء) المعروف ابن مزین ،عظیم المرتبت محدثین اور جلیل القدر فقہاء مالکیہ میں سے تھے۔ قرطبہ میں پیدا ہوئے ،اسکندریہ میں مدرس رہے اور وہیں وفات پائی ۔ ان کی ''المفهم لماأشكل من كتاب تلخيص صحيح مسلم'' بہت مشہور ہے ۔ صحیح مسلم کی شرح میں ان کی اپنی تصنیف کی تلخیص ہے۔ اعلام زرکلی ۱:۱۸۶

''شیخنا'' کی تخصیص کے ساتھ سب سے زیادہ کیا ہے(۱)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں نہ صرف یہ کہ زیادہ عرصہ تک شیخ ابوالعباس سے استفادہ کا موقع ملا بلکہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ قرطبیؒ کا دلی لگاؤ بھی ان کے ساتھ بہت زیادہ تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سقوطِ قرطبہ کے بعد سے قرطبیؒ اپنے استاذِ گرامی ابوالعباس الانصاریؒ کے ساتھ ہی رہے ہوں گے کیوں کہ شیخ ابوالعباس نہ صرف یہ کہ اپنے دور میں کبار علماء میں سے تھے بلکہ دونوں حضرات کا قرطبہ سے ہجرت کرنا اور دونوں کا انصاری ہونا ایسی اضافی نسبتیں تھیں جنہیں ان کے درمیان قریبی تعلقات کا باعث قرار دینا قرینِ قیاس ہے۔ علامہ مقری نے ''نفح الطیب'' میں ایک مستقل باب میں ان علماء کا ذکر کیا ہے جو اندلس چھوڑ کر مشرقی اسلامی ممالک میں جا کر مقیم ہو گئے تھے(۲)۔ ثغرِ اسکندریہ میں ایک قابلِ ذکر عرصہ گزارنے کے بعد امام قرطبیؒ مصر میں دریائے نیل کے قریب ''منیة ابن الخصیب'' کے مقام پر منتقل ہو گئے اور وفات تک وہیں رہے۔ یہ بات علامہ قرطبی کے امتیازات میں سے ہے کہ طویل عرصہ طلبِ علم میں گزارنے کے بعد بھی کبھی درجۂ کمال کا دعویٰ نہیں کیا چناں چہ تفسیر قرطبی میں ان کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ منیة ابن الخصیب میں بھی انہوں نے علماء سے استفادہ کا سلسلہ جاری رکھا۔ وہاں ان کے شیوخ میں مفتی الانام بہاء الدین ابوالحسن علی بن ہبة اللہ اللخمی الشافعی المعروف ابن الجمیزی کا نام ملتا ہے(۳)۔

مصر میں فاطمی دورِ حکومت میں سرکاری سطح پر شیعی افکار کی سرپرستی ہوتی تھی۔ اسکندریہ کے اکثر لوگ اگرچہ مذہباً مالکی تھے مگر حالات کی وجہ سے مشکلات کا شکار تھے۔ ۴۹۵ھ کے لگ بھگ یہاں ایک اندلسی عالم اور فقہاء مالکیہ کے عظیم رہنما شیخ ابوبکر محمد بن ولید الطرطوشی (م ۵۲۰ھ) وارد ہوئے۔ انہوں نے یہاں فقہ مالکی کا ایک مستقل حلقہ قائم کیا اور تمام سرکاری وغیر سرکاری عوامل سے متاثر ہوئے بغیر زندگی کا بقیہ حصہ اسی کی تدریس و ترویج میں گزار دیا۔ ان سے بے شمار لوگوں نے استفادہ کیا جن میں سے الطاہر بن عوف المکی (م ۵۸۱ھ) اور ابو طاہر احمد بن محمد بن ابراہیم سلفہ الشافعی (م ۵۷۶ھ) المعروف حافظ سلفی نے شیخ طرطوشی کی علمی وراثت کو کما حقہ سنبھالا اور ان کے تعلیمی سلسلہ کو قائم رکھنے کے لیے زندگیاں وقف کر دیں۔ امام قرطبیؒ کے اکثر مصری اساتذہ اسی سلسلہ کے

۱۔ تفسیر قرطبی، التوبۃ: ۴۰ (شیخنا الإمام أبا العباس)، التذکرۃ: باب ماجاء أن المیت یحضر الشیطان عند موتہ وجلساؤہ فی الدنیا ومایخاف من سوء الخاتمۃ (مع ذکر ثغر الإسکندریۃ)۔

۲۔ نفح الطیب : الباب الخامس فیمن رحل من الأندلسیین إلی المشرق.

۳۔ شیخ ابوالحسن علی بن ہبة اللہ بن سلامہ ابن المسلم بن احمد بن علی اللخمی المصری الشافعی (۵۵۹-۶۴۹ھ) المعروف ابن الجمیزی اپنے وقت میں مصر کے سب سے بڑے قاری، سب سے بڑے خطیب، سب سے بڑے مدرس اور سب سے بڑے مفتی تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے اور انہیں ''مسند الدیار المصریۃ'' کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ شذرات الذہب، التذکرۃ : باب ماجاء فی تلقین الإنسان بعد موتہ شہادۃ الإخلاص فی لحدہ.

وابستگان میں سے تھے[۱]۔آں جنابؒ کے دیگر اساتذہ میں صاحب ''الترغیب والترھیب'' علامہ منذریؒ مصری[۲]، الشیخ الفقیہ امام ابوالقاسم عبداللہ بن الشیخ الفقیہ علی بن خلف بن معزوز الکومی التلمسانی[۳] اور شیخ ابوالحسن علی بن محمد بن علی بن حفص الیحصبی کے اسماء گرامی بھی ملتے ہیں[۴]۔

قرطبہ سے ہجرت اور مصر میں ورود وقیام کے درمیانی عرصہ کے بارے میں ایک خیال یہ ہوسکتا ہے کہ امام قرطبیؒ اس عرصہ میں شاید بلنسیہ چلے گئے ہوں جس پر ۶۳۶ھ/ ۱۲۳۸ء میں دشمن کا قبضہ ہوگیا یا اشبیلیہ میں رہے ہوں جو ۶۴۴ھ/ ۱۲۴۸ء میں مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گیا یا انہوں نے دشمن کے قبضہ سے بچی ہوئی کسی اور اندلسی ریاست میں وقت گزارا ہو۔اشبیلیہ میں کچھ عرصہ تک ان کا قیام زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کیوں کہ انہوں نے ایک مقام پر محی الدین ابن عربیؒ[۵] کو اپنا شیخ قراردیا ہے[۶] اوروہ اپنی تفسیر میں ان سے اقتباسات بھی بکثرت نقل کرتے ہیں ۔ بلادِ مشرق کی طرف سفر سے پہلے اندلس میں ابنِ عربی کا مسکن ومقام اشبیلیہ ہی تھا۔

امام قرطبیؒ نے حصول علم میں اس قدر محنت اور جاں فشانی سے کام لیا کہ اپنے دور میں علوم دینیہ کے امام اور مرجع خلائق بنے۔ انہیں ایک ٹھوس علمی ماحول میسر آیا۔ ان کے تمام اساتذہ و مشائخ بے مثال شخصیات کے مالک تھے جن سے استفادہ نے امام قرطبی کو ایک ہمہ جہت علمی مقام بخشا۔

۱۔ القرطبي ومنهجه في التفسير ص ۲۱-۲۳

۲۔ تفسیر قرطبی ج ۸، الأنفال ۸:۴۱،زکی الدین ابومحمد عبدالعظیم بن عبدالقوی بن عبداللہ المنذری (۵۸۱-۶۵۶ھ/ ۱۱۸۵-۱۲۵۸ء) لغت کے علامہ اور حافظِ حدیث اوربڑے مؤرخ تھے ۔''الترغیب والترھیب'' اور ''التکملة لوفیات النقلة'' ان کی مشہور کتب میں سے ہیں۔آبائی وطن شام تھامگر یہ مصر میں پیداہوئے اور وہیں زندگی گزاری۔ کافی عرصہ تک دارالحدیث الکاملیہ کے شیخ المشائخ رہے ۔پھر بیس سال مسلسل یہ مصروفیت چھوڑ کر تصنیف وتالیف میں گزارے۔اعلام زرکلی ۴:۳۰

۳۔ تفسیر القرطبی ج ۱۰، الحجر:۹،التذکرة : باب منه في الشفعاء وذكر الجهنميين (یہاں غلطی سے الکوی کی جگہ الکوفی لکھ دیا گیا ہے) ، باب ماجاء في أشجار الجنة وفي ثمارها......

۴۔ نفح الطیب : الباب الخامس فیمن رحل من الأندلسيين إلى المشرق، تعارف أبوعبداللہ محمد بن أحمد القرطبی المفسر نمبر۱۲۲

۵۔ الشیخ الاکبرمحی الدین ابوبکر محمد بن علی بن محمد ابن عربی الحاتمی الطائی الاندلسی (۵۶۰-۶۳۸ھ/ ۱۱۶۵-۱۲۴۰ء)صوفی نظریۂ وحدۃ الوجود کے امام اور متکلمین و فلاسفہ کے رہنما تھے۔اندلس کے شہرمرسیہ میں پیداہوئے اورپھر اشبیلیہ منتقل ہوگئے۔انہوں نے شام، بلادِ روم، حجاز، عراق اورمصر کے سفربھی کیے۔ علماء مصر نے عقیدۂ وحدۃ الوجود کی وجہ سے ان کے قتل کا فتویٰ دیا۔اس سلسلہ میں ان کو قید بھی ہوئی مگراپنی معتقد ایک بااثر شخصیت کی مداخلت پر رہا ہوئے۔آخر میں دمشق چلے گئے اور وفات تک وہیں رہے۔انہوں نے کم وبیش چارصد کتابیں تصنیف کیں۔اعلام زرکلی ۶:۲۸۱

۶۔ تفسیرقرطبی ج ۱۱ ، الکھف :۸۲

علمی مقام اور مسلک ومشرب

۶۲۷ھ میں اپنے والدِ گرامی کی شہادت کے موقع پر قرطبیؒ کے ذوقِ تحقیق کی ابتدائی جھلک سے لے کر سالہاسال پر محیط ان کے علمی اسفار اورطلبِ صادق کے ساتھ علمی و تربیتی حلقوں میں نفس کشی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دینی علوم میں مہارت کے علاوہ تصوف وسلوک اور بیسیوں مروجہ علومِ: کلام ، فلسفہ ، طب اورہیئت وغیرہ میں بھی میں انہیں جامعیت کا مقام حاصل ہوگیا جس کی جھلک ان کی ہرتحریرمیں نمایاں نظر آتی ہے۔اپنے دور کے صفِ اول کے علماء وفقہاء سے علمی استفادہ کے ساتھ ساتھ علامہؒ کی طبع نکتہ بیں نے ان کے ذوقِ مطالعہ کو خوب جلا بخشی ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر صرف ان کتب کی تعارفی فہرست تیار کی جائے جن کے اقتباسات علامہؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیے ہیں تو اسی تفسیر کی ایک جلد کے برابر مواد جمع ہوجائے ۔فقہی مسلک کے اعتبار سے اگرچہ انہیں علماءِ مالکیہ کے علاوہ شیخ ابوالحسن علی بن ہبۃ اللہ (۵۵۹-۶۴۹ھ) المعروف ابن الجمیزی اور ان کے پائے کے شافعی المسلک اساتذہ سے بھی استفادہ کا موقع ملا مگر یہ بات طے ہے کہ انہوں نے زندگی بھر فقہ میں امام مالکؒ کی تقلید کو ہی اپنائے رکھاجس کی تائید ان کی تفسیر کی بیس جلدوں میں دوسوتیں سے زائد دفعہ ''قال علماؤنا'' کہہ کر علماء مالکیہ کا مسلک بیان کرنے سے ہوتی ہے ۔آپؒ کی دوسری کتب ''التذکرۃ'' وغیرہ میں بھی یہ الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ وہ کبھی کبھار ''قال علماؤنا'' کے ساتھ ''المالکیۃ '' کااضافہ کرکے اس کی وضاحت بھی فرماتے جاتے ہیں جیساکہ سورۂ ہود آیت نمبر۸۸ میں فرمایا۔البتہ فقہ وبصیرت میں ان کے عالی مقام کے پیشِ نظر بجا طور پر یہ کہاجاسکتا ہے کہ وہ **مجتھد فی المذھب** تھے ۔یہی وجہ ہے کہ آں جناب اپنی تفسیر میں جابجا ''قلتُ ''فرماکرمختلف مباحث میں بڑے بڑے ائمۂ دین کی آراء ذکرفرمانے کے بعدکبھی ان کی تائید میں اور کبھی اختلافی رائے کے طور پر اپنی مدلل رائے بھی ذکر فرمادیتے ہیں۔ان مباحث میں فقہی اور غیرفقہی مسائل میں ان کاایک ہی اسلوب ہے ۔علوم وفنون کے ساتھ تربیت واصلاح اورتزکیہ وتصوف میں بھی امامؒ کا پس منظرنہایت نمایاں ہے کہ ایک طرف انہیں : ابوعامر یحییٰ بن عبدالرحمٰن الاشعری القرطبی المعروف ابن ابیٰ (۶۳۹ھ/۱۲۴۱ء) [1] سے براہ راست استفادہ کا موقع ملا اور دوسری طرف محیی الدین ابن عربی کی شاگردی اور ان کی کتب کے بھر پور مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔

تالیفات

امام قرطبیؒ کی تالیفات ان کےعلم وفضل کی صحیح ترجمان ہیں۔ ان میں سے ہرایک اپنے موضوع پر قابلِ

۱۔ معجم المؤلفین ۴:۱۰۱

قدر شاہکار ہے۔ ان میں: الأسنى في شرح اسماء الله الحسنى وصفاته العليا ، التذكار في افضل الاذكار، التذكره باحوال الموتىٰ وأمور الآخرة ، شرح التقصي ، قمع الحرص بالزهد و القناعة و رد ذل السؤال بالكف و الشفاعة ، التقريب لكتاب التمهيد، الإعلام بمافي دين النصارىٰ وإظهار محاسن دين الإسلام ، (۱)رسالة في القاب الحديث ، كتاب الأقضية ، المصباح في الجمع بين الأفعال والصحاح شامل ہیں۔یہ کتاب علامہ نے ابوالقاسم علی بن جعفر بن القطاع کی کتاب الأفعال اور امام جوہری کی ''الصحاح'' کا اختصار کرکے مرتب کی ہے ۔انہوں نے اپنی تفسیر میں کتب ''المقتبس في شرح مؤطامالک بن أنس'' اور ''اللمع اللؤلؤية في شرح العشرينات النبوية''، ''الإعلام في معرفة مولد المصطفىٰ عليه الصلاة والسلام'' ، ''منهج العباد ومحجة السالكين والزهاد''، ''مصنف في اصول الفقه'' کا ذکر بھی کیا ہے (۲)۔ ان کی طرف ایک قصیدہ بھی منسوب ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء گرامی جمع کئے گئے ہیں ۔آپؒ کی سب سے بڑی تصنیف : اَلْجَامِعُ لأحكام القرآن و المبين لما تضمنه من السنة و آي الفرقان ہے جوکہ تفسیر قرطبی کے نام سے مشہور ہے اور بیس جلدوں پر مشتمل مطبوع دستیاب ہے (۳)۔

طرزِ زندگی

امام قرطبیؒ اپنے وقت کے دینی ودنیاوی علوم میں مہارت ہونے، اس دور میں مروج جدید ترین سائنسی علوم میں دسترس رکھنے اورنت نئی ایجادات سے ہمہ پہلو باخبر رہنے کے باوجود دنیا کے تکلفات سے دور علم دوست ، جہدکوش اور فنا فی اللہ شخصیت تھے۔ اپنی جوانی کے بارے میں فرماتے ہیں: میں اور میرے ساتھی زمانۂ شباب میں قرطبہ کے یہودی قبرستان سے جانوروں پرمٹی لاد کر لایا کرتے تھے (۴)۔ مصر میں آپ کی کہولت اور بڑھاپے کے طرزِ زندگی کے بارے میں منقول ہے کہ: ''صالح ، متعبد، ورع، مطرح للتكلف يمشي بثوب واحد وعلى راسه طاقية '' (وہ بہت نیک ، عبادت گزار ، پرہیزگاراور تکلف سے یکسر بے گانہ تھے۔بعض اوقات آپؒ صرف ایک کپڑا پہنے اورسر پر ٹوپی رکھے نکل آتے اور اپنی ضرورت کی طرف چل پڑتے تھے) (۵)۔

۱۔ إيضاح المكنون ۲: ۲۴۱ ، هدية العارفين ۲: ۱۲۹۔اس میں ردذل السؤال بالكف و الشفاعة وغيرذلک میں "بالکف" کی بجائے " بالکتب"منقول ہے ۔

۲۔ تفسیر قرطبی بمقدمة الدكتور محمد إبراهيم الحفناوي ص ۸، كشاف تحليلي للمسائل الفقهية في تفسير القرطبي ص ۲۳

۳۔ اعلام زرکلی ۵:۳۲۲،معجم المؤلفين ۳:۵۲،هدية العارفين ۲: ۱۲۹

۴۔ التذكرة ،باب ماجاء أن للموت سكرات وفي تسليم الأعضاء بعضها على بعض وفيمايصير الإنسان إليه.

۵۔ اعلام زرکلی ۵:۳۲۲

علماء سیر کے نزدیک علامہؒ کا مقام

علامہ مقری نے حافظ عبدالکریم کا قول نقل کیا ہے: ''إنه كان من عباد الله الصالحين والعلماء العارفين الورعين، الزاهدين في الدنيا،المشتغلين بما يعنيهم من أمور الآخرة فيما بين توجه وعبادة وتصنيف''(قرطبیؒ اللہ کے نیک بندوں،علماءِ عارفین اور متقین میں سے تھے جو دنیا سے بے نیاز رہتے ہیں۔ان کے اوقات توجہ الی اللہ ،عبادت، اور تصنیف وتالیف جیسے آخرت میں کام آنے والے حقیقی اعمال میں گزرتے ہیں)

انہوں نے تاریخِ کتبی(۱) کی عبارت اور اس کے حاشیے پر مختلف لوگوں کی دلچسپ تعلیقات بھی نقل کی ہیں۔ تاریخ کی عبارت یہ ہے :''كان شيخا فاضلاً ،وله تصانيف مفيدة تدل على كثرة اطلاعه ووفور علمه منها تفسير القرآن مليح إلى الغاية اثنا عشر مجلداً ''(علامہؒ ایک صاحبِ فضل بزرگ تھے۔ان کی بہت مفید تصنیفات، ہیں جوان کے کثرت مطالعہ اورعلمِ کثیرکا پتہ دیتی ہیں۔ان میں سے ایک ان کی تفسیر بھی ہے جو بارہ جلدوں میں ہے، اور حد درجہ لطیف ہے)۔مصنف کے کسی شاگرد نے اس تعارف پر یہ تعلیق چسپاں کی: ''قد أجحف المصنف في ترجمته جدا وكان متقناً متبحرا في العلم''مصنف نے علامہ کے تعارف میں بہت بخل سے کام لیا ہے ۔وہ توایک ماہر اور متبحر عالم تھے)۔اس پر ایک اور صاحب نے حاشیہ چڑھایا:''قال الذهبي: رحلَ وكَتَبَ وسَمِعَ،وكان يقظاً ، فهماً ، حسن الحفظ، مليح النظم ،حسن المذاكرة ، ثقة ،حافظاً''(امام ذہبیؒ نے لکھا ہے کہ انہوں نے سفر کیے علم کوتحریری شکل میں محفوظ کرتے رہے اورعلماء کی مجالس میں حاضر ہوکرعلم سیکھتے رہے ۔وہ حاضر دماغ ،فہم وفراست کے مالک ،اچھے حافظہ والے ،عمدہ شاعر، اچھے مدرس ، قابلِ اعتماد راوی اورعلم کے حافظ تھے)۔ ایک اور صاحب نے اس پر مزید لکھا ہے :مشاحة شيخناللمصنف في هذه العبارة مالهافائدة فإن الذهبي قال في تاريخ الإسلام : العلامة أبوعبدالله محمد بن أحمد بن أبي بكر بن فرح ،الإمام القرطبي ، إمام متفنن متبحرفي العلم ،له تصانيف مفيدة تدل على كثرة اطلاعه ووفور عقله وفضله ...... وقد سارت بتفسيره العظيم الشأن الركبان ،وله الأسنىٰ في شرح الأسماء الحسنىٰ ،والتذكرة وأشياء تدل علىٰ إمامته وذكائه وكثرة اطلاعه(ہمارے شیخ کے مصنف کی اس عبارت پر اعتراض کا کوئی فائدہ نہیں۔حافظ ذہبی نے بھی تاریخِ اسلام میں لکھا ہے : علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکربن فرح ،امامِ قرطبیؒ، کئی فنون کے ماہر تھے اوربحرِ علوم کے غوطہ زن تھے۔ انہوں نے کئی مفید کتابیں تصنیف کیں جوان کے کثیر مطالعہ ، اعلیٰ درجہ کی ذہانت اور ان کے بلندمقام کی

۱۔ تاریخ کتبی فخرالدین محمد ابن شاکر الکتبی (م۷۶۴ھ) کی کتاب عیون التواریخ کا مختصر نام ہے ۔یہ تاریخ ۷۶۰ھ تک کے واقعات پر مشتمل سات جلدوں میں ہے۔اس کے مندرجات بڑی حد تک تاریخ ابن کثیر سے ملتے جلتے ہیں۔کشف الظنون۲: ۱۱۸۵

دلیل ہیں۔ان کی عظیم الشان تفسیر کو قافلے ساتھ لے کر چلے۔ ان کی کتب میں الاسنیٰ شرح الاسماء حسنیٰ، التذکرۃ اور دیگر ایسی تصانیف ہیں جو آپ کی امامت ،ذہانت اور کثرت مطالعہ کا پتہ دیتی ہیں)۔ ایک تیسرے صاحب آئے تو انہوں نے اس پر لکھا:غفر اللہ لک! إذا کان الذھبي ترجمه بماذکرت ،وھو واللہ فوق ذلک ، فکیف تقول: إن مشاحة شیخک لافائدة فیھا، وتسيء الأدب معه ، وتقول إن کلامه لافائدة فیه؟فاللہ یستر علیک!انتھیٰ ۔ (اللہ تجھے معاف کرے! جب حافظ ذہبی نے ان کا تعارف اس طرح کروایا ہے جیسا کہ تو نے ذکر کیا اور اللہ کی قسم آں جناب کی شان اس سے بھی زیادہ ہے تو تم کس طرح یہ کہتے ہو تمہارے شیخ کے اس پر اعتراض کا کوئی فائدہ نہیں ۔ یہ کہہ کر تم اپنے شیخ کی بے ادبی کرتے ہو اور کہتے ہو کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں؟ اللہ تمہاری پردہ پوشی فرمائے)[1]۔ ابن العماد الحنبلی کہتے ہیں: ''وکان إماماً عَلَماً ،مِن الغواصین علی معاني الحدیث ، حسن التصنیف ، جید النقل''(وہ امام ، چوٹی کے عالم،حدیث کے معانی میں غوطہ لگانے والے ، بہت اچھے مصنف اور روایت و اقتباس کے ماہر تھے)[2]۔ان دلچسپ تعلیقات سے امام قرطبیؒ کی اللہ تعالیٰ کے حضور قبولیت کے ظاہری آثار معلوم ہوتے ہیں۔میدانِ علم کے شہسوار ایک دوسرے سے بڑھ کر ان کی شان، علمی مقام،تقویٰ ، بزرگی اور علو مرتبت ذکر کرنے میں اپنی قوتِ بیان صرف کردینے کے خواہش مند نظر آتے ہیں۔

وفات اور آخری آرام گاہ

علم وعمل، تزکیہ وصفوت اور جذبۂ للّٰہیت سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد امام قرطبیؒ نے صعیدِ مصر کے قصبہ منیۃ ابن خصیب یا منیۃ بنی خصیب میں ۹ شوال ۶۷۱ھ/ ۱۲۷۴ء کو وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے[3]۔

رحمة اللہ علیه رحمة واسعة شاملة کافیة وافیة ورفع درجاته في فسیح جنانه۔

۱۔ نفح الطیب : الباب الخامس فیمن رحل من الأندلسیین إلی المشرق، تعارف نمبر۱۲۲

۲۔ شذرات الذھب ج ۵ ، سنة إحدی وسبعین.

۳۔ اعلام زرکلی: ۵:۳۲۲،معجم المؤلفین ۳: ۵۲، ھدیة العارفین ۲: ۱۲۹،شذرات الذھب ج ۵ ، سنة إحدی وسبعین.

تفسیرِ قرطبی کا علمی مرتبہ اوراسلوبِ تالیف

عنوان اور موضوع

تفسیرِ قرطبی کا نام ''الجامع لأحکام القرآن والمبیّن لما تضمّنه من السنّة وآي الفرقان'' ہے۔ اس کے موضوع کی وسعت اسی نام سے ظاہر ہے۔ موضوع کے لحاظ سے تفاسیر دو قسم کی ہیں: ایک کو تفسیر عمومی کہتے ہیں جس میں آیات کی ترتیب کے مطابق ہر آیت کی تفسیر اور اس کے مضامین بیان کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسری قسم تفسیرِ موضوعی کہلاتی ہے جس میں کسی ایک موضوع کی آیات پر زیادہ زور دیا جاتا ہے جیسے فقہی تفاسیر یا تفسیر آیات احکام وغیرہ۔ کچھ موضوعی تفاسیر ایسی بھی ہیں جن میں آیات کا انتخاب نہیں کیا جاتا بلکہ تمام آیات کے معانی کسی مخصوص موضوع کو پیشِ نظر رکھ کر بیان کیے جاتے ہیں جیسے تفسیرِ صوفی یا تفسیرِ اشاری وغیرہ۔

امام قرطبیؒ کی تفسیر میں موضوعی اور عمومی دونوں پہلو جمع ہیں۔ اس کے نام کا پہلا حصہ موضوعی پہلو پر دلالت کرتا ہے یعنی اس میں قرآنی آیات کی روشنی میں فقہی احکام (Legal study of the Holy Quran) بیان ہوں گے۔ اس کا دوسرا حصہ عمومی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے یعنی فقہی احکام کے علاوہ اس میں تمام آیات کی عمومی تفسیر (Generel Commentary) اور اس ضمن میں آنے والی تمام احادیث کی وضاحت ہوگی۔ پھر فقہی احکام کے ساتھ لفظ ''الجامع'' لگا کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اس تفسیر میں قرآن کا فقہی مطالعہ کسی ایک مکتبِ فقہ کی آراء ذکر کرنے کے ساتھ مقید نہیں ہوگا بلکہ یہ فقہی آراء کا ایک جامع مطالعہ ہوگا جس میں تمام مشہور مکاتبِ فقہ کی آراء ذکر کی جائیں گی۔ تفسیر کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس میں تمام مکاتبِ فقہ کی آراء کا خلاصہ نہیں کہ لفظِ ''الجامع'' سے مراد مشترکہ فقہی آراء کا مطالعہ (Comprehensive study) ہو بلکہ اس میں فقہی احکام میں تمام مذاہبِ فقہیہ کا ایک طرح سے تقابلی مطالعہ (Comparative study) ہے۔ جس کی بنیاد تو مالکی فقہی آراء پر ہے مگر ہر مسئلہ میں دیگر مذاہب کی آراء اور ان کے دلائل بھی اس میں ذکر کر دیئے گئے ہیں۔ مالکی آراء ذکر کرتے وقت مؤلف اکثر ''قال علماؤنا'' (ہمارے علماء کہتے ہیں) کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ''المالکیة'' یا ''اصحاب مالکؒ'' بھی کہہ دیتے ہیں۔ حنابلہ کے لیے اکثر ''اصحاب احمد''، شافعیہ کے لیے ''الشافعیة'' اور حنفیہ کے لیے ''الکوفیون''، ''أصحاب أبي حنیفة'' اور ''أهل الرأي'' کہتے ہیں۔ کبھی مذہب ظاہری کی رائے ذکر کرنا مقصود ہو تو ''داؤد بن علي'' یا ''أصحاب داؤد بن علي'' کہہ دیتے ہیں۔

تفسیرِ قرطبی کا دوسرا پہلو عمومی تفسیر ہے جس میں قرآنِ مجید کی تمام آیات کا تفصیلی مطالعہ اور اس ضمن میں آنے والی احادیث کی وضاحت ہے ۔آیات کے تفصیلی مطالعہ میں مؤلفؒ نے صرفی تحقیق ،نحوی ترکیبات، لغوی ماثورات ، قراء ات ، تاریخی حقائق ، صوفیہ کی طرز پر عارفانہ اشارات ،ادعیہ و اذکار، فلسفیانہ موشگافیاں، سائنسی تحقیقات اور بیسیوں قسم کے دیگر تفسیری اقوال جمع کیے ہیں۔احادیث کی وضاحت میں کتاب کا حوالہ، سند کا درجہ، راوی پر بحث ،بعض دفعہ شانِ ورود اور مقام استدلال وغیرہ جیسے امور اس تفسیر میں ملتے ہیں۔حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ اور آیات کے حوالہ سے اپنے دور کے مسائل کا ذکر امام قرطبیؒ کی نمایاں خصوصیت ہے ۔

علمی مرتبہ

علامہؒ کا یہ عظیم شاہکار دراصل اسلامی علوم کا انسائیکلوپیڈیا ہے جس میں تفسیر ، حدیث ، فقہ، اور دیگر علومِ اسلامیہ کا ایک بیش بہا ذخیرہ یک جا میسر ہے ۔ علماء اسے پہلی نظر دیکھ کر اس کے علمی مقام کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے، طلبہ اپنی علمی پیاس بجھانے کے لئے اسے میٹھا چشمہ سمجھتے ہیں اور عوام کے لئے یہ معلومات کا وسیع تر خزانہ ہے۔ حافظ ذہبی نے اس کی تعریف یوں کی ہے:'' وقد سارت بتفسيره العظيم الشأن الركبان''(ان کی عظیم الشان تفسیر قافلے ساتھ لے کر چلے) ،مشہور مؤرخ فخرالدین الکتبی نے امام قرطبی کی اس کاوش کو''مليح إلى الغاية'' (حددرجہ لطیف) کہا ہے[۱]۔ابن العماد الحنبلی نے اس کی جامعیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے: والتفسير الجامع لأحكام القرآن الحاكي مذاهب السلف كلها وماأكثر فوائده.وكان إماماً عَلَماً ،من الغواصين على معاني الحديث ، حسن التصنيف ، جيد النقل. (اور تفسیر''الجامع لأحكام القرآن'' تمام علماء سلف کے نقطہ ہائے نظر کو ذکر کرنے والی ہے اور اس کے بے بہا فوائد ہیں۔مصنفؒ ایک امام ، چوٹی کے عالم،حدیث کے معانی میں غوطہ لگانے والے ،بہت اچھے مصنف اور روایت و اقتباس کے ماہر تھے) [۲]۔ معاصر محقق محمد حسین ذہبی نے تفسیر قرطبی کا تعارف یوں کروایا ہے :وعلى الجملة فإن القرطبي رحمه الله في تفسيره هذا حُرٌّ في بحثه ، نزيه في نقده، عفٌّ في مناقشته وجدله، ملمٌّ بالتفسير من جميع نواحيه بارع في كل فن استطرد إليه وتكلم فيه۔ [۳](قرطبیؒ اپنی اس تفسیر میں آزاد تحقیق ،بے لاگ تنقید اور غیر جانبدارانہ استدلال کے اصولوں پر کاربند نظر آتے ہیں۔ انہوں نے تفسیر کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا اور جس موضوع پر بحث شروع کی اسے نہایت مہارت سے پایہ تکمیل تک پہنچایا)۔

۱۔ نفح الطيب : الباب الخامس فيمن رحل من الأندلسيين إلى المشرق، تعارف نمبر ۲۲ ا

۲۔ شذرات الذهب ج ۵ ، سنة إحدى وسبعين.

۳۔ التفسير والمفسرون ۳:۱۳۰

علماء اور محققین کا اہتمام

حافظ ذہبیؒ کے جملہ : '' وقد سارت بتفسیره العظيم الشأن الركبان ''(ان کی عظیم الشان تفسیرکو قافلے ساتھ لے کر چلے) کا معنوی تسلسل آج بھی نظر آتا ہے کہ جب سے یہ تفسیر وجود میں آئی ہے اس کے مطالعہ کرنے والوں کے پررونق قافلہ کے ساتھ ساتھ مختلف پہلوؤں سے اسے موضوعِ تحقیق و تالیف اور مصدرِ اقتباس وتقلید بنانے والوں کا تانتا بھی بندھا رہا ہے۔بعد کے مفسرین میں سے اس سے لفظاً یا معنیً بکثرت اقتباس کرنے والوں میں حافظ ابن کثیرؒ، ابوالحیان الاندلسی اور امام شوکانی جیسے عظیم نام نظر آتے ہیں[1]۔ امام شوکانیؒ کی تفسیر فتح القدیر تو بادی النظر میں اس کا اختصار نظر آتی ہے ۔پوری عبارات لفظ بلفظ یہیں سے منقول ملتی ہیں۔ برصغیر پاک وہند کے تفسیری ادب میں شاذ ونادر ہی کوئی تفسیر ایسی ہوگی جس کے مؤلف نے قرطبی کو اپنے بنیادی مراجع میں شامل نہ رکھا ہو۔ اس پرعلمی کاموں کے سلسلہ میں سب سے پہلے غالباً سراج الدین عمر بن علی ابن الملقن الشافعی (م ۸۳۱ھ) نے اس کی تلخیص کی[۲]۔ ۱۹۵۲ءمیں دارالکتب المصریۃ سے اس کی اشاعت ہوئی جس میں شیخ احمد عبد العلیم البردونی کی سربراہی میں شیخ ابراہیم اطفیش، شیخ بشندی خلف اللہ اور شیخ محمد حسنین نے مل کر اس میں تصحیحات ،مشکل الفاظ کے معانی اور چیدہ چیدہ تخریجات کا کام کیا۔انہی حضرات نے ایک قابلِ قدر خدمت یہ سرانجام دی کہ مؤلفؒ نے جابجا اپنی تفسیر کے جن دیگرمقامات کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے تعین کی کوشش کر کے ان کے حوالہ جات حواشی میں درج کردیئے ۔تصحیحات کو انہوں نے متن کے اندر ہی قوسین میں درج کردیا۔ ۱۹۵۲ کے بعد یہی نسخہ متعدد بار شائع ہوا۔ جامع ازہر کے پروفیسر ڈاکٹر قصبی محمود زلط نے''القرطبي ومنهجه في التفسير'' کے عنوان سے اس پر ۴۸٦ صفحات کا ایک جامع مقالہ لکھا جسے ''المركز القريب للثقافة والعلوم'' نے شائع کیا ہے۔ اسکندریہ یونیورسٹی مصر کے طالب علم احمد بلعم مفتاح السوسی کواسی عنوان ''القرطبي ومنهجه في التفسير'' سے مقالہ لکھنے پر ۱۹۷۲ء میں ایم اے کی ڈگری دی جاچکی ہے۔جامعہ قاہرہ ،مصر کے کاظم ابراہیم کاظم '' تفسیرِ قرطبی میں نحوی مسائل''پر مقالہ لکھ کر ۱۹۸۲ء میں پی ایچ ڈی کرچکے ہیں۔جدہ، سعودی عرب میں ''كلية التربية للبنات'' سے تفسیرِ قرطبی کی روشنی میں''حدود'' کے بارے میں امام قرطبیؒ کی مجتہدانہ آراء'' کے دیگر فقہاء کی آراء سے تقابلی جائزہ پرمبنی مقالہ پر ۱۴۱۰ھ میں سعدیہ حامد جمعہ الحیاوی کوڈاکٹریٹ کی ڈگری مل چکی ہے۔ جامعہ ازہر سے ایک اور پی ایچ ڈی ''الدخيل في تفسير القرطبي'' کے عنوان سے احمد الشحات احمد موسیٰ کرچکے ہیں۔ قاہرہ یونیورسٹی سے ''تفسير القرطبي: تحقيق ودراسة في المصادر التفسيرية '' (سورۂ کہف کے آخر

۱۔ القرطبی ومنهجه فی التفسير، الفصل الحادي عشر، القيمة العلمية لتفسير القرطبي ص ۴۱۸

۲۔ کشف الظنون ۱:۵۳۴

تک)کے عنوان سے رشاد احمد یوسف ۱۹۸۸ء میں پی ایچ ڈی کرچکی ہیں۔''ابوعبداللہ القرطبی وجھوده في النحو واللغة'' کے عنوان سے عبدالقادر رحیم جتی الہیتی کی کتاب مارکیٹ میں آچکی ہے۔اس کے علاوہ ''الإمام القرطبي شيخ أئمة التفسير ''تالیف مشہور حسن محمود سلمان،''الشواھد الشعرية في تفسير القرطبي''تالیف جمال احمد محمد منصور،''القرطبي المفسر وكتابه الجامع لأحكام القرآن''تالیف الصادق عبدالرحمٰن الغریانی، ''مختار تفسیرِ القرطبي : الجامع لأحكام القرآن''تالیف توفیق الحکیم،''مختارات من تفسير القرطبي والطبري والرازي'' تالیف محمد أدیب صالح،''مختصر تفسیرِ قرطبی'' تالیف محمد بن أحمد شمس الدین مَنظرِ عام پر آچکی ہیں[1]۔ ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸میں'' دارالکتب العلمية بيروت'' نے اس کے پرانے نسخہ کے ساتھ فہارس کی ایک جلد کا اضافہ کیا جس میں تفسیرِ قرطبی میں سے اطراف الحدیث، اعلام رجال، کنیتیوں،اعلامِ نساء، قبائل وشعوب، فرق ومذاہب، مقامات اور شعری شواہد پر مشتمل آٹھ قسم کی فہارس تیار کی گئیں۔ شیخ مشہور حسن سلیمان اور جمال عبداللطیف الدسوقی نے كشاف تحليلي للمسائل الفقهية في تفسير القرطبي کے عنوان سے اس کے فقہی اور اصولی مباحث کی تفصیلی فہرست تیار کی جسے مكتبة الصديق، طائف (سعودی عرب) نے ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء میں شائع کیا۔اس فہرست کی ابتدامیں''شخصية القرطبي وعصره من خلال تفسيره'' کے عنوان سے جابجاتفسیرِ قرطبی کے حوالہ جات سے مؤلف کے ماحول اوران کی ذاتی زندگی کے بعض پہلوؤں پرعمدہ روشنی ڈالی ہے۔۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۳ء میں دارالفکر بیروت سے شیخ عرفات العشّا کی تعلیق وتخریج، شیخ صدقی محمد جمیل کی نظر ثانی اور مفتی لبنان شیخ خلیل محیی الدین المیس کے پیش لفظ کے ساتھ ایک اچھا ایڈیشن شائع ہواجس میں کتاب کے مختلف مندرجات کی الگ الگ فہارس بھی دے دی گئیں۔ قاہرہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر محمد ابراہیم حفناوی اور ڈاکٹرمحمود عثمان کی تحقیق وتخریج سے دارالحدیث قاہرہ نے ۱۴۱۴ھ/ ۱۹۹۴ء میں ایک نہایت عمدہ نسخہ شائع کیا ہے جس کی تخریجات کافی حد تک قابلِ اعتماد معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء میں دارالکتاب العربی بیروت نے شیخ عبدالرزاق المہدی کی تحقیق سے ایک نسخہ شائع کیا ہے جس کے شروع میں تفسیر کی اقسام اور مفسرین کے تعارف پر مشتمل ایک مقدمہ بھی شامل ہے۔انہوں نے حدیث کے حواشی میں اگرچہ صرف کتاب کے نام اور حدیث نمبر پر اکتفا کیا ہے مگراس نسخہ کی قابلِ قدر بات یہ ہے کہ حدیث کے حوالہ جات اول سے آخر تک مسلسل نمبر کے ساتھ دیگر حواشی سے الگ ذکر کیے گئے ہیں۔ فضائل وآداب اور علومِ قرآنِ مجید پر مشتمل تفسیرِ قرطبی کا مقدمہ مستقل کتاب کی صورت میں بھی چھپ چکا ہے۔

۱۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کے مقالہ جات اور تفسیر قرطبیؒ کے بارے میں عربی کتب کی معلومات کے لیے مركز جمعة الماجد للثقافة والتراث دبي کے لائبریری ریکارڈ سے کافی مدد لی گئی ہے۔

آج کے دور میں الیکٹرانک میڈیا نے دنیا کی اچھی بری ہر قسم کی چیزیں ہر شخص کی انگلیوں کے نیچے لاکر رکھ دی ہیں ۔عصرِ حاضر کے سکالرز نے علومِ دینیہ کی ترویج واشاعت میں بھی اس وسیلہ کو خوب استعمال کیا ہے۔ بیسیوں کتب ایک سی ڈی ڈسک میں آجانامعمولی بات ہے ،کئی ڈسکیں ایسی بھی ہیں جو ایک ہزار یا اس سے بھی زائد کتب پر مشتمل ہیں۔اس میدان میں بھی تفسیرِ قرطبی،تفسیر کی متخصص موضوعاتی سیڈیز میں تو صفِ اول میں نظر آتی ہی ہے، علومِ اسلامیہ کے عام مطالعہ یا طلبہ کے لیے تیار کی جانے والی سیڈیز کو بھی شاید تفسیرِ قرطبی کے بغیر نامکمل ہی سمجھا جاتا ہے۔انٹرنیٹ کے ذریعے دینی تعلیمات کے پروگراموں ''المحدّث'' وغیرہ میں بھی یہی حال ہے یا اس سے بھی دو قدم آگے ہوگا۔ایسے پروگراموں میں تو عربی کے ساتھ ساتھ اس عظیم تفسیر کوانگریزی وغیرہ میں بھی نشر کرنے کی سنجیدہ کوششیں جاری ہیں تحقیق وتخریج کے حوالے سے بھی تفسیرِ قرطبی پر آئے دِن نئی نئی کاوشیں منظرِ عام پر آرہی ہیں۔ دراساتِ علیا(ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی سطح) کے طلبہ بھی مدتوں سے اسے تحقیق کا وسیع میدان سمجھتے آئے ہیں اور اس وقت بھی مختلف جامعات میں اس پر کسی نہ کسی پہلو سے کام جاری ہے۔

تفسیرقرطبی کااسلوبِ تالیف

امام قرطبیؒ کااپنی تفسیر میں یہ اسلوب رہا ہے کہ زیرِ مطالعہ آیت یا اس کا کچھ حصہ نقل کرنے کے بعد سب سے پہلے اس کے تفسیری مباحث کی تعداد بتاتے ہیں۔ان مباحث کے لیے وہ ہمیشہ ''مسائل'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مسائل سے ان کی مراد صرف فقہی احکام نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک ہر بحث ایک مسئلہ ہے جسے ہم نے اردو میں بھی ''بحث'' ہی لکھا ہے ان مباحث میں آیت کی لغوی تشریح، قراء ات،شانِ نزول،فقہی مسائل اورتفسیری نکات وغیرہ ہر پہلوایک مستقل مسئلہ کے تحت بیان ہوتا ہے ۔مؤلف ہر چیز کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی تہہ تک جانے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس کی بحث طویل ہی ہوجائے ۔ ان کے ہاں دوسری کتب سے اقتباسات کارواج بھی بہت ہے جس میں جدید اصولِ تحقیق کی واضح جھلک نظر آتی ہے ۔مؤلفؒ نے کتاب کے شروع میں ہی اپنے اسلوب کی چیدہ چیدہ خصوصیات بیان کردی ہیں۔چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

وشرطي في هذا الكتاب إضافة الأقوال إلى قائليها و الأحاديث إلى مصنففيها، فإنه يقال مِن بركة العلم أن يضاف القول إلى قائلهِ و كثيرا ما يجيء الحديث في كتب الفقه و التفسير مبهما...... فلا يقبل منه الاحتجاج به و لاالاستدلال حتى يضيفه الى من خرَّجه ونحن نشيرُ إلى جُمَلٍ من ذلک في هذَاالكتاب واللهالموفق للصواب. وأضرب عن كثير من قصص المفسرين وأخبار المؤرخين إلاَّ مالابد منه ولاغنيً عنه للتبيين . واعتضتُ من ذلک تبيين آى الأحكام بمسائل تُسفِرُ عن معناها و ترشد الطالب إلى

مقتضاهافضَّمْنتُ كل آية تتضمن حكماً أوحكمين فمازادمسائل نبين فيها ماتحتوي عليه من أسباب النزول وتفسير الغريب والحُكم . فإن لم تتضمن حكماً ذكرتُ ما فيها من التفسير والتأويل ، هكذاإلى آخر الكتاب (۱)

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱۔ ہم نے ہر قول کو اس کے قائل کی طرف اور ہر حدیث کو کتاب کے مصنف کی طرف منسوب کیا ہے۔

۲۔ ضرورتِ شدیدہ کے علاوہ مفسرین و مورخین کی طرح قصے کہانیاں ذکر کرنے سے اکثر اجتناب کیا ہے۔

۳۔ آیات احکام پر خصوصی توجہ دی ہے۔ جن آیات میں ایک، دو یا اس سے زیادہ احکام مستنبط ہوتے تھے ہم نے ان کو بیان کردیا ہے۔ جن آیات میں احکام نہیں تھے ان میں دیگر تفسیری پہلوؤں کو اجاگر کرنے پر اکتفا کیا ہے۔

۴۔ جہاں اسباب نزول کی طرف اشارہ ملتا تھا وہ بھی ذکر کردیا ہے۔

۵۔ مشکل الفاظ کے مطالب بھی واضح کردیئے ہیں۔ ہم نے کتاب کے آخر تک یہی اسلوب اختیار کیا ہے۔

علامہ قرطبیؒ کی تفسیر میں ان امور کا خاصا اہتمام کیا گیا ہے۔ بعض تفاسیر میں اسرائیلیات اور تاریخی رطب و یابس کی جو بھرمار ہوتی ہے یہاں اس میں خاطر خواہ کمی نظر آتی ہے۔ ہر دور کے علماء نے اسے تفسیری مرجع کا درجہ دیا ہے تاہم یہ دعوی کرنا مشکل ہے کہ تفسیر قرطبی میں اس منہج کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہوگیا ہے۔ ذیل میں چند امور کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے تاکہ اس عظیم علمی شاہکار سے بہتر طور پر استفادہ ممکن ہوسکے۔

اسلوبِ تالیف کا ایک جائزہ

مؤلفؒ نے اپنے اسلوب کی پابندی کا اہتمام فرمایا ہے تاہم اس قدر ضخیم علمی کام میں اس کے کسی پہلو میں کام کی مزید گنجائش مل جانا کوئی نئی بات نہیں۔ ان کا ایک اصول قول کی نسبت قائل کی طرف ہے جس کا اکثر اہتمام کیا گیا ہے مگر اس کے باوجود جا بجا ''قيل'' اور ''رُوِيَ'' کے الفاظ اس میں مزید تحقیق کی گنجائش کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات قول کو کسی کتاب کے مصنف کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے مگر درحقیقت ایسا نہیں ہوتا(۲)، بعض اوقات ثانوی مرجع سے کسی کا قول نقل کرنے کی وجہ سے معنی میں تبدیلی آجاتی ہے (۳)۔

۱۔ مقدمة تفسير القرطبي ۱: ۳

۲۔ سبا: ۱۶ ''سَيلَ الْعَرِمِ'' کے بارے میں زجاج کی طرف منسوب قول، زجاج: معانی القرآن واعرابہ ۴: ۲۴۸

۳۔ فاطر: ۱۰ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾ کے بارے میں زجاج کا قول جو درحقیقت امام نحاس کی کتاب سے نقل کیا گیا۔ نحاس: اعراب القرآن ۳: ۳۶۴، زجاج: معانی القرآن واعرابہ ۴: ۲۶۴

امام قرطبیؒ کا دوسرا اصول حدیث کی نسبت اس کے مخرج کی طرف ہے۔ ان کی تفسیر میں مختلف اسالیب سے کتبِ حدیث کے حوالہ جات بکثرت ملتے ہیں۔ کبھی ایک حدیث کے متعدد طرق ذکر کیے گئے ہیں۔ کہیں حدیث کا درجہ بھی متعین کر دیا گیا ہے۔ بعض احادیث کتاب کے حوالے، ابواب کے عناوین اور پوری اسناد کے ساتھ منقول ہیں۔ بعض میں صرف کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے، حدیث پوری سند کے ساتھ منقول ہے اور ایک سے زائد طرق بھی ذکر کردیئے گئے ہیں۔ بعض احادیث حوالہ جات اور پوری اسناد کے ساتھ ایک طریق سے نقل کی گئی ہیں۔ کچھ صرف کتاب کے حوالہ اور مختصر سند کے ساتھ منقول ہیں۔ بعض احادیث میں صرف راوی کے نام اور کتاب کے حوالہ پر اکتفا کیا گیا ہے۔ تفسیرِ قرطبی میں بے حوالہ احادیث کی بھی کمی نہیں۔ بعض احادیث میں حوالہ ہے، راوی کا نام مذکور نہیں، بعض میں راوی کا نام ہے، حوالہ موجود نہیں۔ بعض کو بلاحوالہ صرف راوی کے نام کے ساتھ نقل کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ روایت کا دوسرا طریق بھی ذکر کردیا گیا ہے۔ بہت سی احادیث ایسی ہیں جن میں نہ کتاب کا حوالہ ہے نہ راوی کا۔ بعض میں راوی کا نام موجود ہے مگر حدیث کی کتاب کا حوالہ نہیں بلکہ اسی تفسیر کے کسی دوسرے مقام کی طرف اشارہ کردیا گیا ہے۔ کہیں کہیں کتابِ حدیث کا حوالہ بھی دے دیا گیا ہے اور تفسیرِ قرطبی کے کسی دوسرے مقام کا بھی۔ بعض مقامات پر مؤلف نے صرف راوی کا نام ذکر کرکے اپنی ہی کسی کتاب کا حوالہ دے دیا ہے ا، حدیث کی کسی کتاب کا حوالہ نہیں دیا[1]۔ بعض مقامات پر نہ کتابِ حدیث کا حوالہ دیا ہے نہ راوی کا نام، بلکہ تفسیر قرطبی ہی کے کسی اور مقام کی طرف اشارہ کردیا ہے[2]۔ امام قرطبیؒ کا ایک اصول من گھڑت قصے کہانیوں سے اجتناب ہے۔ تفسیرِ قرطبیؒ میں ایسے قصوں کی تعداد نسبتاً کم ہے مگراس کے باوجود اس میں اسرائیلیات کی خاصی تعداد جمع ہوگئی ہے۔ کبھی مؤلف نے ایسی کوئی کہانی ذکرکرنے کے بعد دلائل سے اس کا رد کیا ہے اور کبھی بڑی عجیب عجیب روایات سے بلا تبصرہ گزر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''التذکرہ'' کے حوالے سے حضرت حذیفہ ابن الیمانؓ کی روایت سے سفیانی کے لشکر کا لمبا چوڑا قصہ لکھا ہے جس کی تفاصیل معتبر کتب کی تفاصیل سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان سے متصادم ہیں اور مؤلفؒ ان سے مرور الکرام بلاتبصرہ گزر گئے ہیں۔ ''التذکرہ'' میں خود مؤلف نے بھی لکھا ہے: ''حدیث حذیفة هذا فيه طول'' (حضرت حذیفہ کی اس روایت میں کچھ زیادہ ہی تفصیل ہے)۔ انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس روایت کا مرجع ابوالحسین جعفر بن المنادی کی ''کتاب الملاحم'' ہے اور اس کا مرجع عبرانی نبی دانیال کی کتاب ہے[3]۔ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا حالاں کہ طبری وغیرہ دیگر ائمہ تفسیر نے ان تفاصیل کو باطل قرار دیا ہے[4]۔

۱۔ سبا: ۵۱، ﴿وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ فَزِعُوا فَلَا فَوْتَ﴾، حدیثِ حذیفہؓ

۲۔ سبا: ۳۹، ﴿وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ﴾

۳۔ سبا: ۵۱، القرطبی و منہجہ ص ۴۱۰۔۴۱۷، التذکرۃ: ص ۶۱۰-۶۱۱

۴۔ تفسیر طبری ۱۰: ۳۸۷ ومابعد

مؤلفؒ نے آیاتِ احکام کو خصوصی طور پر موضوعِ بحث بنایا ہے اور ایسی ہر بحث میں عموماً دقیق تفاصیل ذکر کی ہیں جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴾[البقرة۲:۳] کی تفسیر چھبیس مباحث میں بیان فرمائی ہے جن میں سے بحث نمبر چار سے اکیس تک انتیس صفحات پر مشتمل اٹھارہ مباحث صرف نماز کے احکام کے بارے میں ہیں۔جہاں بھی کوئی فقہی حکم دلالۃ یا اشارۃ ثابت ہوسکتا ہو مؤلف حتی الامکان اسے ضرور بیان کرتے ہیں۔ وہ ہر مسالہ کو عموماً فقہ مالکی کی روشنی میں بیان کرتے ہیں۔البتہ اس کے ساتھ ساتھ دیگر فقہی مذاہب کی آراء اور دلائل کو بھی نہایت اہتمام سے ذکر کردیتے ہیں ۔بعض اوقات اپنی مجتہدانہ بصیرت کو استعمال کرتے ہوئے غیر مالکی آراء کو مالکی آراء پر ترجیح بھی دے دیتے ہیں اور اس کے دلائل بھی ذکر کرتے ہیں[1]۔

امام قرطبیؒ کے دور تک اہلِ اندلس دینی علوم کے ساتھ ساتھ صنعت اور سائنسی علوم میں بہت ترقی کرچکا تھا جس کا اثر ان کی تفسیر میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔بعض اوقات وہ موضوعاتِ ہیئت[2] وغیرہ پر ایسے بحث کرتے ہیں گویا جدید دور کا کوئی سائنسدان مقالہ لکھ رہا ہو۔مؤلف نے آیات وسور کا شانِ نزول ذکر کرنے کا خاصا اہتمام کیا ہے تاہم اس میں مزید کام کی کافی گنجائش موجود ہے۔قراءات میں وہ مشہور روایات کے ساتھ ساتھ روایاتِ شاذہ کا تعارف بھی کروادیتے ہیں اور لغوی مباحث میں مشکل الفاظ کے معانی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ صرف ،نحو، بلاغت ہر پہلو کواجاگر کرتے ہیں۔

تفسیر قرطبی کے بارے میں یہ بات پیشِ نظر رہنا ضروری ہے کہ یہ ایک بہت بڑا علمی خزانہ اور مختلف علوم اسلامیہ کا عظیم تحقیق مرجع ہے جس میں مصنفؒ نے اپنے سابقین اور معاصرین کے دروس اور تالیفات سے خوب استفادہ کیا اور یہ فطری بات ہے کہ ایسی ضخیم کتاب میں کچھ نہ کچھ پہلو ایسے مل سکتے ہیں جن پر مزید تحقیقی کام کی گنجائش موجود ہو۔ اس تفسیر کے حوالے سے بالخصوص اقتباسات اور علماء سلف سے منقول اقوال پر تحقیقی کام کی خاصی گنجائش موجود ہے ۔شاید صدیوں کی نقل وحرکت اور کتابت ونسخ کے دوران الفاظ یاعبارات میں ایسی تبدیلیاں آگئی ہیں جن کی وجہ سے بعض مقامات پر معانی میں بھی کچھ تبدیلی واقع ہوگئی ہے[3]۔ بعض اوقات [illegible]وی مراجع سے اقتباسات کی وجہ سے کچھ تبدیلیاں آگئی ہیں[4]۔

۱۔ القرطبي ومنهجه في التفسير ص ۳۱۹-۳۵۷

۲۔ البقرۃ:۱۹، رعد اور برق کی سائنسی تحقیق، فاطر:۱۲، موتیوں کی تکوین۔

۳۔ سبا: ۱۷ میں امام نحاس کی طرف منسوب لفظ ''عرم '' کی تحقیق،نحاس : اعراب القرآن۳:۳۳۸

۴۔ فاطر: ۱۰ بارشاد باری تعالیٰ: ﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا﴾ فراء:معانی القرآن۲:۳٦۷ ، نحاس : اعراب القرآن۳:۳۹۴

تفسیرِ قرطبی اردو میں

کچھ عرصہ قبل تک تفسیرِ قرطبی تک صرف عربی دان اہلِ علم کی رسائی ہی ممکن تھی۔ عرب ممالک کے طلبہ، علماء اور محققین نے اس خصوصیت سے خوب فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے تعلیمی تحقیقی اداروں کی زیرِ سرپرستی یا اپنے ذوقِ تحقیق کی تسکین کے لیے بیسیوں کتابیں اس کے بارے میں لکھ ڈالیں جن میں اس کے مختلف پہلوؤں کو موضوعِ تحقیق بنایا گیا مگر جوں جوں اطرافِ عالم میں فاصلے سمٹتے جارہے ہیں علوم وفنون میں اشتراک بھی بڑھتا جارہا ہے۔ تفسیر قرطبی کو بھی اس ترقی سے وافر حصہ ملا۔ اردوزبان میں اس کا مکمل ترجمہ تو اب تک نہیں چھپ سکا مگر اردو بولنے اور لکھنے والے علماء ومصنفین نے جذبۂ تعلیم وتبلیغ کے تحت اس کے علوم ومعارف کو اردو قارئین تک کسی نہ کسی درجے میں پہنچانے کی سعی ضرور کی۔ اردو کی مشہور ومتداول تفاسیر میں سے شاید ہی کوئی ایسی ہو جس میں قرطبیؒ کے حوالہ جات جابجا نظر نہ آتے ہوں۔ یہ سب کوششیں قابلِ قدر ہیں مگر اسلامی علوم کے اس انسائیکلوپیڈیا تک اردو دان قاری کی رسائی اوراس کے بے شمار علمی فوائد کے پیشِ نظر ایک عرصہ سے علمی حلقوں میں اس کے اردو ترجمہ کی ضرورت کا اظہار کہیں نہ کہیں تذکرہ ہوتا ہی رہتا تھا مگراس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی مضبوط عملی قدم نہ اٹھایا جاسکا۔ **شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد** کی طرف سے یہ کام بندہ کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس منصوبے کا ابتدائی خاکہ محترم پروفیسر ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب صدر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کی ہدایات کے مطابق تیار کیا گیا۔ ترجمہ کی پہلی جلد کی تیاری کے دوران بھی وقتاً فوقتاً جناب موصوف کی سرپرستی حاصل رہی جبکہ محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی صاحب ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی کی مستقل رہنمائی میرے لیے مشعلِ راہ رہی۔ شریعہ اکیڈمی کے فاضل رفقائے کار نے ہر مرحلہ پر میری حوصلہ افزائی بھی فرمائی اور قیمتی مشوروں سے بھی نوازا جزاھم اللہ خیراً۔ یوں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہم علماء ومحققین کی دیرینہ خواہش کی تکمیل کی طرف پہلا قدم اٹھانے میں کامیاب ہوئے اور آج اردو میں تفسیرِ قرطبیؒ کی پہلی جلد ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ سب تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہیں جس نے یہ کرم فرمایا۔

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُونَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ.

وأنا العبد الفقير إلى مولاه القدير

إكرام الحق يٰسين

۲۱ رمضان المبارک ۱۴۲۵ھ

۵ نومبر ۲۰۰۴ء بروز جمعہ

مقدمۂ مؤلّف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبه نستعين، وصلّى الله على سيّدنا محمد و على آله و صحبه وسلّم تسليما

مقدمۂ مؤلف

فقیہِ دوراں، عالم باعمل، ماہر حدیث علامہ ابو عبداللہ محمد بن احمد بن ابوبکر بن فَرح انصاری خزرجی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

تمام تعریفیں اس ذات عالی کے لیے ہیں جس نے اپنی تعریف خود کی، قبل اس کے کہ اس کی تعریف کوئی اور کرتا۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ وہ اکیلا سب کو پالنے والا ہے اور بے نیازی اسی کی ذات کو سجتی ہے۔ وہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔ اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔ وہ عظمتوں والا سخی ہے جس کی عطائیں لامحدود ہیں۔ قرآن اس کا کلام اور انسان اس کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کر کے اسے ایمان کی نعمت سے نوازا اور اپنے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قوتِ بیان دے کر بھیجا جن کی رسالت رہتی دنیا تک باقی رہے گی۔

قرآن کی عظمت

اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی واضح کتاب دے کر بھیجا جو شک اور یقین کو جدا جدا کر کے دکھانے والی ہے۔ وہ ایسی عظیم کتاب ہے کہ دنیا بھر کے فصیح اللسان اور قادر الکلام لوگ اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز، دنیا بھر کے عقلاء اس کے مقابلہ سے قاصر اور جہاں بھر کے بُلغاء اس کے سامنے گونگے نظر آتے ہیں۔ سب مل کر بھی کوشش کریں تو اس کی مثال پیش نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں جو مثالیں بیان فرمائی ہیں وہ ہر غور کرنے والے کو زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھاتی ہیں اور جو احکام بیان فرمائے ہیں وہ ہر توجہ کرنے والے کی رہنمائی کرتے ہیں۔ باری تعالیٰ نے اس کتاب میں ضروری احکام واضح طور پر بیان فرما دیئے ہیں، حلال وحرام کا فرق بتا دیا ہے، اپنی منشاء سمجھانے کے لیے مواعظ اور قصے بار بار دہرائے ہیں، مثالیں بیان کی ہیں اور غیب تک کی خبریں بتا دی ہیں اور اس کے بارے میں یہ ارشاد فرما دیا ہے: ﴿مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام ٦: ٣٨] ہم نے اس کتاب میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔

اہلِ قرآن کی عظمت اور ذمہ داریاں

اس کتابِ مقدس کے ذریعے باری تعالیٰ نے اپنے اولیاء سے خطاب فرمایا تو وہ اس کا مقصود سمجھ گئے۔ ان کے لیے اپنی مراد بیان فرمائی تو وہ جان گئے۔ یوں قرآن کے پڑھنے والے اللہ جل جلالہٗ کے پوشیدہ رازوں کے امین اور اس کے علمی خزانہ کے محافظ ٹھہرے۔ وہی انبیاء کے وارث اور خود باری تعالیٰ کے قابلِ اعتماد بندے ہیں۔ وہی اللہ والے، اس کے خاص بندے، بہتر لوگ اور اس کی منتخب ہستیاں ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۱] إِنَّ لِلّٰهِ أَهْلِينَ مِنَّا۔ قالوا: یا رسول اللّٰه، مَنْ هُم؟ قال: هُم أهلُ القُرآنِ أَهْلُ اللّٰهِ وَ خاصَّتُهُ۔

ہم میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اپنے ہیں۔صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہیں؟ آپ نے فرمایا: وہ قرآن والے ہیں۔ وہی اللہ والے اور اس کے خاص بندے ہیں۔اس حدیث کو امام ابن ماجہؒ نے اپنی ''سنن'' میں اور ابوبکر البزارؒ نے اپنی ''مُسند'' میں نقل کیا ہے۔

اب جس کے پاس کتاب اللہ کا علم ہے اس کا زیادہ حق بنتا ہے کہ جن امور سے اس کو منع کیا گیا ہے اُن سے رُک جائے اور جن کی وضاحت کی گئی ہے ان سے نصیحت حاصل کرے، اللہ سے ڈرے، تقویٰ اختیار کرے، باری تعالیٰ کی عظمت میں غور کرے اور اس کے سامنے شرمندہ ہونے سے ڈرے کیوں کہ اسے وہ ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں جو انبیاء کرام کی تھیں اور اسے قیامت کے دن دوسری قوموں کے ان لوگوں کے خلاف گواہ بنایا گیا ہے جو احکام خداوندی کی نافرمانی کے مرتکب ہوئے ہوں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ﴾ [البقرۃ ۲:۱۴۳] اور اسی طرح ہم نے تمھیں اعتدال پر قائم رہنے والی اُمت بنایا تا کہ تم لوگوں پر گواہ بنو۔

---

[۱] سنن ابن ماجہ: كتاب المقدمة، باب فضل مَن تعلم القرآن و علّمه ۱:۷۸، مستدرک حاکم: كتاب فضائل القرآن، باب أخبار في فضائل القرآن جملة ۱:۷۴۳۔ اس حدیث کی سند حسن اور راوی ثقہ ہیں ۔ بوصیریؒ نے زوائد میں اسے صحیح لکھا ہے۔ امام حاکم فرماتے ہیں یہ حدیث تین طرق سے منقول ہے اور تینوں کے راوی حضرت انس رضی اللہ عنہ ہیں مگر زیرِنظر طریق سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے اس سے سکوت اختیار کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے مطالب عالیہ ۳۵۰۰ میں حضرت نعمان بن بشیرؓ سے اس کا شاہد بھی نقل کیا ہے جس کی سند میں خلیل بن زکریا متروک ہے اور مجالد بن سعید قوی نہیں ہے جیسا کہ تقریب میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حدیث مذکور اسی سند کے ساتھ حسن ہے۔ واللہ اعلم۔

یاد رکھیے! قصور وار تو وہ ہے جو قرآن پاک کا علم رکھنے کے باوجود غافل رہے اور اس کا قصور اس شخص سے زیادہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرنے سے بے بہرہ اور جاہل رہتا ہے۔ جس شخص کو قرآنی علم کی نعمت سے نوازا گیا اور اس نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا، اس کے نواہی نے اسے جھنجھوڑا مگر وہ باز نہ آیا بلکہ گندے گناہوں اور شرمناک جرائم کا مرتکب ہوا تو قرآن اس کے خلاف حجت ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اس کا حریف ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

[۲] الْقُرآنُ حُجَّةٌ لَكَ أو عَلَيك

قرآن تمہارے حق میں حجت ہوگا یا تمہارے خلاف حجت بنے گا۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

جس شخص کو رب تعالیٰ نے قرآن کریم کے حفظ کی نعمت سے نواز ا اور اس پر خصوصی مہربانی فرمائی اس کا فرض بنتا ہے کہ اس کی تلاوت کا صحیح حق ادا کرے، اس کی عبارات میں موجود حقائق میں غور و فکر کرے، اس کے عجائبات کو خوب سمجھے اور جو امور غیر مانوس محسوس ہوں ان کی خوب تحقیق کرے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ مُبَارَكٌ لِيَدَّبَّرُوا آيَاتِهِ﴾ [صٓ ۳۸: ۲۹] یہ کتاب بڑی برکت والی ہے جسے ہم نے آپ پر اس لیے نازل کیا تاکہ لوگ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔ نیز ارشاد ہے: ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَى قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ [محمد ۴۷: ۲۴] کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔

اللہ ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمائیں جو قرآن کریم کے حق کا صحیح خیال رکھتے ہیں، اس میں کماحقہ غور کرتے ہیں، اس کو اس کا پورا حصہ دیتے ہیں، اس کی شرائط پوری کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کہیں اور ہدایت تلاش نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کتاب کی واضح آیات کی معرفت اور اس کے حتمی احکام پر عمل کرنا نصیب فرمائے اور اس کی برکت سے ہمارے لیے دنیا و آخرت کی بھلائیاں جمع فرما دے۔ وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور وہی بخشنے والا ہے۔

تفسیرِ قرآن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام

پھر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے اجمال کی تفصیل، مشکل کی تفسیر اور متعدد احتمالات میں تعیین کا کام نبی

[۲] صحیح مسلم: کتاب الطهارة، باب فضل الوضوء ۱:۲۰۳، جامع ترمذی: کتاب الدعوات ۵:۵۳۵، سنن نسائی: کتاب الزكاة، باب وجوب الزكاة ۵:۵، سنن ابن ماجہ: کتاب الطهارة وسننها، باب الوضوء شطر الإيمان ۱:۱۰۲، سنن دارمی: کتاب الطهارة، باب ماجاء في الطهور ۱:۱۷۶، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب الأذكار ۳:۱۲۳، مسند احمد: حديث أبي مالك الأشعری رضی اللہ عنہ ۶:۳۷۱

کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سونپ دیا تا کہ تبلیغ رسالت کے ساتھ ساتھ ان امور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت بھی واضح ہو جائے اور اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام امتیاز کا پتہ بھی چل جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾[النحل١٦ : ٤٤] اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) آپ پر نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کر دیں جو ان کے لیے اُتارا گیا ہے۔

تفسیرِ قرآن میں علماء کی حیثیت

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علماء کرام کے ذمہ یہ کام لگایا گیا کہ قرآن کریم کے جن معانی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے متوجہ فرمایا ہے انہیں اخذ کریں اور جن اصولوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے ان کی روشنی میں اجتہاد کر کے نصوص قرآنیہ کی مراد تک پہنچیں۔ اس طرح وہ عام لوگوں کے مقابلے میں امتیازی شان پائیں گے اور اپنی اس محنت کے اجر و ثواب کے مستحق قرار پائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ﴾ [المجادلة٥٨: ١١] تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جن کو علم کی نعمت سے نوازا گیا، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی کتاب دین کی اصل ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت اس کی وضاحت ہے اور ان دونوں سے جو مسائل علماء اخذ کرتے ہیں وہ اس کی تشریح ہیں۔ شکر ہے ذات باری تعالیٰ کا جس نے ہمارے سینوں کو اپنی کتاب کے لیے ظرف اور ہمارے کانوں کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کا محل ورود بنایا اور ہمیں کتاب و سنت کو سیکھنے، ان کے معانی اور مشکل عبارات کے مفاہیم تک پہنچنے کی کوشش کرنے، پھر ان سب کے ذریعے رضائے رب العالمین کی تلاش کو مقصد بنانے اور اپنے دین کا علم حاصل کرنے کی طرف متوجہ فرمایا۔

مقصدِ تالیف

ان تمہیدی کلمات کے بعد یہ بتانا مقصود ہے کہ چوں کہ کتاب اللہ ہی تمام علوم شرعیہ کا سرچشمہ اور سنّت و فرض کا مستقل مأخذ ہے اور اسے آسمان کے امین (جبریل علیہ السلام) زمین کے امین (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس لے کر آئے تو میرا ارادہ ہوا کہ زندگی بھر اسی کی خدمت میں مشغول رہوں، اپنی ساری صلاحیتیں اسی میں صرف کردوں اور اس پر مختصر حاشیہ لکھوں جس میں تفسیری اور لغوی نکات کے ساتھ ساتھ اعراب اور قراءات بھی ذکر کیے جائیں، گمراہ اور بے راہ رولوگوں کا رد بھی ہو اور اس میں جو احکام اور آیات کے شانِ نزول ذکر کیے جائیں ان کی تائید میں بہت سی احادیث بھی شامل کر دی جائیں۔ اس کتاب میں آیات و احادیث دونوں

کے مفاہیم جمع ہوں گے اور ان میں جہاں کوئی چیز آسانی سے سمجھ آنے والی نہ ہوگی، علماءِ سلف اور ان کی پیروی کرنے والے علماءِ متاخرین کے اقوال پیش کر کے اس کی خوب وضاحت کر دی جائے گی۔

میں نے یہ کتاب لکھنے کا فیصلہ اس مقصد کے تحت کیا ہے کہ یہ میرے لیے نصیحت ہو، میری قبر کے لیے ذخیرہ ہو اور موت کے بعد میرے لیے نیک عمل ثابت ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يُنَبَّأُ الْإِنسَانُ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ﴾ [القیامۃ۷۵: ۱۳] اس دن انسان کو اگلا پچھلا کیا کرایا سب کچھ بتا دیا جائے گا۔ نیز ارشاد فرمایا: ﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَأَخَّرَتْ﴾ [الانفطار۸۲: ۵] ہر شخص اپنے اگلے پچھلے تمام اعمال کی حقیقت جان لے گا۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

[۳] إذا مَاتَ الإنسانُ انقَطَعَ عَمَلُه' إلا مِنْ ثلاثٍ: صَدَقَةٍ حارِيَةٍ، أوعِلمٍ يُنْتَفَعُ به، أو وَلَدٍ صَالحٍ يَدعُوله۔

جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ صرف تین اعمال ایسے ہیں جن کا ثواب ملتا رہتا ہے :ایک صدقہ جاریہ ہے ، دوسرا علم ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں اور تیسرے نیک اولاد ہے جو اس کے لیے دعا کرتی رہتی ہے۔

تفسیر میں مؤلف کا منہج و اسلوب

اس تفسیر میں میرا طریقہ کار یہ ہوگا کہ اقوال کو ان کے قائلین اور احادیث کو ان کے مأخذ کے حوالہ کے ساتھ ذکر کروں گا۔ کہا جاتا ہے کہ علم کی برکات میں سے یہ بھی ہے کہ جو بات نقل کی جائے اس کے ساتھ اس کے قائل کا نام بھی ذکر کیا جائے۔ معمول یہ ہے کہ فقہ اور تفسیر کی کتابوں میں حدیث بغیر حوالہ ذکر کر دی جاتی ہے اور ماہرینِ حدیث کے علاوہ کسی کو اس کا حوالہ معلوم نہیں ہوتا۔ یوں عام قاری مشکل میں پھنس جاتا ہے اور صحیح وضعیف میں امتیاز بھی نہیں کر پاتا۔ ان امور کی پہچان بذاتِ خود ایک بہت بڑا علم ہے۔ بلا حوالہ حدیث پیش کرنے والے کی نہ تو بات مانی جاتی ہے اور نہ اس کی پیش کی ہوئی حدیث سے استدلال درست تسلیم کیا جاتا ہے جب تک کہ مشہور محدثین اور مستند علماءِ اسلام میں سے کسی کی طرف اس کی نسبت نہ کر دی جائے۔

ہم اس کتاب میں تفسیر سے متعلق ایسی متعدد روایات نقل کریں گے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں

---

[۳] مسلم، كتاب الوصية، باب ما يلحق الإنسان من الثواب بعد وفاته ۳:۱۲۵۵،ابوداود: كتاب الوصايا،باب ماجاء في الصدقة عن الميت ۳:۱۱۷،ترمذی:كتاب الأحكام ، باب في الوقف۳:۶۶۰، احمد: مسند ابی هريرة رضی الله عنه ۳:۶۵

حق وصواب کی توفیق دیں۔البتہ مفسرین کے بیان کردہ بہت سے قصوں اور مؤرخین کے روایت کردہ واقعات کو اس میں لانے سے اجتناب کیا جائے گا۔ہم ان میں سے صرف ایسے واقعات ذکر کریں گے جو کسی چیز کی وضاحت کے لیے ضروری ہوں یا آیاتِ احکام کی مزید وضاحت کے لیے معاون ثابت ہوں۔ اس وضاحت سے مراد ایسے مسائل کا بیان ہے جو ان آیات کے معانی سے اخذ کیے جا سکتے ہیں اور ان کے مقصود ومفہوم تک رسائی کے لیے طالبین کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ہر آیت کے تحت ایک، دو یا اس سے زیادہ جتنے امور آتے ہوں ان سب کو مباحث کی صورت میں ذکر کیا جائے گا۔ ان میں اسبابِ نزول بھی ہوں گے،مشکل مسائل کی وضاحت بھی ہوگی اور فقہی احکام بھی۔ جس آیت میں کوئی حکم بیان نہیں کیا گیا ہوگا وہاں صرف تفسیر اور تاویل پر اکتفا کیا جائے گا۔ یہی اسلوب کتاب کے آخر تک برقرار رکھا گیا ہے۔

تفسیر کا نام

میں نے اس تفسیر کا نام ’’الجامع لأحکام القرآن والمُبَیِّن لِمَا تَضَمَّنَهُ مِنَ السُّنَّةِ وَآيِ الفُرقان‘‘ (احکام قرآن کی جامع اور اپنے اندر مذکور آیات اورسنت کی وضاحت کرنے والی) رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے خالص اپنی رضا کے لیے بنا دے اور اپنے خاص فضل و احسان سے مجھے، میرے والدین کو اوران لوگوں کو جو اس سے مستفید ہونا چاہیں سب کو بہرہ مند فرمائے۔ وہی دعاؤں کو سننے والا، قریب اور قبول کرنے والا ہے، آمین۔

☆☆☆☆☆

باب: ۱

قرآنِ کریم اور حاملینِ قرآن کے فضائل

اس باب میں قرآن مجید کے فضائل، اس سے تعلق رکھنے کی ترغیب اور اس کے طالب، قاری، سامع اور عمل کرنے والے کے فضائل مذکور ہیں۔

جان لیجیے کہ یہ باب بہت عظیم اور یہ موضوع بہت وسیع ہے۔ علماء کرام نے اس پر بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ ہم ان میں سے چندایسے نکات یہاں ذکر کریں گے جو اس کے فضائل کے ساتھ ساتھ ان انعامات کے بیان پر مشتمل ہیں جو باری تعالیٰ نے قرآن والوں کے لیے تیار فرما رکھے ہیں جنہوں نے محض اس کی رضا کی خاطر قرآن سیکھا اور اس پر عمل کیا۔

قرآن مجید کے فضائل

قرآن مجید کے فضائل میں سب سے پہلے یہ یقین رکھنا ضروری ہے کہ یہ ربّ العالمین کا کلام ہے،مخلوق کا نہیں۔ یہ اُس ہستی کا کلام ہے جس کی کوئی مثال نہیں، اور یہ اس ذات کی صفت ہے کہ نہ تو کوئی اس جیسا ہے نہ کوئی اس کا شریک ہے۔ یہ کلام خود ذات باری تعالیٰ کے نور سے ہے البتہ اس کی تلاوت کے وقت سنائی دینے والی آوازیں پڑھنے والوں کی آوازیں اور انہی کے گلوں میں سانس کا اتار چڑھاؤ ہیں۔ یہ اُن کے اعمال کا حصہ ہیں جو وہ ارشاد ربانی کی بجا آوری میں بطور عبادت بجا لاتے ہیں اور کئی بار خود ہی اس کی خوش نودی کی خاطر ان میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وہ اگرقرآنِ مجیدکی تلاوت کرنے سے گریز کریں تو انہیں جھنجوڑا جاتا ہے اورتلاوت کرنے پر ثواب ملتا ہے۔ اگروہ اس عمل کو چھوڑ دیں تو سزا کے مستحق ٹھہرائے جاتے ہیں۔

اس عقیدہ پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے جوکہ اہل حق ہیں۔ احادیث بھی یہی بتلاتی ہیں اور بے شمار واقعات بھی اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اصول بھی یہی ہے کہ جزاء اور سزا صرف انہی چیزوں پر ہوتی ہے جو بندوں کے اعمال شمار ہوتی ہوں جیسا کہ اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

قرآن کی عظمت کا عالم یہ ہے کہ اگر اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں وہ صلاحیت نہ رکھتے جس کی بنا پر وہ اس کی آیات میں غور کرنے، اس سے سبق حاصل کرنے، اس سے اپنے رب کی اطاعت

وعبادت کی ترغیب حاصل کرنے، اس کے بتائے ہوئے حقوق ادا کرنے اور فرائض بجا لانے کے قابل ہوئے تو اس کے بوجھ سے ان کی ہمتیں کمزور پڑ جاتیں اور وہ چور چور ہو جاتے یا اس کے بوجھ تلے دب کر اپنی ہستی کھو بیٹھتے ۔ انسانی ہمتیں اللہ تعالیٰ فضل کے بغیر اسے برداشت کر بھی کیسے سکتی ہیں جیسا کہ خود باری تعالیٰ کا ارشاد ہے اور اسی کی بات سچی ہے:﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ [الحشر: ۲۱] (اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو آپ دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب کر پھٹ جاتا)۔

فضائلِ قرآن کے بارے میں احادیث وآثار

پہلی حدیث وہ ہے جو امام ترمذی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۴] يقول الرب تبارك و تعالى: مَنْ شغله القرآن وذكرى عن مسألتي أعطيته أفضل ما أعطى السائلين قال: وفضل كلام الله على سائر الكلام كفضل الله على خلقه۔ قال: هذا حديث حسن غريب۔

اللہ جل جلالہٗ کا ارشاد ہے: جس شخص کو قرآن میں مشغول رہنے اور میرا ذکر کرنے کی وجہ سے دعا کرنے کا موقع نہیں ملتا تو میں اسے مانگنے والوں سے بہتر عطا کرتا ہوں۔ نیز ارشاد فرمایا: اللہ کے کلام کا درجہ تمام کلاموں سے اسی طرح بلند ہے جس طرح خود باری تعالیٰ اپنی مخلوق سے اعلیٰ و ارفع ہیں۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن غریب کہا ہے۔

امام ابو محمد دارمی سمرقندی رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

[۵] السبع الطول مثل التوراة، والمئون مثل الإنجيل، والمثاني مثل الزبور، وسائر القرآن بعد فضل۔

وہ سات سورتیں جو طِوال کہلاتی ہیں تورات کی طرح ہیں، جو مئین کہلاتی ہیں انجیل کی طرح

---

[۴] جامع ترمذی: کتاب الفضائل، باب فضل كلام الله على سائر الكلام ۵:۱۸۴،امام عبدارزاقؒ، بزارؒاور بیہقیؒ نے شعب لایمان میں اسی کی ہم معنی حدیث نقل کی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اسے فتح الباری ۹:۲۶ میں ذکر کرکے عطیہ العوفی کے علاوہ اس کے تمام راویوں کو ثقہ کہا ہے۔ یہ حدیث اپنے شواہد کی بناء پر حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، واللہ اعلم۔

[۵] سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فضائل الانعام والسور ۲:۹۱۰

ہیں، مثانی زبور کی طرح اور باقی سارا قرآن مجید اس پر مزید ہے (ا)۔

امام ترمذیؒ نے بروایت حارث، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا:

[۶] ستکون فتن كقطع الليل المظلم، قلت يا رسول الله وما المخرج منها؟ قال: كتاب الله تبارك و تعالى فيه نبأ من قبلكم، و خبرما بعد كم، و حكم ما بينكم، هو الفصل ليس بالهزل، من تركه من جبار قصمه الله، ومن ابتغى الهدى فى غيره أضله الله، هو حبل الله المتين و نوره المبين والذكر الحكيم، وهو الصراط المستقيم، وهو الذى لا تزيغ به الأهواء، ولا تلتبس به الألسنة ولا تتشعب معه الآراء، ولا يشبع منه العلماء، ولا يملقه الأتقياء، ولا يخلق على كثرة الرد، ولا تنقضى عجائبه، وهو الذى لم تنته الجن إذ سمعته أن قالوا: إنا سمعنا قرآنا عجبًا، من علم علمه سبق، ومن قال به صدق، ومن حكم به عدل، ومن عمل به أجر، ومن دعا إليه هدى إلى صراط مستقيم، خذها إليك يا أعور۔

ایسے حیران کن فتنے ظاہر ہوں گے جیسے سخت اندھیری راتیں۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! ان سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کی کتاب۔ اس میں تم سے پہلے لوگوں کے حالات، بعد والوں کی خبریں اور تمہارے اپنے مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ ٹھوس حقیقت ہے، مذاق نہیں۔ اگر کسی بڑے طاقتور نے بھی اسے چھوڑا تو اللہ تعالیٰ اسے پاش پاش کر دیں گے اور جس نے اس کے علاوہ کہیں اور ہدایت تلاش کی اسے اللہ تعالیٰ گمراہی کے راستہ پر چھوڑ دیں گے۔ قرآن اللہ کی مضبوط رسی، اس کا واضح نور اور اس کی حکمت بھری

[۶] جامع ترمذی: کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل القرآن ۱۷۲:۵۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث اس سند کے علاوہ ہمیں کہیں نہیں مل سکی اور اس کی سند بھی مجہول ہے۔ امام دارمیؒ نے کتاب فضائل القرآن ، باب فضل من قرأ القرآن ۴۳۵:۲ میں اسے ایک اور طریق سے نقل کیا ہے۔ اس کی سند میں کلام ہونے کے باوجود یہ حدیث معنی کے لحاظ سے صحیح ہے۔

ا۔ طِوال بقرۃ سے براءۃ تک ہیں اور ان کے بعد مئین ہیں کیوں کہ ان میں سے ہرسورت کم وبیش سو آیات پر مشتمل ہے۔ ان کے بعدوالی سورتیں مثانی ہیں۔ فراءؒ کہتے ہیں: مثانی وہ سورتیں ہیں جن کی آیات سو سو سے کم ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ مثانی وہ سورتیں ہیں جن میں قصص دوبارہ بیان کیے گئے ہیں۔ سورۂ فاتحہ اور بعض اوقات پورے قرآن مجید کو بھی مثانی کہا جاتا ہے۔ ان کے بعد والی سورتیں مفصل کہلاتی ہیں کیوں کہ ان میں سے ہر دو کے درمیان بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے فاصلہ لایا گیا ہے۔ الاتقان ۲۲:۱ ومابعدہ ۔

نصیحت ہے۔ وہی صراطِ مستقیم ہے اور وہی ہے جسے خواہشات کے مطابق ڈھالا نہیں جا سکتا اور نہ زبانیں اس کی قراءت کے دوران بھٹکتی ہیں، قرآن رہنما ہو تو سوچیں بکھرتی نہیں۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ علماء اس سے سیر نہیں ہوتے، نیکوکاروں کا دل اس سے بھرتا نہیں، نہ یہ بار بار پڑھنے سے پرانا ہوتا ہے اور نہ اس کے عجائبات ختم ہوتے ہیں۔ یہ وہی کتاب ہے جسے سن کر جنات بھی کہہ اٹھے تھے کہ ہم نے عجیب کلام سنا ہے۔ جو کوئی قرآن کا علم سیکھتا ہے سب سے سبقت لے جاتا ہے، جو اس کی بات کرتا ہے سچا شمار ہوتا ہے، جو اس کی روشنی میں فیصلہ کرتا ہے عادل مانا جاتا ہے، جو اس پر عمل کرتا ہے اجر پاتا ہے اور جو اس کی طرف دعوت دیتا ہے خود سیدھے راستہ کی طرف ہدایت پاتا ہے۔ اے أعور! یہ باتیں خوب یاد کر کے ان کو اپنا لو۔

حارث الأعور کا تعارف

أعور سے مراد حارث ہے[1]۔ امام شعبی نے انہیں کذّاب کہا ہے مگر یہ درست نہیں۔ کیوں کہ ان کا جھوٹ کہیں ثابت نہیں ہوا اور جن حضرات نے انہیں ناپسندیدہ قرار دیا ہے وہ صرف اس وجہ سے ہے کہ یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں مبالغہ کرتے تھے اور انہیں دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم سے افضل سمجھتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امام شعبی نے انہیں جھوٹا کہا ہے کیوں کہ وہ خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی افضلیت اور ان کے سب سے پہلے مسلمان ہونے کے قائل تھے، واللہ اعلم۔

ابو عمر ابن عبدالبر کہتے ہیں: میرا خیال ہے کہ امام شعبیؒ پر اعتراض ''حارث الھمدانی'' کو جھوٹا کہنے کی وجہ سے ہوا ہے نہ کہ حارث الأعور کی وجہ سے جیسا کہ انہوں نے ایک موقع پر روایت ذکر کرتے ہوئے کہا: ''حَدَّثَنِی الحارث، وکانَ اَحَدُ الکذّابین'' (مجھ سے یہ بات حارث نے بیان کی ہے اور حارث جھوٹے راویوں میں سے تھا)۔

ابوبکر محمد بن قاسم بنّ بشار بن محمد انباری نحوی لغوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الرّد علیٰ مَن خالف

۱۔ حارث بن عبداللہ الأعور تابعی علماء میں سے ہیں۔ ابن المدینی نے انہیں کذاب اور دارقطنی نے ضعیف کہا ہے۔ امام نسائی کہتے ہیں: قوی نہیں ہیں، شعبی کہتے ہیں: کذاب ہیں۔ ابوبکر بن عیاش نے مغیرہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ کے ساتھیوں کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے احادیث نقل کرنے والے راویوں میں سے کسی کی روایت سچی نہیں ہوتی تھی۔ المغنی فی الضعفاء ۱:۲۱۳، ابراہیم نخعی نے انہیں مُتّہم کہا ہے۔ ابواسحاق سبیعی نے کذوب، ابن مہدی نے متروک، ابن معین نے ضعیف اور ابوخیثمہ نے کذوب کہا ہے۔ ابو حاتم اور ابوزرعہ کی رائے یہ ہے کہ ان کی حدیث کو حجت نہیں مانا جا سکتا۔ الجرح والتعدیل ۳:۷۸

مُصْحَفَ عُثمان'' [۱] میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۷] إن هذا القرآن مأدبة الله فتعلموا من مأدبته ما استطعتم، إن هذا القرآن حبل الله، وهو النور المبين والشفاء النافع، عصمةُ من تمسك به و زجاة من اتبعه، لا يعوج فيقوَّم، ولا يزيغ فيستعتب، ولا تنقضي عجائبه، ولا يخلق عن كثرة الرد، فاتلوه فإن الله يأجركم على تلاوته بكل حرف عشر حسنات أما إنى لا أقول الّم حرف، ولا ألفينَّ أحدكم واضعا إحدى رجليه يدع أن يقرأ سورة البقرة فإن الشيطان يفرُّ من البيت الذى تقرأفيه سورة البقرة، وإن أصفر البيوت من الخير: البيت الصفر من كتاب الله۔

بلاشبہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا دسترخوان ہے (جو علوم و عرفان سے بھرا ہوا ہے)۔ جس قدر ہو سکے اس کے دسترخوان سے علم سیکھ لو۔ یہ قرآن اللہ کی رسّی ہے، وہی واضح نور اور نفع بخش شفاء ہے۔ جو اس کو تھامے رکھتا ہے یہ اس کی حفاظت کرتا ہے اور جو اس کے احکام پر عمل کرتا ہے یہ اس کے لیے نجات کا باعث بنتا ہے۔ یہ ٹیڑھا نہیں ہوتا کہ اسے سیدھا کرنے کی ضرورت پیش آئے، نہ صراطِ مستقیم سے ہٹتا ہے کہ اس پر اعتراض کیا جائے۔ اس کے عجائبات ہیں کہ ختم نہیں ہوتے، نہ یہ بار بار دہرانے سے پرانا ہوتا ہے۔ اس کی تلاوت

[۷] مستدرک حاکم: كتاب فضائل القرآن ،باب أخبار في فضائل القرآن جملة ۱:۷۴۱، سنن دارمی: كتاب فضائل القرآن ، باب فضل من قرأ القرآن ۲:۸۸۹، عبدالرزاق: كتاب فضائل القرآن ،باب تعليم القرآن وفضله ۳:۳۷۵، بیہقی: شعب الايمان، التاسع عشر من شعب الايمان وهو باب فى تعظيم القرآن ، فصل فى تعاليم القرآن ۲: ۳۴۴ ۔ امام حاکم نے اسے سند کے لحاظ سے صحیح کہا ہے، طبرانی، دارمی، عبدالرزاق اور بزار نے بھی اسے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً بھی نقل کیا ہے۔ بعض روایت کے الفاظ ایک دوسری سے قدرے مختلف ہیں۔ امام بیہقی کہتے ہیں اس کی مذکورہ سند میں مسلم بن ابراہیم الہجری متروک ہے اس لیے اس کی موقوف سند ہی راجح ہے۔ مجمع الزوائد ۷: ۱۶۵، كتاب المجروحين ۱:۹۹ میں راوی کا نام ابو اسحاق ابراہیم بن مسلم الہجری العبدی الکوفی مذکور ہے اور یحییٰ بن معین نے ان میں کلام کیا ہے۔ ان کے تعارف میں ابوحاتم نے یہ حدیث بھی مکمل سند کے ساتھ ابو حاتم نے نقل کی ہے۔ دوسری طرف امام حاکم ہیں جنہوں نے اس حدیث کو شیخین کی شرط کے مطابق قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حدیث کی یہاں مذکور مکمل عبارت مجھے یکجا کہیں نہیں ملی البتہ سنن دارمی کی دو احادیث ملانے سے یہ الفاظ مکمل ہو جاتے ہیں۔

۱۔ ابوبکر ابن الأنباری (م ۳۲۸ھ) اپنے وقت میں نحو و ادب کے امام اور بڑے فاضل آدمی تھے۔ آپ نے ''الرّد عَلیٰ مَن خالفِ مُصْحَفَ عُثمان'' کے علاوہ بھی علوم قرآن و حدیث میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ تاریخ بغداد ۳:۱۸۱

کیجئے۔ اللہ تعالیٰ اس کا ایک حرف پڑھنے پر دس نیکیوں کے برابر ثواب دیتے ہیں اور میں یہ نہیں کہتا کہ ''الٓم'' ایک ہی حرف ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تم میں سے کسی کو اس حال میں دیکھوں کہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بیٹھا ہے اور سورۂ بقرہ نہیں پڑھتا۔ شیطان اس گھر سے دور بھاگتا ہے جس میں سورۂ بقرہ کی تلاوت کی جاتی ہے اور وہ گھر سب سے زیادہ بھلائی سے محروم رہتا ہے جو اللہ کی کتاب سے خالی ہو۔

دسترخوان سے مراد؟

ابوعبید (قاسم بن سلام الہروی) اپنی کتاب ''الغریب''(۱) میں حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا: ''إِنَّ هذا القُرآنَ مَادُبَةُ اللّٰهِ، فَمَنْ دَخَلَ فيه فَهُوَ آمِنٌ'' (بلاشبہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی دعوت (مہمانی) ہے جو بھی اس میں داخل ہوتا ہے امن پاتا ہے)۔

ابوعبید اس حدیث کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: اس مثال میں قرآن کو ایک ایسی دعوتِ مہمانی سے تشبیہ دی گئی ہے جس کا اہتمام رب العالمین کی طرف سے کیا گیا اور پھر خود باری تعالیٰ نے بندوں کو اس کی طرف بلایا اور اس میں اُن کے لیے بھلائیاں اور فوائد رکھ دیئے۔ لفظ مَادُبَةٌ دال کی پیش اور مَادَبَةٌ دال کی زبر دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ اگر دال کی پیش کے ساتھ ''مادُبَة'' بولا جائے تو معنی مہمانی کی دعوت ہوگا جسے انسان تیار کر کے لوگوں کو بلاتا ہے اور اگر دال کی زبر کے ساتھ ''مَادَبَةٌ بروزن مَفْعَلَةٌ'' بولا جائے تو اس کا معنی ادب والا ہوگا یعنی قرآن اَدب سکھانے والی کتاب ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ اس کی دلیل دوسری حدیث ہے جس کے الفاظ ''إن هذا القرآنَ مَادَبَةُ اللّٰهِ عَزّوَجَلّ، فَتَعَلَّمُوا مِنْ مَادَبَتِهِ'' ہیں یعنی بلاشبہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ادب سکھانے والی کتاب ہے، اس سے ادب سیکھو۔

احمرؒ اِن دونوں صورتوں کا ایک ہی معنی بتاتے تھے مگر میں نے ان کے علاوہ کسی سے یہ بات نہیں سنی۔

ابوعبید کہتے ہیں: مجھے اس کی پہلی تشریح زیادہ پسند آئی ہے۔

امام بخاریؒ نے سیّدنا عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

۱۔ ابوعبید رحمہ اللہ کی غریب الحدیث میں مشہور تصنیف کا نام ''الغریبُ المصنف'' ہے جو کہ مطبوع ہے۔ زرکلی نے غریب القرآن کے نام سے بھی ان کی ایک کتاب ذکر کی ہے جبکہ حاجی خلیفہ نے الغریبین کے نام سے بھی ایک کتاب ذکر کی ہے جس کے ایک حصہ کی تحقیق و طباعت ہو چکی ہے۔ کشف الظنون ۲: ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، اعلام زرکلی ۵: ۱۷۶

[۸] خَيْرُكُمْ مَنْ تعلَّمَ الْقرآنَ وعلَّمَه۔
تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور سکھاتا ہے۔

امام مسلمؒ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۹] مثل المؤمن الذی یقرأ القرآن مثل الأ ترجة رِیحها طیّب و طعمها طیّب، و مثل المؤمن الذی لا یقرأ القرآن مثل التمرة لا ریح لها وطعمها حلو، ومثل المنافق الذی یقرأ القرآن مثل الریحانة ریحها طیب و طعمها مر ومثل المنافق الذی لا یقرأ القرآن کمثل الحنظلة لا ریح لها و طعمها مر وفی روایة: مثل الفاجر، بدل المنافق۔

اس مومن کی مثال جو قرآن مجید پڑھتا ہے سنگترے کی سی ہے جس کی خوشبو بھی بہت لطیف ہوتی ہے اور ذائقہ بھی بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور اس مومن کی مثال جو قرآن نہیں پڑھتا خشک کھجور کی سی ہے جس کا ذائقہ تو میٹھا ہوتا ہے مگر اس میں خوشبو نہیں ہوتی اور اس منافق کی مثال جو قرآن مجید پڑھتا ہے خوشبودار پھول کی سی ہے جس میں خوشبو تو ہوتی ہے مگر اس کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے اور اس منافق کی مثال جو قرآن مجید نہیں پڑھتا اندرائن کی سی ہے جس کا مزا بھی کڑوا ہوتا ہے اور اس میں خوشبو بھی نہیں ہوتی۔ ایک روایت میں منافق کی جگہ فاجر (گنہگار) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

امام بخاریؒ کی روایت میں دوسرے ''مَثَل'' کی جگہ ''کَمَثل'' ہے اور اس کے الفاظ یوں ہیں:

---

[۸] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب خیر کم من تعلّم القرآن و علّمه ۲۳۲:۳، ابوداؤد: کتاب الصلاة، باب ثواب قراء ة القرآن ۲ : ۷۰ ، جامع ترمذی: فضائل القرآن، باب ماجاء فی تعلیم القرآن ۵: ۱۷۳۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔اس کے علاوہ بخاری، ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ، دارمی، ابن حبان، ابن خزیمہ، امام احمد، سعید بن منصور، ابو یعلی، عبدالرزاق، بزار، طبرانی، بیہقی، دارقطنی وغیرہم نے اس حدیث کو متعدد مقامات پر نقل کیا ہے جس میں کہیں ''خیر کم'' کے الفاظ ہیں اور کہیں ''أفضلکم'' کے۔

[۹] صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرین و قصرها، باب فضیلة حافظ القُرآن ۵۴۹:۱۔ امام مسلم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ابوداؤد: کتاب الأدب، باب من یُؤمر أن یُجالس ۲۵۹:۴ میں بھی یہی الفاظ ہیں اور کچھ مزید تفصیل بھی ہے۔ امام ابو داؤد کہتے ہیں میں نے اس سلسلہ میں جو احادیث ذکر کی ہیں وہ صحیح ترین ہیں۔ نسائی: کتاب الایمان و شرائعه، باب مثل الذی یقرأ القرآن من مؤمن و منافق ۱۲۴:۸، سنن دارمی: فضائل القرآن، باب مثل المؤمن الذی یقرأ القرآن ۹۰:۲، ابن حبان: کتاب الرقائق، باب قراء ة القرآن ۳۸:۳، مسند امام احمدؒ: حدیث ابی موسیٰ الاشعری رضی الله عنه ۵۴۱:۵، ابویعلی، عبدالرزاق وغیرہ کے ہاں کم و بیش یہی الفاظ ہیں۔

[۱۰] مَثَلُ المومنِ الذی یَقرأ القُرآنَ کَمَثَلِ الأُترُجَّةِ طعُمها طیّبٌ وریحُهَا طَیّب، وَمَثَلُ المُومِنِ الذی لا یقرأُ القرآنَ کَمَثَلِ التَّمرة......۔

ابوبکر الأنباری فرماتے ہیں: احمد بن یحییٰ حلوانی نے مجھے بتایا ، وہ کہتے ہیں: ہم سے یحییٰ بن عبدالحمید نے بیان کیا، انہیں ہشیم نے بتایا۔ ح (۱)

اور ہمیں ادریس نے بھی بتایا ہے، وہ کہتے ہیں ہم سے خلف نے بیان کیا، انہیں ہشیم نے بتایا، انہوں نے عوام بن حوشب سے روایت کی، وہ کہتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن السُّلَمی کے پاس جب کوئی شخص قرآن کریم کا حفظ مکمل کرتا تو وہ اسے اپنے سامنے بٹھا کر اس کے سر پر ہاتھ رکھتے اور فرماتے:

یَاهٰذا، اتَّقِ اللّٰهَ! فَمَاأعرِفُ أحَدًا خیرا مِنْكَ اِن عَمِلْتَ بِالّذِی عَلِمتَ۔

اے بھائی! اللہ سے ڈرتے رہنا۔ اگر تم اس علم پر عمل کرو جس سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں نوازا ہے تو مجھے یقین ہے کہ تم سے بہتر کوئی آدمی نہیں ہوگا۔

امام دارمیؒ نے وہب ذماری سے یہ قول نقل کیا ہے:

[۱۱] من آتاه اللّٰه القرآن فقام به آناء اللیل وآناء النهار، وعمل بما فیه، ومات علی الطاعة، بعثه اللّٰه یوم القیامة مع السفرة والأحکام۔

جسے اللہ تعالیٰ قرآن کی نعمت عطا فرمائے اور وہ دن رات کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کے حضور کھڑے ہو کر اس کی تلاوت کرتا رہے، اس پر عمل بھی کرے اور جب اسے موت آئے تو

---

[۱۰] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب فضل القرآن علی سائرِ الکلام ۲۳۱:۳، جامع ترمذی: کتاب الأمثال، باب ماجاء فی مثل المؤمن القاری للقرآن...... ۱۵۰:۵، میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ امام ترمذی نے اسے حسن صحیح کہا ہے، ابن ماجہ،ابن حبان ،امام احمد ، بیہقی: شعب الإیمان نے بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ بخاری میں کالأترجة کے الفاظ ہیں۔مقدمہ شرح نووی علی صحیح مسلم ۳۸:۱

[۱۱] سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فضل مَن یقرأ القرآنَ و یَشتد علیه ۴۴۴:۲

۱۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: جب کسی حدیث کی دو یا دو سے زیادہ اسناد ذکر کرنا مقصود ہو تو ایک سند سے دوسری کی طرف منتقل ہوتے وقت پہلی سند کے آخر میں حرف "ح" لکھ دیتے ہیں جس کی تفصیل میں مختلف آراء ہیں۔ایک یہ کہ اس سے مراد "تحوّل" یعنی دوسری سند کی طرف منتقل ہونا ،دوسری یہ کہ یہ صرف حاجز یعنی فاصلہ کے طور پر لکھتے ہیں، اسے پڑھا نہیں جاتا،تیسری یہ کہ یہ لفظ "حدیث" کا مخفف ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس کے بعد حدیث ہے،چوتھی یہ کہ یہ لفظ "صح" کا مخفف ہے یعنی یہاں تک جو سند لکھی گئی ہے اسے ارادۃً اسی طرح لکھا گیا ہے،یہاں حدیث کا متن ساقط نہیں بلکہ وہ بعد میں آ رہا ہے۔ اس کا یہاں لکھنا مقصود ہی نہ تھا۔

اس حال میں آئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور نیکی کرنے والا ہو تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کا حشر ملائکہ اور انبیاء کے ساتھ فرمائیں گے۔

سعید کہتے ہیں کہ اس حدیث میں "سَفَرۃ" سے مراد ملائکہ اور "احکام" سے مراد انبیاء ہیں۔

امام مسلمؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، آپ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۲] الماهر بالقرآن مع السفرة الكرام البررة، والذى يقرأ القرآن و يتتعتع فيه وهو عليه شاقٌ له أجران۔

قرآن کا ماہر نیک اور معزز فرشتوں کے ساتھ ہوگا اور جو شخص قرآن مجید پڑھتے ہوئے اٹکتا ہے اور اسے مشقت بھی اٹھانا پڑتی ہے تو اسے دو اجر ملیں گے۔

"تَتَعتع" کا معنی مشکل اور عدم قدرت کی وجہ سے کلام میں بار بار اٹکتے رہنا ہے اور یہاں دو ہرے اجر کا ذکر اس لیے فرمایا کہ ایک اجر تو تلاوت کا ہے اور دوسرا مشقت برداشت کرنے کا۔ جہاں تک قرآن کے ماہر کا تعلق ہے تو اس کا درجہ اس سے بہت بڑا ہے کیونکہ ابتداء میں تو وہ بھی قرآن مجید اٹک اٹک کر پڑھتا تھا مگر بعد میں اس مرحلہ سے گزر کر اس کا معیار بلند ہوتا گیا یہاں تک کہ اس کو فرشتوں کے ساتھ ذکر کیا گیا، واللہ اعلم۔

امام ترمذیؒ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۳] من قرأ حرفاً من كتاب الله فله به حسنة، والحسنة بعشر أمثالها لا أقول ألم حرفٌ ولكن ألف حرف ولام حرف وميم حرف" قال: حديث حسن صحيح غريب من هذا الوجه، وقد رُوي موقوفا۔

---

[۱۲] صحیح بخاری: كتاب التفسير باب تفسير سورة عبس ۴:۱۸۸۲، كتاب التوحيد، باب قول النبي الماهر بالقرآن ۶:۲۷۴۳، صحیح مسلم: كتاب صلاة المسافرين، باب فضل الماهر بالقرآن والذى يَتَتَعْتَعُ فيه ۱: ۵۴۹۔ ۵۵۰، سنن ابو داؤد: كتاب الصلاة، باب في ثواب قراءة القرآن ۲: ۷۰، جامع ترمذی: كتاب فضائل القرآن عن رسول الله صلى الله عليه وسلم، باب ماجاء في فضل قارى القرآن ۵:۱۷۱۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے، ابن ماجہ، داری، ابن حبان ، احمد، عبدالرزاق طبرانی، بیہقی، طیالسی اور ابن ابی شیبہ وغیرہم نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

[۱۳] جامع ترمذی: كتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فيمن قرأ حرفاً مِنَ القرآن ماله مِنَ الأجر ۵: ۱۷۵، سنن دارمی ۲:۸۸۷، امام حاکم، عبدالرزاق اور بیہقی نے اسے قدرے مختلف الفاظ میں نقل کیا ہے۔

جس نے کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھا اس کو اس کے بدلے ایک نیکی ملے گی اور ہر نیکی دس گنا بڑھا دی جائے گی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ''الم'' ایک ہی حرف ہے۔ بلکہ ''الف'' ایک حرف ہے، لام الگ حرف ہے اور ''میم'' الگ حرف ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث اس سند سے حسن صحیح غریب ہے اور دوسرے مقام پر موقوفاً بھی نقل کی گئی ہے۔

امام مسلمؒ نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ آپؓ فرماتے ہیں: ہم صفہ میں تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور ارشاد فرمایا:

[۱۴] أیکم یُحِبُّ أن یغدو کل یوم إلی بُطحان۔ فیأتی منه بناقتین کوماوین۔ في غیر إثم ولا قطع رحم" فقلنا: یا رسول الله، کلنا نحب ذلك، قال: "أفلا یغدو أحدکم إلی المسجد فیعلم أو یقرأ آیتین من کتاب اللّٰه عزوجل خیر له من ناقتین وثلاث خیر له من ثلاث، وأربع، خیر له من أربع ومن أعدادهن من الإبل۔

تم میں کون پسند کرتا ہے کہ ہر روز بازارِ **بُطحَان** یا **عَقیق** جائے اور اونچی کوہان والی دو اونٹنیاں بغیر کسی ظلم و زیادتی کے لے آئے۔ ہم نے عرض کیا: یہ تو ہم میں سے ہر کوئی پسند کرتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: پھر وہ ایسا کیوں نہیں کرتا کہ صبح کو مسجد جائے اور قرآن کی دو آیتیں سیکھ لے یا ان کی تلاوت کر لے تو یہ اس کے لیے دو اونٹنیوں سے بہتر ہوں گی اور تین آیات تین اونٹنیوں سے اور چار آیات چار اونٹنیوں سے اور اتنے ہی اونٹوں سے بہتر ہوں گی۔

بطحان اور عقیق

بطحان مدینہ کے قریب ایک جگہ کا نام ہے۔ اور عقیق ایسی وادی کو کہتے ہیں جو سیلاب کے گزرنے کی وجہ سے بنی ہو۔ اس طرح کے چار مقامات مشہور تھے جن میں سے ایک ''**عقیقُ المدینة**'' کہلاتا تھا۔ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں کہ یہ مدینہ کی ایک وادی ہے جس میں پانی کی گزر گاہ تھی۔

حضرت أبو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۴] صحیح مسلم: **کتاب صلوٰة المسافرین، باب فضل قراء ة القرآن في الصلوٰة وتعلّمه** ۱: ۵۵۲، سنن ابو داؤد: **کتاب الصلاة ، باب في ثواب قراء ة القرآن** ۲: ۷۱، ابن حبان: **کتاب العلم، باب الزجر عن کتبة المرأ......** ۱: ۳۲۱، مسند امام احمدؒ: **حدیث عقبه بن عامر الجهني** ۵: ۱۵۴، بیہقی: **شعب الإیمان، التاسع عشر......، فصل في تعالیم القرآن** ۲: ۳۲۵

[۱۵] مَنْ نفَّس عن مسلم كُربَةً من كُرب الدنيانفس الله عنه كُرْبة من كُرب يوم القيامة، ومن يسر على معسر، يسر الله عليه في الدنيا والآخرة، ومن ستر مسلماً، ستره اللّٰه في الدنيا والآخرة، والله في عون العبد ماكان العبد في عون أخيه، ومن سلك طريقاً يلتمس فيه علماً، سهل اللّٰه له طريقاً إلى الجنة، وما اجتمع قوم في بيت من بيوت اللّٰه يتلون كتاب اللّٰه ويتدارسونه بينهم، إلا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة، وحفّتهم الملائكة، وذكرهم اللّٰه فيمن عنده، ومن أبطأ به عمله، لم يسرع به نَسبهُ۔

جس شخص نے کسی مسلمان سے دنیا کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کی اللہ تعالیٰ اس سے قیامت کی تکالیف میں سے ایک تکلیف دور کریں گے۔ اور جو کسی تنگ دست کے لیے آسانی پیدا کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا و آخرت میں آسانی فرما دیں گے، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس وقت تک بندے کی مدد فرماتے رہتے ہیں جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔ اور جو کوئی علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان فرما دیتے ہیں۔ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے کسی گھر میں قرآن مجید کی تلاوت اور تعلیم و تعلّم کے لیے جمع ہوتے ہیں ان پر سکینہ نازل ہوتی ہے، رحمت ان کو ڈھانپ لیتی ہے، فرشتوں کی ایک بھیڑ ان کے آس پاس جمع ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کا ذکر اپنی محفلِ خاص میں کرتے ہیں۔ جس شخص کو اس کا عمل پیچھے چھوڑ گیا اس کا نسب اسے ترقی نہیں دلا سکتا۔

ائمہ حدیث ابو داؤد، نسائی، دارمی اور ترمذی رحمہم اللہ نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، آپؓ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

---

[۱۵] صحیح بخاری: كتاب المظالم، باب لايَظلمُ المُسلمُ المسلِمَ ولا يُسلمه ۲: ۲۲، صحیح مسلم: كتاب الذكر والدعاء...... باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن، ۴: ۲۰۷۴، أحمد: مسند أبي هريرة رضى الله عنه ۲: ۴۹۷، ابو داؤد: كتاب الأدب، باب المؤاخاة. ۴: ۲۷۳، جامع ترمذی: كتاب الحدود، باب ماجاء في الستر على المسلم ۴: ۳۴، بیہقی: شعب الإيمان، السابع عشر......وهو باب في طلب العلم، فصل في فضل العلم وشرف مقداره ۲: ۲۶۱، السابع والسبعون ......وهو باب في أن يحب الرجل المسلم لأخيه مايحب لنفسه......، فصل في إنظار المعسر والتجاوز عنه...... ۷: ۵۳۵

[۱۶] الجَاهِرُ بِالقُرآنِ كَالجَاهِرِ بِالصَّدَقَةِ، وَالمُسِرُّ بِالقُرآنِ كَالمُسِرِّ بِالصَّدَقَةِ۔

بلند آواز سے قرآن مجید پڑھنے والا اعلانیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور ہلکی آواز سے قرآن مجید پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے۔

امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۷] يجيء القرآن يوم القيامة فيقول: يارب حَلِّهِ فيلبس تاج الكرامة ثم يقول: يارب زده فيلبس حلة الكرامة ثم يقول يارب ارض عنه فيرضى عنه، فيقال: له اقرأ وارق ويزاد بكل آية حسنة۔

قرآن کریم قیامت کے دن آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں درخواست کرے گا کہ صاحب قرآن کو خلعت عطا کی جائے چناں چہ اس کے سر پر عزت کا تاج پہنا دیا جائے گا، قرآن عرض کرے گا: اسے مزید نوازا جائے، چناں چہ اسے عزت کا جوڑا پہنایا جائے گا۔ وہ پھر کہے گا:

---

[۱۶] سنن ابو داوَد: كتاب التطوع، باب رفع الصوت بالقراءة في صلاة الليل، ۲: ۳۸، جامع ترمذی: كتاب فضائل القرآن ۵: ۱۸۰، سنن نسائی: كتاب الزكاة، باب المُسِر بالصدقة ۵: ۸۰ مسند امام احمدؒ: حديث عقبه بن عامر الجهني ۴: ۱۵۱، صحیح بن حبان: كتاب الرقائق ،باب قرءة القرآن ۳: ۸، مستدرک حاکم: كتاب فضائل القرآن ،أخبار في فضائل القرآن جملة ۱: ۷۴۱، مسند ابویعلی: مسند عقبه بن عامر الجهني ۳: ۲۷۸، ۵: ۱۲۸، ۵: ۱۵۹، سنن بیہقی: كتاب الصلاة،باب من جهر به إذا كان من حوله لايتاذى بقراءته ۴: ۹۴، شعب الإيمان،التاسع عشر......في تعظيم القرآن ،فصل في الجهر بقراءة القرآن في صلاة الليل ۲: ۳۸۴،فصل في رفع الصوت بالقرآن إذالم يتاذى به أصحابه...... ۲: ۵۲۸۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے، امام حاکم نے اسے شرط بخاری کے مطابق قرار دیا ہے، امام احمد نے ابو عبدالرحمٰن سے ان کے والد کا قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے راوی حماد بن خالد حافظ تھے اور ہمیں احادیث کا درس دیتے تھے۔ امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں اسے کثیر بن مرہ سے بروایت خالد بن معدان نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ سلیمان بن موسیٰ نے بھی کثیر بن مرہ سے اسے نقل کر کے خالد کی تائید کی ہے۔ اس طرح اس حدیث کا دارومدار کثیر بن مرہ پر ہے اور وہ ثقہ ہیں جیسا کہ تقریب میں ہے اور اس کے دیگر رواۃ بھی قابل اعتماد ہیں اس لیے یہ متصل اور قوی ہے۔ واللہ اعلم۔

[۱۷] جامع ترمذی: كتاب فضائل القرآن،باب...... ۵: ۱۷۸، حسن صحیح۔ اس کی دوسری سند عاصم بن بهدله عن ابی صالح عن ابی هريره رضی الله عنه مرفوع نہیں مگر امام ترمذیؒ نے اسے مذکورہ سند سے زیادہ صحیح قرار دیا ہے، مستدرک حاکم: كتاب فضائل القرآن، باب أخبار فی فضائل القرآن جملة ۱: ۷۳۸، امام حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے، شعب الايمان، التاسع عشر......في تعظيم القرآن ،فصل في إدمان تلاوة القرآن ۲: ۳۴۶، ۳۴۷۔ مستدرک حاکم اور شعب الایمان میں "يجيئ القُرآن" کی جگہ "يجيئ صاحب القرآن يوم القيامة فيقول القرآن---" کے الفاظ ہیں جو کہ زیادہ واضح ہیں، واللہ اعلم۔

یا اللہ! آپ اس سے راضی ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو جائیں گے۔ پھر صاحب قرآن کو کہا جائے گا: قرآن پڑھنا شروع کردو اور درجات پر چڑھتے رہواور ہر آیت کے اختتام پر اسے ایک ایک نیکی مزید ملتی جائے گی۔امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث صحیح ہے۔

امام أبو داؤدؒ نے حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادنقل کیا ہے:

[۱۸] یقال لصاحب القرآن: اقرأ وارتق ورتّل کما کنت ترتّل فی الدنیا فان منزلتك عند آخر آیة تقرؤھا۔

صاحبِ قرآن کو کہا جائے گا: قرآن پڑھتے جاؤ اور بلندیوں کی طرف بڑھتے جاؤ، اور یوں ٹھہر ٹھہر کر پڑھو جس طرح دنیا میں پڑھا کرتے تھے۔ جہاں تمہاری آخری آیت کی تلاوت ختم ہوگی وہی تمہاری منزل ہوگی۔

امام ابن ماجہؒ نے حضرت أبو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادنقل کیا ہے:

[۱۹] یقال لصاحب القرآن إذا دخل الجنة: اقرأ واصعد، فیقرأ ویصعد بکل آیة درجة حتی یقرأ آخر شیء معه۔

صاحبِ قرآن جب جنت میں داخل ہو گا تو اسے کہا جائے گا: تلاوت شروع کرو اور بلندیوں پر چڑھتے جاؤ۔ چناں چہ وہ پڑھتا جائے گا اور ہر آیت کے ساتھ ایک درجہ چڑھتا جائے گا۔ اسی طرح اسے جتنا قرآن مجید یاد ہوگا مکمل کرے گا۔

---

[۱۸] سنن ابوداؤد: کتاب الصلاة، باب استحباب الترتیل فی القراءة ۲:۷۳، جامع ترمذی: کتاب فضائل القرآن ،باب..... ۵:۱۷۷میں ”وَارتَقِ“ کے الفاظ ہیں۔ امام ترمذیؒ نے اسے حدیث حسن صحیح کہاہے ۔سنن بیہقی: کتاب الصلاة ۲:۳۵۲، مستدرک حاکم: کتاب فضائل القرآن ۱:۷۳۹، مسندامام احمدؒ: مسند ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ ۳:۲۳۹میں ”وَارقَهْ“، مسندامام احمدؒ: مسند عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ۲:۳۹۵ میں ”وارْقَا“،شعب الإیمان. التاسع عشر من شعب الإیمان ۲:۳۴۷، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب قراءة القرآن ۳:۴۳، شعب الأیمان ۲:۳۴۶ میں ”وَارْق“ اور شعب الإیمان: التاسع عشر..... فصل فی ترتیب القراءة ۲:۳۹۱میں صرف ”اقرَأورتِّل“ ہے۔

[۱۹] سنن ابن ماجہ: کتاب الأدب، باب ثواب القرآن ۲:۱۲۴۲،مسندابویعلی: مسند ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ ۲:۴۹۵، مسندامام احمدؒ: مسند أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ ۳:۴۳۲، شعب الإیمان: الثانی والأربعون---- ۵:۲۵۴۔ اس کی سند میں عطیہ العوفی کی وجہ سے کچھ کلام کیا گیا ہے مگر شواہد و متابعات کی تائید سے اسے تقویت ملتی ہے۔سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فی فضل سورة البقرة وآل عمران ۲:۹۰۷، مسندامام احمدؒ: حدیث بریدہ الأسلمی رضی اللہ عنہ ۶:۴۷۸ اور شعب الایمان، التاسع---- فصل فی إدمان تلاوة القرآن ۲:۳۴۴ میں زیادہ تفصیل اور قدرے مختلف الفاظ ہیں۔

اُبو بکر الاُنباریؒ نے اُبو اُمامہ الحمصی سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۰] من أعطى ثلث القرآن فقد أعطى ثلث النبوة، ومن أعطى ثلثي القرآن فقد أعطى ثلثي النبوة، ومن قرأ القرآن كله فقد أعطى النبوة كلها غير أنه لا يوحى إليه، ويقال له يوم القيامة اقرأ وارتق فيقرأ آية ويصعد درجة حتى ينجز ما معه من القرآن ثم يقال له: اقبض فيقبض ثم يقال له: أتدرى ما في يديك؟ فإذا في يده اليمنى الخلد، وفي اليسرى النعيم۔

جس کو قرآن کریم کا تیسرا حصہ عطا کردیا گیا، گویا اسے نبوت کا تیسرا حصہ مل گیا، اور جسے قرآن کا دو تہائی نصیب ہوگیا، گویا اسے نبوت کا دو تہائی مل گیا۔ جس نے پورا قرآن کریم پڑھ لیا، گویا اسے پوری نبوت مل گئی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس پر وحی نہیں آتی۔ قیامت کے دن اسے کہا جائے گا: تلاوت شروع کر دو اور بلندی کی طرف بڑھتے جاؤ۔ چناں چہ وہ ایک آیت پڑھے گا اور ایک سیڑھی چڑھے گا۔ اسی طرح جتنا قرآن مجید اسے یاد ہوگا وہ مکمل کر لے گا۔ پھر اسے کہا جائے گا مُٹھی بند کرو۔ وہ مُٹھی بند کرے گا تو اس سے پوچھا جائے گا: جانتے ہو تمہارے ہاتھوں میں کیا ہے؟ پھر دیکھنے پر معلوم ہوگا کہ اس کے دائیں ہاتھ میں خلد (ہمیشگی کی دولت) ہے اور بائیں ہاتھ میں نعیم (یعنی جنت) ہوگی۔

ابن الأنباری کہتے ہیں: اِدریس بن خلف نے ہمیں بتایا، وہ کہتے ہیں: ہم سے اسماعیل بن عیاش نے بیان کیا۔ انہوں نے تمّام سے اور تمّام نے حسن (بصریؒ) سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا:

[۲۱] من أخذ ثلث القرآن وعمِل به، فقد أخذ أمر ثلث النبوة، ومن أخذ نصف القرآن وَعمل به فقد أخذ أمر نصف النبوة،وَمن أخذ القرآن كله، فقد أخذ النبوة كلها۔

جس نے قرآن کریم کا تیسرا حصہ سیکھ کر اس پر عمل کیا، گویا اس نے نبوت کے تیسرے حصہ

[۲۰] بیہقی: شعب الإيمان، التاسع عشر......، فصل في إدمان تلاوة القرآن ۲: ۳۴۶، فصل في التكثر بالقرآن والفرح به ۲: ۵۲۲۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کو موضوع کہا ہے اور اس کے راوی بِشر بن نُمیر پر تفصیلی بحث کی ہے اور انہیں کذاب اوراحادیث گھڑنے والا کہا ہے۔ الفوائد المجموعۃ ص۲ تا ۳، کتاب المجروحین ۱: ۱۸۷، الكامل في الضعفاء ۲: ۱۵۵

[۲۱] بیہقی: شعب الإيمان، التاسع عشر......، فصل في التكثر بالقرآن والفرح به ۲: ۵۲۳، کتاب المجروحین اور الكامل في الضعفاء میں بھی بشر بن نمیر القشیری کے تعارف میں اس حدیث پر جرح کی گئی ہے۔ علامہ سیوطی نے بھی ابن الأنباری کی کتاب المصاحف اور بیہقی کی شعب الإيمان کے حوالہ سے اسے حضرت حسن (بصریؒ) سے مرسلاً نقل کیا ہے۔ الجامع الکبیر نمبر ۲۰۷۴/۳/۱۹۷۲

میں جو کچھ ہے وہ حاصل کر لیا اور جس نے آدھا قرآن کریم سیکھا اور اس پر عمل کیا، گویا اس نے آدھی نبوت میں جو کچھ ہے حاصل کر لیا اور جس نے پورا قرآن مجید سیکھ لیا گویا اس نے پوری نبوت حاصل کر لی۔

انہوں نے ہی محمد بن یحیی المروزی سے نقل کیا ہے ،وہ کہتے ہیں:ہمیں محمد بن سعدان نے بتایا، ان سے حسین بن محمد نے بیان کیا،انہوں نے حفصؒ سے سنا، انہوں نے کثیر بن زاذان سے، انہوں نے عاصم بن ضَمُرَہ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا آپؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۲] من قرأ القرآن وتلاہ و حفظه، أدخله اللّٰه الجنة وشفعه فی عشرة من أهل بیته کلٌّ قد وجبت له النار۔

جس نے قرآن مجید پڑھنا سیکھا، اس کی تلاوت کرتا رہا اور پھر اس کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کریں گے اور اس کے اہل خانہ میں سے ایسے دس لوگوں کے حق میں اس کی شفاعت قبول فرمائیں گے جن کے جہنم میں جانے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا۔

اُم درداءؒ (۱) کہتی ہیں:میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں عرض کیا:جنت میں داخل ہونے والے خوش نصیبوں میں سے قرآن مجید پڑھنے والوں کی نہ پڑھنے والوں پر کتنی فضیلت ہے؟ تو آپؓ نے فرمایا:

إن عدد آی القرآن علی عدد درج الجنة، فلیس أحد دخل الجنة أفضل ممن قرأ القرآن۔

---

[۲۲] اس سے ملتے جلتے الفاظ جامع ترمذی: کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل قاری القرآن ۵:۱۷۱،سنن ابن ماجہ: کتاب المقدمۃ ۱:۷۸،مسندامام احمدؒ: مسند علی بن أبی طالب رضی اللہ عنه ۱:۲۴۱،شعب الإیمان ،التاسع عشر......فی تعظیم القرآن ،فصل فی تعالیم القرآن ۲:۳۲۹،فصل فی تنویر موضع القرآن ۲:۵۵۲ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں اور روایت کا دارومدار حفص بن سلیمان پر ہے جن پر علماءِ رجال نے جرح کی ہے ۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں:یہ حدیث غریب ہے اور ہمیں اس سند کے علاوہ کہیں نہیں ملی اور یہ سند بھی صحیح نہیں کیوں کہ حفص بن سلیمان ضعیف ہے،امام بیہقیؒ نے بھی ترمذیؒ کی یہ بات نقل کرکے اسے ضعیف کہا ہے،ابن عدی نے الکامل فی الضعفاء ،تعارف ابوعمرحفص بن سلیمان الأسدی ۳:۲۶۸ میں محدثین کے اقوال سے ان کاضعف ثابت کیا ہے۔ امام حاکمؒ فرماتے ہیں اس حدیث کی سند صحیح ہے اور یہ متن صرف اسی سند کے ساتھ منقول ہے جوکہ شاذ ہے۔

۱۔ ان کا نام هُجَیمة یا جُهیمة بنت حُیَی دمشقیہ ہے بنوحمیر کی شاخ بنواَوصاب سے تھیں۔ یہ صحابیہ نہیں بلکہ طبقہ ثالثہ کی ثقہ اور فقیہہ تھیں ان کو ام درداء صُغریٰ بھی کہا جاتا ہے۔اپنے شوہر حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایات نقل کرتی ہیں۔ ام درداء کبریٰ کا نام کریمة یا خیرة بنت أبی حدرد تھا ان سے کل تین احادیث منقول ہیں جن میں سے کوئی بھی صحاح ستہ میں نہیں۔ ام درداء صغریٰ کی وفات ۸۱ ہجری میں ہوئی۔الجرح والتعدیل ،أم الدرداء الکبیرۃ ۲: ۴۶۲،جهیمة ۹:۴۶۳،ثقات ابن حبان،هجیمة بنت حُیی ۵:۵۱۷

قرآن کی آیات کی تعداد جنت کے درجات کی تعداد کے برابر ہے اور جنت میں جتنے لوگ داخل ہوں گے ان میں سے قرآن پڑھنے والوں سے افضل کوئی نہیں ہو گا۔اسے اَبو محمد مکی (بن اَبی طالب) نے نقل کیا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[۲۳] من قرأ القرآن واتبع ما فيه؟ هداه الله من الضلالة، ووقاه يوم القيامة سوء الحساب، وذلك بأن الله تبارك وتعالىٰ يقول: فَمَن اتَّبع هُدَایَ فَلا یَضلُّ ولا یَشقی، قال ابن عباس: فضمن الله لمن اتبع القرآن ألا يضل فی الدنيا ولا يشقى فی الآخرة، ذكره مكی أيضاً۔ وقال الليث يقال: ما الرحمة إلى أحد بأسرع منهما إلى مستمع القرآن، لقول الله جل ذكره: ﴿وإذا قُرئَ القُرآنُ فَاستَمِعُوا اِلَّهُ وَاَنْصِتُوا لَعَلَّكُم تُرحَمُون﴾ [طه: ۱۲۳] و"لَعَلَّ"۔ من الله۔ واجبة۔

جس نے قرآن مجید پڑھا اور اس میں موجود تعلیمات کے مطابق چلتا رہا، اللہ تعالیٰ اسے گمراہی سے بچا کر ہدایت نصیب فرمائیں گے اور قیامت کے دن حساب کی شدت سے بچا لیں گے۔ کیونکہ باری تعالیٰ خود ارشاد فرماتے ہیں: ”جس نے میری ہدایت کی پیروی کی وہ نہ تو گمراہ ہو گا نہ بدبخت“۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اس ارشادِ گرامی میں باری تعالیٰ نے قرآنی تعلیمات پر چلنے والے کو ضمانت دی ہے کہ نہ تو دنیا میں گمراہ ہو گا، نہ آخرت میں اسے برا انجام دیکھنا پڑے گا۔ اسے بھی مکی نے ذکر کیا ہے۔

لیثؒ کہتے ہیں: یہ بات مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کسی کی طرف اتنی تیزی سے متوجہ نہیں ہوتی جس قدر تیزی سے اس شخص کی طرف آتی ہے جو قرآن مجید کو غور سے سنتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: ﴿وَإِذَاقُرِیءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾ [الأعراف ۷:۲۰۴] (جب قرآن کریم پڑھا جائے تو خوب غور سے سنو اور خاموش رہو، شاید تم پر رحم کیا جائے) اور اس آیت میں لفظ "لَعَلّ" جو عام طور پر شاید کے لیے استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کی وجہ سے یقینی رحمت کے لیے ہے۔

---

[۲۳] مستدرک حاکم: كتاب التفسير، تفسير سورة طه ۲:۴۱۳، شعب الإيمان: التاسع عشر...... فصل فی ادمان تلاوة القرآن ۲:۳۵۶، عبدالرزاق: كتاب فضائل القرآن، باب تعليم القرآن و فضله ۳:۳۸۲، امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ ان تمام حضرات نے قال ابن عباس: فضمن الله سے پہلے تک نقل کیا ہے۔ اس کے بعد کے الفاظ یا اسی معنی کے دیگر الفاظ تفسیر ثعالبی، درمنثور، تفسیر بغوی اور زاد المسیر میں منقول ہیں۔

اُبو داوٗد طیالسی کی مسند تدوین حدیث کی تاریخ میں پہلی مسند ہے۔ اس میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۲۴] من قام بعشر آیات لم یکتب من الغافلین، ومن قام بمائة آیة کتب من القانتین، ومن قام بألف آیة کتب من المقنطِرین[۱]۔

جو شخص بارگاہ الٰہی میں کھڑا ہو کر دس آیات کی تلاوت کرتا ہے اس کا شمار غافلین میں نہیں ہوتا، جو اس طرح سو آیات پڑھتا ہے اسے قانتین (انتہائی فرمابرداروں) میں لکھ لیا جاتا ہے اور جو اسی طرح ہزار آیات کی تلاوت کرتا ہے اسے ایسے لوگوں میں شمار کر لیا جاتا ہے جو ڈھیروں کے حساب سے انعام پائیں گے۔

اس موضوع پر احادیث و آثار بکثرت ملتے ہیں مگر ہم مذکورہ بالا روایات پر ہی اکتفا کرتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت کی توفیق دینے والے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[۲۴] مسند ابو داود طیالسی میں یہ حدیث مجھے نہیں ملی البتہ امام ابو داوٗد سجستانی سمیت دیگر متعدد محدثین نے اسے ذکر کیا ہے ۔ سنن ابو داوٗد: کتاب الصلاۃ، باب تخریب القُرآن ۲: ۵۷،ابن حبان: کتاب الصلاۃ، باب النوافل ۶: ۳۱۰،ابن خزیمہ: کتاب الصلاۃ، باب فضل قراء ۃ الف آیۃ إن صحّ الخبر ۲: ۱۸۱، شعب الإیمان: التاسع عشر......، فصل فی مقدار مایستحب فیه القرء ۃ ۲: ۴۰۰، ان کے علاوہ دارمی، حاکم،بیہقی: شعب الإیمان ،عبدالرزاق نے یہ حدیث قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ کہیں مرفوعاً اور کہیں موقوفاً نقل کی ہے۔ اس کی سند میں ایک راوی ابوسویۃ کے بارے میں محدثین میں اختلاف ہے کہ وہ ابوسویۃ ہیں یاأبوسوید۔ ابو حاتم نے اسے ابو سوید حمید بن سوید مصری لکھا ہے اور کہا ہے کہ جو انہیں ابوسویۃ سمجھتا ہے اسے وہم ہوا ہے۔ ابن خزیمہ نے باب کا عنوان اس طرح قائم کیا ہے: باب فضل قراء ۃ الف آیۃ إن صحّ الخبر فإنّی لا أعرف أبا سویۃ بعد الة ولاجرح. حافظ ذہبی نے تقریب میں انہیں ابو سویہ عبید بن سویہ کہا ہے۔ حدیث روایات اور شواہد کو ملانے سے پایہ اعتماد کو پہنچ جاتی ہے ۔

۱۔ یہاں لفظ "مُقَنطَرین" استعمال ہوا ہے جو "قنطَار" سے ماخوذ ہے۔ قنطار وزن کا ایک پیمانہ ہے جس کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ سونے کے چالیس اُوقیہ کے برابر ہے جبکہ ایک اوقیہ کا وزن رطل کے بارہویں حصہ کے برابر ہے۔ بعض کہتے ہیں: قنطار ایک ہزار ایک سو دینار کے برابر ہے۔ بعض ایک سو بیس رطل کے برابر کہتے ہیں اور ایک رطل میں بارہ اوقیہ ہوتے ہیں اور یہ وزن چالیس تولے کے برابر بنتا ہے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: قِنطار اسی ہزار درہم کے برابر ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ قنطار مال کے بڑے مجموعے کو کہتے ہیں جس کی مقدار متعین نہیں ہے۔ حضرت اُبوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے کہ قِنطار بارہ ہزار اُوقیہ کے برابر ہے اور ایک اُوقیہ اس سب سے بہتر ہے جو کچھ زمین و آسمان کے درمیان ہے۔ لسان العرب۔ اس حدیث کو ابو داوٗد [illegible]

باب:۲

تلاوت کی کیفیت، اور آداب و احکام

تلاوتِ قرآنِ مجید کی کیفیت و آداب

امام بخاریؒ نے قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا:

[۲۵] كان يَمُدّ مَدًّا إذا قرأ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾ يَمُدّ بِسْمِ اللّٰهِ، وَيَمُدُّ بِالرَّحْمٰنِ، ويَمُدُّ بِالرَّحِيمِ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کرتے وقت الفاظ کو لمبا کیا کرتے تھے، جب آپ﴿ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ﴾پڑھتے تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ﴾ پر مد کرتے،﴿الرَّحْمٰنِ﴾ کو بھی کھینچتے اور ﴿الرَّحِيْمِ﴾ پر بھی مَد کرتے تھے۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے، آپؓ فرماتی ہیں:

[۲۶] كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يُقَطِّعُ قراء ته يقول:﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ ثم يقف ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾ ثم يقف، وكان يقرؤها:﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾۔قال: حديث غريب، وأخرجه أبو داود بنحوه۔

---

[۲۵] صحیح بخاریؒ: كتاب فضائل القرآن، باب مد القراءة ۳:۲۳۴، سنن ابوداؤد: كتاب الصلاة، باب استحباب الترتيل في القراءة ۲:۷۳، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب كيف قراءة المصلى ۲:۳۵۲، شعب الإيمان، التاسع عشر......، فصل في ترتيل القراءة ۲:۳۹۰۔ قدرے مختصر الفاظ میں۔ سنن نسائی: كتاب الافتتاح، باب مد الصوت بالقراءة ۲:۱۷۹، سنن ابن ماجہ: كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في القراءة في صلاة الليل ۱:۴۳۰، مسند احمدؒ: مسند انس بن مالکؓ رضی الله عنه ۵۶۷۳، مسند ابو یعلی: لقادة عن أنس رضى الله عنه ۵:۲۸۴ میں "يَمُدُّ صَوتَهُ مَدًّا" کے الفاظ ہیں۔

[۲۶] جامع ترمذیؒ: كتاب القراءات، باب فاتحة الكتاب ۵:۱۸۵، كتاب فضائل القرآن، باب ماجاء كيف كان قراءة النبي ۵:۱۸۲، سنن أبو داؤد: كتاب الحروف والقراءات، ۴:۳۷، مستدرک حاکمؒ: كتاب التفسير، باب قراءة النبي صلى الله عليه وسلم، حديث أم سلمه زوج النبي صلى الله عليه وسلم ۲:۲۵۲، مسند احمدؒ: حديث أم سلمة زوج النبي صلى الله عليه وسلم ۷:۴۲۹، سنن دار قطنی: كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة بسم الله الرحمن الرحيم، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب الدليل على أن بسم الله الرحمن الرحيم آية تامة من الفاتحة ۲:۳۳۹، شعب الإيمان، التاسع عشر......باب في تعظيم القران، فصل في ابتداء السورة بالتسمية سوى (براءة) ۲:۴۳۵

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر ٹھہر کر تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ چناں چہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ پڑھتے اور رُک جاتے، کچھ وقفہ کے بعد ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پڑھتے اور پھر وقفہ فرماتے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ میم کو الف کے بغیر پڑھا کرتے تھے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث غریب ہے۔ امام اُبو داؤد نے بھی اسی طرح کی ایک حدیث نقل کی ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد بھی منقول ہے:

[۲۷] أحسن الناس صَوتاً من إذا قرأ رأيته يخشى الله تعالى۔

سب سے بہتر آواز اس شخص کی ہے جو تلاوت کرے تو محسوس ہو کہ اس پر خشیتِ الٰہی طاری ہے۔

بلند آواز سے گانے کی طرز میں تلاوت کرنے کے خلاف روایات

زیاد نمیری رحمہ اللہ (۱) سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ کچھ دیگر قُراء کے ساتھ حضرت انس بن مالکؓ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہیں کہا گیا کہ تلاوت سنائیں۔ انہوں نے بلند اور لچکدار آواز سے تلاوت شروع کی۔ کچھ وہ فطرتاً بھی بلند آواز تھے۔ اسے سن کر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے جو کہ چہرے پر سیاہ کپڑا ڈالے ہوئے تھے، اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا اور فرمایا: ''یَاھٰذَا ما هكذا كانوا يَفْعَلُوْنَ'' (ارے بھائی! دورِ صحابہ میں تو ایسے تلاوت نہیں کی جاتی تھی)۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ جب کوئی ناپسندیدہ بات دیکھتے تو اپنے چہرے سے پردہ ہٹا کر بات کیا کرتے تھے۔

---

[۲۷] مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ، باب حسن الصوت ۲: ۴۸۸ میں "من أحسن الناس قراءة" اور "رأيت أنه يخشى الله" ہے، سنن ابن ماجہ: کتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب في حسن الصوت بالقرآن ۱: ۴۲۵ میں "إنَّ مِن أحسَنِ الناسِ صَوتا بالقرآنِ الذي إذا سمعتموه يقرأ حسبتموه يخشى الله" ہے۔ ابن عدیؒ نے الكامل في الضعفاء: تعارف حمید بن حماد التمیمی ۳: ۸۲ میں اس کی سند کو غیر محفوظ کہا ہے اور اس کے مرسل ہونے کو ترجیح دی ہے۔ ابن حبانؒ نے حمید بن حماد کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ الجرح والتعديل میں ہے کہ یہ مشہور نہیں مگر ان کی حدیث لکھی جاتی ہے۔ الجامع الکبیر حدیث نمبر ۶۸۳، الجامع الصغیر میں علامہ سیوطی نے حدیث نمبر ۲۵۲ کے تحت اسے ضعیف شمار کیا ہے مگر البانی نے سلسلہ الأحاديث الصحيحہ ۴: ۱۱۲ نمبر ۱۵۸۵۳ میں اسے ذکر کیا ہے۔

۱۔ زیاد بن عبد اللہ النمیری البصری تابعی ہیں۔ یحییٰ بن معین نے انہیں ضعیف کہا ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں ان کی حدیث لکھی جا سکتی ہے مگر دلیل نہیں بن سکتی۔ ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ وہ غلطی کر جاتے تھے۔ تهذيب الكمال تعارف نمبر ۲۲۸۳

قیس بن عُباد (۱) سے منقول ہے کہ وہ فرماتے تھے:

[۲۸] كانَ اَصحابُ رسولِ الله صلىّ اللّٰه عليهِ وسلَّم يكرَهُونَ رفعَ الصَّوتِ عِند الذِّكر۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اَجمعین بلند آواز سے ذکر کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔

دیگر جن حضرات سے گانے کی آواز میں تلاوتِ قرآن مجید کو ناپسند کرنا منقول ہے ان میں حضرت سعید بن میبؒ، (۲) سعید بن جبیر، قاسمؒ بن محمد، حسن، ابن سیرین اور ابراہیم نخعیؒ ہیں۔ امام مالکؒ اور امام اَحمد بن حنبل رحمہم اللہ بھی اسے ناپسند کرتے تھے۔ ان سب کی رائے یہی تھی کہ بلند اور لہروں والی آواز سے تلاوت کرنا اچھا نہیں ہے (۳)۔

سعید بن میبب رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے ایک دن حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کو کسی نماز میں امامت کراتے ہوئے لہردار آواز میں تلاوت کرتے سنا تو ان کو کہلا بھیجا: "اَصلَحکَ اللّٰہُ! اِنّ الأئمّةَ لاتقرأ هكذا" (اللہ تعالیٰ آپ کی اصلاح فرمائے! امام اس طرح تلاوت نہیں کیا کرتے) جس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے لہردار آواز سے تلاوت کرنا چھوڑ دیا۔

قاسمؒ بن محمد رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ ایک شخص نے مسجد نبوی میں لہردار آواز میں تلاوت کی تو انہوں نے اس کو ناپسند فرمایا اور کہا: اللہ تعالیٰ تو یوں ارشاد فرماتے ہیں: ﴿لاَ يَاْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلاَ مِنْ خَلْفِهِ﴾ [فُصِّلَتْ ۴۱: ۴۱، ۴۲] (وہ بڑی معزز کتاب ہے۔ اس میں باطل نہ آگے سے آسکتا ہے اور نہ پیچھے سے)

امام مالکؒ رحمہ اللہ سے دوران نماز میں قراءت کرتے ہوئے بتکلف آواز بلند کرنے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے اسے سخت نا پسند کیا بلکہ آپؒ تو تکلف کے علاوہ بھی آواز بلند کرنے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ابن القاسمؒ (۴) سے امام مالکؒ ہی کے بارے میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ ان سے نماز میں طرز لگانے سے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: مجھے تو یہ اچھا نہیں لگتا۔ پھر فرمایا: یہ تو گانا ہوا جسے لوگ کمائی کے لئے گاتے ہیں۔

---

[۲۸] سنن بیہقیؒ: کتاب الجنائز، باب كراهية رفع الصوت فى الجنائز والقدر الذى لايكره منه ۵:۴۵، كتاب السير، باب الصمت عندالللقاء ۱۳:۷ ۵۱

۱۔ امام ابوعبداللہ قیس بن عباد ضُبَعی بصری تابعی ہیں (م بعد ۸۰ھ)، طبقہ ثانیہ میں سے تھے اور ثقہ تھے۔ تقریب التھذیب ۱:۴۵۷

۲۔ سعید بن میبب بن حزن بن اَبی وھب قریشی مخزومی (متوفی بعد از سن ۹۰ھ) بہت بڑے فقیہ اور ثقہ علماءِ تابعین میں سے تھے اور اس بات پر محدثین کا اتفاق ہے کہ ابن میبب کی مراسیل صحیح ترین مراسیل ہیں۔ تقریب التھذیب ۱: ۳۰۵

۳۔ قاسمؒ بن محمد (م ۱۰۶ھ) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پوتے اور مدینہ منورہ کے فقہاء میں سے تھے۔ تقریب التھذیب ۱:۴۵۱

۴۔ عبدالرحمٰن بن قاسمؒ بن خالد عتقیؒ المعروف ابن القاسمؒ (م ۱۹۱ھ) امام مالکؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ تقریب التھذیب ۱:۳۴۸

بلند آواز اور خوش الحانی سے تلاوت کرنے کی تائید میں آراء

بعض علماء نے بلند اور لہردار آواز میں تلاوت کرنے کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ جو تلاوت خوبصورت آواز بنا کر کی جائے وہ لوگوں کو زیادہ اچھی لگتی ہے اور دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے:

[۲۹] زَيِّنُوا القرآنَ بأصواتكم۔

قرآن کریم کی تلاوت کو اپنی آواز کے ساتھ خوبصورت بناؤ۔ اس حدیث کو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور امام اُبو داؤد اور امام نسائیؒ دونوں نے نقل کیا ہے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۳۰] لَيسَ مِنَّا مَن لَمْ يَتَغَنَّ بِالقُرآن۔

جو قرآن مجید طرز لگا کر نہیں پڑھتا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یہ حدیث امام مسلمؒ نے نقل کی ہے۔

حضرت اُبوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ عرض کرنا بھی ان کی دلیل ہے کہ

[۳۱] لَو أَعْلَمُ أَنَّكَ تَسْتَمِعُ لِقَراءَتِي لَحَبَّرْتُهُ لَكَ تحبيرا۔

---

[۲۹] صحیح بخاری: کتاب التوحید ۶:۲۷۴۳ میں باب قول النبی: الماهر بالقرآن مع السفرة الكرام البررة وزينوا القرآن باصواتكم کے عنوان سے باب قائم کیا گیا ہے مگر حدیث ذکر نہیں کی گئی۔ سنن اُبو داؤد: کتاب الصلاة باب الوتر ۱:۳۲۸، سنن نسائی: کتاب الافتتاح، باب تزيين القرآن بالصوت ۲:۱۳۹، مستدرک حاکم: کتاب فضائل القرآن، سنن ابن ماجہ: کتاب إقامة الصلاة، باب حسن الصوت بالقرآن ۱:۴۲۶، نیز امام احمدؒ، ابن حبانؒ، ابن خزیمہ، ابویعلی، عبدالرزاق، بزار، دارمیؒ، بیہقیؒ رحمہم اللہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ اس کی سند صحیح اور عبدالرحمٰن بن عوسجہ کے علاوہ اس کے تمام رجال شیخین والے ہیں اور وہ بھی ثقہ ہیں۔

[۳۰] صحیح بخاریؒ: کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ ﴿وَأَسِرُّوا قَوْلَكُمْ أَوِ اجْهَرُوا بِهِ﴾ ۴: ۳۰۴، صحیح مسلمؒ: کتاب صلاة المسافرين، باب استحباب تحسين الصوت بالقرآن ۱:۵۴۵، قدرے مختلف الفاظ، سنن ابوداؤد: کتاب الصلاة، باب استحباب الترتيل في القراءة ۲:۷۴، مسند احمد: مسند سعد بن ابی وقاص رضي الله عنه ۱:۱۷۲، سنن دارمی: کتاب الصلاة، باب التغني بالقرآن ۱:۳۷۲۔ نیز ابویعلی، عبدالرزاق، بزار، بیہقیؒ وغیرہم بہت سے محدثین نے اسے نقل کیا ہے البتہ ان میں سے بعض نے اس کے معنی میں تاویلات ذکر کی ہیں۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے اور امام ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔ یہی حدیث دو اور طرق سے بھی منقول ہے۔

[۳۱] صحیح ابن حبانؒ: کتاب اخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۶:۱۶۹، مستدرک حاکمؒ: کتاب معرفة الصحابة رضي الله عنهم، باب ذکر مناقب ابی موسى عبدالله بن قيس الأشعري رضي الله عنه ۳:۵۲۹، مسند ابو یعلی: حديث ميمونة زوج النبي صلى الله عليه وسلم ۱۳:۲۱۳، مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاة، باب حسن الصوت ۲:۴۸۵، سنن بیہقیؒ: کتاب الصلاة، باب من جهر بها إذا كان من حوله لايتاذى بقراءته ۳:۹۴۔ امام حاکمؒ نے اسے صحیح کہا ہے اور حافظ ذہبیؒ نے ان کی تائید کی ہے۔

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میری تلاوت غور سے سن رہے ہیں تو میں اپنی آواز کو خوب سنوار کر تلاوت کرتا۔

اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، آپؓ فرماتے ہیں:

[۳۲] قرأ رسول الله صلىّ الله عليهِ وسلَّم عامَ الفَتحِ فِي مَسِيرٍ له سُورةَ الفتح على راحِلتِهِ فَرَجَعَ فِي قِراءته۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ والے سال ایک سفر کے دوران اپنی سواری پر ''سورۂ فتح'' کی تلاوت فرمائی تو آواز کو گھما گھما کر پڑھتے تھے۔

طرز کے ساتھ جوازِ تلاوت کے قائلین

جن حضرات سے یہ رائے منقول ہے ان میں امام اَبو حنیفہؒ اور ان کے ہم خیال علماء، امام شافعیؒ، ابن مبارکؒ اور نضر بن شُمَیلؒ شامل ہیں۔ یہی رائے اَبو جعفر طبریؒ، اَبو الحسن بطّالؒ اور قاضی اَبو بکر ابن العربیؒ وغیرہم کی بھی ہے۔

مؤلف کا تبصرہ

میرے خیال میں پہلی رائے زیادہ صحیح ہے جیسا کہ ذکر کیا جا چکا اور آئندہ بھی آرہا ہے۔ باقی جہاں تک دوسری رائے اور اس کے حق میں پہلی حدیث سے استدلال کا تعلق ہے تو اس کا ظاہری معنی مراد نہیں بلکہ اس کا الٹ مراد ہے یعنی ''زَيِّنُوا أصواتَكُمْ بالقُرآن'' (قرآن کی تلاوت کر کے اپنی آوازوں کو خوب صورت بناؤ)۔

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: کئی علماءِ حدیث نے اس حدیث کی یہی تاویل کی ہے کہ اس سے مراد تلاوتِ قرآن کے ذریعے اپنی آوازوں کو حسن بخشنا ہے اور حدیث کے الفاظ کی جو ترتیب ہے معنی اس کے الٹ مراد ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''عَرَضْتُ الحَوْضَ عَلَى النَّاقَةِ'' (میں پانی کے تالاب کو اونٹنی کے پاس لے آیا)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ''اونٹنی کو تالاب کے پاس لے آیا''۔ علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کو معمر نے منصور سے اور انہوں نے طلحہ سے بھی نقل کیا ہے، ان کی روایت میں اَصوات کا ذکر بھی قرآن سے پہلے آیا ہے اور یہی

[۳۲] صحیح بخاریؒ: كتاب فضائل القرآن، باب القراءة على الدابة ۳:۲۳۳، باب الترجیع ۳:۲۳۵، صحیح مسلمؒ: كتاب صلاة المسافرين، باب ذكر قراءة النبي صلى الله عليه وسلم سورة الفتح يوم فتح مكه ا: ۵۴۷، سنن اَبو داوٗد: كتاب الصلاة، باب استحباب الترتيل في القراءة ۲: ۷۴، مسند احمدؒ: حديث عبدالله بن مغفل المزني رضى الله عنه ۲: ۱۰۴، صحیح ابن حبانؒ: كتاب الرقائق، باب قراءة القرآن ۳: ۲۳

بات صحیح ہے۔ نیز فرماتے ہیں کہ اسی حدیث کو طلحہ نے عبد الرحمٰن بن عوسجہ سے اور انہوں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اس ارشادِ نبوی کے الفاظ:" زَيِّنُوا القُرآنَ بأصواتِكُمْ "(قرآن کو اپنی آوازوں سے خوبصورت بناؤ) نقل کیے ہیں۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت سے اپنی زبانوں کو تر رکھو، اپنی آوازوں کو اسی میں لگائے رکھو۔ اسے اپنا شعار اور اپنے لئے زیور بنا لو۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے مراد قرآن کی تلاوت اور اس کو ہمیشہ اپنائے رکھنے کی ترغیب ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

[۴۳] زَيِّنُوا أصواتَكُمْ بِالقُرآنِ۔اپنی آوازوں کو قرآن سے مزین کرو۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

[۴۴] حَسِّنُوا أَصْواتَكُمْ بِالقُرآنِ۔اپنی آواز کو قرآن کی تلاوت کے ذریعے حُسن بخشو۔

میرے خیال میں ارشادِ نبوی "لیسَ مِنَّا مَن لَمْ يَتَغَنَّ بِالقُرآنِ" (وہ ہم میں سے نہیں جو قرآن کریم کی تلاوت طرز لگا کر نہیں کرتا) سے مراد بھی یہی ہے کہ وہ شخص ہم میں سے نہیں جو قرآن کی تلاوت کر کے اپنی آواز کو حُسن نہیں بخشتا۔ عبد اللہ بن اَبی مُلیکہ نے بھی اس کی تاویل اسی طرح کی ہے۔ عبد الجبار بن الورد کہتے ہیں، میں نے اَبو مُلیکہ کو یہ کہتے ہوئے سنا:"عبد اللہ بن اَبی یزید کہتے ہیں: اَبو لُبابہ ہمارے قریب سے گزرے تو ہم ان کے پیچھے ہو لئے، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ وہاں ایک مفلوک الحال شخص تھا جو کہہ رہا تھا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے: "لَيسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بالقرآن" (وہ شخص ہم میں سے نہیں جو قرآن طرز لگا کر نہیں پڑھتا)۔ تو میں نے ابن اَبی مُلیکہ کو کہا، اے اَبو محمد! آپ کا کیا خیال ہے اگر تلاوت کرنے والے کی آواز ہی اچھی نہ ہو تو کیا کرے؟ انہوں نے کہا: جس قدر ہو سکے اسے اچھا بنانے کی کوشش کرے۔ یہ روایت امام اَبو داوُدؒ نے نقل کی ہے۔

---

[۴۳] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مجھے یہ حدیث نہیں ملی۔ مستدرک حاکمؒ : کتاب فضائل القرآن، ذکر فضائل سورو آی متفرقة ۱:۷۶۲،۷۶۴،مصنف عبدالرزاق : کتاب الصلاة، باب حسن الصوت ۲:۴۸۵ میں یہ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے منقول کیا ہے،ابن حبانؒ نے اپنی صحیح:کتاب الرقائق ،باب قراءة القرآن ۳:۲۵ میں" زَيِّنُوا القُرآنَ باصواتِكُمْ "نقل کرنے کے بعد فرمایا:یہ عبارت اضداد میں سے ہے جس کا یہاں مطلب یہ ہے اپنی آوازوں کو قرآن سے مزین کرو، نہ یہ کہ قرآن کو اپنی آوازوں سے زین کرو۔

[۴۴] مصنف ابن اَبی شیبہ: کتاب فضائل القرآن ،باب في حسن الصوت بالقرآن میں یہ درج ذیل سند کے ساتھ منقول ہے: حدثنا أبو أسامة عن أبي حنيفة عن حماد عن إبراهيم قال.قال عمر رضی الله عنه : "حَسِّنُوا أصواتكم بالقرآن"، امام دارمیؒ نے اپنی سنن: کتاب فضائل القرآن، باب التغني بالقرآن ۲:۹۲۹ میں حضرت براء رضی اللہ عنہ سے حَسِّنُوا القرآن نقل کیا ہے۔

اسی طرح حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا اس سے بھی یہی مراد ہے کہ: اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ آپ میری تلاوت غور سے سن رہے ہیں تو میں قرآن سے اپنی آواز کو حسین بناتا اور ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کرتا۔ اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اپنی فطری خوبصورت آواز کے باوجود قرآن مجید کی تلاوت جلدی جلدی کر رہے تھے۔

اس حدیث میں جو لفظ "تحبیر" استعمال ہوا ہے اس کا معنی تزیین اور تحسین ہے یعنی اگر ان کو معلوم ہو جاتا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تلاوت سن رہے ہیں تو وہ ٹھہر ٹھہر کر آواز کو لمبا کر کے تلاوت کرتے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کیا کرتے تھے اور اس طرح تلاوت سے ان کی آواز کا حسن اور بڑھ جاتا۔ خدا کی پناہ !اس قول کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے کہ قرآن کریم کو حسن بخشنے کے لئے آواز یا کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ جو شخص حدیث کی یہ تاویل کرتا ہے وہ قرآن کے حسن و خوبی کو دیگر عوامل کا محتاج مان کر بہت غلطی کرتا ہے۔ حالاں کہ قرآن خود نور ہے، روشنی ہے اور اس شخص کو اعلیٰ ترین حسن بخشنے والا ہے جو اس کی رعنائیوں کے ساتھ تعلق بناتا اور اس کی ضیاء پاشیوں سے منور ہونا چاہتا ہے۔

دونوں آراء میں تطبیق کی صورتیں

ایک رائے یہ ہے کہ جن روایات میں تلاوت کے وقت آواز خوبصورت بنانے کا حکم دیا گیا ہے، ان سے مراد قراءت کے طریقوں کو سیکھنا اور انہیں اپنی آوازوں سے خوبصورت بنانا ہے۔ اس لحاظ سے اصل عبارت یوں بنتی ہے: "زَيِّنُوا القِراءَ ةَ بِأَصْواتِكُمْ" (تلاوت کو اپنی آوازوں سے خوبصورت بناؤ) چناں چہ "قرآن" کا لغوی معنی "قراءت" یعنی تلاوت اور پڑھنا مراد ہو گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَقُرْآنَ الْفَجْرِ﴾ [الاسراء ۱۷:۷۸] اور صبح کے وقت کی تلاوت، اور ارشاد گرامی: ﴿فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ﴾ [القیامۃ: ۱۸] اور جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اسی طرح پڑھا کریں۔ یہاں بھی قرآن سے مراد تلاوت اور پڑھنے کا عمل ہے۔

اسی طرح صحیح مسلمؒ میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا:

[۳۵] إِنَّ فِي البَحْرِ شَيَاطِين مسجونَةٌ أَوثَقَهاسُليمانُ عليه السلام، وَيُوشِكُ أَنْ تَخرُجَ فتقرأ على النّاسِ قُرآناً۔ أي قراءةً ۔

[۳۵] صحیح مسلمؒ: المقدمة، باب النهي عن الرواية عن الضعفاء ۱:۱۲ بروایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعا، مصنف عبدالرزاق: كتاب العلم، باب أشراط الساعة ۱۱:۳۸۳ بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ موقوفا، کامل ابن عدیؒ ۱:۴۵، مجمع الزوائد ۷: ۴۲

سمندر میں کچھ شیاطین قید ہیں جنہیں حضرت سلیمان علیہ السلام نے باندھ دیا تھا۔ قریب ہے کہ وہ سمندر سے نکل آئیں اور لوگوں کو کچھ پڑھ کر سنائیں۔ یہاں بھی لفظ ''قُرْآن'' سے مراد پڑھنے کا عمل ہے۔

ایک شاعر نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا ذکر یوں کیا ہے:

ضَحُّوا بِأشْمَطَ، عُنوانُ السُّجود بِهِ يُقَطِّعِ اللّيلَ تسبيحًا وقُرآنا

انہوں نے ایسی ہستی کو شہید کر دیا جس کے بال سفید اور اس کی پیشانی پر سجدے کا نشان نمایاں تھا۔ وہ اپنی راتیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور تلاوت میں گزارتے تھے۔

یہاں بھی تلاوت کے لیے لفظ "قرآن" ہی استعمال کیا گیا ہے۔ اس تاویل کے مطابق لفظ "قرآن" کا لفظی معنیٰ'' قراءۃ ''ہی صحیح ہوگا البتہ اگر'' قراءۃ'' بمعنی تلاوت اپنے اصلی معنی میں استعمال نہ ہو تو مندرجہ بالا تاویل بھی صحیح نہ ہوگی جیسا کہ ہم اس کی وضاحت آئندہ چل کر کریں گے۔

غِنَاء بمعنی استغناء کی تحقیق

ایک رائے یہ بھی ہے کہ جن روایات میں لفظ "غِنَی" استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد گانا یا طرز بنانا نہیں بلکہ "استغناء" ہے جو کہ "افتقار" یعنی محتاجی کا متضاد ہے۔ چناں چہ کہا جاتا ہے: "تَغَنَّيتُ وتغانَيتُ" بمعنی استَغْنَيتُ"، اسی طرح علامہ جوہریؒ کی کتاب "الصحاح" میں بھی "تغنّى الرَّجُلُ کا معنی استغنَى الرّجُلُ (یعنی آدمی مستغنی ہو گیا) ہی آیا ہے۔ اور اغناهُ اللّٰهُ. اور "تغانَوا" کا معنی ہے وہ ایک دوسرے سے مستغنی ہو گئے۔

مغیرہ بن حَبْنَاء[1] تمیمی کہتا ہے:

كِلانَا غِنِيٌّ عَنْ أخيهِ حياتَهُ ونَحْنُ إذا مُتنا أشَدُّ تغانيا[2]

ہم دونوں بھائی اپنی زندگی میں ایک دوسرے سے مستغنی ہیں اور جب ہم مر جائیں گے تو یہ استغناء اور زیادہ ہو جائے گا۔

یہی تاویل سفیان بن عیینہ اور وکیع ابن الجراح نے اختیار کی ہے اور اسی کو سفیان نے سعد بن اَبی وقاص رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اسحاق بن راہویہؒ نے سفیانؒ سے اس رائے کا ایک اور مفہوم بھی نقل کیا ہے اور وہ یہ کہ: قرآن کے ساتھ تعلق کی وجہ سے دوسرے ہر طرح کے کلاموں سے مستغنی ہو جائے۔

۱۔ حَبْناء مغیرہ کی والدہ کا نام ہے اور اس کے والد کا نام عمرو بن ربیعہ بن اُسَید تھا۔ اس کے دونوں بھائیوں صخر اور یزید میں سے ہر ایک کو بھی ''ابن حَبناء ہی کہا جاتا تھا۔ المؤتلف والمختلف في أسماء الشعراء وكُناهم ص ۱۳۲

۲۔ یہ شعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ رضی اللہ عنہ کا ہے۔ تاريخ آداب اللغة العربية ۱: ۱۵۱

[۳۶] یہی رائے امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ کی بھی ہے۔ انہوں نے ایک باب کا عنوان قائم کرنے کے بعد درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ نقل کیا ہے: ﴿اَوَلَمْ یَکْفِھِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ یُتْلٰی عَلَیْھِمْ﴾ [العنکبوت ۴۹] اُن کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو انہیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

غِناء بمعنی دُکھ اور غم کی تحقیق

ایک رائے یہ بھی ہے کہ حدیث کے لفظ "یَتغَنّی به" کا معنی قاری کا تلاوت کرتے ہوئے دُکھی ہو جانا ہے اور اس پر رقت کا طاری ہو جانا ہے۔ اس معنی کے لئے "حُزن" کا لفظ آتا ہے جو کہ "سرور" کا متضاد ہے یعنی تلاوت کرتے ہوئے اس پر غم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لفظ "یتغنّی" یہاں "غُنیة" سے مأخوذ نہیں ہے کیوں کہ ایسا ہوتا تو حدیث کے الفاظ "یتغنّی به" کی بجائے "یتغانیَ به" ہوتے، یہ علماء کی ایک جماعت کی رائے ہے جن میں ابو محمد ابن حِبّان البُستی بھی ہیں۔ ان کی دلیل مطرِّف بن عبد اللہ بن شِخّیر کی روایت ہے جسے وہ اپنے والد محترم سے نقل کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ:

[۳۷] رأیتُ رسولَ اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم یُصلّی ولصَدرِہ أزیزٌ کأزیز المِرجَل من البکاء۔

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا جس کے دوران رونے کی شدت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سینہ مبارک سے کسی چیز کے ابلنے کی یوں آواز آرہی تھی جیسے چولہے پر چڑھی ہنڈیا کھدکھداتی ہے۔

---

[۳۶] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب من لم یتغن بالقرآن و قوله تعالیٰ...... ۴:۱۹۱۸ ۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو اپنے لئے کافی سمجھ کر اقوام کی تاریخوں کے علم سے مستغنی ہو جائے۔ مفسرین نے یہی کہا ہے۔

[۳۷] یہ الفاظ "کأزیز المِرجل" سنن نسائی: کتاب السهو، باب البکاء فی الصلاة ۳:۱۳، صحیح ابن حبانؒ: کتاب الرقائق، باب الخوف والتقوی ۲:۴۳۹، صحیح ابن خزیمہ: کتاب الصلاة، باب الدلیل علی أنّ البکاء فی الصلاة لا یقطع الصلاة مع اباحة البکاء فی الصلاة ۲: ۵۳، مستدرک حاکمؒ: کتاب الإمامة و صلاة الجماعة، باب التامین ۱:۳۹۶ وغیرہ میں منقول ہیں جبکہ سنن ابو داؤد: کتاب الصلاة، باب البکاء فی الصلاة ۱:۲۳۸، سنن بیہقیؒ: کتاب الصلاة، باب من بکی فی صلاته فلم یظهر صوته ما یکون کلاماله هجاء ۳:۱۳۱، شعب الإیمان: التاسع عشر......، فصل فی البکاء عند قراءۃ القرآن ۲:۳۶۲ میں "کأزیز الرَّحا" یعنی چکی کی رگڑ کے الفاظ ہیں۔ امام حاکمؒ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح اور امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق ہے، امام احمدؒ نے عبداللہ بن الشخیر کا قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث میں "مِنَ البکاء" یعنی رونے کی وجہ سے یہ آواز آنے کا ذکر صرف یزید بن ہارون نے کیا ہے۔

یہاں لفظ ''اَزِیز'' استعمال ہوا ہے جس کا معنی بجلی کی کڑک اور ہنڈیا کا ابلنا ہے۔ علماء فرماتے ہیں: اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ حدیث میں ''یتغنّی'' کے لفظ سے مراد غمگین ہونا اور رقت طاری ہونا ہے، وہ اس کی تائید میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ایک حدیث بھی پیش کرتے ہیں جس میں انہوں نے فرمایا:

[۳۸] قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: "اقرأ عليّ" فقرأتُ علیه سورة "النساء" حتی إذا بلغت: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَابِكَ عَلَى هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ [النساء ۴] فنظرت إلیه فإذا عیناه تدمعان۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا: مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ چناں چہ میں نے ''سورۂ نساء'' پڑھنا شروع کر دی جب میں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَابِكَ عَلَى هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا﴾ یعنی اس وقت کیا حال ہو گا جب ہم ہر امت سے ایک ایک گواہ حاضر کریں گے اور ان لوگوں پر آپ کو بطور گواہ پیش کریں گے تو میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

یہ بحث چار طرح کی آراء پر مشتمل تھی۔ جس میں کسی روایت سے تلاوت قرآن مجید کرتے ہوئے گانے کی طرزیں بنانے اور دوہرا دہرا کر پڑھنے کا ثبوت نہیں ملتا۔ اور أبو سعید بن الأعرابی زیر بحث حدیث پاک ''لیسَ مِنّا مَنْ لَمْ یتغنّ بِالقُرآن'' کا شان ورود بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اہل عرب اکثر مواقع پر اپنا کلام شعر اور گانے کے ذریعے پیش کرنے کے عادی تھے۔ جب قرآن مجید نازل ہوا تو انہوں نے چاہا کہ گانے کی جگہ قرآن مجید کو اپنے کلام کا ذریعہ بنائیں چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا: ''لَیسَ مِنّا مَن لَمْ یَتغَنَّ بِالقُرآن'' (۱)

پانچویں تأویل: ''غِنَاء'' بمعنی ترجیع وتطریب

یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو زیر بحث حدیث سے تلاوت قرآن کریم میں طرز لگانے اور آواز گھمانے

---

[۳۸] جامع ترمذیؒ: کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ النساء ۵:۲۳۷، سنن ابن ماجہ: کتاب الزھد، باب الحزن والبکاء ۲:۱۴۰۳، میں یہی الفاظ ہیں جبکہ ابن خزیمہؒ، بزارؒ، ابو یعلی، بخاریؒ، مسلمؒ، ابن حبانؒ، طبرانی، بیہقیؒ: شعب الایمان اور امام احمدؒ کے ہاں ''تَذرِفان''، فاضت، تھرقان، فَاغرَورَقَتْ، تَھراقان، دُموعه تَسِیل، تَسیلان، فبکی وغیرہ اسی کے ہم معنی الفاظ منقول ہیں۔

۱۔ اس سیاق کے مطابق حدیث کا مطلب یہ بنتا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں جو گانا چھوڑ کر اس کی جگہ قرآن کی تلاوت نہیں اپناتا۔

کو جائز ثابت کرتے ہیں چناں چہ عمر بن شَبّہ کہتے ہیں کہ میں نے جب ابو عاصم النبیل کو بتایا کہ ابن عُیینہ اس حدیث میں لفظ "یتغنَّ" کا معنی "یَستغنی" (استغناء اختیار کرنا) کرتے ہیں تو انہوں نے کہا: "ابن عُیینہ کی اس بات کی کوئی اہمیت نہیں"۔ اسی طرح امام شافعیؒ رحمہ اللہ سے ابن عُیینہ کے بیان کردہ معنی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: "ہمیں اس کا معنی ابن عیینہ سے زیادہ معلوم ہے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے مراد "استغناء" ہوتی تو آپ علیہ السلام "مَنْ لَمْ یستغنِ" ہی فرماتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی "یتغنّ" فرمایا تو اس سے مراد بھی وہی معنی ہوگا جو "یتغنّ" کا ہے۔

امام طبریؒ فرماتے ہیں: ہمارے ہاں کلام عرب میں مشہور یہی ہے کہ "تَغَنّی" سے مراد گانے کی طرز ہے جس میں آواز خوبصورت بنانا اور اسے گلے میں گھمانا دونوں شامل ہیں۔ اسی معنی کی وضاحت میں شاعر کا یہ قول ہے:

تَغَنَّ بالشِّعر مَهمَا کُنتَ قائله إنّ الغِنَاء بهذا الشّعر مِضمارُ

شعر کو گا کر پڑھو تم جب بھی اسے بولو۔ اس شعر کو گا کر بولنا ہی اس کا میدان ہے۔

امام طبریؒ کہتے ہیں: یہ دعویٰ کہ "غِناء" سے مراد "استغناء" ہے، بالکل بے دلیل ہے۔ نہ کلام عرب میں اس کی کوئی مثال ہے نہ شعر میں، نہ ہی ہمارے علم کے مطابق اہل علم میں سے کسی کا قول اس کے حق میں ہے۔ جہاں تک اَعشیٰ کے شعر:

و کُنتُ امرأ زمَنًا بالعراقِ عَفیفَ المَناخِ طویلَ التغَنّ

میں کچھ عرصہ عراق میں اس طرح رہا کہ میرا ماحول پاکیزہ اور قیام لمبا تھا۔

سے استدلال کا تعلق ہے تو اس میں "تغنی" کا معنی "استغناء" سمجھنے والوں کی غلطی ہے۔ اَعشیٰ[1] کے قول "طویل التَّغَن" سے مراد لمبا قیام ہے جیسا کہ عرب لوگ کہتے ہیں: "غَنَی فُلانٌ بمکانِ کذا" ای أقام (یعنی فلاں شخص فلاں جگہ پہ اقامت پذیر رہا) اور اسی معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿کَاَنْ لَمْ یَغْنَوْا فِیْهَا﴾ [هود: ۹۵] (ایسے جیسے کہ وہ اس میں کبھی رہے ہی نہ ہوں)۔

اسی طرح شاعر کے قول: "ونحنُ إذا مُتنَا أشدُّ تغانِیا" میں لفظ "تغانیا" کا معنی "استغناء" لینا بھی ایسا سمجھنے والے کی ناواقفیت کی وجہ سے ہے کیوں کہ "تَغَانِي" باب "تفاعل" سے ہے جس میں دو طرفہ عمل ضروری ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے مستغنی ہوتے ہیں، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "تضارَبَ

۱۔ میمون بن قیس بن جندل بن بکر بن وائل بن ربیعہ (م ۶۲۹ھ) المعروف اَعشیٰ زمانہ جاہلیت کے بڑے شعراء میں سے تھے اور ان کے شعر گائے بھی جاتے تھے۔ تاریخ آداب اللغة العربیة ۱:۱۰۳

الرَّجُلان" یعنی دو آدمیوں میں سے ہر ایک نے دوسرے کو مارا۔ اب اگر کوئی کہتا ہے کہ "تفاعل" والا معنی تب مراد لیا جائے گا جب معاملہ دو اطراف کے درمیان ہو۔ جب بات ہی ایک کی ہو تو یہ معنی مراد لینا ٹھیک نہیں ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر کسی ایک فرد کے لئے یہ صیغہ استعمال کر کے " تغانیَ زیدٌ اور تضارَبَ زَیدٌ" وغیرہ کہنا بھی جائز نہیں اور اسی طرح یہ دعویٰ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ "تغنّی" "استغنی" کے معنی میں آتا ہے۔

امام طبریؒ کی بحث پر مؤلف کا تبصرہ

میرے خیال میں طبری رحمہ اللہ[۱] کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ کلامِ عرب میں "تغنّی" "استغنی" کے معنی میں کہیں نہیں آیا۔ یہ معنی جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں جوہری نے بھی بیان کیا ہے اور ہروی نے بھی۔ علامہ طبری کا یہ کہنا کہ "فَاعَلَ" کے صیغہ میں دو طرفہ عمل پایا جانا ضروری ہے تو یہ بھی کوئی قطعی بات نہیں کیوں کہ بہت سے مقامات پر یہ صیغہ مفرد کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے:

[۳۹] وأنا یومَئِذٍ قَد ناهَزْتُ الاِحتِلَامَ۔ اور میں ان دنوں قریب البلوغ تھا۔

اسی طرح اہل عرب کہتے ہیں: "طَارَقْتُ النَّعْلَ، وعاقَبْتُ اللِّصَّ، ودَاوَیتُ العَلیلَ" (میں نے جوتے کے اوپر دوسرا جوتا پہن لیا، اور میں نے چور کو سزا دی، اور میں نے بیمار کو دوا دی)۔ اس طرح کی بہت سی مثالیں پائی جاتی ہیں اور انہی میں سے ایک "تغانیَ" بھی ہے۔ چناں چہ جب ارشاد نبوی کے لفظ "یتغنَّ" میں "غِناء" (خوش آوازی اور طرز بندی) اور "استغناء" دونوں کا احتمال موجود ہے تو ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، حق تو یہ ہے کہ اگر لفظ "یتغنَّ" کی اور کوئی مناسب تاویل ممکن نہ ہو تو اس سے "استغناء" مراد لینا ہی زیادہ بہتر ہے۔ کیوں کہ یہ ایک عظیم المرتبت صحابی سے بھی منقول ہے، جیسا کہ سفیان بن عیینہ نے ذکر کیا ہے۔ خود سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کی ثقاہت اور علمی پختگی کا یہ عالم ہے کہ ابن وہب ان کے بارے میں کہتے ہیں: میں نے احادیث کی تشریح و توضیح میں سفیان سے بڑا عالم کوئی نہیں دیکھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ سفیان نے امام شافعیؒ کی زیارت بھی کی اور ان کی صحبت سے فیض یاب بھی ہوئے۔

---

[۳۹] صحیح مسلمؒ: كتاب الصلاة، باب سترة المصلي ۱:۳۶۱، سنن ابوداود: كتاب الصلاة، باب من قال: الحمار لایقطع الصلاة ۱:۱۹۰، مؤطا امام مالک: كتاب قصر الصلاة في السفر، باب الرخصة في المرور بين يدي المصلي ۱:۱۵۵ میں یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

۱۔ امام محمد بن جریر بن یزید طبریؒ (م ۳۱۰ھ) کو مفسرین کا بادشاہ مانا جاتا ہے، ان کا کوئی ہم عصر علوم و معارف میں ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ شیخ الشافعیہ امام أبو حامد اسفرایینی کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص چین تک صرف تفسیرِ طبری سیکھنے کی خاطر سفر کر لے تو کوئی بڑی بات نہیں۔ سیوطی: طبقات المفسرین ص ۹۵ تا ۹۷

چھٹی تاویل: گانے کی طرز کے ساتھ دہرا دہرا کر پڑھنے کی ممانعت

اس تاویل کی بنیاد وہ مزید الفاظ ہیں جو صحیح مسلمؒ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہیں۔ آپؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

[۴۰] مَا أذِنَ اللّٰهُ لِشَیءٍ ما أذِنَ لنبیٍّ حُسنَ الصوتِ یتغَنّی بِالقرآن یَجْهَرُبه۔

جس چیز کی اجازت اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی ہے اور کسی کو نہیں دی، اور وہ اچھی آواز کی نعمت ہے جس سے وہ قرآن کو طرز لگا کر اونچی آواز سے پڑھ لیتے ہیں۔

امام طبریؒ کہتے ہیں اگر اس کا معنی "استغناء" ہو جیسا کہ سفیان بن عیینہؒ سے منقول ہے تو اس حدیث میں "اچھی آواز" اور "بلند آواز" سے پڑھنے کا ذکر بے معنی ہو جاتا ہے۔

مؤلف کی رائے

ہمارے خیال میں یہاں لفظ "یَجْهَرُبه" (اونچی آواز سے تلاوت کرتے ہیں) میں کئی احتمالات ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے، دوسرا یہ کہ حضرت اَبوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور تیسرا یہ کہ ان کے علاوہ کسی اور راوی کا قول ہے۔ اگر پہلا احتمال صحیح مان لیا جائے جو کہ بعید از قیاس ہے تب بھی اس سے آواز کی لہریں بنا کر پڑھنے اور بار بار دہرانے کی نفی ہوتی ہے کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "یَجْهَرُبه" (اونچی آواز سے پڑھتا ہے) فرمایا ہے، "یطرب به" (لہریں بنا کر پڑھتا ہے) نہیں فرمایا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آواز اس قدر اونچی ہو کہ پڑھنے والا خود سن سکے اور اس کے نزدیک والے لوگوں تک بھی آواز پہنچ جائے۔ اس بات کی تائید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے کسی شخص کو اونچی آواز سے "لاَ إلٰهَ إلاّ اللّٰه" کہتے سنا تو فرمایا:

[۴۱] یأیُّهَا النّاسُ اربَعُو اعلی اَنفُسِکُم فإنّکُم لَستُم تَدْعُونَ أَصَمَّ وَلاَغَائِبًا۔

---

[۴۰] صحیح مسلمؒ: کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب تحسین الصوت بالقرآن ۱: ۵۴۵، صحیح بخاریؒ: کتاب فضائل القرآن، باب من لم یتغَنّ بالقرآن ۳: ۲۳۱۔ ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ ائمہ حدیث ابو داود، نسائیؒ اور امام اَحمد، دارمی، ابن حبانؒ، حاکمؒ، ابویعلی، عبدالرزاق اور بیہقی رحمہم اللہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ البتہ اس کے راوی احمدؒ بن ہارون پر علماءِ رجال نے جرح کی ہے۔

[۴۱] صحیح بخاریؒ: کتاب الدعوات، باب الدعاء إذا علاعقبه ۳: ۱۱۰، کتاب المغازی، باب غزوة خیبر ۴: ۱۵۴۱، صحیح مسلمؒ: کتاب الذکروالدعاء والتوبة والإستغفار، باب استحباب خفض الصوت بالذکر ۴: ۲۰۷۶۔ ائمہ حدیث ابوداؤد، ترمذیؒ، احمدؒ، بیہقیؒ، ابویعلی، اور عبدالرزاق رحمہم اللہ نے بھی اسے اپنی کتب میں نقل کیا ہے۔

اے لوگو! آواز کو اپنے آپ تک ہی محدود رکھو کیوں کہ تم نہ تو کسی ایسی ہستی کو پکار رہے ہو جو کانوں سے بہری ہے نہ اس کو جو تم سے دور ہے۔

اس حدیث کا بیان آئندہ آرہا ہے۔ اسی طرح اگر یہ صحابی یا کسی اور راوی کا قول ہو تو اس سے وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جو لوگ چاہتے ہیں۔

یہ تأویل بعض حضراتِ مالکیہؒ نے اختیار کی ہے اور کہا ہے کہ یہی زیادہ صحیح ہے کیوں کہ عرب ہر اس شخص کو "غانی" (گانے والا) کہتے ہیں جو اپنی آواز بلند کرے اور لگا تار بولے۔ اس کے اس عمل کو "غِناء" (گانا) کہتے ہیں اگرچہ وہ گانے کی طرز نہ بھی بنائے۔ وہ کہتے ہیں کہ صحابی نے بھی اس کا یہی مطلب لیا ہے اور وہ اس حدیث کو بھی بہتر سمجھتے ہیں اور اس کے سیاق و سباق کو بھی۔

شوافع کی دلیل

ابو الحسن بن بطالؒ نے امام شافعیؒ رحمہ اللہ کی تائید میں فرمایا ہے: اس مسئلہ میں اشکال اس روایت سے ختم ہوجاتا ہے جسے امام ابن ابی شیبہؒ نے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ہم سے زید بن حُباب نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں ہم سے موسیٰ بن علی بن رباح نے ذکر کیا، انہوں نے اپنے والد گرامی سے روایت کیا اور انہوں نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۴۲] تَعلَّمُوا القُرآنَ وَغَنُّوا بِهِ وَاكتبوهُ فَوَالذى نَفسِى بِيَدِهِ لَهُوَ أشدُّ تَفَصِّيًا مِنَ المخَاضِ العَقَلِ۔

قرآن سیکھو، اسے اچھی آواز سے طرز لگا کر پڑھو اور اسے لکھ لیا کرو۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے یہ ذہنوں سے نکلنے میں اونٹوں سے بھی تیز ہے جو اپنی رسیوں سے نکل جاتے ہیں۔

[۴۲] مصنف ابن ابی شیبہؒ: کتاب صلاۃ التطوع، باب ما امربه من تعاهد القرآن ۲:۳۸۴ میں اس سند کے ساتھ "تَعَلَّمُوا القُرآنَ وَالذي نَفسِي بِيَدِهِ لَهُوَ اشدُّ تَفَصِّيًا مِنَ المخَاضِ من عقلها" ہے۔ مسند احمدؒ: حدیث عقبه بن عامر الجهنی ۵:۱۵۲ میں دو مقامات پر "واكتبوه" کی جگہ "واقتنوه" اور "غَنُّوا" کی جگہ "تغنّوا" اور تیسرے مقام پر "وتعاهدوه" ہے، سنن دارمی: فضائل القرآن، باب فی تعاهد القرآن ۲:۸۹۷، بیہقیؒ: شعب الإيمان، التاسع عشر...... فصل فی إدمان تلاوة القرآن ۲:۳۳۵ میں بھی یہی الفاظ ہیں۔ اکثر کتب حدیث میں "غَنُّوا" کی جگہ "تغنُّوا" منقول ہے۔ اس سیاق میں "وَاكتبوه" کے الفاظ مجھے نہیں مل سکے۔ واللہ اعلم۔

مالکیہ کا جواب

علماءِ مالکیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس حدیث کی سند صحیح ثابت بھی ہو جائے تو اس کے جواب کے لئے یہ بات کافی ہے جو قطعی ذرائع سے ثابت ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت ہمارے لہجہ میں تمام مشائخ سے تواتر کے ساتھ چلی آرہی ہے اور یہی سلسلہ نسل درنسل چلتے ہوئے حضرات صحابہ کرام کے عہد مبارک تک اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لہجہ میں نہ تو سر لگانے کا کوئی رواج ہے نہ لہر دار آواز میں پڑھنے کا، حالاں کہ حروف کے مخارج، مد، ادغام اور اظہار وغیرہ جتنی بھی قراء ت کی معروف کیفیات ہیں۔ ان سب کی ادائیگی میں گہرائی تک جانے والے لوگ بکثرت موجود ہیں۔

گا کر پڑھنے کے نتائج

اس کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ حلق میں آواز گھما کر پڑھنے اور سر نکالنے سے ہوتا یوں ہے کہ جہاں ہمزہ نہیں ہوتا وہاں بھی ہمزہ پڑھا جاتا ہے اور جہاں مد نہیں ہوتی اس لفظ کو بھی بے جا کھینچا جاتا ہے اور اسی طرح ایک الف کے کئی الف، ایک واؤ کے کئی واؤ اور ایک حرکت کی کئی حرکات بن جاتی ہیں جس سے پڑھنے والا قرآن میں اضافہ کا مرتکب ہوتا ہے جو کہ ممنوع ہے۔ اس طرح پڑھنے والے اگر کسی ایسی جگہ پہنچتے ہیں جہاں قاعدہ کے مطابق آواز کو ہلکا سا زور دے کر نکالا جاتا ہے تو وہ اس کو کئی گنا زیادہ کر دیتے ہیں اور اگر کہیں ہمزہ آجائے تو اس کے کئی ہمزے بنا دیتے ہیں،حالاں کہ آواز کا یہ ہلکا سا دباؤ صرف ایک ہمزہ کی طرح ہوتا ہے خواہ ہمزہ مد والا مراد ہو یا بغیرِ مد ہو اس میں اضافہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اب اگر کہا جائے کہ حضرت عبد اللہ بن مُغَفّل رضی اللہ عنہ نے تو یہ نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک سفر میں سواری پر سورۂ فتح تلاوت فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تلاوت میں ترجیع فرماتے رہے۔ امام بخاریؒ نے یہ حدیث نقل کر کے ترجیع کی وضاحت یوں کی ہے کہ مد والے ایک ہمزہ کو تین مرتبہ ''آء آء آء'' پڑھا[1]۔

ہم کہتے ہیں کہ اس سے مراد مد کو اپنی حدود کے اندر لمبا کرنا ہے، اور دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ سواری کے ہلنے کی وجہ سے آواز میں تکرار پیدا ہو گیا ہو جیسا کہ سواری پر جاتے ہوئے آواز بلند کرنے سے ہو جایا کرتا ہے سواری کے ہلنے کی وجہ سے کبھی آواز میں اچانک زور پیدا ہو جاتا ہے اور کبھی وہ رُک رُک کر سنائی دیتی ہے۔

حدیث نمبر ۳۲ میں بخاریؒ، مسلمؒ، ابو داؤدؒ اور ابن حبانؒ کے حوالہ سے اس کی مکمل تخریج گزر چکی ہے۔

اگر اس احتمال کو سامنے رکھا جائے تو معترض کی بات کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو أبوداؤد محمد عبد الغنی بن سعید الحافظ نے قتادہ رحمہ اللہ سے نقل کی ہے، انہوں نے اسے عبد الرحمٰن بن ابی بکر سے اور انہوں نے اپنے والدگرامی سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

[۴۳] كَانَتْ قِرَاءَةُ رسول الله صلى الله عليه وسلم المدُّ ليسَ فيها تَرجِيعٌ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کرتے وقت الفاظ کو لمبا کیا کرتے تھے مگر اس میں آواز کا گھماؤ یا تکرار نہیں تھا۔

اسی طرح ابن جریج نے عطا سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، آپ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مؤذن تھا جو سر لگا کر اذان دیتا تھا، آپؐ نے اس کو ارشاد فرمایا:

[۴۴] إنَّ الأذانَ سَهلٌ سمِحٌ، فإذا كانَ أذانُكَ سمحًا سَهلًا وَإلَّا فَلَا تُؤذِّن۔

بلا شبہ اذان آسان اور بے تکلف ہے اگر تو اسی طرح آسان اور بے تکلف اُذان پڑھ سکتا ہے تو ٹھیک ورنہ تو اُذان نہ پڑھا کر۔ اس حدیث کو دارقطنی نے نقل کیا ہے۔

اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان میں سُر لگانے سے منع فرمایا ہے تو قرآن کریم جس کی حفاظت کا ذمہ خود ربِّ رحمٰن نے لیا ہے اس میں اس کا جائز قرار نہ دیا جانا زیادہ مناسب ہے۔ باری تعالیٰ کا ارشادِ برحق ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ﴾ [الحجر ۱۵: ۹] (بے شک ہم نے اس ذکر کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)۔ اور ارشاد فرمایا: ﴿لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ﴾ [فُصِّلَت ۴۱: ۴۲] (اس میں باطل نہ آگے سے آ سکتا ہے، نہ پیچھے سے۔ یہ دانا اور خوبیوں والی ذات کی نازل کی ہوئی ہے)۔

---

[۴۳] ترجیع کے بارے میں احادیث بکثرت ملتی ہیں مگر یہ الفاظ مجھے کامل ابن عدیؒ: تعارف الولید بن قاسمؒ ۷:۸۲ اور تعارف عمر بن موسیٰ بن وجیہ ۶:۱۳ کے علاوہ نہیں مل سکے۔ نصب الراية لأحاديث الهداية ۱:۲۶۲ میں بھی اس سلسلہ میں متعدد احادیث و آثار منقول ہیں۔ قراءت میں مدیعنی آواز کولمبا کرنے کے بارے میں امام احمدؒ، ابو یعلی، بیہقیؒ اور دارقطنیؒ نے بھی کئی احادیث وآثار نقل کیے ہیں۔

[۴۴] سنن دارقطنیؒ: كتاب الصلاة، باب ذكر الإقامة واختلاف الروايات فيها ۱:۲۳۹، كتاب الجنائز، باب تخفيف القراءة لحاجة ۲:۸۶ مگر ابن حبانؒ نے كتاب المجروحين، تعارف اسحاق بن یحییٰ الکعبی میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی طرح کی نسبت ثابت نہیں اور اسحاق جھوٹا آدمی تھا۔ امام بخاریؒ نے اپنی صحیح، كتاب الأذان ۱:۲۲۱ میں باب رفع الصوت بالنداء کے نام سے ایک عنوان قائم کیا ہے جس میں یہ الفاظ ذکر کیے ہیں کہ: عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: ”اذِّن أذانًا سمِحًا، وإلا فاعتزِلنا“ (بے تکلف اذان دو یا ہمیں چھوڑ جاؤ)۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: اس مسئلہ میں اختلاف اس وقت تک قابل برداشت ہے جب تک آوازوں کے تکرار اور بکثرت سر لگانے کے باوجود کلام اللہ کا معنی سمجھ میں آتا رہے، مگر جب معاملہ اس حد سے گزر جائے یہاں تک کہ معنی ہی سمجھ میں نہ آئے تو اس طرح پڑھنا بالاتفاق حرام ہے جیسا کہ مصر کے وہ قاری کرتے ہیں جو حکمرانوں کی مجالس میں یا جنازوں کے موقع پر تلاوت کرتے ہیں اور اس کے بدلے ان کو مال اور انعامات ملتے ہیں۔ ان کی یہ محنت رائیگاں اور عمل بے کار ہے، بلکہ وہ تو اس طرح اللہ کی کتاب میں تبدیلی کو جائز سمجھنے کا جرم کرتے ہیں، اور اللہ کی نازل کردہ کتاب میں ایسی چیزوں کا اضافہ کرنے کی جرأت کرتے ہیں جو اس کا حصہ نہیں اور پھر وہ اس بات کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ یہ سراسر ان کی دین سے لاعلمی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے لاتعلقی اور سلف صالحین کی اتباع سے انکار ہے۔ شیطان نے ان کے کرتوتوں پر جو ملمع سازی کی ہے وہ اس کی چمک دمک میں گرفتار ہو کر راہِ حق سے غفلت میں پڑ چکے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ بہت اچھا کر رہے ہیں۔ کتاب اللہ کے ساتھ انہوں نے کھیل تماشہ بنایا ہوا ہے "إنا للہ وإنا إلیہ راجعون" حق تو یہ ہے کہ آج وہی کچھ ہو رہا ہے جس کی خبر سچوں کے سردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے دے چکے ہیں۔

حافظ ابوحسین رزین اور ابو عبد اللہ حکیم ترمذیؒ نے اپنی کتاب نوادر الأصول میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۴۵] اقرأوا القرآن بِلُحُون العرب وأصواتها، وإياكم ولُحُونِ أهل العشق ولحون أهل الكتابين۔ وسيجيئ بعدی قوم يرجعون بالقرآن ترجيع الغناء والنّوح، لايجاوز حناجرهم، مفتونةٌ قلوبهم وقلوب الذين يعجبهم شأنهم۔

قرآن کی تلاوت اہل عرب کی طرز اور انہی کی آواز کے ساتھ کرو، اور خبردار! عاشقوں اور اہل کتاب کی سروں سے بچو۔ میرے بعد ایسے لوگ آئیں گے جو تلاوتِ قرآن کرتے

[۴۵] بیہقیؒ: شعب الإيمان، التاسع عشر......، فصل فی ترک التعمق فی القرآن الکريم ۲:۵۴۰، حکیم ترمذیؒ: نوادر الأصول ص ۳۳۴۔ اس کے راوی بقیہ بن ولید بن صائد الکلاعی مجروح اور مدلس ہیں اکثر ضعفاء سے روایات نقل کرتے ہیں۔ کامل ابن عدیؒ: تعارف۔ بقیہ بن الولید ۲:۲۵۹، یہاں "أهل الكتابين" کی بجائے "أهل الكتاب" اور "ترجيع الغناء والنوح" کی بجائے "ترجيع الرهبانية والنوح والغناء" ہے۔ بیہقیؒ نے شعب الإيمان میں بھی اسی طرح نقل کیا ہے۔ الجامع الکبیر، کتاب الصلاة حدیث نمبر ۳۹۳۴/۶۴ میں بروایتِ محمد بن نصر اور الإبانة میں بھی بروایت أبو نصر سجزی، یہ حدیث منقول ہے، ابن جوزیؒ نے علل میں لکھا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے اور ہیثمی کہتے ہیں کہ اس میں ایک راوی مجہول ہے۔

ہوئے آوازوں کو ایسے گھمائیں گے جیسے گانے والے یا میتوں پر رونے والے کرتے ہیں۔
قرآن ان کے نرخروں سے آگے نہیں جاتا ہو گا۔ ان کے اور ان کی سروں کے شیدائیوں
کے دل فتنے میں پڑے ہوں گے۔

لُحُون: لحن کی جمع ہے جس کا معنی سُر نکالنا، آواز کو گھمانا اور تلاوت قرآن مجید، شعر گوئی یا گانا گاتے ہوئے آواز کو خوبصورت بنانا ہے۔

علماءِ مالکیہ فرماتے ہیں: معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دور کے قراء مختلف مجالس اور علماء کے وعظ کے موقع پر جس طرح اہل عجم کی سی سُروں میں تلاوت کرتے ہیں یہ بھی وہی انداز ہے جس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

ترجیع اور ترتیل میں فرق

تلاوت میں ترجیع سے مراد حروف کو گلے میں گھما گھما کر پڑھنا ہے جیسے عیسائی کتاب مقدس کو پڑھتے وقت کرتے ہیں جبکہ ترتیل سے مراد ٹھہر ٹھہر کر، آرام سے، حروف اور حرکات کو واضح کر کے پڑھنا ہے جیسے خوبصورت دانت ہموار اور ترتیب سے جڑے ہوں یا جیسے بابونہ کے دانے۔ تلاوت قرآن میں یہی انداز مطلوب ہے، چناں چہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا﴾ [المزمل ۷۳:۴](اور قرآن خوب صاف صاف پڑھیے)۔ ام المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت اور آپ کی نماز کی کیفیت پوچھی گئی تو انہوں نے فرمایا:

[۴۶] مالكم وصلاتَه! كان يصلي ثم ينام قدر ما صلّى، ثم يصلّي قدر مانام، ثم ينام قدر ما صلّى حتى يُصبح ثم نعتت قراء ته، فاذا هي قراء ة مفسرة حَرفاً حرفا۔
أخرجه النسائيؒ وأبو داودؒ والترمذيؒ وقال: هذا حديث حسن صحيح غريب۔
تم لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے کیا مناسبت، حضور تو رات کو نماز پڑھتے تھے،

---

[۴۶] جامع ترمذیؒ: كتاب فضائل القرآن، باب كيف كان قراء ة النبي صلى الله عليه وسلم ۵: ۱۸۲، سنن أبو داؤد: كتاب الصلاة، باب استحباب الترتيل في القرء ة ۲:۷۳، سنن نسائی: كتاب الافتتاح باب تزيين القرآن بالصوت ۲:۱۸۱، كتاب قيام الليل، باب ذكر صلاة الرسول اللّٰه بالليل ۳:۲۱۴، صحیح ابن خزیمہ: كتاب الصلاة، باب الترتيل بالقراء ة في صلاة الليل ۲:۱۸۸، اس کے علاوہ امام حاکمؒ نے كتاب صلاة التطوع میں، امام احمدؒ نے حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا میں؛ اورامام بیہقیؒ نے شعب الإيمان میں اسے نقل کیا ہے۔ امام حاکمؒ فرماتے ہیں یہ صحیح اور امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق ہے۔

پھر اسی قدر لیٹ رہتے اور آرام فرماتے، پھر اٹھتے اور جتنا سوئے تھے اتنی دیر نماز پڑھنے میں لگاتے، اس کے بعد دوبارہ اتنی ہی دیر کے لئے آرام فرماتے جتنی دیر میں نماز پڑھی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی معمول مبارک رہتا یہاں تک کہ صبح ہو جاتی۔ پھر حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کی کیفیت بیان فرمائی جس سے معلوم ہوا کہ حضورؐ ایک ایک حرف کو یوں الگ الگ کر کے تلاوت فرماتے کہ سننے والے کو ساتھ ہی ساتھ معنی اور مفہوم سمجھ آتا جاتا۔ اس حدیث کو امام نسائی، امام ابو داؤد اور ترمذیؒ نے نقل کیا ہے، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح غریب ہے۔

☆☆☆☆☆

باب: ۳

علماء اور قرّاء کو ریاکاری پر تنبیہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاعْبُدُوْا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا﴾ [النساء ۴: ۳۶] (اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو) نیز ارشاد فرمایا: ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْلِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ أَحَدًا﴾ [الکھف ۱۸: ۱۱۰] (سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے اسے چاہئے کہ نیک کام کرتا رہے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے)۔ امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

[۴۷] إن أول الناس يقضى عليه يوم القيامة رجل استشهد فأُتي به فعرفه نعمه فعرفها قال: فما عملتَ فيها؟ قال: قاتلت فيكَ حتى استشهِدتُ قال: كذبت ولكنك قاتلت لأن يقال: جرىء فقد قيل، ثم أمِر به فسحب على وجهه حتى ألقى فى النار، ورجل تَعَلَّم العلم وَعَلَّمَه وقرأ القرآن فَأُتِيَ به فعرَّفه نعمَه فعرفها قال: فما عملت فيها؟ قال: تعلمت العلم وعلمته وقرأت فيك القرآن قال: كذبت ولكنك تَعَلَّمتَ العِلم ليقال: عالم وقرأ ت القرآن ليقال: هو قارئ فقد قيل: ثم أمِر به فسُحِبَ على وجهه حتى ألقى فى النار، ورجل وسَّع الله عليه وأعطاه من أصناف المال كله فأتى به فعرفه نعمه فعرفها قال: فما عملت فيها؟ قال: ماتركت من سبيل تحب أن ينفق فيها إلا أنفقت فيها لك قال: كذبت ولكنك فعلت ليقال: هو جوادٌ فقد قيل ثم أمر به فسحب على وجهه ثم ألقى فى النار۔

قیامت کے دن سب سے پہلے جس شخص کا فیصلہ ہوگا وہ ایک شہید ہوگا۔ اسے اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کر کے اس کی نعمتیں یاد دلائی جائیں گی۔ جب وہ سب نعمتوں کا اقرار کرلے گا تو اس سے پوچھا جائے گا کہ ان نعمتوں کا شکر تو نے کس طرح ادا کیا؟ وہ عرض کرے گا:

---

[۴۷] صحیح مسلم: كتاب الإمارة، باب من قاتل للرياء والسمعة استحق النار ۳: ۱۵۱۴، جامع ترمذی: أبواب الزهد، باب ماجاء في الرّياء والسمعة ۴: ۵۹۱ قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: ان الفاظ میں یہ روایت حسن غریب ہے۔ سنن نسائی: كتاب الجهاد، باب من قاتل ليقال فُلانٌ جرئٌ ۶: ۲۳، مستدرک حاکم: كتاب العلم ۱: ۱۸۹، كتاب الجهاد ۲: ۱۲۰، سنن بیہقی: كتاب السير، باب بيان النية التي يقاتل عليها ليكون في سبيل الله ۱۳: ۵۵۲

باری تعالیٰ! میں آپ کے راستہ میں جہاد کرتا رہا یہاں تک کہ شہید ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم جھوٹ کہتے ہو، تم نے تو اس لیے لڑائی کی کہ تمہیں بہادر کہا جائے، سو وہ کہا جاچکا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم پر اسے منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ پھر ایک ایسے آدمی کو دربار عالی میں لایا جائے گا جو دنیا میں قرآن سیکھتا سکھاتا رہا ہوگا اور اس کی تلاوت بھی کی ہو گی۔ اسے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں یاد دلائی جائیں گی تو وہ ان کا اعتراف کرلے گا۔ پھر اس سے کہا جائے گا: یہ تو اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تھیں تم نے دنیا میں کیا عمل کیا؟ وہ کہے گا: میں نے علم سیکھا اور سکھایا اور تیری رضا کے لیے قرآن مجید پڑھتا رہا۔ باری تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: تم جھوٹ کہتے ہو، تم نے اس لیے علم سیکھا کہ تمہیں عالم کہا جائے، اور اس لیے قرآن کی تلاوت کی کہ تمہیں قاری کہا جائے اور یہ سب کچھ کہا جا چکا۔ پھر اسے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر منہ کے بل گھسیٹا جائے گا اور جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ پھر ایک تیسرے آدمی کو پیش کیا جائے گا جسے اللہ تعالیٰ نے بہت وسعت و فراخی دی ہو گی اور ہر طرح کے مال سے نوازا ہو گا۔ اسے یہ سب نعمتیں یاد دلائی جائیں گی۔ جب وہ سب کچھ مان لے گا تو اس سے پوچھا جائے گا اب تم بتاؤ، تم نے کیا عمل کیا؟، وہ کہے گا: میں نے کوئی جگہ ایسی نہیں چھوڑی جہاں مال خرچ کرنا آپ کو پسند ہو اور میں نے نہ کیا ہو۔ ارشاد ہو گا: تم جھوٹ کہتے ہو، تم نے تو اس لیے مال خرچ کیا کہ تمہیں سخی کہا جائے، سو وہ کہا جا چکا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے بھی منہ کے بل گھسیٹ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔

امام ترمذیؒ یہ حدیث ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم على رُكبتي فقال:"يا أبا هريرة أولئك الثلاثة أول خلق الله تسعر بهم النار يوم القيامة "۔

پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ابو ہریرہ! اللہ کی مخلوق میں سے یہ تینوں سب سے پہلے انسان ہوں گے جن کو ڈال کر جہنم کی آگ بھڑکائی جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تعارف

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی عبد اللہ یا عبد الرحمٰن ہے۔ آپؓ نے فرمایا: میری کنیت ابو ہریرہ یوں مشہور ہوئی کہ ایک مرتبہ میں نے اپنی آستین میں بلی ڈالی ہوئی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دیکھ

لیا اور فرمایا: یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا: بلّی ہے، تو آپ نے مجھے فرمایا: "یا أبا هُريرة" (اے بلّی والے)۔ چنانچہ یہی نام مشہور ہو گیا۔ حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث ان لوگوں کے لیے عبرت ہے جو اپنے عمل اور علم میں اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقصود نہیں رکھتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

[۴۸] مَنْ طلَبَ العِلمَ لغَيْرِ اللّٰهِ أو أرادَبِهِ غيرَ اللّٰهِ فَليتبوّأ مقعَدَهُ مِنَ النّار۔

جس نے اللہ کی رضا کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے علم حاصل کیا یا اللہ کی ذات کے علاوہ کسی اور کی خوش نودی پیش نظر رکھی وہ جان لے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم میں تیار ہے۔

ابن مبارکؒ نے اپنی "رقائق" میں حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۴۹] يظهر هذا الدين حتى يجاوز البحار وحتى تخاض البحار بالخيل في سبيل الله تبارك وتعالىٰ، ثم يأتي أقوام يقرء ون القرآن فإذا قرء وه قالوا: من أقرأ منا من أعلم منا۔ثم التفت إلى أصحابه فقال:"هَلْ ترونَ فِي أولئِكَ مِن خَير"؟ قالوا:لا۔قال:"أولئك مِنكُم، وأولئك مِن هذهِ الأمّة، وأولئك هُمْ وَقُوْد النار"۔

یہ دین غالب آئے گا یہاں تک کہ سمندروں کے پار پہنچ جائے گا اور اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد پر چلنے والے گھوڑے سمندروں کو عبور کر جائیں گے۔ پھر ایک زمانے میں ایسے لوگ آئیں گے جو قرآن تو پڑھیں گے مگر تلاوت کے بعد (فخر سے) کہا کریں گے: ہم سے بڑا قاری کون ہے، ہم سے بڑا عالم کون ہے؟۔پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: کیا تمہیں ان لوگوں میں کوئی بھلائی نظر آتی ہے؟۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: نہیں حضور! آپ نے فرمایا: یہ لوگ تمہی میں سے ہوں گے، اسی اُمت سے ہوں گے اور یہی جہنم کا ایندھن بنیں گے۔

امام ابو داؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد نقل کیا ہے:

---

[۴۸] سنن ابن ماجہ: كتاب المقدمة ۱:۹۵، جامع ترمذی: كتاب العلم ۵:۳۳ باب ماجاء فيمن يطلب بعلمه الدنيا ۵:۳۳ میں بھی اسی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

[۴۹] مسند ابو یعلیٰ: مسند العباس بن عبدالمطلب رضی الله عنه ۱۲:۵۶، مسند بزار: مسند العباس بن عبدالمطلب رضی الله عنه، باب و معاروت بنت عبدالهادی عن العباس ۴:۱۴۹، ہیثمی: مجمع الزوائد ۱:۱۸۵۔ اس کی سند میں راوی موسیٰ بن عبیدہ ضعیف ہیں۔ بعض دیگر طرق سے اس حدیث کی توثیق بھی ملتی ہے اور علماءِ رجال نے بزار کے تمام رجال کی توثیق کی ہے۔

[۵۰] مَنْ تعلّمَ عِلمًا مِمّا يُبتَغى به وَجهُ اللّٰه، لَا يتعَلّمه، إلّا ليُصيب بهِ عَرضًا مِنَ الدُّنيا لم يَجد عَرف الجنّةِ يومَ القِيامَة۔

جس شخص نے ایسا علم سیکھا جس کا مقصد صرف اللہ کی رضا ہونا چاہئے مگر اس نے اسے سیکھتے ہوئے دنیوی فائدہ مدنظر رکھا تو ایسے شخص کو قیامت کے دن جنت کی ہوا بھی نصیب نہیں ہوگی۔

یہاں لفظ "عرف" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہوا اور خوشبو ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۵۱] تعوّذُوا باللّٰهِ مِنْ جُبِّ الحَزَن۔ قالوا: يا رسول اللّٰهِ وما جُبُّ الحَزَن۔ قال: "وادٍ فِي جَهنّم تتعوّذ مِنه جَهنّم في كل يومٍ مائة مرّة۔ قيل: يا رسول اللّٰه ومَن يدخله؟ قال: القُرّاءُ المُرَاء ون بأعمالهم۔ قال: حديث غريب۔

دُکھ کے گڑھے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! دُکھ کا گڑھا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ جہنم کی ایک وادی ہے جس سے خود جہنم بھی ہر روز سو مرتبہ پناہ مانگتی ہے۔ عرض کیا گیا: یا رسول اللہ! اس میں کون داخل ہوگا؟ آپ نے فرمایا: اپنے اعمال میں ریاکاری کرنے والے قراء۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث غریب ہے۔

اسد بن موسیٰ کی کتاب میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۵۰] سنن ابوداؤد: كتاب العلم، باب في طلب العلم لغير الله ۳:۳۲۳، سنن ابن ماجہ: ۱:۹۲، سنن دارمی: ابواب متفرقة في صفات النبي صلى الله عليه وسلم و في العلم و نحوها، باب العمل بالعلم وحسن النية فيه ۱:۸۶، صحیح ابن حبان: كتاب العلم ۱:۲۷۹، مسند احمدؒ: مسند ابی هريرة رضى الله عنه ۳:۶، امام حاکم، ابو یعلی اور بیہقی نے شعب الایمان میں بھی اسے نقل کیا ہے۔

[۵۱] جامع ترمذی: كتاب الزهد، باب ماجاء في الرياء والسمعة ۴:۵۹۳۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن غریب ہے، سنن ابن ماجہ ۱:۹۴۔ یہاں جہنم کے اس سے چار سو مرتبہ پناہ مانگنے کا ذکر ہے، بیہقی: شعب الإيمان: الخامس والأربعون من شعب الايمان وهو الإخلاص...... ۵:۳۳۹ میں قراء کی تخصیص نہیں بلکہ مطلقاً اعمال میں ریاکاری کرنے والوں کا ذکر ہے۔ امام بیہقی نے اس ضمن میں امام بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس حدیث کے راوی ابو معاذ کا ابن سیرین سے سماع ثابت نہیں اور وہ مجہول ہے۔ امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: ریاکاروں کے دامن میں ایسے اعمال باقی نہیں رہے جو خالصتاً اللہ کے لیے کیے گئے ہوں۔ کتاب المجروحين ۱:۱۹۴ میں بکیر بن مسمار کے تعارف میں اس حدیث کو ذکر کیا گیا ہے اور بکیر کو قلیل الحدیث اور راویٔ المناکیر لکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ ایسی روایات نقل کرتا ہے جن کی کہیں تائید نہیں ملتی، الكامل في الضعفاء ۶:۱۳۵ میں عمار بن سیف الضبی کے تعارف میں بھی یہ حدیث منقول ہے اور عمار بن سیف کی وجہ سے اسے غیر معتبر کہا گیا ہے۔

[۵۲] إن فی جهنم لواديا إن جهنم لتتعوذ من شر ذلك الوادی کل یوم سبع مرات، وإن فی ذلك الوادی لحبا إن جهنم وذلك الوادی لیتعو ذان بالله من شر ذلك الحب، وإن فی الحب حیة وإن جهنم والوادی والحب لیتعوذون بالله من شر تلك الحیة سبع مرات، أعدها الله للأشقياء من حملة القرآن الذین یعصون الله۔

جہنم میں ایک وادی ہے جس سے خود وہ بھی ہر روز سات مرتبہ پناہ مانگتی ہے اور اس وادی میں ایک گڑھا ہے جس کے شر سے جہنم اور وہ وادی دونوں اللہ کی پناہ مانگتے ہیں اور اس گڑھے میں ایک اژدھا ہے جس سے جہنم، اس کی وادی اور گڑھا تینوں سات مرتبہ اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ان بدبخت علماء اورقراء کے لیے تیار کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو قرآن کریم کی نعمت سے نوازا ہے اسے اور جو ابھی طلب علم میں مصروف ہے، دونوں پر لازم ہے کہ اپنے معاملہ میں اللہ سے ڈریں اور اپنے اعمال اسی کی رضا کی خاطر کیا کریں اور اگر غلطی سے کوئی ایسا کام ہو جائے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق نہ ہو تو فوراً توبہ کی طرف دوڑیں، رب تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں، اور اسی وقت سے علم کی طلب اور اس پر عمل کرنے میں خالص اللہ کی رضا کی نیت کرلیں۔ قرآن کے عالم کے لیے جس قدر احتیاط ضروری ہے اور کسی کے لیے نہیں۔ یہی صورت حال اجر کی ہے کہ اسے جو کچھ ملنے والا ہے اور کسی کے نصیب میں نہیں ہے۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۵۳] أنزل الله فی بعض الکتب أو أوحی إلی بعض الأنبیاء۔ قل للذین یتفقهون لغیر الدین و یتعلمون لغیر العمل، و یطلبون الدنیا بعمل الآخرة، یلبسون للناس مسوك الکباش و قلوبهم کقلوب الذئاب السنتهم أحلَیٰ من العسل وَقلوبهم أمر من الصبر إیای یخادعون وبی یستهزءون لأتیحن لهم فتنة تذر

---

[۵۲] بیہقی: شعب الإیمان، الناس عشر...... فی نشر العلم وأن لایمنعه أهله، فصل. قال: وینبغی لطالب العلم أن یکون تعلمه......۲:۳۰۹، سنن ابن ماجہ: کتاب المقدمة، باب الزهد میں اسی سے ملتے جلتے الفاظ ہیں مگر اس حدیث کی سند ضعیف ہے۔

[۵۳] جامع ترمذی: کتاب الزهد ۴:۶۰۴ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ و ابن عمر رضی اللہ عنہما قدرے مختلف الفاظ سے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث حسن غریب ہے۔ مذکورہ سند کے علاوہ ہمیں اس کا کہیں علم نہیں ہو سکا۔

الحلیم فیھم حیران۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں یہ نازل فرمایا یا اپنے کسی پیغمبر کو وحی کے ذریعے ارشاد فرمایا کہ ان لوگوں کو فرما دیجیے جو دینی جذبے کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے دین سیکھتے اور علم حاصل کرتے ہیں اور علم حاصل کرتے وقت ان کی نیت عمل کے علاوہ کسی اور مفاد کی ہوتی ہے اور جن اعمال سے آخرت سنوارنی چاہیے وہ ان سے دنیا حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے لوگوں کے سامنے بھیڑوں کی کھالیں پہنے ہوں مگر دل اُن کے بھیڑیوں کے دلوں کی طرح ہیں۔ زبانیں ان کی شہد سے بھی میٹھی ہوتی ہیں مگر دل ایلوے کی طرح کڑوے۔ وہ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور میرے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔ یقین رکھو میں انہیں ایسی آزمائش میں ڈالوں گا جو ان میں سے بڑی عقل اور بڑے حوصلے والوں کا یہ حال کر دے گی کہ ان کو کچھ سجھائی نہ دے گا۔

امام طبریؒ نے اپنی کتاب آداب النفوس میں نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: ہم سے ابوکریب محمد بن علاء نے بیان کیا، انہیں محاربی نے بتایا، انہوں نے عمرو بن عامر بَجَلی رحمہ اللہ سے سنا، اُن سے ابن صدقۃ[1] نے بیان کیا، ابن صدقہ نے یہ حدیث ایک صحابیؓ سے روایت کی جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

[۵۴] لا تخادع اللہ فإنه من یخادع اللہ یخدعه اللہ و نفسه یخدع لو یشعر۔ قالوا: یا رسول الله، و کیف یخادع اللہ؟ قال: "تعمل بما أمرك اللہ به و تطلب به غیره واتقوا الریاء فإنه الشرك وإن المرائی یدعی یوم القیامة علی رؤس الأشهاد بأربعة أسماء ینسب إلیها: یا کافر یا خاسر یا غادر یا فاجر ضلّ عمَلُكَ و بَطَل أجرك فلا خلاق لك الیوم فالتمس أجرك ممن کنت تعمل له یا مخادع۔

اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرو، جو شخص اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کا ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں، اور اگر بندہ سمجھے تو دھوکہ اپنے آپ کو ہی دے رہا

---

[۵۴] طبری: کتاب آداب النفوس. علامہ سیوطی فرماتے ہیں اس کی سند ضعیف ہے۔

۱۔ ابو صدقۃ صخر بن صدقۃ الیمامی رحمہ اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضرت ہلال بن یسار سے روایات نقل کرتے ہیں۔ تهذیب الکمال تعارف ہلال بن زید بن یسار نمبر ۱۸۲۱

ہوتا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! بندہ اللہ کو کیسے دھوکہ دے سکتا ہے؟ ارشاد فرمایا: وہ اس طرح کہ تم عمل تو اللہ کے حکم کے مطابق کرو مگر مقصد اس کی رضا کے علاوہ کچھ اور ہو۔ دکھلاوے سے بچو کیوں کہ وہ شرک ہے اور قیامت کے دن ریاکاری کرنے والے کو چار ناموں سے پکارا جائے گا اور کہا جائے گا: اے کافر، اے بازی ہارنے والے، اے خیانت کرنے والے اور اے حکم عدولی کرنے والے! تیرے اعمال برباد اور تیرے لیے اجر کا حق ختم ہو گیا ہے۔ آج کی بھلائی میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔اے دھوکہ باز! جا اور اپنا بدلہ انہی سے مانگ جن کے لیے تو عمل کیا کرتا تھا۔

علقمہ رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

[۵۵] كيف أنتم! إذا لبستكم فتنة يربو فيها الصغير، و يهرم الكبير، و تتخذ سنّة مبتدعة يجرى عليها الناس فإذا غير منها شيء قيل: قد غيرت السنّة۔ قيل: متى ذلك يا أبا عبدالرحمن؟ قال: إذا كثر قراؤكم، وقلّ فقهاؤكم، و كثر أمراؤكم، وقلّ أمناؤكم، والتمست الدنيا بعمل الآخرة، و تفقه لغير الدين۔

تمہارا اس وقت کیا حال ہوگا جب تمہیں ایسی آزمائش گھیر لے گی جس میں بچے جوان اور جوان بوڑھے ہو جائیں گے، اور سنتوں کے نام پر بدعات گھڑ کر انہیں اپنا لیا جائے گا۔ لوگ انہی پر عمل کریں گے اور اگر کوئی ان میں ذرا بھی تبدیلی کرے گا تو لوگ کہیں گے: اس نے سنّت بدل دی ہے۔ سننے والوں نے عرض کیا: اے ابوعبدالرحمٰن ایسا کب ہوگا؟ آپ نے فرمایا: جب تم میں قُرّاء زیادہ ہو جائیں گے اور علماء و فقہاء کم رہ جائیں گے، منصب والے زیادہ ہو جائیں گے مگر امانت دار کم ہوں گے۔ جن اعمال سے آخرت سنورتی ہے ان سے دنیا کمانے کی کوشش کی جائے گی حتیٰ کہ دین بھی غیر دینی مقاصد کے لیے سیکھا جانے لگے گا۔

سفیان بن عُیینہؒ فرماتے ہیں، ہمیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد پہنچا ہے کہ آپؓ نے فرمایا:

لوأنَّ حَمَلَةَ القُرآن أخَذُوهُ بِحَقّهِ وما ينبغِي، لأحَبَّهُم اللّهُ، ولكِن طَلَبُوا الدُّنيا فَأبْغَضَهُمُ اللّهُ وَهانُوا على النّاسِ۔

---

[۵۵] سنن داری: ابواب متفرقة في صفات النبي صلى الله عليه وسلم ......، باب تغير الزمان وما يحدث فيه ۱:۶۸، مستدرک حاکم: كتاب الفتن والملاحم ۴:۵۶۰،مصنف عبدالرزاق: كتاب العلم، باب الفتن ۱۱:۳۵۹، شعب الایمان: الخامس الاربعون...... ۵:۳۶۱

اگر قرآن والے قرآن کے اصل مقصد کو سامنے رکھ کر اس کے آداب کے مطابق اسے حاصل کرتے تو یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے محبت کرتے۔ مگر جب انہوں نے قرآن کو دنیا کی کمائی کا ذریعہ بنا لیا تو اللہ تعالیٰ ان سے ناراض ہوگئے اور وہ لوگوں کی نظروں سے بھی گر گئے۔

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَكُبْكِبُوْا فِيْهَا هُمْ وَالْغَاوُوْنَ﴾ [الشعراء ۲۶:۹۴] (پھر وہ اور گمراہ لوگ سب کے سب اس میں اوندھے ڈال دیئے جائیں گے) کی تفسیر میں امام ابوجعفر محمد بن علیؒ سے منقول ہے:

قَومٌ وَصَفُوا الحقَّ والعَدْلَ بِأَلسِنَتِهِمْ وَخالفُوهُ إلَى غَيرِه۔

یہ ایسے لوگوں کے بارے میں ہے جو زبانوں سے تو حق اور عدل کی خوب باتیں کرتے تھے مگر عملی طور پر ان کا رخ کہیں اور ہوتا تھا۔

اس موضوع کی مزید تفصیل اِن شاء اللہ کتاب میں مختلف مقامات پر آئے گی۔

☆☆☆☆☆

باب:۴

حاملِ قرآن کے لیے ضروری ہدایات

حاملِ قرآن کی صفات

بنیادی بات تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں یہ ہے کہ حاملِ قرآن اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے میں پوری طرح مخلص ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ رات اور دن کے اوقات میں تلاوت کی پابندی کرے۔ یہ تلاوت نماز میں بھی ہو اور نماز کے علاوہ بھی تاکہ وہ قرآن مجید بھول نہ جائے۔ امام مسلمؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۵۶] إنما مثل صاحب القرآن كمثل صاحب الإبل المعقلة إن عاهد عليها أمسكها، وإن أطلقها ذهبت، وإذا قام صاحب القرآن فقرأه بالليل والنهار ذكره، وإذا لم يقم به نسيه۔

حاملِ قرآن کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنے اونٹوں کو رسیوں سے باندھ کر رکھتا ہے۔ اب اگر وہ انہیں اسی طرح باندھے رکھے گا تو اُونٹ اس کے پاس رہیں گے اور اگر بغیر باندھے چھوڑ دے گا تو وہ چلے جائیں گے۔ اسی طرح صاحبِ قرآن اگر رات دن تلاوت کا معمول بنائے رکھتا ہے تو قرآن مجید اسے یاد رہتا ہے اور اگر تلاوت کی پابندی نہیں کرتا تو وہ اسے بھول جائے گا۔

اسے یہ بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا رہے، اس کی نعمتوں کا شکر بجا لائے، اس کا ذکر کرتا رہے، اسی پر بھروسہ رکھے، اسی سے مدد مانگے، اسی کی طرف دھیان رکھے اور اسی کے ساتھ اپنا تعلق مضبوط بنائے۔

حاملِ قرآن کو یہ بھی چاہیے کہ موت کو یاد کرتا رہے اور اس کے لیے ہمیشہ تیار رہے، اپنے گناہوں سے ڈرتا رہے اور اپنے رب کی طرف سے معافی کی اُمید رکھے۔ اللہ کا خوف اس پر صحت کے دنوں میں زیادہ

[۵۶] صحیح بخاریؒ: كتاب فضائل القرآن، باب استذكار القرآن و تعاهده ۴:۲۳۳۳، صحیح مسلم : كتاب صلاة المسافرين، باب الأمر بتعهد القرآن و كراهة قول: نسيت آية كذا، و جواز قول أنسيتها ۱:۵۴۳۔ ائمہ حدیث نسائی، مالک، احمد، حنبل رحمہم اللہ نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے۔

غالب رہے۔ نہ معلوم اسے خاتمہ کیسا نصیب ہو۔ ذاتِ باری تعالیٰ سے رحمت کی امید موت کے وقت زیادہ ہو تاکہ اپنے مالک کے ساتھ حسنِ ظن کا ٹھیک اظہار ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

[۵۷] لَا یَمُوتَنَّ اَحَدُکُمْ اِلَّا وَھُوَ یُحْسِنُ باللہ الظَنَّ۔

تم میں سے ہر ایک کو اس حال میں موت آنی چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہو۔

حسنِ ظن کا مطلب یہ ہے کہ اس سے رحمت اور بخشش کی امید رکھے۔ حامل قرآن میں یہ صفت بھی ہونی چاہیے کہ اپنے ہم عصروں کے بارے میں جانتا ہو، عہدوں اور مناصب سے بچنے والا ہو، اپنی جان کو معصیت سے بچانے اور نفس کو عذاب سے نجات دلانے کی کوشش کرنے والا ہو، اپنی دنیا سے جتنا ہوسکے آخرت کے لیے ذخیرہ کرتا رہے اور اس بارے میں اپنے نفس کے ساتھ جس قدر ہوسکے مجاہدہ کرتا رہے۔ اسے یہ بھی چاہیے کہ دین کے معاملہ میں شبہات اور معاصی سے اجتناب کرنے کو اپنے نزدیک اہم ترین کام سمجھے۔ اللہ تعالیٰ نے جن کاموں کا حکم دیا ان کی بجاآوری اور جن سے منع کیا ہے ان سے اجتناب کرنے میں اللہ سے ڈرتا رہے اور ان احکام کی پوری پوری پابندی کرے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[۵۸] ینبغی لقارئ القرآن أن یعرف بلیلہ إذا الناس نائمون، وبنھارہ إذا الناس مستیقظون، وببکائہ إذا الناس یضحکون، وبصمتہ إذا الناس یخوضون، وبخضوعہ إذا الناس یختالون، وبحزنہ إذا الناس یفرحون۔

قرآن کے قاری کو چاہیے کہ رات کو جب لوگ سورہے ہوں تو وہ عبادت سے پہچانا جائے اور دن میں جب لوگ جاگ رہے ہوں تو وہ اپنے اعمال سے پہچانا جائے، اور جب لوگ ہنس رہے ہوں تو وہ رونے سے پہچانا جائے، اور جب لوگ فضول باتیں کر رہے ہوں تو اس کی پہچان خاموشی سے ہو اور جب وہ تکبر کر رہے ہوں تو اس کی پہچان عاجزی سے ہو اور جب لوگ خوشی سے اترا رہے ہوں تو اس کی پہچان غم سے ہو۔

---

[۵۷] صحیح مسلم: کتاب الجنۃ و صفۃ نعیمھا وأھلھا، باب الامر بحسن الظن باللہ تعالیٰ عندالموت ۴:۲۰۵، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب حسن الظن باللہ تعالیٰ ۲:۴۰۳، مسند احمدؒ: مسند جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ۴:۲۱۸، ۲۵۶، ۲۸۰، ۳۸۳، مسند ابویعلی: مسند جابر رضی اللہ عنہ ۳:۴۴۶

[۵۸] شعب الایمان: التاسع عشر......، فصل: قال وینبغی لطالب العلم...... ۲:۲۹۰

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حاملِ قرآن کے لیے مناسب نہیں کہ فضول بحث کرنے والوں کے ساتھ بحث کرے۔ اسے چاہیے کہ جاہلانہ حرکتیں کرنے والوں کے ساتھ جاہلانہ طریقہ سے پیش نہ آئے بلکہ لوگوں کو معاف کر دیا کرے اور جو قرآن اس کے سینے میں ہے اس کے احترام میں ان سے درگزر کیا کرے۔ حامل قرآن کو یہ بھی چاہیے کہ خود کو مقاماتِ شبہ سے بچنے کا عادی بنائے۔ قرآن کی مجالس میں ہنسنے اور باتیں کرنے سے پرہیز کرے بلکہ قرآن کے علاوہ دیگر مجالس میں بھی بے فائدہ گفتگو نہ کیا کرے۔ اپنے آپ کو تحمل اور وقار کی عادت ڈالے، نادار لوگوں کے ساتھ عاجزی سے پیش آئے، تکبر اور خود پسندی سے بچے اور اگر دنیا کے کسی فتنے میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اس سے بھی اور اس کے چاہنے والوں سے بھی دور رہے۔ جھگڑے اور شک و شبہ سے پہلوتہی کرے اور اپنی عادت نرمی اور ادب و احترام کی بنالے۔ اسے ایسا ہونا چاہیے کہ لوگ اس کے شر سے محفوظ رہیں اور اس سے بھلائی کی توقع رکھیں۔ اس سے کسی کو نقصان نہ پہنچے اور اگر اس کے پاس کوئی شخص چغلی لے کر آئے تو یہ اس پر کان نہ دھرے۔ جو شخص بھلائی کے کاموں میں اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے اسے چاہیے کہ اس کے لیے اپنا وقت فارغ کرے، اس کو سچائی اور خوش اخلاقی سکھائے اس کی بھلائی چاہے اور عیب جوئی نہ کرے۔

حاملِ قرآن کے لیے ضروری علوم

حاملِ قرآن کو چاہیے کہ اس کے احکام کا علم بھی حاصل کرے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کس لیے نازل کیا ہے اور یہ بھی پتہ چل جائے کہ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس طرح وہ جو کچھ پڑھتا ہے اس سے فائدہ اٹھائے اور جس کی تلاوت کرتا ہے اس پر عمل بھی کرے، کیوں کہ جب تک وہ اس کے معانی نہیں سمجھے گا اس پر عمل نہیں کر سکے گا۔ دوسری طرف یہ بھی بہت غلط بات ہے کہ جس قرآن کی وہ تلاوت کرتا ہے اس کے معنی و مراد کے بارے میں اس سے پوچھا جائے تو اسے معلوم ہی نہ ہو، یہ تو اسی طرح ہوا جیسے گدھے پر کتابیں لاد دی جائیں۔

حاملِ قرآن کو مکی اور مدنی سورتوں کی پہچان بھی ہونی چاہیے تاکہ اسلام کے ابتدائی دور کی آیات اور آخری دور کی تعلیمات میں فرق کر سکے، اسی طرح اسے یہ بھی پتہ چل سکے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اللہ تعالیٰ نے کون سی چیزیں فرض کیں اور بعد کے زمانہ میں ان میں کیا تبدیلی کی۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں نسخ ہوا ہے

اکثر مدنی دور میں نازل ہونے والے احکام مکی دور میں نازل ہونے والے احکام کے لیے ناسخ ہیں اور یہ ممکن نہیں کہ کہیں مکی دور کے احکام مدنی دور کے احکام کو منسوخ کریں، کیوں کہ منسوخ وہی ہو سکتا ہے جو اپنے ناسخ سے پہلے نازل ہوا ہو۔

حاملِ قرآن میں ایک خوبی یہ بھی ہونی چاہیے کہ اعراب اور نادر الفاظ کے معانی کا بھی ماہر ہو، اس سے اس کلام کا سمجھنا زیادہ آسان ہو جاتا ہے جس کی وہ تلاوت کرتا ہے۔ نیز اس کے مفاہیم سے پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کا ازالہ بھی ہو جاتا ہے۔

ابو جعفر طبریؒ فرماتے ہیں: میں نے ابوعمر الجرمی کو یہ فرماتے سنا: میں تیس برس سے لوگوں کو فقہ کے فتوے سیبویہ کی کتاب کی مدد سے دے رہا ہوں۔ محمد بن یزید اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دراصل ابوعمر الجرمی ایک محدّث تھے جن کا کام حدیث پڑھنا پڑھانا تھا مگر جب انہوں نے سیبویہ کی کتاب پڑھ لی تو اس سے حدیث کے مسائل سمجھنے میں بہت مدد ملی کیوں کہ اس سے متن میں غور کرنے اور اس کی وضاحت کرنے کا طریقہ معلوم ہوگیا۔

اس کے علاوہ حامل قرآن کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول سنن و احادیث پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اس سے ارشادات باری تعالیٰ کی مراد کے طالب کو اپنی مراد مل جاتی ہے اور احکام قرآن بھی پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ ضحاک رحمہ اللہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ﴾ [آل عمران ۳: ۷۹] (بلکہ اللہ والے بن جاؤ۔ اس لیے کہ تم کتاب کو پڑھاتے ہو اور خود بھی پڑھتے ہو) کی تفسیر میں فرماتے ہیں: "حَقٌّ عَلٰى كُلِّ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ أَنْ يَكُوْنَ فَقِيْهًا" یعنی جو شخص قرآن سیکھتا ہے اس پر فرض ہے کہ فقہ کا بھی ماہر ہو۔

آدابِ تعلّم

ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ سن ۱۸۵ ہجری میں ایک دن ہم کئی لوگ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہاں پہنچے تو دروازے پر رک کر اجازت طلب کی مگر انہوں نے ہمیں اندر آنے کی اجازت نہ دی۔ کچھ لوگ کہنے لگے کہ ان سے ملاقات کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کوئی شخص قرآن مجید پڑھنا شروع کر دے، اسے سن کر وہ ضرور نکلیں گے۔ چناں چہ ہم نے اپنے ایک ساتھی قاری کو کہا تو اس نے تلاوت شروع کر دی۔ اس پر فضیل رحمہ اللہ نے دیوار کے ایک سوراخ میں سے سر باہر نکالا تو ہم نے سلام عرض کیا، انہوں نے وعلیکم السلام کہا۔ ہم نے عرض کیا: ابو علی آپ کیسے ہیں اور وقت کیسا گزر رہا ہے؟ انہوں نے فرمایا:

میں اللہ کے فضل سے خیریت سے ہوں مگر تم لوگوں نے مجھے تکلیف دی ہے۔ یہ جو کام تم لوگوں نے کیا ہے اسلام میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ. ہم اپنے زمانہ میں اس طرح علم نہیں سیکھا کرتے تھے۔ ہم مشائخ کی خدمت میں آتے تو اس احساس کے ساتھ آتے کہ ہم ان کے پاس بیٹھنے کے اہل نہیں ہیں۔ چناں چہ ان سے کچھ فاصلہ پر ہی بیٹھ جاتے اور چھپ کر سبق سنتے رہتے۔ اسی دوران جب کسی حدیث کا ذکر آتا تو ان کی خدمت میں اسے دہرانے کی درخواست کرتے اور جس طرح حدیث سنتے اسے اپنے پاس لکھ لیتے۔ تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے جاہلانہ طریقے اختیار کرتے ہو۔ تم لوگوں نے کتاب اللہ کو ضائع کر دیا۔ اگر تم لوگ اسے سیکھ لیتے تو تمہیں اس میں اپنے مسائل کا پورا حل مل جاتا۔ ابن أبي الحواری کہتے ہیں: ہم نے عرض کیا! ہم نے قرآن مجید تو سیکھ لیا ہے۔ انہوں نے فرمایا: قرآن سیکھنے کے لیے تو تمہاری اور تمہاری اولاد کی پوری زندگیوں کی ضرورت ہے۔ ہم نے کہا: أبو علی! وہ کیسے؟ انہوں نے فرمایا: تم اس وقت تک قرآن نہیں سیکھ سکتے جب تک تمہیں اس کے اعراب، آیات محکم اور متشابہ کا فرق اور ناسخ و منسوخ کا علم نہ ہو جائے اور جب یہ چیزیں تمہیں معلوم ہو جائیں گی تو نہ فضیل[1] سے کچھ پڑھنے کی ضرورت رہے گی نہ ابن عیینہ سے کچھ سیکھنے کی۔ پھر آپ نے کہا: أَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ. بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. (میں شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں جو سننے اور جاننے والا ہے اور شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور رحم والا ہے)۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیت کریمہ تلاوت کی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ. قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ﴾ [یونس ۱۰:۵۷-۵۸]۔ (اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کے پاس سے نصیحت آگئی ہے اور ان بیماریوں کے لیے شفا بھی جو سینوں میں ہوتی ہیں۔ اور ایمان والوں کے حق میں ہدایت اور رحمت۔ آپ کہہ دیجیے: لوگوں کو چاہیے کہ اللہ کے فضل سے اور اس کی رحمت سے خوش ہوں۔ وہ اس (دنیا) سے جس کو یہ جمع کر رہے ہیں کہیں بہتر ہے)۔

۱۔ فضیل بن عیاض بن مسعود التیمی (م۱۸۷ھ) کا شمار صوفی علماء میں ہوتا ہے، علم تصوف کے ساتھ ساتھ آپ روایت حدیث میں ثقہ، بات کے سچے اور بارُعب شخصیت تھے۔ جب بات کرتے تو سننے والوں پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ آپ کا آبائی وطن خراسان تھا مگر رہائش مکہ مکرمہ میں تھی۔ تقریب التھذیب ۲:۱۱۳، جمھرۃ الأولیاء ۲:۱۳۲

مؤلف کا تبصرہ

میں سمجھتا ہوں کہ جب یہ ساری صفات قرآن کے قاری کو نصیب ہو جائیں تو وہ قرآن مجید کا ماہر بن جاتا ہے اور جو شخص ان کے حصول کی کوشش کرتا ہے اسے یہ سعادت نصیب ہو بھی جاتی ہے۔ اور ان تمام چیزوں سے نفع صرف اس صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ان کے حصول کے دوران اور اس کے بعد نیت صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو جیسا کہ اس کا بیان گزر چکا ہے۔ کبھی یوں بھی ہو جاتا ہے کہ طالب علم ابتداء میں دنیاوی عزت اور نام و نمود کو پیش نظر رکھ کر علم حاصل کرنا شروع کرتا ہے مگر کچھ عرصہ بعد اسے اپنی نیت کی خرابی کا احساس ہو جاتا ہے جس پر وہ توبہ کر لیتا ہے اور خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے۔ اس طرح اسے علم کا فائدہ بھی حاصل ہو جاتا ہے اور اس کا حال بھی بہتر ہو جاتا ہے۔

حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ہم دنیا کی خاطر علم حاصل کیا کرتے تھے مگر اس نے ہمیں دین کی طرف کھینچ لیا۔ یہی بات سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بھی فرمائی ہے۔ حبیب بن أبی ثابت کہتے ہیں: ہم نے اس حال میں علم حاصل کرنا شروع کیا کہ ہماری نیت ٹھیک نہ تھی مگر بعد میں نیت بھی درست ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

باب: ۵

اعراب سیکھنے اوراس کے مطابق تلاوت کے فضائل

ابو بکر ابن الأنباری کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور تابعین رحمہم اللہ سے اعرابِ قرآن کی فضیلت، اسے سیکھنے کی ترغیب اور اعرابی اغلاط کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کی مذمت اور ناپسندیدگی کے بارے میں جو ارشادات نقل کیے گئے ہیں ان کے پیش نظر قُرّاءِ قرآن پر لازم ہے کہ وہ اسے نحوی قواعد کے ساتھ سیکھنے کی بھرپور کوشش کریں۔ انہی ارشادات میں سے ایک وہ ہے جو ہمیں یحیٰی بن سلیمان ضَبّی نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہمیں محمد بن سعید نے بتایا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم نے ابو معاویہ سے سنا، انہوں نے عبداللہ بن سعید مَقْبری سے روایت کی، انہوں نے اپنے والد گرامی سے انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۵۹] أَعْرِبُوا القرآنَ والتَمِسُوا غرائبَه۔

قرآن کی تلاوت فصیح عربی میں کرو اور اس کے نادر الفاظ کو سیکھو۔

ابن الأنباریؒ کہتے ہیں: مجھ سے میرے والد گرامی نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں کہ ہمیں ابراہیم بن الہیثم نے بتایا، ان کا کہنا ہے کہ ہمیں یہ حدیث آدم بن ابوایاس سے پہنچی، وہ کہتے ہیں ہمیں ابو الطیب المروزی نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہم سے عبد العزیز بن اَبی رَوّاد نے ذکر کیا، انہوں نے نافع سے اور نافع نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۶۰] مَنْ قَرأَ القُرآنَ فَلَمْ يُعرِبُه وُكِّلَ بِهِ مَلَكٌ يَكْتُبُ لَهُ كما أُنزِلَ، بِكُلِّ حَرفٍ عَشْرُ حَسَنات، فإِنْ أَعْرَبَ بَعْضَهُ وُكِّلَ بِهِ مَلَكان يَكتُبانِ لَهُ بكُلِّ حَرفٍ عِشرِينَ حَسَنَة، فإِنْ أَعْرَبَهُ وُكِّلَ به أَربَعَةُ أَملاكٍ يَكتُبُونَ لَهُ بِكُلِّ حَرفٍ سَبعِينَ حَسَنَة۔

جو شخص قرآن کریم کی تلاوت اِعراب کی رعایت رکھے بغیر کرتا ہے اس کے لیے ایک فرشتہ مقرر کیا جاتا ہے جو اس کی تلاوت کو اسی طرح شمار کر کے لکھتا ہے جس طرح قرآن نازل

[۵۹] مسندابویعلی: شهر بن حوشب عن ابی هريرة رضى الله عنه ۱۱:۶ ۴۳۶، شعب الايمان: التاسع عشر......فصل في قراءة القرآن بالتفخيم والإعراب ۲: ۴۲۷، فصل في ترک التعمق في القرآن ۲:۱ ۵۴ میں اسی کی ہم معنی مگر کافی مفصل تین احادیث منقول ہیں۔ امام حاکم فرماتے ہیں: کچھ لوگوں کے نزدیک یہ حدیث صحیح ہے، ذہبی کہتے ہیں: اس کے ضعیف ہونے پر اتفاق ہے، عراقی نے بھی اس کی سند کو ضعیف کہا ہے، ہیثمی کہتے ہیں: اس میں ایک راوی عبداللہ بن سعید المقبری متروک ہے، مجمع الزوائد ۷:۱۶۳

ہوا یعنی ہر حرف کے بدلے دس نیکیاں۔ جو شخص تلاوت کرتا ہے اور اعراب کی بھی کچھ رعایت کر لیتا ہے اس کے لیے دو فرشتے مقرر کیے جاتے ہیں جو اس ۔کے نامہ اعمال میں ہر حرف کے بدلے بیس نیکیاں لکھ دیتے ہیں اور اگر وہ اعراب کی پوری رعایت رکھتے ہوئے سب الفاظ صحیح صحیح ادا کرتا ہے تو اس کے لیے چار فرشتے مقرر کیے جاتے ہیں جو اس کے نامہ اعمال میں ہر حرف کے بدلے ستر نیکیاں لکھتے ہیں۔

جُویبِر نے ضحاکؒ سے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

جَوِّدُوا القُرآنَ وَزَیِّنُوهُ بِأَحْسَنِ الأَصواتِ، وأعرِبُوهُ فإنَّهُ عَرَبِیٌّ، وَاللّٰهُ یُحِبُّ أَنْ یُعرَبَ بِه۔

قرآن مجید کو اچھی ادائیگی کے ساتھ پڑھو، آواز بھی جس قدر اچھی ہو سکے بناؤ اور اسے فصیح عربی میں پڑھو کیوں کہ قرآن عربی ہے اور اللہ تعالیٰ بھی یہی پسند فرماتے ہیں کہ اسے صحیح عربی زبان کے مطابق پڑھا جائے۔

مجاہد رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''أعرِبُوا القُرآنَ'' (قرآن کو عربی زبان کے اصولوں کے مطابق پڑھا کرو)۔ محمد بن عبد الرحمٰن بن زید سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت أبو بکر و عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے: ''لَبَعْضُ إعْرَابِ الْقُرآنِ أحَبُّ إلَیْنَا مِنْ حِفْظِ حُرُوفِه'' (قرآن مجید کا کچھ حصہ صحیح لغت عرب کے مطابق پڑھ لیا جائے تو یہ ہمیں اس کے حروف یاد کر لینے سے زیادہ پسند ہے)۔

شعبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''مَنْ قَرأَ الْقُرآنَ فَأعْرَبَهُ کَانَ لَهُ عِندَ اللّٰهِ أجْرُ شَهِیدٍ'' (جس نے قرآن کی تلاوت لغت عرب کے اصولوں کے مطابق کی اس کو اللہ کے ہاں ایک شہید کے برابر ثواب ملے گا۔ مکحول رحمہ اللہ کہتے ہیں: مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ جس نے قرآن مجید کو اِعراب کی رعایت رکھتے ہوئے پڑھا اسے اس شخص سے دوگنا اجر ملے گا جس نے یہ رعایت رکھے بغیر پڑھا۔ ابن جُریج نے عطاء سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۶۰] اس حدیث کے راوی عبدالعزیز بن ابی رواد ضعیف ہیں۔ ابن حبان کہتے ہیں: انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب موضوعات کا ایک مکمل نسخہ نافع سے نقل کیا ہے۔ المیزان۔ مگر تہذیب التہذیب تعارف نمبر ۴۷۸۰ میں منقول ہے کہ یحییٰ بن قطان نے انہیں ثقہ فی الحدیث، امام احمد نے ارجاء کے باوجود صالح، ابن معین نے ثقہ، ابوحاتم نے صدوق، ثقہ فی الحدیث، متعبد اور نسائی نے کہا ہے کہ اس کی حدیث لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ابن مبارک کہتے ہیں: یہ جب بات کرتے تھے تو ان کے آنسو رخساروں پر بہنے لگتے تھے۔......حافظ ابن حبانؒ کہتے ہیں کہ ابوالطیب بوڑھے آدمی تھے جو عبدالعزیز بن ابی رواد سے عجیب وغریب روایات نقل کرتے ہیں ۔ان کی بات کا کسی حال میں اعتبار کرنا جائز نہیں۔انہوں نے عبدالعزیز سے یہ روایت بھی نقل کی ہے۔ کتاب المجروحین :تعارف ابوالطیب ۳:۱۶۰، علامہ ہیثمی نے مجمع الزوائد ۷:۱۶۳ میں اسی طرح کی ایک حدیث حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کر کے لکھا ہے کہ اس کا راوی عبدالرحیم بن زید العمی متروک ہے۔

[۶۱] أَحِبُّوا العَرَبَ لِثَلَاثٍ: لأنِّي عَرَبِيٌّ، والقُرآنُ عَرَبِيٌّ، و كلامُ أهلِ الجَنَّةِ عَرَبِيٌّ۔

تین وجوہات کی بنا پر عربوں سے محبت رکھو: ایک یہ کہ میں عربی ہوں، دوسری یہ کہ یہ قرآن عربی ہے اور تیسری یہ کہ اہل جنت کی زبان عربی ہوگی۔

سفیان نے ابُوحمزہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: حضرت حسن بصریؒ سے کہا گیا کہ کچھ لوگ عربی زبان سیکھتے ہیں تو انہوں نے فرمایا: وہ بہت اچھا کرتے ہیں، اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سیکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے ان کی خدمت میں شکایت کی کہ ہمارے محلے کا امام قراءت غلط لہجہ میں کرتا ہے تو انہوں نے فرمایا: اسے برطرف کر دو۔

تلاوتِ قرآن مجید میں اعراب کی اہمیت

ابن ابی ملیکہ (۱) فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک دیہاتی آیا اور کہنے لگا: کون ہے جو مجھے اس قرآن کا کچھ حصہ پڑھا دے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، فرماتے ہیں: ایک صاحب نے اسے سورۂ براءت پڑھانا شروع کی اور جب ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ وَرَسُوْلُهٗ﴾ [التوبۃ ۹: ۳] (کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے دست بردار ہیں) پر پہنچے تو "وَرَسُولِهِ" (۲) لام کی زیر کے ساتھ پڑھا دیا، دیہاتی یہ سنتے ہی بول پڑا: کیا اللہ اپنے رسول سے بے زار ہے، اگر اللہ ہی اپنے رسول [صلی اللہ علیہ وسلم] سے بے زار ہے تو میں اس سے زیادہ بے زار ہوں۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو پہنچی تو آپ نے دیہاتی کو بلا بھیجا اور پوچھا: کیا تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے زار ہوتے ہو؟، اس نے عرض کیا: امیرالمؤمنین! میں مدینہ طیبہ آیا تو مجھے قرآن کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ میں نے کہا: کوئی شخص مجھے پڑھا دے۔ فلاں شخص نے مجھے سورۂ براءت پڑھانا شروع کی اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ

---

[۶۱] مستدرک حاکم: کتاب معرفة الصحابة رضی الله تعالی عنهم، باب فضل کافة العرب ۴: ۹۷۔ امام حاکمؒ کہتے ہیں محمد بن فضل نے ابن جریج سے اس روایت کی متابعت کی ہے، شعب الإیمان: الرابع عشر......فصل في بيان النبي صلى الله عليه وسلم فصاحته ۲: ۱۵۹، الخامس عشر......فصل في الصلاة على النبي صلى الله عليه وسلم......۲: ۲۳۰ میں امام بیہقیؒ نے لکھا ہے کہ یحییٰ بن یزید سے یہ روایت صرف علاء بن عمرو نے نقل کی ہے۔ الجامع الکبیر حدیث نمبر ۶۳۴/۵۰ کے تحت علامہ سیوطی نے یہ روایت علامہ عقیلی کی کتاب الضعفاء سے نقل کی ہے،علامہ ذہبی مختصر المستدرک میں کہتے ہیں میرے خیال میں یہ حدیث موضوع ہے۔ عقیلی نے الضعفاء میں لکھا ہے منکر ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں۔

۱۔ عبد اللہ بن عبید اللہ بن ابی ملیکہ ثقہ تابعی اور طبقہ ثالثہ کے فقیہ تھے، مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ تقریب التہذیب ۱: ۴۳۱

۲۔ "رسولہ" کا ترجمہ لام کی زیر کے ساتھ یہ بنتا ہے کہ اللہ مشرکوں سے بھی بے زار ہے اور (معاذ اللہ) اپنے رسول سے بھی۔

وَرَسُولُهُ﴾ کو (لام کی زیر کے ساتھ ''وَرَسُولِه'') پڑھایا تو میں نے کہا: کیا اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے زار ہے؟ اگر اللہ ہی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بے زار ہے تو میں اس سے زیادہ بیزار ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے دیہاتی! بات ایسے نہیں جیسے تم سمجھے ہو۔ اس نے کہا: امیر المؤمنین! پھر کیسے ہے؟ آپ نے فرمایا ارشاد باری تعالیٰ یوں ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ بَرِیٓءٌ مِنَ الْمُشْرِكِينَ وَرَسُولُهُ﴾ (مشرکین سے اللہ تعالیٰ بے زار ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی بے زار ہیں) اس پر دیہاتی کہنے لگا: اللہ کی قسم میں بھی اس سے بے زار ہوں جس سے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بے زار ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم جاری فرمایا کہ قرآن مجید صرف وہ لوگ پڑھایا کریں جو لغت عرب کی صحیح واقفیت رکھتے ہوں۔ نیز انہوں نے أبو الأسود دوئلی کو حکم دیا کہ عربی کے اصول و قواعد مرتب کریں چنانچہ انہوں نے نحو مرتب کی[1]۔

علی بن جعد سے منقول ہے کہ انہوں نے شعبہ کو یہ کہتے سنا کہ ایسا محدّث جو عربی سے واقف نہیں، اس طرح ہے جیسے گدھے کے منہ کے ساتھ خوراک کا تھیلا لٹکا ہو مگر اس میں گھاس نہ ہو۔ حماد بن سلمہ کہتے ہیں:

جو شخص حدیث سیکھنے چل پڑتا ہے مگر نحو کا علم حاصل نہیں کرتا، یا شاید انہوں نے نحو کی بجائے عربی زبان کا لفظ استعمال کیا تو وہ اس گدھے کی طرح ہے جس کے سر کے ساتھ خوراک کا توبڑا لٹکا دیا جائے مگر اس میں کھانے کے لیے جَو نہ ہوں۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: اِعراب قرآن شرعی علوم کی بنیاد ہیں کیوں کہ انہی سے قرآن کے معانی کی درستگی ممکن ہے اور یہی معانی دراصل شریعت ہیں۔ ابن الأنباری کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم سے بھی قرآن مجید کے نادر اور پیچیدہ الفاظ کی وضاحت کے لیے لغت اور شعر کو بطور شاہد پیش کرنا ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں علماءِ نحو کا موقف درست ہے اور جو لوگ ان کی مخالفت کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں۔ اس کی ایک مثال وہ روایت ہے جو ہمیں عُبید بن عبد الواجد بن شریک البزاز نے بتائی ہے، وہ کہتے ہیں مجھے ابن أبی مریم نے بتایا، ان کو ابن فروخ نے خبر دی، وہ کہتے ہیں مجھے اسامہ نے بتایا، اسامہ کہتے ہیں مجھ سے عکرمہؒ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

إِذَا سَأَلْتُمُونِي عَنْ غَرِيبِ الْقُرْآنِ فَالْتَمِسُوهُ فِي الشِّعْرِ، فَإِنَّ الشِّعْرَ دِيوَانُ الْعَرَبِ۔

۱۔ عام طور پر مشہور ہے کہ أبو الأسود الدؤلی کو نحو مرتب کرنے کا حکم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دیا، مگر عین ممکن ہے کہ پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا ہو پھر بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے تاکید فرمائی ہو۔ أبو الأسود کا نام ظالم بن عمرو بن سفیان اور تاریخ وفات ۶۷ھ ہے بنو کنانہ کی شاخ ''دِئل'' سے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں بصرہ میں رہائش پذیر تھے، پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وہیں کے گورنر ہوئے۔ بیک وقت فقہ، شعر اور نحو کے ماہر تھے۔ بڑے بہادر شہسوار بھی تھے۔ ان کا شمار تابعین میں ہوتا ہے۔ معجم الأدباء ۳:۴۳۶

جب تم مجھ سے قرآن مجید کے نادر الفاظ کے بارہ میں پوچھنا چاہو تو انہیں اَشعار میں تلاش کیا کرو کیوں کہ شعر عربوں کی پنچایت ہے۔

ادریس بن عبد الکریم کہتے ہیں مجھ سے خلف نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں: ہمیں حماد بن زید نے بتایا، انہوں نے علی بن زید بن جُدعان سے روایت کی، وہ کہتے ہیں: میں نے سعید بن جُبیر اور یوسف بن مہران دونوں حضرات کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہمارے سامنے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے قرآن کے کسی مقام کی تفسیر پوچھی جاتی تو آپ فرماتے: اس کی تفسیر یوں یوں ہے، کیا تم نے شاعر کو "ایسے ایسے" کہتے نہیں سنا؟

عکرمہؒ کہتے ہیں: ایک شخص نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾ [المدثر ۷۴:۴] (اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھیے) کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا: "لا تَلبِس ثيابكَ على غَدرٍ" (میلے کچیلے کپڑے نہ پہنو) اور اس پر بطور ثبوت غیلان ثقفی کا یہ شعر پڑھا:

فإني بحمد الله لا ثَوْبَ غادرٍ لبِستُ ولامن سَوءةٍ أتقنع

اللہ کا شکر ہے کہ نہ تو میں نے کبھی کیچڑ والے کپڑے پہنے ہیں نہ ہی کسی برائی کی وجہ سے مجھے منہ چھپانا پڑا ہے۔

ایک شخص نے عکرمہ رحمہ اللہ سے قرآن مجید کے لفظ "زَنیم" کا معنی پوچھا تو انہوں بتایا کہ اس کا معنی زنا سے پیدا شدہ حرام کی اولاد ہے اور بطور دلیل یہ شعر پڑھا:

زنيمٌ ليسَ يُعرَفُ مَن أبوه بَغِيُّ الأمِّ، ذو حسبٍ لئيم

وہ حرام زادہ ہے، اس کے باپ کا کچھ پتہ نہیں، اس کی ماں فاحشہ عورت ہے اور وہ نسب کے لحاظ سے کمینہ انسان ہے۔

انہی سے منقول ہے کہ "زنیم" کا معنی: نسب بدلنے والا، بدکار، کمینہ ہے۔ پھر انہوں نے یہ شعر پڑھا:

زنيم تداعاه الرجال زيادةً كما زيد في عرض الأديم الأكارع[1]

وہ مخلوط النسب ہے اور مرد ایک دوسرے سے بڑھ کر اس کا باپ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے چمڑے کے توشہ دان میں پائے پکا کر ڈال دیے گئے ہوں۔

انہی سے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ذَوَاتَا أَفْنَانٍ﴾ [الرحمن ۵۵:۴۸] کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "أفنان" کا معنی سایہ اور ٹہنیاں ہیں۔ کیا تم نے شاعر کا یہ قول نہیں سنا:

ما هاج شوقك من هديل حمامة تدعو على فَنَنِ الغصون حماما

۱۔ ابن منظورؒ نے اس شعر کو حطیم تمیمی کی طرف اور ابو عبید نے حضرت حسان بن ثابتؓ کی طرف منسوب کیا ہے۔ لسان العرب۔

تدعو أبا فرخين صادف طائر اذامخلين من الصقور قطاما[1]

تمہارا شوق اس کبوتری کی آواز سن کر بھی نہ بھڑکا جو درخت کی ٹہنیوں پر بیٹھی کبوتر کو بلا رہی تھی اپنے بچوں کے باپ کو آوازیں دے رہی تھی جسے ایک بھاری بھرکم جسامت اور تیز ناخنوں والے باز نے اچک لیا تھا۔

عکرمہؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ [النازعات ۷۹: ۱۴] (لوگ فوراً میدان میں آموجود ہوں گے)۔ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے "الساهرة" کا معنی "الأرض" (زمین) کیا ہے۔ اُمیہ ابن اُبی الصلت[2] کہتا ہے کہ عربوں کے ہاں "لَحْمُ بَحر اور لحْمُ سَاهِرَة" (سمندری گوشت اور زمینی گوشت) کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ابن الانباریؒ کہتے ہیں اس معنی کی دلیل کے طور پر درج ذیل شعر پیش کیا جاتا ہے:

وفيها لحم ساهرة وبحرٍ وما فاهوا به لهم مقيم[3]

اور وہاں ان کے لیے بحری مخلوق کا گوشت بھی ہوگا اور زمینی مخلوق کا بھی، اور جو کچھ بولیں گے وہ بھی ہمیشہ کے لیے مل جائے گا۔

نافع بن اَزرق نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾ [البقرة ۲:۲۵۵] (اسے نہ اونگھ آسکتی ہے نہ نیند)۔ کی تفسیر بیان فرما دیجیے تو آپ نے فرمایا: "سِنَةٌ" کا معنی اُونگھ ہے جیسا کہ زہیر بن اَبی سُلمیٰ[4] نے کہا ہے:

لا سنة في طوال الليل تأخذه، ولا يَنامُ وَلَا فِي أمرِه فَنَدَ

نہ تو رات بھر اس کو اونگھ آتی ہے نہ وہ سوتا ہے اور نہ اس پر کوئی کمزوری طاری ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

۱۔ ابن منظورؒ نے یہ شعر بَری کی طرف منسوب کیا ہے۔ لسان العرب.

۲۔ اَبوعثمان اُمیہ بن اَبی صلت ثقفی (۹ھ) بڑا شاعر، دانا اور بہت عبادت گزار آدمی تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ عربوں کا نبی بن جائے مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ کی مخالفت کرنے لگا اور اسی حالت میں طائف میں اس کا انتقال ہو گیا۔ زیات: تاریخ الأدب العربي ص۸۵

۳۔ یہ شعر اُمیہ ابن ابی صلت کا ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اسے "ساهرة" کا معنی زمین بتاتے ہوئے بطور ثبوت پیش کیا۔ لسان العرب (سهر)۔

۴۔ زہیر بن اَبی سُلمیٰ بن رباح کا سلسلہ نسب نزار تک پہنچتا ہے۔ بڑا دانا، متقی اور تارک الدنیا شخص تھا۔ اہل حجاز کے نزدیک یہ سب سے بڑا شاعر تھا۔ شعرگوئی میں کوئی دوسرا اس کے ہم پلہ نہ تھا۔ تاریخ آداب العرب: ۳: ۴۸، ۳۴۷

باب: ٦

تفسیرِ قرآن مجید اور مفسرین کے فضائل

ہمارے علماءِ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ تفسیر کے فضائل میں حضرات صحابہ و تابعین سے جو روایات منقول ہیں ان میں سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے علمی مقام کی تعریف کی تو ایک شخص نے عرض کیا: حضرت! میں آپ پر قربان ہو جاؤں، آپ جابر رضی اللہ عنہ کو عالم بتلا رہے ہیں حالاں کہ آپ تو اس میدان میں اپنی مثال آپ ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: وہ اس لیے کہ جابر رضی اللہ عنہ ارشاد باری: ﴿إِنَّ الَّذِىْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَى مَعَادٍ﴾ [القصص ٢٨:٨٥] (جس اللہ نے آپ پر قرآن کو نازل کیا ہے وہ آپ کو آپ کے وطن میں پھر پہنچا کر رہے گا) کی تفسیر جانتے تھے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے سب سے زیادہ پسندیدہ شخص وہ ہے جو قرآن کا علم زیادہ رکھتا ہے۔ حسن بصریؒ فرماتے ہیں: اللہ کی قسم! اللہ تعالیٰ نے جو آیت بھی اتاری اس کے بارے میں وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کا شان نزول اور اس کی تفسیر دونوں معلوم کیے جائیں۔

شعبی کہتے ہیں کہ مسروق رحمہ اللہ نے صرف ایک آیت کی تفسیر کی خاطر بصرہ کا سفر کیا۔ وہاں پہنچ کر انہیں بتایا گیا کہ جو شخص اس آیت کی تفسیر جانتا ہے وہ شام چلا گیا ہے۔ انہوں نے رخت سفر باندھا اور شام کی طرف روانہ ہو گئے یہاں تک کہ اس آیت کی تفسیر معلوم کر لی۔ عکرمہؒ کہتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُوْلِهِ﴾ [النساء ٤:١٠٠] (جو کوئی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر ہجرت کرتا ہوا نکلے) میں جس شخص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے میں چودہ سال تک اس کا نام تلاش کرتا رہا یہاں تک کہ مجھے معلوم ہو گیا۔ حافظ ابن عبد البرؒ [1] کہتے ہیں: اس شخص کا نام ضَمْرَہ [2] بن حبیب تھا جیسا کہ اس کا ذکر آئندہ ان شاء اللہ آئے گا۔

١۔ ابن عبد البر مشہور محدث اور فقیہ أبو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر قرطبی مالکی (٣٦٨-٤٦٣ھ) ہیں۔ ان کی تصانیف ان کے علم و فضل کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ شجرة النور الزكية ص١١٩

٢۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے تو ان کا نام ضمرة بن حبیب ہی ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ ضُمیرة بن جندب، ضمیرة بن انس اور ضمرہ بن العیص وغیرہ نام بھی روایات میں ملتے ہیں۔ الاستيعاب على هامش الإصابة ٢: ٢١٣

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[۶۲] مکثت سنتین أرید أن أسأل عمر عن المرأتین اللتین تظاهرتا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ما یمنعنی إلا مهابته، فسألته، فقال: هی حفصة وعائشة۔

میں دو سال تک سوچتا رہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان دونوں عورتوں کے نام پوچھوں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی تھی مگر ان کے رعب کی وجہ سے پوچھ نہ سکا، پھر ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا تو آپ نے فرمایا: وہ حفصہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما تھیں۔

ایاس بن معاویہ کہتے ہیں:

جو لوگ قرآن مجید پڑھتے ہیں مگر اس کی تفسیر نہیں جانتے، وہ ان لوگوں کی طرح ہیں جن کے پاس رات کے وقت بادشاہ کا خط آیا مگر ان کے پاس چراغ نہ تھا اس لیے وہ نہ اسے پڑھ سکے نہ ہی انہیں معلوم ہو سکا کہ اس میں کیا لکھا ہے اور بادشاہ کے خط کی وجہ سے ان پر ایک انجانا سا خوف طاری ہو گیا۔ جو شخص تفسیر جانتا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ان لوگوں کے پاس ایک چراغ لے آیا جس کی روشنی میں انہوں نے اپنے بادشاہ کا خط پڑھ لیا۔

☆☆☆☆☆

[۶۲] صحیح بخاری: کتاب التفسیر، باب ﴿تَبْتَغِي مَرْضَاةَ أَزْوَاجِكَ﴾ ۴:۱۸۶۶، باب ﴿وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَى بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا﴾ اور باب قوله: ﴿إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا﴾ ۴: ۱۸۶۸، کتاب اللباس، باب ماکان النبي صلى الله عليه وسلم يتجوز من اللباس والبسط ۵:۲۱۹۷، صحیح مسلم: کتاب الطلاق، باب في الإيلاء واعتزال النساء ۲: ۱۱۰۸، ۱۱۱۰، مسند احمد: مسند عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ۱: ۴۸، مسند ابو یعلی: مسند عمر رضی اللہ عنہ ۱: ۱۶۲، سنن دار قطنی کتاب الطلاق والخلع والإيلاء ۴: ۴۲

باب: ۷

حاملینِ قرآن کی پہچان اور ان کی ناقدری کا وبال

ابو عمر (ابن عبدالبرؒ) کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قدرے کمزور طرق سے یہ ارشاد منقول ہے:

[۶۳] مِنْ تَعْظِيمِ جَلالِ اللّٰهِ إكرامُ ثَلاثَةٍ۔ الإمام المُقسِطُ، وذِي الشيبَةِ المُسْلِمِ، وَحامِلِ القُرآنِ غَيرِ الغالي فِيه ولَا الجافِي عَنه۔

تین طرح کے لوگوں کا احترام کرنا خود باری تعالیٰ کی عظمت و جلال کی بجا آوری کا حصہ ہے۔ وہ تینوں لوگ: عادل بادشاہ، بوڑھا مسلمان اور ایسا حامل قرآن ہے جو اس کے بارے میں افراط و تفریط سے کام نہیں لیتا۔

ابو عمرؒ کہتے ہیں: حاملینِ قرآن سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس کے احکام بھی جانتے ہیں، حلال و حرام بھی اور اس کی تعلیمات پر عمل بھی کرتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۶۴] القرآن أفضل من كل شيء فمن و قر القرآن: فقد و قرّ اللّٰه، ومن استخف بالقرآن استخف بحق اللّٰه تعالى، حملة القرآن هم المحفوفون برحمة اللّٰه، المعظمون كلام للّٰه، الملبسون نور اللّٰه، فمن والاهم، فقد والى اللّٰه، ومن

---

[۶۳] سنن ابو داؤد: كتاب الإدب، باب في تنزيل الناس منازلهم ۴: ۲۶۱، سنن بیہقی: كتاب قتال أهل البغي، باب النصيحة للّٰه ولكتابه و رسوله ولأئمة المسلمين ۸:۱۲:۳۰۸، شعب الإيمان: التاسع عشر......، فصل في تنوير موضع القرآن ۲: ۵۵۰، الحادى والستون......، قصه إبراهيم في المعانقة......۶:۴۹۱، الرابع والسبعون......۷:۴۲۶، الخامس والسبعون...... ۷:۴۶۰، بخاری: الأدب المفرد، باب اجلال الكبير ۱:۱۱۰، ان سب میں الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ یہ حدیث منقول ہے۔ اسے علامہ سیوطی نے الجامع الكبير ۲۷۴۰/ ۲۲۶ ۷ میں مکارم اخلاق کے ضمن میں خرائطی سے نقل کیا ہے۔ اس کے راوی طلحہ بن عبداللہ ابن کریز ہیں۔ یہ حدیث حسن ہے اور اسے حافظ عراقیؒ اور ابن حجرؒ دونوں نے نقل کیا ہے۔ منهاج الصالحين: ص ۶۶۴

[۶۴] نوادر الأصول ۲:۲۴۵ عن الباقرؒ مرسلا الجامع الكبير: ۱۱۴۶۲/۲۶ بروایت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بحوالہ ابو نصر سجزی اور بروایت محمد بن عبداللہ مرسلا بحوالہ حکیم ترمذی۔ علامہ سیوطی فرماتے ہیں یہ حدیث احسن ہے اور اس کے راوی یا تو ثقہ ہیں یا مقبول۔

عاداهم، فقد استخف بحق اللّٰه تعالى۔

قرآن مجید ہر چیز سے افضل ہے۔ جو شخص قرآن مجید کا احترام کرتا ہے وہ حقیقت میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی تعظیم کرتا ہے اور جو اس کے احترام میں کوتاہی کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے حق میں کوتاہی کرتا ہے۔ جن کو قرآن مجید کی نعمت دی گئی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں لپٹے ہوئے، اس کے کلام کی تعظیم کرنے والے اور اس کے نور سے اپنے دل و دماغ کو منور کرنے والے ہیں۔ جو شخص ان سے دوستی رکھے گا اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے بن جائے گا اور جو ان سے دشمنی رکھے گا وہی اللہ تعالیٰ کے حق کی بے حرمتی کرنے والا ہے۔

☆☆☆☆☆

باب: ۸

تعظیمِ قرآن میں حاملینِ قرآن کی ذمہ داریاں

ابو عبداللہ حکیم ترمذیؒ اپنی کتاب نوادر الاصول میں فرماتے ہیں: قرآن کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ اسے بے وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ اس کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کی تلاوت باوضو ہو کر کی جائے۔ تلاوت کرنے والا مسواک کرے اور دانتوں کے درمیانی فاصلوں کو بھی صاف کرے تاکہ اس کا منہ صاف اور پاکیزہ ہو جائے کیوں کہ یہی قرآن کے گزرنے کا راستہ ہے۔ یزید بن ابی مالکؒ کا قول ہے:

تمہارے منہ قرآن کی گزرگاہیں ہیں انہیں پاکیزہ اور جس قدر ممکن ہو صاف ستھرا رکھا کرو۔

یہ بات بھی قرآن کے احترام میں داخل ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت اسی طرح لباس پہننے کا اہتمام کیا جائے جس طرح بادشاہ کے پاس جاتے وقت کیا جاتا ہے کیوں کہ قرآن کا قاری اپنے رب سے مخاطب ہو رہا ہے۔ قرآن کی تلاوت قبلہ رخ ہو کر کی جائے۔ ابو العالیہ رحمہ اللہ جب تلاوت کا ارادہ کرتے تو پگڑی سجاتے، اچھا لباس زیب تن کرتے، جُبّہ پہنتے اور پھر قبلہ رُخ ہو کر تلاوت کرتے۔ یہ بھی قرآن کے آداب میں سے ہے کہ اس کی تلاوت کرتے ہوئے کھنکارنا پڑے تو کلی کرے۔ شعبہ نے ابو حمزہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا عمل نقل کیا ہے کہ اُن کے پاس پانی کا ایک برتن رکھا رہتا تھا، جب انہیں کھنکار آتا تو کُلی کر لیتے اور پھر اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جاتے۔ وہ اسی طرح ہر بار کھنکار آنے پر کلی کرتے تھے۔

قرآن کا ادب یہ بھی ہے کہ اگر دوران تلاوت جمائی آ جائے تو تلاوت روک دے کیوں کہ قاری جب تلاوت کرتا ہے تو اپنے رب سے مخاطب ہوتا ہے اور اس سے مناجات کرتا ہے۔ جمائی شیطان کی طرف سے آتی ہے۔ مجاہد کہتے ہیں جب دوران تلاوت قرآن مجید آپ کو جمائی آ جائے تو تلاوت روک دیں یہاں تک کہ جمائی ختم ہو جائے۔ عکرمہ رحمہ اللہ سے بھی یہی منقول ہے، اور اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا کرنے میں قرآن کی تعظیم ہوگی۔

قرآن کی تلاوت شروع کرتے وقت ﴿أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ﴾ کہے اور ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھے خواہ تلاوت کی ابتداء سورت کے شروع سے ہو یا کسی اور مقام سے۔ جب تلاوت شروع کر دے تو بلاضرورت باتوں سے اسے بار بار منقطع نہ کرتا رہے۔ کسی الگ جگہ بیٹھ کر تلاوت کرے تاکہ کوئی شخص بات کر کے اس میں رکاوٹ نہ ڈالے اور قاری جواب دے کر اپنی تلاوت میں کلام کی ملاوٹ نہ کرے۔

کیوں کہ اگر اس نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ کی جو پناہ اس نے شروع میں مانگی تھی اس کا اثر ختم ہو جائے گا۔ تلاوت کرنے بیٹھے تو سکون سے، بلا تکلف اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھے۔ دوران تلاوت اپنے ذہن اور دماغ کو استعمال کرے تاکہ اسے معلوم ہو کہ اپنے رب سے کیا بات کر رہا ہے۔ وعدے والی آیات پر رک کر اللہ تعالیٰ کی طرف زیادہ متوجہ ہو اور اس کے فضل کا سوال کرے اور وعید والی آیات پر رک کر اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگے۔ قرآن مجید میں جو مثالیں آئیں اُن پر رُک کر اُن سے سبق حاصل کرے۔

آدابِ قرآن میں یہ بھی ہے کہ اس کے نادر الفاظ کو سمجھنے کی کوشش کرے اور ہر حرف کی ادائیگی کا پورا پورا حق یوں ادا کرے کہ قرآن کے الفاظ مکمل طور پر ادا ہو جائیں کیوں کہ ہر حرف کی ادائیگی پر اس کے لیے دس نیکیاں ہیں۔

قرآن کا حق یہ بھی ہے کہ جب تلاوت مکمل کر چکے تو اپنے رب کے سچا ہونے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق تبلیغ ادا کر دینے کا اقرار کرے اور اس پر یہ گواہی بھی دے کہ رب تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا وہ سارا حق ہے۔ یہ سب کچھ درج ذیل الفاظ میں کہے:

صَدَقْتَ رَبَّنَا وَبَلَّغَتْ رُسُلُكَ، ونحنُ على ذلك مِن الشّاهِدين، اللهمّ اجعَلْنَا مِن شُهَدَاءِ الحقّ، القائِمينَ بالقِسطَ۔

اے ہمارے رب! آپ نے سچ فرمایا اور آپ کے پیغمبروں نے صحیح پہنچا دیا، ہم اس بات کے گواہ ہیں۔ اے اللہ! ہمیں حق کی گواہی دینے والے اور انصاف پر قائم رہنے والے بنا دے۔ اور اس کے بعد دیگر دعائیں مانگے۔

اس کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مختلف سورتوں میں سے کچھ آیات منتخب کر کے ان کی تلاوت نہ کرے۔

[۶۵] ہمیں یہ روایت ملی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ ہر سورت میں سے کچھ حصہ کی تلاوت کر رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علہ وسلم کا وہاں سے گزر ہوا تو آپ نے انہیں ہر سورت مکمل پڑھنے کا حکم فرمایا یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی سے ملتے جلتے الفاظ ارشاد فرمائے۔

قرآن کا یہ بھی حق ہے کہ جب اسے رکھا جائے تو کھلا نہ چھوڑا جائے اور اس کے اوپر کوئی دوسری کتاب بھی نہ رکھی جائے تاکہ وہ ہمیشہ تمام کتب سے اوپر رہے، خواہ وہ دینی کتب ہوں یا دوسرے علوم کی۔ جب قرآن مجید پڑھنے لگے تو اسے اپنی گود میں رکھے یا اپنے سامنے کسی اور چیز پر رکھے۔ قرآن مجید کو زمین پر بالکل

[۶۵] نوادر الأصول ۲:۴۱

نہ رکھے۔ اگر تختی پر لکھے ہوئے قرآنی الفاظ مٹانے کی ضرورت ہو تو تھوک سے نہ مٹائے بلکہ اسے پانی سے دھوئے۔ پھر یہ پانی نہ تو ناپاک جگہ پر گرائے نہ عام گزرگاہ پر کیوں کہ یہ پانی بذات خود قابل احترام ہے۔ ہمارے اسلاف تو اس پانی کو جس سے قرآنی الفاظ دھوئے جاتے، بیماریوں کے علاج کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔ اگر قرآن مجید کے صفحات بوسیدہ ہو جائیں تو انہیں دوسری کتابوں کی جلد بندی وغیرہ میں استعمال نہ کیا جائے کیوں کہ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ ان اوراق کو دھو کر الفاظ مٹا دیئے جائیں(۱)۔

قرآن مجید کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی دن ایسا نہ گزرے جس دن کم از کم ایک مرتبہ اسے کھول کر اس پر نظر نہ ڈالی جائے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: ''إنّي لأستحيي ألّا أنظرَ كُلّ يومٍ في عَهدِ رَبّي مرّة'' (مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ دن میں ایک بار بھی اپنے رب کے عہدنامہ کو نہ دیکھوں)۔

قرآن کا یہ بھی حق ہے کہ بندہ اپنی آنکھوں کو قرآن کریم میں سے ان کا حق دیتا رہے کیوں کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اسے دل تک پہنچاتی ہے۔ قرآن مجید سینے میں ہوتا ہے اور سینے اور دل کے درمیان ایک پردہ حائل ہے۔ جب انسان قرآن مجید کو دیکھے بغیر تلاوت کرتا ہے تو وہ اپنے کان کو سناتا ہے اور کان اسے دل تک پہنچاتا ہے اور جب بندہ دیکھ کر تلاوت کرتا ہے تو کان اور آنکھ دونوں اس امانت کی دل تک ادائیگی میں حصہ لیتے ہیں۔ اس سے ادا کا عمل بھی زیادہ بہتر ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کان کی طرح آنکھ کو بھی اپنا حصہ مل جاتا ہے۔ زید بن اسلم نے عطاء بن یسار سے اور انہوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۶] أَعْطُوا أَعْيُنَكُمْ حَظَّهَا مِنَ العِبَادَةِ قالوا يَارسولَ اللّٰه! ومَاحَظُّهَا مِنَ العِبَادَةِ؟ قالَ: النَّظرُ فِي المُصحَفِ والتَّفكّرُ فيهِ والإعتبارُ عِند عَجائِبه۔

اپنی آنکھوں کو عبادت میں سے اُن کا حصہ دیا کرو، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا:

[۲۶] الجامع الکبیر ۱: ۱۰۹۰ حدیث نمبر ۳۵۱۰/۷۲ بحوالہ حکیم ترمذیؒ بروایت ابن ابی الدنیا۔ یہی حدیث علامہ سیوطی نے الجامع الصغیر میں نمبر ۱۱۶۱ کے تحت ذکر کر کے اس پر ضعیف کا اشارہ دیا ہے۔ بیہقیؒ: شعب الایمان التاسع عشر...... فصل في قراءۃ القرآن من المصحف ۲: ۴۰۸، بروایت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور اسی مقام پر دوسری حدیث حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کے ساتھ نقل کی ہے اور اسے ضعیف کہا ہے۔ امام عبدالرزاقؒ نے اپنی مصنف: کتاب فضائل القرآن، باب تعاهد القرآن ونسيانه ۳: ۳۶۲ میں اسے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ متعدد صحابہ و تابعین سے قرآن مجید کو کھول کر دیکھنے کے فضائل منقول ہیں۔

۱۔ علامہ قرطبیؒ کے زمانہ میں پرنٹنگ پریس نہ تھے اس لیے اوراق دھو کر مٹائے جا سکتے تھے۔ آج کل بوسیدہ اوراق کا حکم یہ ہے کہ انہیں مناسب جگہ پر دفن کر دیا جائے۔

یارسول اللہ! عبادت میں ان کا حصہ کیا ہے؟۔ آپ نے فرمایا: قرآن مجید کو کھول کر اس پر نظر ڈالنا، اس میں غور کرنا اور اس کے عجائبات سے سبق حاصل کرنا۔

مکحولؒ نے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[٦٧] أفضلُ عِبادةِ أُمّتِي قِراءَةُ القُرآنِ نظرًا۔

میری امت کی افضل ترین عبادت دیکھ کر قرآن کریم کی تلاوت کرنا ہے۔

قرآن کے ادب کا تقاضا یہ بھی ہے کہ دنیاوی کلام کے طور پر اس کے جملے استعمال نہ کرے۔ عمرو بن زیاد حنظلی نے ہشیم بن بشیر سے اور انہوں نے مغیرہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابراہیم رحمہ اللہ دنیاوی کلام کے طور پر قرآنی عبارات کو استعمال کرنے کو ناپسند کرتے تھے۔ جس کی مثال اس طرح ہے کہ کوئی شخص آپ کے پاس آئے تو آپ اس کے استقبال میں کہیں ﴿جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَا مُوسَىٰ﴾ [طٰہٰ ۲۰:۴۰] (اے موسیٰ تم وقت معین پر یہاں آ گئے ہو۔اسی طرح کھانا وغیرہ آنے پر حاضرین کو یہ کہنا بھی ہے: ﴿كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ [الحاقۃ ۶۹:۲۴] (کھاؤ اور پیو مزے کے ساتھ ان اعمال کے بدلے میں جو تم گزشتہ ایام میں کر چکے ہو)۔

اس کے ادب کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی سورتوں کو اشیاء کی طرف نسبت کر کے نہ بولا جائے جیسے سورۃ النحل (مکھی والی سورت)، سورۃ البقرہ (گائے والی سورت) اور سورۃ النساء (عورتوں والی سورت) وغیرہ، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ سورت جس میں فلاں چیز کا ذکر ہوا ہے۔

اشیاء کی طرف سورتوں کی نسبت کے بارے میں مؤلف کی رائے

میرا خیال ہے یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درج ذیل ارشاد گرامی سے مطابقت نہیں رکھتی:

[٦٨] الآيَتَانِ مِن آخرِ سُورةِ البَقَرَةِ مَنْ قَرأَبهِما فِي لَيلةٍ كَفَتَاهُ۔

[٦٧] الجامع الکبیر ۱:۱۱۸۲، حدیث نمبر ۲۸۳/۱۶۳ بروایت حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ بحوالہ حکیم ترمذیؒ اور الجامع الصغیر میں نمبر ۱۳۰۵ کے تحت اسے ضعیف لکھا ہے، بیہقیؒ نے شعب الإیمان ،التاسع عشر ......في تعظيم القرآن ، فصل في إدمان تلاوة القرآن ۲:۳۵۴ میں بروایت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ صرف ''أفضلُ عبادةِ أمّتِي قِراءَةُ القُرآنِ'' کے الفاظ منقول ہیں۔

[٦٨] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن،باب، فصل سورۃ البقرہ ۳:۲۲۹، باب من لم يربأسًا أن يقول سورة كذا و كذا ۳:۲۳۴،صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين، باب فضل الفاتحة و خواتيم سورة البقرة والحث على قراءة الآيتين من سورة البقرة ۱:۴۵۵

سورۂ بقرہ کی آخری آیات ایسی ہیں کہ جو کوئی رات کو انہیں پڑھ لے گا یہ اسے کافی ہو جائیں گی۔ اس حدیث کو شیخینؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

قرآن کا ادب یہ بھی ہے کہ اس کی تلاوت آخر سے شروع کر کے ابتداء کی طرف نہ لائی جائے جیسے بچوں کو پڑھانے والے مدرسین کی عادت ہوتی ہے۔ وہ اس طرح حفظ میں اپنی مہارت ثابت کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ کیوں کہ یہ ادب کے خلاف ہے[1]۔

قرآن مجید کا ادب یہ بھی ہے کہ تلاوت کرتے وقت آواز مخارج کی گہرائی سے بتکلف زور لگا کر نہ نکالی جائے جیسے تالو سے آوازیں نکالنے والے بدعتی لوگ اپنے بدبودار منہ سے اپنے زعم میں الفاظ کی زیادہ واضح ادائیگی کے لیے بتکلف آوازیں نکالتے ہیں اور ان کی آواز کے ہر مقطع کے ساتھ ہمزہ کی آواز پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ طریقہ من گھڑت ہے جو شیطان نے انہیں سکھایا اور انہوں نے اسی کو اپنا لیا۔ قرآن مجید کو نہ تو بدکار لوگوں کی طرح سُر لگا کر گانوں کی طرز پر پڑھا جائے، نہ عیسائیوں کی طرح آواز گھما گھما کر اور نہ ہی راہبوں کی طرح رونے کی آواز میں۔ یہ سب طریقے غلط ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا۔

قرآن کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ جب اسے لکھنا چاہے تو موٹے الفاظ میں لکھے۔ ابو حُکیمہ سے نقل کیا گیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں کوفہ میں قرآن مجید کی کتابت کیا کرتا تھا۔ ایک دن حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ادھر سے گزر ہوا اور انہوں نے میری لکھائی دیکھی، پھر فرمایا:

أَجِلَّ قَلَمَكَ، فَأَخذْتُ الْقَلَمَ فَقَطَطْتُه' مِن طَرَفِهٖ قطًّا، ثُمَّ كَتَبتُ و علي رضى الله عنه - قائمٌ ينظُرُ إِلَى كتابَتِي، فقال: هكذا، نَوِّرهُ كما نَوَّرَهُ اللّٰهُ عَزَّ و جلّ"۔

قلم موٹا کرو۔ میں نے قلم پکڑا اور اس کو ایک طرف سے قط لگا دیا اور پھر لکھنے لگا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ جو کھڑے ہو کر میری لکھائی دیکھ رہے تھے، نے فرمایا: یہ ہوئی ناں بات! اس کو اسی طرح واضح لکھو جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے روشن بنایا ہے۔

تلاوت کرتے وقت ایک دوسرے سے اونچی آواز نہ نکالی جائے تاکہ دوسروں کی تلاوت میں خلل نہ آئے۔ ہوسکتا ہے دوسرے لوگ اُونچی آواز سے تلاوت کو ناپسند کریں یا اس کی وجہ سے مقابلہ کی صورت پیدا ہو جائے۔

۱۔ بعض قُرّاء حفظ میں مہارت دکھانے کے لیے قرآن کی آخری آیت پڑھتے ہیں اور پھر اس سے پہلے والی اور اسی طرح پیچھے ہٹتے چلے آتے ہیں۔ علامہ قرطبی نے اس کو ناپسندیدہ لکھا ہے۔ شاید اس سے مراد یہ نہیں کہ چھوٹے بچوں کی سہولت کے لیے پہلے پارہ "الم" کی بجائے انہیں آخری پارہ "عم" شروع کروا دیا جائے اور اس میں بھی پہلی سورت "نبا" کی بجائے آخری سورت "الناس" پڑھائی جائے اس میں بچوں کے لیے آسانی ہو جاتی ہے اور چھوٹی چھوٹی سورتیں وہ نماز میں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

یہ بات بھی قرآن کے آداب میں سے ہے کہ اس کی قراءات میں بحث مباحثہ یا جھگڑا نہ کیا جائے اور نہ ایک قاری دوسرے کو کہے کہ یہ اس طرح نہیں ہے (جیسے آپ کہہ رہے ہیں)۔ ہو سکتا ہے وہ بھی صحیح اور جائز قراءت ہو جس کا انکار کر کے وہ کتاب اللہ کے انکار کا مرتکب ہو جائے۔

قرآنِ مجید کی تلاوت بازاروں، شور والی جگہوں، فضول باتوں کی مجالس اور غیر مہذب لوگوں کے مجموعوں میں نہ کی جائے۔ قرآن کا حق ہے کہ اسے نہ تو تکیہ (سرہانہ) بنایا جائے، نہ اس پر ٹیک لگائی جائے اور نہ اسے کسی شخص کو پکڑانے کے لیے اچھالا جائے۔ قرآنِ مجید کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ اسے چھوٹی تقطیع میں نہ تیار کیا جائے۔ اعمش نے ابراہیم رحمہ اللہ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے **لَا يُصَغَّرُ الْمُصْحَفُ** (قرآن مجید چھوٹا نہ بنایا جائے)۔

قرآنِ مجید کا چھوٹا نسخہ بنانے پر مؤلف کا تبصرہ

میں کہتا ہوں ایک روایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ انہوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں قرآن مجید کا چھوٹی تقطیع والا نسخہ دیکھا تو پوچھا: یہ کس نے لکھا ہے؟ اس نے عرض کیا: میں نے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک دُرّہ مارا اور فرمایا: "عَظِّمُوا الْقُرآن" (قرآن مجید بڑا بنایا کرو)۔

[۶۹] ایک روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ آپ نے لفظ "مَسجِد" کی تصغیر بنا کر مُسَیجِد اور لفظِ "مُصْحَف" (قرآن مجید) کی تصغیر بنا کر "مُصَیحِف" کہنے سے منع فرمایا۔

قرآن کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اندر ایسی چیزیں نہ ملائی جائیں جو اس کا حصہ نہیں۔ اس پر سونے سے نقش و نگار بھی نہ کیا جائے، نہ ہی اس کے الفاظ سونے سے لکھے جائیں تاکہ دنیا کی چمک دمک اس میں شامل نہ ہو جائے۔ مغیرہ نے ابراہیمؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ قرآن مجید کو سونے کے ساتھ مزین کرنے، سونے کے ساتھ لکھنے، آیات کے شروع اور آخر میں نشانات لگانے اور قرآن مجید کو چھوٹا بنانے کو ناپسند کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۶۹] بیہقیؒ: شعب الإیمان، التاسع عشر......، فصل فی تفخیم قدر المصحف و تفریج خطه ۲:۵۴۵۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد یہ لفظ بولتے وقت تصغیر کی ممانعت ہے۔ ابن عدیؒ نے الکامل، تعارف اسحاق بن نجیح ۱:۳۳۱ اور ابن الجوزی نے اپنی موضوعات ۱:۱۵۸ میں اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کر کے موضوع کہا ہے۔

[۷۰] إذا زخرَفتُم مَسَاجِدَكُم و حَلَّيتُم مَصَاحِفَكُم فَالدّبارُ عَليكُم۔

جب تم اپنی مساجد پر نقش و نگار اور قرآن مجید کو مزیّن و آراستہ کرنے لگو گے تو تمہارے لیے ہلاکت ہوگی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا ایک نسخہ دیکھا جسے چاندی سے سجایا گیا تھا تو ارشاد فرمایا:

تُغرُونَ بِه السارِقَ وزينتُه' فِي جوفِه۔

اس پر چاندی لگا کر تم خواہ مخواہ چوروں کو دعوت دیتے ہو حالاں کہ قرآن کی زینت اس کے اندر موجود ہے۔

دیوار یا زمین پر قرآنِ مجید لکھنا

اس کے احترام میں یہ بھی شامل ہے کہ اسے زمین یا دیواروں پر نہ لکھا جائے جیسا کہ آج کل مساجد میں لکھا جانے لگا ہے۔ محمد بن علی شقیقی نے اپنے والد سے، انہوں نے عبداللہ بن مبارک سے، انہوں نے سفیان سے اور انہوں نے محمد بن زبیر سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا:

[۷۱] مَرَّ رسولُ اللّٰه صلَّى اللّٰه عليهِ وَسلَّمَ بِكتابٍ فِي أرضٍ، فقال لِشَابٍّ مِنْ هُذَيلٍ "ماهذا؟" قال: مِنْ كتابِ اللّٰه كتبه' يَهُودِيّ، فقال لعَنَ اللّٰه مَنْ فَعَل هذا، لا تَضَعُوا كِتابَ اللّٰهِ إلّامَوضِعَه۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسی جگہ سے گزر ہوا جہاں زمین پر کچھ لکھا ہوا تھا آپ نے بنو ہذیل کے ایک جوان سے پوچھا "یہ کیا ہے"؟ اس نے عرض کیا: حضور! یہ کتاب اللہ کا کچھ حصہ ہے جسے ایک یہودی نے یہاں لکھ دیا ہے۔ آپ نے فرمایا: جس نے یہ کام کیا اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ کتاب اللہ کو اس کا اصل مقام دیا کرو۔

محمد بن زبیر کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے اپنے ایک بیٹے کو دیوار پر قرآن مجید لکھتے ہوئے دیکھا تو اسے سزا دی۔

---

[۷۰] مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ، باب تزيين المساجد والممر فی المسجد ۳:۱۵۴، حکیم ترمذیؒ نے بھی اسے نوادر الاصول میں حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، علامہ مناوی کی فیض القدیر ۱:۳۶۶ نمبر ۶۵۸ میں اس کی مزید تفصیل ہے۔

[۷۱] سیوطی: الجامع الکبیر ۳:۷۱۰ حدیث نمبر ۲۶۹/۱۷/۱۷/۳۰۱ بحوالہ حکیم ترمذیؒ: نوادر الاصول، ابن حمزہ الحسینی: البیان والتعریف فی أسباب ورود الحدیث ۱:۲۴۹

یہ بات بھی قرآن مجید کے احترام میں شامل ہے کہ اگر کسی بیماری کے علاج کے طور پر اس کا کچھ حصہ لکھ کر اس سے غسل کرے تو یہ پانی نہ تو کوڑا کرکٹ کی جگہ بہائے، نہ ناپاک جگہ یا عام گزر گاہ پر گرائے بلکہ اسے دور کہیں ایسی جگہ بہائے جہاں عام طور پر لوگ نہیں گزرتے یا پاک جگہ پر گڑھا کھود کر وہیں غسل کرے تاکہ پانی اس کے جسم سے سیدھا اسی میں گرے، پھر نہانے سے فارغ ہوکر اس گڑھے کو بھر دے۔ یا کسی بڑی نہر وغیرہ کے کنارے غسل کرے تاکہ یہ پانی اس کے بہتے پانی میں مل جائے۔

ختمِ قرآن کے ساتھ ہی ابتداء کر دینا

اس کا ادب یہ بھی ہے کہ جب قرآن مجید مکمل کر چکے تو ساتھ ہی اس کی ابتداء سے کچھ حصہ کی تلاوت کر لے تاکہ تلاوت میں انقطاع کا اندیشہ نہ ہو۔

[۷۲] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قرآن مجید ختم فرماتے تو اس کے ساتھ ہی ابتداء سے تقریباً پانچ آیات پڑھ لیتے تاکہ ایسا معلوم نہ ہو کہ اب اس کی تلاوت ختم ہو چکی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں: ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

[۷۳] يَارسُولَ اللّٰه، أيّ العَمَل أفضَلُ؟ قال: عَليكَ بالحَالِّ المُرتَحِلِ۔ قال: وما الحالُّ المُرتَحِلُ؟ قال: صاحِبُ القُرآنِ يَضرِبُ مِنْ أوّلِه حتى يَبلُغَ آخِرَهُ، ثم يَضرِبُ فِي أوّلِه كُلّمَا حَلَّ ارتحَلَ۔

کون سا عمل سب سے بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: پہنچتے ہی کوچ کرنے والے کو اپنے لیے لازم کرلو۔ اس نے عرض کیا: پہنچتے ہی کوچ کرنے والے سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: صاحب قرآن جو اس کی ابتداء سے تلاوت شروع کرتا ہے، یہاں تک کہ آخر تک پہنچ جاتا ہے۔ پھر وہاں پہنچتے ہی دوبارہ ابتداء کر دیتا ہے۔ اسی طرح جب بھی آخر کو پہنچتا ہے بغیر رُکے پھر شروع کر دیتا ہے۔

---

[۷۲] نوادر الاصول ۲:۲۳۳ ۔علامہ سیوطیؒ جامع کبیر کے مقدمہ میں کہتے ہیں: جو روایت اکیلے حکیم ترمذیؒ نقل کریں وہ ضعیف ہوتی ہے۔

[۷۳] جامع ترمذیؒ: کتاب القراء ات ۵:۱۹۷، سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فی ختم القرآن ۲:۹۲۴، مستدرک حاکم: کتاب فضائل القرآن، باب ذکر فضائل سور و آی متفرقة ۱:۷۵۷، شعب الإیمان: التاسع عشر......، فصل فی إدمان تلاوة القرآن ۲:۳۴۸، فصل فی البکاء عند قراء ة القرآن ۲:۳۶۷، سیوطی: الجامع الکبیر ۲:۳۱۹۰ حدیث نمبر ۱۵۴۷۲/۱۹۱۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: اس کی سند قوی نہیں ہے، مگر مجموعی لحاظ سے اس کے مختلف طرق کو دیکھا جائے تو حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے

ختمِ قرآن کے طریقہ کے بارے میں مؤلف کی رائے

میرا خیال یہ ہے کہ ختم قرآن کے وقت اگر اپنے اہل خانہ کو جمع کر لیا جائے تو بہت اچھا ہے۔ ابوبکر ابن الانباری کہتے ہیں ہمیں ادریس نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں خلف نے بتایا، انہوں نے وکیع سے سنا، وکیع نے مِسْعَر سے اور انہوں نے قتادہؒ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جب قرآن مجید ختم کرتے تو اپنے اہل خانہ کو جمع کر لیتے اور دعا کرتے اور ہمیں ادریس نے ہی خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں خلف نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہم سے جریر نے ذکر کیا، انہوں نے منصور سے اور منصور نے حکم سے روایت کی، وہ کہتے ہیں کہ مجاہد، عبدہ بن ابی لبابہؒ اور کچھ دوسرے لوگ ایک دوسرے کو قرآن مجید سناتے تھے اور جب وہ ختم کے قریب پہنچتے تو ہماری طرف دعوت بھیجتے جس میں یہ پیغام بھی ہوتا تھا کہ آپ لوگ ختم کے موقع پر ہمارے ہاں آئیں، کیوں کہ جہاں ختم قرآن ہوتا ہے وہاں رحمت نازل ہوتی ہے۔[1]

ہمیں ادریس نے ایک اور روایت بھی سنائی ہے، کہتے ہیں ہمیں یہ خلف نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہمیں ہشیم نے بتایا، انہوں نے عوّام سے نقل کیا اور عوّام نے ابراہیم تیمیؒ سے سنا، وہ کہتے تھے جو شخص دن کے پہلے حصے میں قرآن مجید ختم کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے فرشتے شام تک اس کے لیے رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں اور جو شخص رات کے پہلے حصے میں ختم کرتا ہے فرشتے صبح تک اس کے لیے یہی دعا کرتے رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اسی لیے قراء حضرات یہ پسند کرتے تھے کہ دن کے پہلے حصے میں بھی ختم کریں اور رات کے پہلے حصے میں بھی۔

قرآن کے تعویذات

قرآن مجید کے احترام کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کے الفاظ پر مشتمل تعویذات پہن کر بیت الخلاء میں نہ جائیں۔ ہاں اگر چمڑے یا چاندی وغیرہ میں بند ہوں تو حرج نہیں کیوں کہ اس طرح وہ یوں ہی محفوظ ہوں گے جیسا کہ تمہارے سینے میں ہوں۔ اگر قرآنی آیات کسی چیز پر لکھ کر پینا چاہے تو ہر سانس کے ساتھ بسم اللہ پڑھے اور نیت بڑی رکھے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت نیت کی مقدار پر ہوتی ہے۔ لیث نے مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہتے تھے: قرآن مجید لکھ کر کسی مریض کو پلا دینے میں کوئی حرج نہیں۔ ابو جعفر سے نقل کیا گیا ہے کہ وہ کہتے جس شخص کو اپنے دل میں سختی محسوس ہو وہ کسی پیالے میں زعفران سے ''سورۂ یٰسین'' لکھ کر پی لے۔

---

[1] شعب الإيمان: التاسع عشر......، فصل فی البکاء عند تلاوۃ القرآن ۲:۳۶۸، سنن دارمی: فضائل القرآن، باب في ختم القرآن ۲:۹۲۶

سورتوں کو چھوٹا یا بڑا کہنا

میں کہتا ہوں قرآن کے احترام کا تقاضا یہ بھی ہے کہ کسی سورت کو ''چھوٹی سورت'' نہ کہا جائے۔ ابو العالیہ سورتوں کو چھوٹا یا بڑا کہنے کو ناپسند کرتے تھے اور اگر کسی کو ایسا کہتے ہوئے سنتے تو فرماتے تم خود اس سے چھوٹے ہو۔ قرآن تو سارا ہی عظیم ہے۔ یہ روایت مکیؒ(۱) نے نقل کی ہے۔

میں کہتا ہوں امام ابوداؤد نے عمرو بن شعیب کی روایت سے ایک حدیث نقل کی ہے جو اس رائے کے خلاف ہے۔ یہ حدیث عمرو بن شعیب نے اپنے والد سے اور انہوں نے ان کے دادا سے نقل کی، وہ کہتے ہیں:

[۷۴] مَا مِنَ المُفَصَّلِ سورۃ صَغِیرۃٌ ولا کَبیرۃٌ إلّا وَقدْ سمِعتُ رَسولَ اللّٰه صلَّی اللّٰه علیهِ وسلمَ یَؤُمُّ بِها النَّاسَ فِي الصلاۃِ۔

مفصل سورتوں میں سے کوئی چھوٹی یا بڑی ایسی سورت نہیں جسے میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کی امامت کے دوران پڑھتے ہوئے نہ سنا ہو۔

☆☆☆☆☆

---

[۷۴] ابوداؤد: کتاب الصلاۃ، باب من رای التخفیف فیھا ۱:۲۱۵؛ بیہقیؒ: السنن الکبری، کتاب الصلاۃ، باب طول القراءۃ وقصرھا ۳:۳۶۵۔ اس حدیث کے راویوں میں سے محمد بن اسحاق کو علماء حدیث نے مدلس لکھا ہے اور البانی نے ضعیف أبي داؤد ص۱۷۳ میں اسے ذکر کیا ہے۔

۱۔ مکی بن ابی طالب بن محمد القیسی (م۴۰۷ھ) اپنے وقت کے فقیہ، استاذ قراءت اور ادیب تھے مگر قرآن کا رنگ ان پر غالب تھا۔ وہ اس میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور علومِ قرآن میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ داؤدی: طبقات المفسرین ۲:۳۳۱

باب: ۹

مفسرین کے درجات اور تفسیر بالرّائے پر وعید

اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا:

[۷۵] ماکانَ رسولُ اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہِ وسلَّمَ یُفَسِّرُ مِنْ کتابِ اللّٰہ إلّا آیًا بِعَدَدٍ، علَّمَہٗ إیَّاھُنَّ جبریلُ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چند آیات کے علاوہ قرآن مجید کے کسی حصہ کی تفسیر بیان نہیں فرمایا کرتے تھے اور ان آیات کی تفسیر بھی انہیں جبریل علیہ السلام نے سکھائی تھی۔

حدیث کی وضاحت

علامہ ابن عطیہؒ فرماتے ہیں: اس حدیث میں تفسیر بیان نہ فرمانے سے مراد ایسے غیبی امور کی تفسیر ہے جنہیں قرآن نے ذکر کیا ہے اور ایسے امور جنہیں قرآن نے اجمالاً ذکر کیا ہے اور اسی طرح کے دیگر امور جن کی تفصیل صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی معلوم ہوسکتی ہے۔ ان غیبی امور میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے دیا ہی نہیں، جیسے قیامت کے مقررہ وقت کا علم اور اسی طرح کے دیگر امور جن کا پتہ قرآن کے الفاظ سے ہی چل سکتا ہے جیسا کہ صور پھونکنے کی تعداد اور زمین وآسمان کی پیدائش کے درمیان وقفے کا بیان۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

[۷۶] اتقُوا الحدِیثَ عَلَیَّ إلّا ماعلِمتم، فَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتعمِّدًا فلیتبوّأ مَقعدَہٗ مِنَ النار،

---

[۷۵] مسندابویعلیٰ: مسند عائشۃ رضی اللہ عنہا ۸:۲۳ میں ''کان لایفسر شیئا من القرآن برأیہ إلّا آیًا بِعَدَدٍ، علّمھُنَّ إیاہُ جبریلؑ'' ہے۔ ہیثمیؒ نے المجمع ۶:۳۰۳ میں بحوالہ بزار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔ ابو یعلیٰؒ اور بزارؒ کی سندوں میں راوی جعفر بن محمد بن خالد الزبیری ساقط ہے۔ امام طبریؒ نے جعفر کو غیر معروف کہا ہے اور میزان میں امام بخاریؒ کا قول ہے کہ ان کی حدیث قابل اعتماد نہیں۔

[۷۶] مسنداحمدؒ: مسند عبداللّٰہ بن العباس رضی اللہ عنہ ۱:۲۹۳، ۳۲۳، ۳۲۷، جامع ترمذیؒ: کتاب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برأیہ ۵:۱۹۹۔ مسندابو یعلیٰ: مسند ابن عباس رضی اللہ عنہ ۴:۲۲۸، ۵، ۱۰۹۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔ ابن قطانؒ نے سفیان بن وکیع کی وجہ سے اسے ضعیف کہا ہے۔ امام ابن ابی شیبہؒ نے المصنف، کتاب فضائل القرآن، باب من کرہ أن یفسر القرآن میں اسے صحیح سند کے ساتھ نقل کیا ہے جسے ابن قطان نے بھی صحیح کہا ہے۔

ومَن قال فِي القرآن برأيه فليتبوّأ مقعدَهٗ مِنَ النار۔

بغیر علم میری طرف کوئی بات منسوب کرنے سے بچو، کیوں کہ جس نے جان بوجھ کر میری طرف وہ بات منسوب کر دی جو میں نے کہی نہ تھی، وہ جان لے کہ اس کا ٹھکانہ جہنم میں تیار ہے اور جس نے قرآن کے بارے میں کوئی بات صرف اپنے خیال کی بنیاد پر کہی اس کا ٹھکانہ بھی جہنم میں تیار ہے۔

انہوں نے حضرت جندب رضی اللہ عنہ [۱] سے بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

[۷۷] مَنْ قالَ فی القُرآنِ بِرَأیه فأصابَ فقَدْ أخطأَ۔

جس شخص نے قرآن کے بارے میں اپنے خیال سے کچھ کہا اس نے غلط کیا خواہ اس کی بات ٹھیک ہی ہو۔امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے۔ اسے امام ابوداؤد [۲] نے بھی نقل کیا ہے البتہ اس کے ایک راوی پر جرح کی گئی ہے۔

حضرت رزین رضی اللہ عنہ نے اس حدیث میں درج ذیل الفاظ کا اضافہ بھی کیا ہے:

ومَن قَالَ بِرَأیه فأخطَأَ فَقَدْ کَفرَ۔

جس نے اس کے بارے میں اپنے خیال سے کچھ کہا اور جو کہا وہ غلط بھی نکلا تو اس نے کفر کیا۔

تفسیر بالرائے کی وضاحت

ابوبکر محمد ابن القاسم بن بشار بن محمد الانباری نحوی لغوی نے اپنی کتاب "الرّد" میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی مندرجہ بالا حدیث کی دو توجیہات کی گئی ہیں، ایک یہ کہ جس نے قرآن کے مبہم الفاظ و عبارات کا وہ مطلب بیان کیا جو اسے سلف صالحین صحابہ و تابعین سے منقول نہ ملا تو وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا مستحق ہے اور

[۷۷] سنن ابوداؤد: کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللہ بغیر علم ۳:۳۲۰،جامع ترمذیؒ: کتاب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی یفسر القرآن برأیه ...۲۰۰،مسند ابو یعلی: مسند جندب بن عبداللہ البجلي ۳:۹۰، شعب الإیمان: التاسع عشر...... فصل فی ترک التفسیر بالظن ۲:۴۲۳،ابن عدي: الکامل في الضعفاء، تعارف سہیل بن مہران ۴:۵۲۶۔سنن ترمذیؒ میں "ھذا حدیث غریب" کے الفاظ مجھے نہیں ملے البتہ امام ترمذیؒ کا یہ قول موجود ہے کہ بعض علماءِ حدیث نے اس حدیث کے راوئ سہیل بن ابی حزم پر جرح کی ہے۔

۱۔ حضرت ابوعبداللہ جندب بن عبداللہ البجلی (ما بعد ۶۰ھ) جلیل القدر صحابی ہیں اور اصحاب صحاح نے ان کی مرویات نقل کی ہیں۔

۲۔ امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث السجستانی (م ۲۷۵ھ) صحاح ستہ کے مصنفین میں سے ہیں،ان کی سنن چار ہزار آٹھ سو احادیث پر مشتمل ہے جن کا انتخاب انہوں نے پانچ لاکھ احادیث میں سے کیا۔ ان کی اور بھی کئی تصنیفات ہیں۔اعلام زرکلی:۳:۱۲۲

دوسری توجیہ جو کہ زیادہ برمحل اور معنی کے لحاظ سے زیادہ صحیح ہے یہ ہے کہ جس نے قرآن کی تفسیر میں ایسی بات کہی جس کے بارے میں اسے معلوم تھا کہ صحیح بات اس کی بجائے اور کوئی ہے تو اس شخص کا ٹھکانہ جہنم میں تیار ہے۔

یہاں لفظ "یتبوأ" استعمال ہوا ہے جس کا معنی ہے: وہاں جا کر اترے اور قیام کرے۔ شاعر کہتا ہے:

وَبُوِّئَتْ فِي صَمِيمِ مَعْشَرِهَا فَتَمَّ فِي قومِهَا مُبَوَّؤُها[1]

شرافت نسب کے اعتبار سے اس کا مقام عین اس کے خاندان کے دل میں ہے اور اس مقام کے لحاظ سے وہ مکمل طور پر اپنی قوم ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

حضرت جندبؓ کی حدیث کے بارے میں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم نے اس میں رائے سے مراد خواہش نفس لیا ہے یعنی جس نے قرآن کی تفسیر اپنی خواہش کے مطابق کی اور ائمہ سلف سے اسے نقل نہ کیا اس نے غلطی کی خواہ اس کی رائے صحیح ثابت ہو جائے کیوں کہ اس نے قرآن مجید کے بارے میں ایسا فیصلہ دیا جس کا مأخذ و مصدر معلوم نہیں اور نہ ہی حدیث کے علماء اور رواۃ میں سے کسی کا قول اس بارے میں ملتا ہے۔ علامہ ابن عطیہ[2] کہتے ہیں اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص سے قرآن مجید کی کسی عبارت کی تفسیر معلوم کی جائے تو وہ علماء کے اقوال کی طرف رجوع کیے اور نحو و اصول وغیرہ ضروری علوم کے تقاضے دیکھے بغیر جو دل میں آئے وہی تفسیر کرنے بیٹھ جائے۔ یہاں اس بات کی ممانعت نہیں ہے کہ لغت کے ماہرین الفاظ قرآن کے لغوی معانی اور علماء نحو اس کے نحوی مباحث بیان کریں یا فقہاء اس کے معانی کی وضاحت کریں اور ان میں سے ہر ایک متعلقہ علم کے قوانین اور شواہد کی روشنی میں اپنے غور و فکر اور اجتہاد سے جو سمجھتا ہے اسے بیان کر دے۔ کیوں کہ اس طرح تفسیر بیان کرنے والا صرف اپنی رائے کی بناء پر کچھ کہنے والا شمار نہیں ہوتا۔

مؤلف کا تبصرہ

میرے خیال میں یہ بات صحیح ہے اور اسی کو متعدد علماء نے اختیار کیا ہے کیوں کہ جو شخص صرف اپنے تخیل اور دل میں آنے والی بات سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے اور اس کی بنیاد تفسیری اصولوں پر نہیں ہوتی، وہ درحقیقت غلطی پر ہے اور اس کے مقابلہ میں جو شخص ٹھوس اصولوں کی رہنمائی میں تفسیر بیان کرتا ہے جن کے مآخذ و مصادر پر علماء سلف کا اتفاق ہے وہ قابل تعریف ہے۔

۱۔ لسان العرب (بوأ)

۲۔ ابو محمد قاضی عبدالحق بن غالب بن عبدالملک بن غالب بن عامر بن عطیہ (م ۵۴۱ھ) بہت بڑے مفسر، فقیہ اور محدث تھے۔ ادب میں بھی ان کو اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ ان کی تفسیر (المحرر الوجیز) بہت مشہور ہے۔ طبقات المفسرین: ص ۶۰، ۶۱

تفسیر صرف علماءِ سلف سے منقول اقوال کا نام نہیں

بعض علماء کہتے ہیں کہ تفسیر کا دارومدار صرف منقولات اور ماثورات پر ہے۔ اس کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُولِ﴾[النساء ۴: ۵۹] ہے۔ یعنی پھر اگر تم میں باہم کسی چیز کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا لیا کرو۔ مگر اس آیت سے مراد لینا ٹھیک نہیں کیوں کہ تفسیر قرآن سے منع کرنے کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ اس سلسلہ میں صرف منقول اقوال پر اکتفاء کیا جائے اور غور وخوض کے ذریعے قرآن کے معانی اخذ کرنے کو بالکل ترک کر دیا جائے، یا اس سے مراد کچھ اور ہوگا۔

اس کا یہ مطلب لینا تو بالکل غلط ہے کہ قرآن کے بارے میں کوئی شخص نئی بات نہ کہے بلکہ صرف وہی بولے جو پہلے علماء سے سنا ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید کو پڑھتے تھے اور اس کی تفسیر میں ان کے اقوال ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے اور یقیناً یہ تمام اقوال انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی:

[۷۸] اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَ عَلِّمْهُ التَّأْوِيلَ۔

اے اللہ اسے دینی مسائل میں مہارت عطا فرما اور تفسیر کا طریقہ سکھا دے۔

اگر تفسیر کا دارومدار بھی صرف سماع پر ہوتا جیسا کہ خود قرآن کریم کا ہے تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حق میں اس خصوصیت سے دعا فرمانے کا کیا فائدہ تھا اور یہ بات بالکل واضح ہے، اس میں کوئی اشکال نہیں۔ اس پر مزید بحث إن شاء اللہ سورۂ نساء میں بھی آئے گی۔

تفسیر بالرائے کی ممنوع صورتیں

تفسیر بالرائے سے منع کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس کا اطلاق درج ذیل دو صورتوں میں ہو سکتا ہے:

پہلی صورت یہ ہے کہ مفسر کسی خاص مسئلہ پر اپنی رائے اور طبعی میلان رکھتا ہو اور اس خواہش کی تائید کے لیے وہ قرآن مجید کے کسی حصہ کی تفسیر اپنے اس میلان کے مطابق کر لے تا کہ اپنے موقف کو صحیح ثابت کرنے

---

[۷۸] صحیح بخاری: كتاب الوضوء، باب وضع الماء عند الخلاء ۱: ۴۰، صحیح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب فضائل عبدالله بن عباس رضی الله عنه ۴: ۱۹۲۷، صحیح ابن حبان: كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۵: ۵۳۱، مسند احمد: مسند عبدالله بن العباس بن عبدالمطلب رضی الله عنهما ۱: ۴۳۹، طبرانی: المعجم الصغير، باب العين، من اسمه علی ۱: ۲۳۶، سنن ابن ماجہ: كتاب المقدمة، ۱: ۵۸ میں اس سے ملتے جلتے الفاظ ہیں۔

کے لیے اسے بطور دلیل پیش کر سکے۔ حالاں کہ اگر اس کا یہ طبعی میلان اور خواہش کا عمل دخل نہ ہو تو قرآن سے یہ مفہوم اس کے ذہن میں نہ آئے۔ اس طرح کی تفسیر کبھی تو لوگ جان بوجھ کر کرتے ہیں جیسا کہ اہل بدعت اپنی بدعات کے جواز کا ثبوت قرآن سے فراہم کرتے ہیں، حالاں کہ ان کو معلوم ہوتا ہے کہ آیت سے حقیقتاً یہ مراد نہیں۔ ایسے لوگوں کا مقصد صرف مخالفین کو مخمصے میں ڈالنا ہوتا ہے۔

بعض لوگ ایسی تفسیرات کم علمی میں کر جاتے ہیں اس صورت میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ آیت میں کئی معانی کا احتمال ہوتا ہے جن میں سے مفسر کا ذہن اسی معنی کی طرف مائل ہو جاتا ہے جو اس کے طبعی میلان سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس طرح وہ کسی خاص معنی کو اپنی خواہش کے مطابق ترجیح دیتا ہے اور اس کی یہ ترجیح تفسیر بالرائے شمار ہوتی ہے گویا اس کی رائے ہی اس معنی کو ترجیح دینے کی بنیاد بنی اور اگر وہ نہ ہوتی تو یہ معنی اس کے ہاں ترجیح نہ پاتا۔

بعض اوقات انسان کے پیش نظر کوئی جائز غرض ہوتی ہے اور وہ اس کے بارے میں رہنمائی اور اس کی تائید کے لیے قرآن سے دلیل تلاش کرتے ہوئے کسی ایسی آیت کا سہارا لے لیتا ہے جس کے بارے میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا دراصل یہ مطلب نہیں ہے۔ اس کی مثال اس شخص کا عمل ہے جو سخت دل کے لیے مجاہدہ تجویز کرتا ہے اور دلیل کے طور پر یہ ارشاد باری تعالیٰ پیش کرتا ہے: ﴿ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴾ [طٰہٰ ۲۰:۲۴] (تم فرعون کے پاس جاؤ کہ وہ بڑا سرکش ہو گیا ہے)۔ اس سے وہ دل کی طرف اشارہ کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ فرعون سے مراد انسان کا دل ہے۔ یہ طریقہ بعض واعظین استعمال کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کے مقاصد اچھے ہوتے ہیں اور وہ قرآنی آیات پیش کر کے محض کلام کو مزین کرنا اور سامعین کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں مگر یہ ممنوع ہے۔ وہ اس طرح قیاس کے ذریعے لغوی معانی میں تصرف کرتے ہیں جو کہ جائز نہیں۔ یہی طریقہ تفسیر فرقہ باطنیہ کے پیروکار اپنے غلط مقاصد کے لیے اختیار کرتے اور اس طرح دھوکے سے لوگوں کو اپنے فاسد عقائد کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یہ لوگ قرآنی آیات کو اپنی رائے اور اپنے مذہب کے مطابق ایسے امور پر منطبق کرتے ہیں۔ جن کے بارے میں بالیقین جانتے ہیں کہ ان سے وہ مراد نہیں۔ یہ تمام انداز ایسی تفسیر بالرائے کی صورتیں ہیں جو کہ ممنوع ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لغت عرب کے ظاہری معانی کو لے کر قرآن مجید کی تفسیر کے لیے اُٹھ دوڑے اور اس کی نادر عبارات، مبہم اور مبدل الفاظ، اختصارات، حذف، اضمار اور تقدیم و تاخیر وغیرہ کے متعلق سلف سے جو اقوال منقول ہیں ان سے مدد اور تائید حاصل نہ کرے۔ اب جو شخص پہلے سے موجود تفسیر میں تو مہارت حاصل نہیں کرتا اور صرف عربی لغت کے علم کی بناء پر معانی کا استنباط اور استخراج کرنے چل پڑتا ہے وہ بہت زیادہ غلطیاں کرے گا اور اس کی یہ کوشش بھی تفسیر بالرائے کے زمرے میں داخل ہوگی۔

تفسیر کا طریقِ کار

تفسیر قرآن کے لیے ضروری ہے کہ مفسر سب سے پہلے ان تفسیری اقوال میں مہارت حاصل کرے جو پہلے سے ماثور ہیں اور علماء سلف سے منقول ہیں تاکہ غلطی کے امکانات کم ہوں۔ اس تفسیر کو ظاہری تفسیر کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس تفسیر پر عبور حاصل کر لینے سے قرآن کے معانی سمجھنے اور ان سے نئے معانی اخذ کرنے کی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ایسی نادر عبارات کی کمی نہیں جنہیں صرف منقول اقوال اور ماثور روایات کی مدد سے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ظاہری تفسیر کے ٹھوس علم کے بغیر باطنی معانی تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ ذرا غور کیجیے کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا﴾[الاسراء ۱۷: ۵۹] (اور ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی دی تھی بصیرت کے ذریعہ کے طور پر لیکن انہوں نے اس کے ساتھ بڑا ظلم کیا)۔ اس ارشاد باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہے کہ انہیں یہ اونٹنی ایسی نشانی کے طور پر دی گئی تھی جو ان کے لیے بصیرت اور راہ راست پر آنے کا ذریعہ بن سکتی تھی مگر انہوں نے اسے قتل کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر لیا۔ اب یہاں صرف عربی زبان کے بل بوتے پر تفسیر کرنے والے تو یہی سمجھیں گے کہ وہ اونٹنی ایسی تھی جسے نظر بھی آتا تھا اور اس کے بعد ان کی تفسیر ختم ہو جائے گی انہیں یہ بھی پتہ نہ چلے گا کہ انہوں نے کیا ظلم کیا اور نہ ہی یہ کہ یہ ظلم اپنے آپ پر کیا یا کسی اور پر۔ ان چیزوں کا تعلق حذف اور اضمار وغیرہ سے ہوتا ہے جس کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت ملتی ہیں۔ ان دو صورتوں کے علاوہ تفسیر بالرائے کی ممانعت کی کوئی صورت نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔

تفسیرِ قرآن میں احتیاط

علامہ ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ سلف صالح میں سے بڑے بڑے حضرات جیسے سعید بن مسیّب اور عامر شعبی وغیرہ تفسیر قرآن کو بہت ذمہ داری کا کام سمجھتے تھے اور اپنے تقویٰ و احتیاط کی بناء پر اس سے توقف فرماتے تھے، حالاں کہ ان کی بصیرت اور علمی مقام کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ابوبکر بن الانباری کہتے ہیں: علماءِ سلف اور ان میں سے بڑے بڑے ائمہ قرآن مجید کے غیر صریح مقامات کی تفسیر سے گریز کرتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات یہ سوچتے کہ اس کی جو تفسیر ہمارے ذہن میں آ رہی ہے شاید اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نہ ہو۔ اس خیال سے وہ اپنی رائے کا اظہار نہ کرتے اور بعض حضرات اس خوف سے توقف فرماتے کہ کہیں میری بیان کی ہوئی تفسیر کو لوگ ایک مستقل اسلوب بنا کر اس کی پیروی نہ شروع کر دیں اور مجھے اس کا امام شمار کرنے لگیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے بعد میں آنے والا کوئی شخص کسی حرف کی تفسیر اپنی رائے سے کرے جس میں غلطی ہو جائے اور وہ لوگوں

میں مشہور یہ کر دے کہ اس تفسیر میں میرے مقتدا و امام فلاں بزرگ ہیں۔ اس سلسلہ میں ابن ابی ملیکہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک حرف کی تفسیر پوچھی گئی تو آپ نے فرمایا:

أيُّ سَمَاءٍ تُظِلُّنِي؟ وأيُّ أرضٍ تُقِلُّني؟ وأينَ أذْهَبُ؟ و كيفَ أصْنَعُ؟ إذَا قُلتُ فِي حَرفٍ مِن كِتَابِ اللّٰه بِغيرِ ماأرادَ اللّٰه تَبارَكَ وَتَعالىَ۔[۱]

کون سا آسمان مجھ پہ سایہ کرے گا، کون سی زمین میرا بوجھ برداشت کرے گی، میں کہاں جاؤں گا اور کیا کروں گا اگر قرآن کے کسی ایک حرف کے بارے میں میری زبان سے ایسی بات نکل گئی جو اللہ تعالیٰ کا مقصود نہیں۔

سلف میں ائمہ تفسیر

ابن عطیہؒ فرماتے ہیں کہ عظیم المرتبہ بزرگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد نے تفسیر قرآن مجید کو اپنا موضوع بنایا۔ اللہ ان پر راضی ہو انہوں نے اس معاملہ میں مسلمانوں پر بڑی مہربانی فرمائی۔

اس جماعت مفسرین کے امیر اور متفق علیہ بزرگ سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں اور ان کے بعد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا مقام ہے۔ وہ ایسی ہستی ہیں جنہوں نے تفسیر کے لیے خود کو وقف کر دیا تھا۔ ان کے بعد ائمہ کرام مجاہد، سعید بن جبیر اور دیگر حضرات ان کے نقش قدم پر چلے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے تفسیری اقوال جو اب تک محفوظ ہیں ان کی تعداد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول اقوال سے بھی زیادہ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''مَاأخَذْتُ مِنْ تفسيرِ القُرآنِ فَعَنْ عَليّ بنِ أبي طالبٍ رَضيَ اللّٰه عنه۔'' میں نے قرآن مجید کی جتنی تفسیر بھی سیکھی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے سیکھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی تفسیر کی تعریف فرماتے اور لوگوں کو آپ سے سیکھنے کی ترغیب دیتے تھے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں[۲]: ''نِعْمَ تَرْجُمَانُ القُرآنِ عبداللّٰه بن عباسؓ۔ (قرآن مجید کے بہترین ترجمان عبداللہ بن عباسؓ ہیں) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں فرمایا: ''ابن عباسٍ كأنّما ينظُرُ إلى الغَيبِ مِن سِتر رَقِيقٍ۔'' (ایسا لگتا ہے کہ ابن عباسؓ ایک باریک پردے میں سے جھانک کر غیب سے دیکھ لیتے ہیں)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بعد حضرات عبداللہ بن مسعود، اُبَی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مقام ہے۔

۱۔ شعب الإيمان: التاسع عشر......فصل فى ترك التفسير بالظن ۲:۴۲۴

۲۔ تفسیرِ قرطبی میں قال ابن عباسؓ ہے۔ مگر درحقیقت یہ ان کے بارے میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے۔ الاصابة ۲:۳۳۲

تفسیر میں صحابہ کرام کا مقام اور ان کا ذوق

تفسیر میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو بھی منقول ہے وہ تمام آراء سے مقدم ہے کیوں کہ انہوں نے قرآن مجید کو نازل ہوتے دیکھا اور وہ انہی کی زبان میں نازل ہوا۔ عامر بن واثلہ فرماتے ہیں میں نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے خطبہ میں فرماتے ہوئے سنا:

سَلُو نِي! فَوَاللّٰهِ لاتَسْأَلُونِي عن شَيىءٍ يكُونُ إلى يَومِ القِيامَةِ اِلَّا حَدَّ ثْتُكُمْ بِهِ، سلُونِي عَن كتاب اللّٰهِ، فَوَاللّٰهِ مَامِن آيَةٍ إلَّا أنا أعلَمُ أبلَيلٍ نَزَلَتْ أمْ بِنَهَار، أمْ فِي سَهْلٍ نَزَلَتْ أمْ في جَبَل، فقامَ إليه ابنُ الكواء فقال يا أميرَالمؤمِنِين. مَاالذّاريات ذَرْوًا؟ وذكر الحديث۔[1]

مجھ سے پوچھ لو۔ اللہ کی قسم! قیامت تک پیش آنے والے معاملات میں سے جس کے بارے میں مجھ سے پوچھو گے میں تمہیں جواب دوں گا۔ مجھ سے اللہ کی کتاب کے بارے میں پوچھو۔ اللہ کی قسم میں ہر ہر آیت کے بارے میں جانتا ہوں کہ رات کو نازل ہوئی یا دن کو، میدانی علاقے میں اتری یا پہاڑ میں۔ اس پر ابن الکواء[2] کھڑے ہوئے اور عرض کیا: اے امیر المؤمنین ﴿الذّٰرِيَات ذَرْوًا﴾ (اڑنے والی ہوائیں) کیا چیزیں ہیں؟ اور اسی طرح مکمل روایت ذکر کی۔

منہال بن عمرو کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لو أعلَمُ أحدًا أعلَمَ بِكِتاب اللّٰه مِنِّي تبلُغُهُ المَطِيُّ لأتَيتُهُ، فقال له رجُلٌ: أماَ لَقِيتَ عَلِيَّ بن أبي طالِب؟ فقال: بلَى قد لقيتُه۔[3]

اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ کتاب اللہ کو جاننے والا کوئی شخص ہے اور سواری کے ذریعے اس تک پہنچا بھی جا سکتا ہے تو میں ضرور اس کے پاس جاؤں گا۔ ایک شخص نے کہا: کیا آپ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے نہیں ملے؟ تو انہوں نے فرمایا: کیوں نہیں، میں ان سے بھی مل چکا ہوں۔

۱۔ الجرح والتعدیل: تعارف علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۶:۱۹۱ میں یہ اثر مکمل منقول ہے۔ مستدرک حاکم: کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ الذاریات ۲:۵۰۶ میں مختلف الفاظ ہیں اور وہاں ہر چیز کے بارے میں سوال کرنے کا ذکر نہیں۔

۲۔ ابن الکواء کا نام عبد اللہ بن عمرو اور قبیلہ بنی یشکر تھا۔ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ المعارف: ص ۲۹۷

۳۔ صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عبدالله بن مسعود و امه ۴:۱۹۱۳، مسند بزار: مسند عبدالله بن مسعود رضی الله عنه، هبيره بن بريم عن عبدالله ۵:۲۵۶ وعبداللہ بن مرہ وغیرہ من اصحاب مسروق عن مسروق ۵:۳۴۳

مسروقؒ کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی مثال چھوٹے بڑے تالابوں کی طرح ہے جن میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے ایک ایک انسان سیراب ہو سکتا ہے، کچھ ایسے ہیں کہ جن سے دو شخص سیر ہو کر پی سکتے ہیں اور ان میں ایسے بھی ہیں کہ اگر سب لوگ مل کر بھی ان کی طرف اُمڈ آ جائیں تو وہ ان کو کافی ہو جائیں۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود ایسے ہی تالابوں میں سے ایک ہیں۔ ان مناقب کو ابو بکر ابن الأنباری نے کتاب الرد میں ذکر کیا ہے اور یہاں جو لفظ "إخاذ" استعمال ہوا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرب کے ہاں "إخاذ" ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں تالاب کی طرح پانی جمع کر لیا جائے۔

ابو بکر (ابن الأنباری) کہتے ہیں: ہمیں احمد بن ہیثم بن خالد نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہم سے احمد بن عبد اللہ بن یونس نے ذکر کیا، وہ کہتے ہیں ہمیں سلام نے بتایا، انہوں نے زید العَمّی سے، زید نے ابو صدیق ناجی سے اور انہوں نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کیا، آپؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۷۹] أرحمُ أمتي بها أبو بكر، وأقواهُم في دين الله عمر، وأصدقُهم حياءً عثمانُ، وأقضاهُم علي، وأفرضهم زيد، وأقرؤهم لكتاب الله عزوجل أُبيٌّ بن كعب، وأعلمهم بالحلال والحرام معاذ بن جبل، وأمينُ هذه الأمة أبو عبيدة بن الجراح، وأبو هريرة وعاء من العلم، وسَلْمان بحرٌ من علمٍ لا يُدرَك، وما أظلت الخضراءُ ولا أقلَّتِ الغَبْراءُ۔ أوقَال البطحاءُ۔ من ذى لهجة أصدق من أبى ذر۔

میری امت میں سے اس پر سب سے زیادہ مہربان ابو بکر رضی اللہ عنہ ہے، ان میں سے اللہ کے دین کے معاملہ میں سب سے مضبوط عمر رضی اللہ عنہ ہے، فطری طور پر حیا کا پیکر عثمان رضی اللہ عنہ ہے، فیصلے کی قوت و صلاحیت کے اعتبار سے بلند تر علی رضی اللہ عنہ ہے، وراثت کے مسائل میں ماہر ترین زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہے، کتاب اللہ کا سب سے بڑا قاری اُبَیّ بن کعب رضی اللہ عنہ ہے، حلال و حرام کا سب سے بڑا ماہر معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہے، اس امت کا اَمین اَبو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ ہے، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ علم کا خزانہ ہے،

---

[۷۹] جامع ترمذیؒ: كتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل و زيد بن ثابت وأبیّ وأبی عبيده بن الجراح رضى الله عنهم. ۵:۶۶۴، ۶۶۵۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: حدیث حسن صحیح ہے، سنن ابن ماجہ: كتاب المقدمه ۱:۵۵، صحیح ابن حبان: كتاب اخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۶:۷۴، ۸۵، باب فضل الصحابة والتابعين رضى الله عنهم ۱۶:۲۳۸، سنن سعید بن منصور: باب الحث على تعلم الفرائض ۱:۲۸، مصنف عبدالرزاق: كتاب الجامع، باب اصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ۱۱:۲۲۵، طبرانی: المعجم الصغير، كتاب العين، باب من اسمه على ۱:۲۴۱، سنن بیہقی: كتاب الفرائض، باب ترجيح قول زيد بن ثابت...... ۹:۲۴۳، مستدرک حاکم: كتاب معرفة الصحابه ۳:۴۲۲۔ امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند صحیح اور شیخین کی شرائط کے مطابق ہے۔

سلمان رضی اللہ عنہ علم کا ایسا سمندر ہے جس کی تہہ تک نہیں پہنچا جا سکتا اور آسمان کے سائے تلے زمین کی دھرتی پر کوئی ایسا انسان نہیں جو ابو ذر رضی اللہ عنہ سے زیادہ صاف گو ہو۔

تابعین میں ائمہ تفسیر

علامہ ابن عطیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: حضرات تابعین میں زیادہ ماہرینِ تفسیر حسن بصری (۱)، مجاہد (۲)، سعید ابن جبیر (۳) اور علقمہ ہیں۔ مجاہد رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے اس طرح تفسیر سیکھی کہ ہر آیت پر ٹھہر کر اسے مکمل طور پر سمجھتے اور جب تک اس کی مکمل سمجھ نہ آ جاتی، آگے نہ بڑھتے۔ ان کے بعد عکرمہؒ (۴) اور ضحاکؒ (۵) کا مقام ہے۔

ضحاکؒ کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ملاقات نہیں ہوئی اور انہوں نے سعید بن جبیرؒ سے علم سیکھا۔ باقی جہاں تک سُدّی (۶) کا تعلق ہے تو عامر شعبیؒ ان پر اور صالح پر جرح کیا کرتے تھے کیوں کہ ان کے نزدیک وہ دونوں روایات کی مکمل تحقیق نہیں کرتے تھے۔

۱۔ شیخ الاسلام حسن بن ابی الحسن یسار بصریؒ (م ۱۱۰ھ) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے احاطہ میں پیدا ہوئے۔ بڑے فصیح اللسان مفسر قرآن تھے اور عراق کے تابعی مفسرین میں انہیں مقام صدارت حاصل تھا۔ دنیا کی شان و شوکت سے بے نیاز رہتے تھے۔ ان کی وفات بصرہ میں ہوئی۔ داؤدی: طبقات المفسرین ۱:۱۵۰

۲۔ ابو الحجاج مجاہد بن جبر مکیؒ (۱۰۳ھ) تفسیر و قراءت کے امام تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں پیدا ہوئے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت ام سلمہ، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم اور دیگر حضرات سے کسب فیض کیا۔ مکہ مکرمہ میں ۸۳ برس کی عمر میں ان کی وفات ہوئی۔ طبقات المفسرین: ۱:۲۹۲

۳۔ سعید بن جُبیرؒ بنو اسد کے آزاد کردہ غلام تھے۔ روایت حدیث میں ثقہ اور تیسرے طبقہ کے فقہاء میں شمار ہوتے ہیں۔ پچاس برس کی عمر مکمل نہ کی تھی کہ ۹۵ھ میں حجاج بن یوسف کے دربار میں قتل کیے گئے۔ تقریب التھذیب ۱:۲۹۲

۴۔ ابو عبد اللہ عکرمہ بن عبد اللہ بربریؒ مدنی (م۱۰۴ھ) حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہوں نے ام المؤمنین حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم سے کسب فیض کیا۔ حدیث کے راوی اور تفسیر کے عالم تھے۔ داؤدی کہتے ہیں: ان پر نہ تو جھوٹ کا الزام درست ہے اور نہ ہی بدعت کا ثبوت ملتا ہے۔ طبقات المفسرین ۱:۳۸۶ـ۱۴۳

۵۔ ابو القاسم یا ابو محمد ضحاک بن مزاحم خراسانیؒ (م بعد ۱۰۰ھ) صدوق ہیں اور ان سے مراسیل بکثرت منقول ہیں۔ التقریب ۱:۲۸۰

۶۔ یہاں سدی صغیر مراد ہیں جن کا نام ابو محمد اسماعیل بن عبد الرحمٰن بن ابی کریمہ الکوفی (م۹۷ھ) ہے۔ صدوق تھے اور وہم کا شکار ہو جاتے تھے۔ ان کا شمار چوتھے طبقہ میں ہوتا ہے اور ان پر تشیع کا الزام بھی ہے۔ التقریب ۱:۱۰۸

مؤلف کا تبصرہ

یحییٰ بن معینؒ[1] کہتے ہیں: کلبی کی کوئی حیثیت نہیں اور یحییٰ بن سعید القطان[2] سے منقول ہے، انہوں نے سفیان سے نقل کیا ہے، کہتے ہیں، کلبی کہا کرتے تھے، ابو صالح نے ایک مرتبہ مجھے کہا میں نے تمہیں جتنی روایات سنائی ہیں سب جھوٹی ہیں۔ حبیب بن ابی ثابت کہتے ہیں ہم نے ام ھانی کے غلام ابو صالح کا نام ''دَروغ زَنْ'' رکھا ہوا تھا۔ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور اس کا معنی جھوٹا ہے۔

زمانۂ تابعین کے بعد تفسیر

ان حضرات کے بعد تفسیر قرآن مجید کی ذمہ داری ان کے قابل اعتماد جانشینوں نے سنبھالی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی منقول ہے:

[۸۰] يَحْمِلُ هَذا العِلْمَ مِن كُلِّ خَلَفٍ عَدُولُهُ، يَنْفُونَ عَنْهُ تَحريفَ الغَالِينَ وانتِحَالَ المُبْطِلِينَ و تَأوِيلَ الجَاهلين۔

اس علم کو ہر عالم کے معتبر جانشین حاصل کرتے رہیں گے جو کہ مبالغہ آمیزوں کی تحریف و تبدیل، اہل باطل کی من گھڑت باتوں اور جاہلوں کی تاویلات سے اس کا دفاع کریں گے۔ اس حدیث کو ابوعمرو (ابن عبدالبرؒ) اور دیگر حضرات نے نقل کیا ہے۔

---

[۸۰] سنن بیہقی: كتاب الشهادات ،باب الرجل من أهل الفقه يسال الرجل من أهل الحديث ...... ۱۵: ۲۹۶، الجرح والتعديل، باب في عدول حاملي العلم أنهم ينفون رنه التحريف والإنتحال ۲: ۱۷، کامل ابن عدی: تعارف امام احمد بن حنبلؒ ۱: ۲۱۰، ثقات ابن حبان: تعارف ابراہیم بن عبدالرحمٰن العذری ۴: ۱۰، شوکانیؒ نے ارشاد الفحول في علم الأصول ،فصل في العدالة میں حافظ ابن عبدالبرؒ کے حوالہ سے اس حدیث پر جرح، ارسال، ضعف اور تفرد کے اقوال نقل کر کے امام احمد بن حنبلؒ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا کہ اس کی عبارت من گھڑت معلوم ہوتی ہے تو امام صاحب نے فرمایا: ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ صحیح ہے اور میں نے اسے کئی لوگوں سے سنا ہے۔ اس کے بعد ابن صلاح کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت امام رحمہ اللہ کے اس ارشاد میں تسامح ہے جو زیادہ پسندیدہ نہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ البداية والنهاية ،ذكر ثناء الأمة على الإمام احمد بن حنبل میں کہتے ہیں کہ یہ روایت مرسل اور ضعیف ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ ابن عبد البرؒ نے اسے صحیح کہا ہے۔

۱۔ یحییٰ بن مُعین بن عون غطفانی (م۲۳۳ھ) مشہور حافظِ حدیث، ثقہ اور جرح و تعدیل کے امام تھے۔ مدینہ منورہ میں ستر سال سے زائد عمر کے بعد وفات پائی۔ التقریب ۲: ۳۵۸

۲۔ ابوسعید یحییٰ بن سعید بن فروخ التمیمی البصری القطانؒ (م ۹۸ھ) ثقہ اور حافظ الحدیث تابعی تھے۔ التقریب ۲: ۳۴۸

ابوبکر احمد بن علی البغدادیؒ الخطیب کہتے ہیں: یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تصدیق ہے کہ یہ حضرات دینی رہنما اور مسلمانوں کے پیشوا ہیں کیوں کہ وہی شریعت کو تحریف سے بچاتے، من گھڑت باتوں کے شامل ہونے سے اسے محفوظ رکھتے اور جاہل بے وقوفوں کی تاویلات سے اس کا دفاع کرتے ہیں۔ اس حدیث پاک سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ شرعی امور میں ان سے رہنمائی لینا اور دینی معاملات میں ان پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔

کتبِ تفسیر

علامہ ابن عطیہؒ فرماتے ہیں: اس موضوع پر علماء نے کتابیں بھی تصنیف کیں جن میں عبدالرزاق صنعانی، مفضل، علی بن ابی طلحہ اور بخاری وغیرہ شامل ہیں۔ پھر محمد بن جریر طبری رحمہ اللہ نے لوگوں کی سہولت کے لیے مختلف تفاسیر کو یکجا کر دیا اور جو علم لوگوں کی دسترس سے باہر تھا اس کو قریب کر دیا اور تفسیری اقوال کو سند کے ساتھ نقل کرنے کا خوب اہتمام کیا۔

متاخرین میں سے جن حضرات نے اس فن میں شہرت پائی ان میں ابو اسحاق زجاج اور ابوعلی الفارسی کے نام قابل ذکر ہیں۔ جہاں تک ابوبکر النقاش اور ابوجعفر النحاس کا تعلق ہے تو علماء نے ان کی تفاسیر پر کافی اظہار خیال کیا ہے۔ پھر ان کے بعد مکی بن ابی طالبؒ بھی ان دونوں حضرات کے نقش قدم پر چلے اور ابوالعباس المہدوی نے تو ماہر تالیف کا لقب پایا۔ ان سب حضرات نے بہت محنت فرمائی۔ جس کا اجر ان کو ضرور ملے گا۔ اللہ ان پر مہربان ہو اور ان کے چہروں کو تروتازہ فرمائے۔

☆☆☆☆☆

باب: ۱۰

تفسیرِ قرآنِ مجید بذریعہ سنت

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾ [النحل ۱۶:۴۴] (اور ہم نے آپ پر بھی یہ نصیحت نامہ اتارا تاکہ آپ لوگوں پر ظاہر کر دیں جو کچھ ان کے پاس بھیجا گیا ہے)۔ نیز فرمایا:﴿فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ [النور ۲۴:۶۳] (ان لوگوں کو جو اللہ کے حکم کی مخالفت کر رہے ہیں ڈرنا چاہیے کہ کہیں ان پر (دنیا میں ہی) کوئی آفت نازل ہو جائے یا انہیں کوئی دردناک عذاب آ پکڑے)۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ﴾ [الشوریٰ ۴۲:۵۲] (اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ راہ راست ہی کی ہدایت کر رہے ہیں)۔

نیز متعدد آیات میں باری تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت فرض قرار دی ہے اور اسے اپنی اطاعت کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ [الحشر ۵۹:۷] (اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ تمہیں دے دیا کریں وہ لے لیا کرو اور جس سے وہ تمہیں روک دیں رُک جایا کرو)۔

حافظ ابن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب جامع العلم و فضلہ میں لکھا ہے کہ عبدالرحمٰن بن یزیدؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ احرام کی حالت میں کپڑے پہنے ہوئے تھا، آپ نے اسے اس فعل سے منع فرمایا تو وہ کہنے لگا: مجھے قرآن کی کوئی آیت بتا دیجئے جس سے احرام کی حالت میں کپڑے پہننے کی ممانعت ثابت ہوتی ہو چناں چہ آپ نے یہی ارشاد باری تعالیٰ سے سنا دیا: ﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾۔

ہشام بن حُجیر سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ طاؤسؒ عصر کی نماز کے بعد دو رکعت نفل پڑھا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو پتہ چلا تو انہیں یہ عادت چھوڑنے کو فرمایا۔ طاؤس کہنے لگے: ان سے صرف اس لیے روکا گیا ہے کہ ان کی مستقل عادت نہ بنا لی جائے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عصر کے بعد کوئی نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ جو دو رکعت تم پڑھتے ہو ان پر تمہیں عذاب ہوگا یا ثواب ملے گا۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾[الاحزاب ۳۳:۳۶](اور کسی مومن یا مومنہ کے

لیے یہ درست نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی امر کا حکم دیں تو پھر ان کو اپنے اس امر میں کوئی اختیار باقی رہ جائے)۔ امام ابو داؤدؒ نے حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

[۸۱] ألا وإني قد أوتيت الكتاب ومثلَهُ معَهُ ألا يُوشِكُ رَجلٌ شبعَان علىَ أرِيكَتِهِ يَقولُ عليكُم بِهذَا القرآن فمَا وَجدتُم فِيهِ مِن حلالٍ فَأحِلُّوهُ ومَا وَجدتُم فِيهِ مِنْ حَرامٍ فَحَرِّمُوهُ، ألا لايَحِلُّ لكُمُ الحِمارُ الأهْلِيُّ وَلا كُلُّ ذِي نَابٍ مِنَ السِّبَاعِ وَلا لَقطَةُ مُعَاهِدٍ إلَّا أن يَسْتَغْنِيَ عَنهَا صَاحِبُهَا، وَمَن نَزَلَ بِقَومٍ فَعلَيهِمْ أن يَقْرُوهُ فَإن لَمْ يَقْرُوهُ فَلَهُ أن يُعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِرَاهُ۔

سنو! مجھے کتاب اللہ کے ساتھ ساتھ اسی کے برابر مزید علم دیا گیا ہے۔ خبردار رہو! عنقریب ایک آسودہ حال شخص ایسا ہوگا جو اپنے خوبصورت تخت پر بیٹھ کر یہ کہا کرے گا: اسی قرآن کو اپنا لو، اس میں جو چیز حلال ملے اسے حلال سمجھو اور جو حرام نظر آئے اسے حرام جانو۔ خبردار! تمہارے لئے نہ تو پالتو گدھا حلال ہے نہ کچلی کے دانتوں والے درندے اور نہ ہی کسی حلیف کی گری ہوئی چیز، ہاں اگر وہ خود اسے لینے سے انکار کر دے تو دوسری بات ہے۔ جو شخص کسی کا مہمان بنے انہیں چاہیے کہ اس کی مہمان نوازی کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اسے اختیار ہے کہ اپنی مہمانی کے برابر ان سے وصول کر لے۔

مطالبِ حدیث

علامہ خطابیؒ فرماتے ہیں: ارشاد نبوی "أُوتِيتُ الكتابَ و مثلَه معَه" (مجھے کتاب اللہ کے ساتھ اسی کے برابر مزید علم دیا گیا ہے) کا معنی دو طرح سے سمجھا جا سکتا ہے: ایک یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ظاہری وحی کے ساتھ ساتھ باطنی وحی بھی دی گئی جسے وحی غیر متلو کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی متلو (قرآن مجید) عطا کی گئی، پھر اس کے ساتھ اسی شان کی تفسیر و بیان کا ملکہ عطا فرمایا گیا، یعنی باری تعالیٰ کے دربار عالی سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اجازت دی گئی کہ قرآن کریم میں نازل کی گئی تعلیمات کی وضاحت کیا کریں۔ اس کے عام میں تخصیص اور خاص میں تعمیم کریں، جہاں کسی حکم میں اضافہ کی ضرورت ہو اضافہ کریں اور جہاں ضرورت ہو کسی چیز کا خود حکم بیان فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ ان احکام اور تعلیمات پر عمل اور ان کو قبول کرنا اسی طرح واجب ہے جس طرح ظاہری طور پر پڑھے جانے والے قرآن مجید پر۔

[۸۱] سنن ابو داؤد: كتاب السنّة، باب لزوم السنّة ۴:۲۰۰،مسند احمد: حديث المقدام بن معديكرب الكندي أبي كريمة رضىَ الله عنه ۵:۱۱۵،سنن بیہقی: كتاب الضحايا،باب ماجاء في أكل لحوم الحمر الأهلية ۲۲:۱۴

ارشاد گرامی: "يُوشِكُ رجُلٌ شَبْعَانٌ" (قریب ہے کہ ایک پیٹ بھرا آدمی) میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی سنتوں کی خلاف ورزی پر تنبیہ فرمائی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود جاری فرمائی ہیں اور قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ملتا جیسا کہ فرقہ خوارج کے لوگ اور روافض کرتے ہیں۔ یہ لوگ صرف قرآن کا ظاہر لیتے ہیں اور سنّت چھوڑ دیتے ہیں جس سے نص قرآنی کی وضاحت اور اس کا معنی متعین ہوتا ہے۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں: یہ لوگ تذبذب کا شکار ہو کر صحیح فیصلہ نہ کر پائے اور گمراہ ہوگئے۔ فرماتے ہیں: "أرِيكه" کا جو لفظ یہاں استعمال ہوا ہے اس کا معنی تخت ہے۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ تخت کو اس وقت تک "اریکہ" نہیں کہہ سکتے جب تک وہ دلہن کے لیے سجائے گئے کمرے کے اندر نہ رکھا ہوا ہو۔ پھر فرمایا: یہاں تخت پر بیٹھے پیٹ بھرے شخص کا ذکر کر کے نعمتوں کے پلے ایسے آرام پسند اور آسودہ حال لوگ مراد لیے گئے ہیں جو اپنے گھروں میں بیٹھے رہتے ہیں اور علم کے اصل مراکز سے اسے حاصل کرنے نہیں جاتے۔ اور ارشاد گرامی: "إلاّ أن يَسْتَغْنِي عَنها صاحبها" (ہاں اگر اس کا مالک اس سے مستغنی ہو جائے) کا مطلب یہ ہے کہ اس چیز کا مالک اس کی ضرورت نہ محسوس کرتے ہوئے اسی شخص کو دے دے جس کو پڑی ہوئی ملی تھی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا، وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ﴾ [التغابن ۶۴: ۶] غرض انہوں نے کفر کیا اور اعراض کیا، اور اللہ نے ان کی کچھ پروا نہ کی۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی پروا نہ کرتے ہوئے انہیں چھوڑ دیا۔ اور جہاں تک ارشاد نبوی: "فَلَهُ أن يُعْقِبَهُمْ بِمِثْلِ قِراه" (اسے اختیار ہے کہ اپنی مہمانی کے برابر ان سے وصول کر لے) کا تعلق ہے تو یہ ایسے مجبور شخص کے بارے میں ہے جسے کھانے کے لیے کچھ نہ مل رہا ہو اور خطرہ ہو کہ اگر کچھ نہ کھایا تو مر جائے گا۔ ایسے شخص کو اختیار ہے کہ اگر وہ لوگ اسے کھانا نہ دیں تو اتنا ان سے زبردستی وصول کر لے جس سے اس کا گزارہ ہو جائے اور ان کو نہ دینے کی سزا بھی مل جائے۔ اس میں لفظ "يعقبهم" استعمال ہوا ہے یہ شد کے ساتھ (يُعَقِّبَهُمْ) اور بغیر شد "مُعاقَبَة" (باب مفاعلہ سے "يُعاقِبَهُمْ") دونوں طرح آتا ہے۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ﴾ [النحل ۱۶: ۱۲۶] آیا ہے۔ یعنی جب تمہیں غلبہ حاصل ہو جائے اور مال غنیمت بھی مل جائے۔ اسی طرح حدیث میں اس لفظ کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کو اختیار ہے کہ اپنی مہمانی کے برابر کھانا اُن سے غنیمت کی طرح لے لے۔

حجیتِ حدیث

اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہمیشہ حدیث کی قرآن سے توثیق ضروری نہیں ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ کوئی چیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے تو وہ بذات خود حجت ہوتی ہے۔ جو روایت بعض حضرات نے نقل کی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۸۲] إذَا جاءَ كُمُ الْحَدِيثُ فَاعرِ ضُوهُ عَلى كِتابِ اللّٰهِ، فإنْ وَافقَهٗ فَخُذوهُ، وإن لَمْ يُوَافِقهُ فَرُدّوهُ۔

جب تمہارے پاس کوئی حدیث آئے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو۔ اگر اس کے مطابق ہوتو لے لو اور اگر وہاں سے اس کی تصدیق نہ ہوتو رد کر دو۔

یہ روایت جھوٹی ہے اور اس کا کوئی ثبوت نہیں۔

تفسیر و بیان کی قسمیں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے بیان اور تفسیر کا جو کام سونپا گیا وہ دو طرح کا ہے:

۱۔ **قرآن کے اجمال کی تفسیر:** کتاب اللہ میں جو چیزیں اجمالاً ذکر ہوئی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تفصیل بیان فرمائی ہے جیسے پانچ نمازوں کی وضاحت، ان کے اوقات، رکوع سجود اور دیگر احکام کی تفصیل۔ زکوٰۃ کی مقدار، ادائیگی کے اوقات اور جو چیزیں بطور زکوٰۃ دی جا سکتی ہیں ان کی تفصیل اور اسی طرح مناسکِ حج کی تفصیلات کا بیان۔ جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر حاضرین کو ارشاد فرمایا:

[۸۳] خُذُواعنّي مَناسِكَكُم۔ حج کے احکام مجھ سے سیکھ لو۔

---

[۸۲] یہ حدیث ضعیف اسناد کے ساتھ حضرت علی، حضرت ابن عمر، حضرت ثوبان اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت جسے امام دارقطنی نے نقل کیا ہے میں جبارہ بن مغلس ضعیف اور مضطرب الحدیث ہے۔ذہبیؒ :المغنی علی الدار قطنی ۲۰۸:۴۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت جسے طبرانی نے المعجم الکبیر میں نقل کیا ہے میں ابو حاضر عبدالملک بن عبدربہ منکر الحدیث ہے۔حوالہ بالا ۵۷۵:۱، حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت میں جسے طبرانیؒ نے نقل کیا ہے یزید بن ربیعہ منکر الحدیث ہیں اور امام نسائیؒ نے انہیں متروک کہاہے۔حوالہ بالا۴۱۹:۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت جسے علامہ ہروی نے ذم الکلام میں ذکر کیا ہے ،اس میں صالح بن موسی متروک ہیں۔ یہ امام نسائیؒ کا قول ہے اورحافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: ضعیف ہے۔ایضا ۴۳۶:۱۔ ان کے علاوہ امام شافعیؒ، حافظ ابن عبد البر، بیہقیؒ اور خطابیؒ سب نے اسے باطل کہا ہے اور عبدالرحمٰن بن مہدی سے منقول ہے کہ زنادقہ اور خوارج نے یہ حدیث گھڑی ہے۔ ابن عبدالبر: جامع بیان العلم و فضلہ ص ۵۶۲۔ الابتہاج بتخریج احادیث المنہاج ص ۱۰۴-۱۰۶،ابن جوزیؒ نے :الموضوعات ۱ :۲۵۷۔ ۲۵۸ میں اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کر کے یحیی بن معین کاقول ذکرکیاہے کہ یہ حدیث زنادقہ نے گھڑی ہے ۔خطابی کہتے ہیں یہ روایت باطل ہے اور اس کی کوئی اصل نہیں۔

[۸۳] صحیح مسلم: کتاب الحج، باب استحباب رمی جمرة العقبة یوم النحرراكباً و بیان قوله صلى الله عليه وسلم لِتاخُذُوا مَناسِكَكُم" ۲:۴۹۳۔مسند احمد :مسند جابر بن عبد الله رضى الله عنه ۴:۳۴۳، ۲۸۳،سنن ابن ماجہ: کتاب المناسک ، باب الوقوف بجمع ۱۰۰۶:۲،سنن ابوداؤد: کتاب المناسک، باب رمي الجمار۲۰۱:۲،سنن بیہقی: کتاب الحج ، باب وقت الوقوف لإدراک الحج ۲۵۲:۷۔تمام روایات میں الفاظ کا تھوڑا بہت اختلاف ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کے بارے میں ارشاد فرمایا:

[۸۴] صَلُّوا كَمَا رأَيْتُمُونِي أُصَلِّي۔

ایسے نماز پڑھو جیسے مجھے پڑھتے دیکھتے ہو۔اسے امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

ابن مبارکؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمران بن حُصین رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو یہی بات سمجھاتے ہوئے فرمایا: تم بڑے بے وقوف آدمی ہو۔ کیا کتاب اللہ میں تمہیں ظہر کی چار رکعات کا ذکر ملتا ہے یا یہ بات کہیں ملتی ہے کہ ظہر کی قراءت بلند آواز سے نہ کی جائے؟ پھر نماز، زکوۃ اور اسی طرح دیگر امور کا ذکر کر کے فرمایا: کیا یہ تمام چیزیں کتاب اللہ میں پوری تفصیل سے ملتی ہیں؟ کتاب اللہ نے تو ان کو اجمالاً بیان فرمایا ہے اور اس اجمال کی تفصیل سنت بیان کرتی ہے۔

امام اوزاعیؒ[۱] نے حسان بن عطیہ[۲] سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی اور اسی طرح جبریل علیہ السلام حاضر ہو کر سنت کی باتیں بتاتے تھے جن سے وحی کی تفسیر ہوتی تھی۔

سعید بن منصور[۳] کہتے ہیں: ہمیں عیسیٰ بن یونس نے بتایا، انہوں نے اوزاعیؒ سے اور اوزاعیؒ نے مکحولؒ سے نقل کیا وہ کہتے ہیں: قرآن کو سنّت کی اس سے زیادہ ضرورت ہے جتنی کہ سنّت کو قرآن کی ضرورت ہے۔
امام اوزاعیؒ کہتے ہیں: یحییٰ بن ابی کثیر فرمایا کرتے تھے: کتاب اللہ کے احکام سنّت سے منسوخ ہو جاتے ہیں مگر کتاب اللہ سنت کو منسوخ نہیں کرتی۔ فضل بن زیاد کہتے ہیں: امام ابوعبداللہ احمد بن حنبلؒ سے اس روایت کے بارے میں پوچھا گیا تو میں نے انہیں یوں فرماتے سنا: میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا البتہ یہ کہتا ہوں کہ سنت کتاب اللہ کی تفسیر اور وضاحت کرتی ہے۔

---

[۸۴] صحیح بخاری: كتاب الأذان، باب الأذان للمسافرين إذا كانوا جماعة ...... ۲۲۶:۱، كتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم ۲۲۳۸:۵، كتاب التمني، باب ماجاء في إجازه خبر الواحد الصدوق ...... ۲۶۴۷:۶، سنن دارمی: كتاب الصلاة، باب من أحق بالإمامة ۳۰۳:۱، صحیح ابن حبان: كتاب الصلاة، باب الأذان ۵۴۱:۴، صحیح ابن خزیمہ: كتاب الصلاة، باب ذكر الخبر المفسر ......۲۰۶:۱، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب من سها فترک رُكناً ۳۰۱:۳

۱۔ شیخ الاسلام ابوعمرو عبدالرحمٰن بن عمرو الاوزاعی (م ۱۵۷ھ) فقیہ، ثقہ اور تبع تابعین کے عظیم المرتبت علماء میں سے تھے۔تقریب ۱:۳۴۷

۲۔ امام ابوبکر حسان بن عطیہ المحاربی الدمشقی (م ۱۲۰ھ) بڑے عابد فقیہ، ثقہ اور کبار تابعین میں سے تھے۔تقریب ۱:۱۵۸

۳۔ مؤلف سنن حافظ حدیث سعید بن منصور الخراسانی (م تقریباً ۲۲۷ھ) مکہ مکرمہ کے رہائشی تھے۔شمس الدین ذہبی: الکاشف، تعارف سعید بن منصور ۱:۴۷۳

۲. قرآن کے حکم میں کسی چیز کا اضافہ: تفسیر ر بیان کی دوسری صورت یہ ہے کہ سنت کے ذریعے کتاب اللہ کے کسی حکم میں اضافہ کیا جائے، جیسا کہ پھوپھی یا خالہ کی موجودگی میں اس کے شوہر سے بھتیجی یا بھانجی کا نکاح حرام ہونا[۸۵]، پالتو گدھے[۸۶] اور کچلی کے دانتوں والے درندوں کا حرام ہونا[۸۷]، گواہ کی گواہی کے ساتھ قسم لے کر فیصلہ کرنا[۸۸] اور اس طرح کے دیگر امور جن کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

☆☆☆☆☆

[۸۵] صحیح بخاری: کتاب النکاح، باب لاتُنکح المرأۃ علی عمتھا ۴۴۵:۳ ،صحیح مسلم: کتاب النکاح، باب تحریم الجمع بین المراۃ و عمتھا أ خالتھا فی النکاح ۱۰۲۸:۲

[۸۶] پالتو گدھے کی حرمت والی حدیث صحیح بخاری: کتاب الذبائح والصید، باب لحوم الحُمر الانسیۃ ۳۱۳:۳ ،صحیح مسلم: کتاب الصید والذبائح، باب تحریم لحم الحُمر الإنسیۃ ۱۵۳۷:۳میں ہے۔

[۸۷] کچلی کے دانتوں والے پرندے کی حرمت والی مسلم :کتاب الصید والذبائح، باب تحریم کل ذی ناب من السباع و کل ذی مخلب من الطیر ۱۵۳۴:۳ میں منقول ہے۔

[۸۸] صحیح مسلم: کتاب الأقضیۃ، باب القضاء بالیمین والشاھد ۱۳۳۷:۳ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ، مؤطاامام مالک: ۷۲۱:۲، مسند أحمد: ۲۴۸:۱، ۳۱۵، ۳۲۳

باب : ۱۱

کتاب وسنت کی تعلیم کا طریقہ اور سلف کی خصوصیات

علم وعمل دونوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ابو عمر والدانی[1] نے اپنی کتاب ''البیان'' میں اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمان، حضرت ابن مسعود اور حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہم اجمعین سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دس آیات پڑھایا کرتے تھے اور وہ دوسری دس آیات اس وقت تک شروع نہ کرتے جب تک پہلی آیات پر مکمل طور پر عمل کرنا نہ سیکھ لیتے۔ وہ حضرات فرماتے ہیں کہ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں قرآن مجید اور اس پر عمل ایک ساتھ سکھاتے تھے[2]۔

عبد الرزاق نے معمر بن عطاء بن سائب سے نقل کیا ہے، وہ ابو عبد الرحمٰن السُّلمی[3] سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا:

[۸۹] كُنَّا إذا تَعَلَّمْنَا عَشْرَ آياتٍ مِنَ القُرآنِ لَمْ نَتَعلَّم العَشْرَ التِي بَعدَهَا حتّى نَعرِفَ حَلاَلَهَا وحَرامَهَا وَأمْرَها ونَهْيَهَا۔

ہمارا حال یہ تھا کہ جب قرآن مجید کی دس آیات سیکھ لیتے تو اس کے بعد والی دس کو اس وقت تک نہ سیکھتے جب تک پہلی آیات میں بیان کئے گئے حلال، حرام اور امر و نہی سب کچھ معلوم نہ کر لیتے۔

---

[۸۹] مصنف عبد الرزاق: كتاب فضائل القرآن، باب تعليم القرآن و فضله ۳:۳۸۰، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب البيان أنه إنما قيل يؤمهم...... ۴:۲۹۵، شعب الإيمان، التاسع عشر......، فصل في تعاليم القرآن ۲:۳۳۰

۱۔ أبو عمر عثمان بن سعید الدانی الأموی القرطبی (م ۴۴۴ھ) ابن الصیرفی کے نام سے مشہور تھے، مشرق ومغرب میں ان کے علم و روایت کا لوہا مانا جاتا تھا۔ علوم قرآن اور خصوصاً اس کی روایات، تفسیر، معانی اور اعراب میں اپنے وقت کے امام تھے قراءت میں ان کی کتابیں بہت مشہور ہیں۔ اعلام زرکلی ۴:۲۰۶

۲۔ ابو عمر الدانی کی سند مجھے نہیں مل سکی علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اسے بروایت أعمش عن أبي وائل عن ابن مسعود رضي الله عنه نقل کیا ہے مگر اس میں ''كان الرجل منّا إذا تعلّم'' (ہم میں سے جب کوئی شخص سیکھتا) کے الفاظ ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر نہیں اور غالباً یہی روایت زیادہ صحیح ہے۔

۳۔ ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ بن حبیب بن ربیعہ السُّلمی الکوفي (م ۷۰ھ) مشہور قاری اور تابعی ہیں۔ یہ اپنی کنیت سے مشہور تھے آپ کے والد گرامی صحابی تھے۔ تصوف کے باب میں جو سُلمی مشہور ہیں وہ ان کے بعد کے ہیں۔ تقریب ۱: ۲۹۹

[۹۰] امام مالکؒ "موطا میں فرماتے ہیں: مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ سیکھتے سیکھتے آٹھ سال گزار دیئے۔

حافظ ابو بکر احمد بن علی بن ثابت (۱) نے اپنی کتاب "أسماء مَن روَى عَن مالک" میں ابو بلال مرداس بن محمد الأشعری سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: ہمیں امام مالک نے بتایا، انہوں نے بروایت نافع حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرہ بارہ برس میں سیکھی اور جب وہ ختم ہوئی تو انہوں نے کئی اونٹ ذبح کیے۔

عمل کے ماحول کا اثر

ابو بکر الأنباریؒ کہتے ہیں: مجھ سے محمد بن شہر یار نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں ہمیں حُسین بن اَسود نے بتایا، ان سے عبید اللہ بن موسیٰ نے ذکر کیا، انہوں نے اَبوعمر و زیادہ بن مسلم سے، اور انہوں نے زیادہ بن مخراق سے روایت کی، وہ کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

إنّا صَعُبَ عَلينَا حِفظُ اَلفاظِ القُرآنِ، وسَهُلَ عَلينَا العَمَلُ بِهِ، وَإنَّ مَن بَعْدَنَا يَسْهُلُ عَليهِمْ حِفظُ القُرآنِ ويَصعُبُ عليهِمُ العَمَلُ به۔

ہمارے لئے قرآن مجید کے الفاظ کو یاد کرنا مشکل اور اس پر عمل کرنا آسان بنا دیا گیا ہے، جب کہ ہم سے بعد والوں کے لئے قرآن مجید یاد کرنا آسان ہوگا اور اس پر عمل کرنا مشکل۔

ابراہیم بن موسیٰ بیان کرتے ہیں کہ ہمیں یوسف بن موسیٰ نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہمیں فضل بن دُکین نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہم سے اسماعیل بن ابراہیم بن مہاجب نے ذکر کیا، انہوں اپنے والد گرامی سے، انہوں نے مجاہدؒ سے اور مجاہد نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی، فرماتے ہیں:

كانَ الفاضِلُ مِنْ أصحابِ رسولِ اللّٰه صَلَّى اللّٰه عليه وَسلَّمَ فِي صدرِ هذهِ الأمّةِ لا يَحفَظُ مِنَ القُرآنِ إلّا السورةَ أو نَحوَهاَ وُرزِقوا العَمَل بِالقُرآنِ، وإنَّ آخِرَ هذهِ الأمّةِ يَقرؤونَ القُرآنَ منهُم الصَّبِيُّ وَالأعمَى وَلايُرزَقُونَ العملَ به۔

اس امت کے ابتدائی دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے بہت سے

[۹۰] موطا امام مالکؒ: کتاب القرآن، باب ماجاء في القرآن ۱:۲۰۵

۱۔ یہاں ابو بکر احمد بن علی سے مراد خطیب بغدادی (م ۴۶۳ھ) ہیں۔

حضرات کو اگرچہ قرآن مجید کی ایک ایک سورت یا اس کے برابر ہی یاد تھا مگر ان کو پورے قرآن پر عمل کی توفیق حاصل تھی۔ جب کہ اس امت کے آخری دور میں بچوں اور نابیناؤں سمیت لوگ قرآن تو پڑھیں گے مگر ان کو اس پر عمل کی توفیق نہ ہوگی۔

حصولِ علم میں تدریج اور عمل کی اہمیت

مجھےابو محمد حسن بن عبد الوہاب بن ابی العنبر نے بتایا، وہ کہتے ہیں: ہم سے ابو بکر بن حماد المُقری نے ذکر کیا، وہ کہتے ہیں میں نے خلف بن هشام البزاز کو یہ کہتے سنا: میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ قرآن مجید ہمارے پاس عارضی طور پر ہی موجود ہے کیوں کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقرۃ حفظ کرنے میں دس سال سے زیادہ عرصہ لگایا اور جب اس کی تکمیل ہوئی تو شکرانے کے طور پر انہوں نے کئی اونٹ ذبح کئے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ایک بچہ میرے سامنے بیٹھ کر قرآن مجید پڑھنا شروع کرتا ہے اور اسی نشست میں ایک تہائی ختم کر کے دم لیتا ہے جس میں اس سے ایک حرف کی غلطی بھی نہیں ہوتی۔

علماءِ حدیث فرماتے ہیں: طالب حدیث کو چاہئے کہ حدیث کو صرف سننے اور لکھ لینے پر اکتفاء نہ کرے بلکہ اس کی پہچان بھی حاصل کرے اور اس کے معانی بھی سمجھے۔ اگر وہ تحقیق اور سمجھے بغیر اسے لکھ لیتا ہے تو یوں سمجھے کہ اس نے خواہ مخواہ تکلیف کی اور کوئی فائدہ بھی نہ اٹھایا۔ حدیث یاد کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دنوں اور راتوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے اسے بتدریج ذہن نشین کیا جائے۔ اس سلسلہ میں جن حضرات کے اقوال منقول ہیں ان میں شعبہ، ابن عُلَیّہ اور مَعْمَرؒ بھی ہیں۔ مَعمر کہتے ہیں، میں نے زہریؒ(۱) کو یوں کہتے سنا: جو شخص علم کو یکبارگی حاصل کرتا ہے اس کے ذہن سے وہ اسی طرح اکٹھا ہی نکل جاتا ہے۔ علم کا صحیح اِدراک تو اس وقت ہوتا ہے جب اسے ایک ایک دو دو حدیثیں کر کے حاصل کیا جائے۔ واللہ اعلم۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[۹۱] اعلمُوا مَا شِئتُم أنْ تَعَلَمُوا فَلَن يأجركم اللّٰه بعِلمِه حتّى تعملُوا۔

جتنا علم چاہو حاصل کر لو مگر یہ یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا اجر اس وقت تک نہیں دیں گے جب تک عمل نہیں کرو گے۔

---

[۹۱] سنن دارمی: أبواب متفرقة فی صفات النبی و فی العلم و نحوها، باب العمل بالعلم و حسن النية فیه ۱:۸۶ میں الفاظ ''اعملوا ما شِئتُمْ بَعدَ أنْ تعلمُوا، فلن يأجركم اللّٰه بالعلم حتى تعملوا'' ہیں اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

۱۔ مشہور تابعی اور حدیث وفقہ کے علامہ محمد بن مسلم بن شہاب زہری (م۱۲۴ھ)۔ التقریب ۱:۵۰۶

حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بروایت عباد بن عبد الصمد اسی طرح کے الفاظ منقول ہیں۔ اس میں مزید یہ ارشاد بھی ہے:

أنَّ العُلَمَاءَ هِمّتُهُم الدّرايَةُ، وأنَّ السُّفَهاءَ هِمّتُهُم الرّوايةُ[1]

علماء کی اصل توجہ حدیث کے معانی کی گہرائی پر ہوتی ہے، جب کہ کم عقل لوگ احادیث کو نقل کرنے پر زیادہ زور دیتے ہیں۔

عباد بن عبد الصمد اور ان کی روایت پر بحث

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ والی یہ روایت موقوف ہے اور یہی مرفوع روایات کی نسبت زیادہ قابل اعتماد ہے کیوں کہ اس کے راوی عباد بن عبد الصمد اس پائے کے نہیں ہیں کہ ان کی روایت پر اعتماد کیا جائے[2]۔

علم کی فضیلت اور کتاب وسنّت کی عظمت کے بارے میں شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

إن العلومَ وإن جلّت محاسنُها فتاجُهَا مابهِ الإيمانُ قدوجبَا

هوالكتاب العزيز اللّٰهُ يحفَظهُ وبعد ذلك علمٌ فرّجَ الكُربَا

فذاكَ فاعلم حديثُ المصطفٰی فيه نورُ النبوة سنَّ الشرعَ والأدبَا

وَبعدَ هذا علومٌ لاانتهاءلهَا فَاخترْ لنَفسِكَ يامَنْ آثرَ الطّلَبَا

۱۔ یہاں درایت اور روایت دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ درایت بھی علم حدیث کا ایک شعبہ ہے جس میں قبول اور عدم قبول کے لحاظ سے راوی اور متن دونوں پر بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کے بانی قاضی ابو محمد رامہر مزی ہیں روایت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب روایات کی نقل وحفاظت کا نام ہے۔ یہ روایات خواہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے متعلق ہوں، اعمال کے متعلق ہوں، ان میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کسی کی تائیدات وتصدیقات بیان کی گئی ہیں یا وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کے بیان پر مشتمل ہوں۔ ضوء القمر شرح نخبة الفكر ص ۱۲

۲۔ حافظ ابن عبد البرؒ نے جامع بيان العلم و فضله ۸:۲ میں اسے پہلے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے موقوفاً نقل کیا پھر حضرت أنس رضی اللہ عنہ کی روایت سے مندرجہ بالا اضافے کے ساتھ مرفوعاً ذکر کر کے ان دونوں میں سے پہلی یعنی موقوف روایت کو صحیح شمار کیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ عباد بن عبد الصمد جو اسے حضرت أنس رضی اللہ عنہ سے نقل کر رہے ہیں وہ منکر الحدیث ہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی انہیں ضعیف کہا ہے۔ ابو حاتم وغیرہ دیگر حضرات فرماتے ہیں ''ضعيف جدًا'' (بہت ضعیف ہیں)۔ المغنی فی الضعفاء: ۳۶۵:۱

یَاأَیُّهَا الطالبُ ابحَثْ وَانظُرِ الْكُتُبَا والعِلمُ كنزٌ تَجِدُه في معادِنِه

كلُّ العُلومِ تَدَبَّرهُ تَرَ العَجَبَا وَاتلُ بِفَهمٍ كتابَ اللّٰهِ فيهِ أتَتْ

مَولاكَ مَاتَشتَهِي يَقْضِي لكَ الأَرَبَا وَاقرَأْ۔ هُدِيتَ۔حدِيثَ المُصطفَى وَسَلَنْ

إذَا تزَيَّدَ مِنهُ قَالَ وَأطرَبَا مَنْ ذَاقَ طَعمًا لِعِلمِ الدينِ سُرَّبه

علوم سارے ہی اگرچہ بہت خوبیوں والے ہیں مگر ان سب کا تاج وہ علم ہے جس پر ایمان لانا واجب ہے۔وہ کتاب عزیز ہے جس کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں اور اس کے بعد ایسا علم ہے جس نے مشکلات حل کر ڈالیں۔یہ بات سمجھ لو کہ وہ نبی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے جس میں وہ نور نبوت ہے جس نے شرعی احکام جاری کئے اور ادب سکھایا۔

اس کے بعد اتنے علوم ہیں جن کی انتہا نہیں۔ اس لئے اے وہ شخص جس نے علم کا راستہ اختیار کیا ہے خود دیکھ کر ان علوم میں سے اپنے لئے چن لو۔اور علم ایک خزانہ ہے جسے اس کے اصل مقام پر ہی پایا جا سکتا ہے۔ اس لئے اے علم کی تلاش کرنے والے! اسے خود تلاش کر اور کتابیں پڑھ۔اور اللہ کی کتاب کو سمجھ کر پڑھو۔ اسی میں تمام علوم آئے ہیں۔تم غور کرو تو عجائبات نظر آئیں گے۔اور اللہ تمہیں ہدایت دے، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بھی پڑھو اور جو تمہاری تمنا ہے اسے اپنے مالک سے مانگو وہ تمہاری حاجت پوری کر دے گا۔ جو شخص علم دین کا ذائقہ چکھ لیتا ہے اسے حاصل کر کے خوش ہو جاتا ہے اور جب اسے دل کھول کر بیان کرتا ہے تو سننے والے جھوم جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

باب: ۱۲

قرآنِ کریم کے سات حروف اور مروّجہ قراء ات

یہاں اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا مفہوم بیان کرنا مقصود ہے:

[۹۲] إنّ هذا القُرآنَ أُنزِلَ علَى سَبْعَةِ أحرُفٍ فاقْرَءُوا ماتيسَّرَ مِنهُ۔

یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے۔ ان میں سے جو تمہارے لئے آسان ہو اسی طریقہ سے پڑھ لو۔

امام مسلم نے حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بنو غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے کہ حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا:

[۹۳] إن اللّٰه يأمرك أن تقرأ أمتك القرآن على حرف، فقال: "أسأل اللّٰه معافاته ومغفرته، وإن أمتي لا تطيق ذلك"۔ ثم أتاه الثانية فقال: إن اللّٰه يأمرك أن تقرأ أمتك القرآن على حرفين، فقال: "أسأل اللّٰه معافاته ومغفرته، وإن أمتي لا تطيق ذلك"۔ ثم جاء ه الثالثة فقال: إن اللّٰه يأمرك أن تقرأ أمتك القرآن على ثلاثة أحرف، فقال: "أسأل اللّٰه معافاته ومغفرته وإن أمتي لا تطيق ذلك"۔ثم جاء ه الرابعة فقال: إن اللّٰه يأمرك أن تقرأ أمتك القرآن على سبعة أحرف فأيما حرف قرء وا عليه أصابوا۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو قرآن مجید ایک طرح کے الفاظ کے ساتھ

[۹۲] اس موضوع پر ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ بہت سی احادیث منقول ہیں۔صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب أنزل القرآن على سبعة أحرف ۲۲۶:۳،صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين، باب بيان أن القرآن على سبعة أحرف و بيان معناه ۵۶۰:۱، سنن نسائی : كتاب الإفتتاح ، باب جامع ماجاء في القرآن ۱۵۲:۲ وغیرہ

[۹۳] صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين، باب بيان أن القرآن على سبعة أحرف و بيان معناه ۵۶۲:۱،مسنداحمد: حديث عبدالرحمن بن ابی لیلی عن أبيّ بن كعب رضي الله عنه ۱۵۱:۶، ۱۵۲،سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب وجوب القراء ة على مانزل من الأحرف السبعة...... ۳۵۶:۳، كتاب السير،باب ماجاء في عذر المستضعفين......۲۱۵:۱۳ میں یہی الفاظ منقول ہیں جب کہ اس معنی کی دیگر احادیث کی تعداد مختلف کتب حدیث میں بہت زیادہ ہے۔

پڑھنے کا حکم دیں۔ آپ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور درگزر کا طلب گار ہوں میری امت میں ایسا کرنے کی طاقت نہیں ہے۔ جبریل علیہ السلام دوبارہ آپ کے پاس آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو بتا دیں کہ قرآن مجید کے حروف دو طرح پر پڑھ لے۔ آپ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت کی درخواست کرتا ہوں، میری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہیں ہے۔ وہ تیسری بار آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ اپنی امت کو تین طرح پر قرآن مجید پڑھنے کی اجازت دے دیں۔ آپ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ سے معافی اور مغفرت مانگتا ہوں۔ میری امت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی۔ جبریل علیہ السلام چوتھی بار آئے اور فرمایا: اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ کی امت سات طرح پر قرآن مجید کی تلاوت کر سکتی ہے۔ ان میں سے وہ جس طرح پر پڑھیں گے ان کی قراءت درست ہوگی۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابیؓ ہی سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

[۹۴] لقی رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم جبریل فقال: یا جبریل إنّي بُعِثتُ إلی أمة أُمِّیّةٍ منهم العجوز والشیخ الکبیر، والغُلَامُ والجاریَةُ والرجلُ الذي لا یَقرأ کتاباً قطّ، فقال لي: یا محمّد! إنّ القرآنَ أُنزِلَ علی سبعةِ أحرُف۔

حضرت جبریل علیہ السلام کی ملاقات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی تو آپ نے فرمایا: اے جبریل! میں ایسی امت کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتے۔ ان میں بوڑھے مرد عورتیں بھی ہیں، لڑکے لڑکیاں بھی اور ایسے لوگ بھی جنھوں نے زندگی بھر کبھی کوئی تحریر نہ پڑھی ہوگی۔ جبریل علیہ السلام نے فرمایا: اے محمد! قرآن مجید بھی سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، مؤطا امام مالکؒ، سنن ابو داؤد اور سنن نسائی وغیرہ امہات الکتب میں ہشام بن حکیم کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی گفتگو بھی منقول ہے جس کا مفصل بیان إن شاء اللہ اس بحث کے آخر میں آئے گا۔

---

[۹۴] جامع ترمذی: کتاب القراءت ۵:۱۹۴، ۱۹۵، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب قراءة القرآن ۳:۱۴، مسند احمد: حدیث حذیفة بن الیمان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶:۵۵۴، ۵۶۳

سات حروف سے مراد

اس بارے میں علماء سے پینتیس (۳۵) مختلف اقوال منقول ہیں۔ جنہیں امام ابو حاتمؒ[1] محمد بن حبان بُستیؒ نے ذکر کیا ہے۔ ذیل میں ان سے پانچ اقوال نقل کیے جاتے ہیں:

پہلا قول: ملتے جلتے معانی والے الفاظ

سفیان بن عُیینہؒ، عبد اللہ بن وہبؒ، طبریؒ اور طحاویؒ وغیرہ اکثر اہل علم کی رائے یہ ہے کہ سات حروف سے مراد ملتے جلتے معانی والے مختلف الفاظ کا ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہے جیسے "أَقْبِلْ"، "تعالَ" اور "هَلُمَّ" (کہ یہ سب "آؤ" کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں) امام طحاوی[2] فرماتے ہیں: اس سلسلہ میں واضح ترین حدیث وہ ہے جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں:

[۹۵] جاء جبريل إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال اقرأ على حرف، فقال ميكائيل: استزده، فقال: أقرأ على حرفين، فقال ميكائيل: استزده، حتى بلغ إلى سبعة أحرف، فقال: اقرأ فكلٌّ شافٍ كافٍ إلَّاأن تخلط آية رحمةٍ بآيةِ عذابٍ، أو آيةَ عذابٍ بآية رحمةٍ، على نحو هَلُمَّ وَتعالَ وأَقْبِلْ وَاذهَبْ وأسرِعْ وَعَجِّلْ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا: قرآن مجید کی تلاوت ایک حرف پر فرمایئے، میکائیل علیہ السلام نے فرمایا: کچھ زیادہ بتا دیجیے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا: دو حرفوں پر پڑھ لیجیے، میکائیل علیہ السلام کہنے لگے اور زیادہ بتایئے۔ اسی طرح گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ بات سات حروف تک پہنچ گئی پھر جبریل علیہ السلام

[۹۵] مسند احمد: حديث ابى بكرة نفع بن الحارث رضي الله عنه، حديث عبادة بن الصامت عن ابى بن كعب رضي الله عنه ۵:۴۱، حديث انس بن مالك عن ابى بن كعب رضي الله عنهما۵: ۵۱، سنن ابو داؤد: كتاب الصلاة، باب أُنزل القرآن على سبعة أحرف ۲:۷۶، سنن نسائی: كتاب الافتتاح، باب ماجاء فى القرآن ۲:۱۵۴، طحاوی: مشكل الآثار ۴:۱۹۱ بروایت اَبی بکرہ صحیح ابن حبان: كتاب الرقائق، باب قراءة القرآن ۳:۱۱، اس کی سند میں ایک راوی علی بن زید ضعیف ہیں اور باقی سب ثقات ہیں۔

۱۔ حافظ حدیث ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد البستی (م ۳۵۴ھ) حدیث اور رجال حدیث میں اپنے وقت کے امام تھے۔ اس سلسلہ میں ان کی کئی کتب مشہور و متداول ہیں۔ اعلام زرکلی ۶:۷۸

۲۔ اَبو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ مصری طحاوی (م ۳۲۱ھ) ثقہ، صاحب تقوی اور فقہ میں اپنے وقت کے مرجع خلائق تھے۔ امام مزنی شافعیؒ کے پاس فقہ پر مکمل عبور حاصل کیا۔ پھر حنفیہ کے دلائل سے متأثر ہو کر مذہب حنفی اختیار کر لیا۔ ان کی تصنیفات ان کے علمی مقام کی شاہد ہیں خصوصاً ان کی شرح معانی لآثار علمی حلقوں میں بہت مشہور ہے۔ تاج التراجم ص ۱۴

نے فرمایا: آپ تلاوت فرماتے رہیں، ان میں سے ہر حرف پر تلاوت مکمل اور درست ہے۔ البتہ رحمت کی آیت عذاب کی آیت کے ساتھ اورعذاب کی آیت رحمت کی آیت کے ساتھ خلط ملط نہ ہو، جیسے "هَلُمّ" تعالَ اور اَقْبِلْ (آؤ کے معنی میں) اور اذهَبْ، اسرِع اور عَجِّل (جاؤ اور جلدی کرو کے معنی میں)۔

ورقاء نے ابن ابی نُجیح سے نقل کیا ہے، وہ مجاہد سے اور مجاہد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لِلَّذِيْنَ آمَنُوا انْظُرُوْنَا﴾ [الحديد ۵۷:۱۳] (ایمان والوں سے (کہیں گے) ہمارا انتظار کر لو) کی بجائے "لِلَّذِينَ آمَنُوا أَمْهِلُونَا" (ایمان والوں کو کہیں گے ہمیں مہلت دو)، لِلَّذِينَ آمَنُوا اَخِّرونَا" (ہمیں اس سے پیچھے ہٹاؤ)، "لِلَّذِينَ ارقبُونا" (......ہمارا انتظار کر لو) پڑھا کرتے تھے۔ حضرت اُبی کے بارے میں ہی اسی سند کے ساتھ منقول ہے کہ وہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿كُلَّمَا اَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيْهِ﴾ [البقره ۲:۲۰] (اور جب بجلی ان پر چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں یہ چلتے ہیں) کی بجائے "مَرّوا فيه" (وہ اس میں گزر جاتے ہیں) اور "سَعَوا فيه" (اس میں دوڑ پڑتے ہیں) پڑھا کرتے تھے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں امام زہریؒ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ حروف کا یہ اختلاف کسی ایک معنی کی ادائیگی کے لئے ہے۔ اس سے مراد ایسا اختلاف نہیں جس سے حلت وحرمت میں کوئی تبدیلی واقع ہو جائے۔

مختلف قراء ات کے جواز کی حدود

امام طحاویؒ فرماتے ہیں: حروف میں اختلاف کی یہ رعایت لوگوں کو اس لئے دی گئی کہ وہ اپنے لہجات کے علاوہ قرآن مجید ذہن نشین نہیں کر پاتے تھے کیوں کہ وہ ان پڑھ لوگ تھے۔ ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو کچھ لکھنا بھی جانتے ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر لہجہ بولنے والے کے لئے اپنے لہجہ کے علاوہ دوسرے لہجات اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے اور اگر وہ اس کی کوشش بھی کرے تو بہت مشقت اٹھانے کے بعد کہیں جا کر انسان کا ذہن اسے قبول کرتا ہے ان مشکلات کو مدنظر رکھ کر لوگوں کو لفظی اختلافات کی رعایت دی گئی بشرطیکہ اس سے معنی میں فرق نہ پڑے۔ یہ ابتدائی دور کی بات ہے۔ پھر لوگ اس وقت تک اس رعایت سے فائدہ اٹھاتے رہے جب تک ان میں بہت سے لوگ ایسے نہ ہو گئے جو لکھنا جانتے تھے اور سب لہجات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک غالب آ گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان کے الفاظ کو ذہن نشین کر لینے کی استعداد لوگوں میں پیدا ہو گئی۔ تو دیگر لہجات میں تلاوت کرنے کی رعایت ختم ہوگئی[1]۔

۱۔ امام طحاویؒ: مشکل الآثار ۱:۱۸۱۔۱۹۱

حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں: اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ان سات حروف کی رعایت خاص ضرورت کے تحت محدود مدت تک دی گئی اور جب وہ ضرورت ختم ہو گئی تو سات حروف والی رعایت بھی ختم ہو گئی اور قرآن مجید کا صرف ایک ہی طریقہ باقی رہ گیا۔

امام ابو داوُدؒ نے حضرت اُبَی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۹۶] يا أبي إني أقرِئتُ القرآن فقيل لي على حرفٍ أو حرفين فقال الملك الذي معي: قل على حرفين فقيل لي: على حرفين أو ثلاثة فقال الملك الذي معي قل على ثلاثة حتى بلغ سبعة أحرف، ثم قال: ليس منها إلا شافٍ كافٍ إن قلت: سميعاً عليماً عزيزاً حكيماً مالم تخلط آية عذاب برحمة أو آية رحمةٍ بعذاب۔

اے اُبَی! مجھے قرآن مجید پڑھایا گیا اور کہا گیا کہ اس کی تلاوت ایک یا دو حروف (قراءتوں) پر کیا کریں۔ میرے ساتھ جو فرشتہ تھا اس نے (دوسرے کو) کہا: ایک کے بجائے دو حرفوں پر قراءت کی اجازت دیں۔ مجھے کہا گیا کہ آپ دو یا تین قراءتوں پر پڑھ سکتے ہیں۔ میرے ساتھ جو فرشتہ تھا اس نے کہا: (دو کی بجائے) تین حرفوں پر کہیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا یہاں تک کہ سات قراءتوں تک پہنچ گیا۔ پھر فرشتے نے کہا: آپ "سمیعاً" (سننے والا) کہیں، "علیماً" (جاننے والا) کہیں یا "عزیزاً" (غالب) کہیں سبھی مکمل اور درست ہیں بشرطیکہ عذاب والی آیت رحمت والی آیت کے ساتھ اور رحمت والی آیت عذاب والی آیت کے ساتھ خلط ملط نہ ہو جائیں۔

ثابت بن قاسمؒ نے بھی اسی طرح کی حدیث حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کی[۱] ہے اور اسی سے ملتا جلتا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول بھی ذکر کیا ہے۔

---

[۹۶] مسند احمد: حديث سليمان بن عمره عن ابی بن كعب رضی الله عنهما ۵:۱۲۴؛ سنن أبو داوٗد: كتاب الصلاة، باب أُنزِلَ القرآن على سبعة أحرف ۲:۷۶، مشكل الآثار ۴:۱۸۹؛ سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب وجوب القراءة على ما نزل من الأحرف السبعة ۳:۳۵۷

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ والی حدیث مختصر ہے اور اس کے راوی محمد بن عمرو کی کمزوری کی وجہ سے اس کی سند "حسن" ہے۔ اس کے باقی تمام رواۃ ثقہ ہیں۔ مسند احمد ۲:۳۳۲، مصنف ابن ابی شیبہ ۱۰:۵۱۶، مسند بزار ۳:۲۳

قاضی ابن طیب رحمہ اللہ[1] فرماتے ہیں: جب حضرت اُبی رضی اللہ عنہ والی حدیث سند کے اعتبار سے ثابت ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف قراءات کی اجازت سب کو دی گئی تھی مگر بعد میں منسوخ ہوگئی۔ اب کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کسی ایک نام کی جگہ دوسرا نام بولے خواہ ان دونوں کے معانی ایک جیسے ہوں یا مختلف۔

دوسرا قول: مختلف قبائل کی زبانیں

علماء کی ایک جماعت کا موقف ہے کہ سات حروف سے مراد ایک ہی حرف کی سات صورتیں نہیں بلکہ عربوں کے یمنی اور نزاری قبائل کی کل سات زبانیں ہیں جو کہ قرآن مجید میں استعمال ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ سب زبانیں معلوم تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جوامع الکلم بھی عطا فرمائے گئے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ان سات زبانوں کے الفاظ پورے قرآن مجید میں پھیلے ہوئے ہیں، کہیں قریش کی زبان استعمال کی گئی ہے، کہیں بنو ہذیل کی، کہیں بنو ہوازن کی اور کہیں یمن کی۔ علامہ خطابی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اس کے باوجود قرآن مجید میں ایسے الفاظ بھی ہیں جنہیں سات طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَعَبَدَ الطَّاغُوتَ﴾ [المائدۃ ۵: ۶۰] (اور انہوں نے شیطان کی پوجا کی)۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ﴾ [یوسف ۱۲: ۱۲] (انہیں کل ہمارے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ ذرا کھائیں پئیں اور کھیلیں)۔ اس کے ساتھ انہوں نے ان دونوں ارشادات باری تعالیٰ میں قراءت کی مختلف صورتیں ذکر کیں۔ گویا علامہ خطابی رحمہ اللہ کی رائے میں قرآن مجید کا کچھ حصہ سات حروف پر نازل ہوا ہے پورا قرآن نہیں۔

یہ دوسرا قول کہ سات حروف سے مراد سات لغات ہیں، علامہ ابوعبید قاسم بن سلام رحمہ اللہ کا ہے اور علامہ ابن عطیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے۔ ابو عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بعض قبائل زیادہ خوش بخت ہیں کہ ان کی زبان کو دوسرے قبائل کی نسبت قرآنی لغات میں زیادہ حصہ ملا۔ پھر انہوں نے بطور دلیل ابن شہاب رحمہ اللہ والی روایت ذکر کی جو انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

قرآن مجید لغتِ قریش میں نازل ہونے کی تحقیق

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب ہمیں قرآن مجید کے نسخے تیار کرنے کا حکم دیا تو فرمایا:

۱۔ قاضی ابوبکر محمد بن طیب المعروف ابن باقلانی (م ۴۰۳ھ)۔ بصرہ کے رہنے والے اور مذہب اشعری کے متکلمین میں سے تھے۔ انہوں نے معتزلہ، خوارج اور روافض وغیرہ کے رد میں بہت سی کتب تصنیف کیں۔ الفتح المبین فی طبقات الاصولیین ۱: ۲۳۳

[۹۷] ما اختلفتم أنتم و زيدٌ فاكتبُوهُ بِلُغَةِ قُريشٍ، فإنّهُ نزلَ بِلُغتِهم۔

جہاں تمہارا اور زید رضی اللہ عنہ کا اختلاف ہو جائے وہ حصہ قریش کے لہجہ میں لکھ دو کیوں کہ یہ انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔اس روایت کو امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ والی حدیث بھی ذکر کی کہ انہوں نے فرمایا:

[۹۸] نَزَلَ القُرآنَ بِلُغَةِ الكعبين؛ كعب قُريشٍ و كعبِ خُزَاعَة، قيل: و كيف ذلك؟ قال: لأنّ الدّارَ واحِدَةٌ

قرآن قریش کی شاخ بنو کعب اور خزاعہ کی شاخ کعب دونوں کی زبان میں نازل ہوا۔ ان سے پوچھا گیا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس لیے کہ دونوں کا قیام ایک جگہ ہے۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں:اس کا مقصد یہ ہے کہ بنوخزاعہ چوں کہ قریش کے پڑوسی تھے اس لیے انہوں نے ان کی زبان اپنا لی۔ قاضی ابن طیبؒ کہتے ہیں:سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اس ارشادگرامی کہ ''قرآن قریش کی زبان میں نازل ہوا'' کا مطلب یہ ہے کہ اس کا اکثر حصہ ان کی زبان میں اترا ورنہ اس بات کی کوئی قطعی دلیل نہیں ملتی کہ پورا قرآن صرف قریش ہی کی زبان میں نازل ہوا کیوں کہ اس میں ایسے الفاظ پائے جاتے ہیں جو قریش کی زبان کے نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا بھی ارشاد ہے: ﴿إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا﴾ [الزخرف ۴۳:۳] ہم نے اس کو عربی زبان کا قرآن بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم نے اس کو قریشی زبان کا قرآن بنایا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن مجموعی طور پر عربی زبان میں نازل ہوا۔کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ دوسرے عرب قبائل کو چھوڑ کر اسے قریش کے ساتھ مختص کر دے، نہ ہی یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس سے مراد بنو عدنان کی زبان تو ہے بنو قحطان کی نہیں یا بنو ربیعہ کی تو ہے بنو مضر کی نہیں کیوں کہ لفظ عرب میں تمام قبائل برابر کے شریک ہیں۔

---

[۹۷] صحیح بخاری: كتاب المناقب ، باب نزل القرآن بلسان قريش ۳:۱۲۹۱،باب نزل القرآن بلغة قريش والعرب قرآناعربيا ۴:۱۹۰۶،باب جمع القرآن ۴:۱۹۰۸،جامع ترمذی: كتاب تفسير القرآن ، باب و من سورة التوبة ۵:۲۸۴

[۹۸] علامہ زرکشیؒ نے یہ قول ابو الاسود الدیلی کی طرف منسوب کیا ہے اور پھر لکھا ہے کہ ابوعبید نے اپنی کتاب ''فضائل القرآن'' میں اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: میرے خیال میں قریش کی زبان کو تخصیص کے ساتھ ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبائل کے لہجات تو قرآن مجید میں پائے ہی جاتے ہیں۔ حسن کی دلیل ہمزہ کی ادائیگی وغیرہ دوسری علامات ہیں جب کہ قریش کے ہاں ہمزہ کی ادائیگی دوسروں سے مختلف ہے۔ گویا اس کا خصوصیت سے ذکر کر کے ان میں شامل کیا گیا۔ کعب کے دونوں قبیلوں سے مراد کعب بن لوی جو قریش کے جد اکبر ہیں اور دوسرے کعب بن عمرو ہیں جو کہ بنوخزاعہ کے بڑے ہیں۔ زرکشی:البرهان في علوم القرآن ۱:۲۸۳

حافظ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں: میرے نزدیک قرآن کے لغت قریش میں نازل ہونے سے مراد یہ ہے کہ اس کا غالب حصہ ان کی زبان میں اترا کیوں کہ لغت قریش کے علاوہ دیگر لہجات بھی قرآن کی صحیح قراء ات کے ضمن میں منقول ہیں جیسا کہ ہمزہ کی ادائیگی وغیرہ جب کہ قریش کے ہاں ہمزہ کی ادائیگی نہیں پائی جاتی، واللہ اعلم۔

علامہ ابن عطیہؒ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کہ " أُنْزِلَ القُرآنُ علی سبعَةِ أحرُفٍ"[۱] (قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا) کا مطلب یہ ہے کہ اس میں سات قبائل کی زبانوں میں سے لی گئی عبارات موجود ہیں اور یہ ان سب زبانوں پر اکھٹا نازل ہوا۔ چنانچہ کوئی بات لغت قریش میں بتائی گئی ہے، کوئی لغت ہذیل میں اور کوئی کسی اور زبان میں جہاں کسی زبان میں زیادہ فصاحت اور کم الفاظ میں پوری بات سمجھا دینے کی صلاحیت پائی گئی، اسی زبان کی وہی عبارت قرآن مجید میں استعمال کر لی گئی۔ غور کیجئے کہ لفظ "فَطَر" کا معنی لغت قریش کے علاوہ دیگر لہجات میں کسی چیز کو شروع سے بنانا آتا ہے۔ جب یہی لفظ قرآن مجید میں نازل ہوا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ یہاں تک کہ دو دیہاتی ایک کنویں کے بارے میں جھگڑتے جھگڑتے فیصلہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان میں سے ایک نے کہا: "أنَا فَطَرتُها" (اسے ابتداء ہی سے میں نے کھودا ہے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

[۹۹] ففهمتُ حينئذ معنى ﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ﴾[فاطر ۳۵: ۱، الشوری ۴۲: ۱۱]

اس دیہاتی سے یہ لفظ سن کر میری سمجھ میں آیا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالأَرْضِ﴾ کا معنی کیا ہے۔

اسی طرح آپؓ سے منقول ہے کہ مجھے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ﴾ [الاعراف ۷: ۸۹] (اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر دے) کی سمجھ نہیں آتی تھی یہاں تک کہ "ذویزن"[۲] کی بیٹی کو اپنے خاوند سے یہ کہتے سنا "تعالَ أُفَاتِحُكَ، أي أُحاكِمُكَ" (آؤ میں تمہارا فیصلہ کرتی ہوں)۔ سیّدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ[۳] سے منقول ہے کہ وہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿أَوْ يَأْخُذَهُمْ عَلَى تَخَوُّفٍ﴾ [النحل ۱۶: ۴۷] کا معنی "عَلى تنقُّصٍ لهُم" (یا انہیں گھٹاتے گھٹاتے پکڑ لے) نہیں جانتے تھے۔

---

[۹۹] شعب الإيمان: السابع عشر من شعب الإيمان وهو باب في طلب العلم ۲: ۲۵۷

۱۔ تفسیر ابن عطیة ۱: ۴۴

۲۔ ذویزن حمیری بادشاہوں میں سے ایک تھا۔ النهاية ۲: ۱۷۳

۳۔ آپ کی وفات یکم محرم الحرام سن ۲۳ ہجری کو ہوئی۔

[۱۰۰] حضرت قطبہ بن مالک رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَالنَّخلَ بَاسِقَاتٍ﴾ [ق ۵۰: ۱۰] (اور لمبی لمبی کھجوروں کے درخت) کی تلاوت فرماتے سنا تو وہ بھی اس کا معنی نہ سمجھ سکے۔ اسے امام مسلمؒ نے "باب القِراءَ ۃ فی صلاۃِ الفَجر" میں نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔

تیسرا قول: بنومضر کے سات لہجات

ان سات حروف کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ ان سے مراد بنو مُضر کے سات لہجات ہیں اور اس کی دلیل میں سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا جاتا ہے کہ "نَزَلَ القُرآنُ بِلُغَۃِ مُضَر"[۱] (قرآن مجید بنومضر کی زبان میں نازل ہوا)۔ اس رائے کے قائلین کے خیال میں یوں بھی ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ لغت قریش میں ہو اور کچھ حصہ بنوکنانہ، بنواسد، بنوہذیل، بنوتمیم، بنوضبّہ اور بنوقیس میں سے ہر ایک کے لہجہ میں ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ بنومضر کے یہی سات قبائل ہیں جو درجہ بدرجہ یہ سات زبانیں بولنے والے ہیں اور حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ پسند کرتے تھے کہ قرآن مجید لکھنے والے لوگ بنومضر ہی سے منتخب کیے جائیں۔ دیگر اہلِ علم اس رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بنومضر کے لہجات کے اعتبار سے بعض شاذ قراء تیں بھی نقل کی گئی ہیں جن کو پڑھنا سرے سے جائز ہی نہیں جیسے بنوقیس کا کشکشہ اور بنوتمیم کا تمتمہ وغیرہ۔ چنانچہ بنوقیس مونث کے ''کاف'' کو ''شین'' کی آواز دے کر ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿جَعَلَ رَبُّکِ تَحتَکِ سَرِیًّا﴾ [مریم ۱۹: ۲۴] تمہارے پروردگار نے تمہارے پائیں ہی میں ایک نہر پیدا کر دی ہے، کو "رَبُّشِ تَحتَشِ سَرِیًّا" پڑھتے ہیں اور بنوتمیم کا تمتمہ یہ ہے کہ وہ "النَاس" کو "النَات" اور "اَکیاس" کو "اَکیات" کہتے ہیں۔ ان علماء کا کہنا ہے کہ ان لہجات میں تلاوت کرنے سے اجتناب ہی کرنا چاہیے اور حقیقت یہ ہے کہ سلف سے بھی ایسی کوئی قراء ت ثابت نہیں ہے۔ بعض حضرات کہتے ہیں کہ جہاں تک ہمزہ کو عین سے اور دیگر حروف حلقیہ کو ایک دوسرے سے بدلنے کا تعلق ہے

---

[۱۰۰] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب القراءۃ فی الصبح ۱: ۳۳۶، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب قدر القراءۃ فی صلاۃ الصبح ۳: ۳۶۶، امام حاکمؒ نے مستدرک: کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ ق ۲: ۵۰۴ میں نقل کیا ہے کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ سن کر حضرت قطبہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: "وما بُسوقھا" یعنی "باسِقات" کا کیا معنی ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "طولھا" (اس سے مراد ان کا لمبا ہونا ہے)۔ اس کے بعد امام حاکمؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث امام مسلم نے بھی نقل کی ہے مگر نہ تو اس کا یہ سیاق وسباق نقل کیا ہے نہ "باسقات" کی وضاحت ذکر کی ہے حالاں کہ یہ دونوں باتیں ان کی شرط کے مطابق ہیں۔

۱۔ فتح الباری کتاب فضائل القرآن علی سبعۃ أحرف میں یہ قول حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

تو یہ فصحاء سے بھی منقول ہے اور جلیل القدر قراء نے انہی لہجات میں تلاوت کی ہے۔ اس سلسلہ میں وہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراء ت بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ "لَیَسْجُنُنَّهٗ عَتّٰی حِینٍ" پڑھا کرتے تھے اسے امام ابو داؤد نے ذکر کیا ہے[1]۔ اسی طرح ذوالرُّمّہ کہتا ہے[2]:

فَعَیْنَاكِ عَیْنَاهَا وَجِیدُكِ جِیدُهَا   وَلَوْنُكِ إِلَّا عَنَّهَا غَیْرُ طَائِلِ

تمہاری آنکھیں اس کی آنکھوں کی طرح ہیں اور تمہارا گلا اس کے گلے کی طرح اور اسی طرح تمہارا رنگ بھی مگر ان مماثلتوں کا کچھ فائدہ نہیں۔ یہاں اس نے "إِلاَّعَنَّھَا" کہا ہے جب کہ اصل میں "إِلاَّأَنَّھَا" ہے۔

چوتھا قول: قراء ت میں اختلاف کی صورتیں

اس سے مراد وہ رائے ہے جو مؤلفِ "دلائل" نے بعض علماء سے نقل کی ہے اور اسی طرح قاضی ابن طیبؒ نے اسے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے قراء ت میں اختلاف کی صورتوں میں غور کیا تو کل سات صورتیں سامنے آئیں۔ ان میں سے کچھ ایسی صورتیں ہیں جن میں حرف کی حرکت مختلف ہوتی ہے مگر نہ تو اس کا معنی تبدیل ہوتا ہے اور نہ لفظ کی شکل بدلتی ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ﴾ [هود ۱۱:۷۸] میں "أَطْهَرَ" اور ﴿وَيَضِيقُ صَدْرِي﴾ [الشعراء ۲۶:۱۳] میں "يَضِيقَ" پڑھنا۔ ان میں سے بعض ایسی ہیں جن میں ظاہری شکل تو نہیں بدلتی مگر اعراب بدل جانے سے معنی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿رَبَّنَا بَاعِدْ بَيْنَ أَسْفَارِنَا﴾ [سبا ۳۴:۱۹] (اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفروں میں درازی کر دے) میں "بَاعِدْ" (دور کر دے) کی جگہ "بَاعَدَ" (اس نے دور کر دیا) پڑھنا۔ انہی میں سے کچھ صورتیں ایسی ہیں جن میں لفظ کی ظاہری شکل تو باقی رہتی ہے مگر حرف بدل جانے سے معنی بدل جاتا ہے۔ جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿نُنْشِزُهَا﴾ [البقرة ۲:۲۵۹] (انہیں ہم ترتیب دیتے ہیں) میں "نُنْشِرُها" (انہیں ہم پھیلاتے ہیں) پڑھنا۔ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں لفظ کی شکل تو تبدیل ہو جاتی ہے مگر اس کا معنی باقی رہتا ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ﴾ [القارعة ۱۰۱:۵] (دھنکی ہوئی اون کی طرح) میں "کالصُّوفِ

۱۔ ہمزہ کو عین سے بدلنے کو عنعنة کہتے ہیں۔ یہ بنو قیس، بنو تمیم اور ان کے پڑوسی قبائل کی زبانوں میں پایا جاتا تھا۔ وہ "أشهَدُ أنّکَ رسولُ الله" کی بجائے "أشهَدُ عَنّکَ رسولُ الله" کہتے تھے۔ تاریخ آداب العرب: ۱:۱۴۲، لسان العرب (عنعنة)۔

۲۔ اس کا نام غیلان بن عقبہ بن نہیس ہے۔ اس کا تعلق بنو مضر سے تھا اور یہ اپنے دور میں تشبیہ کا اسی طرح ماہر شمار ہوتا تھا جس طرح امرؤ القیس زمانہ جاہلیت میں تھا۔ تاریخ آداب اللغة العربية ۱:۲۹۵، خزانة الأدب ۱:۵۱، وفيات الأعيان ۱:۴۰۴۔

الْمَنْفُوش" پڑھنا۔ بعض صورتیں ایسی ہیں جن میں لفظ کی شکل بھی بدل جاتی ہے اور معنی بھی۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَطَلْحٍ مَنْضُودٍ﴾ [الواقعۃ ۵۶:۲۹] (اور تہ بہ تہ کیلے) میں "وَطَلْعٍ مَنْضُودٍ" (اور تہ بہ تہ شگوفے) پڑھنا۔ بعض ایسی ہیں جن میں تقدیم و تاخیر پائی جاتی ہے۔ جیسے: ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ [ق ۵۰:۱۹] (اور آ پہنچی موت کی بے ہوشی سچائی کے ساتھ) کی جگہ "وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْحَقِّ بِالْمَوْتِ" (اور آ پہنچی حقیقی بے ہوشی موت کے ساتھ) پڑھنا۔ بعض صورتوں میں کچھ کمی یا بیشی پائی جاتی ہے جیسے یوں پڑھنا: "تِسْعٌ وتِسْعُونَ نَعْجَةً أُنْثَى" [1] (ننانوے مؤنث بھیڑیں) اور "وَأَمَّا الْغُلامُ فَكَانَ كَافِرًا وَأَبَوَاهُ مُؤْمِنَيْنِ" [2] (اور وہ جو لڑکا تھا وہ تو کافر تھا اور اس کے ماں باپ ایمان والے تھے) اور "فَإِنَّ اللَّهَ مِنْ بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ لَهُنَّ غَفُورٌ رَحِيمٌ" [3] (تو اللہ تعالیٰ ان کے مجبور کیے جانے کے بعد ان کو بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

پانچواں قول: سات طرح کی تعلیمات

اس قول کے مطابق سات حروف سے مراد قرآنی مضامین کی سات قسمیں ہیں جیسے اوامر، نواہی، وعدے، وعیدیں، قصے، مباحث اور مثالیں۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: یہ رائے کمزور ہے کیوں کہ ان چیزوں پر حرف کا اطلاق نہیں ہوتا اور اس لیے بھی کہ یہ بات متفق علیہ ہے کہ کسی حلال کی حلت یا معانی کی تبدیلیوں میں کوئی اضافے نہیں کیے گئے۔ قاضی ابن طیب اس بارے میں ایک حدیث نقل کر کے کہتے ہیں: لیکن یہ امور وہ نہیں ہیں جن کو بطور قراءت پڑھنے کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی ہے۔ یہاں حرف سے مراد تو سمت اور طریقہ ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللَّهَ عَلَى حَرْفٍ﴾ [الحج ۲۲:۱۱] اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی پرستش کنارہ پر کھڑا ہو کر کرتا ہے۔ اسی طرح حدیث کا معنی یہ ہے کہ قرآن میں سات طرح کے طریقے نازل کیے گئے جیسے حلّت حرمت وغیرہ۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ ارشاد نبوی: "أُنْزِلَ الْقُرآنُ عَلَى سَبْعَةِ أَحرف" (قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا) سے مراد وہ سات قراءات ہیں جو سات مشہور قراء سے منقول ہیں کیوں کہ یہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ مگر اس بات کی کوئی اہمیت نہیں جیسا کہ اس کا غلط ہونا درج ذیل تفصیل سے ظاہر ہے۔

۱۔ سورہ ص ۳۸ :۲۳ کی طرف اشارہ ہے جہاں "أُنْثَى" کا لفظ نہیں ہے۔

۲۔ سورہ کہف ۱۸: ۸۰ میں "وأمّا الغُلامُ فكانَ أبواهُ مؤمِنَينِ" ہے باقی الفاظ اس قراءت میں زائد ہیں۔

۳۔ سورہ نور ۲۴: ۳۳ کے مطابق یہاں لفظ "لَهُنَّ" زائد ہے۔

فصل:

کیا سات حروف سے مراد سات مشہور قراءتیں ہیں؟

داؤدی[۱] اور ابن ابی صفرہ[۲] وغیرہ متعدد مالکی علماء سے منقول ہے کہ یہ سات قراءات جو ان سات قراء کی طرف منسوب ہیں یہی وہ سات حروف نہیں ہیں جن پر پڑھنے کی رعایت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل تھی بلکہ ان قراءات کی بنیاد تو درحقیقت ان سات حروف میں سے ایک پر ہے اور یہ وہی حرف ہے جس پر سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کو جمع فرمایا۔ یہ بات ابن نحاس اور دیگر حضرات نے ذکر کی ہے۔ یہ مشہور قراءات تو ان ائمہ قرّاء کا انتخاب ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو جو روایات ملیں ان میں غور کرنے سے جو روایت بہتر اور زیادہ مناسب معلوم ہوئی اس نے اسی کو اپنے طریقہ کے طور پر اپنا لیا، اسی کے مطابق دوسروں کو پڑھایا، وہی اس کی پہچان بن گئی اور اسی کی نسبت سے مشہور ہوئی۔ ایسی ہی روایات کو قراءتِ نافع اور قراءتِ ابن کثیر وغیرہ کہا جانے لگا۔ مگر اس سب کے باوجود ان میں سے ہر ایک دوسرے سے منقول روایات کو جائز کہتا رہا اور اس کے حق میں دلائل دیتا رہا۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ سات مشہور قراء میں سے ہر ایک نے صرف ایک ایک قراءت کو اختیار کرنے پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ان سے دو دو اور بعض دفعہ اس سے زیادہ روایات بھی منقول ہیں اور وہ سب قراءاتِ صحیحہ ہیں۔

ہر زمانہ میں مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ ان ائمہ کرام نے جو قراءات نقل کیں اور ان کا جو انتخاب تھا، سب صحیح اور قابل اعتماد ہے۔ اس بارے میں علماء نے مستقل کتب تصنیف کیں۔ اس طرح ان کی صحت پر امت کا اجماع مستقل طور پر قائم رہا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ قاضی ابوبکر بن طیب، امام طبریؒ اور ان کے پائے کے دیگر ائمہ متقدمین اور فضلاء محققین کی بھی یہی رائے ہے۔ علامہ ابن عطیہؒ فرماتے ہیں: مدتوں سے ہر زمانے اور ہر علاقے میں انہی سات قُرّاء کی قراءات ہی معیار چلی آ رہی ہیں اور انہی کے طریقوں سے نمازوں میں قراءت کی جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کے صحیح الثبوت

۱۔ احمد بن نصر داؤدی مالکی (م ۳۰۷)۔ شجرۃ النور الزکیہ: ۸۲

۲۔ قاضی ابو القاسم مہلّب بن احمد بن ابی صفرہ التمیمی (م ۴۳۵ھ تقریباً) بہت بڑے فقیہ اور محدث تھے۔ ان کی بخاری کی شرح بہت مشہور ہے۔ شجرۃ النور الزکیۃ: ۱۱۴

ہونے پر اُمت کا اجماع ہے۔ البتہ شاذ قراء ات کو نمازوں میں نہیں پڑھا جاتا کیوں کہ ان پر اجماع نہیں ہے۔ اب ان میں سے جو روایات حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اور علماء تابعین سے منقول ہیں ان کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ انہی حضرات نے انہیں نقل کیا ہوگا۔ البتہ ایسی جو روایات ابو سمّال[1] اور ان کے ہم عصر و ہم پلہ لوگوں سے منقول ہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں۔ بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ ایسی شاذ قراء ات جو ان قراء ات متواترہ کے علاوہ ہیں جو قرآن مجید کے نسخوں میں درج چلی آ رہی ہیں وہ قرآن کا حصہ نہیں ہیں، نہ ہی ان پر اس حیثیت سے عمل کیا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کا حصہ ہیں۔ ان کی سب سے بہتر توجیہ یہ ہے کہ جن حضرات کی طرف یہ منسوب ہیں انہیں ان کے تفسیری بیانات شمار کیا جائے جیسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ قراء ت: "فصیامُ ثلاثةِ أیّام متتابعات"[2] (تو تین دن کے لگاتار روزے)۔ ہاں اگر راوی واضح طور پر کہتا ہے کہ اس نے کوئی قراء ت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے تو اس پر عمل کرنے کے بارے میں علماء کی دو آراء ہیں:

ایک یہ کہ اس پر عمل کیا جائے گا اور دوسری یہ کہ عمل نہیں کیا جائے گا۔ دوسری رائے کے مطابق اس کی توجیہ یہ ہے کہ راوی نے اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور خبر نقل نہیں کیا بلکہ قرآن مجید کے حصہ کے طور پر نقل کیا اور چوں کہ اس کا قرآن ہونا تو ثابت نہیں ہو سکا اس لیے اس پر عمل کرنے کی گنجائش بھی نہیں رہی۔ اس پر عمل کرنے کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ اس قراء ت شاذہ کا قرآن ہونا اگرچہ ثابت نہیں ہو سکا مگر سنّت ہونا تو ثابت ہے اس لیے دیگر اخبار آحاد کی طرح اس پر عمل کرنا بھی واجب ہوگا[3]۔

۱۔ قعنب بن ابی قعنب العدوی البصری اپنی کنیت ابو السمال سے مشہور ہیں۔ ان سے بہت سی ایسی قراء ات منقول ہیں جنہیں جمہور قراء کی تائید حاصل نہیں ہے۔ لسان المیزان، تعارف نمبر ۵۵۷

۲۔ سورۂ بقرہ: ۱۹۶ میں "متتابعات" (لگاتار) کا لفظ نہیں ہے چوں کہ یہ قراء ت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے اس لیے زیر نظر قول کے مطابق اسے انہی کی طرف سے تفسیری الفاظ سمجھا جائے گا۔

۳۔ قراء ات شاذہ ایسی قراء ات ہیں جن میں قراء ات صحیحہ کی تین شرائط میں سے کوئی ایک شرط نہ پائی جاتی ہو۔ علامہ ابن الجزری کے قول کے مطابق وہ تین شرائط یہ ہیں: (۱) نحوی قواعد کے بارے میں مختلف اقوال میں سے کسی قول کی تائید اسے حاصل ہو۔ (۲) رسم و املاء کی کسی صورت کے مطابق ہو۔ (۳) سند کے لحاظ سے صحیح ثابت ہو۔ شاذ قراء ات کے حجت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں دو آراء ہیں۔ پہلی رائے یہ ہے کہ حجت ہیں اور ان پر عمل ضروری ہے۔ یہ احناف کی رائے ہے۔ حنابلہ کے نزدیک بھی ترجیح اسی کو ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ سے ایک روایت میں اور بہت سے شافعی علماء سے بھی یہی منقول ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ قراء ات شاذہ نہ تو حجت بن سکتی ہیں اور نہ ان کو دلیل بنا کر عمل کرنا جائز ہے۔ امام شافعیؒ کے دو اقوال میں سے ایک قول میں یہی منقول ہے۔ ان کے بعض اصحاب کی بھی یہی رائے ہے اور امام مالکؒ کا مسلک یہی ہے۔ اسی طرح کی ایک روایت امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ملتی ہے۔ تیسیر التحریر ۳:۹، شرح الکواکب المنیر ۲:۱۳۸، جمع الجوامع مع شرح جلال الدین المحلی ۱:۲۳۱

فصل:

حضرت عمر بن الخطابؓ اور ہشام بن حکیمؓ (۱) والی حدیث پر بحث

مفسر ابن عطیہؒ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان سات حروف کو جائز قرار دیا اور حضرت جبریل علیہ السلام نے جتنی بار بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قرآن مجید کا دور کیا ہر دفعہ یہ حروف بھی اس انداز سے ان کے دور میں شامل رہے جو اس کے اعجاز اور حسنِ ترتیب اور کمال نظم کے شایان شان تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:

[۱۰۱] فَاقْرَءُ وامَاتَيَسَّرَ مِنْهُ۔ اس میں سے جو آسانی سے ہوسکے پڑھ لو

میں یہ اجازت ہرگز نہیں دی گئی کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہ میں سے جو صاحب ان لغات میں سے جو لفظ تبدیل کرنا چاہتے اپنی مرضی سے اس کی جگہ کوئی اور لفظ لگا دیتے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو قرآن کا اعجاز ختم ہو جاتا اور ہر کوئی اپنے طور پر اس میں تبدیلیاں کرتا رہتا اور ایک وقت ایسا آتا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا نازل کیا ہوا کچھ بھی باقی نہ رہتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اجازت صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ملی تاکہ امت کے لیے آسانی پیدا فرماسکیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو اس میں سے کچھ پڑھایا جو جبریل علیہ السلام آپ کے ساتھ دور کیا کرتے تھے۔ کبھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کو (اور انداز سے) پڑھایا مگر ہوتا یہ بھی وہی تھا جس کا حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ دور ہو چکا ہوتا۔ اس طرح سورہ فرقان کی قراء ت کے دو اندازوں میں سے ایک کو قراء ت عمر رضی اللہ عنہ کہہ دیا گیا اور دوسرے کو قراء ت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ۔ اگر یہ بات نہ ہوتو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان دونوں قراءتوں کے باہم مختلف ہونے کے باوجود ان میں سے ہر ایک کے بارے میں یہ ارشاد فرمانا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ

---

[۱۰۱] یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جسے امام بخاریؒ نے اپنی الجامع الصحیح کی کتاب فضائل القرآن، باب انزل القرآن علی سبعة احرف ۳:۶۶۲ میں نقل کیا ہے۔ ان کے علاوہ ائمہ حدیث مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن حبان وغیرہم سب نے اسے بروایت عبدالرحمٰن بن عبدالقاری حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

۱۔ حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ خود اور ان کے والد گرامی حضرت حکیم بن حزام دونوں قریشی صحابی تھے۔ آپ کی وفات آپ کے والد گرامی سے پہلے ہوئی۔ تقریب التهذیب ۔

[۱۰۲] ھکذا أقرأني جبریل۔ مجھے جبریل علیہ السلام نے اسی طرح پڑھایا۔

اس کی صرف اور صرف ایک ہی صورت ہوسکتی ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرتبہ ایک انداز سے پڑھایا اور دوسری مرتبہ دوسرے انداز سے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول کا بھی یہی مطلب ہے جب انہوں نے "إنّ ناشِئَةَ اللّیلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْأً وَاَصْوبُ قِیلاً"(۱) (بے شک رات کے وقت اٹھنے میں (دل و زبان کا) خوب ملاپ رہتا ہے اور بات خوب ٹھیک نکلتی ہے) پڑھا تو انہیں کہا گیا کہ ہم تو ﴿وَاَقْوَمُ قِیلاً﴾ پڑھتے ہیں۔ اس پر حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "واَصْوَبُ قِیلاً، وأقومُ قِیلاً، وأھْیَأ واحِدٌ" (واَصْوَبُ قِیلاً، واَقْوَمُ قِیلاً اور واَھْیَأ سب ایک ہی ہیں) اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں۔ ورنہ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے کہ کوئی انسان اپنی طرف سے بھی یہ الفاظ بدل سکتا ہے تو ارشاد باری تعالیٰ: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ﴾ [الحجر ۱۵: ۹] (اس نصیحت نامہ کو ہم نے ہی نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا۔

امام بخاریؒ و امام مسلمؒ اور دیگر کئی ائمہ حدیث نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

[۱۰۳] سمعتُ ھشام بن حکیم یقرأ سورۃ "الفرقان" علی غیرما أقرؤھا، وکان رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم أقر أنیھا، فکِدتُ أن أعجلَ علیہ، ثم أمھلتہ حتی انصرف، ثم لَبّبتہ بردائہ، فجئت بہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقلت یا رسول اللّٰہ! إني سمعتُ ھذا یقرأ سورۃ "الفُرقان" علی غیرما أقر أتنیھا! فقال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم: وأرسلہ ـ اقرأ "فقرأ القراء ۃ التی سمعتہ یقرأ؛

[۱۰۲] مسند احمد: مسند عبداللہ بن العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنھما ۱: ۴۳۵

[۱۰۳] صحیح بخاری: کتاب الخصومات، باب کلام الخصوم بعضھم فی بعض ۲: ۸۵۱، صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا، باب بیان أن القرآن علی سبعۃ أحرف و بیان معناہ، سنن ابوداود: کتاب الصلاۃ، باب أنزل القرآن علی سبعۃ أحرف ۲: ۷۵، سنن نسائی: کتاب الافتتاح، باب جامع ماجاء فی القرآن ۲: ۱۵۰، مؤطاامام مالک: کتاب القرآن، باب ما جاء فی القرآن ۱: ۲۰۱، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب قراء ۃ القرآن ۳: ۱۷، مسند احمد: مسند عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ۱: ۴۱، ۱: ۲۶، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب التوسع فی الأخذ بجمیع ماروینا فی التشھد......۲: ۵۰۶

۱۔ المزمل ۷۳: ۶ میں "واَقْوَمُ قِیلاً" ہے۔

فقال رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم: هكذا أنزلت" ثم قال لي: "اقرأ" فقرأت فقال: "هكذا أنزلت إن هذا القرآن أنزل على سبعة أحرف فاقرؤوا ما تيسر منه۔

میں نے ہشام بن حکیم کو اپنی قراءت کے علاوہ دوسرے طریقے پر سورہ فرقان پڑھتے سنا تو چوں کہ میں نے پڑھنے کا طریقہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھا ہوا تھا اس لیے میرا دل چاہا کہ فوراً ان کا مواخذہ کروں مگر رک ہی گیا یہاں تک کہ وہ چلے گئے پھر کچھ دیر کے بعد میں نے سامنے سے ان کی چادر پکڑی، انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا اور عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ نے مجھے سورہ فرقان جس طرح پڑھائی تھی میں نے اس شخص کو سنا ہے یہ اس کے علاوہ اور طریقے سے پڑھ رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسے چھوڑ دو تاکہ پڑھ کر سنائے۔ اس نے اسی طریقہ سے پڑھا جیسے میں نے اسے پہلے سنا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ سورت اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ پھر مجھے فرمایا: تم پڑھو! میں نے اپنے والے طریقے پر پڑھا تو آپ نے فرمایا: اسی طرح نازل ہوئی ہے۔ یہ قرآن سات طریقوں سے نازل ہوا ہے۔ ان میں سے جو آسان ہو اسی کے مطابق پڑھ لیا کرو۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ہشام بن حکیمؓ کے واقعہ پر مؤلف کا تجزیہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ہم معنی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی ہے جسے امام مسلم نے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

[۱۰۴] كنتُ في المسجد فدخل رجل يصلي، فقرأ قراءةً أنكرتُهاعليه ،ثم دخل آخر فقرأ قراءةً سِوَى قِراءَة صاحبه ، فلماقضيناالصلاةَ دخلناجميعاً على رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ،قلتُ: إن هذاقرأ قراءةً أنكرتُهَا عليه ،ودخل آخر فقرأ سِوَى قراءة صاحبه ،فأمرهمَاالنبي صلى اللّٰه عليه وسلم فقرءَا ،فحسَّنَ النبي صلى اللّٰه عليه وسلم شأنهما،فسقط في نفسي من التكذيب ،ولاإذ كنتُ في

[۱۰۴] صحیح مسلم: كتاب صلاة المسافرين، باب بيان أنّ القرآن على سبعة أحرف و بيان معناه ۵۶۱/۱، مسند أحمد: ۱۶۷/۵۔ حديث سليمان بن صر عن أبى بن كعب رضى الله عنه، حديث عبدالرحمن بن أبى ليلى عن ابى بن كعب رضى الله عنه ۱۵۱:۶، البيهقى: السنن الكبرى، كتاب الصلاة، باب وجوب القراءة على مانزل من الأحرف السبعة---- ۳۵۵.۱۰، صحیح ابن حبان: كتاب الرقائق، باب قراءة القرآن ۱۴:۳

الجاهلية ،فلمارأى النبي صلى الله عليه وسلم ماقد غشِيَني ضربَ في صدري ففضت عرقاً،وكأنماأنظر إلى الله تعالىٰ فَرَقاً ،فقال لي:يا أُبيّ أُرسِلَ إليَّ أن أقرأ القرآن على حرفٍ فرددتُ إليه أن هَوِّن على أمتي فردَّ إليَّ الثانية: اقرأه على حرفين فرددتُ إليه أن هوِّن على أمتي فرد إليَّ الثالثة: اقرأه على سبعةِ أحرفٍ فلك بكل ردة ردّدتُكها مسألة تسألنيها، فقلت: اللهم اغفر لأمتي، اللهم اغفر لأمتي وأخرت الثالثة ليوم يرغب إلي فيه الخلق كلُّهم حتى إبراهيم عليه السلام۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں مسجد میں موجود تھا تو ایک شخص آیا اور اس نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اس نے نماز میں جو قراءت کی وہ میرے لیے غیر معروف تھی۔ پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے پہلے سے بھی مختلف قراءت کی۔ جب ہم سب نماز پڑھ چکے تو مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ میں نے عرض کیا: حضور! اس شخص نے قراءت کی تو مجھے غیر معروف لگی اور جب دوسرا شخص آیا تو اس نے اس سے بھی مختلف طریقے سے پڑھا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو پڑھ کر سنانے کا حکم فرمایا۔ انہوں نے پڑھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی تعریف فرمائی۔ میرے دل میں شک کی لہری دوڑ گئی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کے بارے میں (معاذ اللہ) نظر ثانی کا خیال اس شدت سے ذہن میں ابھرا جتنا جاہلیت میں بھی نہ تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب میرے چہرے کے تاثرات دیکھے تو میرے سینے پر ایک ضرب لگائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کا میرے سینے پر پڑنا تھا کہ میں پسینہ پسینہ ہو گیا شدتِ خوف سے یوں لگا جیسے میں بارگاہ ایزدی میں حاضر ہوں اور ذات جلالت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا: اے ابیّ! مجھے حکم دیا گیا تھا کہ قرآن مجید ایک ہی طریقہ پر پڑھا کروں۔ میں نے اپنی امت کے ساتھ رعایت کی درخواست کی تو دوبارہ حکم ہوا کہ دو طریقوں سے پڑھ لیا کرو۔ میں نے پھر عرض کیا: میری امت کے ساتھ رعایت کی جائے۔ تیسری مرتبہ سات طریقوں سے پڑھنے کی اجازت دے دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا کہ آپ کی درخواست کو ہم نے جتنی بار واپس کیا ہے، ہر بار کے بدلے آپ ایک دعا ہم سے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ دو دعاؤں میں تو میں نے یہی مانگا کہ ”اللّٰھمّ اغفِرْ لأمّتِی، اللّٰھمّ اغفِرْ لأمّتِی“ (اے اللہ میری امت کو

بخش دے، اے اللہ میری امت کو بخش دے)۔ البتہ تیسری بار کے بدلے جو دعا تھی وہ میں نے اس دن کے لیے بچا رکھی جب سب لوگ حتیٰ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی میرے پاس یہ امید لے کر آئیں گے۔

حضرت اُبیؓ کی حدیث کی وضاحت

حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے قول "فَسَقَطَ فِي نَفْسِي" (میرے دل میں خیال ابھرا) کا معنی یہ ہے کہ میں اس بات پر حیران اور مبہوت ہو کر رہ گیا۔ مطلب یہ کہ شیطان نے ان کو شک میں مبتلا کرنے اور اس لمحے ان کا یقین متزلزل کرنے کے لیے ان کے دل میں وسوسہ ڈال دیا۔ اور وہ اس طرح کہ قراء ت کے اختلاف کو جو درحقیقت کوئی بڑی بات نہ تھی، خوب بڑھا چڑھا کر ان کے ذہن میں ڈالا، حالاں کہ قراء ت کا اختلاف قرآن میں نسخ سے بڑا مسئلہ تو کسی صورت نہ تھا۔ جب نسخ کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان حضرات کے دلوں میں نہ تو اس کے امکان میں شک گزرا، نہ ہی اس کی تکذیب کا خیال آیا تو قراء ت کے اختلاف میں ایسی کون سی چیز تھی جس سے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا؟۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اس خیال کو بھانپ کر تنبیہ کی غرض سے ان کے سینے پر ضرب لگائی تو دست مبارک سینہ پر لگتے ہی ان کا انقباض دور اور دِل منور ہو گیا۔ یہاں تک کہ کشف اور شرح صدر سے معاینہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جب حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کو اپنے خیال کی غلطی کا یقین ہو گیا تو ان پر اللہ تعالیٰ کا خوف طاری ہو گیا اور وہ بارگاہِ ایزدی میں حیا سے پسینہ پسینہ ہو گئے۔ اس خیال کی نوعیت اسی طرح کی تھی جس طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اَجمعین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ:

[۱۰۵] إِنَّا نجِدُ فِی أنفُسِنَا ما يتعاظَمُ أحدُنَا أنْ يتكلّم به۔قال: "وقد وجدتموه"؟ قالوا:نَعَم، قال: "ذلك صريح الإيمان"۔

ہمارے دلوں میں ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن کو زبان سے ادا کرنے کی ہم میں

[۱۰۵] صحیح مسلم: كتاب الإيمان، باب بيان الوسوسة في الإيمان وما يقوله مَن وَجدَها ۱:۱۱۹، اسی معنی کی احادیث قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ سنن أبو داوٗد: كتاب الأدب، باب في ردالوسوسه ۴:۳۲۹، مسنداحمد: مسند ابی هريرة رضی الله عنه ۳:۱۸۶، شعب الإيمان، الثامن من شعب الإيمان......، فصل فيما يجاوز الله عن عباده...... ۱:۳۰۱، صحیح ابن حبان: كتاب الإيمان، باب التكليف ۱:۳۶۱، بخاری: الأدب المفرد، باب الوسوسة ۱:۳۴۱ میں بھی منقول ہے۔

سے کوئی شخص جرأت نہیں کر سکتا۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: کیا واقعی تم لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہی کیفیت عین ایمان ہے۔ یہ حدیث امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے۔

اور اس کا تفصیلی بیان اِن شاء اللہ سورۂ اعراف میں آئے گا۔

☆☆☆☆☆

باب: ۱۳

حفظ وتدوینِ قرآن عہدِ نبوی تاعہدِ عثمانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں قرآن مجید لوگوں کے سینوں میں متفرق طور پر محفوظ تھا۔ بعض لوگوں نے اسے کاغذ، کھجور کی کھال، سفید رنگ کے باریک اور دھار دار پتھروں، مٹی کے پکے ہوئے برتنوں اور دیگر چیزوں پر لکھ کر محفوظ کر لیا تھا۔

اَصمعیؒ کہتے ہیں: "لِخاف" سفید رنگ کے باریک پتھروں کو کہتے ہیں اور یہ لَخْفَۃٌ کی جمع ہے۔ "ظُرَر" چُھری کی طرح تیز دھار پتھر ہوتا ہے۔ اس کی جمع "رُطَب رِطاب اور رُبَع رِباعٌ" کے وزن پر "ظِرَار" آتی ہے۔ اسی کی ایک اور جمع "صُرَدٌ صِرْدَان" کے وزن پ پر "ظِرّان" بھی ہے۔

جمع قرآن کی ابتداء

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جنگ یمامہ کے موقعہ پر جب بہت سے قُرّاء شہید ہو گئے، جن کی تعداد سات سو نقل کی گئی ہے تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو قرآن مجید یکجا جمع کرنے کا مشورہ دیا تاکہ یہ کام شیوخِ قراء حضرات اُبی، ابن مسعود اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اَجمعین کی زندگیوں میں ہی انجام پا جائے۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے یہ کام حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے ذمہ لگایا۔ انہوں نے شدید محنت کے بعد اسے یکجا جمع کر لیا مگر سورتوں کی ترتیب کا کام پھر بھی باقی رہ گیا۔ امام بخاریؒ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ:

[۱۰۶] حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے اس روز بلا بھیجا جب جنگ یمامہ میں بہت سے مسلمان شہید ہوئے۔ جب میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان کی

---

[۱۰۶] صحیح بخاری: كتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن ۳: ۲۲۵، كتاب تفسير القرآن، تفسير سورة "براءة"، كتاب الاحكام، باب يُستحب للكاتب أن يكون اميناً عاقلاً، صحیح ترمذی: أبواب التفسير، باب ومن سورة التوبة ۵:۳۸۳، صحیح ابن حبان: كتاب السير، باب فى الخلافى والإمارة، ...... ۱:۳۵۹، ۱۰:۳۶۴، مسند ابویعلی: مسند ابى بكر الصديق ۱:۹۱، سنن بیہقی: باب الدليل على أن ما جمعته مصاحف الصحابة رضى الله عنهم كله قرآن--- ۲:۳۲۳، شعب الإيمان، الرابع من شعب الإيمان--- ذكر حديث جمع القرآن ۱:۱۹۵

خدمت میں حاضر ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ مجھ سے یوں مخاطب ہوئے: عمر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور کہا کہ جنگ یمامہ میں ہمارے ساتھی کثرت سے شہید ہوئے ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آئندہ جنگوں میں دیگر قراء بھی شہید نہ ہو جائیں اور اس طرح قرآن مجید کا بڑا حصہ ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہے۔ اس کی حفاظت کی صرف یہ صورت ہے کہ اسے یکجا جمع کر دیا جائے۔ اس لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ قرآن مجید کو جمع کروا ہی دیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں وہ کام کیسے کر سکتا ہوں جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ انہوں نے جواب دیا: خدا گواہ ہے اس کام میں خیر ہی خیر ہے۔ وہ مجھے بار بار کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں مجھے شرح صدر سے نواز دیا اور میری بھی وہی رائے بن گئی جو عمر رضی اللہ عنہ کی تھی۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اس دوران حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہیں تشریف فرما تھے مگر انہوں نے کوئی بات نہیں کی۔ پھر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے فرمایا: آپ ایک نوجوان اور سمجھدار آدمی ہیں اور آپ پر کسی نے کبھی اعتراض بھی نہیں کیا۔ آپ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر وحی کی کتابت کرتے رہے ہیں۔ اس مناسبت سے میں یہ عظیم کام آپ کے سپرد کر رہا ہوں کہ آپ قرآن مجید کے جو حصے جہاں ملیں ان کی تحقیق کر کے یکجا جمع کر دیں۔ اللہ کی قسم! اگر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کسی پہاڑ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام میرے ذمہ لگا دیتے تو مجھے اتنا مشکل نہ لگتا جس قدر قرآن مجید جمع کرنے کا کام مشکل تھا جس کا انہوں نے مجھے حکم دیا۔ میں نے عرض کیا: آپ دونوں حضرات وہ کام کیسے کر سکتے ہیں جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ گواہ ہے اس کام میں خیر ہی خیر ہے۔ اس کے بعد میں بار بار ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اس پر بات کرتا رہا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اسی طرح اطمینانِ قلب نصیب فرما دیا جس طرح ان دونوں حضرات کو فرمایا تھا۔

سورۂ توبہ کی بعض آیات کی تلاش

میں نے کمر کس لی اور قرآن مجید کے مختلف حصوں کو چمڑے کے ٹکڑوں، شانوں

کی ہڈیوں، کھجور کی ٹہنیوں اور لوگوں کے سینوں سے حاصل کر کر کے اس کی تحقیق کرتا رہا اور اسے جمع کرتا رہا یہاں تک کہ سورۃ توبہ کی دو آیتیں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ [التوبہ ۹:۱۲۸] (بے شک تمہارے پاس ایک پیغمبر آئے ہیں تمہاری ہی جنس میں سے) آخر تک صرف حضرت خُزیمہ[1] انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لکھے ہوئے یہ قرآنی صحیفے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس محفوظ رہے۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آگئے اور تا حیات انہی کے پاس رہے۔ ان کی وفات کے بعد اُم المؤمنین حضرت حفصہ بنت عمر رضی اللہ عنہما کے پاس رہے۔

لیثؒ کہتے ہیں: مجھ سے عبد الرحمٰن بن غالب نے بیان کیا، انہوں نے ابن شہاب زہری سے روایت کیا اور خزیمہ انصاری کی بجائے ابو خزیمہ انصاری کا ذکر کیا۔ اسی طرح اُبو ثابت کہتے ہیں: ہم سے ابراہیم نے بیان کیا اور کہا کہ یہ آیتیں خزیمہ کے پاس ملیں یا اُبو خزیمہ کے پاس: ﴿فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ. عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ.﴾ [التوبہ ۹:۱۲۹] (پھر اگر وہ لوگ روگردانی کرتے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ میرے لیے تو اللہ کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اسی پر میں نے بھروسہ کر لیا۔ وہی عرش عظیم کا مالک ہے)۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کے الفاظ یوں نقل کیے ہیں:

[۱۰۷] فَوَجدتُ آخِرَ سُورة بَراء ة معَ خُزيمة بن ثابت: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ [التوبة ۹:۱۲۸-۱۲۹]

چناں چہ سورۂ براءت کی آخری آیات ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ. عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ مجھے خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں۔امام ترمذیؒ نے فرمایا: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

---

[۱۰۷] جامع ترمذی: كتاب التفسير، باب ومن سورة التوبة ۵: ۲۸۳-۲۸۴

۱۔ حضرت خزیمہ بن ثابت اُنصاری رضی اللہ عنہ (م ۳۷ھ) جلیل القدر بدری صحابی ہیں۔ ان کی گواہی دو گواہوں کے برابر شمار ہوتی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دیتے ہوئے معرکہ صفین میں شہید ہوئے۔ اُبو خزیمہ ان کے علاوہ دوسرے شخص ہیں۔ الإصابة تعارف نمبر ۲۲۵۳

سورۂ احزاب کی بعض آیات کی تلاش

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

[۱۰۸] لَمَّا نَسَخْنَا الصُّحُفَ فِی المَصَاحِفِ فَقَدْتُ آيَةً مِنْ سورة "الأحزاب" كنتُ أَسْمَعُ رسولَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يقرؤها، لم أجدها مع أحدٍ إلا مَعَ خُزيمة الأنصارى۔ الذى جَعَل رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم شهادَته بِشَهَادَةِ رَجُلين۔ ﴿رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾۔

جب ہم نے قرآن مجید کے صفحات کو لکھ کر کتابی شکل میں جمع کیا تو اس موقعہ پر مجھے سورۂ احزاب کی آیت: ﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ [الأحزاب ۳۳:۲۳] (کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے) نہیں مل رہی تھی۔ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے ہوئے سنا کرتا تھا۔ میں اسے تلاش کرتا رہا اور بالآخر مجھے خزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس مل گئی جن کی گواہی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مردوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا)۔

امام ترمذیؒ اسی حدیث کے الفاظ یوں نقل کرتے ہیں:

فَقَدتُ آيةً مِن سورةِ الأحزاب ،كنتُ اَسْمَعُ رسولَ اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم يَقْرَؤها ﴿مِنَ الْمُؤمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيهِ۔ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ﴾ فَالتَمَسْتُهَا فوجدتها عند خزيمة بن ثابت أو أبي خزيمة فألحقتها في سورتِهَا۔

مجھے سورۂ احزاب کی ایک آیت کریمہ جسے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا کرتا تھا، نہیں مل رہی تھی اور ۔ آیت کریمہ ﴿مِنَ الْمُؤمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيهِ. فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يُنْتَظِرُ﴾ [الأحزاب۳۳: ۲۳] ہے۔ اہل ایمان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے اللہ سے جو عہد کیا تھا اس میں سچے اُترے۔ سو ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی نذر پوری کر چکے اور ان میں سے کچھ انتظار کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں اسے ڈھونڈتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ حضرت خزیمہ بن ثابت یا ابوخزیمہ کے پاس مل گئی اور میں نے اسے اس کی متعلقہ سورت میں لگا دیا۔

[۱۰۸] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن ۷:۹۹

مؤلف کی رائے

میرے خیال میں سورہ براء ت کی آیت کا نہ ملنا پہلی دفعہ جمع قرآن کے موقعہ پر تھا اور سورۂ احزاب والی آیت کا نہ ملنا دوسری دفعہ جمع کے وقت تھا۔ امام طبریؒ کہتے ہیں کہ سورۂ براء ت والی آیت پہلے موقعہ پر گم ہوئی مگر پہلی بات ہی زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔

عہدِ صدیقی اور عہدِ عثمانی کے جمع قرآن میں فرق

اگر کوئی سوال کرے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جمع قرآن کا کام مکمل کر چکے تھے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا لوگوں کو ایک قرآن پر اکٹھا کرنے کا مطلب کیا ہوا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جو کام کیا ہے اس سے مراد قرآن مجید کے متفرق حصوں کو ایک جگہ جمع کرنا ہرگز نہیں۔ غور تو کیجئے آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس جو پیغام بھیجا وہ یہ تھا کہ جو صفحات کا مجموعہ آپ کے پاس ہے، وہ ہماری طرف بھیج دیجئے۔ ہم اس سے مزید نسخے تیار کروا کر اسے واپس آپ کے پاس بھیج دیں گے۔

عہدِ عثمانی میں جمع قرآن کا مطلب اور اس کے اسباب

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اس جمع شدہ قرآن مجید کے نسخے تیار کروانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف علاقوں میں پھیل چکے تھے اور ان کی روایات کے اختلاف کی وجہ سے لوگ مختلف قراء ات سے قرآن مجید پڑھنے لگے تھے۔ لوگوں کی قراء ات میں یہ اختلاف اس قدر شدت اختیار کر گیا تھا کہ اہل عراق اور اہل شام کے درمیان اسی پر تنازع اٹھ کھڑا ہوا جس کی روداد حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ یوں بیان فرماتے ہیں:

[۱۰۹] وذلك أنّهم اجتمعوا في غزوةِ أرمينيةَ فَقرأتْ كلُّ طائفةٍ بِمَا روىَ لهَا، فاختَلَفُوا وتنازَعُوا وأظْهرَ بَعْضُهُمُ إكْفارَ بَعْضٍ والبَراء ة مِنهُ وتَلاعَنُوا۔

واقعہ یوں ہوا کہ یہ لوگ غزوہ ارمینیہ کے سلسلہ میں جمع تھے اور ان میں سے ہر جماعت اسی روایت کے مطابق تلاوت کرتی تھی جو اسے ملی تھی۔ اب روایات کے اختلاف سے ان کے درمیان تنازع اٹھ کھڑا ہوا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے ایک دوسرے کی قراء ت کا علی الاعلان انکار کرنا شروع کر دیا اور اسی بناء پر ایک دوسرے سے لاتعلقی کا اظہار کرنے لگے۔ ہر کوئی دوسرے کو مورد الزام ٹھہرا رہا تھا۔

---

[۱۰۹] صحیح بخاریؒ: كتاب فضائل القرآن باب جمع القرآن ۴:۱۹۰۸ .... بقیہ آئندہ صفحہ پر

اختلاف کی یہ کیفیت دیکھ کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو امت کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چناں چہ جب حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ آئے تو جیسا کہ ''صحیح بخاری'' اور ''جامع ترمذی'' میں ہے، وہ اپنے گھر جانے سے پہلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

بقیہ از صفحہ گزشتہ............

یہ روایت مختصر ہے اور اس میں ایک دوسرے کے انکار کا ذکر نہیں ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۸: ۶۳۴ میں اسی حدیث کے تحت عمارہ بن غزیہ سے ایک روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ زیرِ نظر روایت سے بہت حد تک ملتے ہیں۔ اس روایت کا جو معنی فوراً ذہن میں آتا ہے کہ شاید اس بناء پر لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہنا شروع کر دیا، یہ صحیح نہیں ہے اس سے مراد مطلق اس قراءت کا انکار ہے جیسا کہ فتح الباری ۸:۶۳۵ میں مصعب بن سعد سے منقول ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو فرمایا: ''تمترون فی القرآن، تقولونَ قِراء ۃ اُبَی، قراء ۃ عبداللّٰہ، ویقول الآخر: واللّٰہِ ماتُقِیم قِراءَ تَکَ'' (کیا تم قرآن میں شک کرنے لگے ہو، کوئی کہتا ہے اُبی کی قراءت، کوئی کہتا ہے عبداللہ کی قراءت، اور کوئی اٹھتا ہے تو کہتا ہے: تم قراءت صحیح طریقہ سے نہیں کرتے)۔ اس کے لیے ''کفر'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ چنانچہ محمد بن سیرین کی روایت میں ''کَفَرْتُ بِمَا تقُول'' (تو جو کچھ کہتا ہے میں اس کا انکار کرتا ہوں) اور ابن ابی داؤد نے بکیر بن اشج کی روایت میں نقل کیا ہے: ''انّ ناسا من أھلِ العراقِ یُسْئَلُ اَحَدُھم عن الآیۃ فَإذا قَرأھا قال: إلا أنّی أکفر بھذہ، ففشا ذلک فی الناس فکلّم عثمانُ فِی ذلک'' (عراق کے کچھ لوگوں کی یہ عادت بن گئی تھی کہ کوئی شخص کسی دوسرے سے کسی آیت کے بارے میں پوچھتا۔ جب وہ شخص یہ آیت پڑھتا تو پوچھنے والا کہتا: مگر میں تو اس قراءت کو نہیں مانتا۔ یہ طریقہ اسی طرح لوگوں میں پھیل گیا یہاں تک کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں یہ مسئلہ پیش کر دیا گیا۔ پھر یہ بات بھی طے ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے مختلف قراءات رائج ہونے کے باوجود مذکورہ بالا شدت نہیں پائی جاتی تھی بلکہ یہ معاملات مختلف علاقوں (شام وعراق) وغیرہ کے نومسلموں کے درمیان وجہ نزاع بنے۔ علامہ ابن خلدون نے تیس ہجری کی تاریخ کے ساتھ یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے جس میں قراءات کے اس اختلاف پر وہاں موجود تمام صحابہ اور تابعین کی تشویش کا تذکرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''واستعظمہٗ، وحذر من الاختلاف فی القرآن ووافقہ من حضر من الصحابۃ والتابعین'' (حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو یہ بات عجیب لگی، انہوں نے اسے غیر معمولی امر سمجھا اور قرآن میں اختلاف سے لوگوں کو متنبہ کیا۔ اس سلسلہ میں جتنے صحابہ اور تابعین وہاں موجود تھے سب نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ البتہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں کو حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ سخت موقف پسند نہ آیا اور انہوں نے اس پر احتجاج کیا۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ان کے احتجاج کو غلط قرار دیا اور ان پر سختی کی جس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کبیدہ خاطر ہوئے۔ یہ تمام باتیں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کہہ دیں۔ابن خلدون: غزوۃ حذیفۃ...... وأمر المصاحف ۲:۱۳۵۔ لسان العرب میں ''اکفار'' کا معنی کسی کو نافرمانی پر مجبور کر دینا بھی لکھا ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں: ''أکفر الرجل مطیعہ: أخرجہ الی أن یعصیہ۔ التھذیب: إذا أَلْجأتَ مُطِیعَکَ إلی أن یَعصِیَکَ فقد أکْفرتہ'۔ (لسان العرب (کفر) اس معنی کے لحاظ سے عبارت کا معنی یہ ہوگا کہ لوگوں کو مجبوراً ایک دوسرے کی مخالفت کا اظہار کرنا پڑا اور انہوں نے ایک دوسرے کے موقف سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا۔ واللہ اعلم۔

[۱۱۰] أدرِكْ هذهِ الامّة قَبلَ أن تهلِكَ! قال: فيماذا؟ قال: في كتاب الله، انّي حضرت هذِه الغزوةَ، وجمعت ناسًا مِنَ العِراقِ والشام والحجاز، فوصفَ له ماتقدّمَ وقالَ: إنّي أخشَى عَليهِم أن يَختَلِفُوا فِي كِتابِهم كما اختلف اليهود والنصارى۔

اس امت کو ہلاک ہونے سے پہلے پہلے بچا لیجئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: معاملہ کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: قرآن مجید کی قراء ت میں اختلاف کے موقع پر میں اس غزوہ میں موجود تھا اور اس میں عراق، شام اور حجاز ہر طرف سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ پھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے گزشتہ واقعہ سنایا اور عرض کیا: مجھے ڈر ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی کتاب میں اسی طرح اختلاف کرنے لگیں گے جیسے یہود و نصاریٰ نے کیا۔

اختلافِ قراء ات اور اَحرفِ سبعہ پر مؤلف کا تبصرہ

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حدیث میں "أحرف سبعة" والی جو بات مذکور ہے اس سے مراد سات قُراء کی قراء ات نہیں کیوں کہ حق میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

[۱۱۱] قرآن مجید کے نسخے تیار کروانے کے بارے میں آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟ کیوں کہ لوگوں میں مختلف طریقہ ہائے تلاوت رائج ہو چکے ہیں اور یہ اختلاف اس قدر شدید ہو چکا ہے کہ ایک آدمی دوسرے کو کہتا ہے کہ میری قراء ت تمہاری قراء ت سے اچھی ہے اور کوئی تو یوں بھی کہتا ہے کہ میری قراء ت تمہاری قراء ت سے اعلیٰ درجہ کی ہے اور ایسی باتیں مسلمانوں کو بالکل زیبا نہیں۔ ہم نے عرض کیا: اس سلسلہ میں امیر المومنین نے کیا سوچا ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میری رائے یہ ہے کہ سب لوگ ایک ہی قراء ت پر

---

[۱۱۰] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن ۴:۱۹۰۸، جامع ترمذی: کتاب التفسیر، باب ومن سورة التوبة ۵:۲۸۴، صحیح ابن حبان: کتاب السیر، باب في الخلافة والأمارة ۱۰:۳۵۹۔ الفاظ تفسیر قرطبی سے مختلف ہیں۔

[۱۱۱] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن بروایت انس رضی اللہ عنہ ۶:۹۹، جامع ترمذی: کتاب التفسیر، باب ومن سورة التوبة ۵:۲۸۴

۱۔ ابو امیہ سوید بن غفلہ الجعفی (م ۸۰ھ) جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، جس دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین ہوئی اس دن مدینہ منورہ آئے۔ الإصابة، تعارف نمبر ۳۷۲۳

متفق ہو جائیں کیوں کہ آج اگر آپ لوگ ہی اس میں اختلاف کرنے لگیں گے تو بعد والوں کا اختلاف اس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ ہم نے عرض کیا: ہم امیر المومنین کی رائے سے بالکل متفق ہیں چناں چہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف پیغام بھیجا کہ قرآن مجید کا جو نسخہ آپ کے پاس محفوظ ہے وہ ہمارے پاس بھیج دیں، ہم اس سے مزید نسخے تیار کروا کر اصل آپ کو واپس کر دیں گے۔ انہوں نے وہ نسخہ ارسال کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرات زید بن ثابت، عبداللہ بن زبیر، سعید بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہم اجمعین کو اس کی کتابت پر مامور کیا۔ انہوں نے اس کے کئی نسخے تیار کر دیئے۔ اسی دوران حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قریشی حضرات کو فرمایا کہ اگر تم لوگوں کا اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قرآن مجید کے کسی حصہ کی قراءت میں اختلاف ہو جائے تو ترجیحاً اسے قریش کے لہجہ میں لکھیں کیوں کہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے چناں چہ ان حضرات نے اسی پر عمل کیا۔ جب مطلوبہ نسخے تیار ہوگئے تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نسخہ ان کے پاس واپس بھیج دیا اور جو نسخے ان حضرات نے تیار کیے تھے ان میں سے ایک ایک نسخہ ہر علاقے میں روانہ فرما دیا۔

اس کے علاوہ جو متفرق صفحات یا مجموعے تھے ان سب کو جلا کر ختم کرنے کا حکم فرما دیا۔

جمعِ قرآن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمات

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے اس معاملہ میں حضرات مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم کی متفقہ رائے لینے کے ساتھ ساتھ اس دور کی دیگر عظیم شخصیات کو بھی اس میں شامل کیا اور ان سب سے اس بارے میں مشورہ لیا جس کے نتیجہ میں ان سب کا اس بات پر اجماع ہوگیا کہ قراءات مشہورہ کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح ثابت ہوں ایک جگہ جمع کر لیا جائے اور اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے اسے مسترد کر دیا جائے۔ ان سب حضرات نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید کی اور یہ رائے واقعی ٹھیک اور توفیقِ الٰہی کے عین مطابق ثابت ہوئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ اس عظیم کارنامہ میں شامل تمام حضرات کو اپنی رحمت سے مالامال فرمائیں۔ آمین!

امام طبری رحمہ اللہ نے ایک اور روایت بھی ذکر کی ہے جس میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن مجید کے لیے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ اکیلے ابان بن سعید بن عاص کو معاون مقرر فرمایا مگر

قول ضعیف ہے۔ صحیح وہی ہے جو امام بخاریؒ ،امام ترمذیؒ اور دیگر حضرات نے نقل کیا ہے۔ امام طبریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حتمی نسخے تیار کروانے کے لیے اصل کے طور پر حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا والے نسخہ ہی کو اختیار فرمایا اور یہ بات بالکل صحیح ہے۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے تقرر پر اشکال

ابن شہاب کہتے ہیں: مجھے عبید اللہ بن عبد اللہ نے بتایا کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ نسخے تیار کرنے کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے تقرر پر تحفظات کا اظہار فرمایا اور کہا:

[۱۱۴] يا معشرَ المُسلِمين، أُعزَل عَنْ نَسخ المصَاحِفِ وَيتولّاهُ رجُلٌ، واللّٰهِ لقدَ أَسلَمتُ وإنّه لفِي صُلب رَجُلٍ كافر! يُريدُ زيد بن ثابت۔ ولذلك قال عبدُ اللّٰه بن مسعود: يا أهلَ العِرَاقِ، أكتُموا المصاحفَ الّتي عِندَكُم وغلُّوها، فإنّ اللّٰهَ عزّوجلّ يقول: ﴿وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [آل عمران ۳: ۱۶۱]فَالقوا اللّٰهَ بِالمصَاحِفِ۔

اے مسلمانو! یہ کیا بات ہوئی کہ مجھے قرآن مجید کے نسخے تیار کرنے میں شامل نہیں کیا گیا اور ایک عام آدمی کو شامل کر لیا گیا۔ اللہ کی قسم، میں تو اس وقت مسلمان ہوا تھا جب یہ پیدا بھی نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا والد بھی مسلمان نہ ہوا تھا۔ ان کا اشارہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اہل عراق سے مخاطب ہوکر کہا: تم لوگوں کے پاس جو مجموعے ہیں انہیں چھپا لو اور چپکے سے اپنے پاس محفوظ کر لو (اگر یہ خیانت بھی شمار ہوتی تو) اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں: (اور جو کوئی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اپنی خیانت کی ہوئی چیز کو حاضر کرے گا)۔اس طرح تم لوگ قرآن مجید ہی لے کر بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو گے۔ اس روایت کو امام ترمذی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

اس پر تفصیلی بحث اِن شاء اللہ سورۂ آل عمران میں آئے گی ۔ [آل عمران۳:۱۶۱]

---

[۱۱۴] جامع ترمذی: كتاب التفسير، باب ومن سورة التوبة ۵:۲۸۵، ابویعلی :مسند أبي بكر صديق رضي الله عنه ۱:۶۳۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حَسَن صحیح ہے مگر صرف زہریؒ سے منقول ہے، ان کے علاوہ ہمیں کہیں نہیں ملی۔ امام زہریؒ کہتے ہیں: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اس بات کو بہت سے جلیل القدر صحابہ کرام نے ناپسند فرمایا۔

اشکال کا جواب

ابو بکر ابن الأنباری کہتے ہیں: حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ شان میں یقیناً حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے افضل ہیں۔ انہوں نے اسلام بھی حضرت زید رضی اللہ عنہ سے پہلے قبول کیا اور دیگر امتیازات و فضائل کے اعتبار سے بھی بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ حضرات شیخین ابو بکر و عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے انہیں چھوڑ کر جمع قرآن مجید کی ذمہ داری حضرت زید رضی اللہ عنہ کو صرف اس لیے سونپی کہ انہیں حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی نسبت قرآن مجید زیادہ یاد تھا کیوں کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے پردہ فرمانے سے پہلے پورا قرآن مجید یاد کر لیا تھا جب کہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں صرف ستر اور کچھ مزید سورتیں یاد تھیں۔ باقی کی تکمیل انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد کی۔ واضح بات ہے جس شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں پورا قرآن مجید ختم کر لیا اور اسے اچھی طرح یاد کر لیا اسی کا زیادہ حق بنتا ہے کہ اسے جمع قرآن مجید کی ذمہ داری سونپی جائے۔ اس معاملہ میں اسے دوسرے حضرات پر ترجیح دینا عین حق ہے۔

ان باتوں سے کوئی جاہل یہ نہ سمجھے کہ اس سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی شان میں کمی واقع ہوتی ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ کا حفظ قرآن میں ان سے سبقت لے جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کا مجموعی مقام بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے زیادہ ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ حفظ قرآن میں تو حضرات شیخین ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما سے بھی آگے تھے مگر رتبہ میں ان سے بہتر ہرگز نہ تھے بلکہ وہ تو فضائل و مناقب میں ان حضرات کے برابر بھی نہ تھے۔ ابوبکر (ابن الانباری) کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ اشکال وقتی غصہ کی وجہ سے تھا۔ اس پر نہ تو کبھی عمل ہوا نہ ہی اسے دلیل بنا کر اختلاف ثابت کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ غصہ ختم ہونے کے بعد حقیقت حال ان پر بالکل واضح ہوگئی اور انہیں یقین ہوگیا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور جمہور صحابہ رضی اللہ عنہم کا انتخاب بالکل درست تھا۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسی وقت اپنے اشکال سے رجوع کر لیا اور تاحیات صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجماع میں ان کے ساتھ رہے۔

محدثین اور اہلِ تاریخ کے ہاں یہ بات مشہور ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قرآن مجید کا باقی حصہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حفظ کیا۔ بعض ائمہ نے تو یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا حفظِ قرآن ابھی کچھ باقی تھا کہ ان کی وفات ہوگئی۔ یزید بن ہارون نے ایک مرتبہ کہا کہ معوذتین کی شان سورۂ بقرہ اور آل عمران کے برابر ہے۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ قرآن مجید کا حصہ نہیں ہیں وہ

اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے والا ہے۔ ان سے کہا گیا کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ان کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو انہوں نے کہا: اس بات پر تو تمام مسلمان متفق ہیں کہ حفظِ قرآن مکمل کرنے سے پہلے ہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی تھی، مگر میرا خیال ہے کہ اس بات پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ایک روایت اسماعیل بن اسحاق اور دیگر حضرات نے بھی نقل کی ہے۔ حماد کہتے ہیں کہ میرے خیال میں انہوں نے یہ روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: جب کسی آیت کے بارے میں ان کی معلومات مختلف ہوتیں تو کسی ایسے شخص کو تلاش کرتے جس نے یہ آیت براہِ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھی ہوتی۔ اگر ایسا شخص مدینہ منورہ سے تین راتوں کی مسافت پر بھی ہوتا تو اسے لایا جاتا اور پوچھا جاتا: فلاں فلاں آیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو کیسے پڑھائی تھی؟ پھر وہ اسی طرح لکھی جاتی جس طرح یہ شخص بتاتا۔

[۱۱۳] ابن شہابؒ کہتے ہیں: ایک دن لفظ ''تابوت'' میں ان حضرات کا اختلاف ہوگیا۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ اسے ''تَابُوہ'' پڑھتے تھے اور حضرت ابن زبیر اور سعید بن العاص رضی اللہ عنہما ''تابوت'' کہتے تھے۔ معاملہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے فرمایا: اسے تاء کے ساتھ ہی لکھو کیوں کہ قرآن مجید لغتِ قریش میں نازل ہوا ہے۔ یہ روایت امام بخاریؒ اور امام ترمذیؒ دونوں نے ذکر کی ہے۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں چوں کہ اسے حضرت زید نے ''ھاء'' کے ساتھ پڑھا تھا اور قریشی حضرات ''تاء'' سے

---

[۱۱۳] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب جمع القرآن ۴:۱۹۰۷، جامع ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ التوبہ ۵:۲۸۴۔ یہ الفاظ بخاری میں نہیں بلکہ ترمذی میں ہیں، صحیح ابن حبان: کتاب السیر، باب فی الخلافۃ والإمارۃ ۱۰:۳۵۹، مسند ابویعلیٰ: مسند ابی بکر الصدیق ۱:۶۳، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب وجوب القراء ۃ علی مانزل من الأحرف السبعۃ ۳:۳۵۹۔ امام بیہقی نے اسماعیل کا قول نقل کیا ہے کہ ابراہیم بن حمزہ نے تابوت والا یہ واقعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ تک متصل نقل کیا ہے جب کہ ابوالولید نے اس کو حدیث سے جدا کر کے زہری رحمہ اللہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی کتب حدیث میں مندرجہ بالا تفصیل موجود ہے۔ بخاری کی مذکورہ کتاب، باب نزل القرآن بلسان قریش والعرب ۷:۹۷ میں الفاظ اس طرح ہیں کہ: ''اذا اختلفتم وزید بن ثابت فی عربیۃ من عربیۃ القرآن فاکتبوھا بلسان قریش'' (اگر تمہارا اور زید بن ثابت کا قرآن کی عربی زبان میں اختلاف ہو جائے تو اسے لغت قریش کے مطابق لکھو)۔ بیہقی :السنن الکبری، کتاب الصلاۃ، باب الدلیل علی ان ما جمعتہ مصاحف الصحابۃ ۲:۳۴۴ میں بھی اسی طرح ہے۔

پڑھتے تھے اس لیے اسے ''تاء'' کے ساتھ ہی لکھا گیا۔ مجموعی طور پر قرآن مجید اسی طرح لکھا گیا جس طرح پہلے سے لکھا ہوا موجود تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس سے مزید نسخے تیار کروائے۔ بعض حضرات نے ان نسخوں کی تعداد بھی بتلائی ہے، کچھ کہتے ہیں سات نسخے تھے اور بعض کا خیال ہے کہ چار تھے، اور یہی اکثریت کی رائے ہے۔ پھر یہ نسخے تیار کروا کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اطراف عالم میں بھجوا دیے، چنانچہ ایک نسخہ عراق کی طرف، ایک شام کی طرف اور تیسرا مصر کی طرف بھجوا دیا۔ یہ سب اصل نسخے تھے۔ انہی کو تمام علاقوں کے قرّاء نے معیار بنایا اور کسی نے اپنی پہلی روایات کی بنیاد پر ان نسخوں سے اختلاف نہیں کیا۔

اختلافِ قُرّاء کے اسباب

قراءِ سبعہ کی قراءات میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں کہ کسی کے ہاں کہیں کوئی حرف زیادہ ہے اور کسی کے ہاں کم ہے، اس کی بنیاد وہی مصاحف ہیں جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ارسال فرمائے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قراءت کی تمام جائز صورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نسخے تیار کروائے تھے اور اسی کے پیش نظر انہوں نے بعض نسخوں میں بعض مقامات پر بعض حروف لکھوا دیے اور بعض میں نہیں لکھوائے۔ مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ یہ سب صورتیں صحیح ہیں اور ان کے مطابق قراءت جائز ہے۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: پھر یہ بات بھی ثابت ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان مصاحف کے علاوہ سب قرآنی مجموعوں یا صفحات کو جلانے کا حکم دے دیا تھا۔ یہاں جو لفظ ''تُحْرَق'' استعمال ہوا ہے یہ دو طرح سے منقول ہے، بغیر نقطے کی ''حاء'' کے ساتھ [تُحْرَق بمعنی جلانا] اور نقطے والی ''خاء'' کے ساتھ جس کا معنی دفن کرنا آتا ہے۔ بغیر نقطے کی حاء والی روایت زیادہ قابل اعتماد ہے۔

حضرت عثمانؓ کا دفاع حضرت علیؓ کی زبانی

ابوبکر الانباری نے اپنی کتاب ''الردّ علی من خالف مصحف عثمان'' میں سوید بن غفلہ کا یہ قول نقل کیا ہے:

سَمِعتُ عَلیَّ بنَ أبی طالب کرّم اللّٰہ وجهه یقولُ: یا معشر الناسِ اتّقُوا اللّٰہَ! وَإیّاکُم والغُلُوَّ فِي عُثمان، وقولَکم: حَرّاقُ المصاحِف، فوَاللّٰہِ ماحَرَّقَھا إلّاعَن مَلَاءٍ مِنّا أصْحَابِ محمّدٍ صلی اللّٰہ علیه وسلم۔

میں نے حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ کو یہ فرماتے سنا: اے لوگو! اللہ سے ڈرو اور

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں زبان درازی سے باز رہو اور انہیں قرآن مجید جلانے والا مت کہو۔ اللہ کی قسم انہوں نے ہم سب اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان اوراق کو جلایا[1]۔

عمیر بن سعیدؒ سے منقول ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

لو کنتُ الوالی وقتَ عُثمان لَفَعَلْتُ فِی المصاحف مِثلَ الذی فَعَلَ عُثمان۔

اگر عثمان رضی اللہ عنہ کی جگہ میں خلیفہ ہوتا تو قرآن مجید کے نسخے تیار ہونے کے بعد بقیہ اوراق کے بارے میں میں بھی وہی فیصلہ کرتا جو انہوں نے کیا۔

بوسیدہ اوراق کا حکم

ابوالحسن بن بطال کہتے ہیں: جمع قرآن مجید کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے بقیہ اوراق جلا دینے کے حکم میں اس بات کی دلیل ہے کہ ایسی (بوسیدہ اور غیر کارآمد) کتابوں کا جلانا جائز ہے جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ لکھے ہوئے ہوں۔ یہ عمل ان کے احترام اور انہیں بے ادبی سے بچانے کے لیے ہے کیوں کہ اگر انہیں ویسے ہی زمین پر پھینک دیا جائے تو وہ قدموں کے نیچے آنے سے نہیں بچ سکتے۔ اسی طرح معمر نے ابن طاؤس سے نقل کیا ہے، وہ اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس ایسے خطوط جمع ہو جاتے جن میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ لکھا ہوتا تو وہ انہیں جلا دیتے۔ واقعہ حرّہ میں حضرت عروہ بن زبیر نے بھی اپنے پاس موجود فقہی کتب کو جلا دیا تھا۔ البتہ ابراہیم نخعی ایسے اوراق جلانے کو ناپسند کرتے تھے جن میں اللہ تعالیٰ کا ذکر ہوتا۔ بہر حال ایسے اوراق جلا دینے کے جواز والا قول ہی بہتر معلوم ہوتا ہے جس کی سب سے بڑی دلیل حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا ایسا کرنا ہے۔ قاضی ابوبکر لسان الأمت کہتے ہیں: اگر خلیفہ غور و خوض کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے تو اس کے لیے ایسے اوراق کا جلا دینا جائز ہے جن میں قرآن مجید لکھا ہوا ہو۔

۱۔ گویا ہم سب کی تائید انہیں حاصل تھی۔

فصل:

مسئلہ خلق قرآن

فرقہ حلولیہ اور حشویہ کا رد

علماءِ مالکیہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عمل میں حلولیہ[1] اور حشویہ[2] دونوں کا رد ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن کے حروف اور آوازیں بھی قدیم ہیں اور اس کی قراءت اور تلاوت بھی قدیم ہے، وہ ایمان اور روح کو بھی قدیم بتلاتے ہیں، حالاں کہ پوری امت کا اس پر اجماع ہے بلکہ یہود، نصاری اور (ہندو) براہمہ سمیت تمام ملحدین وموحدین یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ قدیم کو نہ تو بطور عمل اپنایا جا سکتا ہے نہ ہی کسی قدرت والے کے اختیار کا عمل دخل کسی بھی صورت میں اور کسی بھی سبب سے اس میں ہو سکتا ہے۔ اس طرح قدیم پر حالت عدم آ سکتی ہے نہ ہی وہ کسی صورت میں مُحدث ہو سکتا ہے جیسا کہ مُحدَث کبھی قدیم نہیں بن سکتا۔ قدیم تو وہ ہوتا ہے جس کے وجود کی کوئی ابتداء نہ ہو جب کہ مُحدَث وہ ہوتا ہے جو حالتِ عدم سے وجود میں آئے۔ اس طرح مذکورہ فرقوں نے تمام ادیان کے عقلاء اور دیگر تمام لوگوں کے اجماع کو ٹھکرا دیا اور کہا: مُحدَث بھی قدیم ہو سکتا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جب بندہ کلام اللہ کی تلاوت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے قدیم کلام کو اپنے عمل میں لاتا

۱۔ حلولیہ صوفیہ کے ایک مکتب فکر کا نام ہے جن کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر چیز میں خود موجود ہے۔ شیوخ منصور حلاج، ابن فارض اور ابن عربی وغیرہم اسی سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بارے میں علماء دو انتہائی مختلف آراء رکھتے ہیں۔ کچھ تو اس کو معرفت کا نام دیتے ہیں اور غیر صوفی حضرات میں سے کچھ اس کو زندقہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ حافظ ذہبی: المیزان، تعارف شیخ ابن عربی (محمد بن علی)۔ علامہ محمد اعلیٰ تھانوی نے کتاب توضیح المذاہب کے حوالہ سے لکھا ہے: یہ صوفیہ کی ایک جماعت کا نام ہے جو عورتوں اور بے ریش لڑکوں کو دیکھنا جائز سمجھتے ہیں اور اسی حال میں رقص کرتے ہیں اور کہتے ہیں یہ اللہ کی صفت ہے جو ہمارے اندر حلول کر گئی ہے ان کی مجالس میں چیخنا رونا ہائے وائے کرنا کپڑے پھاڑنا وغیرہ عام ہوتا ہے۔ محمد اعلیٰ تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون ۱: ۷۰۹

۲۔ حشویہ یا اہل حشو تجسیم کے قائل تھے اور قرآن مجید کے الفاظ کو ظاہری معانی میں لے کر اپنی طرف سے ان کی تاویلات کرتے تھے، جیسے انسانی اعضاء کی نسبت ذات باری تعالیٰ کی طرف کرنا وغیرہ۔ یہ نہ تو کرامیہ میں سے تھے نہ اصل شیعہ میں سے۔ پہلے حسن بصریؒ کے ساتھی تھے مگر بعد میں ان سے جدا ہو گئے۔ محمد اعلیٰ تھانوی: کشاف اصطلاحات الفنون ۱: ۶۷۸، اردو دائرہ معارف اسلامیہ ۸: ۳۴۹

ہے۔ اسی طرح اگر کوئی لکڑی میں یا مٹی کو پکا کر اس میں کھود کر حروف لکھتا ہے یا سونے یا چاندی کے حروف بناتا ہے یا کوئی کپڑا بُنتا ہے اس میں کتاب اللہ کی کوئی آیت نقش کر دیتا ہے تو یہ تمام لوگ اللہ کے قدیم کلام کو اپنے عمل میں لا رہے ہیں۔ گویا کلام اللہ اس کپڑے میں قِدم سے لکھا ہوا ہے اور لکڑی یا پختہ مٹی میں قِدم سے کھودا ہوا ہے اور اسی طرح سونے یا چاندی میں قِدم سے ڈھلا ہوا ہے ان لوگوں سے یہ پوچھا جائے کہ تمہارا کیا خیال ہے، کیا کلام اللہ کو پگھلا دینا یا مٹا دینا یا جلا دینا جائز ہے؟ اگر وہ اس کا جواب ہاں میں دیں تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں اور اگر کہیں کہ ایسا کرنا جائز نہیں تو انہیں کہا جائے کہ تمہارا کیا خیال ہے، ایسے حروف کے بارے میں جو کتاب اللہ کی کسی آیت کا مظہر ہیں مگر وہ شمع (موم)، سونے، چاندی، لکڑی یا کاغذ وغیرہ پر بنے ہوئے ہیں۔ اب اگر وہ آگ میں گر کر پگھل یا جل جائیں تو کیا تمہارے خیال میں اللہ تعالیٰ کا کلام جل گیا ہے۔ اس کے جواب میں اگر وہ ہاں کہیں تو یہ ان کے اپنے موقف کی تردید ہے اور اگر ان کا جواب نفی میں ہو تو ان سے پوچھا جائے کہ کیا تم نے خود نہیں کہا کہ یہ لکھائی بھی کلام اللہ ہے جو اب جل چکی ہے۔ تم نے یہ بھی کہا کہ یہ حروف بھی اس کا کلام ہیں اور وہ پگھل چکے ہیں۔ اب اگر وہ کہیں کہ حروف تو جل چکے ہیں مگر کلام اللہ باقی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے حق کی طرف رجوع کر لیا ہے اور صحیح بات تسلیم کر لی ہے اور اس کے جواب میں دیانتداری سے کام لیا ہے۔ یہی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی جسے اہل حق نے اپنا مذہب و مسلک قرارا دیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

[۱۱۴] ولَو كانَ القُرآنُ فِي إهابٍ ثم وَقَعَ فِي النار ما احترق۔

(قرآن مجید اگر چمڑے میں ہو اور پھر آگ میں گر جائے تو آگ اسے نہیں جلائے گی)۔

اسی طرح حدیث قدسی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

[۱۱۵] أنزَلْتُ عَليكَ كِتاباً لا يغسِلُهُ الماءُ، تَقرؤُهُ نائِمًا وَيَقْظَانَ۔

میں نے آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جسے پانی بھی دھو کر نہیں مٹا سکتا، آپ اسے بیداری اور نیند دونوں حالتوں میں پڑھیں گے۔اس کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

---

[۱۱۴] یہ حدیث تقریباً حسن ہے۔مسند احمدؒ: حدیث عقبہ بن عامر ۴:۱۵۵، سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فضل مَن قرا القرآن ۲:۴۳۰ بروایت عقبہ بن عامرؓ۔امام اَبو یعلیٰؒ، دیلمیؒ اور دیگر حضرات نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ اس کی سند ابن لہیعہ کی وجہ سے قدرے ضعیف ہے مگر اس کے دو اور طرق کو ساتھ ملایا جائے تو اسے تقویت ملتی ہے۔طبرانیؒ :المعجم الکبیر ۷:۱۵۸،حافظ عراقی: شرح الإحیاء ۱:۲۷۳

[۱۱۵] صحیح مسلم: کتاب الجنة و صفة نعیمها، باب الصفات التي یعرف بها في الدنیا أهل الجنة بروایت عیاض بن حمار المجاشعی ۴:۲۱۹۷، مسند احمدؒ: حدیث عیاض بن حمار المجاشعی ۴:۱۶۲، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب الخوف والتقوی ۲:۴۲۵ مصنف عبدالرزاق: کتاب الجامع، باب القدر ۱۱:۱۲

اس سے ثابت ہوا کہ کلام اللہ ان ظاہری حروف کا نام نہیں، نہ ہی حروف کے ساتھ اس کی کوئی مشابہت ہے۔ اس مسئلہ میں طویل بحث کی ضرورت ہے۔ اس سے متعلقہ مباحث کتبِ اصول میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم نے بھی کتاب "الکتاب الأسنَیٰ فی شرحِ أسماءِ اللّٰہِ الحُسنَیٰ" میں اسے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

فصل:

جمعِ قرآن میں خبرِ واحد پر اکتفاء نہیں کیا گیا

روافض کا اعتراض

روافض(۱) پر اللہ کی پھٹکار ہو، انہوں نے قرآن مجید پر بھی اعتراض کر ڈالا۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی آیت یا کسی بھی بات کو نقل کرنے کے لیے خبر واحد ہی کافی ہے کیوں کہ سورہ براءت میں ارشاد باری تعالیٰ "مِنَ المُؤمِنِینَ رِجَالٌ" کے سلسلہ میں ایک ہی شخص خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے قول کو معتبر سمجھ کر شامل کر دیا گیا۔

اعتراض کا جواب

یہ حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کی گواہی اکیلی گواہی نہیں تھی بلکہ جب انہوں نے مذکورہ دونوں آیات پیش کیں تو بہت سے صحابہ کو وہ یاد آ گئیں۔ مزید یہ کہ خود حضرت زید رضی اللہ عنہ پہلے سے ان کو جانتے تھے، اسی لیے تو یہ فرمایا: مجھے سورۂ توبہ کے آخر سے دو آیتیں نہیں مل رہی تھیں۔ اگر وہ ان آیات کو پہلے سے نہ جانتے ہوتے تو انہیں اس بات کی طرف توجہ ہی نہ ہوتی کہ کچھ گم ہوا ہے یا نہیں۔ اس طرح یہ آیات اجماعِ صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہوئیں، اکیلے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی سے نہیں۔

۱۔ روافض کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ حضرت حسین بن علی رضی اللہ عنہما کے پوتے حضرت زید بن علی بن الحسین بن علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہم اجمعین نے جب ہشام بن عبد الملک کے خلاف خروج کیا تو ان کے حامیوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں گستاخانہ کلمات کہنا شروع کیے جس پر حضرت زیدؒ نے انہیں منع فرمایا تو وہ اس سے باز نہ آئے بلکہ حضرت زیدؒ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ صرف دو سو سوار آپ کے ساتھ رہ گئے۔ آپؒ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا: "أرفضتموني"؟ (کیا تم لوگوں نے مجھے چھوڑ دیا ہے؟) وہ کہنے لگے: جی ہاں۔ یہیں سے ان کا نام روافض (ساتھ چھوڑنے والے) پڑ گیا۔ اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین ص ۷۷

دوسرا جواب

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ان آیات کو صرف حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کی گواہی کی بنیاد پر قرآن مجید میں شامل کیا گیا تو یہ ان کی اکیلی گواہی دو افراد کی گواہی کی طرح معتبر ہونے کی وجہ سے ہے جیسا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ان کی گواہی سے ثابت ہے اور یہ ایسا مضبوط قرینہ ہے جس کی موجودگی میں دوسرے گواہ کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی[1]۔ باقی جہاں تک سورۂ احزاب کی آیت کا تعلق ہے تو وہ حضرت زید اور حضرت اَبو خزیمہ رضی اللہ عنہما دونوں کی گواہی سے ثابت ہوئی تھی کیوں کہ ان دونوں نے یہ آیت کریمہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنی تھی۔ مہلب سے بھی اسی طرح کا قول نقل کیا گیا ہے۔

خزیمہ اور ابوخزیمہ کی تحقیق

مہلبؒ نے ذکر کیا ہے کہ خزیمہ اور اَبوخزیمہ دو الگ الگ شخصیات ہیں۔ اَبوخزیمہ جن کے پاس سورۂ توبہ والی آیات ملیں، انصاری صحابی ہیں اور حضرت اَنس رضی اللہ عنہ بھی انہیں پہچانتے تھے۔ انہی کے بارے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ”نحنُ ورثناہ“ (ہم ان کے وارث بنے)، باقی جہاں تک سورۂ احزاب والی آیت کا تعلق ہے تو وہ حضرت خزیمہ بن ثابت کے پاس سے ملی۔ لہذا اس میں کوئی تعارض نہیں ہے اور یہ دونوں قصے بھی الگ الگ ہیں جن میں نہ تو کوئی اشکال ہے نہ خلط ملط ہونے کا اندیشہ۔ حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں: ابوخزیمہ کے صحیح نام کا علم نہیں وہ اپنی کنیت سے ہی مشہور تھے۔ ان کا نسب اَبوخزیمہ بن اوس بن زید بن اَصرم بن ثعلبہ بن غُنم بن مالک ابن النجار ہے۔ بدری صحابہ میں سے ہیں اور اس کے بعد کے معرکوں میں بھی موجود رہے اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ یہ حضرت مسعود بن اوس رضی اللہ عنہ کے بھائی ہیں۔ ابن شہابؒ عبید بن سباق سے اور وہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں: مجھے سورۂ توبہ کی آخری آیات ابوخزیمہ انصاریؓ سے ملیں۔ ان سے مراد یہی مذکورہ ابوخزیمہ ہیں۔ ان کے اور حضرت ابوخزیمہ حارث بن خزیمہؓ کے درمیان سوائے اس کے کوئی مناسبت اور کوئی تعلق نہیں کہ یہ دونوں حضرات انصاری صحابیؓ ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق اوس سے ہے اور دوسرے کا خزرج سے۔

۱۔ مؤلف کا اشارہ صحیح بخاری کی اس حدیث کی طرف ہے جو پہلے بھی مختصراً نقل کی گئی ہے اور جس میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب ہم نے قرآن مجید کے نسخے تیار کیے تو مجھے سورۂ احزاب کی ایک آیت خزیمہ انصاری کے علاوہ کسی کے پاس نہ ملی جسے میں اکثر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتا تھا۔ خزیمہ انصاری وہ ہیں جن کی گواہی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو آدمیوں کی گواہی کے برابر قرار دیا تھا۔ الإصابة بتعارف خزیمہ رضی اللہ عنہ ۱: ۴۲۵

عہدِ نبوی کے حفاظ صحابہ کرامؓ

امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

[۱۱۶] جَمعَ القُرآنَ على عَهدِ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم أربعةٌ، كُلّهم مِنَ الأنصار: أُبَيّ بن كعب، ومعاذ بن جَبل، وزيد بن ثابت وأبو زيد۔ قُلتُ لأنسٍ: مَنْ أبو زيد؟ قال أحد عمومتي۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں چار شخصیات نے مکمل قرآن مجید حفظ کیا، وہ چاروں حضرات انصار میں سے ہیں اور ان کے نام ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابو زید رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا، یہ ابو زید کون ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا: یہ میرے ددیالی رشتہ دار ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے ہی ایک اور روایت منقول ہے۔

[۱۱۷] ماتَ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم ولم يَجمعِ القرآن غير أربعة: أبو الدرداء، ومعاذ بن جبل، وزيد، وأبو زيد، قال: ونحن ورثناهُ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات تک صرف چار صحابہ ایسے تھے جنہوں نے پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، اور وہ ابو درداء،(۱) معاذ بن جبلؓ، زیدؓ، اور ابو زیدؓ ہیں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: ابوزید کی وراثت ہم نے ہی پائی۔

---

[۱۱۶] صحیح بخاری: كتاب فضائل القرآن، باب القراء من اصحاب النبی صلى الله عليه وسلم، ۴:۱۹۱۳، صحیح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل أبی بن كعب و جماعة من الأنصار رضی الله عنه ۴:۱۹۱۴، جامع ترمذی: كتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل و زيد بن ثابت وأبی ۵:۶۶۶، صحیح ابن حبان: كتاب إخباره صلی الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۶:۷۲، مسند احمد: مسند أنس بن مالك رضی الله عنه ۴:۱۱۷، سنن بیہقی: كتاب الفرائض، باب ترجيح قول زيد بن ثابت على قول غيره من الصحابة...... ۹:۲۴۵

[۱۱۷] صحیح بخاری: كتاب فضائل القرآن، باب القُرّاء من أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم ۶:۱۰۳

۱۔ اسم گرامی عُوَیمر ابن زید ہے، جلیل القدر صحابی ہیں۔ غزوہ اُحد اور بعد کے غزوات میں شریک رہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں وفات پائی۔ اسم گرامی زیادہ معروف نہیں۔ عویمر کے علاوہ عامر بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ الاصابۃ، تعارف عویمر ۳:۴۵

حضرت ابو زید رضی اللہ عنہ کا تعارف

ایک اور روایت میں حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ابو زید رضی اللہ عنہ کی وفات اس حال میں ہوئی کہ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ بدری صحابہ میں سے تھے۔ ابو زید[1] رضی اللہ عنہ کا اسم گرامی سعد بن عبید ہے۔

دیگر حفاظ صحابہ کرام

قاضی ابن الطیبؒ کہتے ہیں: حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ان روایات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں چار انصاری صحابہ کے علاوہ کسی صحابی نے قرآن مجید حفظ نہیں کیا۔ چنانچہ روایاتِ متواترہ سے ثابت ہے کہ حضرات عثمان، علی، تمیم داری، عبادۃ بن الصامت اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم سب نے مکمل قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اس طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد کہ چار حضرات کے علاوہ کسی نے مکمل قرآن مجید حفظ نہیں کیا کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ چار حضرات ہی ہیں جنہوں نے براہ راست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے پورا قرآن مجید حفظ کیا۔ ورنہ اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن مجید کے کچھ حصے خود زبانِ رسالت سے سُن کر حفظ کیے اور باقی ایک دوسرے سے سیکھا۔ یہ بات بھی تواتر سے ثابت ہے کہ حضرات خلفاء اربعہ نے اسلام میں اپنی سبقت اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں بلند مقام کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں مکمل قرآن مجید محفوظ کر لیا تھا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے حفظ کے بارے میں مؤلف کا استدراک

میں کہتا ہوں قاضی ابن طیبؒ نے حفاظِ قرآن مجید میں حضرات عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہ کا نام ذکر نہیں کیا حالاں کہ وہ دونوں بھی حفاظ کلام مجید میں شامل ہیں، جیسا کہ جریر نے عبداللہ بن یزید صہبانی سے اور انہوں نے کُمیل[2] سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

۱۔ ابو زید سعد بن عبید بن نعمان الانصاری الاوسی (م۱۶ھ) جنگ قادسیہ میں شہید ہوئے۔ الاصابۃ، تعارف سعد بن عبید۲:۳۱

۲۔ کُمیل ابن زیاد نخعی کوفی (م۸۲ھ) اکثر علماء رجال کے ہاں ثقہ اور کبار تابعین میں سے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حامیوں میں سے تھے۔ صرف ابن حبان نے ناقابلِ اعتماد کہا ہے۔ تھذیب التھذیب، تعارف کمیل ۸:۴۴۷-۴۴۸

[۱۱۸] كُنتُ مع رسول الله صلى الله عليه وسلم و معه أبو بكر و من شاء الله، فمررنا بعبد الله ابن مسعود وهو يُصلي، فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من هذا الذى يقرأ القرآن؟ فقيل له: هذا عبدالله بن أم عبد، فقال: انّ عبدالله يقرأ القُرآن غضًّا كما أُنزِلَ۔

میں ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہا تھا۔ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات بھی آپ کے ساتھ تھے۔ ہمارا گزر عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس سے ہوا۔ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: جو شخص قرآن مجید پڑھ رہا ہے وہ کون ہے؟ عرض کیا گیا: عبد اللہ بن اُم عبد (ابن مسعود) ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلا شبہ عبد اللہ اس طرح بے تکلف قرآن مجید پڑھتے ہیں جیسے نازل ہوا۔

بعض علماء فرماتے ہیں: اس حدیث میں لفظ "غَضًا کما أُنزِلَ" کا مطلب یہ ہے کہ وہ اسی لہجہ میں قرآن مجید پڑھتے ہیں جس میں نازل ہوا۔ ان قراءات میں نہیں پڑھتے جن کی اجازت ہر رمضان میں حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن مجید کا مذاکرہ کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی۔

[۱۱۹] وکیعؒ اور ان کے ساتھ دیگر متعدد حضرات نے اعمش سے اور انہوں نے ابو ظبیان سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: ایک مرتبہ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھ سے پوچھا: تم دونوں قراءتوں میں سے کس کے مطابق پڑھتے ہو؟ میں نے عرض کیا: پہلی قراءت کے مطابق جو کہ عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت ہے۔ انہوں نے فرمایا: بلکہ یہ تو آخری قراءت ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال ایک مرتبہ قرآن مجید جبریل علیہ

---

[۱۱۸] سنن ابن ماجہ: كتاب المقدمة، فضائل عبدالله بن مسعود. اس حدیث کی سند عاصم بن بہدلۃ کی وجہ سے حسن ہے، مستدرک حاکم: كتاب معرفة الصحابة، باب ذكر مناقب عبدالله بن مسعود رضى الله عنه ۳:۳۱۷ بروایت کمیل حضرت علی رضی اللہ عنہ سے، ۳:۳۱۸ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ۔ امام حاکم نے اسے شیخین کی شرط کے مطابق قرار دیا ہے اور حافظ ذہبی نے بھی ان کی تائید کی ہے۔ تفسیر قرطبی میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ہے۔ سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب كراهية النوم قبل العشاء...... ۲:۴۴۴، باب الدعاء فى الصلاة ۲:۵۲۲، مسند احمد: حديث عمرو بن الحارث بن المصطلق...... ۵:۳۵۱، مسند بزار: مسند عمار بن ياسر ۴:۲۳۹ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ یہی بات منقول ہے۔ امام بزارؒ نے یہی روایت مسند ابى بكر الصديق، ومماروى عبدالله بن مسعود عن ابى بكر رضى الله عنه ۱:۶۶ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہم دونوں سے نقل کی ہے۔ صحیح ابن خزیمہ: كتاب الصلاة، باب الجهر بالقراءة فى صلاة الليل ۲:۱۸۶ میں "يقرأ القرآنَ غضًّا" کی جگہ "رطبًا" ہے۔

[۱۱۹] مسند ابو یعلی: مسند ابن عباس رضى الله عنه ۴:۴۳۵ مختلف الفاظ کے ساتھ، مسند احمد: مسند عبدالله بن عباس بن عبدالمطلب ۱:۵۹۸

السلام کو سناتے تھے۔ مگر جس سال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی اس سال قرآن مجید دو مرتبہ سنایا گیا۔ اس دوران عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی موجود رہتے تھے۔ اس لیے اگر قرآن مجید کا کچھ حصہ منسوخ ہوا یا کچھ حروف میں تبدیلی ہوئی تو وہ ان کو بھی معلوم ہے۔

صحیح مسلمؒ میں حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

[۱۲۰] خُذوا القُرآنَ مِنْ اَرْبَعَةٍ مِن ابنِ أمّ عبد۔ فبدأبه۔ وَمعاذ بن جَبل وأُبَي بن كعب وسالم مَولَى أبي حُذيفة۔

قرآن چار آدمیوں سے سیکھو: ابن اُمّ عبد سے، سب سے پہلے انہی کا نام لیا، معاذ بن جبل سے، اُبی بن کعب سے اور ابو حذیفہ کے غلام سے۔

میں کہتا ہوں: یہ تمام روایات اس بات کی گواہ ہیں کہ گزشتہ قول کے برعکس حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پورا قرآن مجید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں حفظ کر لیا تھا۔ واللہ اعلم۔ ابو بکر الأنباری اپنی کتاب ''الرّد'' میں کہتے ہیں: ہم سے محمد بن شہر یار نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں ہمیں حسین بن الأسود نے بتایا، ان سے یحییٰ بن آدم نے ذکر کیا، انہوں نے ابو بکر سے اور انہوں ابو اسحاق سے روایت کیا، کہتے ہیں: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

[۱۲۱] قرأتُ مِن في رسولِ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم اثنتينِ وسَبْعينَ سُورةً۔ أو ثلاثاً وسَبْعِين سورة۔ وقراء ت عليهِ مِن البَقرَةِ إلى قوله تعالىٰ: ﴿إنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَوّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾۔

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بہتر یا تہتر سورتیں سیکھیں اور سورۂ بقرہ بھی ارشاد باری تعالیٰ: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ﴾ [البقرہ ۲:۲۲۲] (کچھ شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو

[۱۲۰] صحیح بخاری: كتاب فضائل الصحابه، باب مناقب أُبَی كعب ۲:۳۱۴۔ کچھ تقدیم و تاخیر کے ساتھ، صحیح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب مِن فضائل عبد الله بن مسعود و أمّه رضى الله عنهما ۴:۱۹۱۳۔ جامع ترمذی: كتاب المناقب، باب مناقب عبدالله بن مسعود رضى الله عنه ۵:۶۷۴، مستدرک حاکم: كتاب معرفة الصحابة رضى الله عنهم، باب مناقب سالم مولى ابى خذيفة ۳:۲۵۰، ذكر عمرو بن العاص ۳:۶۰۵۔ امام احمدؒ اور امام بزارؒ نے اسے نقل کیا ہے۔

[۱۲۱] اس کی سند میں انقطاع ہے کیوں کہ ابو اسحاق سبیعی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ اس حدیث کو امام بخاریؒ مسلمؒ، نسائیؒ اور ابن حبانؒ وغیرہم نے شقیق بن سلمہ سے نقل کیا ہے جس کی سند صحیح ہے۔ صحیح بخاری: كتاب فضائل القرآن، باب القراء من أصحاب النبی صلى الله عليه وسلم ۷:۱۰۲، سنن نسائی: كتاب الزينة، باب الذؤابة ۸:۱۳۴ قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ۔

دوست رکھتا ہے) تک سیکھی۔

ابو اسحاق (۱) کہتے ہیں: حضرت عبداللہ نے بقیہ قرآن مجید مجمع بن جاریہ انصاری (۲) سے سیکھا۔

میں کہتا ہوں: اگر یہ روایات صحیح ہیں تو وہ اجماع بھی صحیح ہے جس کا ذکر یزید بن ہارون نے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قاضی ابوبکر بن طیب نے ان کا ذکر ایسے لوگوں میں نہیں کیا جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں حفظِ قرآن مجید مکمل کر لیا تھا۔ واللہ اعلم۔ ابوبکر الأنباری کہتے ہیں: مجھے ابراہیم بن موسیٰ الخوزی نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہم سے یوسف بن موسیٰ نے ذکر کیا، انہیں مالک بن اسماعیل نے بتایا، ان سے زہیر نے ذکر کیا، انہوں نے ابو اسحاق سے نقل کیا، کہتے ہیں: میں نے اسود(۳) سے پوچھا کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سورہ اعراف کے بارے میں کیا کرتے تھے؟ انہوں نے کہا: وہ کوفہ آنے سے پہلے سورۂ اعراف جانتے ہی نہیں تھے۔ ابواسحاق کہتے ہیں، بعض اہلِ علم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ابھی معوذتین نہ سیکھی تھیں کہ ان کی وفات ہوگئی۔ اسی وجہ سے یہ دونوں سورتیں ان کے قرآنی نسخہ میں لکھی ہوئی نہیں ملتیں۔

اس بارے میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے جس کی کچھ تفصیل اس کتاب کے آخر میں معوذتین کی تفسیر کے ضمن میں اِن شاء اللہ بیان کی جائے گی۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حفظ پر ابن الأنباری کا اشکال

ابوبکر (ابن الأنباری) کہتے ہیں: جو حدیث ہم سے ابراہیم بن موسیٰ نے بیان کی، انہیں یوسف بن موسیٰ نے خبر دی اور انہیں عمر بن ہارون خراسانی نے بتائی، انہوں نے اسے ربیعہ بن عثمان سے اور ربیعہ نے محمد بن کعب قُرظی سے نقل کیا، وہ کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہی میں جن حضرات نے قرآن مجید ختم کر لیا تھا ان میں حضرات عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب اور عبداللہ بن مسعود رضوان اللہ علیہم بھی تھے تو یہ حدیث اہلِ علم کے نزدیک پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی بلکہ مقطوع ہے۔ اس کا انحصار صرف محمد بن کعب قرظی پر ہے۔ اس لیے نہ تو اس حدیث کو دلیل بنایا جا سکتا ہے اور نہ اس پر کسی امر کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

۱۔ ابو اسحاق عمرو بن عبداللہ السبیعی کوفی (م۱۲۹ھ) مشہور تابعی عالم ہیں۔ تہذیب التہذیب ۸: ۶۳

۲۔ حضرت مجمع بن جاریہ رضی اللہ عنہ جلیل القدر انصاری صحابی ہیں۔ نو عمری میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ ان کے والد مسجد ضرار کے بانیوں میں سے تھے مگر یہ سچے مسلمان تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کوفہ میں معلم قرآن بنا کر بھیجا تھا۔ انہوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی۔ الاصابۃ ۳: ۳۶۷

۳۔ ابو عمرو یا ابو عبدالرحمٰن اسود بن یزید نخعی (۷۵ھ) جلیل القدر تابعی اور ثقہ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے ان کی ملاقات بھی ہوئی اور استفادہ کا موقع بھی ملا۔ تہذیب التہذیب ۱: ۳۴۳

مؤلف کا جواب

میرا موقف یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد"خُذوا القُرآن مِن أربَعَةٍ، من ابنِ أمّ عبد......" (قرآن چار بندوں سے سیکھو، ایک ابن اُمّ عبد سے......") اس بات کی دلیل ہے کہ جو کچھ مندرجہ بالا حدیث میں مذکور ہوا وہ صحیح ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت اس حقیقت سے ہو جاتی ہے کہ تمام اصحاب قراء ات خواہ ان کا تعلق حجاز سے ہو، شام سے ہو یا عراق سے، ان سب نے اپنی اپنی قراء ت کی نسبت کسی نہ کسی صحابی کی طرف کی ہے اور اس صحابی کے بارے میں بتایا ہے کہ انہوں نے اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا علم حاصل کیا اور یہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے پورے قرآن مجید میں سے کسی حصے کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا چنانچہ عاصمؒ[1] اپنی قراء ت کی سند حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تک بیان کرتے ہیں، امام ابن کثیر[2] اپنی قراء ت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔

اسی طرح امام ابو عمرو[3] بن العلاء بھی اپنی قراء ت کی نسبت حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی طرف ہی کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عامرؒ[4] کی قراء ت کی نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف ہے۔

ان سب حضرات سے یہی منقول ہے کہ: "قرأنَا علیَ رَسُولِ اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم" (ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں قرآن مجید پڑھا)۔ خطابیؒ[5] کہتے ہیں کہ ان تمام قراء ات کی اسناد متصل اور ان کے راوی ثقات (قابل اعتماد) ہیں۔

☆☆☆☆☆

۱۔ امام عاصم بن ابی النجود (بہدلہ) الأسدی الکوفی (م ۱۲۸ھ) مشہور تابعی اور ائمہ قراء ت میں سے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند اور دیگر اکثر ممالک میں وہی قراء ت رائج ہے جو حفص بن سلیمانؒ نے ان سے نقل کی۔ تھذیب التھذیب ۵:۳۸

۲۔ امام ابو معبد عبداللہ بن کثیر مکی داری (م ۱۲۰ھ) قراء ت میں اہل مکہ کے امام تھے۔ تھذیب التھذیب ۵: ۳۶۷

۳۔ امام ابو عمرو زبان بن علاء مازنی بصری (م ۱۵۴ھ) قراء ت کے مشہور سات ائمہ میں سے ہیں۔ تھذیب التھذیب ۱۲: ۱۷۸

۴۔ امام ابو عمران عبداللہ بن عامر شامی (م ۱۱۸ھ) جلیل القدر تابعی اور دمشق کے قاضی تھے۔ تقریب التھذیب ۱: ۴۰۹

۵۔ ابو سلیمان حمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب البستی (م ۳۸۸)۔ مشہور محدث، فقیہ، شاعر اور ادیب تھے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھائی زید بن خطاب کی نسل میں سے تھے۔ کابل کے قریب علاقہ بست کے باشندے تھے۔ اعلام زرکلی ۲:۲۷۳

باب:۱۴

قرآنِ مجید کی سورتیں،آیات اوراَحزاب وحروف

سورتوں کی ترتیب: اجتہادی یا توقیفی؟

قاضی ابن طیب کہتے ہیں: اگر کوئی شخص کہے کہ علمائے سلف کا قرآنی سورتوں کی ترتیب میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض نے اپنے نسخے میں انہیں ترتیب نزولی سے لکھا اور مکی سورتوں کو مدنی سورتوں سے پہلے رکھا۔ اسی طرح بعض حضرات نے اپنے نسخہ کی ابتداء سورہ فاتحہ سے کی ہے اور بعض نے ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ [العلق ۹۶:۱] سے، اور یہی ابتداء حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نسخہ کی بھی ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے نسخہ کے شروع میں ﴿مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ [الفاتحۃ ۱:۳] لکھا تھا، اس کے بعد سورہ بقرہ تھی اور بقرہ کے بعد نساء۔ یہ ترتیب دوسرے حضرات کے نسخوں کی ترتیب سے مختلف تھی۔ اسی طرح حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف کے شروع میں ''اَلْحَمْدُلِلّٰہِ'' پھر ''نساء''، پھر ''آل عمران''، پھر ''انعام''، پھر ''اعراف'' اور اس کے بعد سورۂ مائدہ تھی۔ یہ ترتیب بھی دوسرے مصاحف سے مختلف ہے۔

قاضی ابوبکر ابن طیبؒ اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ممکن ہے قرآن مجید میں سورتوں کی موجودہ ترتیب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اجتہاد کا نتیجہ ہو۔ یہی بات مکی بن ابی طالب نے سورۂ براءت کی تفسیر میں ذکر کی ہے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ سورتوں کے اندر آیات کی ترتیب اور ان کے شروع میں ﴿ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ﴾ لکھنا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی بنیاد پر ہے۔ چوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ براءت کے شروع میں ''بسم اللہ'' لکھنے کا حکم ہی نہیں فرمایا اس لیے نہیں لکھی گئی۔ یہی بات اس سلسلہ کی تمام آراء میں سے زیادہ صحیح ہے، جیسا کہ تفصیل آئندہ آئے گی۔

ابن وہب[1] اپنی کتاب ''الجامع فی الحدیث'' میں کہتے ہیں: میری موجودگی میں ربیعہؒ[2] سے

۱۔ ابوعثمان ربیعہ بن ابی عبدالرحمٰن مدینہ منورہ کے سات مشہور فقہاء میں سے ہیں انھیں ربیعۃ الرای کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ تہذیب التہذیب ۳:۲۵۸

۲۔ ابو محمد عبداللہ بن وہب بن مسلم القرشی المصری (م ۱۹۰ھ) امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد خاص، بہت بڑے محدث، مفسر، قاری اور فقیہ تھے۔ الجامع فی الحدیث، ایک تفسیر، مؤطا صغیر اور مؤطا کبیر یادگار چھوڑیں۔ معجم المؤلفین ۶:۱۶۲

پوچھا گیا کہ سورہ بقرہ اور آل عمران کو دوسری سورتوں سے پہلے کیوں رکھا گیا حالاں کہ ان سے پہلے اس سے زیادہ سورتیں نازل ہو چکی تھیں، بلکہ یہ دونوں تو مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں؟

جن حضرات نے قرآن مجید کو ترتیب سے جمع کیا اور ان دونوں سورتوں کو پہلے لکھا، انہوں نے ایسا سوچ سمجھ کر ہی کیا۔ تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے اسی ترتیب پر اتفاق کیا تو اس کے بارے میں صحیح علم اور واقفیت کی بنیاد پر کیا۔ ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں اور اس کے بارے میں مزید کسی سے سوال نہیں کرتے۔

سُنَید کہتے ہیں: ہم سے معتمر نے بیان کیا، انہوں نے سلام بن مسکین سے نقل کیا اور سلام نے قتادہ سے روایت کی، فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا:

مَنْ كَانَ مِنْكُم مُتأَ سِّيًا فليتأسَّ بأصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأنّهم كانُوا أَبَرَّ هٰذِهِ الأمَّة قُلوبًا، وأعمقُهَا عِلمًا، وأقلّها تكلُّفًا، وأقومُهَا هَدْيًا، وَأحسَنُهَا حالاً، اختارهُم اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نبيِّهِ صلى الله عليه وسلم، وإقامَةِ دينه فاعرِفُوا لهم فَضْلَهُم، واتبِعُوهُم في آثارهم فَإنّهُمْ كانوا علَى الهُدَى المستقيم۔

تم میں سے اگر کوئی شخص کسی (رہنما) کی اتباع اور تقلید کرنا چاہے تو اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے۔ وہ اس امت میں سب سے زیادہ نیک دل، علم میں سب سے زیادہ پختہ، تکلفات سے سب سے زیادہ دور رہنے والے، سب سے زیادہ واضح طور پر ہدایت پانے والے اور سب سے بہتر کیفیت والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور نفاذِ دین کے لیے منتخب فرمایا۔ چناں چہ ان کی فضیلت پہچانو اور ان کے اعمال میں ان کی تقلید کرو کیوں کہ وہی ہدایت یافتہ اور سیدھے راستے پر چلنے والے تھے۔

علماء کے ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ سورتوں کی موجودہ ترتیب توقیفی یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر مبنی ہے۔

مصاحف صحابہؓ کی ترتیب میں اختلاف کی حقیقت

جو روایات حضرت اُبی، حضرت علی اور حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہم کے مصاحف کی ترتیب میں اختلاف کے بارے میں ملتی ہیں تو یہ اختلاف اس وقت تک تھا جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ آخری مرتبہ قرآن مجید کا دور نہ کر لیا۔ اس سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ـ نے اگرچہ صحابہ رضی

اللہ عنہم کو سورتوں کی ترتیب نہیں بتائی تھی مگر بعد میں باقاعدہ رہنمائی فرما کر انہیں مرتب کروایا۔ یونس نے ابن وہب سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے امام مالک رحمہ اللہ کو یہ فرماتے سنا: قرآن مجید اسی طرح ترتیب دیا گیا جس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کرتے تھے۔

ابو بکر الأنباری نے اپنی کتاب "الردعلی من خالف مصحف عثمان" میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو آسمان دنیا پر یکبارگی نازل فرمایا، پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بیس سال تک نازل ہوتا رہا۔ اس دوران کبھی کوئی واقعہ پیش آتا تو اس کی مناسبت سے کوئی سورت نازل ہو جاتی یا کوئی شخص سوال پوچھتا تو اس کے جواب میں کوئی آیت اتار دی جاتی۔ جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورت اور آیت کی صحیح جگہ کے بارے میں بتا دیتے چناں چہ سورتوں کی ترتیب اور نسق بھی مکمل آیات اور حروف کے نسق کی طرح ہے اور یہ سب کچھ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے اور انہیں رب العالمین کی طرف سے عنایت ہوا ہے۔ اب اگر کوئی شخص پہلے والی سورت کو بعد میں کر دیتا ہے یا بعد والی کو پہلے لے آتا ہے تو وہ اسی طرح غلط ہے جس طرح کوئی آیات کی ترتیب خراب کر دے یا حروف اور کلمات کو بدل ڈالے۔ اہل حق پر یہ اعتراض ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے سورۂ بقرہ کو "انعام" سے پہلے کیوں رکھا حالاں کہ نزول میں تو "انعام"، "بقرۃ" سے پہلے آئی تھی کیوں کہ یہ ترتیب جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لی گئی ہے اور وہی ارشاد فرمایا کرتے تھے:

[۱۲۲] ضَعُوا هٰذِهِ السورةَ مَوضِعَ كَذا و كَذا مِنَ القرآن۔

یہ سورت قرآن مجید میں فلاں فلاں جگہ رکھ دو۔

آیات کی ترتیب کے بارے میں حضرت جبریل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا کرتے تھے۔

حسن بن حباب نے ہمیں بتایا، انہیں ابو ہشام نے اور ابو ہشام کو ابوبکر بن عیاش نے بتایا، انہوں نے ابواسحاق سے اور ابواسحاق نے حضرت براء رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں کہ

[۱۲۳] آخر مانزل من القرآن ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِى الْكَلٰلَةِ﴾

---

[۱۲۲] مستدرک حاکم: كتاب التفسير، باب تفسير سورة التوبة ۲: ۳۶۰، ۲۴۱، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب الدليل على أن ماجمعته مصاحف الصحابة كله قرآن ...... ۲: ۴۲۶، مسند احمد: مسند عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ۱: ۹۲

[۱۲۳] صحیح بخاری: كتاب تفسير القرآن، باب براءة من الله ورسوله إلى الذين عاهدتم...... ۴: ۱۷۰۹، كتاب الفرائض، باب ﴿يستفتونك قل الله يفتيكم في الكلالة﴾ ۶: ۲۴۷۶، جامع ترمذی: كتاب تفسير القرآن، باب ومن سورة النساء ۵: ۲۴۹

قرآن مجید کی جو آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی وہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿یَسۡتَفۡتُوۡنَکَ قُلِ اللّٰہُ یُفۡتِیۡکُمۡ فِی الۡکَلٰلَۃِ﴾ (لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں (میراث) کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے کہ......) ہے۔

ابو بکر بن عیاش کہتے ہیں: اس میں ابواسحاق کو غلطی لگی ہے کیوں کہ محمد بن سائب نے ابو سائب سے نقل کرتے ہوئے ہمیں بتایا اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں:

[۱۲۴] آخر ما نزَلَ مِنَ القُرآنِ۔ ﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ﴾ فقال جبریل للنبی علیهما السلام: یا محمد ضَعْهَا فِی رأس ثمانین ومائتین مِنَ البَقَرَة۔

قرآن مجید کی جو آیت سب سے آخر میں نازل ہوئی وہ ﴿وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ ۟ ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَہُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ﴾ (اور اس دن سے ڈرتے رہو جس میں تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اس کا معاوضہ پورا پورا ملے گا اور ان پر ظلم ذرا بھی نہ ہوگا)۔ اس پر جبریل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسے سورۂ بقرہ میں دو سو اسی آیتوں کے فوراً بعد رکھ دیں۔

موجودہ ترتیب کے خلاف تلاوت کا حکم

ابوالحسن بن بطالؒ کہتے ہیں کہ جو حضرات قرآنی سورتوں کی ترتیب کو توقیفی مانتے ہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ نماز میں قراءت اور قرآن مجید سیکھنے کے دوران تلاوت بھی اسی ترتیب سے واجب ہے جیسے اب قرآن مجید میں موجود ہے، بلکہ وہ صرف یہ بات ضروری قرار دیتے ہیں کہ قرآن مجید اس ترتیب کے علاوہ لکھا ہوا نہ ہو۔ یہ کبھی نہیں سنا گیا کہ ان میں سے کسی صاحب نے نماز میں قراءت اور قرآن مجید سیکھتے وقت تلاوت میں بھی اسی ترتیب کو واجب قرار دیا ہو اور کہا ہو کہ سورۂ کہف کو بقرہ سے پہلے یا سورۂ حج کو کہف سے پہلے سیکھنا جائز نہیں۔

---

[۱۲۴] صحیح بخاری: کتاب تفسیر القرآن، سورۃ البقرہ، باب ﴿وَاتَّقُوا یَوۡمًا......﴾ ۵:۱۶۴، سنن نسائی: کتاب التفسیر، باب سورۃ البقرہ ۵:۳۰۷ میں اس کا پہلا حصہ بروایت عکرمہ عن ابن عباس منقول ہے، علامہ سیوطی نے الدرالمنثور ۱:۳۷۰ میں اسے عبد بن حمید، ابن منذر، ابن انباری، طبرانی، ابن مردویہ اور بیہقی کی دلائل النبوۃ کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ ابن ابی شیبہ نے اسے سُدی سے نقل کیا ہے اور ابن الأنباری نے بروایت ابو صالح اور سعید بن جُبیر نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری ۸:۲۰۵ میں ان دونوں اقوال میں تطبیق دینے کی یوں کوشش کی ہے کہ دونوں آیات ایک ہی وقت میں نازل ہوئیں۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ آیت کلالہ کے آخری آیت ہونے سے [illegible] کے بارے میں آخری ہو، مطلق نہ ہو۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے تفسیر قرطبی سورۂ بقرہ ۲: ۲۸۱

ذرا غور کیجیے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب اس بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

[۱۲۵] لَا یَضُرُّكَ اَیَّةً قَرَأْتَ قبلُ۔ وقد كان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الصلاۃِ السُّورۃَ فِی رَکعَۃٍ، ثم یقرأ فی رکعۃ أخری بِغیر السورۃ التی تَلیھا۔

تم جو سورت بھی پہلے پڑھ لو کوئی حرج نہیں، کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی رکعت میں ایک سورت پڑھتے تو دوسری رکعت میں اس سورت کے فوراً بعد آنے والی سورت کو چھوڑ کر کوئی اور سورت پڑھ لیتے تھے۔

باقی جو کچھ حضرات ابن مسعود اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ قرآن مجید کی ترتیب کے الٹ تلاوت کرنے کو ناپسند فرماتے تھے اور اس بارے میں ان کا ارشاد ہے کہ ایسا کرنے والا شخص اُلٹے دل والا ہے تو اس سے ان کی مراد وہ شخص تھا جو کسی سورت کی تلاوت اس کی ترتیب کے اس طرح الٹ کرتا ہے کہ اس کی آخری آیت سے شروع کرے اور ابتداء کی طرف ہٹتا چلا آئے کیوں کہ یہ ممنوع اور حرام ہے۔ واقعی کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو قرآن مجید اور اشعار مضبوطی سے یاد کرنے اور ان کو خوب زبان زد کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ یہ بات ایسی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے متنبہ بھی فرمایا اور اس سے باز رہنے کا حکم بھی دیا۔ کیوں کہ یہ قرآن کی سورتوں کو بگاڑنا اور انہیں اصل مقصد سے ہٹانا ہے۔

ترتیبِ نزولی کے مطابق قرآن مجید لکھنا

قرآن مجید کو تاریخ نزول کے مطابق ترتیب دینا ضروری نہیں۔ اس کی دلیل صحیح سند سے ثابت شدہ وہ روایات ہیں جن کے مطابق کچھ آیات مدینہ منورہ میں نازل ہوتی تھیں مگر انہیں مکی سورتوں میں لگا دیا جاتا تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

[۱۲۶] وما نَزَلَتْ سورَۃُ البقرۃِ والنساء إلّا وأنا عندہ۔

[۱۲۵] اس حدیث کی مکمل عبارت مجھے نہیں مل سکی البتہ "مایضرک أیة قرأت قبل" صحیح بخاریؒ: کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن ۴:۱۹۱۰،مصنف عبدالرزاقؒ: کتاب فضائل القرآن، باب إذاسمعت السجدۃ وأنت لصلی...... ۳:۳۵۲ اور شعب الإیمان، التاسع عشر......، فصل فی ترک خلط سورۃ بسورۃ ۲:۴۳۱ میں منقول ہیں۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں اس موضوع پر سب سے بہتر بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی موجودہ ترتیب خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جمع فرمودہ ہے اور عین ممکن ہے انہوں نے یہ ترتیب حضرت جبریل علیہ السلام سے لی ہو۔ قاری کے لئے بہتر یہ ہے کہ اسی منقول اور متفق علیہ ترتیب کے مطابق تلاوت کرے۔

[۱۲۶] صحیح بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن ۴:۱۹۱۰،شعب الإیمان، التاسع عشر......، فصل فی ترک خلط سورۃ بسورۃ ۲:۴۳۱

سورۂ بقرہ اور نساء تو اس وقت نازل ہوئیں جب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں تھی۔

مطلب یہ کہ مدینہ منورہ میں تھی مگر قرآن مجید میں انہیں کئی ایسی سورتوں سے پہلے لگایا گیا ہے جو اُن سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ اگر قرآن مجید کو تاریخ نزول کے مطابق ترتیب دیا جاتا تو سورتوں کی آیات کی ترتیب میں ضرور خلل آ جاتا۔

مکی اور مدنی سورتیں

ابوبکر الأنباری کہتے ہیں: ہم سے اسماعیل بن اسحاق القاضی نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں ہمیں حجاج بن منھال نے بتایا، انہیں ہمام نے بتایا، ہمام نے قتادہؒ[1] سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں: قرآن مجید کی درج ذیل سورتیں مدینہ منورہ میں نازل ہوئیں: **بقرہ، آل عمران، نساء، مائدہ، أنفال، براءت، رعد، نحل، حج، نور، احزاب، محمد، فتح، حجرات، رحمن، حدید، مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، یاأیّھا النبی لِمَ تُحَرِّمُ.** دسویں آیت کے اختتام تک......، **إذا زلزلت، إذا جاء نصرُاللّٰہ**۔ یہ تمام سورتیں مدینہ میں نازل ہوئیں اور باقی سارا قرآن مجید مکہ مکرمہ میں نازل ہوا۔

ابوبکر الأنباری کہتے ہیں: اب جو شخص منقولہ روایات کو بھی چھوڑ دیتا ہے اور صحابہ کے اجماع کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے قرآنی سورتوں کو مکہ اور مدینہ میں نزول کے اعتبار سے مرتب کرتا ہے تو اس کو سورہ فاتحہ ہی کا پتہ نہیں چلے گا کہ اسے کس سورت کے ساتھ رکھے کیوں کہ اس کے مکی یا مدنی ہونے میں شدید اختلاف ہے۔ اسی طرح اب جو آیت سورہ بقرہ کی آیت نمبر دو سو پینتیس کے فوراً بعد ہے، مجبوراً اسے آیت نمبر چالیس کے بعد لے جانا پڑے گا۔ اور جو شخص قرآن مجید کے نظم و ترتیب کو خراب کرتا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اس کا منکر شمار ہوتا ہے بلکہ اس طرح وہ ان تمام باتوں کا انکار کرتا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب تعالیٰ سے نقل کی ہیں۔

مکی مدنی سورتوں کی تقدیم و تاخیر میں حکمت

قرآن مجید کی موجودہ ترتیب میں مدنی سورتوں کی مکی سورتوں پر تقدیم کی ایک حکمت یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ذریعے عربوں کو ان کی زبان کے عین مطابق خطاب فرمایا ہے اور اس میں ان کے تمام فنون کلام اور محاوروں کا لحاظ رکھا ہے۔ اور چوں کہ کلام عرب کے اسالیب میں ایک اسلوب مؤخر کی تقدیم اور مقدّم کی تاخیر کا بھی ہے اس لیے نزول قرآن کے وقت یہ اسلوب بھی اس میں شامل کر لیا گیا تا کہ وہ یہ نہ کہہ سکیں کہ

۱۔ ابوالخطاب قتادہ بن دعامہ سدوسی بصری (م ۱۱۸ھ تقریباً) مشہور تابعی، ثقہ اور ماہر تفسیر ہیں۔ تہذیب التہذیب ۸: ۳۵۱

قرآن ہمارے کلام کے اس اسلوب سے خالی ہے جو ہماری ترکیب لغوی میں ایک ہر دلعزیز اسلوب ہے۔ عَبید بن اَبْرَص[1] کا قول ہے:

اَنْ بُدِّلَتْ مِنهُمْ وُحوشًا وغَيَّرَتْ حالَهَا الخُطُوب

عَينَاكَ دمْعُهُمَا سَرُوبٌ كأنَّ شأنَيهِمَا شَعِيبٌ

اس وجہ سے کہ وہ اپنوں سے دور ہو چکی ہیں اور مصائب نے ان کی حالت بگاڑ کر رکھ دی ہے، تمہاری آنکھوں کے آنسو زمین پر بکھر رہے ہیں اور یوں لگتا ہے جیسے ان کی رگیں اپنی جگہ سے ٹل گئی ہوں۔

ان دونوں اشعار کی اصل عبارت یوں ہے:

عَيْنَاكَ دَمعُهما سَرُوبٌ لِأنْ تبدّلتْ مِنْ اَهلهَا وُحُوشا۔

تمہاری آنکھوں کے آنسو اس لیے زمین پر بکھر رہے ہیں کہ وہ اپنوں سے دُور ہیں اور ان کے بدلے ان کا بسیرا جنگلی جانوروں کے ساتھ ہے۔

یہاں بھی بعد والی عبارت پہلے اور پہلی بعد میں ذکر کی گئی ہے۔

شعر کی لغوی تحقیق

یہاں ''سَرُوبٌ'' کا معنی زمین پر بہہ جانے والا ہے، اسی سے لفظ ''سارِب'' بھی ہے جس کا معنی وہ شخص ہے جو زمین پر جس طرف رخ ہو جائے چلتا جائے۔ شاعر کہتا ہے:

أنّی سَرَبْتِ و كُنتِ غَيرَ سَرُوبِ۔[2]

تم تو یوں بے سوچے سمجھے نکل جانے والی نہ تھیں، تم کیسے نکل کھڑی ہوئیں۔

اسی طرح شعر میں جو لفظ "شَأنيهما" استعمال ہوا ہے یہ "شأنٌ" سے تثنیہ ہے اور اس کی جمع "شؤون" ہے۔ یہ سر کے جوڑوں کو کہا جاتا ہے اور انہی سے آنسو آتے ہیں۔ "شعیب" کا معنی متفرق اور بکھرا ہوا ہونا ہے۔

۱۔ عبید بن اَبرَص بن جُشَم بن عامر مشہور جاہلی شاعر ہے۔ المؤتلف والمختلف فی أسماء الشعراء و كناهم ص ۱۹۸

۲۔ یہ شعر قیس خُطیم اَوسی کا ہے اور اس کا دوسرا مصرع یوں ہے: وتقرّبُ الأحْلامُ غيرَ قريب (اور خواب ان چیزوں کو بھی قریب کر دیتے ہیں جو دراصل قریب نہیں ہوتیں)۔ لسان العرب (سرب)

فصل:

اِعراب اور نقاط

جہاں تک قرآن مجید میں اعراب اور نقطے لگانے کا تعلق ہے تو منقول ہے کہ یہ کام عبدالملک بن مروان[1] کے حکم پر ہوا۔ حجاج بن یوسف نے جو کہ اس وقت عراق کا گورنر تھا اس کام کا بیڑا اٹھایا اور مقام واسط پر اسے سرانجام دیا گیا۔ حجاج نے حسن بصری رحمہ اللہ اور یحییٰ بن یعمر[2] کو اس کام کے لیے مقرر کیا۔ اعراب و نقاط کے علاوہ حجاج نے قرآن مجید کے احزاب بھی مقرر کیے۔ جب یہ کام مکمل ہوچکا تو اس نے ہی مقام واسط میں ایک کتاب مرتب کروائی جس میں وہ قراءات جمع کروا دیں جو قرآنی رسم الخط کے مطابق لکھے جانے کی وجہ سے لوگوں میں مشہور ہوگئی تھیں۔ لوگ کافی عرصہ تک اسی کتاب سے رہنمائی حاصل کرتے رہے یہاں تک کہ ابن مجاہدؒ نے قراءات میں اپنی کتاب تألیف کی۔

زبیدی نے کتاب الطبقات میں مبرد کے حوالہ سے یہ بات نقل کی ہے کہ قرآن مجید میں جس شخص نے سب سے پہلے نقطے لگائے وہ ابوالاسود الدؤلی تھے۔ انہوں نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ ابن سیرین کے پاس قرآن مجید کا ایک نسخہ تھا جس میں یحییٰ بن یَعمر نے انہیں نقطے لگا کر دیئے تھے۔

فصل:

اخماس اور اعشار[3]

باقی جہاں تک اعشار کی ابتداء کا تعلق ہے تو اس بارے میں مفسر ابن عطیہ فرماتے ہیں: میں نے تاریخ کی بعض کتب میں دیکھا ہے کہ یہ علامات عباسی خلیفہ مامون کے حکم سے لگائی گئیں، بعض کہتے ہیں ان کا موجد حجاج بن یوسف ہے۔

۱۔ عبدالملک بن مروان (م ۸۶ھ) مشہور اموی خلیفہ ہیں۔ ان کا زمانۂ خلافت تیرہ برس سے زیادہ ہے۔ ابن الأثیر: ۴:۵۱۷

۲۔ یحییٰ بن یعمر (م قبل ۱۰۰ھ) مقام مرو کے رہائشی اور وہاں کے قاضی تھے۔ تھذیب التھذیب ۱۱:۳۰۵

۳۔ قرون اولیٰ کے قرآنی نسخوں میں ایسی علامات کا رواج تھا کہ ہر پانچ آیات کے بعد حاشیہ پر لفظ "خمس" یا "خ" اور ہر دس آیات کے بعد لفظ "عشر" یا "ع" لکھ دیا جاتا تھا۔ پہلی قسم کی علامات کو "احماس" اور دوسری قسم کو "اعشار" کہا جاتا تھا۔ مفتی محمد شفیعؒ: معارف القرآن ۱:۴۰۳ بحوالہ مناھل العرفان

اخماس و اعشار کی شرعی حیثیت

ابوعمرو الدانی نے اپنی کتاب ''البیان'' میں نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ قرآن مجید میں اعشار کی علامات لگانے کو ناپسند فرماتے تھے بلکہ لگی ہوئی علامات کو بھی کھرچ دیتے تھے۔ مجاہدؒ سے منقول ہے کہ وہ قرآن مجید میں اعشار کی علامات اور خوشبو لگانے کو ناپسند فرماتے تھے۔ اَشہب [1] کہتے ہیں: امام مالکؒ سے ان ''اعشار'' کے بارے میں پوچھا گیا جن کی علامات قرآنی صفحات میں سرخ یا اس کے علاوہ کسی رنگ سے لگا دی جاتی ہیں تو آپؒ نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا: اگر یہ علامات صرف سیاہی کے ساتھ لگا دی جائیں تو کوئی حرج نہیں۔

سورتوں کے اختتام پر علامات

امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ بعض مصاحف میں سورتوں کے اختتام پر جو علامات بنا دی جاتی ہیں ان کا کیا حکم ہے تو آپ نے فرمایا مجھے یہ پسند نہیں کہ متن قرآن مجید کے اندر کوئی چیز لکھی جائے یا اِعراب لگایا جائے، البتہ جن نسخوں سے بچے قرآن مجید سیکھتے ہیں ان کی سہولت کے لئے ایسی علامات لگا دی جائیں تو میرے نزدیک اس میں کوئی حرج نہیں۔ اَشہب کہتے ہیں: پھر امام رحمہ اللہ نے اپنے دادا جان کا قرآنی نسخہ نکال کر ہمیں دکھایا جو انہوں نے اسی زمانے میں لکھا تھا جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اصل نسخے تیار کروائے تھے، چناں چہ ہم نے دیکھا کہ اس میں سورتوں کے اختتام کی نشانی کے طور پر سیاہی کے ساتھ ہر سورت کے آخر میں ایک زنجیر بنائی گئی تھی جو کہ پوری سطر پر محیط تھی اور اسی طرح میں نے دیکھا کہ اس کی آیات کے آخر میں بھی سیاہی کے ساتھ نقطے لگے ہوئے تھے۔

تلاوت میں آسانی کے لیے علامات کی ابتداء اور تاریخ

قتادہؒ کہتے ہیں: قرآن مجید میں سب سے پہلے نقطے لگائے گئے، پھر پانچ آیات پر نشانات اور اس کے بعد دس آیات کے نشانات وجود میں آئے۔ یحییٰ بن اَبی کثیر کہتے ہیں: مصاحف میں قرآن مجید کی صرف عبارت لکھی ہوئی تھی۔ اس پر سب سے پہلے جو علامت ایجاد ہوئی وہ ''باء''، ''تاء'' اور ''ثاء'' کے نقطے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کیوں کہ ان سے عبارات زیادہ واضح ہو جائیں گی۔ پھر آیات کے آخر میں بھی نقطے لگائے دیئے گئے اور ایک وقت وہ بھی آیا کہ سورتوں کی ابتداء اور انتہاء میں بھی علامات لگا دی گئیں۔

۱۔ اَبوعمرو اشہب بن عبد العزیز العامری (م ۲۰۴ھ) مصر کے بڑے فقیہ اور امام مالکؒ کے شاگرد خاص تھے۔ تہذیب التہذیب ۱: ۳۵۹

علامات کے بارے میں بعض علماءِ سلف کے تحفظات

ابوحمزہ کہتے ہیں: ابراہیم نخعیؒ نے میرے قرآنی نسخہ میں یہ لکھا ہوا دیکھا ''فاتحة سورة كذا وكذا'' (فلاں سورت کی ابتداء) تو مجھ سے فرمایا: اسے مٹا دو کیوں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی کتاب میں کوئی ایسی چیز شامل نہ کرو جو اس میں پہلے سے موجود نہیں۔ ابو بکر السراج کہتے ہیں، میں نے اَبو رزین سے پوچھا: کیا میں اپنے نسخہ میں لکھ لوں کہ ''یہ فلاں سورت کی ابتداء ہے'' تو انہوں نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ کوئی ایسی قوم پیدا ہو جو ان علامات کی حقیقت سے واقف نہ ہو اور انہیں بھی قرآن مجید کا حصہ سمجھنے لگے۔

تسہیلی علامات کا ثبوت اور ان کے جواز کی صورتیں

ابوعمرو الدانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ان تمام آثار منقولہ سے ثابت ہوتا ہے کہ پانچ پانچ اور دس دس آیات پر نشانات نیز سورتوں اور آیات کی ابتداء میں مخصوص علامات دراصل حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے شروع ہو گئی تھیں جن کا فیصلہ انہوں نے اپنے اجتہادات کے نتیجہ میں کیا تھا۔ اس دور میں یا ان کے بعد جن حضرات نے ایسی علامات کو ناپسند فرمایا، درحقیقت ان کی ناپسندیدگی ان علامات کی بنا پر نہ تھی بلکہ ان میں سرخ، زرد اور دیگر مختلف رنگ استعمال کرنے کی وجہ سے تھی۔ ان کے مطلق استعمال کے جواز پر دنیا بھر کے مسلمانوں کا اتفاق ہے خواہ انہیں اصل نسخوں میں لگایا جائے یا ضرورت کے مطابق مخصوص نسخوں میں۔ اور جس چیز پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہو۔ اِن شاء اللہ اس میں نہ کوئی حرج ہو گا اور نہ ہی وہ غلط شمار ہو گی۔

فصل:

قرآن مجید کے حروف اور اس کے احزاب ومنازل

جہاں تک قرآن مجید کے حروف اور اجزاء کی تعداد کا تعلق ہے تو اَبو محمد سلام الحِمّانی نے نقل کیا ہے کہ حجاج بن یوسف نے قرّاء، حفاظ اور کاتبین کو جمع کیا اور کہا کہ مجھے پورے قرآن مجید کے بارے میں بتاؤ کہ اس میں کتنے حروف ہیں؟ سلام کہتے ہیں: میں بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔ ہم نے گنتی کی اور متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ قرآن مجید کے حروف کی تعداد تین لاکھ چالیس ہزار سات سو چالیس ہے۔

قرآن کا نصف

پھر حجاج نے کہا: مجھے بتاؤ کہ قرآن کا نصف کس حرف پر مکمل ہوتا ہے؟ ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اس کا نصف سورۂ کہف میں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلْيَتَلَطَّفْ﴾ [الكهف ۱۸: ۱۹] کی "فاء" پر مکمل ہوتا ہے۔

قرآن کی تہائیاں

پھر حجاج نے کہا، مجھے بتاؤ قرآن کی تہائیاں کہاں کہاں ہوتی ہیں، تو ہم نے دیکھا کہ پہلی تہائی سورۂ براءت کی ایک سو آیات کی انتہاء پر، دوسری تہائی سورۂ شعراء (طٰسٓمٓ) کی ایک سو یا ایک سو ایک آیات مکمل ہونے پر اور تیسری تہائی قرآن مجید کی انتہاء کے ساتھ جاکر مکمل ہوتی ہے۔

قرآن کی سات منزلیں

حجاج نے کہا: پورے قرآن مجید کو حروف کے حساب سے سات حصوں پر تقسیم کر کے مجھے بتاؤ کہ ہر حصہ کہاں پورا ہوتا ہے؟۔ ہم نے دیکھا کہ پہلا ساتواں حصہ سورۂ نساء کی آیت کریمہ ﴿فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُمْ مَنْ صَدَّ﴾ [النساء ۴: ۵۵] کی دال پر، دوسرا سورۂ اعراف میں ﴿أُولٰئِكَ حَبِطَتْ﴾ [الأعراف ۷: ۱۴۷] کی تاء پر، تیسرا سورۂ رعد میں ﴿أُكُلُهَا دَائِمٌ﴾ [الرعد ۱۳: ۳۵] ﴿أُكُلُهَا﴾ کے دوسرے الف پر، چوتھا سورۂ حج میں ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا﴾ [الحج ۲۲: ۳۴] کے الف پر، پانچواں سورۂ احزاب میں ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ﴾ [الأحزاب ۳۳: ۳۶] کی ہاء پر، چھٹا سورۂ فتح میں ﴿الظَّانِّينَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ﴾ [الفتح ۴۸: ۶] کی واؤ پر اور ساتواں حصہ باقی قرآن مجید کے اختتام پر مکمل ہوتا ہے۔ ابو محمد سلّام کہتے ہیں ہم نے یہ کام چار ماہ میں مکمل کیا۔

قرآن مجید کی چوتھائیاں

حجاج کی عادت تھی کہ وہ ہر رات میں ایک چوتھائی قرآن مجید پڑھا کرتا تھا۔ اس کی پہلی چوتھائی سورۂ انعام کے اختتام پر پوری ہوتی تھی، دوسری سورۂ کہف میں "وَلْيَتَلَطَّفْ" پر، تیسری سورۂ زمر کے اختتام پر اور چوتھی قرآن مجید کے آخر تک ہوتی تھی۔ ان تمام روایات میں کچھ اختلاف بھی ہے جو ابو عمرو الدانی کی کتاب البیان میں مذکور ہے جو حضرات تفصیل چاہیں اس کی طرف کریں۔

فصل:

قرآنِ مجید کی آیات کی تعداد

اہلِ مدینہ کی پہلی گنتی کے مطابق قرآنی آیات کی تعداد کے بارے میں محمد بن عیسیٰؒ کا قول یہ ہے کہ وہ چھ ہزار آیات ہیں۔ اَبوعمرو کہتے ہیں: یہی تعداد اہل کوفہ نے اہل مدینہ سے نقل کی ہے مگر اسے کسی خاص شخصیت کی طرف منسوب نہیں کیا۔ اہل مدینہ ہی کی آخری گنتی میں اسماعیل بن جعفر(۱) کے قول کے مطابق چھ ہزار دو سو چودہ آیات ہیں۔ فضل بن شاذان کہتے ہیں: اہل مکہ کے قول کے مطابق قرآن مجید کی آیات کی تعداد چھ ہزار دو سو انیس ہے۔

محمد بن عیسیٰ کہتے ہیں کہ اہل کوفہ کے قول کے مطابق قرآن مجید کی آیات کی مجموعی تعداد چھ ہزار دو سو چھتیس ہے، اور یہی تعداد سلیم(۲) اور کسائی(۳) نے حمزہ(۴) سے نقل کی ہے۔ کسائی نے اس روایت کی نسبت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے۔

محمد بن عیسیٰ کہتے ہیں: اہل بصرہ کے قول کے مطابق آیات کی مجموعی تعداد چھ ہزار دو سو چار ہے اور یہی وہ تعداد ہے جو اہل بصرہ میں اپنے اسلاف سے مُسلّم چلی آ رہی ہے۔ باقی جہاں تک اہل شام کے نزدیک آیات کی تعداد کا تعلق ہے تو یحییٰ بن حارث ذماری(۵) کہتے ہیں: یہ تعداد چھ ہزار دو سو چھبیس ہے اور ایک روایت میں یہ تعداد ایک آیت کم چھ ہزار دو سو پچیس ہے۔ ابن ذکوان کہتے ہیں: دوسری روایت سے مجھے یہ گمان ہوا کہ یحییٰ نے "بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ" کو بطور آیت شمار نہیں کیا۔ ابوعمرو کہتے ہیں: آیات کی تعداد کے بارے میں یہی آراء ہیں جو لوگوں میں متداول چلی آ رہی ہیں اور پوری دنیا میں پہلے بھی ان کا شمار اسی طرح ہوتا تھا اور اب بھی یوں ہی ہوتا ہے۔

۱۔ امام قراءت اسماعیل بن جعفر الزرقی (م ۱۸۰ھ) ثقہ اور اپنے وقت میں قراءت کے امام ہیں۔ مدینہ منورہ میں تھے پھر بغداد چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ تہذیب التہذیب ۱:۲۸۷

۲۔ سلیم بن عیسیٰ کوفی امام حمزہ بن حبیب الزیات کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے تہذیب التہذیب ۳:۲۷ (حمزہ بن حبیب)

۳۔ امام نحو ابوالحسن علی بن حمزہ کسائی کوفی (م ۱۸۰ھ) نحو، تجوید، قراءت اور لغت وشعر کے علامہ تھے۔: معجم المؤلفین ۷:۸۴

۴۔ امام قراءت ابو عمارہ حمزہ بن حبیب الزیات کوفی (م ۱۵۶ھ) حلوان میں اَبوجعفر منصور کے دور میں فوت ہوئے۔ معجم المؤلفین ۴:۷۸

۵۔ ابوعمرو یحییٰ بن حارث ذماری (م ۱۴۵ھ) شام میں قراءت کے امام اور ثقہ تھے۔ تہذیب التہذیب ۱۱:۱۹۳، تعارف نمبر ۳۲۷

قرآنِ مجید کے الفاظ اور حروف کی تعداد

فضل بن شاذان کہتے ہیں: قرآن مجید کے الفاظ کی مجموعی تعداد عطاء بن یسار کے قول کے مطابق ستتّر ہزار چار سو انتالیس ہے اور اس کے حروف تین لاکھ تیئیس ہزار پندرہ ہیں۔

مؤلف کی رائے

میرے خیال میں یہ تعداد اس کے مطابق نہیں ہے جو پہلے ہم حمانی سے نقل کر چکے ہیں۔ عبد اللہ بن کثیر نے مجاہدؒ[1] کا قول نقل ہے کہ ہم نے خود قرآن مجید کے حروف گنے ہیں۔ ہماری گنتی کے مطابق ان کی تعداد: تین لاکھ، اکیس ہزار ایک سو اسی ہے۔ مگر یہ بھی حمانی کے گنتی کے مطابق نہیں جیسا کہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔

☆☆☆☆☆

۱۔ امام المفسرین مجاہد بن جبر (م ۱۰۴ھ) ثقہ اور مشہور تابعی ہیں۔ حضرات ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم اجمعین سے علم سیکھا۔ تهذيب التهذيب ۱۰:۴۲

باب: ۱۵

سورت، آیت، کلمہ اور حرف

ا۔ سورت

بغیر ہمزہ "سُورۃ": لغتِ عرب میں لفظ "سورۃ" ایک حصے کو دوسرے سے جدا اور واضح کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ سورت کے ذریعے کلام اللہ کی منازل طے کی جاتی ہیں جیسا کہ نابغہ[1] کہتا ہے:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أعطاك سورة . تَرى كل مَلِكٍ فيهايتذبذب[2]

تم نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسا مقام دیا ہے جس کی وجہ سے ہر بادشاہ بے چین ہے؟

یہاں "سورۃ" کا معنی قدر و منزلت ہے جس پر پہنچ کر آپ تمام بادشاہوں سے زیادہ شان پا گئے ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ سورت کا نام اس کے اپنے مقام و مرتبہ کی وجہ سے رکھا گیا ہے جیسا کہ زمین کے بلند حصے کو "سور" کہتے ہیں۔ ایک اور رائے کے مطابق اسے سورت اس لئے کہا جاتا ہے کہ اسے پڑھنے سے تلاوت کرنے والے کو مزید علم حاصل ہو جاتا ہے جو پہلے سے اس کے پاس نہ تھا۔ جیسا کہ عمارت کے گرد بڑی دیوار کو "سور البناء" کہا جاتا ہے۔ ان تمام معانی کے لفظ (سور یا سورۃ) کو بغیر ہمزہ کے استعمال کیا جاتا ہے۔

ہمزہ کے ساتھ "سُؤرٌ": ایک رائے یہ بھی منقول ہے کہ چوں کہ یہ قرآن مجید کے ایک الگ حصہ پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے اسے "سؤرۃ" کہا جاتا ہے جیسا کہ کلام عرب میں بچی ہوئی چیز کو "سُؤرٌ" کہتے ہیں۔ اسی معنی کے لیے کہا جاتا ہے: "جاءَ فِي أسآرِ النّاسِ أى بقاياهم" یعنی وہ باقی ماندہ لوگوں میں آیا۔ اس طرح لفظ کا اصل تو ہمزہ کے ساتھ "سؤرۃ" ہوگا جس کی تسہیل کر کے ماقبل پر ضمہ ہونے کی وجہ سے اسے واؤ کے ساتھ بدل دیا گیا۔

ایک قول یہ ہے کہ چوں کہ یہ ایک مکمل اور مستقل اکائی ہوتی ہے اس لئے اسے "سورۃ" کہا جاتا ہے جیسا کہ عرب لوگ مکمل اونٹنی کو "سُورۃ" کہتے ہیں جس کی جمع واؤ کی زبر کے ساتھ "سُوَرٌ" آتی ہے۔ شاعر کہتا ہے:

ا۔ نابغہ ذبیانی: زیاد بن معاویہ بن ضباب الغلذانی المضری (م تقریباً ۱۸ق۔ھ) کا جاہلی شعراء میں بہت بلند مقام ہے۔ اس کا لقب نابغہ بھی اسی وجہ سے مشہور ہوا کہ اس کی شعری مہارت کا اظہار بتدریج نہیں بلکہ اچانک ہوا۔ اس نے بہت لمبی عمر پائی مگر قبل از اسلام ہی وفات پا گیا۔ اعلام زرکلی ۳: ۵۴

۲۔ لسان العرب: (سور)

سُوْدُ المحَاجِرِ لایَقْرَأنَ بِالسُّوَرِ۔ [1]

اس کی جمع "سورات" اور "سُوَرات" بھی آتی ہے۔

۲۔ آیت

"آیة" کا معنی علامت ہے۔ اور قرآن مجید میں آیت سے مراد ایسی علامت ہے جو اپنے سے پہلے اور اپنے سے بعد میں آنے والے کلام کے درمیان فاصلے کا کام دیتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ پہلے والا کلام بعد والے کلام سے جدا ہے اور اس کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ عرب کہتے ہیں: "بَینِی وَبَیْنَ فُلانٍ آیة، أی علامة" (میرے اور فلاں شخص کے درمیان ایک علامت ہے)۔ اسی معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ﴾ [البقرة ۲:۲۴۸] بے شک اس کی بادشاہی کی نشانی۔ اسی طرح نابغہ کہتا ہے:

تَوَهَّمتُ آیاتٍ لها فَعَرَفْتُها　　　لِسِتَّةِ أعوامٍ وذَاالعامُ سابعُ [2]

میں نے اس کی کچھ نشانیاں اپنے ذہن میں رکھی ہوئی تھیں جن کی مدد سے مجھے معلوم ہو گیا

کہ اس کی عمر چھ سال ہے اور یہ اس کا ساتواں سال ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ آیت چوں کہ مجموعہ اور جماعت کے معنی میں بھی آتا ہے اس لیے قرآنی حروف کے ایک مجموعے کو بھی آیت کہا گیا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: "خَرَجَ القومُ بِآیَاتِهِمْ، أي بِجَمَاعَتِهِمْ" (یعنی لوگ جماعتوں کی صورت میں نکلے)۔ اسی معنی میں بُرج بن مُسْهِر الطائی کا یہ قول بھی ہے:

خَرَجْنَا مِنَ النَّقْبَیْنِ لاحَیَّ مثلنَا　　　بآیاتِنا نُزجِی اللِّقَاحَ المَطَافِلَا [3]

ہم پہاڑی راستوں سے صرف اپنی جماعتوں کو لے کر نکلے کیوں کہ کوئی شخص ہم جیسا نہ تھا۔

اور ہم جاتے ہوئے اپنی دودھ والی اونٹنیوں اور ان کے نوزائیدہ بچوں کو بھی ساتھ لے گئے۔

ایک رائے کے مطابق اسے آیت اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک عجیب باکمال کلام ہے جس کی مثال پیش کرنے سے پوری انسانیت عاجز ہے۔

۱۔ یہ شعر کا دوسرا مصرع ہے۔ پہلا مصرع: "هُنَّ الحَرائر لاَرَبَّاتُ أخْمِرَةٍ" ہے۔ پورے شعر کا ترجمہ یوں ہے: "وہ آزاد خواتین ہیں جو کہ شراب خانوں میں کام کرنے والی۔ کالی آنکھوں والی ہیں اور اونٹنیوں پر سواری کے دوران بچے نہیں جنتیں"۔ شاعر کا نام عبد بن حسین بن جندل بن طویلم بن ربیعہ اور لقب "راعی" ہے۔ المؤتلف والمختلف ص ۱۵۵

۲۔ کتاب سیبویہ ۱:۲۵۲

۳۔ لسان العرب (آیة)

آیت کے اشتقاق میں علماءِ نحو کا اختلاف ہے۔ سیبویہ[1] کہتے ہیں: اس کی اصل "أَيَيَةٌ" بروزن "فَعَلَةٌ" مثل "اَكَمَةٌ اور شَجَرَةٌ" ہے، چوں کہ اس میں یاء متحرک اور اس کی ماقبل فتحہ تھا اس لیے "یاء" کو الف سے بدل دیا تو "آيَةٌ" ہو گیا۔ کسائی کہتے ہیں: اس کی اصل "آيِيَةٌ" بروزن "فاعِلَةٌ" مثل "آمنة" تھا۔ اس کی یاء کو متحرک ہونے اور ماقبل مفتوح ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا۔ پھر اس تبدیل شدہ یاء کو حذف کر دیا گیا تاکہ جمع کے ساتھ مشابہت نہ رہے۔ فرّاء کہتے ہیں: یہ لفظ اصل میں پہلی یاء کی تشدید کے ساتھ "أَيِّيَةٌ" تھا۔ اس یاء مشددہ کو یہاں مناسب نہ ہونے کی وجہ سے الف سے بدل دیا گیا جس سے یہ "آية" ہو گیا۔ اس کی جمع "آيٌ، آيات اور آياءٌ" تمام صورتوں میں آتی ہے۔ اسی آخری صورت کو ابو زید نے اپنے درج ذیل شعر میں ذکر کیا ہے:

لَمْ يُبقِ هذا الدهرُ مِن آيائِهِ غيرَ أثافِيهِ و أرْمِدَائِهِ[2]

اس زمانے نے اس کا کوئی نشان باقی نہیں چھوڑا، سوائے اس کے کہ ہنڈیا رکھنے والے کچھ پتھر اور کچھ راکھ کے نشانات اس کی جگہ پر مل جاتے ہیں۔

۳۔ کلمہ اور اس کے حجم

اس سے مراد وہ شکل ہے جو مختلف حروف کے ایک مجموعہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ کتاب اللہ میں سب سے بڑا کلمہ (لفظ) دس حروف کے مجموعہ پر مشتمل ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ﴾[النور ۲۴:۵۵]، ﴿أَنُلْزِمُكُمُوهَا﴾ [ھود ۱۱:۲۸] اور ان جیسے دیگر کلمات۔ مگر ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَأَسْقَيْنَاكُمُوهُ﴾ [الحجر ۱۵:۲۲] جو کہ لکھنے میں دس حروف پر مشتمل ہے اسے بولنے سے گیارہ حروف ادا ہوتے ہیں۔ اور سب سے چھوٹے الفاظ وہ ہیں جو دو حروف پر مشتمل ہوں جیسے "ما، لا، لک، له وغیرہ" البتہ حروف معانی میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو اکیلے ہی کلمہ یا لفظ شمار ہوتے ہیں جیسے ہمزۂ استفہام اور واوٗ عاطفہ وغیرہ مگر ان کو اکیلا بولا نہیں جاتا۔

ایک کلمہ پر مشتمل آیات

کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ پوری آیت ایک ہی لفظ (کلمہ) پر مشتمل ہوتی ہے جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَالْفَجْرِ﴾ [الفجر ۸۹:۲] ﴿وَالضُّحَى﴾ [الضحیٰ ۹۳:۱] ﴿وَالْعَصْرِ﴾ [العصر ۱۰۳:۱] اور اسی طرح ﴿الٓمٓ﴾ [البقرۃ ۲:۱، آل عمران ۳:۱، العنکبوت ۲۹:۱] ﴿الٓمٓصٓ﴾[الأعراف ۷:۱]﴿طٰهٰ﴾ [طٰہٰ ۲۰:۱]﴿یٰسٓ﴾[۳۶:۱]اور ﴿حٰمٓ﴾

۱۔ لغت ونحو کے امام عمرو بن عثمان المعروف سیبویہ کی وفات ۱۸۰ھ میں ہوئی۔ معجم المؤلفین ۸:۱۰

۲۔ لسان العرب (أثف)

[غافر ۴۰: ۱، فصّلت ۴۱: ۱، الشوری ۴۲: ۱، الزخرف ۴۳: ۱، الدخان ۴۴: ۱، الجاثیة ۴۵: ۱، الأحقاف ۴۶: ۱] یہ سب علماء کوفہ کے قول کے مطابق ہیں۔ایسی آیات سورتوں کے شروع میں آتی ہیں، درمیان میں نہیں آتیں۔ ابوعمرو الدانی کہتے ہیں کہ مجھے سورۂ رحمٰن میں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿مُدْهَآمَّتَانِ﴾ [الرحمن ۵۵: ۶۴] کے علاوہ کوئی ایسا کلمہ معلوم نہیں ہو سکا جو اکیلا ہی پوری آیت ہو۔ البتہ دو ایسے کلمات مل کر آئے ہیں جو دونوں الگ الگ آیت ہیں جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿حٰمٓ عٓسٓقٓ﴾ [الشوری ۴۲: ۱، ۲] یہ بھی صرف علماءِ کوفہ کا قول ہے۔

پوری آیت اور مستقل کلام کے لیے لفظِ کلمہ کا استعمال

مذکورہ صورتوں کے علاوہ کبھی لفظ "کلمة" کا اطلاق مکمل آیت یا مستقل کلام پر بھی ہوتا ہے خواہ اس کی مقدار کم ہو یا زیادہ، جیسے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىٓ اِسْرَآئِيلَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ [الأعراف ۷: ۱۳۷] (اور آپ کے پروردگار کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی بنا پر پورا ہو کر رہا)۔ اس کی تفسیر میں ایک قول یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِى الْاَرْضِ﴾ [القصص ۲۸: ۵] (اور ہم کو یہ منظور ہوا کہ جن لوگوں کا زور ملک میں گھٹایا جا رہا ہے، ہم ان پر احسان کریں) سے اس کے بعد والی آیت کے اختتام تک ہے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى﴾ [الفتح ۴۸: ۲۶] (اور اللہ نے انہیں تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا)۔ مجاہدؒ فرماتے ہیں: یہاں "كَلِمَةَ التَّقْوٰى" سے مراد "لا إلٰهَ إلاّ اللّٰه" ہے، نیز ارشاد نبوی ہے:

[۱۲۷] كَلِمَتَانِ خَفِيفَتَانِ عَلَى اللِّسَانِ، ثَقِيلَتَانِ فِي الميزانِ، حبيبتانِ إلى الرحمن: سُبْحَانَ اللّٰهِ وبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ العَظِيمِ۔

دو کلمات ایسے ہیں جو کہ زبان پر ہلکے ہیں، میزان میں وزنی اور رب رحمٰن کے پسندیدہ ہیں، وہ دونوں: "سُبْحَانَ اللّٰهِ وبِحَمْدِهِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ العَظِيمِ" ہیں۔

کلمہ بمعنی قصیدہ، خطبہ، رسالہ وغیرہ

کبھی کبھی عرب پورے قصیدہ یا قصہ کو ہی کلمہ کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے: " قَالَ قُسٌّ فی كَلِمَتِهِ كذا" (قس

---

[۱۲۷] صحیح بخاری: کتاب التوحید، باب قوله تعالیٰ: ﴿وَنَضَعُ الموازِينَ القِسْطَ﴾ ۶: ۲۷۴۹، کتاب الدعوات، باب فضل التسبیح ۵: ۲۳۵۲، کتاب الأیمان والنذور، باب إذا قال: واللّٰه لا أتكلّمُ اليوم...... ۶: ۲۴۵۹۔ یہ صحیح بخاری کی آخری حدیث ہے، صحیح مسلم: کتاب الذکر والدعاء، باب فضل التهليل والتسبيح والدعاء ۴: ۲۰۷۲ بروایت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ جامع ترمذی: کتاب الدعوات ۵: ۵۱۲، سنن ابن ماجہ: کتاب الأدب، باب فضل التسبیح ۲: ۱۲۵۱، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب الأذکار ۳: ۱۱۲، ۱۲۱، مسند احمد: مسند أبی هریرة ۲: ۲۳۲، مسند ابو یعلیٰ: مسند أبی هریره ۱۰: ۲۸۳، شعب الإيمان: العاشر من ......، فصل فی إدامة ذکر اللّٰه عزوجل ۱: ۴۲۰

نے اپنے خطاب میں یوں کہا)، "قال زهيرٌ في كلمتهِ كذا أي في قصيدته" (یعنی زہیر نے اپنے قصیدہ میں یوں کہا)، "وقال فُلانٌ فِي كلمتِهِ يعني في رسالته" (فلاں نے اپنے پیغام میں یوں کہا)۔ اس طرح پورے کلام کو کلمہ کہہ دیا جاتا ہے کیوں کہ وہ کلمات پر مشتمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر عرب کسی چیز کو اس کے اپنے ہی کسی جزء یا اس کی کسی قریبی چیز کا نام دے دیتے ہیں۔ اسی کو مجاز یا اتساع کا نام دیا جاتا ہے۔

۴۔ حرف

حرف کسی (مفرد آواز کی) ایسی شکل کا نام ہے جو کسی کلمہ (لفظ) سے جدا ہو کر بھی اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ البتہ کبھی مجاز اور اتساع کے طور پر حرف کو کلمہ اور کلمہ کو حرف کہہ دیا جاتا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔

حروفِ مُقَطَّعات

ابو عمرو الدانی کہتے ہیں: اگر یہ حرف کی تعریف ہے تو سورتوں کے شروع میں جو اکیلے حروف (مُقطَّعات) آتے ہیں جیسے: "ص"، "ق" اور "ن" وغیرہ، کیا انہیں حروف کہا جائے گا یا کلمات؟ میرا جواب یہ ہے کہ انہیں کلمات کہا جائے گا، حروف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک حرف بول کر نہ تو سکوت اختیار کیا جاتا ہے، نہ (کلام میں) اس کو اکیلا لکھا جاتا ہے اور نہ ہی وہ اس مجموعہ سے جدا ہوتا ہے جس پر کلمہ مشتمل ہوتا ہے، جب کہ یہ حروف ایسے ہیں کہ ان پر سکوت (وقف) بھی اختیار کیا جاتا ہے، یہ لکھے بھی جاتے ہیں اور مکمل کلمات کی طرح ان کی مستقل حیثیت بھی ہوتی ہے۔ اسی لیے ان کو کلمات کہا جاتا ہے، حروف نہیں۔

حرف بمعنی روِش اور طریقہ

ابو عمرو کہتے ہیں: کبھی کبھی لفظ "حرف" روش اور صورت کے معنی میں بھی آتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ [الحج ۲۲:۱۱] (اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی پرستش کنارہ پر کھڑا ہو کر کرتا ہے)۔ یعنی ایک طریقہ پر کرتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

[۱۲۸] أُنزِلَ القُرآنُ علی سَبعَةِ أَحرُفٍ۔ قرآن مجید سات طریقوں پر نازل ہوا۔

اس سے مراد بھی یہ کہ قرآن مجید لغت کی سات صورتوں پر نازل ہوا، واللہ اُعلم۔

☆☆☆☆☆

[۱۲۸] مفصل حوالہ گزر چکا ہے۔

باب: ۱۶

قرآنِ مجید میں غیر عربی الفاظ

اس بات پر تو تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربی تراکیب کا کوئی وجود نہیں۔ البتہ کچھ ایسے لوگوں کے نام ضرور موجود ہیں جن کی زبان عربی نہ تھی جیسے: اسرائیل، جبرئیل، عمران، نوح اور لوط۔ اس بات میں اختلاف ہے کہ قرآن مجید میں غیر عربی اعلام کے علاوہ بھی ایسے کلمات ہیں یا نہیں۔

منکرین کا موقف

قاضی ابو بکر بن طیبؒ اور طبریؒ وغیرہ کا خیال ہے کہ قرآن مجید میں ایسے الفاظ موجود نہیں ہیں اور وہ خالص عربی کلام ہے۔ ان کی رائے میں جن قرآنی الفاظ کی نسبت دوسری زبانوں کی طرف کی جاتی ہے وہ دراصل غیر عربی نہیں بلکہ اتفاقاً مختلف زبانوں میں پائے گئے ہیں۔ کئی الفاظ ایسے ہیں جنہیں عرب بھی بولتے ہیں، فارس والے بھی، حبشہ والے بھی اور دیگر زبانوں والے بھی۔

قائلین کا موقف

ان کے علاوہ ایک طبقہ قرآن مجید میں غیر عربی الفاظ کے وجود کا قائل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ان الفاظ کی قلیل تعداد کی وجہ سے قرآن کی خالص عربیت میں کوئی فرق نہیں آتا اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی قوم کی زبان بولنے والا ہونے پر کوئی حرف آتا ہے۔ چنانچہ "مِشكاة" بمعنی چراغ دان اور "نشاء" بمعنی رات کو اٹھنا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ﴾ [المزمل ۷۳:۶] (بے شک رات کے وقت اٹھنے میں) ﴿يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ﴾ [الحديد ۵۷:۲۸] "أيْ ضِعْفَيْنِ" (یعنی دوگنا) اور ﴿فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾ [المدثر ۷۴:۵۱] "أي الأسد" (یعنی قَسْوَرَة بمعنی شیر) یہ سب حبشی زبان کے الفاظ ہیں۔ اور اسی طرح "غَسَّاق" بمعنی ٹھنڈا۔ بدبودار ترکی زبان کا، قِسْطَاس" بمعنی ترازو رومی زبان کا، "سِجّيل" بمعنی پتھر اور مٹی فارس والوں کی زبان کا، "طُور" بمعنی پہاڑ اور "يَمّ" بمعنی سمندر سریانی زبان کے اور "تنّور" بمعنی سطح زمین عجمی زبان کا لفظ ہے۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: ایسے الفاظ کے کلامِ عرب میں استعمال ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اصل میں تو

غیر عربی الفاظ ہی ہیں لیکن چوں کہ عرب انہیں استعمال کرنے لگے اور عربی زبان کے مطابق ہی ان کو ڈھال لیا۔ اس طرح یہ الفاظ بھی عربی ہی ہو گئے۔ یہ حقیقت ہے کہ عرب عاربہ[1] جن کی زبان میں قرآن مجید نازل ہوا، ان کا بھی کسی حد تک ایسے لوگوں کے ساتھ میل جول رہا جو عربی کے علاوہ دیگر زبانیں بولتے تھے۔ خصوصاً تجارت کے لیے ان کا میل جول، قریش کے گرمیوں اور سردیوں کے سفر، مسافر بن اَبی عمرو[2] کا شام کا سفر، عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ اور عمارہ بن ولید کے سرزمین حبشہ کی طرف سفر اور اعشیٰ کا ''حیرہ'' کی طرف آنا جانا اور وہاں کے نصاریٰ کے ساتھ رہنا حالاں کہ اعشیٰ تو لغت عرب میں حجت مانا جاتا ہے، ان تمام ذرائع سے کئی غیر عربی الفاظ عربوں کے استعمال میں آئے ان میں سے بعض کے حروف میں کمی کے ذریعے ان کی عجمیت کی سختی کو ختم کر دیا گیا اور عربوں نے انہیں اپنے اشعار اور محاورات میں استعمال کیا۔ یہاں تک کہ وہ صحیح عربی الفاظ شمار ہونے لگے اور انہیں عام گفتگو میں استعمال کیا جانے لگا۔ ان کی مقبولیت یہاں تک پہنچی کہ قرآن مجید میں بھی وہی الفاظ نازل ہوئے۔ اب اگر کوئی عرب یہ الفاظ نہیں سمجھتا تو اسے اپنی زبان کے ان الفاظ سے اسی طرح لاعلم سمجھا جائے گا جس طرح وہ دوسری کوئی زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے لاعلم سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو لفظ ''فاطر'' کا معنی معلوم نہیں تھا۔ اسی طرح کی اور بھی بہت سی مثالیں ہیں۔

مختلف زبانوں میں مشابہ الفاظ کے استعمال کی حقیقت

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: جو موقف امام طبریؒ نے اختیار کیا ہے کہ بعض الفاظ کئی زبانوں میں اتفاقاً ایک جیسے آ گئے، یہ بات مستبعد ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا استعمال کسی ایک زبان میں اصلی ہے اور دوسری زبانوں میں یہ اسی سے آئے ہیں۔ اکثر الفاظ کا حال یہی ہے۔ البتہ شاذ و نادر کہیں اتفاقی استعمال بھی پایا جائے تو اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ عرب عاربہ سے مراد اصل عرب ہیں۔ جو لوگ ان کے ساتھ اختلاط سے عرب بن گئے دیگر اقوام سے تعلق رکھتے تھے مگر ان کے ساتھ تعلق کی وجہ سے عرب بن گئے انہیں عرب مستعربہ کہا جاتا ہے۔ عرب کی وجہ تسمیہ ان کی اپنے دادا ''یعرب بن قحطان'' کی طرف نسبت ہے جو جملہ اہلِ یمن کا باپ تھا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ان کے رہائشی علاقے ''عَرَبَات'' کی طرف نسبت کی وجہ سے انہیں عرب کہا جانے لگا۔ لسان العرب (عرب)۔

۲۔ مسافر بن اَبی عمرو قریشی سردار اور سخی تھا۔ اسے ہند بنت عتبہ سے عشق ہو گیا اور اس نے اس کا رشتہ مانگا مگر ہند نے اسے قبول نہ کیا۔ جب ابو سفیان رضی اللہ عنہ سے ان کی شادی ہوئی تو مسافر بن ابی عمرو اسی غم میں بیمار ہو کر مر گیا۔ تاریخ آداب لغة العرب: ۱۳۹

بعض دیگر حضرات کی رائے یہ ہے کہ پہلا (امام طبریؒ والا) قول ہی زیادہ صحیح ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ الفاظ دراصل تو کسی اور زبان کے ہیں لیکن کسی نہ کسی طرح عربی میں دخیل ہو گئے ہیں، یہ پہلی رائے سے زیادہ مضبوط نہیں ہے کیوں کہ ہوسکتا ہے عربوں نے ہی پہلے انہیں اپنے کلام میں استعمال کیا ہو۔ اور اگر یہی بات ہو تو یہ الفاظ عربوں ہی کی زبان کے ہوئے نہ کہ کسی اور زبان کے۔ ورنہ ان کی اپنی زبان اور ان کے اپنے کلام کو ان کی زبان و کلام نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ دوسری زبانیں بولنے والوں نے اتفاقاً یہی الفاظ استعمال کرنے شروع کر دیئے ہوں جو عرب پہلے سے استعمال کر رہے ہیں۔ یہ امام کبیر ابو عبیدہ کا قول ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ کلمات کلام عرب کے اوزان پر پورے نہیں اترتے اس لیے انہیں عربی نہیں کہا جا سکتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کو اس بات کی ضمانت کس نے دی ہے کہ کلام عرب کے تمام اوزان معلوم کر لیے گئے ہیں جن کو دیکھ کر آپ نے فیصلہ کر لیا کہ یہ الفاظ ان اوزان کے مطابق نہیں ہیں۔ حالاں کہ قاضی (ابو بکر بن طیب) نے کلام عرب کے اصل اوزان کی تحقیق کی ہے اور ان اسماء کو قواعدِ نحو کے لحاظ سے ان اوزان کے عین مطابق قرار دیا ہے۔ دوسرے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر عربوں نے یہ الفاظ اپنی عام بول چال میں استعمال نہ کیے ہوتے اور وہ ان کو نہ جانتے ہوتے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ایسے کلام سے ان کو خطاب فرماتے جسے وہ جانتے ہی نہ تھے۔ اس طرح نہ تو قرآن اصل عربی قرآن کہلا سکتا نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم سے ان کی اپنی زبان میں خطاب کرنے والے شمار ہوتے، وَاللہ اعلم۔

☆☆☆☆☆

باب:۱۷

اعجازِ قرآنی اور معجزہ

معجزہ کی تعریف

معجزہ واحد ہے جس کی جمع معجزات ہے اور یہ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی سچائی کی دلیل بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ معجزہ کو اس لیے معجزہ کہا جاتا ہے کہ انسان اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہے۔

معجزہ کی شرائط

معجزہ ثابت ہونے کے لیے پانچ شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی گئی تو وہ معجزہ نہیں ہوگا۔

پہلی شرط: معجزہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ اس کام کی قدرت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہ ہو چناں چہ جب نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری تھا اگر اس زمانے میں کوئی شخص رسالت کا دعوی کر دیتا اور معجزہ کے طور پر اپنے حرکت کرنے یا حرکت نہ کرنے یا کھڑا ہونے یا بیٹھنے کو پیش کرتا تو اس کا یہ دعوی ہرگز معجزہ شمار نہ ہوتا، نہ یہ اس کی سچائی کی دلیل بن سکتا کیوں کہ ایسے کام تو مخلوق کی استطاعت میں داخل ہیں۔ معجزہ ایسے کام بن سکتے ہیں جو انسان کے بس سے باہر ہوں جیسے سمندر میں راستے بن جانا، چاند کا ٹکڑے ہوجانا وغیرہ۔

دوسری شرط: یہ ہے کہ وہ کام پہلے سے جاری نظام کو توڑ کر ظاہر ہو یعنی اس میں خرقِ عادت کا پایا جانا ضروری ہے اگر کوئی مدعی رسالت کہے کہ دن کے بعد رات کا آنا اور سورج کا مشرق سے طلوع ہونا میرا معجزہ ہے تو اس کی بات کا اعتبار نہ ہوگا۔ یہ کام اگر چہ ایسے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی نہیں کر سکتا مگر یہ اس کی وجہ سے وجود میں نہیں آئے، اس کے دعوائے رسالت سے پہلے بھی ان کا نظام اسی طرح چل رہا تھا جس طرح دعوی کے وقت چل رہا ہے۔ اگر یہ اسی کو اپنی نبوت کی دلیل بناتا ہے تو کوئی اور بھی اسی بنا پر یہ دعوی کر سکتا ہے۔ یہ دعویٰ اس کی سچائی کی دلیل نہیں بن سکتا۔ جو کام حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی نبوت کی دلیل بنتے ہیں ان میں ایسی بات ضرور پائی جاتی ہے جو ان کی صداقت کی دلیل بن سکے، مثال کے طور پر کوئی پیغمبر (علیہ السلام) اپنی صداقت

کی دلیل کے طور پر یوں کہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے میرے دعوائے رسالت کے ثبوت کے لیے پہلے سے جاری نظام کو توڑ کر لاٹھی کو سانپ بنا دیا، پتھر کو توڑ کر اس سے اونٹنی نکالی، میری انگلیوں سے اس طرح پانی جاری کر دیا جس طرح چشمے سے جاری کرتے ہیں یا ان کے علاوہ کوئی ایسا کام بتائیں جو عام نظام کو توڑ کر کیا جائے جسے صرف وہ ہستی کر سکتی ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زمین بھی ہے اور آسمان بھی تو ایسی علامات اس درجہ کی ہیں گویا اللہ تعالیٰ خود مخلوق سے مخاطب ہو کر ارشاد فرما ہوں: ''اس رسول نے سچ کہا، میں نے ہی اسے بھیجا ہے'' اور پھر مخلوق کو یہ کلام سننے کی طاقت بھی دے دیں۔

اس بحث کی مثال یوں دی جا سکتی ہے...... اگرچہ اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے بہت بلند ہے...... جیسے زمین کے بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کے دربار میں کچھ لوگ بیٹھے ہوں اور بادشاہ کے سامنے بیٹھے مقربین میں سے کوئی شخص کھڑا ہو کر کہنا شروع کرے ......اور بادشاہ بھی اس کی بات سن رہا ہو کہ اے لوگو! بادشاہ سلامت تم لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ فلاں فلاں کام کرو اور اس کی دلیل یہ ہے کہ خود بادشاہ سلامت کسی علامت کو ظاہر کر کے میری تصدیق کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ کہے کہ بادشاہ سلامت میری تائید کے طور پر اپنی انگوٹھی اتار رہے ہیں۔ چناں چہ جب بادشاہ اس کا لوگوں سے یوں مخاطب ہونا سنتا ہے اور اس کا دعوی بھی سن لیتا ہے تو وہی کام کرتا ہے جسے اس شخص نے اپنی تصدیق کے طور پر پیش کیا تھا تو اس کا ایسا کرنا اس کے اس قول کے قائم مقام ہوگا کہ اس شخص نے میرے بارے میں جو دعویٰ کیا وہ اس میں سچا ہے۔ اسی طرح باری تعالیٰ کوئی ایسا کام کرتے ہیں جس کی قدرت ان کے سوا کسی کو نہیں اور اس علامت کو اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ظاہر کرتے ہوئے پہلے سے جاری نظام کو توڑ دیتے ہیں تو یہ کام باری تعالیٰ کے اس ارشاد کے قائم مقام ہوگا، بشرطیکہ ہمیں وہ ارشاد سننے کی طاقت دے دی جائے اور پھر ارشاد فرمایا جائے: میرے بندے نے رسالت کا جو دعوی کیا ہے وہ اس میں سچا ہے، میں نے ہی اسے تم لوگوں کی طرف بھیجا ہے، تم اس کی بات بھی سنو اور اس کی اطاعت بھی کرو۔

تیسری شرط: یہ ہے کہ مدعیِ رسالت اسے اپنی دلیل کے طور پیش بھی کرے۔اس کی مثال یوں ہے کہ وہ یوں کہے: میری سچائی کی نشانی یہ ہے کہ میرے کہنے پر اللہ تعالیٰ اس پانی کو تیل بنا دیں گے یا یہ کہ: میں جب زمین کو کہوں گا کہ ہلنے لگو تو اللہ تعالیٰ اس میں حرکت پیدا کر دیں گے۔ اس کے کہنے پر اگر اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کر دیا تو جس معاملہ میں مقابلہ تھا اس میں اس دعوی کرنے والے کو کامیابی حاصل ہوگئی۔

چوتھی شرط: یہ کہ معجزہ مدعی کے دعوی کے مطابق ہو۔ اگر رسالت کا کوئی مدعی کسی علامت کو اپنے دعوی کی سچائی کی دلیل بتاتا ہے تو اس کے معجزہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ علامت اس مدعی کی سچائی کی دلیل بنے۔ اگر کوئی دعوے دار کہتا ہے: میری نبوت کی نشانی اور میری سچائی کی دلیل یہ ہے کہ میرے ہاتھ بول پڑیں یا یہ کہے کہ فلاں جانور باتیں کرنے لگے۔ اب اس کا ہاتھ یا وہ جانور بولنے تو لگا مگر اس نے کہا: یہ شخص جھوٹا ہے اور اللہ تعالیٰ کا نبی نہیں ہے۔ اب یہ کلام جس کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے اس ہاتھ میں یا اس جانور میں پیدا کر دی اس مدعی کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہو گا کیوں کہ یہ علامت اس کے دعوی کے مطابق ظاہر نہیں ہوئی۔ اسی طرح کی ایک علامت مسیلمہ کذاب ملعون کے بارے میں بھی منقول ہے، کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ کنویں میں تھوک پھینکی اور دعوی کیا کہ اس کا پانی زیادہ ہو جائے گا چناں چہ اس میں جو پانی تھا وہ بھی زمین پی گئی اور کنواں خشک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے جو علامت ظاہر فرمائی یہ اس شخص کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے دلیل بن گئی جس کے ہاتھ پر اس کا ظہور ہوا، کیوں کہ اس جھوٹے دعوے دار کا جو مقصد تھا معاملہ اس کے برعکس ہوا۔

پانچویں شرط: معجزہ کی پانچویں شرط یہ ہے کہ اس کی علامت منفرد ہو یعنی مدعی نبوت نے جس علامت کو مقابلہ میں پیش کیا اور کوئی شخص ایسا نہ کر سکے۔ اگر مذکورہ بالا تمام شرائط کے ساتھ یہ شرط بھی کسی مدعی کی تائید کے لیے پائی گئی تو یہ علامت معجزہ ہو گی اور جس کے ہاتھ پر ظاہر ہوئی ہے اس کی نبوت کی دلیل بنے گی۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی دوسرا شخص بھی ایسا پیدا کر دیا جو اس کے مقابلے میں آ گیا اور وہی کچھ کر دکھایا جو اس نے کیا تھا تو اس کا دعویٰ جھوٹا ثابت ہو جائے گا اور یہ علامت معجزہ نہیں رہے گی نہ ہی مدعی کی سچائی کی دلیل بنے گی۔ اسی لیے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ﴾[الطور ۵۲: ۳۴] (اچھا تو یہ لوگ اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر یہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں)۔ نیز یہ ارشاد فرمایا: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ﴾[هود ۱۱: ۱۳] (کیا یہ کہتے ہیں کہ آپ نے اسے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے اچھا تو تم بھی دس سورتیں اس کی مثل گھڑی ہوئی لے آؤ)۔

گویا ارشاد باری تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اگر تم یہ دعوی کرتے ہو کہ یہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ترتیب دیا ہوا ہے یا یہ انہوں نے خود بنایا ہے تو تم بھی اسی طرح کی دس سورتیں مرتب کر کے لے آؤ۔ اگر تم سارے مل کر بھی ایسا کلام نہ بنا سکو تو جان لو کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتب کردہ نہیں نہ ہی انہوں نے خود اسے بنایا ہے۔

مسیحِ دجال کے خرقِ عادت کام

اگر کوئی کہے کہ ہم یہ قید نہیں لگا سکتے کہ جن علامات میں یہ پانچ شرائط پائی جائیں وہ صرف سچے لوگوں کے ہاتھ پر ہی ظاہر ہوتی ہیں کیوں کہ مسیح دجال کے بارے میں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ اس کے ہاتھوں پر عظیم علامات ظاہر ہوں گی اور بڑے بڑے معاملات کا ظہور ہوگا جیسا کہ مشہور ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے جو بات کی ہے اس میں رسالت کے دعویٰ کا ذکر ہے جب کہ دجال کا دعویٰ ربوبیت کا ہو گا۔ ان دونوں کے درمیان ایسے فرق ہے جیسے بیناؤں اور نابیناؤں کے درمیان ہوتا ہے اور یہ بات دلیل عقلی سے ثابت ہو چکی ہے کہ مخلوق میں سے کسی کو اسی مخلوق کے افراد کی طرف (رسول بنا کر) بھیجنا ناممکن نہیں، نہ ہی یہ بات بعید از قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے ان افراد کی تصدیق کے لیے دلائل قائم فرما دے جو اس کی شریعت اور دین لے کر آئے ہیں۔ اسی طرح دلائل عقلیہ سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ مسیح دجال سے چیزوں کی ہم شکل اور چیزیں بنانا یا ان کو ایک حال سے بدل کر دوسرے حال میں کر دینا ظاہر ہو گا اور یہ بات ثابت ہے کہ ایسی صفات کا تعلق تو پیدا کرنے کی طاقت سے ہی ہو سکتا ہے۔ اس کائنات کا رب اس سے بہت بلند ہے کہ وہ کسی چیز جیسا ہو یا کوئی چیز اسی جیسی ہو، اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہی سننے اور دیکھنے والا ہے۔

فصل:

معجزہ کی اقسام

جب یہ سب باتیں ثابت ہو چکیں تو جان لیجیے کہ معجزات کی دو قسمیں ہیں:

ایک ایسے معجزات جو نقل و روایت کے لحاظ سے درجہ شہرت کو پہنچے ہوئے ہوں مگر ان کا زمانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہو۔ دوسرے وہ معجزات جن کے ظہور اور صداقت کی روایات درجہ تواتر کو پہنچی ہوں جن سے ان معجزات کا واضح ثبوت مل چکا ہو اور ان روایات کے سننے والے کو اس کا علم ہو جانا یقینی ہو چکا ہو۔

معجزہ کی روایت کے لئے شرائط

اس کی ایک شرط یہ ہے کہ اسے نقل کرنے والی ایک کثیر مخلوق اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد ہو۔ پھر جو

کچھ وہ نقل کر رہے ہیں اس کے بارے میں انہیں یقینی علم ہو اور نقل کرتے ہوئے ہر مرحلہ پر راویوں کی تعداد میں کثرت ایک جیسی ہو تاکہ ان کا جھوٹ پر متفق ہونا محال ہو جائے۔

قرآن مجید ہم تک کیسے پہنچا؟

یہ تمام شرائط قرآن مجید کو نقل کرنے میں بھی پائی جاتی ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کو ثابت کرنے میں بھی۔ اُمت مسلمہ نسلاً بعد نسل قرآن مجید کو نقل کرتے آئی ہے یہاں تک کہ اس نقل کی سند نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ جاتی ہے جن کا وجود یقینی علم کے ساتھ ثابت اور جن کی سچائی دلائل اور معجزات کی بنا پر مسلّم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کو جبریل علیہ السلام سے نقل کیا جنہوں نے اسے خود رب ذوالجلال سے حاصل کیا۔ اس طرح حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کو دو ایسے رسولوں نے نقل کیا ہے جو اس میں کمی یا زیادتی سے محفوظ ہیں۔ پھر اسے ہم تک ایک بہت بڑی تعداد نے تواتر کے ساتھ پہنچایا جن کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اسے پہلوں سے سنتے ہوئے یا بعد والوں تک پہنچاتے ہوئے جھوٹ پر متفق ہو گئے ہوں گے کیوں کہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس بنا پر انہوں نے ہمیں جو کچھ روایت کر کے بتایا جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود، قرآن مجید کا ان کے دست مبارک پر ظاہر ہونا اور کفار کو مقابلہ کی دعوت دینا ہمیں اس کی سچائی کا یقینی علم حاصل ہو گیا۔ دنیوی علوم میں اس کی مثال وہ علم ہے جو انسان کو شہروں کے بارے میں لوگوں کے بتانے سے حاصل ہوتا ہے جیسے بصرہ، شام، عراق، خراسان، مدینہ اور مکہ وغیرہ کے موجود ہونے کا علم۔ اسی طرح بہت سی یقینی معلومات ہوتی ہیں جو تواتر کے ساتھ نقل ہو کر حاصل ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآن مجید ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا معجزہ ہے جو ان کے بعد بھی قیامت تک باقی رہنے والا ہے، جب کہ دیگر تمام انبیاء کے معجزات یا تو معدوم ہو چکے ہیں یا ان میں تبدیلی آ چکی ہے جیسے تورات اور انجیل وغیرہ کا حال ہوا۔

اعجازِ قرآنی کے دس امتیازات

پہلا امتیاز: نظم کا انوکھا انداز

نظمِ قرآنی کا انداز ایسا نرالا ہے کہ لغتِ عرب میں نظم کے تمام اسالیب اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہیں اور بات صرف لغت عرب ہی کی نہیں، کسی بھی زبان میں ایسا نظم نہیں پایا جاتا۔ نظم قرآنی کا نظمِ شعر سے کوئی تعلق نہیں جس کی گواہی اس کے موجد خود اللہ رب العزت نے یوں دی ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِي

لَهُ﴾ [یس ۳۶: ۶۹] (اور ہم نے آپ کو شعر و شاعری نہیں سکھلائی اور نہ وہ آپ کے شایاں شان ہے)۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضرت أبو ذر رضی اللہ عنہ[1] کے بھائی اُنیس نے ایک مرتبہ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو کہا:

[۱۲۹] لقيتُ رجُلاً بمكة على دينك يزعمُ أنّ اللهَ أرسله ؛ قلتُ: فما يقولُ الناسُ؟ قال: يقولون: شاعر، كاهِنٌ، ساحر؛ وكانَ أُنَيسٌ أحدَ الشُّعَراء، قال أُنَيس: لقد سمعتُ قولَ الكَهَنةِ، فما هو بِقولِهم، ولقد وضعتُ قولَهُ على أقراءِ الشِعرِ فلَمْ يَلْتَئِمْ على لسانِ أحَدٍ بَعدي أنه شعر، واللهِ إنّه لصادقٌ، وإنّهم لكاذِبُونَ۔

میری ملاقات مکہ میں ایک شخص سے ہوئی جو اسی دین پر ہے جس پر تم ہو۔ وہ یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ (حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں) میں نے (انیس سے) کہا: لوگ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: لوگ کہتے ہیں: وہ شاعر ہے، کاہن ہے، جادوگر ہے۔ انیس جو کہ خود شاعر تھے انہوں نے مزید کہا: یقیناً میں نے کاہنوں کی باتیں سنی ہوئی ہیں۔ جو کچھ یہ شخص سناتا ہے کاہنوں کا قول نہیں، اور میں نے اس کے شعر کا تمام اسالیب سے تقابل کر کے دیکھا مگر میں تو کیا میرے علاوہ بھی کسی نے نہیں کہا کہ یہ شعر ہے۔ اللہ کی قسم! یہ شخص سچا ہے اور (مخالف) لوگ ہی جھوٹے ہیں۔

اسی طرح عتبہ بن ربیعہ کو جب سورہ "حٰمٓ فُصِّلَت" سنائی گئی تو اس نے بھی مانا کہ یہ نہ جادو ہے نہ شعر ہے، جیسا کہ مذکورہ سورت کی تفسیر کے ضمن میں اس کا بیان آئے گا۔ عتبہ کو لغتِ عرب میں جو مہارت اور فصاحت و بلاغت میں جو مقام حاصل ہے اس کے باوجود وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس نے قرآن جیسا کلام کبھی نہیں سنا۔ یوں وہ اپنے مقابلے میں بھی اعجازِ قرآنی کا اقرار کرتا ہے اور اپنے برابر کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بھی جن کی فصاحت مسلم اور تمام اسالیب کلام پر ان کا حاوی ہونا محقق تھا۔

دوسرا امتیاز: انوکھا اسلوب

اعجازِ قرآنی کا دوسرا امتیاز اس کا اسلوب ہے جو عرب کے تمام اسالیب کلام سے انوکھا اور نرالا ہے۔

---

[۱۲۹] صحیح مسلم: كتاب فضائل الصحابة رضى الله عنهم، باب فضائل أبي ذر رضى الله عنه ۷:۱۵۲، صحیح ابن حبان: كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۶:۷۷، مسند أحمد: حديث أبي ذر رضى الله عنه ۶:۲۲۱

۱۔ أبو ذر جندب بن جنادہ الغفاری (م ۳۲ھ) مشہور صحابی ہیں۔ ان کی وفات حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ہوئی۔ انیس بن جنادہ بھی ان کے بھائی ہیں۔ الإصابة ۴:۶۲، کنیت: ۳۸۴

تیسرا امتیاز: فصاحت و روانی

قرآنی عبارات میں ایسی روانی ہے جو مخلوق کے کلام میں کسی طور ممکن نہیں، سورۂ "ق والقُرآنِ المجید" میں شروع سے آخر تک غور کر کے دیکھ لیجیے۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [الزمر ۳۹:۶۷](اور حال یہ ہے کہ قیامت کے دن ساری زمین اسی کی مٹھی میں ہو گی) ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ اللَّهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُونَ﴾ [ابراھیم ۱۴:۴۲] سے سورت کے آخر تک۔(اور اللہ کو اس سے بے خبر ہرگز مت سمجھ جو کچھ یہ ظالم لوگ کر رہے ہیں)۔

ابنِ حصار کہتے ہیں: جس شخص کو یہ یقین ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کا وجودِ برحق ہے اسے یہ بھی یقین ہو گا کہ یہ روانی اس کے علاوہ کسی اور کے کلام میں ممکن نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے بادشاہ کی ہمت نہیں کہ یوں کہہ سکے: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ [غافر ۴۰:۱۶](آج کے روز کس کی حکومت ہے؟)۔ نہ کوئی یہ کہہ سکتا ہے: ﴿وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَشَاءُ﴾ [الرعد ۱۳:۱۳] (اور وہ (اللہ) بجلیاں بھیجتا ہے، پھر انہیں جس پر چاہتا ہے گرا دیتا ہے)۔

تینوں امتیازات کا دائرہ کار

ابن حصارؒ کہتے ہیں: یہ تینوں امتیازات: نظم، اسلوب اور روانی ہر سورت بلکہ ہر آیت میں لازمی طور پر پائے جاتے ہیں۔ ان تینوں امتیازات کے مجموعہ کا اثر یہ ہے کہ کوئی بھی آیت یا سورت پڑھی جائے، سننے والے کو انسان کے ہر طرح کے کلام سے اس کا امتیاز واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کفار کو قرآن مجید کی مثال پیش کرنے کی دعوت دی گئی اور اسے معجزہ قرار دیا گیا۔ ان تینوں امتیازات کے عمومی طور پر پورے قرآن مجید میں موجود ہونے کے باوجود ہر سورت میں ان کا وجود مستقل ہے، خواہ اعجازِ قرآنی کے دس امتیازات میں سے کوئی اور امتیاز اس میں نہ بھی پایا جائے۔ مثال کے طور پر سورۂ کوثر کو لے لیجیے: اس میں تین چھوٹی چھوٹی آیات ہیں۔ یہ پورے قرآن مجید میں سب سے چھوٹی سورت ہے، اور مضمون کے لحاظ سے اس میں دو غیبی امور کی خبر دی گئی ہے جن میں سے پہلا حوض کوثر ہے جس کی عظمت، وسعت اور اس کے برتنوں کی کثرت اس سورت میں بیان کی گئی ہے اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والے باقی تمام رسل کے متبعین سے زیادہ ہوں گے۔ دوسری بات جس کی طرف اشارہ ہے وہ ولید بن مغیرہ کا حال بیان کرنا ہے جو کہ اس آیت کریمہ کے نزول کے وقت صاحبِ مال و اولاد تھا جیسا کہ درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں بیان فرمایا گیا ہے: ﴿ذَرْنِي وَمَنْ

خَلَقْتُ وَحِيْدًا. وَجَعَلْتُ لَهُ مَالاً مَّمْدُوْدًا. وَبَنِيْنَ شُهُوْدًا. وَمَهَّدْتُّ لَهُ تَمْهِيْدًا﴾ [المدثر ۷۴: ۱۱-۱۴] چھوڑ دیجئے مجھے اور اس کو جسے میں نے اکیلا پیدا کیا، اور اس کو کثرت سے مال دیا، اور پاس رہنے والے بیٹے، اور (سب طرح کا) سامان اس کے لیے میں نے خوب مہیا کر دیا۔

چوتھا امتیاز: لغتِ عرب میں منفرد تصرف

اعجازِ قرآنی کے امتیازات میں سے ایک لغتِ عرب کے اپنے کلمات اور حروف کے استعمال اور ترتیب کا وہ انوکھا انداز ہے جو کسی ایک عربی کے ہاں مستقل طور پر نہیں پایا جاتا، جس کی وجہ سے ایسے استعمال اور ترتیب پر تمام اہلِ عرب کا متفق ہونا بھی ناپید ہے۔

پانچواں امتیاز: گزشتہ حالات کا بیان

جب سے دنیا بنی، اس وقت سے لے کر نزول قرآن تک کے معاملات قرآن مجید میں ایک ایسی ہستی کے ذریعے بیان کیے گئے جو اُمّی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نزول قرآن سے پہلے کوئی کتاب نہ پڑھی تھی نہ ہی اپنے ہاتھ سے لکھنا جانتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء کے اپنی امتوں کے ساتھ پیش آنے والے حالات و واقعات بیان کیے اور گزشتہ زمانوں کے دیگر حالات سنائے۔ نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم سے اہلِ کتاب نے جن چیزوں کے بارے میں سوالات کیے قرآن نے ان کے جوابات دیے۔ اہل کہف کے قصہ کے بارے میں ان سے مقابلہ کرنا چاہا تو اس کی بھی قرآن نے وضاحت کی۔ یہی حال حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام اور ذوالقرنین کے حالات کا ہوا۔ چناں چہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود اُمّی ہونے اور اُمّی قوم کا فرد ہونے کے جو علم سے آشنا نہ تھی، ان کو اسی کے مطابق جوابات دیے جو وہ گزشتہ کتابوں میں پڑھ چکے تھے اور جن کی صحت کا انہیں یقین تھا۔ اس سے انہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی کی بھی تحقیق ہوگئی۔

قاضی ابن طیبؒ کہتے ہیں: ہم یہ بات بدیہی طور پر جانتے ہیں کہ ان امور کا علم سیکھے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب یہ بات سب لوگ جانتے تھے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ تو روایات سنانے والوں یا گزشتہ حالات جاننے والوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، نہ وہ کسی پڑھے لکھے شخص کے پاس آتے جاتے تھے اور خود بھی پڑھنا نہ جانتے تھے کہ اس بات کا امکان ہوتا کہ کوئی کتاب ان کے ہاتھ لگ جاتی اور وہ اس سے کچھ اخذ کر لیتے تو اس سے معلوم ہوگیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ سب باتیں جان لینا صرف وحی کے ذریعے تھا۔

چھٹا امتیاز: قرآنی وعدوں کا سچا ہونا

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو وعدے کیے ان کو اس طرح سچ کر دکھایا کہ سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور اپنے حواس سے ان کا ادراک کر لیا۔ قرآنی وعدوں کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ مطلق وعدے:

جیسا کہ باری تعالیٰ نے اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد اور ان لوگوں کو اپنے وطن سے نکال باہر کرنے کا وعدہ کیا جنہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نکالا تھا۔

۲۔ مشروط وعدے:

جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ [الطلاق ۶۵: ۳] اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے گا سو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔ ﴿وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ﴾ [التغابن ۶۴: ۱۱] اور جو کوئی اللہ پر ایمان رکھتا ہے وہ اسے راہ دکھا دیتا ہے۔ ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا﴾ [الطلاق ۶۵: ۲] اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے کشائش پیدا کر دیتا ہے۔ ﴿اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ﴾ [الأنفال ۸: ۶۵] اگر تم میں سے بیس آدمی بھی ثابت قدم ہوں گے تو دو سو پر غالب آ جائیں گے۔ اور اسی طرح کے دیگر ارشادات باری تعالیٰ۔

ساتواں امتیاز: آئندہ زمانے کے حالات کا ذکر

انہی امتیازات میں سے آئندہ زمانے کے حالات کی خبر دینا ہے جو اس وقت تک پردۂ غیب میں تھے اور جن کا پتہ چلانا وحی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ ان میں سے اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ وعدہ فرمانا بھی ہے کہ وہ جملہ ادیان پر آپ کا دین غالب کرے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [الفتح ۴۸: ۲۸] وہ (اللہ) وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ چناں چہ ایسا ہی کر کے دکھا دیا گیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب بھی اپنے لشکر کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو انہیں دین کے غلبہ والا اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ یاد دلاتے تا کہ انہیں اپنی فتح اور دشمن کے مقابلہ میں کامیابی کا یقین ہو جائے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے عہدِ خلافت میں اسی طرح کیا کرتے تھے۔ جس کی برکت سے خشکی اور تری ہر راستہ سے مشرق و

مغرب میں فتوحات لگاتار جاری رہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَعَدَاللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ [النور ۲۴:۵۵]تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، ان سے اللہ وعدہ کرتا ہے کہ انہیں زمین میں حکومت عطا کرے گا، جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دے چکا ہے۔ اور فرمایا: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ آمِنِيْنَ﴾ [الفتح ۴۸:۲۷]۔ (بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا خواب دکھایا، مطابق واقعہ کے تم لوگ مسجد حرام میں ان شاء اللہ ضرور داخل ہو گے امن و امان کے ساتھ) نیز فرمایا: ﴿وَاِذْيَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ اَنَّهَالَكُمْ﴾ [الأنفال ۸:۷] اور (وہ وقت یاد کرنے کے قابل ہے) جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا دو جماعتوں میں سے ایک کے لئے کہ وہ تمہارے ہاتھ آ جائے گی۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ﴾ [الروم ۳۰:۱،۲] (الف لام میم۔ اہل روم ایک قریب کی زمین میں مغلوب ہوگئے۔ اور وہ اپنی اس مغلوبیت کے بعد عنقریب غالب آ جائیں گے)۔

یہ تمام پیش گوئیاں اُن غیبی امور کے بارے میں ہیں جنہیں رب العالمین ہی جانتا ہے یا اس شخص کو معلوم ہوسکتا ہے جسے رب العالمین بتا دے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے بتائیں تاکہ ان کی سچائی کی دلیل بنیں۔

آٹھواں امتیاز: پوری کائنات کا نظام چلانے کے لئے دستور

قرآن مجید جن علوم کو محیط ہے وہ ساری مخلوق کا نظام چلانے کے لئے کافی ہیں۔ حلال و حرام کی پہچان اور دیگر تمام احکام اس میں موجود ہیں۔

نواں امتیاز: عقل و دانش کے بے مثال جواہر

قرآن مجید میں حکمت و دانائی کی جو اعلیٰ مثالیں ہیں وہ اپنی عظمت، قدر اور کثرت کے لحاظ سے اس درجہ کی ہیں کہ عام طور پر کسی انسان سے ان کا صادر ہونا ناممکن ہے۔

دسواں امتیاز: قرآن کے ظاہر و باطن میں تناسب

قرآن مجید میں جو مضامین ہیں ان کے ظاہر اور باطن میں اس قدر تناسب ہے کہ کہیں اختلاف کا شائبہ

نہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ [النساء ۴: ۸۲] اگر یہ کلام اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

نظامیہ اور قدریہ کا رد

میں کہتا ہوں: یہ دس امتیازات تو وہ ہیں جو ہمارے علماءؒ نے بیان کیے ہیں۔ ایک گیارہویں صورت جس کے قائل فرقہ قدریہ والے اور فرقہ نظامیہ کا بانی نظام ہیں[1]۔

وہ یہ کہ قرآن کا اعجاز دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کفار کو قرآن کی سورت جیسی اور سورت بنانے سے روکے رکھا اور مقابلہ کی دعوت کے وقت ان کے ارادے پھیر دیئے۔ ان کا خیال ہے کہ اصل معجزہ یہی قدرتی رکاوٹ ہے، خود قرآن میں کوئی اعجاز نہیں۔ یہ نظریہ باطل ہے۔ اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن کی مخالفت ظاہر ہونے سے پہلے ہی وہ معجز تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ قدرتی رکاوٹ اور کفار کے ارادے میں اللہ تعالیٰ کا تصرف ہی معجز ہے تو اس سے قرآن کے معجز ہونے کا انکار لازم آتا ہے اور یہ اجماع کے خلاف ہے۔ اور جب حقیقت یہی ہے تو معلوم ہوا کہ قرآن بذاتِ خود معجز ہے کیوں کہ اس کی فصاحت و بلاغت غیر معمولی ہے اور اس طرز کا کوئی کلام آج تک دیکھا سنا نہیں گیا۔ جب یہ کلام ہی سرے سے ان کے ہاں معروف و معتاد نہ تھا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ قدرتی رکاوٹ اور ارادوں میں تصرف کا نام اعجازِ قرآنی نہیں۔

ان کی اپنی آراء میں اختلاف

جن لوگوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخالفین کو اس کے مقابلہ سے روکے رکھنے اور ان کے ارادوں کو موڑنے میں ہے وہ بھی کسی ایک رائے پر متفق نہیں بلکہ اس بارے میں ان کے دو اقوال ہیں:

ایک یہ کہ اُن سے قرآن کا مقابلہ کرنے کی طاقت سلب کر لی گئی۔ اگر وہ مقابلہ کی کوشش بھی کرتے تو ان سے نہ ہو سکتا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ ان میں مقابلہ کرنے کی طاقت تو باقی رہی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کو مقابلہ کی طرف رخ کرنے سے روکے رکھا۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو ہو سکتا ہے کامیاب ہو جاتے۔

۱۔ ابراہیم النظام فرقہ نظامیہ کا بانی ہے۔ یہ فرقہ قدریہ کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ نظام نے فلاسفہ کا کلام معتزلہ کی باتوں کے ساتھ ملا کر پیش کیا۔ فرقہ قدریہ والے کہتے ہیں کہ بندہ خود اپنے افعال کا خالق ہے۔ وہ کفر اور معاصی کو بھی اللہ تعالیٰ کی تقدیر نہیں مانتے۔

قرآنی مبارزت اور اعجاز کا حقیقی پہلو

ابن عطیہ کہتے ہیں: قرآنی مبارزت کا پہلو اس کے نظم، معانی کی صحت اور الفاظ کی مسلسل فصاحت میں نمایاں ہے۔ اس کے اعجاز کی صورت یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کا علم ہر شے کو محیط ہے اور اس کے ضمن میں کلام کے ہر پہلو کو بھی محیط ہے۔ اسی علمی احاطہ کی بناء پر اللہ تعالیٰ یہ خوب جانتے ہیں کہ ایک کے بعد دوسرا لفظ کون سا لایا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا اور پہلے معنی کے بعد دوسرے معنی کی مکمل طور پر وضاحت کرنے والا ہوگا قرآن کا اسلوب اپنی ابتداء سے آخر تک اسی طرح ہے۔ انسان کے علم میں بھی کمی رہ جاتی ہے، وہ بھول بھی جاتا ہے اور کبھی ہوش و حواس بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ یہ بات بھی بدیہی طور پر واضح ہے کہ انسان کبھی بھی تمام جہات کو مکمل طور پر محیط نہیں رہا۔ اسی وصف کی بناء پر نظمِ قرآنی فصاحت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہے۔ اس طرح غور کرنے سے یہ بات بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ اس کے قائل ہیں کہ عرب فصاحت کے اعلیٰ درجہ کے حامل قرآن مجید کی مثال تو پیش کر سکتے تھے مگر جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو ان کا رخ اس مقابلہ سے پھیر دیا گیا اور وہ اس جیسا قرآن بنا کر لانے سے عاجز رہ گئے۔ ان لوگوں کا نظریہ بالکل غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ قرآن کے مقابلہ میں اس جیسا قرآن بنا لانا کبھی بھی کسی مخلوق کی قدرت میں نہ تھا۔ انسان کی کمزوری تو اسی سے واضح ہو جاتی ہے کہ ایک فصیح اللسان شخص ایک خطبہ ترتیب دیتا ہے یا قصیدہ کہتا ہے جس میں اپنی مکمل صلاحیت لگا دیتا ہے مگر اس کے باوجود پورا سال اسی کی اصلاح کرنے میں صرف کر دیتا ہے۔ پھر سال بھر گزرنے کے بعد اسے کسی اور کے حوالہ کرتا ہے جو اس کی اصلاح پر اپنی صلاحیتیں لگاتے ہوئے اس میں مزید تنقیح اور تبدیلیاں کرتا ہے۔ اس سب کے بعد بھی ہمیشہ اس میں کوئی نہ کوئی مقام ایسا رہتا ہے جس پر نظرثانی اور تبدیلی کی تجاویز ملتی رہتی ہیں۔ اس کے برعکس کتاب اللہ کی شان یہ ہے کہ اگر اس میں سے ایک لفظ نکال لیا جائے اور اس سے بہتر کی تلاش میں پوری لغتِ عرب کو تہہ و بالا کر دیا جائے تب بھی اس سے بہتر لفظ نہیں ملے گا۔

قرآنی فصاحت کی چند مثالیں

قرآنی فصاحت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آیت میں دو امر، دو نہی، دو خبریں اور دو بشارتیں ذکر فرمائیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاَوْحَيْنَا إِلَى أُمِّ مُوْسٰى أَنْ اَرْضِعِيْهِ﴾ [القصص ۲۸:۷]
اور ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ تم انہیں دودھ پلاؤ۔

اسی طرح سورۂ مائدہ کی ابتداء میں وفاء کا حکم، بے وفائی کی ممانعت، عام حلت کا ذکر، پھر دوہرا استثناء اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کا بیان ہے۔ اس اندازِ کلام کی طاقت اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کو

نہیں۔ اسی طرح اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے موت کا ذکر فرمایا، موقعہ ہاتھ سے نکل جانے پر حسرت کو بیان فرمایا، آخرت اور اس کے ثواب و عقاب کی خبر دی، کامیاب ہونے والوں کی کامیابی اور مجرمین کی بربادی کو بھی بیان فرمایا، دنیا کے دھوکہ میں پڑنے سے متنبہ کیا اور اسے متاعِ قلیل کا نام دیا، جب کہ آخرت کے بارے میں بتایا کہ وہ دارالبقا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾ [آل عمران ۳:۱۸۵] ہر جاندار کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو تمہاری پوری مزدوری تو بس قیامت ہی کے دن ملے گی۔

اسی طرح باری تعالیٰ نے پہلے اور پچھلے لوگوں کے قصے، سرکشوں کا انجام اور ہلاک ہونے والوں کی عاقبت سب کچھ صرف ایک آیت کے ایک حصے میں بیان فرما دیا۔ ارشاد باری ہے: ﴿فَمِنْهُمْ مَنْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا، وَمِنْهُمْ مَنْ أَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ، وَمِنْهُمْ مَنْ خَسَفْنَا بِهِ الْأَرْضَ، وَمِنْهُمْ مَنْ أَغْرَقْنَا﴾ [العنکبوت ۲۹:۴۰] (تو ان میں سے کسی قوم پر تو ہم نے تند ہوا بھیجی، کسی کو ہولناک آواز نے آدبایا، کسی کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کسی کو ہم نے غرق کر دیا)۔ ایک مقام پر اللہ عزوجل نے کشتی کا قصہ، اس کے جاری ہونے کا منظر، کفار کی ہلاکت، کشتی کے ٹھہرنے اور برابر ہو جانے کا ذکر فرمایا۔ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللَّهِ مَجْرِيهَا وَمُرْسَاهَا" سے "وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ﴾ [ھود ۱۱:۴۱-۴۴] تک۔ اور (نوح نے) کہا: (آؤ) اس میں سوار ہو جاؤ۔ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا۔ بے شک میرا پروردگار بڑا بخشنے والا ہے بڑا رحمت والا ہے۔ اور وہ کشتی انہیں لے کر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی۔ اور نوح (علیہ السلام) نے اپنے لڑکے کو پکارا اور وہ کنارے پر تھا کہ اے میرے (پیارے) بیٹے! سوار ہو جا ہمارے ساتھ اور کافروں کے ساتھ مت رہ۔ وہ بولا! میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لیتا ہوں، وہ مجھے پانی سے بچا لے گا۔ (نوح علیہ السلام نے کہا): آج کے دن اللہ کے حکم (عذاب) سے کوئی بچانے والا نہیں ہے، البتہ وہی جس پر اللہ رحم کر دے اور دونوں کے درمیان موج حائل ہوگئی۔ سو وہ ڈوبنے والوں میں ہوگیا اور ارشاد ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تھم جا اور پانی کم ہوگیا اور کام پورا ہوگیا اور (کشتی) آٹھہری جودی پر اور کہہ دیا گیا کہ (اپنے اوپر) ظلم کرنے والے لوگ (رحمت سے) دور ہوگئے۔ اسی طرح مزید آیات میں غور کرنے سے اعجازِ قرآنی کا پتہ چل جاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع اور کفار کو دعوتِ مقابلہ

جب قریش بے بس ہوگئے اور قرآن مجید جیسا کلام بنا کر نہ لا سکے مگر اس پر اصرار کرتے رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گھڑ لیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ ارشاد نازل فرمایا: ﴿أَمْ يَقُولُونَ تَقَوَّلَهُ. بَلْ لَا يُؤْمِنُونَ. فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِثْلِهِ إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ﴾ [الطور ۵۲:۳۳،۳۴] (ہاں یہ کہتے ہیں کہ آپ نے (قرآن) کو گھڑ لیا

ہے؟ اصل یہ ہے کہ ان میں ایمان ہی نہیں۔ اچھا تو یہ لوگ اس طرح کا کوئی کلام لے آئیں اگر یہ اپنے دعوے میں سچے ہیں)۔ پھر ان کی بے بسی ظاہر کرنے کے لئے کاری ضرب لگائی اور ارشاد فرمایا: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ. قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ﴾[هود ۱۱:۱۳] (کیا یہ کہتے ہیں کہ (آپ نے) اسے گھڑ لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا تو تم بھی دس سورتیں اسی کی مثل گھڑی ہوئی لے آؤ)۔ جب وہ لوگ اس چیلنج کا بھی جواب نہ دے سکے تو دس سورتوں سے کم مقدار کی مبارزت دے کر ایک چھوٹی سی سورت بنا لانے کی دعوت دی اور ارشاد فرمایا: ﴿وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّانَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ﴾ [البقره ۲:۲۳] اگر تم اس کتاب ہی کے بارے میں شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو کوئی ایک سورت اس جیسی تم بھی بنا لاؤ۔

جب ان کی زبانیں گُنگ ہوگئیں اور وہ کوئی جواب نہ دے سکے اور ان کے سارے رابطے منقطع ہوگئے تو مقابلہ چھوڑ کر لڑائی اور دشمنی پر اتر آئے، اور بیوی بچوں کے قیدی بننے بنانے کو ترجیح دی، حالاں کہ اگر ان میں مقابلہ کی سکت ہوتی تو یہ زیادہ آسان، حجت کے لحاظ سے زیادہ مضبوط اور زیادہ مؤثر کام تھا۔ ان کا یہ حال ان کی بلاغت وخوش کلامی اور مہارت کے باوجود ہوا حالاں کہ دنیا ان سے فصاحت اور لغت سیکھنے کے لئے آتی تھی۔

قرآن کی بلاغت

قرآن مجید کی بلاغت نہ صرف یہ کہ حسن وکمال کے اعلیٰ درجہ اور جامعیت ومعنویت کی معراج پر ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ وہ حسن وعمدگی کے تمام پیمانوں کو توڑ کر بلندیوں کی کھلی فضاؤں کو جلا بخش رہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کو دیکھیے جن کو جوامع الکلم والے حسنِ بیان اور حکمت ودانش کے ایسے بیش قیمت جواہر سے نوازا گیا ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں غور کیجئے جو آپ نے جنت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

[۱۳۰] فِيهَا مَالَا عَينٌ رأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلى قَلْبِ بَشَرٍ۔

اس میں وہ کچھ ہوگا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہوگا، نہ کسی کان نے اس کے بارے میں سنا ہوگا اور نہ ہی کسی انسان کے دل پر اس کا خیال تک گزرا ہوگا۔

---

[۱۳۰] صحیح مسلم: كتاب الجنة وصفة نعيمها بروایت ابو هريرة رضی الله عنه ۸:۱۴۳، صحیح بخاری: کتاب بدأ الخلق باب ماجاء في صفة الجنة وأنّها مخلوقة ۳:۱۱۸۵، كتاب التفسير، باب قوله فلا تَعْلَمُ نفسٌ ما أُخفِيَ لهم مِن قُرّة أعين ۴:۱۷۹۴، كتاب التوحيد، باب قول الله يريدون أن يُبدّلوا كلام الله ۶:۲۷۲۳۔ اس کے علاوہ ترمذیؒ نے کتاب التفسیر، ابن ماجہؒ نے: کتاب الزهد، دارمیؒ نے کتاب الرقائق میں اور ابن حبان، ابن خزیمہ، حاکم، احمد، ابو یعلی، عبدالرزاق، طبرانی، بیہقی: شعب الإيمان نے اسے متعدد مقامات پر نقل کیا ہے۔

یہ ارشاد عالی اگرچہ حسن و جامعیت کی انتہاء کو پہنچا ہوا ہے لیکن قرآن کی شان اس سے بھی بہت نرالی ہے، جہاں تک ارشاد نبوی کی بھی رسائی نہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فِيْهَا مَاتَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ [الزخرف ۴۳: ۷۱] وہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کا جی چاہے گا اور جس سے آنکھوں کو لذت ملے گی۔ ﴿فَلَاتَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآاُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ [السجدة ۳۲: ۱۷] سوکسی کو علم نہیں جو جو (سامان) آنکھوں کی ٹھنڈک کا ان کے لئے (خزانۂ غیب میں) مخفی ہے۔

ان ارشاداتِ الٰہیہ کا وزن مناسب ترین، ان کی ترکیب حسین ترین، ان کے الفاظ کی شیرینی اعلیٰ ترین اور حروف کی تعداد بہت مختصر ہے، حالاں کہ یہ ایک (چھوٹی) سورت یا ایک لمبی آیت سے زیادہ نہیں۔ کلام اگر طویل ہو تو جوں جوں اس کے طول میں اضافہ ہوتا جاتا ہے بے تکلف بولنے والے کے لئے الفاظ کے استعمال میں آسانیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جس میں صلاحیت کی کمی ہوتی ہے اور بتکلف کچھ کلام کر لیتا ہے اس کے لئے بولنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قرآن کی اس خصوصیت کی بناء پر اہلِ عرب پر حجت قائم ہوئی، کیوں کہ وہ تو میدانِ فصاحت کے شہسوار اور اس میدان میں مقابلہ کے لئے ہر دم تیار رہنے والے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے اطِبّاء پر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ سے جادوگروں پر حجت قائم ہوئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے معجزات ہر دور کے اسی میدان میں ظاہر فرمائے جس میں متعلقہ نبی کی قوم انتہائی کمال کو پہنچی ہوتی تھی۔ چناں چہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو انتہاء پر تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طِب ترقی کی معراج پر تھی اور اسی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں فصاحت عظمتوں کا مینار تھی۔

☆☆☆☆☆

باب:۱۸

فضائلِ قرآن کے بارے میں من گھڑت روایات

ایسی جھوٹی احادیث اور باطل روایات ہرگز قابلِ توجہ نہیں جنہیں گھڑنے والوں نے قرآن کی سورتوں کے فضائل کے بارے میں گھڑ لیا یا ایجاد کرنے والوں نے اپنے تخیل سے دیگر اعمال کے فضائل کے بارے میں ایجاد کرلیا۔ یہ بہت سے لوگوں کا اجتماعی گناہ ہے جس کے پیچھے ان کے مختلف مقاصد کارفرما تھے۔[1] چنانچہ زنادقہ میں سے مغیرہ بن سعید الکوفی[2] اور محمد بن سعید شامی[3] جسے زندیق ہونے کی وجہ سے سولی چڑھا دیا گیا۔

دین دشمنی کی بناء پر وضعِ حدیث

ان کے علاوہ اور کئی لوگوں نے بھی اپنے پاس سے احادیث گھڑیں اور لوگوں کے دلوں میں شک ڈالنے

۱۔ موضوع حدیث وہ ہے جسے کوئی راوی اپنے پاس سے گھڑ کر اس کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دے۔ یہ دراصل حدیث شمار ہی نہیں ہوتی مگر اس کے راوی کے زعم میں چوں کہ یہ حدیث ہوتی ہے اس لیے دیگر اقسام کے ساتھ اسے بھی ذکر کر دیا جاتا ہے۔ حدیث کے موضوع ہونے کی پہچان یا تو خود گھڑنے والے کے کسی ضمنی اعتراف سے ہو جاتی ہے یا قرائن سے ایسی حدیث کی پہچان ہوتی ہے جنہیں علماء حدیث خوب جانتے ہیں۔ یہ قرائن کبھی راوی کے حال سے مل جاتے ہیں اور کبھی روایت کے متن سے۔ وضع حدیث کے اسباب میں ایک بڑا سبب بے دینی تھا۔ زنادقہ نے چودہ ہزار احادیث گھڑیں۔ دوسرا سبب اپنے فرقہ یا جماعت کو بے جا تائید مہیا کرنا تھا جیسے خوارج کے بارے میں منقول ہے کہ ان کے ایک عالم نے توبہ کے بعد بتایا کہ ہم جب بھی کسی کام کا ارادہ کرتے تو اس کی تائید کے لیے حدیث گھڑ لاتے۔ کبھی حدیث گھڑنے کا مقصد امراء کی خوشنودی ہوتی تھی۔ کبھی جہالت اس کا سبب بن جاتی تھی جیسے جاہل عبادت گزاروں نے ترغیب کی خاطر قرآنی سورتوں کی فضیلت میں احادیث گھڑلیں، خواہ یہ عبارت گھڑنے والے کی اپنی ہو یا کسی اور سے لے کر اسے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دی گئی ہو۔ اس کا حکم یہ ہے کہ حدیث گھڑنا ہر حال میں حرام ہے۔ خواہ اس کا مقصد اعمال کی ترغیب ہو یا بداعمال پر متنبہ کرنا۔ محمد مرعفی: **الوجیز فی مصطلح الحدیث** ص ۳۷-۳۸

۲۔ ابوعبداللہ مغیرہ بن سعید البجلی الکوفی (م تقریباً ۱۲۰ھ) نے کوفہ میں اپنی چرب زبانی اور شعبدہ بازی کی بناء پر کثیر خلق خدا کو اپنے پیچھے لگا لیا اور بالآخر نبوت کا دعویٰ کر دیا جس کی وجہ سے اسے قتل کر دیا گیا۔ **المیزان** ۶: ۷۵

۳۔ محمد بن سعید شامی اہل دمشق میں سے تھا۔ اسے زندقہ کے الزام میں سولی چڑھا یا گیا۔ اس نے مکحولؒ سے علمی استفادہ کیا اور امام بخاری نے بھی نام میں خلط ملط ہونے کی وجہ سے اپنی ''التاریخ'' میں اس سے کچھ روایات بھی نقل کی ہیں مگر ان کا کہنا ہے کہ: اس کی روایت معتبر نہیں ہے۔ امام نسائیؒ کہتے ہیں: وہ کذاب ہے۔ دیگر کئی محدثین سے بھی یہی منقول ہے۔ **المغنی فی الضعفاء** ۲: ۲۰۲

کے لیے ان کی خوب تشہیر کی۔ ان میں محمد بن سعید کی ایک روایت یہ بھی ہے:

[۱۳۱] عَن أنس بن مالك في قوله صلى الله عليه وسلم: أنا خاتم الأنبياء لانبيَّ بَعْدی إلّاماشاء اللّٰه۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی یوں نقل کیا گیا ہے: میں آخری نبی ہوں۔ میرے بعد کوئی نبی نہیں مگر جسے اللہ تعالیٰ چاہے۔

یہ استثناء (إلا ما شاء الله) محمد بن سعید کی طرف سے اضافہ ہے جس کا مقصد اپنی الحاد اور زندقہ کی دعوت کو تقویت پہنچانا ہے۔

مؤلف کی رائے

یہ روایت حافظ ابن عبدالبر رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "التمهيد" میں نقل کی ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ استثناء کے اس اضافہ (إلاّمَا شَاءَ اللّٰه) کی تاویل میں لکھا ہے کہ اس سے مراد "خواب" ہیں۔ واللہ اعلم[1]

من مانے نظریات کی تائید کے لیے وضعِ حدیث

بعض لوگ اپنے مخصوص نظریات کی طرف لوگوں کو دعوت دینے اور ان کی تائید کے لیے احادیث گھڑ لیا کرتے تھے جیسا کہ خوارج کے ایک بڑے مذہبی لیڈر کو جب توبہ کی توفیق ہوگئی تو اس نے کہا یہ احادیث تمہارے دین کا (مأخذ) ہیں۔ یہ دیکھا کرو کہ اپنا دین کس سے سیکھ رہے ہو۔ ہمارا تو یہ حال تھا کہ جب اپنی خواہش کی بناء پر کوئی کام کرتے تو اس کی تائید میں حدیث گھڑ لیتے تھے۔

ثواب کی نیت سے احادیث گھڑنا

بعض لوگ ایسے تھے جنہوں نے لوگوں کو فضائلِ اعمال کی طرف دعوت دینے کے لیے ثواب کی نیت

---

[۱۳۱] ابن الجوزیؒ نے اپنی الموضوعات ۱:۲۷۹ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت سے اس عبارت کو نقل کرکے اس پر جرح کی ہے اور اسے موضوع کہا ہے۔ البتہ اصل حدیث: "أنا خاتم النبيين لانبيّ بعدی" احادیث صحیحہ میں ثابت اور نص قرآنی کا تقاضا ہے۔ صحیح مسلم: كتاب الفضائل باب من فضائل علی رضی الله عنه ۱۲۰۷۔ اس کے علاوہ صحیح بخاریؒ سمیت تمام متداول کتب حدیث میں متعدد مقامات پر "لاَ نبِيّ بَعدی" کے الفاظ منقول ہیں۔

۱۔ بظاہر اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت تو ختم ہوگئی ہے مگر اللہ جس کو چاہے الہامی خواب دکھا سکتا ہے۔ یہ تاویل بعید از قیاس معلوم ہوتی ہے۔ امام حاکم اور ابن الجوزی وغیرہما ... الموضوعات ۱:۲۷۹

سے احادیث گھڑ لیں، جیسا کہ ابوعصمہ نوح بن ابی مریم المَرْوَزِی،[۱] محمد بن عکاشہ کرمانی[۲]، احمد بن عبداللہ جُوَیباری[۳] اور ان جیسے دیگر لوگوں نے کیا۔

ابن عصمہ سے ایک مرتبہ پوچھا گیا کہ تم قرآن مجید کی ایک ایک سورت کے فضائل کے بارے میں عکرمہ کے واسطہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جو روایت نقل کرتے ہو، اس کی حقیقت کیا ہے؟ تو اس نے کہا:

میں نے دیکھا کہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹ کر ابوحنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کی مغازی پر مرکوز ہو چکی ہے تو میں نے ثواب کی نیت سے فضائلِ قرآن کی یہ حدیث اپنے پاس سے بنا لی۔

ابوعمرو عثمان بن الصلاح اپنی کتاب ''علوم الحدیث'' میں کہتے ہیں:[۴] اسی طرح وہ طویل حدیث بھی ہے جو قرآن مجید کی ہر سورت کے فضائل کے بارے میں نقل کی جاتی ہے۔ایک محقق نے جب اس کی تحقیق کی تو ایک ایسے راوی کا پتہ چلا جس نے خود اعتراف کیا کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے مل کر یہ حدیث گھڑی ہے، اور واقعۃً اس حدیث میں موضوع ہونے کی علامات بالکل واضح ہیں۔مفسر واحدی نے ایسے لوگوں کے تفسیری اقوال ذکر کر کے غلطی کی، اور یہی غلطی ان لوگوں نے بھی دوہرائی جنہوں نے واحدی سے ان کے اقوال جوں کے توں نقل کر لیے۔

بھکاریوں کی گھڑی ہوئی احادیث

احادیث گھڑنے والوں میں بھکاریوں اور ایسے مانگنوں کے نام بھی نمایاں ہیں جو بھیک مانگنے کے لیے مساجد اور بازاروں میں کھڑے ہو جاتے تھے اور ٹلنے کا نام نہ لیتے تھے۔ وہ (اپنا کاروبار چمکانے کے لیے) ایسی

۱۔ ابوعصمہ نوح بن ابی مریم یزید بن عبداللہ المروزی (م ۱۷۳ھ)۔ حافظ ذہبی کہتے ہیں: وہ منکرِ حدیث تھا۔ اس نے فقہ وحدیث وقت کے ائمہ سے سیکھیں اور دنیا کے معاملات میں بھی باخبر تھا اس لیے ''الجامع'' کے لقب سے مشہور ہوا۔ البتہ روایت حدیث میں اکثر اصحاب رجال نے اس کی حدیث قبول کرنے سے اجتناب کیا ہے۔ امام ابوحنیفہ نے اسے نصیحت کا خط بھی لکھا مگر اس پر اثر نہ ہوا۔ الکامل ۷: ۲۵۵، لسان المیزان ۷:۴۷۴ کنیت نمبر ۵۵۸۹، تہذیب التہذیب، ۱۰:۴۸۶

۲۔ لسان المیزان ۵:۲۸۶ میں ہے کہ محمد بن عکاشہ کرمانی (م بعد ۲۲۵ھ) جھوٹا آدمی تھا۔ حدیثیں گھڑا کرتا تھا۔ ابن ابی حاتم نے بھی ابوزرعہ سے یہی نقل کیا ہے۔وہ کہتے ہیں" اس نے مجھے سب سے پہلے جو حدیث سنائی وہی اللہ عزوجل پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بہتان تھا۔ الجرح والتعدیل ۸:۵۲

۳۔ احمد بن عبداللہ بن خالد جویباری سُتُّوق کے لقب سے مشہور تھا۔ ابن عدی کہتے ہیں: یہ ابن کرّام کی خواہش کے مطابق احادیث گھڑ کر دیا کرتا تھا جنہیں وہ اپنی کتابوں میں ذکر کرتا اور اس کا نام احمد بن عبداللہ الشیبانی ذکر کرتا تھا۔ ابن حبان نے اسے دجال لکھا ہے۔ ابن عدی: الکامل فی الضعفاء ۱:۱۸۱، لسان المیزان ۱:۱۹۳

۴۔ مقدمہ ابن الصلاح ص ۵۹

احادیث گھڑ لیتے تھے جنہیں بالکل صحیح سند کے ساتھ لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ جعفر بن محمد طیالسی کہتے ہیں: ایک مرتبہ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ ابن مَعین (۱) نے مسجد رُصافہ میں نماز پڑھی تو ان کے سامنے ایک قصہ گو کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا: احمد بن حنبل اور یحییٰ بن مَعین نے ہم سے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ہمیں عبدالرزاق نے خبر دی، انہوں نے کہا ہمیں مَعْمَر نے بتایا، انہوں نے قتادہ سے اور قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۳۲] مَنْ قالَ لا إلٰه إلّااللّٰهُ يُخلَقُ مِنْ كُلِّ كَلِمَةٍ منها طائرٌ مِنْقَارُه' مِنْ ذهَبٍ وريشُه' مَرْجان۔

جس نے لاإلٰهَ إلّااللّٰه پڑھا اس کے پڑھے ہوئے ہر لفظ سے ایک پرندہ پیدا کیا جاتا ہے جس کی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے ہوتے ہیں۔ پھر اتنا لمبا قصہ سنایا جسے لکھا جائے تو بیس اوراق میں سمائے۔ یہ سُن کر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے امام یحییٰ رحمہ اللہ کی طرف اور یحییٰ نے احمد کی طرف دیکھنا شروع کیا اور کہا: آپ نے یہ حدیث اسے سنائی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا: اللہ کی قسم میں تو یہ حدیث اب (اسی کی زبان سے) سُن رہا ہوں۔ راوی کہتے ہیں: وہ دونوں حضرات خاموش ہو رہے، یہاں تک کہ قصہ سنانے والے نے قصہ مکمل کر لیا تو امام یحییٰ بن معین ؒ بولے: تجھے یہ حدیث کس نے سنائی ہے؟ کہنے لگا: احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ انہوں نے فرمایا: میں ابن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں، ہم نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے ذخیرہ میں یہ بات آج تک نہیں سنی! اگر تو نے جھوٹ ہی بولنا ہو تو کسی اور کے نام سے بولو۔ وہ شخص بولا: آپ یحییٰ بن معین ہیں؟ انہوں نے کہا: ہاں، وہ کہنے لگا: میں عرصے سے سنتا آ رہا تھا کہ یحییٰ بن معین سادا اور ناسمجھ ہے، مجھے اب یقین ہوا کہ واقعی یہ بات صحیح ہے۔ امام یحییٰ نے اس سے کہا: تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں احمق ہوں؟ کہنے لگا: تمہاری باتوں سے یوں لگتا ہے جیسے پوری دنیا میں تم دونوں کے علاوہ یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل ہے ہی نہیں۔ ان کے علاوہ احمد بن حنبلؒ نام کے

[۱۳۲] یہ موضوع حدیث علامہ سیوطی نے "تحذير الخواص مِنْ اكاذيب القصاص" ص ۶۵ میں اور ابو الفرج ابن الجوزی نے اپنی الموضوعات میں مفصل قصہ کے ساتھ ذکر کی ہے۔

۱۔ شیخ الاسلام امام ابوزکریا یحییٰ بن مَعین الغطفانی (م۲۳۳ھ) جرح وتعدیل میں پوری اُمت کے امام ہیں جس کی تائید امام احمد بن حنبلؒ نے کی ہے۔ ابن معین خود فرماتے ہیں: میں نے اپنے ہاتھ سے ایک لاکھ احادیث لکھیں۔ تهذيب التهذيب ۱۱: ۲۸۰

سترہ آدمی ہیں جن کی روایت کی ہوئی احادیث میں نے لکھی ہیں۔ راوی کہتے ہیں: یہ سُن کر امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی آستین سے چہرہ چھپا لیا اور کہا: چھوڑیئے! اسے جانے دیجئے۔ وہ شخص ان کا مذاق اڑانے کے انداز میں اٹھا اور چل دیا۔

یہ ایسے لوگوں کے گروہ ہیں جو اپنی طرف سے احادیث گھڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے منسوب کرتے رہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو ان کے راستہ پر چلتے رہے۔ مثال کے طور پر ہارون الرشید کو کبوتر رکھنا اور ان سے کھیلنا اچھا لگتا تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے ان کو کبوتر تحفہ میں دیئے تو قاضی ابوالبختری[1] جو ان کے پاس موجود تھا، کہنے لگا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

[۱۳۳] لاسَبَقَ إلَّا فِي خُفٍّ أو حافِرٍ أو جَنَاحٍ۔

مقابلہ جائز نہیں سوائے پنجوں والے جانوروں کے یا سُموں والے جانوروں کے یا پروں والے جانوروں کے۔

یہاں اس نے "أو جناح" یعنی (پروں والے جانور) کا لفظ بڑھایا جس سے اس کا مقصد ہارون الرشید کی خوشی حاصل کرنا تھا۔ ہارون الرشید نے اسے اس وقت تو ایک قیمتی انعام دے دیا مگر جب وہ چلا گیا تو ہارون الرشید نے کہا: اللہ کی قسم مجھے معلوم ہے کہ یہ جھوٹا آدمی ہے اور اس کے ساتھ ہی تمام کبوتروں کو ذبح کرنے کا حکم بھی صادر کر دیا۔ انہیں کہا گیا کہ ان کبوتروں کا کیا قصور ہے؟ ہارون الرشید نے جواب دیا: انہی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جھوٹی بات منسوب کی گئی۔

اس روایت اور اس طرح کی دیگر موضوع روایات کی وجہ سے علماء نے اس کی حدیث کو قبول کرنا چھوڑ دیا چناں چہ وہ کسی صورت بھی اس کی منقولہ حدیث نقل نہیں کرتے۔

---

[۱۳۳] لا سَبَقَ إلَّا في خُفٍّ أو حافرٍ تک تو حدیث صحیح ہے جسے امام احمدؒ نے اپنی مسند ۲:۲۵٦، ۳۵۸، میں اور ائمہ حدیث أبو داوَد، نسائی، ابن حبان وغیرہ سب نے نقل کیا ہے جس کی تفصیل تلخیص الحبیر ۴:۱٦۱ میں ہے۔ متن میں مذکورہ حدیث موضوع ہے جس میں "أو جناح" کے لفظ کا اضافہ ہے اور اسے ابن الجوزی نے اپنی کتاب الموضوعات ۱:۴۲ اور ۳:۷۸ میں ذکر کیا ہے۔ البتہ ہارون الرشید اور ابو البختری کے حوالہ سے یہ قصہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ جہاں اس موضوع حدیث کا ذکر ہے خلیفہ مہدی اور غیاث بن ابراہیم النخعی کے متعلق ہے۔ الوجیز فی مصطلح الحدیث ص ۳۷

۱۔ أبو البختری وہب بن وہب قرشی مدنی (م ۲۰۰ھ) امام یحییٰ، امام احمدؒ اور دیگر حضرات نے اسے کذاب کہا ہے جبکہ عثمان بن ابی شیبہ کا قول ہے کہ قیامت کے دن اسے دجال بنا کر اٹھایا جائے گا۔ لسان المیزان ٦:۲۳۱

مؤلف کی رائے

اگر لوگ نقل حدیث میں صرف صحاح، مسانید اور ان کے علاوہ ایسی کتابوں پر اعتماد کر لیتے جنہیں علماء نے ایک دوسرے سے نقل کیا ہے اور ان کی روایت ائمہ فقہاء نے کی ہے تو یہ ان کے لیے کافی ہوتا۔ اس طرح وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہ کی زد میں آنے سے بھی بچ جاتے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۳۴] اتَّقُوا الحدیثَ عَنِّی إلاَّ ماعَلِمْتُم، فَمَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّدًا فَلْیَتَبَوَّأ مَقْعَدَہُ مِنَ النارِ۔

کسی حدیث کی میری طرف نسبت کر کے نقل کرنے سے بچو سوائے اس کے جس کے حدیث ہونے کا تمہیں پورا علم ہے، کیوں کہ جس نے جھوٹ سے کوئی بات میری طرف منسوب کی وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں ڈھونڈے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی طرف جھوٹ سے کسی بات کے منسوب ہونے پر آگ سے ڈرانا اس بات کی دلیل ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے سے معلوم تھا کہ ان کی طرف جھوٹ سے باتیں منسوب کی جائیں گی۔ لہذا بچو! ایسی روایات سے جنہیں دین کے دشمنوں اور بگڑے ہوئے مسلمانوں نے ترهیب، ترغیب اور دیگر موضوعات کے بارے میں گھڑ لیا ہے۔

احادیث گھڑنے والے خطرناک ترین لوگ

ان سب میں سے زیادہ خطرناک وہ لوگ ہیں جو زاہد بنتے ہیں اور اپنے زعم میں ثواب کی خاطر احادیث گھڑ لیتے ہیں۔ چوں کہ لوگوں کو (ان کی نیکی اور تقوی کی وجہ سے) ان پر اعتماد ہوتا ہے اس لیے وہ اپنے طبعی میلان کی بنا پر ان کی من گھڑت روایات قبول کر لیتے ہیں۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[۱۳۴] مسند أحمد: مسند عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ۱:۲۹۳، جامع ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب ماجاء فی الذی یُفَسّرُ القُرآنَ بَرأیہ. امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے۔

باب: ۱۹

مصحفِ عثمانی کے مخالفین کا رد

قرآن کی حقیقت

اس بات میں پوری امت اور خصوصا ائمہ اہل سنت کے درمیان مطلقاً کوئی اختلاف نہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے اس کلام کا نام ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے معجزہ کے طور پر لے کر آئے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہ بات بھی مسلّم ہے کہ قرآن مجید سینوں میں محفوظ ہے، زبانوں سے پڑھا جاتا ہے، صفحات پہ لکھا ہوا ہے، اس کی سورتیں اور آیات یقینی طور پر معلوم ہیں اور اس کے حروف اور کلمات کمی و زیادتی سے پاک ہیں۔ اس کی تعریف کے لیے نہ تو حدود متعین کرنے کی ضرورت ہے، نہ ہی شمار کے ذریعے اسے مقیّد کرنے کی کوئی حاجت۔ اب جو شخص بھی اس میں کسی طرح کے زیادتی یا نقصان کا دعویٰ کرتا ہے وہ (صحابہ رضی اللہ عنہم کے) اجماع کو باطل قرار دیتا ہے، تمام لوگوں کو موردِ الزام ٹھراتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل ہوا اور وہ اسے لے کر دنیا والوں کی طرف تشریف لائے، اس کو رد کرتا ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْإِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَىٰ أَنْ يَأْتُوا بِمِثْلِ هَٰذَا الْقُرْآنِ لَا يَأْتُونَ بِمِثْلِهِ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيرًا﴾ [الأسراء: ۱۷:۸۸] (آپ کہہ دیجیے، اگر انسان وجنات اس بات کے لیے جمع ہو جائیں کہ اس جیسا قرآن لے آئیں (جب بھی) اس جیسا نہ لا سکیں گے اور خواہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جائیں) کا انکار کرتا ہے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی دلیل کو بے وزن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر قرآن مجید میں باطل کا شائبہ مان لیا جائے تو اس کی حیثیت یہ ہو جائے گی کہ اس پر دوسروں کا بس چلنا ممکن ہوجائے گا اور جب اس پر کسی کا بس چل جائے تو نہ یہ حجت رہے گا نہ نبوت کی علامت اور اس طرح اس کی معجزانہ حیثیت بھی ختم ہو جائے گی۔

جو یہ کہتا ہے کہ قرآن میں کوئی کمی زیادتی ہوئی ہے وہ کتاب اللہ اور اس پوری شریعت کی تردید کرتا ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے۔ پھر اس شخص کی مثال تو یوں ہے جیسے کوئی کہے: نمازیں پچاس فرض ہیں، نکاح نو عورتوں سے جائز ہے، اللہ تعالیٰ نے رمضان کے ساتھ کچھ اور دنوں کے روزے بھی فرض کیے ہیں اور اسی طرح کی اور کئی باتیں جو دین میں ثابت نہیں۔ جب یہ ساری باتیں اجماع سے نا قابلِ عمل قرار پائیں تو قرآن پر اجماع ان سے زیادہ واضح ثبوت والا، ان سے زیادہ مضبوط، زیادہ ضروری اور زیادہ واجب العمل ہے۔

مصحفِ عثمانؓ پر اعتراض کرنے والوں کا رد

امام ابوبکر محمد بن قاسم بن بشار بن محمد الأنباری کہتے ہیں: اہل فضل و دانش بڑے اہتمام سے قرآن مجید کی عظمت اور علوشان کے اسی طرح معترف چلے آرہے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ جھوٹے لوگوں کی جھوٹی باتوں، ملحدین کے الزامات اور گمراہوں کی تحریفات سے اس کا دفاع بھی کرتے چلے آرہے ہیں۔

قرآن مجید میں نقص کا دعویٰ

یہاں تک کہ ہمارے زمانے میں ایک گمراہ شخص ظاہر ہوا جو ساری ملت اسلامیہ کو چھوڑ کر غلط راستے پر چل نکلا اور پوری امت کے متفقہ موقف پر حملہ آور ہوا۔ اس کی پوری کوشش ہے کہ اس پوری شریعت کو بیکار قرار دے دے جسے رب العزت کی مسلسل تائید حاصل ہے، وہی ذات اس کی جڑیں مضبوط کئے ہوئے ہے، اس کی شاخوں کی نشوونما کی کفیل ہے اور گمراہوں اور ظالموں کی نکتہ چینی، نیز دشمنوں اور کفار کی مکر و فریب سے اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ وہ مصحف جسے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متفقہ رائے اور بھرپور تائید سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یکجا کیا ہے اس میں پورا قرآن (معاذ اللہ) شامل نہیں، کیوں کہ پانچ صد حروف اس میں درج ہونے سے رہ گئے ہیں جن میں سے بعض میں نے دیکھ لیے ہیں اور باقی جلد ہی دیکھ لوں گا۔ انہی میں سے یہ عبارت بھی ہے: "والعَصْرِ وَنَوائِبِ الدَّھر" کے الفاظ چھوٹ گئے ہیں[1]۔ انہی میں سے

۱۔ مستدرک حاکم: کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ والعصر ۵۸۲:۲ میں یہ الفاظ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب نقل کئے گئے ہیں۔ شوکانیؒ نے فتح القدیر تفسیر سورۂ والعصر میں فریابی، ابوعبید، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن الأنباری کے حوالہ سے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب نقل کیا ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے بھی سورۂ عصر کے ضمن میں اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کر کے زیرِ نظر باب کا حوالہ دیا ہے اور خلاصہ یہ لکھا ہے کہ صحیح وہی ہے جس پر پوری اُمت کا اتفاق ہے اور جو قرآنی نسخوں میں موجود ہے۔ امام ابن جریر طبری نے اپنی سند کے ساتھ ابن عبدالأعلی بن واصل سے عمرو ذی مُر کی روایت نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ الفاظ بولتے خود سنا۔ اسی طرح انہوں نے ایک روایت اسی سند کے ساتھ ابوکریب سے بھی نقل کی ہے۔ مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موجودگی میں جمع قرآن کا پورا عمل ہوا اور انہوں نے اپنے دورِ خلافت میں بھی انہی عثمانی مصاحف کو قابل اعتماد قرار دیا۔ اگر وہ ان الفاظ کی قرآنیت کے قائل ہوتے تو ان کی ترویج پر ضرور اصرار فرماتے یا کم ازکم اپنے دورِ خلافت میں ہی ترمیم کرا دیتے۔ ان کا ایسا نہ کرنا ان کے مصاحف عثمانیہ پر غیر متزلزل اعتماد کی دلیل ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے اپنے دور میں کسی شخص کے بارے میں بتایا ہے کہ اس نے یہ مسئلہ اٹھا کر قرآن میں تحریف کا دعویٰ کیا مگر بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ مصنف رحمہ اللہ نے یہ عبارت امام ابوبکر ابن الأنباری سے من وعن نقل کی ہے اور اس کا حوالہ نہیں دیا۔ اس طرح یہ اشارہ امام ابن الأنباری کے دور کے کسی فتنہ پرداز کی طرف تھا نہ کہ علامہ قرطبی کے دور کا۔

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿حَتّٰی إِذَا أَخَذَتِ الأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ، وَظَنَّ أَهْلُهَا أَنَّهُمْ قَادِرُوْنَ عَلَيْهَا، أَتَاهَا أَمْرُنَا لَيْلاً أَوْنَهَارًا، فَجَعَلْنَاهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالأَمْسِ﴾ [یونس ۱۰:۲۴] کے ساتھ: وَمَاكَانَ اللّٰهُ لِيُهْلِكَهَا إِلاَّ بِذُنُوبِ أَهْلِهَا.[1] کا اضافہ ہے۔ یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ اہل اسلام اس حصے کو قرآن میں شامل نہ کر سکے۔ اس طرح اس نے بہت سے الفاظ ذکر کیے ہیں جن کے بارے میں اس کا دعویٰ ہے کہ یہ دراصل قرآن کے تھے مگر اس میں درج نہیں کیے گئے۔

قرآن میں اضافے کا دعویٰ

اس شخص کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اُجمعین نے قرآن مجید میں اپنی طرف سے وہ الفاظ بھی شامل کر دیے جو دراصل اس کا حصہ نہ تھا۔ چناں چہ اس نے فرض نماز میں لوگوں کے سامنے یوں پڑھا: "اَللّٰهُ الواحِدُ الصَّمَدُ"۔ اس نے نہ صرف یہ کہ "قُلْ هُوَ" کو حذف کر دیا بلکہ لفظ "أحد" سے بدل دیا اور دعویٰ کیا کہ یہی صحیح ہے اور جس طرح سب لوگ پڑھتے ہیں وہ باطل اور ناممکن ہے۔ اسی طرح اس نے نماز فرض ہی میں "قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا لاأَعْبُدُمَاتَعْبُدُونَ" پڑھا اور مسلمانوں کی قراءت کو غلط قرار دیا۔

موجودہ قرآن میں الفاظ کی تبدیلی کا دعویٰ

وہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ جو قرآن مجید ہمارے ہاتھوں میں ہے اس کے الفاظ تبدیل کر کے نامناسب الفاظ شامل کر دیئے گئے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ، وَإِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾[المائدۃ ۵:۱۱۸] (تو اگر انہیں عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو بھی زبردست ہے، حکمت والا ہے)۔ وہ کہتا ہے کہ "اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ" میں عزت و حکمت کی مغفرت کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں اور صحیح اس طرح ہے: ﴿وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ﴾ (اور اگر تو ان کو بخش دے تو یقیناً تو بخشنے والا اور مہربان ہے)۔

۱۔ امام ابن جریر طبری نے اس آیت کے ضمن میں یہ الفاظ بحوالہ مروان بن الحکم حارث سے نقل کئے ہیں جنھوں نے اپنی سند کے ساتھ انہیں حضرت ابن عباس اور حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کی طرف منسوب کیا ہے مگر خلاصہ وہی ہے کہ جمع قرآن مجید اور متفق علیہ نسخے کی تیاری کے بعد ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی نہ ہی ان حضرات نے اپنے شاگردوں کو کبھی اس طرح پڑھنے کی ترغیب دی۔ علامہ ابن کثیر نے بھی ابن جریر کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ ہی میں دلائل کے ساتھ اس کا ناقابل عمل ہونا ثابت کیا ہے۔

مذکورہ ارشاد باری تعالیٰ ہو یا دیگر مقامات اس شخص کو اس کی گمراہی بہت دور لے گئی یہاں تک کہ اس نے مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ قرآن مجید غلط پڑھتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا﴾ [الأحزاب ۳۳: ۶۹] (اور اللہ کے نزدیک وہ بڑے معزز تھے)۔ میں وہ دعویٰ کرتا ہے کہ صحیح الفاظ ''وَكَانَ عَبْدًا لِلّٰهِ وَجِيهًا'' (وہ اللہ کے معزز بندے تھے) ہیں۔ہمیں ان لوگوں نے بتایا جنہوں نے خود اسے پڑھتے ہوئے سنا اور وہ اس کے پاس موجود تھے کہ اس نے فرض نماز میں آیت کریمہ یوں پڑھی: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقِرَاءَتَهُ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قِرَاءَتَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا نَبَأَ بِهِ﴾ (۱) آپ قرآن پڑھتے ہوئے اپنی زبان نہ ہلائیں، اس کو جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم اسے پڑھیں تو آپ اس کی پڑھائی کی پیروی کریں، پھر اس کی خبر دینا ہمارے ذمہ ہے۔

ہمیں کچھ اور لوگوں نے بتایا جنہوں نے یہ بات ایسے لوگوں سے سُنی، جنہوں نے خود اسے یوں پڑھتے ہوئے سُنا: ﴿وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ بِسَيْفِ عَلِيٍّ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ﴾ (۲) اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے بدر کے مقام پر تمہاری مدد علی کی تلوار سے کی جب تم کمزور تھے۔انہی لوگوں نے اس سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ کہتا ہے: ﴿هٰذَا صِرَاطُ عَلِيٍّ مُسْتَقِيمٌ﴾ (۳) یہ علی کا راستہ ہے جو کہ سیدھا ہے۔انہوں نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ اس شخص نے قرآن مجید کی ایک آیت میں ایسے الفاظ شامل کر دیئے ہیں جو نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فصاحت کے مناسب ہیں اور نہ آپ کی قوم کی زبان میں ہیں جس قوم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ [ابراهیم ۱۴: ۴] اور ہم نے ہر رسول کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس کی زبان میں۔ اس نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿أَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ﴾ (کیا آپ نے لوگوں کو کہا) کی جگہ یوں پڑھا: ''أَلَيْسَ قُلْتَ لِلنَّاسِ'' اس کا وجود نہ تو لغت عرب کے قواعد میں کہیں ہے نہ یہ علماء نحو کی اختلافی آراء میں سے کسی رائے کے مطابق ہے۔ عرب (فعل مخاطب کے ساتھ لیس بصیغۂ غائب لگا کر) لَيْسَ قُمْتَ تو ہرگز نہیں کہتے، البتہ دونوں میں مخاطب کے صیغے لگا کر) جو ''لَسْتَ قُمْتَ'' مل جاتا ہے، وہ بھی شاذ ہے، قبیح ہے، اور اس کا یہ استعمال بالکل غلط اور بے کار ہے کیوں کہ ''لیسَ'' فعل ماضی کی نفی نہیں کرتا۔ اس طرح کا استعمال صرف ''أَلَيْسَ قد خَلَقَ اللّٰهُ مِثْلَهُمْ'' میں ملتا ہے اور وہ بھی شاذ ہے۔ کتاب اللہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

۱۔ یہ سورۂ قیامۃ ۷۵: ۱۶ کی تحریف ہے۔

۲۔ سورۂ آل عمران: ۱۲۳ کی تحریف ہے۔

۳۔ سورۂ حجر: ۴۱ کی تحریف ہے۔

جمع قرآن کے لیے حضرت زیدؓ کے انتخاب پر اعتراض

اس شخص کا دعویٰ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع قرآن کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا جو انتخاب کیا وہ درست نہیں کیوں کہ حضرات عبد اللہ بن مسعود اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہما میں اس کام کی اہلیت حضرت زید رضی اللہ عنہ سے زیادہ تھی جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۳۵] أَقْرَأُ أُمَّتِي أُبَي بن كعب۔

میری امت میں قرآن کے سب سے بڑے ماہر ابی بن کعب ہیں۔

اور یہ بھی ارشاد فرمایا:

[۱۳۶] مَنْ سَرَّہُ أَنْ يقرأَ القُرآنَ غَضًّا كَمَا أُنْزِل فليقرأه بِقِراءَةِ ابن أم عَبد۔

جسے یہ پسند ہو کہ قرآن کو بے تکلف اسی طرح پڑھے جس طرح نازل ہوا تو وہ ابن اُم عبد (عبد اللہ بن مسعود) کی طرح پڑھے)۔

موجودہ قرآن سے بغاوت

یہ شخص کہتا ہے کہ مصحفِ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف پڑھنا میرا حق ہے جیسا کہ ابو عمرو بن العلاء نے اس کے خلاف پڑھا۔ چناں چہ انہوں نے ﴿إِنَّ هٰذَانِ﴾ [طه ۲۰:۶۳] کی جگہ إِنَّ هٰذَيْنِ''، ﴿فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ﴾ [المنافقون ۶۳:۱۰] بغیر واؤ کی جگہ "فَاصدق واكُونَ''، ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ﴾ [الزمر ۳۹:۱۷] کی جگہ ''وَبَشِّر

---

[۱۳۵] یہ طویل حدیث کا ایک حصہ ہے۔طبرانی: المعجم الصغير، باب العين، من اسمه علي ۱:۲۴۱،سیوطی: الجامع الكبير ۱:۹۲۱ نمبر ۱۱۷/۲۹۶۱،سنن سعید بن منصور: باب الحث على تعليم الفرائض ۱:۲۸ میں''أقراهم أبي بن كعب" ہے۔ اسی طرح کے الفاظ جامع ترمذی: كتاب المناقب، باب مناقب معاذ بن جبل و زيد بن ثابت وأبى ۵:۶۶۴، صحیح ابن حبان: كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۶:۸۵،سنن بیہقی: كتاب الفرائض، باب ترجيح قول زيد بن ثابت على قول غيره...... ۹:۲۴۳، مسند ابویعلی: مسند عبدالله بن عمر رضى الله عنه ۱۰:۱۴۱،مصنف عبدالرزاق: كتاب الجامع، باب أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ۱۱:۲۲۵۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری: كتاب فضائل القرآن، باب القراء من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم. ۴:۱۹۱۳ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے کہ ابی ہم سب سے بڑے قاری ہیں۔

[۱۳۶] صحیح ابن حبان: إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۵:۵۴۲،مسند احمدؒ: مسند ابی بكر الصديق رضی الله عنه ۱:۱۵، مسند عمر بن الخطاب رضي الله عنه ۱:۶۳، مسند عبدالله بن مسعود رضي الله عنه ۲:۳۷،مسند بزار: مسند عبدالله بن مسعود رضى الله عنه ۴:۳۲۲،سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب كراهية النوم قبل العشاء...... ۲:۲۴۴، باب الدعاء فى الصلاة ۲:۵۲۲، اس کے علاوہ "غضاً" کی بجائے اسی کے ہم معنیٰ لفظ "رطباً" کے ساتھ یہی حدیث دیگر متعدد محدثین نے نقل کی ہے۔

عِبَادِیَ الَّذِینَ" یاء کے فتحہ کے ساتھ اور ﴿فَمَا آتَانِ اللّٰهُ﴾ [النمل ۲۷:۳۶] بغیر یاء کی جگہ "فَمَا آتَانِیَ اللّٰه" یاء کی زبر کے ساتھ پڑھا جیسا کہ ابن کثیر، نافع، حمزہ اور کسائی سب نے مصحفِ عثمانی سے اختلاف کیا اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿كَذٰلِكَ حَقًّا عَلَيْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [یونس ۱۰:۱۰۳] کو ان میں سے بعض نے دوسرے نون کے فتحہ کے ساتھ اور بعض نے سکون کے ساتھ پڑھا جبکہ مصحف میں ایک نون ہے۔ اسی طرح حمزہ نے مصحفِ عثمانی سے اختلاف کرتے ہوئے "أَتُمِدُّونِي بِمَالٍ" ایک نون اور اس کے بعد یاء پر وقف کر کے پڑھا ہے جبکہ مصحف میں دو نون ہیں اور ان کے بعد یاء نہیں ہے۔ حمزہ نے ہی اس مصحف سے اختلاف کرتے ہوئے "أَلاَ إِنَّ ثَمُودَ كَفَرُوا رَبَّهُمْ" کو بغیر تنوین پڑھا ہے حالانکہ الف لکھا جائے تو اس پر تنوین پڑھنا ضروری ہوتا ہے۔ ان تمام باتوں سے اس نے حضرات قُرّاء پر مصحف سے اختلاف کے الزامات لگائے۔

معترض کی دلیل اور اس کا جواب

مختلف چیزوں کی تعداد کے بارے میں مصاحف کا جو اختلاف تھا اسے ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں اور آئندہ بھی اِن شاء اللہ اس کتاب میں مناسب مقامات پر اس کی تفصیل آتی رہے گی۔

ابو بکر کہتے ہیں: اس شخص نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس طرح پڑھا تھا:"كَأن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ، وما كَانَ اللّٰهُ لِيُهْلِكَهَا إِلاَّ بِذُنُوبِ أَهلِهَا"۔گویا کہ وہ کل موجود ہی نہ تھی، اور اللہ تعالیٰ اسے ہلاک کرنے والے نہ تھے اگر اس کے باشندوں کے گناہ نہ ہوتے مگر یہ صاف جھوٹ ہے کیوں کہ عبد اللہ بن کثیر نے مجاہد سے استفادہ کیا۔ مجاہد حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے شاگرد ہیں اور انہوں نے قرآن مجید حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پڑھا۔ ان کی قراءت: ﴿حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ، كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْآيَاتِ﴾ [یونس ۱۰:۲۴] (صاف، ایسا گویا کہ وہ کل تھی ہی نہیں۔ ہم اس طرح اپنی آیات کو کھول کر بیان کرتے ہیں) ہی ہے۔ایک روایت میں ہے کہ حضرت اُبی نے قرآن مجید خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا۔ یہ سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک متصل ہے جسے قابل اعتماد اور باکردار لوگوں نے نقل کیا ہے، اور یہ اصول ہے کہ جب کسی چیز کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح طور پر منقول ہونا ثابت ہو جائے تو اس کے خلاف کسی روایت کو دلیل نہیں بنایا جاتا۔ یحییٰ بن مبارک یزیدی کہتے ہیں: میں نے قرآن مجید ابوعمرو بن العلاء سے پڑھا، ابوعمرو نے مجاہد سے، انہوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے اور اُبی رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا۔ اس قرآن میں یہ الفاظ نہیں ہیں: "وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُهْلِكَهَا إِلاَّ بِذُنُوبِ أَهْلِهَا"۔ اس لیے جو شخص اس اضافہ کے اللہ کی طرف سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ ہونے کا انکار کرتا ہے وہ نہ تو کافر ہے نہ گنہگار۔

مجھے میرے والدگرامی نے بتایا [۱]، وہ کہتے ہیں ہمیں نصر بن داؤد صاغانی نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں اُبو عبید نے بتایا، ان کا کہنا ہے: ایسے الفاظ جو متفق علیہ مصحف کے خلاف منقول ہیں اور جن کی اسناد خاص خاص لوگ ہی جانتے ہیں عوام کو ان کا کوئی علم نہیں جیسا کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے یہ عبارت منقول ہے: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُهْلِكَهَا إِلَّا بِذُنُوبِ أَهْلِهَا'' اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے: ''لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلاً مِن رَبِّكُم فِي مَوَاسِمِ الْحَجِّ'' اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ''غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيهِمْ وَغَيْرِ الضَّالِّينَ'' پڑھا اور اسی طرح کے بہت سے دیگر الفاظ۔ ان کو اہل علم نے اس حیثیت سے نقل نہیں کیا کہ ان کے پڑھنے سے نماز ہو جاتی ہے اور نہ ہی اس حیثیت سے ان کا مصحف حضرت عثمان کے ساتھ موازنہ کیا گیا ہے۔ ان الفاظ کی حیثیت یہی ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے قرآن میں سے ہونے کا انکار کر دے تو وہ کافر نہیں ہو گا۔

مصحفِ عثمانؓ کے کسی حصہ کا منکر کافر ہے

وہ مصحف جسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی متفقہ رائے سے جمع کیا مگر کوئی شخص اس کے کسی حصہ کا انکار کر دیتا ہے تو وہ کافر ہے اور اس کا حکم مرتد کی طرح ہے، یعنی اُسے توبہ کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ورنہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔

جمع قرآن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے معترضین کا محاسبہ

ابو عبید کہتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن والے عمل کو ہمیشہ قابل قدر کارنامہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا بہت بڑا امتیاز سمجھا جاتا رہا ہے۔ بعض گمراہ لوگوں نے اس سلسلہ میں ان پر اعتراضات بھی کیے جن کی قباحت جلد ہی منکشف ہوگئی اور ان کی شرمناک حرکات کا راز فاش ہوگیا۔ ابو عبید کہتے ہیں: میں نے یزید بن زُرَیع [۲] سے نقل کیا ہے، انہوں نے عمران بن جویر سے اور عمران نے ابو مِجلَز [۳] سے روایت کی ہے،

۱۔ ابوبکر بن الأنباری کے والد گرامی کا نام قاسم بن محمد بن بشار الأنباری (م۳۰۴ھ) اور کنیت اُبو محمد ہے ادب اور علم حدیث کے علامہ اور صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ اعلام زرکلی ۵:۱۸۱، حافظ ذہبیؒ نے سیر أعلام النبلاء، تعارف ابي بكر بن الأنباري: ۲۹۶۹ میں وضاحت کی ہے کہ انہوں نے اپنے علوم اپنے والد سے ورثہ میں پائے۔

۲۔ ابو معاویہ یزید بن زُریع بصری (م۱۸۲ھ)، ثقہ حافظِ حدیث اور اپنے وقت کے امام ہیں۔ تہذیب التہذیب ۱۱:۳۲۶

۳۔ ابو مِجلَز لاحق بن حُمید السدوسی بصری (م۱۰۲ھ) ثقہ اور جلیل القدر تابعی ہیں۔ تہذیب التہذیب ۱۲:۲۲۲ کنیت ۱۰۱۲

وہ کہتے ہیں: کچھ لوگوں نے (اپنی بے وقوفی کی وجہ سے) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع قرآن پر اعتراضات کیے مگر پڑھتے خود بھی وہی رہے جو نسخے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تیار کروائے تھے)۔

ابو عبیدؒ کہتے ہیں: اَبو مِجلَز کی رائے ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اگر کوئی چیز مصحف میں شامل نہیں کی تو اس کے بارے میں پوری طرح علم ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے، اور جو چیزیں شامل کی ہیں وہ بھی یقینی علم کی روشنی میں کی ہیں۔

مصحفِ عثمان کے منکر کے کفر کی دلیل

ابو بکر الأنباری کہتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ﴾ [الحجر ۱۵: ۹] (اور اس نصیحت نامہ کو ہم نے، ہاں ہم ہی نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) ایسے انسان کے کفر کی دلیل ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو تغیر و تبدل اور کمی بیشی سے محفوظ فرمایا ہے۔ اب اگر کوئی شخص "تَبَّتْ يَدَا اَبِي لَهَبٍ وَّقَدْ تَبَّ، مَا اَغْنَى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَاكَسَبَ، سَيَصْلَى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ وَمُرَيَّتُهٗ حَمَّالَةَ الحَطَبِ، فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِنْ لِيفٍ" پڑھتا ہے تو وہ یقیناً جھوٹی بات کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کے ارشاد کے طور پر ایسی بات کو پیش کرتا ہے جو اس ذات عالی نے کلام نہیں فرمایا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کو بدل رہا ہے، اس میں تحریف کر رہا ہے اور ایسے کام کی کوشش کر رہا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو محفوظ کیا ہے اور ایسی چیزوں کے اختلاط سے روکا ہے۔ اس شخص کی اس کارستانی سے ملحدین کے لیے راہ ہموار ہوگی تا کہ وہ قرآن میں ایسی چیزیں شامل کر سکیں جس سے ان کے لیے اسلام کی مضبوط گرہ کو کھولنا آسان ہو جائے۔ وہ لوگ بھی اپنی مرضی سے جو چاہیں گے گھڑ کر قرآن میں شامل کر دیں گے اور اسی طرح ان پاک باز ہستیوں کی طرف ان اقوال کی نسبت کر دیں گے جیسے اس شخص نے کر دی ہے۔

ان کی یہ کاروائی اس اجماع کی خلاف ورزی بھی ہے جو اسلام کی حفاظت کا ضامن ہوتی ہے، اور جس کے ثبوت سے نمازوں کی امامت عمل میں آتی ہے، زکوۃ ادا کی جاتی ہے اور عبادات کا تعین کیا جاتا ہے۔

مصحفِ عثمانؓ کے کسی حصہ میں تبدیلی بدعت ہے

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿الٓرٰ كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ﴾ [هود ۱۱: ۱] (الف لام راء۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات محکم ہیں)۔ میں اس بات کی دلیل ہے کہ ایسا انسان بدعت کا مرتکب ہوا اور کفر کی طرف چل نکلا

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ﴾ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو یہ طاقت ہی نہیں دی کہ وہ قرآن مجید میں کوئی اضافہ یا کمی کریں یا اس کا کوئی حصہ حذف کر کے اپنی طرف سے اس جیسا کوئی اور حصہ لگا دیں۔ جب کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس شخص نے نص قرآنی میں اضافہ کیا ہے اور کہا ہے: "وكفى اللهُ المُؤْمِنِينَ القِتَالَ۔ بِعَلِيٍّ، وكانَ اللهُ قوِيًّا عَزِيزًا" (۱)

اس طرح اس نے قرآن میں نہایت نا مناسب الفاظ استعمال کیے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا نام ایسے مقام پر لیا کہ اگر وہ خود اس کے منہ سے یہ بات سن لیتے تو اس پر حد جاری فرماتے اور اس کے لیے قتل کا فیصلہ سناتے۔ اس شخص نے کلام اللہ میں سے "قُلْ هُوَ" کے الفاظ حذف کر دیئے اور ارشاد باری تعالیٰ "احدٌ" کو تبدیل کر کے "اللّٰهُ الوَاحِدُ الصَّمَدُ" پڑھا۔ اس نے جو کچھ حذف کیا، اس کا حذف کرنا ہی کلام اللہ کی نفی اور اس کا انکار ہے اور جو شخص قرآن کے ایک حرف کا انکار کرتا ہے وہ یقیناً پورے قرآن کا انکار کرتا ہے۔ اس طرح اس نے آیت کریمہ کا معنی بالکل بدل ڈالا، کیوں کہ مفسرین کرام فرماتے ہیں: یہ آیت مشرکین کے سوال کے جواب میں نازل کی گئی جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ ہمیں اپنے رب کا حلیہ بتاؤ، وہ سونے کا بنا ہوا ہے؟ تانبے کا؟ یا پیتل کا؟ تو اللہ جل جلالہ نے ان کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ﴾ (کہہ دیجئے وہ اللہ ایک ہے) یہاں "هُوَ" ضمیر لا کر ان کی بات کا جواب دیا گیا ہے۔ اب اگر اس کو حذف کر دیا جائے تو پوری آیت بے معنی ہو کر رہ جائے اور نہ صرف یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کلام کی نسبت جھوٹی ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا بلکہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب بھی لازم آئے گی۔

معترضین کو دعوتِ مبارزت

اعتراض کرنے والے اس شخص اور مختلف حیلوں بہانوں سے اس کی تائید کرنے والوں کو کہا جانا چاہیے کہ ہمیں اس قرآن کے بارے میں بتاؤ جسے ہم پڑھتے ہیں۔ ہم اس کے علاوہ کسی قرآن کو نہیں جانتے اور نہ گزشتہ زمانوں میں ہمارے آباء و اجداد کو کسی اور قرآن کی خبر تھی۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ کیا یہ قرآن شروع سے آخر تک پورے قرآن پر مشتمل ہے جس کے الفاظ اور معانی سب صحیح ہیں اور جو کسی طرح کی خرابی اور خلل سے پاک ہے؟ یا (تمہارے خیال میں) اس میں قرآن کا کچھ حصہ تو ہے مگر باقی حصہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے جیسا کہ ملت اسلامیہ کے اسلاف اس کو نہ پا سکے؟ اگر ان کا جواب یہ ہو کہ ہمارے پاس موجود قرآن مجید میں اصل قرآن پورے کا پورا موجود ہے، اس میں سے کوئی چیز رہ نہیں گئی، اس کے الفاظ اور معانی بالکل صحیح اور ہر طرح کے خلل

۱۔ یہ سورۂ احزاب آیت ۲۵ میں تحریف ہے۔

یا لغزش سے پاک ہیں تو انہوں نے اپنے کفر کا فیصلہ خود دے دیا کیوں کہ انہوں نے اس قرآن میں اضافہ کیا ہے، جیسا کہ وہ کہتے ہیں: "فَلَيسَ لَهُ اليَومَ هٰهُنَا حَمِيمٌ، وَلَيسَ لَهُ شَرَابٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ مِنْ عَيْنٍ تَجْرِي مِنْ تَحتِ الجَحِيمِ" (۱) (تو آج یہاں نہ کوئی اس کا دوست ہے اور اسے پینے کی کوئی چیز نصیب نہ ہوگی سوائے زخموں کے دھوون کے۔ ایسے چشمے میں سے جو جہنم کے نیچے بہہ رہا ہے)۔

قرآن میں اس سے زیادہ واضح زیادتی کیا ہوسکتی ہے۔ یہ عبارت قرآن کے ساتھ کیسے ملائی جا سکتی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اس سے محفوظ رکھا ہے اور ہر بہتان تراش باطل کوش کو اس طرح کی کارستانی سے روک کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس اضافہ کو غور سے دیکھا جائے اور اس کے معانی کو سوچا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ فاسد اور غلط ہے، کلام اللہ کے ساتھ اس کی نہ کوئی مشابہت ہے، نہ یہ اس کے ساتھ ملانے سے جچتا ہے اور نہ ہی اس کے معنی کی کلام باری تعالیٰ کے ساتھ کوئی مطابقت ہے۔ اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ کا بعد والا حصہ یوں ہے، ﴿لَا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ﴾ (اسے صرف غلط کار لوگ ہی کھائیں گے)۔ اب جب معترض نے اس میں لفظ "شراب" شامل کر دیا ہے تو "شراب" (پینے والی چیز) کے کھانے کا کیا مطلب ہوا۔ اور جو کچھ اس نے اس سے پہلے لگایا ہے: "فليسَ لهُ اليومَ هاهُنَا حَمِيمٌ وليسَ لهُ شرابٌ إلَّا مِنْ غِسْلينٍ مِنْ عَينٍ تَجرى مِنْ تحتِ الجَحِيمِ، لَايَأْكُلُهُ إِلَّا الخَاطِئُونَ" تو اس کے الفاظ ہی معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے اور اسی سے اس کا باطل ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ "شراب" (پینے کی چیز) تو کھائی نہیں جاتی اور نہ ہی عرب کبھی یوں کہتے ہیں: "أَكَلْتُ الماءَ" (میں نے پانی کھایا) بلکہ وہ تو یوں کہتے ہیں: "شرِبتُهُ وذُقْتُهُ وَطعِمتُهُ" (میں نے اسے پیا، اسے چکھا اور اسے بطور خوراک استعمال کیا)۔ اس ارشاد باری تعالیٰ کی صحیح عبارت کا معنی، جسے اللہ تعالیٰ نے اس قرآن میں نازل کیا ہے جس کے ایک حرف کی مخالفت کرنے والا بھی کافر ہو جاتا ہے، یہ ہے: ﴿وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ﴾ [الحاقة ۶۹: ۳۶] (اور نہ اسے کوئی کھانا نصیب ہے سوائے زخموں کے دھوون کے جسے سوائے سخت گنہ گاروں کے کوئی نہیں کھائے گا)۔

غِسلین کا معنی

غِسلِین اس مادہ کو کہتے ہیں جو (پگھلی ہوئی) چربی اور پیپ وغیرہ کی صورت میں ان کے پیٹوں سے نکلے گا۔ یہ وہ کھانا ہے جو مشکل وقت میں بطور سزا ہی کھایا جاسکتا ہے۔ جب کہ "شراب" (پینے والی چیز) کو کھانا ناممکن ہے۔

۱۔ سورۃ الحاقۃ: ۳۵، ۳۶ کی تحریف ہے۔

اب اگر یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے شامل کیے گئے جھوٹے اضافہ ''مِن عَمِنٍ تجرِی مِن تحتِ الجَحیم'' کے بعد ﴿لا یَاْکُلُہٗ اِلاَّ الْخَاطِئُوْنَ﴾ کے الفاظ بھی قرآن مجید میں نہیں ہیں اور اپنے شامل کیے ہوئے اضافہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے پوری آیت کی نفی کر دیتا ہے تو قرآن کی آیت کا انکار کرنے کی وجہ سے یہ شخص کافر ہو جائے گا۔ اس کے اعتراض کے جواب اور اس کی حرکات کو شرمناک ثابت کرنے کے لیے اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

صحابۂ کرامؓ کے ہاں قرآنی الفاظ کے ساتھ پائے جانے والے اضافوں کی حیثیت

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین سے جو اس طرح کی روایات منقول ہیں کہ انہوں نے فلاں فلاں الفاظ کے ساتھ پڑھا تو ان کے یہ اقوال توضیحی اور تفسیری ہیں نہ یہ کہ ان کو قرآن کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے جس کی تلاوت شروع کر دی جائے۔

منسوخ کی حیثیت

اسی طرح جن نصوص کے الفاظ اور احکام دونوں منسوخ ہو گئے ہیں یا جن کے الفاظ تو منسوخ ہو گئے ہیں مگر احکام باقی ہیں ان سب کا شمار قرآن میں نہیں ہوتا جیسا کہ اس کا مفصل بیان ارشاد باری تعالیٰ ﴿مَا نَنسَخْ مِنْ آیَۃٍ﴾ [البقرہ ۲:۱۰۶] کی تفسیر میں اِن شاء اللہ آئے گا۔

☆☆☆☆☆

تعوّذ کا بیان

اس کا بیان بارہ مباحث پر مشتمل ہے

پہلی بحث: تعوّذ پڑھنے کا موقع

اللہ تعالیٰ نے ہر مرتبہ قرآن مجید کی تلاوت شروع کرنے سے پہلے تعوّذ پڑھنے کا حکم دیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ [النحل ۱۶:۹۸] (تو جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود (کے شر) سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کیجئے)۔اس سے مراد یہ ہے کہ جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو تعوّذ پڑھ لیا کریں۔ یہاں صیغۂ ماضی ﴿قَرَأْتَ﴾ کو مستقبل کی جگہ استعمال کیا گیا ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَإِنّي لآتِيكُمْ لِذِكْرَى الذي مَضَى   مِنَ الوُدِّ وَاسْتِئْنَافِ ماكانَ في غدِ

میں تم لوگوں کے پاس سابقہ محبت کی یادیں تازہ کرنے اور آئندہ کے لیے محبت کی تجدید کرنے ضرور آؤں گا۔

یہاں بھی اس کی مراد "مايكون في غد" (جو کچھ آئندہ کل میں ہونے والا ہے) ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہاں کلام میں تقدیم و تاخیر ہے اور ہر ان دو فعلوں میں جن کے معانی قریب قریب ہوں حسب منشاء تقدیم و تاخیر جائز ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ثُمَّ دَنَى فَتَدَلّٰى﴾ [النجم ۵۳:۸] (پھر وہ نزدیک ہوا اور زیادہ نزدیک ہوا)۔ اس سے مراد بھی "فَتَدَلّٰى" (پھر وہ نزدیک ہوا) "ثُمَّ دَنَى" (پھر اور زیادہ نزدیک ہوا) ہے۔ یہی اصول ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ [القمر ۵۴:۱] (قیامت نزدیک آ پہنچی اور چاند شق ہوگیا) میں بھی نمایاں ہے۔اس اسلوب کی مزید مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں۔

دوسری بحث: تعوّذ پڑھنے کا حکم

جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق نماز کے علاوہ ہر مرتبہ قراءت سے پہلے "أعُوذُ بِاللّٰهِ" پڑھنے کا حکم استحبابی ہے۔

مذاہب فقہاء

مذہب جمہور

نماز میں تعوّذ پڑھنے کے بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں: نقاش[1] نے عطاء[2] سے نقل کیا ہے کہ تعوذ پڑھنا واجب ہے۔ ابن سیرین، ابراہیم نخعی اور دیگر کئی حضرات نماز کی ہر رکعت میں تعوّذ پڑھا کرتے تھے اور اس طرح ارشاد باری تعالیٰ کے عموم پر عمل کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کی رائے

یہ دونوں حضرات ہر نماز کی پہلی رکعت میں تعوّذ پڑھا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک پوری نماز کی قراء ت ایک ہی قراء ت شمار ہوتی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کی رائے

امام مالکؒ کے نزدیک فرض نماز میں تعوّذ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ تراویح میں اسے پڑھ لیا جائے۔

تیسری بحث: کیا تعوّذ قرآن کی آیت ہے؟

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ تعوّذ نہ قرآن کا حصہ ہے، نہ اس کی آیت بلکہ یہ تلاوت کرنے والے کی طرف سے یہ کہنا ہے کہ ﴿أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ﴾ (میں شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں)۔ یہی الفاظ ہیں جن پر جمہور علماء کا اتفاق ہے کیوں کہ یہی کتاب اللہ میں استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ ﴿أَعُوذُ بِاللّٰهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ﴾ کہا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

۱۔ مشہور مفسر ابو بکر محمد بن حسن موصلی (م۳۵۱ھ) قراء ت اور تفسیر کے ماہر تھے۔"شفاء الصدور" اور "الموضح لمعانی القرآن" ان کی مشہور تفاسیر ہیں البتہ حدیث میں ان کا درجہ کمزور ہے۔۔ لسان المیزان ۵:۱۳۲

۲۔ امامِ تفسیر عطاء بن أبي رباح (أسلم) القرشي (م۱۱۴ھ) حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد خاص تھے۔ ثقہ اور فاضل تابعی تھے مگر اکثر مرسل روایات نقل کرتے تھے۔ انہیں حضرت عقیل بن ابی طالب، حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر بن عبداللہ، رافع بن خدیج، حضرت عائشہ صدیقہ اور بعض دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی زیارت بھی نصیب ہوئی تهذيب التهذيب ۷:۱۹۹

[۱۳۷] یَابنَ أُمِّ عَبدٍ! اَعُوذُ باللّٰهِ مِنَ الشیطٰنِ الرَّجِیم، هکذا أَقْرَأَنِي جِبریل عَنِ اللَّوحِ المَحفوظِ عَنِ القَلَمِ۔

اے ابن اُمّ عبد! ﴿اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيم﴾ کہو۔ مجھے جبریل علیہ السلام نے لوح محفوظ سے اسی طرح پڑھایا جہاں یہ قلم سے اسی طرح نقل ہو کر آیا۔

چوتھی بحث: تعوّذ کے مختلف الفاظ

امام اُبو داوٗد اور امام ابن ماجہ رحمہما اللہ نے اپنی اپنی سنن میں حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ[۱] سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا۔ راوی عمرو کہتے ہیں: مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون سی نماز تھی۔ اس نماز میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا:

[۱۳۸] "اللّٰهُ أكبَر كبيرًا، اللّٰهُ اكبَرُ كَبيرًا (تین مرتبہ)، "اَلْحَمدُ لِلّٰهِ كثيرًا، اَلْحَمد لِلّٰهِ كثيرًا (تین مرتبہ)، وَسُبحانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيلاً (تین مرتبہ) اور پھر فرمایا:" اَعُوذُ باللّٰهِ مِنَ الشيطانِ مِنْ نَفخِهِ ونَفْثِهِ وهَمْزِه"۔عمرو کہتے ہیں هَمْزُهُ المُوْتَةُ (هَمْزُهُ سے مراد 'المُوْتَةُ' یعنی شیطان کا جنون پیدا کرنا، نفثه: شعر اور نفخه سے مراد اس کا تکبر ہے۔ امام ابن ماجہؒ فرماتے ہیں: "مؤتة" کا معنی جنون ہے، "نفث" کا معنی منہ سے اس طرح پھونک مارنا کہ اس کے ساتھ تھوک نکلے اور "کبر" سے مراد غرور اور گمراہی ہے۔

---

[۱۳۷] جامع ترمذی: کتاب الصلاة، باب مَایقول عِندَ افتتاح الصلاة ۲:۱۰۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں "مِن هَمْزِه وَنَفْخِه وَنَفْثِهِ" اور دیگر احادیث میں اس کے علاوہ مزید الفاظ بھی وارد ہیں۔ سنن أبو داوٗد: کتاب الصلاة، باب من رأى الأستفتاح بسبحانک اللهم ۱:۲۰۶۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: اس باب میں حضرت علی، عائشہ، عبد اللہ بن مسعود، جابر، جُبیر بن مطعم اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے بھی روایات منقول ہیں مگر ابوسعیدؓ کی روایت زیادہ مشہور ہے۔ بذل المجهود ۴:۵۱۳ میں اس پر مفصل بحث ہے۔

[۱۳۸] سنن ابو داوٗد: کتاب الصلاة، باب ما یستفتح به الصلاة من الدعاء ۱:۲۰۳، باب من رأى الإستفتاح بسبحانک اللهم وَ بحمدک ۱:۲۰۶، جامع ترمذی: أبواب الصلاة، باب مایقول عند افتتاح الصلاة بروایت ابوسعید خدریؓ ۲:۹، سنن ابن ماجہ: کتاب إقامة الصلاة والسنة فیها، باب الإستعاذة في الصلاة ۱:۲۶۵ بروایت حضرت جبیر بن مطعمؓ، ۱:۲۶۶ بروایت ابن مسعودؓ، سنن دارمی: کتاب الصلاة، باب ما یقال بعد افتتاح الصلاة ۱:۲۹۹ بروایت حضرت ابو سعیدؓ۔ ائمۂ حدیث ابن حبانؒ، ابن خزیمہؒ، حاکمؒ، امام احمدؒ، ابویعلیؒ، عبدالرزاقؒ، بیہقیؒ اور دارقطنیؒ نے بھی یہ الفاظ نقل کئے ہیں۔ حدیث کے راوی ابو عبد اللہ عمرو بن مُرّۃ کوفی (م ۱۱۸ھ) ثقہ اور عبادت گزار تابعی ہیں۔ تهذیب التهذیب ۸:۱۰۲

۱۔ جلیل القدر صحابی حضرت جبیر بن مطعم النوفلی القرشی (م ۵۸ھ) جنگ بدر کے موقع قیدیوں کے فدیہ والے مذاکرات میں مشرکین کے نمائندہ تھے۔ اس کے بعد خیبر والے سال یا فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے۔ تهذیب التهذیب ۲:۶۳

امام ابو داوُدؒ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نوافل پڑھنے کے لیے کھڑے ہوتے تو سب سے پہلے تکبیر کہتے اور پھر فرماتے:

[۱۳۹] سبحانک اللّهم وبِحَمْدِکَ، تبارکَ اسْمُکَ وتعالیٰ جَدُّکَ ولا إلہٰ غیرُکَ، پھر تین مرتبہ "لا إلہ إلاّ اللّٰہ" پھر تین مرتبہ "اللّٰہ أکبر کبیرا" کہتے اور اس کے بعد فرماتے: "أعُوذُ بِاللّٰہِ السّمیع العلیم من الشیطٰن الرَّجیم؛ مِنْ ھَمزہٖ، و نَفْخِہٖ، و نَفْثہٖ" اور اس کے بعد قراءت شروع کرتے۔

سلیمان بن سالم نے ابن القاسمؒ سے نقل کیا ہے کہ تعوّذ اس طرح ہے:

أعوذ بِاللّٰہِ العَظِیم مِنَ الشیطَانِ الرَّجیم، إنّ اللّٰہَ ھُوَالسمیعُ العلیم۔ بسم اللّٰہ الرَّحمٰن الرَّحیم۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: قُراء نے تعوّذ کے اندر صفاتِ باری تعالیٰ میں بہت زیادہ تبدیلیاں کر لی ہیں۔انہوں نے شیطان کے لئے بھی بدل بدل کرالفاظ استعمال کئے ہیں چناں چہ ان میں سے بعض یوں پڑھتے ہیں:

اَعوذ باللّٰہِ المَجید مِنَ الشّیطانِ المَرید۔

اسی طرح بہت سے الفاظ ہیں جن کے بارے میں نہ تو میں یہ کہتا ہوں کہ بڑی کمال ایجاد ہے اور نہ یہ کہتا ہوں کہ ایسا کرنا ناجائز ہے۔

پانچویں بحث: تعوّذ بلند آواز سے پڑھے یا آہستہ؟

مہدوی(۱) کہتے ہیں: قراء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے شروع میں تعوّذ بلند

[۱۳۹] سنن ابو داوُد: کتاب الصلاۃ، باب من رأی الإستفتاح بِسُبْحَانَکَ اللّھُمّ ۲۰۶:۱، جامع ترمذی: أبواب الصلاۃ، باب مایقول عندافتتاح الصلاۃ ۹:۲، سنن داری: کتاب الصلاۃ، باب مایقال عندافتتاح الصلاۃ ۲۹۹:۱، صحیح ابن خزیمۃ: کتاب الصلاۃ، باب إباحۃ الدعاء بعد التکبیر...... ۲۳۸:۱، مسند احمد: مسند أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ ۴۴۹:۳، مسند ابویعلیٰ: مسند أبي سعید الخدریؓ ۳۵۸:۲، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب الإنفتاح بسبحانک اللھم ۳۲۳:۲، باب التعوّذ بعد الإفتتاح ۳۲۵:۲، سنن دارقطنی: کتاب الصلاۃ، باب دعاء الاستفتاح بعد التکبیر ۲۹۸:۱

۱۔ ابو العباس احمد بن عمار بن ابی العباس مہدوی مغربی (م ۴۴۰ھ) مشہور نحوی، مفسر اور قاری ہیں۔ ان کی ایک بڑی تفسیر "التفصیل الجامع لعلوم التنزیل اور قراءات میں ایک کتاب "الھدایۃ فی القراءات السبع بھی ہے۔ معجم المؤلفین ۲۷:۲

آواز سے پڑھنا چاہیے، البتہ امام حمزہ اسے آہستہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ سُدی نے اہل مدینہ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ وہ قراءت کی ابتداء بِسْمِ اللّٰہ سے کرتے ہیں۔

تعوّذ بھول جائے تو کیا کرے؟

ابوالليث سمرقندی[1] نے بعض مفسرین کا قول نقل کیا ہے کہ تعوّذ فرض ہے اور اگر کوئی شخص تلاوت کے شروع میں اسے بھول جائے تو تلاوت کے دوران منزل کے جس مرحلہ پر یاد آئے، تلاوت روک دے اور تعوّذ پڑھ کر نئے سرے سے شروع کرے۔ بعض کہتے ہیں کہ تلاوت روک کر تعوّذ پڑھے اور پھر وہیں سے تلاوت جاری رکھے جہاں رکا تھا۔ پہلا قول حجاز اور عراق کے معتبر علماء کا ہے جب کہ دوسرا قول شام اور مصر کی معتبر شخصیات کا ہے۔

چھٹی بحث: نماز کے علاوہ تعوّذ

زہراویؒ کہتے ہیں: تعوّذ والی آیت نازل تو نماز کی قراءت کے بارے میں ہوئی مگر استحباباً ہمیں نماز کے علاوہ بھی ہر مرتبہ تلاوت سے پہلے اسے پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ یہ فرض نہیں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ تعوّذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر فرض تھا مگر ہم نے اسے صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں اپنا لیا۔

ساتویں بحث: قراءت کے بعد تعوّذ والی رائے کا تجزیہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ تعوّذ کا موقع قراءت کے بعد ہے۔ امام داؤد[2] ظاہریؒ کی رائے بھی یہی ہے۔

قاضی ابوبکر ابن العربی کہتے ہیں: کچھ لوگوں کی نااہلی اس درجہ پر جا پہنچی کہ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا:

جب قاری تلاوت قرآن سے فارغ ہو چکے تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگے حالاں کہ

۱۔ ابوالليث نصر بن محمد سمرقندی حنفی (م۳۹۳ھ) حنفیہ کے مشہور فقیہ اور مفسر ہیں۔ ان کی تفسیر میں منقول احادیث کی تخریج قاسم بن قطلوبغا حنفی (م۸۷۹ھ) نے کی ہے۔ معجم المؤلفین ۱۳: ۹۱

۲۔ ابوسلیمان داؤد بن علی اصفہانی (م۲۷۰ھ) اہل ظاہر کے امام اور ان کے اصول کے موجد ہیں۔ ان کے بعد امام ابن حزمؒ نے ان کا راستہ اپنایا اور ان کا مذہب زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ معجم المؤلفین ۴: ۱۳۹

حضرت ابو سعید خدریؓ نے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز میں قراءت سے پہلے تعوّذ پڑھا کرتے تھے، اور یہ نص ہے۔اگر کوئی یہ کہے کہ تلاوت کے وقت شیطان مردود سے پناہ مانگنے کا کیا فائدہ ہے؟ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ اس کا فائدہ اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانا ہے اور شرعی امور کا (حقیقی) فائدہ یہی ہوتا ہے کہ کوئی شرعی حکم پورا کر کے یا کسی ممنوع امر سے باز رہ کر ان کی وفا کا حق ادا کر دیا جائے۔اس کا ایک اور فائدہ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ قراءتِ قرآن کے وقت شیطان کے وسوسہ سے پناہ مانگنے کا حکم پورا کرنا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّا اِذَا تَمَنّٰی اَلْقَی الشَّیْطَانُ فِیْ اُمْنِیَّتِه﴾ [الحج ۲۲:۵۲] اور ہم نے آپ سے قبل کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا مگر یہ کہ جب اس نے کچھ پڑھا ہو تو شیطان نے اس کے پڑھنے کے باب میں شبہ ڈالا۔

امام مالکؒ کی رائے پر مؤلف کا تبصرہ

قاضی ابن العربیؒ کہتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ﴾ [النحل ۱۶:۹۸] تو جب آپ قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کیجئے۔ کی تفسیر کے تحت "المجموعة" میں ہم نے امام مالکؒ کا ایک عجیب وغریب قول دیکھا ہے، جو یہ ہے کہ یہ حکم نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد تعوّذ پڑھنے کے متعلق ہے۔ یہ ایسا قول ہے جس کی تائید میں نہ کوئی روایت ملتی ہے نہ ہی عقل سے اس کو تقویت ملتی ہے۔ اگر اس رائے کو علماء کی قراءت کے بعد تعوذ والی دیگر آراء کی طرح تسلیم کر لیا جائے تب بھی اس کا نماز کے اندر سورۂ فاتحہ کی قراءت کے بعد پڑھنے کی تخصیص کرنا ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ یہ نہ تو امام مالکؒ کے اصل مسلک سے مطابقت رکھتا ہے نہ ان کے اندازِ فکر سے اس کو کوئی مناسبت ہے۔ اس روایت کی حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں(۱)۔

آٹھویں بحث: تعوّذ کے فضائل

امام مسلمؒ نے سلیمان بن صرد سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

۱۔ ابن العربی: أحكام القرآن ۳:۶:۱۱۷۶

[۱۴۰] استَبَّ رجلان عِندالنبی صلی الله علیه وسلم فَجَعَل أحدُهما يغضَبُ وَيَحمرُّ، وجهه، وتنتفِخُ أوداجُه، فنظَر إليه النبی صلی الله علیه وسلم فقال: "إنّی لَأعْلَمُ كلمةً لوقالها لذهَبَ ذا عنه؛ أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں دو آدمیوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دینا شروع کر دیں۔ ان میں سے ایک کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا اور رگیں پھول گئیں۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی طرف دیکھا اور ارشاد فرمایا: "مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ شخص اسے کہہ لے تو اس کی یہ کیفیت جاتی رہے۔ وہ کلمہ:"اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" ہے۔جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سن رہے تھے ان میں سے ایک اٹھا اور اس شخص کو جا کر کہا: تم جانتے ہو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی کیا ارشاد فرمایا ہے؛ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر یہ غصے والا شخص اسے کہہ لے تو اس کی یہ کیفیت ختم ہوجائے؛ وہ کلمہ: "اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ" ہے۔ اس پر غصے والے شخص نے کہا: کیا میں تمہیں پاگل نظر آتا ہوں۔ اس روایت کو بھی امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

امام مسلم نے بھی حضرت عثمان بن ابی العاص ثقفی(۱) سے نقل کیا ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

[۱۴۱] يَا رسولَ اللّٰه! اِنّ الشّيطانَ قدحالَ بَينِي و بينَ صَلاتي، و قِراءَ تِي يَلْبِسُهَا علىَّ، فقال له رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم: ذلكَ شيطانٌ يُقَالُ لَهٗ "خَنزَب"، فاذَا

[۱۴۰] صحیح بخاری: كتاب بدأالخلق، باب صفة إبليس و جنوده......۳:۱۱۹۵،الأدب المفرد،باب مايقول إذاغضب ۱:۳۴۹،صحیح مسلم: كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل من يُمسِكُ نفسه عندالغضب، وبِاىّ شيءٍ يَذهبُ الغضب ۴:۲۰۱۵،سنن ابو داؤد: كتاب الأدب، باب ما يقال عندالغضب ۴:۲۴۹

[۱۴۱] صحیح مسلم: كتاب السلام، باب التعوّذ مِن شيطانِ الوسوسةِ في الصلاة ۴:۱۷۲۹، مستدرک حاکم: كتاب الطب ۴:۲۲۴، مسند امام احمدؒ: حديث عثمان بن ابی العاصؓ ۵:۲۵۰، مصنف عبدالرزاق: كتاب الصلاة، باب الاستعاذة فی الصلاة ۲:۸۵، باب الرجل يلتبس عليه القرآن في الصلاة ۲:۴۹۹

ا۔ ابو عبداللہ عثمان بن ابی العاص ثقفی (م۵۵ھ)، اہل طائف میں سے مشہور صحابی ہیں۔ ان کی وفات حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بصرہ میں ہوئی۔ تهذيب التهذيب ۷:۱۲۸

أُحَسْسَتَهُ فتعوّذْ بِاللّٰهِ مِنهُ وَاتفُلْ عَن يَسَارِكَ ثلاثًا، قَال: فَفعَلْتُ فَأذهَبَهُ اللّٰه عنّي۔

یارسول اللہ! شیطان میرے اور میری نماز کے درمیان حائل ہوگیااور میری قراءت میں خلل ڈالنے لگا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: یہ وہ شیطان ہے جس کا نام "خَنْزَب" ہے۔ جب تمہیں اس کا احساس ہوتو اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کرو اور تین مرتبہ اپنی بائیں طرف تھوک دیا کرو۔ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے ایسا ہی کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسے مجھ سے دور بھگا دیا۔

امام ابو داوٗدؒ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کبھی سفر پر تشریف لے جاتے اور رات ہو جاتی تو یہ کلمات فرماتے:

[۱۴۲] يَا أَرْضُ! ربّي وربُّكِ اللّٰه، أعوذ باللّٰهِ مِن شرّكِ، ومِنْ شرّ ما خَلَقَ فيكِ، وَمِن شرّ ما يَدُبُّ عَليكِ، ومِنْ أَسَدٍ وأَسْوَدَ، ومِنَ الحيَّةِ والعَقرَب، ومِنْ ساكِني البَلَدِ وَوَالِدٍ ومَا وَلَدَ۔

اے زمین! میرا اور تمہارا دونوں کا رب اللہ ہے۔ میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں تیرے شر سے، اس مخلوق کے شر سے جسے اللہ نے تمہارے اندر پیدا کیا، اس مخلوق کے شر سے جو تمہارے اوپر چلتی ہے، شیروں کے شر سے، ناگ کے شر سے، سانپ کے شر سے، بچھو کے شر سے، بستی والوں کے شر سے اور باپ اور اس کی اولاد کے شر سے۔

حضرت خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے منقول ہے، فرماتی ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

[۱۴۳] مَنْ نَزَلَ مَنزِلاً ثم قال: أعُوذُ بكلِمَاتِ اللّٰهِ التامّات مِن شرّ مَا خَلَق، لم يضرّه شيء حتى يرتحِل۔

---

[۱۴۲] سنن ابو داوٗد: كتاب الجهاد، باب ما يقولُ الرجل إذا نزَلَ المنزل ۳:۳۵، سنن بیہقی: كتاب الحج، باب مايقول إذا جنّ عليه الليل وهوفي السفر ۸:۶۱

[۱۴۳] صحیح مسلم: كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب التعوّذ من سوء القضاء و درک الشفاء وغيره ۴:۲۰۸، مؤطاامام مالکؒ: كتاب الاستئذان، باب ما يؤمر به من الكلام في السفر ۲:۹۷۸، جامع ترمذی: كتاب الدعوات، باب مايقول إذا نزلَ منزلاً ۵:۴۹۶، ابن ماجہ: كتاب الطب، باب الفزع والإرق ومايتعوّذ منه ۲:۱۱۷۴، سنن دارمی: كتاب الإستئذان، باب مايقول إذانزلَ منزلاً ۲:۳۴۷، صحیح ابن حبانؒ: كتاب الصلاة، باب المسافر ۶:۴۱۸، صحیح ابن خزیمہ، كتاب المناسک، باب الاستعاذة عند نزول المنازل ۴:۱۵۰، مسند امام احمدؒ: حديث خوله بنت حكيم رضى الله عنها ۷:۵۲۲، مصنف عبدالرزاق: كتاب المناسک باب مايقول إذا نزل منزلاً ۵:۱۶۶، سنن بیہقی: كتاب الحج، باب مايقول إذا نزل منزلاً ۸:۶۳

جوشخص کسی جگہ جا کر ٹھہرے اور یہ کلمات پڑھ لے: أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التامّات مِن شرِّ مَا خَلَقَ، تو اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکے گی یہاں تک کہ اس جگہ سے کوچ کر جائے۔ یہ روایت مؤطاامام مالکؒ، صحیح مسلم اور جامع ترمذی میں نقل کی گئی ہے۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔

احادیث میں تعوّذ والی دعائیں کثرت سے وارد ہوئی ہیں جو سند کے لحاظ سے بھی قابل اعتماد ہیں۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق دے۔

نویں بحث: لفظ ''استعاذة'' کی لغوی تحقیق

لفظ "استعاذة" کا معنی لغتِ عرب میں پناہ مانگنا اور کسی چیز کے سہارے سمٹ کر تکلیف سے محفوظ ہونا ہے۔ "عُذْتُ بِفلانٍ وَاستَعَذْتُ بفُلانٍ" دونوں الفاظ پناہ حاصل کرنے کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے: هوعِيَاذِي، یعنی وہ میری پناہ گاہ ہے۔ کسی دوسرے کو پناہ دلوانے کے لئے: "أَعَذْتُ غَيرِي به وعَوَّذْتُه" دونوں الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اگرکوئی "عَوْذٌ بِاللّٰهِ منک" کہے تو اس کا معنی بھی "أعُوذُ بِاللّٰهِ مِنکَ" ہی ہوگا یعنی میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔ شاعر کہتا ہے:

قَالَتْ وَفِيهَا حَيدَةٌ و ذُعُرٌ عَوذٌ بِرَبِّي مِنكُمْ و حُجُرْ

جب اسے چوٹ لگی تو اس نے خوف سے کہا: تم سے اپنے رب کی پناہ چاہتی ہوں اور اسی سے اپنی حفاظت کی امید رکھتی ہوں۔

اہل عرب کو جب کوئی ناخوشگوار امر درپیش ہو تو کہتے ہیں: "حُجْرًا له" (اسی کی حفاظت ہے) یہاں حُجرٌ اور استعاذہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ اسی طرح: "عَوذَة، معاذٌ اور تعویذ" سب کا ایک ہی معنی ہے۔ أعُوذُ اصل میں أَعْوُذُ تھا۔ واؤ پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے عین کو دے دیا گیا تو واؤ ساکن ہوگئی۔

دسویں بحث: لفظ ''شیطان'' کی تحقیق

شیطان مفرد ہے جس کی جمع تکسیر "شَیاطین" ہے۔ اس میں نون اصلی ہے کیوں کہ یہ "شَطَنَ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی خیر سے دور ہونا ہے۔ کہا جاتا ہے: شَطَنَتْ دارُہ: أی بَعُدَت (اس کا گھر دور ہے)۔ شاعر کہتا ہے:

نَأَتْ بِسُعَادَ عَنْكَ نوَى شَطُونٗ فَبَانَتْ والفُؤادُ بِهارَهِينٗ[1]

ا۔ یہ نابغہ ذبیانی کا شعر ہے۔لسان العرب (شطن)

سعاد کو دور کے مشقت بھرے سفر نے تم سے بہت دور کر دیا۔ اب وہ تو تم سے دور ہے مگر
دل اب بھی اسی کے قبضہ میں ہے۔

کہاجاتاہے: ''بِئرٌ شطونٌ؛ أی بعیدة القعر'' (بہت گہرائی والا کنواں)۔ ''شَطَن'' رسی کو بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ لمبی ہوتی ہے اور اس کے دونوں کنارے دور دور ہوتے ہیں۔ ایک عرب دیہاتی کے گھوڑے کے پاؤں لمبے سفر کے باوجود بھی نہیں گھستے تھے تو اس نے اس کا حال یوں بیان کیا: ''کأنّهٗ شیطانٌ فِی أشطانٍ'' (گویا کہ وہ رسیوں میں بندھا شیطان ہے)۔ ''شیطان'' کو بھی شیطان اسی لئے کہا گیا کہ اس نے سرکشی کی اور حق سے دور ہوگیا۔ ہر ضدی سرکش کو بھی شیطان کہا جاتا ہے خواہ وہ انسان ہو یا جن۔ جریر[1] کہتا ہے:

أیّامَ یَدعُونَنِي الشیطانَ مِنْ غَزَلِي وهُنَّ یَهْوَ ینَنِي إذْ كُنتُ شیطانا

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میری غزل گوئی کی وجہ سے عورتیں مجھے شیطان کہہ کر پکارتی تھیں۔ وہ مجھ سے محبت کرتی تھیں، اسی لئے کہ میں شیطان تھا۔

ایک رائے یہ ہے کہ ''شیطان''، ''شَاطَ یَشِیطُ'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہلاک ہونا ہے۔ اس صورت میں آخر والا نون زائد ہوگا۔ ''شاطَ'' جلنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اگر گوشت کو بھڑکتی آگ پر بھونا جائے مگر پوری طرح پکایا نہ جائے تو کہا جاتا ہے: ''شَیَّطْتُ اللَّحْمَ'' ۔ جب کوئی شخص غصے کی شدت سے بھڑک اٹھے تو کہاجاتاہے: ''اشتَاطَ الرَّجُلُ''۔ زیادہ چربی والی اونٹنی کو ''نَاقَةٌ مِشیاطٌ'' کہاجاتاہے۔ ''اشْتَاطَ'' بھی ہلاک ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اعشٰی کا ایک شعر ہے:

قَدْ نَخْضِبُ العَیرَ مِنْ مَكْنُونِ فائِلِهِ وقَد یَشِیطُ علَی أرماحِنا البَطَلُ[2]

نیزہ زنی میں ہماری مہارت کا یہ عالم ہے کہ ہم کبھی تو سرداروں کے پیٹ سے بہنے والے خون سے ان کو رنگ دیتے ہیں اور کبھی بڑے بڑے پہلوانوں کو نیزے کی نوک پر اٹھا کر ہلاک کر دیتے ہیں۔

اس شعر میں بھی ''یَشِیطُ'' کا معنی ہلاک ہو جانا ہی ہے۔ اس رائے کے رد میں سیبویہ کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ جب کوئی شخص شیاطین والے کام کرے تو عرب اس لفظ کے آخر میں نون لگا کر کہتے ہیں: ''تَشَیطَنَ فُلانٌ''

۱۔ جریر بن عطیہ بن خطفی تمیمی (م ۱۱۱ھ)۔ فرزدق اور اخطل کا ہم عصر شاعر ہے۔ فرزدق کے ساتھ اس کے ہجو گوئی کے مقابلے بہت مشہور ہیں۔ اس کی وفات اپنے وطن یمامہ میں ہوئی۔ زیات: تاریخ الادب العربي ص ۱۸۳، معجم المؤلفین ۳: ۱۲۹

۲۔ یہ شعر اعشٰی کے مشہور معلقہ لامیہ سے ہے۔ ابن النحاس: شرح القصائد المشهورات ۲: ۱۵۴

(فلاں شیطان بن گیا ہے)۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ مادہ "شَطَن" سے باب تفعیل ہے کیوں کہ اگر یہ "شاطَ" سے ہوتا تو بغیر نون "تشیُّط" کہا جاتا۔ اُمیہ بن ابی صلت کا درج ذیل شعر بھی اس کی تائید کرتا ہے:

أَيُّماَ شاطِنٍ عصاهُ عكَاهُ ورَماهُ فِي السجنِ وَالأَغلالِ (۱)

جو شیطان بھی ان کی (سلیمان علیہ السلام کی) نافرمانی کرتا وہ اسے باندھ دیتے اور زنجیروں سے جکڑ کر قید میں ڈال دیتے تھے۔ یہ "شاطن" بھی یقیناً "شطن" سے ماخوذ ہے۔

گیارہویں بحث: لفظ "رجیم" کی تحقیق

"رجیم" سے مراد وہ شخص ہے جسے ذلیل کر کے بھلائی سے دور ہٹا دیا جائے۔ "رجیم" کا اصل معنی پتھر مارنا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: رَجَمْتُهُ أرجُمُهُ (میں نے اسے پتھر مارا اور میں اسے پتھر مارتا ہوں)، "فَهو رَجيمٌ مَرجُومٌ"۔ لفظ "رجم" قتل، لعنت، دھتکارنے اور گالی دینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ تمام معانی درج ذیل ارشاد باری تعالیٰ میں مختلف مفسرینؒ نے بیان کیے ہیں: ﴿لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ يَانُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ﴾ [الشعراء ۲۶: ۱۱۶] (اے نوح اگر تم باز نہ آئے تو ضرور ہی سنگسار کر دیئے جاؤ گے)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے قول میں بھی ہے: ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ﴾ [مریم ۱۹: ۴۶] (اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا)۔ اس کا مفصل بیان اِن شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

بارہویں بحث: شیطان کا طریقۂ واردات

اَعمش نے ابو وائل سے روایت کیا ہے، وہ عبد اللہ سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

[۱۴۴] رَأيتُ النبيَّ صلى الله عليه وسلمَ عند الصفا وهو مُقبلٌ على شخُصٍ في صورةِ

---

[۱۴۴] یہ روایت مجھے کسی مستند کتاب میں نہیں ملی، نہ اس کی عبارت سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے شایان شان معلوم ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ انہوں نے شیطان کو قتل کرنے کا ارادہ اس لیے ترک کر دیا ہو کہ وہ ان کے دشمنوں کا نسب خلط ملط کرتا ہے۔ اور اسے بنیاد بنا کر اس کا یہ کہنا بھی ذومعنی ہے کہ میں تو آپ کے دشمنوں کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہوں اور آپ مجھے قتل کرنے جا رہے ہیں۔ آپ سے مجھے اس بدلہ کی توقع تو نہیں۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ یہ روایت سند کے لحاظ سے ثابت ہے نہ ہی درایت کے اصولوں کے پیش نظر اس کی کوئی اصل ہے، واللہ اعلم۔

۱۔ لسان العرب (شطن)۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اختیار کا ذکر ہے۔

الفِيل وهو يَلْعَنُهُ، قلتُ: ومَنْ هذَا الذِي تَلعنُهُ يا رسولَ اللّٰه؟ قال: "هذا الشيطانُ الرجيم" فقلتُ يا عدُوَّ اللّٰه! وَاللّٰهِ لأَقْتُلَنّكَ وَلَأُرَيِّحَنّ الأمَّةَ مِنكَ، قال:-ماهذا جزائِي مِنكَ؛ قلتُ: ومَاجَزاؤكَ مِنّي يَا عَدوّ اللّٰه؟ قال: وما أَبْغَضَكَ أحدٌ قَطُّ إلاّ شرِكتُ أبَاهُ فِي رحِمِ أمِّهِ۔

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کوہ صفا کے نزدیک ایک ہاتھی کی شکل والے شخص کی طرف لپکتے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے لعنت ملامت بھی کر رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: حضور! یہ کون ہے جس پر آپ لعنت بھیج رہے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ شیطان مردود ہے۔ میں نے اسے مخاطب کر کے کہا: اے اللہ کے دشمن! میں تجھے ضرور قتل کروں گا اور امت کی جان تجھ سے چھڑا دوں گا۔ اس نے کہا: میں آپ سے اس بدلہ کا مستحق تو نہیں ہوں۔ میں نے کہا: اللہ کے دشمن! تو مجھ سے کس بدلہ کا مستحق ہے؟ اس نے کہا: جو شخص بھی آپ کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے میں اس کی ماں کے رحم میں اس کے باپ کے ساتھ شریک ہوتا ہوں۔

بسم اللہ کا بیان

اس کی تفصیل ستائیس مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث: بسم اللہ کا مقام

اللہ تعالیٰ کا عہد نامہ

علماءِ کرام فرماتے ہیں: ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ایسا حلف نامہ ہے جو انہوں نے ہر سورت سے پہلے نازل فرما کر اپنے بندوں کے ساتھ حلفاً عہد کیا ہے کہ اے میرے بندو! میں نے اس سورت میں تم لوگوں کے لیے جو کچھ بھیجا ہے وہ سچ ہے، اور یقین رکھو کہ میں نے اس سورت میں جو وعدہ کیا یا جس مہربانی اور عنایت کا ذکر کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔

اُمت کے لیے خاص تحفہ

﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ اس کلامِ باری تعالیٰ کا حصہ ہے جو اس نے ہماری کتاب (قرآن مجید) میں نازل فرمایا۔ یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد اس امت کو ملنے والا خصوصی تحفہ ہے۔

شریعت کا خلاصہ

بعض علماء کرام فرماتے ہیں: ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ میں پوری شریعت سمائی ہوئی ہے کیوں کہ اس میں باری تعالیٰ کی ذات کا ذکر بھی ہے اور صفات کا بھی اور یہ بات صحیح ہے۔

دوسری بحث: بسم اللہ کی برکات

سعد بن اَبی سکینہ کہتے ہیں: مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ لکھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: اسے خوبصورت بنا کر لکھو کیوں کہ ایک شخص کی مغفرت صرف اس بنا پر ہو گئی کہ اس نے بسم اللہ کو سنوار کر لکھا۔ سعید کہتے ہیں: مجھے یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ ایک شخص نے

کاغذ پر ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ لکھا دیکھا تو اسے چوم لیا اور اپنی آنکھوں پر لگا لیا، اسی سے اس کی بخشش ہو گئی۔ اس طرح کا ایک واقعہ بشر الحافی رحمہ اللہ کی طرف بھی منسوب ہے کہ انہوں نے کاغذ کا وہ ٹکڑا اٹھا لیا جس پر اللہ کا نام لکھا ہوا تھا اور پھر اس کو خوشبو لگائی تو ان کا اپنا نام بھی معطر کر دیا گیا۔(۱) یہ بات قشیریؒ نے ذکر کی ہے۔

امام نسائیؒ نے اَبو ملیحؒ (۲) سے نقل کیا ہے، وہ اس صحابی سے روایت کرتے ہیں جو سواری پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھتے تھے، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۴۵] إذَا عَثرتُ بِكَ الدابّةُ فَلاَ تَقُل تَعِسَ الشيطانُ، فإنّهُ يَتَعَاظَمُ حتّى يَصِيرَ مِثْلَ البَيتِ ويقول بقوته:صَنعتُهُ، ولكِنْ قُلْ بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ، فَإِنّهُ يَتَصَاغَرُ حتّٰى يَصِيرَ مِثْلَ الذُّبَابِ۔

اگر تمہاری سواری پھسل جائے تو یوں نہ کہو کہ یہ شیطان کی نحوست ہے کیوں کہ وہ یہ بات سن کر اپنے تئیں اتنا پھیلتا ہے کہ پورے گھر کے برابر ہو جاتا ہے اور پوری طاقت سے کہتا ہے: میں نے ہی کام کیا ہے، تم اس کی بجائے ﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ کہا کرو اس سے شیطان سکڑتا ہے یہاں تک کہ مکھی کے برابر ہوجاتا ہے۔

حضرت علی بن الحسینؒ، ارشاد باری تعالیٰ:﴿وَاِذَا ذَكَرۡتَ رَبَّكَ فِی الۡقُرۡاٰنِ وَحۡدَهٗ وَلَّوۡا عَلٰٓی اَدۡبَارِهِمۡ نُفُوۡرًا﴾[الإسراء ۱۷:۴۶] (اور جب آپ قرآن میں تنہا اپنے پروردگار کا ذکر کرتے ہیں تو وہ لوگ اپنی پیٹھ پھیر کر نفرت کرتے ہوئے چل دیتے ہیں) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اس میں رب کے ذکر سے مراد﴿بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ﴾ کہنا ہے۔

---

[۱۴۵] مسند احمد: حديث رديف النبى صلى الله عليه وسلم ۵۹:۵، أحاديث رجال من أصحاب النبى صلى الله عليه وسلم ۵۰۲:۶،سنن ابوداؤد: كتاب الأدب ۲۹۶:۴، مستدرک حاکم: كتاب الأدب ۳۲۴:۴، ۳۲۵، مصنف عبدالرزاق: كتاب العلم، باب قول تعس الشيطان و تحريق الكتب ۴۲۴:۱۱،شعب الإيمان، الرابع والثلاثون......، فصل و مما يجب حفظ اللسان منه...... ۳۰۱:۴۔ اکثر کتب حدیث میں "بقوته صنعته" کی بجائے "بقوّتي صرَعتُهُ" (میں نے اسے اپنی طاقت سے مغلوب کر لیا ہے) کے الفاظ آتے ہیں۔

۱۔ ابو نصر بشر بن الحارث بن عبد الرحمٰن المروزی (م۲۲۷ھ) مشہور زاہد اور متقی ہیں۔ ان کی وفات بغداد میں ہوئی۔ جمهرة الأولياء ۱۴۶:۲، تهذيب التهذيب ۴۴۴:۱۔ اللہ کے نام کا زمین پر گرے ہونا بشر الحافی سے برداشت نہ ہو سکا اور اس کی قدر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگی ایسی بدلی کہ آج عالم ولایت میں ان کا مقام بہت بلند ہے۔

۲۔ ابو ملیح عامر بن اسامہ ہذلی (م۹۸ھ) ثقہ تابعی ہیں، نام کی نسبت ان کی کنیت زیادہ مشہور ہے۔ تهذيب التهذيب ۲۴۷:۱۲

حروف کی تعداد سے فرشتوں کی تعداد کا تعین

وکیعؒ نے اُعمشؒ سے، انہوں نے ابو وائلؒ سے اور انہوں نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: جو شخص یہ چاہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جہنم کی طرف ہانک کر لے جانے والے انیس فرشتوں سے بچا لیں تو اسے چاہئے کہ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پڑھا کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر حرف سے ایک ڈھال بنا دیں گے جو اسے ایک ایک فرشتے سے بچا لے گی۔﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کے انیس حروف ہیں اور آگ والے فرشتوں کی تعداد بھی انیس ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:﴿عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾ [المدثر ۷۴: ۳۰] (اس پر انیس فرشتے ہوں گے)۔ یہ فرشتے اپنے تمام کام﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پڑھ کر کرتے ہیں اور یہی ان کی طاقت کا مرکز ہے۔ بسم اللہ ہی سے ان کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: اسی طرح بعض حضرات نے لیلۃ القدر کے بارے میں سورۂ قدر کے الفاظ اور اس کے آخر میں ضمیر "هِیَ" سے نتیجہ نکالا ہے کہ یہ ستائیس رمضان کی رات ہے۔ ان فرشتوں کی تعداد کے بارے میں بھی اسی طرح کی رائے منقول ہے جنہوں نے ایک صحابی سے "رَبَّنَا وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا کَثِیْرًا طَیِّبًا مُبَارَکًا فِیْهِ" (اے ہمارے رب! تعریف تو تیرے ہی لیے ہے، بہت زیادہ، بہت اچھی اور برکت والی تعریف) سن کر اسے لکھنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ چوں کہ اس دعاء میں تیس سے کچھ زائد حروف ہیں اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۴۶] لَقَدْ رأَیْتُ بِضْعًا وَثَلَاثِیْنَ مَلَکاً یَبْتَدِرُونَهَا، أَیُّهُمْ یَکْتُبُهَا أَوَّلَ۔

میں نے تیس سے زیادہ فرشتے دیکھے جو ان کلمات کے بارے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ سب سے پہلے وہ انہیں لکھے۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: یہ چیزیں تفسیری لطائف میں سے ہیں، ان کا حقیقی علم سے کوئی تعلق نہیں ہے[1]۔

---

[۱۴۶] صحیح بخاری: کتاب مواقیت الصلاۃ، باب فضل اللهمّ ربّنالک الحمد ۱:۱۴۴، مسنداحمدؒ: حدیث رفاعة بن رافع الزرقيؓ ۴:۳۴۰، سنن ابوداؤد: کتاب الصلاۃ، باب مایستفتح به الصلاة من الدعاء ۱:۲۰۴، سنن نسائی: کتاب التطبیق، باب مایقول المأموم ۲:۱۹۶، صحیح ابن حبان: باب الصلاة، باب صفة الصلاة ۵:۲۳۵، صحیح ابن خزیمۃ: کتاب الصلاة، باب فضیلة التحمید بعد رفع الرأس من الرکوع ۱:۳۱۱، مستدرک حاکم: کتاب الإمامة، باب التأمین ۱:۳۴۸، سنن بیہقی: کتاب الصلاة، باب القول عند رفع الرأس من الرکوع وإذا استوی قائما ۲:۴۱۹

۱۔ تفسیر ابن عطیة ۱:۸۲

تیسری بحث: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ لکھنے کی ابتداء

شعبی اور اعمش دونوں حضرات نے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم "بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ" لکھا کرتے تھے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "بِسْمِ اللّٰهِ" لکھنے کا حکم دیا گیا تو آپ نے یہ لکھنا شروع کر دیا، پھر جب ارشاد باری تعالیٰ: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُواالرَّحْمٰنَ﴾ [الإسراء ۱۷:۱۱۰] آپ کہیے: اللہ (کہہ کر) پکارو یا رحمان پکارو۔ نازل ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ﴾ لکھنا شروع کر دیا۔ پھر جب ﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ [النمل ۲۷:۳۰](وہ سلیمان کی طرف سے ہے اور وہ یہ ہے: بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ) نازل ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ لکھنے کا معمول بنا لیا۔

[۱۴۷] امام ابو داؤدؒ نے شعبیؒ، ابو مالکؒ، قتادہؒ اور ثابت بن عمارہؒ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ نہیں لکھا یہاں تک کہ سورۂ نمل نازل ہوئی۔

چوتھی بحث: کیا ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قرآن کی آیت ہے؟

حضرت جعفر صادق رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "البَسْمَلَةُ تِيجَان السُّوَر" ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قرآنی سورتوں کے تاج ہیں۔

مؤلف کی رائے: یہ قرآن کی آیت نہیں

میں کہتا ہوں: یہ اس بات کی دلیل ہے کہ بسم اللہ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے نہ کسی اور سورت کی۔

فقہاء کے نقطہ ہائے نظر

اس کے قرآنی آیت ہونے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، جس میں درج ذیل تین آراء ہیں:
امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے، نہ کسی اور سورت کی۔ عبداللہ بن مبارک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ ہر سورت کی آیت ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے۔ امام شافعیؒ سے اس ضمن میں اور بھی کئی اقوال منقول ہیں جن میں سے ایک قول یہ ہے کہ ہر سورت کی آیت ہے، دوسرا یہ ہے کہ صرف سورۂ فاتحہ کی آیت ہے۔ البتہ اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو "بسم اللہ الرحمن الرحیم"

---

[۱۴۷] سنن ابوداؤد: کتاب الصلاۃ، باب من جھرَ بھا، ۱:۲۰۹

سورۂ نمل میں ہے وہ قرآن مجید کی آیت ہے۔

امام شافعیؒ کے دلائل

امام شافعیؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو دار قطنیؒ نے ابو بکر الحنفی سے نقل کی ہے، انہوں نے عبد الحمید بن جعفر سے، انہوں نے نوح بن ابی بلال سے، انہوں نے سعید بن ابی سعید المقبری سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۴۸] إذَا قَرَأْتُم الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالِمِينَ فَاقرُأوا بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيم،إنها أمّ الْقُرآن، وأمّ الكتاب، والسبع المثاني، و﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾أحدُ آياتِهَا۔

جب تم "الحَمْدُ لِلّٰهِ ربِّ العَالِمِين" پڑھو تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بھی پڑھ لیا کرو۔ کیوں کہ وہ اُمّ القرآن بھی ہے،اور اُمّ الکتاب بھی اور سبع مثانی بھی ہے اور ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس کی ایک آیت ہے۔

راوی عبد الحمید بن جعفر اور نوح بن اَبی بلال پر بحث

اس حدیث کو عبد الحمید بن جعفر نے مرفوعاً نقل کیا ہے اور ان کو امام احمد بن حنبلؒ، یحییٰ بن سعیدؒ اور یحییٰ بن معینؒ نے ثقہ کہا ہے۔ اَبو حاتم(۱) کہتے ہیں: وہ صدوق تھے۔ سفیان ثوریؒ ان کو ضعیف کہتے تھے اوران پر سخت اعتراض کرتے تھے(۲)۔نوح بن ابی بلال ثقہ اور مشہور ہیں(۳)۔

---

[۱۴۸] سنن دارقطنی: کتاب الصلاة، باب وجوب قراء ة ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ في الصلاة والجهر بها، واختلاف الروايات في ذلك ۳۱۲:۱۔ اس کے راوی عبد الحمید بن جعفر کو یحییٰ بن معین اور کچھ دیگر حضرات نے ثقہ کہا ہے مگر ثوریؒ اور ابو حاتم وغیرہ بہت سے حضرات نے ضعیف کہا ہے۔ اس میں ایک اور علت یہ بھی ہے کہ عبد الحمید بن جعفر سے نقل کرنے والے راوی ابو بکر حنفی کہتے ہیں: پھر میں نوح سے خود ملا تو انہوں نے یہی حدیث سعید بن اَبی سعید مقبری سے نقل کی جس میں صرف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہیں کیا۔ تهذيب التهذيب ۱۱۱:۶

۱۔ ابو حاتمؒ محمد بن ادریس رازی (م۲۷۷ھ) جرح وتعدیل کے ائمہ میں سے ہیں۔دیگر کتب کے ساتھ ساتھ ان کی''الجرح و التعدیل'' بہت مشہور ہے۔ معجم المؤلفين ۳۵:۹

۲۔ تهذيب التهذيب ۱۱۱:۶، الجرح والتعديل ۱۰:۳

۳۔ نوح بن ابی بلال مدنی حضرت معاویہؓ کے غلام تھے۔ اکثر ائمہ جرح نے انہیں ثقہ کہا ہے ۔ تهذيب التهذيب ۴۸۱:۱

ابن مبارکؒ اور امام شافعیؒ کے دوسرے قول کے دلائل

ان کی دلیل وہ حدیث ہے جسے امام مسلمؒ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

[۱۴۹] بینَا رسول الله صلى الله عليه وسلم ذات يوم بين أظهُرِنا إذْ أغْفِيَ إغفاءةً ثمّ رفع رأسَهُ مُتبَسِّمًا، فقُلنا: مَا أضحَكَكَ يا رَسُولَ الله؟ قال: "نَزَلَتْ عَلَيَّ آنِفًا سورةٌ فَقرأ: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔ إنَّا أعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ إنَّ شَانِئَكَ هُوَ الأبْتَرُ۔

ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان تشریف فرما تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہلکی سی غنودگی طاری ہوگئی، پھر آپ نے مسکراتے ہوئے سر اٹھایا تو ہم نے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپ کے مسکرانے کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے فرمایا: مجھ پر ابھی ایک سورت نازل ہوئی ہے، پھر آپ نے یہ سورت پڑھ کر سنائی: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔ إنَّا أعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ. فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. إنَّ شَانِئَكَ هُوَالأبْتَرُ﴾۔اس طرح انہوں نے پوری حدیث ذکر کی جس کا مکمل بیان ان شاء اللہ سورۂ کوثر میں آئے گا۔

پانچویں بحث: امام مالکؒ کے قول کی تائید میں دلائل

ان سب اقوال میں سے زیادہ صحیح قول امام مالکؒ کا ہے، کیوں کہ کسی چیز کا قرآن ہونا خبرِ واحد سے ثابت نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ایسے قطعی تواتر کا ہونا ضروری ہے جس میں اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ ابن العربیؒ کہتے ہیں:

> بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے قرآن مجید کی آیت ہونے یا نہ ہونے میں علماء کا اختلاف بذاتِ خود اس بات کی کافی دلیل ہے کہ یہ قرآن میں سے نہیں، کیوں کہ قرآن میں اختلاف نہیں ہو سکتا۔صحیح احادیث جن کی صحت وثبوت پر کوئی کلام نہیں، ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ نہ سورۂ فاتحہ کی آیت ہے نہ کسی قرآنی سورت کی سوائے اس کے جو سورۂ نمل میں نازل ہوئی۔

---

[۱۴۹] صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب حجة مَن قال: البسملة آية مِن كُلّ سورة سوى براءة ۱:۳۰۰، سنن ابو داؤد: كتاب الصلاة، باب مَن لم ير الجهر بِبِسم الله الرحمن الرحيم، ۱: ۲۰۸، مسند احمد: مسند أنس بن مالك رضي الله عنه ۳:۵۳۸،مسند ابویعلیٰ: المختار بن فلفل عن (أنسؓ) ۷:۴۰، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب الدليل على أنّ ما جمعته مصاحف الصحابة...... ۲:۳۳۷

امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، آپؓ فرماتے ہیں، میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

[۱۵۰] قَالَ اللّٰه عزّوجل: قَسَمتُ الصلاةَ بيني وَبينَ عبدِي نِصفَينِ، وَلعَبدِى ماسَأَلَ۔ فإذَا قَالَ العبدُ:"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العَالَمِينَ" قال اللّٰه تعالى:حمِدَ نِي عَبدي، وإذا قَالَ العبدُ: "الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمُ" قال اللّٰه تعالىٰ: أَثْنَى عَلَيَّ عَبدِي، وإذا قالَ العَبْدُ:"مَالِكِ يَومِ الدِّينِ" قال: مجَّدَنِي عبدي۔ وقالَ مَرَّةً: فَوَّضَ إِلَيَّ عَبْدِي۔ فإذا قال:"إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ" قال: هٰذَا بَينِي وَبَينَ عَبدي، ولِعَبْدِي مَاسَأَلَ، فإذا قالَ:"إِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ صِرَاطَ الَّذِينَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيرِالْمَغْضُوبِ عَلَيهِمْ وَلَاالضَّالِّينَ" قال: هٰذَا لِعَبْدِي، ولِعَبْدِي مَاسَأَلَ"۔

اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: میں نے نماز اپنے اور اپنے بندے کے درمیان دوحصوں میں تقسیم کر دی ہے اور میرا بندہ جو کچھ مانگتا ہے اسے عطا کیا جاتا ہے۔ چناں چہ جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب بندہ کہتا ہے:﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری ثنا بیان کی ہے۔ جب بندہ کہے﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (وہ مالک ہے روزِ جزاء کا) تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے میری بلند شان کا ذکر کیا ہے۔ کبھی فرماتے ہیں: بندے نے معاملہ میرے سپرد کر دیا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے:﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ (ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھی سے مدد چاہتے ہیں) تو ارشاد ہوتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان معاملہ ہے۔ میرے بندے کو وہ ملے گا جو وہ مانگتا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے:﴿إِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَاالضَّالِّيْنَ﴾ (چلا ہم کو سیدھے راستہ پر۔

[۱۵۰] صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب وجوب قراء ة الفاتحة فى كل ركعة، وإنّه إذا لم يُحسِن الفَاتِحَةَ ولا أمكنه تعلّمها قرأ ما تيسّر له من غيرها ۲۹٦:۱، مؤطاامام مالکؒ: كتاب الصلاة، باب القراء ة خلف الإمام فيما لا يجهر فيه بالقراء ة ۸۴:۱، سنن ابوداؤد: كتاب الصلاة، باب من ترك القراء ة فى صلاته بفاتحة الكتاب ۲۱٦:۱۔ ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، ابن حبانؒ، ابن خزیمہؒ، احمدؒ وغیرہم بھی اسے نقل کیا ہے۔

ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا ہے، نہ ان لوگوں کا راستہ جو زیر غضب آ چکے ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا)۔ تو ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے: یہ میرے بندے کے لئے ہے اور میرے بندے نے جو کچھ مانگا ہے اسے مل جائے گا۔

اس حدیث میں ارشاد باری تعالیٰ "قَسَمْتُ الصَّلَاةَ" (میں نے نماز کو تقسیم کر دیا ہے) سے مراد سورۂ فاتحہ ہے جسے اللہ عزوجل نے نماز کا نام دیا ہے کیوں کہ نماز اس کے بغیر نہیں ہوتی۔

سورۂ فاتحہ کی سات آیات

پہلی تین آیات کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کیا، جن کا معنی و مفہوم صرف اسی ذات کو جچتا ہے اور اس بات پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے۔ چوتھی آیت کو اپنے اور اپنے بندے کے درمیان مشترک رکھا کیوں کہ اس میں بندے کی عاجزی اور اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنے کا ذکر ہے۔ بندے کی اس عاجزی اور مانگنے کی کیفیت میں اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے۔ اس کے بعد والی تینوں آیات مل کر سات آیات مکمل ہو جاتی ہیں۔ آخری آیات کی تعداد تین ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حدیث قدسی میں ان کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ کے الفاظ "**هٰؤلاءِ لِعَبدی**" (یہ بصیغہ جمع میرے بندے کے لئے ہیں) ہیں جیسا کہ امام مالکؒ نے نقل کیا ہے۔ یہاں "**هاتان**" (ضمیر تثنیہ۔ یہ دونوں۔) ارشاد نہیں فرمایا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيهِمْ﴾ مستقل آیت ہے۔ ابنِ بکیر کہتے ہیں، امام مالکؒ نے فرمایا: ﴿اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ ایک آیت ہے اور اس کے بعد والی مکمل ایک آیت ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی اس تقسیم سے اور اس ارشادِ نبوی سے بھی ثابت ہوتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

[۱۵۱] **كيف تقرأ إن افتتحت الصّلاةَ. قال: فقرأتُ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ حتى اتيتُ على آخرِها۔**

تم جب نماز کی ابتداء کرتے ہو تو قراءت کیسے کرتے ہو؟ حضرت ابیؓ فرماتے ہیں: میں نے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ اس کے آخر تک پہنچ گیا۔

ان دونوں احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے۔ اس کی آیات کو اہلِ

---

[۱۵۱] مؤطا امام مالکؒ: كتاب الصلاة، باب ماجاء في أمّ القرآن ۱:۸۳، مستدرک حاکم: كتاب فضائل القرآن، أخبار في فضائل القرآن جملة ۱:۷۴۴

مدینہ، اہلِ شام، اہلِ بصرہ اور اکثر قرّاء نے اسی طرح شمار کیا ہے کہ ﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ کو ایک آیت قرار دیا ہے۔ قتادہ ؒ نے ابو نضرہؒ سے اورانہوں نے حضرت ابوہریرہؓ سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے کہ چھٹی آیت ﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ ہے۔

علماءِ کوفہ کی رائے

جہاں تک کوفہ کے قُرّاء اور فقہاء کا تعلق ہے تو انہوں نے ﴿اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ﴾ کے بجائے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کو آیت شمار کیا ہے[1]۔

اِشکال اور اس کا جواب

اگر کوئی کہے کہ بسم اللہ تو قرآن مجید میں مستقل طور پر موجود ہے، اسے رسم قرآنی کے مطابق لکھا جاتا ہے اور یہ ہم تک بالکل اسی طرح بطریق تواتر منقول ہو کر آئی ہے جس طرح سورۂ نمل والی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آئی ہے تو پھر اس کو قرآن کی آیت ماننے میں تأمل کیسا؟ ہمارا جواب یہ ہے کہ آپ کی بات تو ٹھیک ہے مگر یہ فیصلہ کرنا باقی ہے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کی آیت کے طور پر تواتر سے منقول ہے یا سورتوں کے درمیان فاصلے کی علامت کے طور پر جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ:

[۱۵۲] کُنّالا نَعرِفُ اِنْقضاءَ السورةِ حتّی تنزل ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾۔

ہمیں اس وقت تک سورت ختم ہونے کا علم نہیں ہوتا تھا جب تک ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ نازل نہ ہو جاتی۔ اسے امام ابو داوٗدؒ نے نقل کیا ہے۔

---

[۱۵۲] سنن ابوداوٗدؒ: کتاب الصلاة، باب ما جاء من خبرها۔ بذل المجہود ۴:۵۳۹، بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يَعرفُ فصل السورة حتى ينزِل عليهِ بسم اللّٰه الرحمن الرحيم. یہاں خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ہے ۔اسی مفہوم کی احادیث مستدرک حاکم: كتاب الإمامة و صلاة الجماعة، باب التامين ۱:۳۵۶، مصنف عبدالرزاق: كتاب الصلاة، باب قراءة بسم الله الرحمن الرحيم ۲:۹۲، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب الدليل على أن ما جمعته مصاحف الصحابة رضى الله عنهم كله قرآن...... ۲:۳۳۷ میں بھی منقول ہیں۔

---

[1] ابوبکر جصاصؒ کہتے ہیں: قُرّاء کوفہ نے تو اسے فاتحہ کا حصہ قرار دیا ہے مگر فقہائے احناف سے اس طرح کی کوئی صریح روایت منقول نہیں۔ البتہ شیخ ابوالحسن کرخیؒ نے احناف کا مذہب اسے باآواز بلند نہ پڑھنے کا نقل کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرات بسم اللہ کے سورۂ فاتحہ کا حصہ ہونے کے قائل نہیں۔جصاص: أحكام القرآن، "القول في أنها من فاتحة الكتاب" ۱:۸۔ مزید تفصیل مولانا ظفر احمد عثمانی: أحكام القرآن ۱:۵، إعلاء السنن اور آلوسیؒ: روح المعاني میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تیسری صورت یہ بھی ہے کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کو حصولِ برکت کے لئے قرآنی سورتوں کے شروع میں لگا دیا گیا ہو جیسا کہ پوری امت میں متفقہ طور پر خطوط اور رسائل کے شروع میں اسے لکھنے کا رواج ہے۔ یہ تمام احتمالات موجود ہیں۔

امام جزیری[۱] کہتے ہیں: حسن بصریؒ سے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؒ نے فرمایا: "في صُدور الرسائل" (یہ تو خطوط کے شروع میں ہوتی ہے)۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قرآن مجید میں کہیں نازل نہیں ہوئی سوائے سورہ طٰس کے جس میں ہے ﴿إِنَّهُ مِنْ سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ"﴾ [النمل ۲۷: ۳۰]

ان سب احتمالات کی روشنی میں فیصلہ یہی ہے کہ کسی چیز کا قرآن ہونا محض رائے قائم کر لینے یا اپنی مرضی سے دلیل قائم کرنے سے ثابت نہیں ہوتا، وہ تو قطعی اضطراری تواتر سے ثابت ہے[۲]۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ امام شافعیؒ سے بھی اس بارے میں متعدد اقوال منقول ہیں کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہر سورت کے شروع میں اس کی آیت کے طور پر ہے یا نہیں۔ الحمد للہ ان تمام اقوال کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ یہ ہر سورت کی آیت نہیں ہے۔

دوسرا اشکال اور اس کا جواب

اگر یہ کہا جائے کہ بہت سے علماء نے اس کا آیتِ قرآنی ہونا نقل کیا ہے اور امام دارقطنیؒ[۳] نے ان روایات کو ایک رسالہ میں جمع کیا ہے جسے انہوں نے "صحیح" کا نام دیا ہے۔

ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم ان روایات کا انکار نہیں کرتے بلکہ اس بات کی وضاحت ہم پہلے بھی کر چکے ہیں۔ مگر ان روایات کے مقابلہ میں ہمارے پاس صحیح اور ثابت احادیث ہیں جنہیں ائمہ ثقات اور نہایت قابل اعتماد فقہاء نے نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جسے صحیح مسلم میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا گیا ہے، فرماتی ہیں:

۱۔ ابو مسعود، سعید بن ایاس جزیری بصریؒ (م۱۴۴ھ)۔ تهذيب التهذيب ۴:۵

۲۔ مطلب یہ کہ قرآن مجید کا نسل در نسل کثیر جماعت سے نقل ہوتے آنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظتِ قرآن کا حصہ تھا جس میں انسانی سوچ اور ارادہ کا کوئی دخل نہ تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے پاس کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ اب اگر کوئی چیز اس درجہ تواتر پر پوری نہیں اتری تو وہ قرآن کا حصہ نہیں بن سکتی۔ مترجم

۳۔ امام ابوالحسن علی بن عمر بن احمد دارقطنیؒ شافعی بغدادی (م۳۸۵ھ) اپنے وقت کے بڑے محدّث اور فن علل حدیث کے ماہر تھے۔ سنن کے علاوہ بھی ان کی تالیفات ہیں۔ معجم المؤلفین ۷:۱۵۷

[۱۵۳] كانَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم يستفتِحُ الصلاةَ بالتكبير، والقِرَاءَةَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی ابتداء تکبیر سے، جب کہ قراءت کی ابتداء ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ سے کیا کرتے تھے۔

یہ مکمل حدیث آئندہ إن شاء اللہ آئے گی۔

امام مسلمؒ نے ایک اور روایت حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

[۱۵۴] صَلَّيْتُ خَلفَ النبيِّ صلى الله عليه وسلَّم وأبي بَكروعُمَر، فَكانُوا يَسْتَفْتِحُونَ بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ، لَايذْكُرُونَ "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لافي أوّلِ قِرَاءَةٍ وَلَا فِي آخِرِها۔

میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں بھی نماز پڑھتا رہا اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے بھی۔ یہ سب حضرات قراءت کی ابتداء ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ سے کرتے تھے۔ انہوں نے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ نہ کبھی قراءت کے شروع میں پڑھی اور نہ آخر میں۔

تعاملِ اہلِ مدینہ

ہمارے (مالکیہ) کے موقف کو ترجیح حاصل ہونے کی ایک بڑی اور نہایت معقول وجہ یہ بھی ہے کہ مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کو قائم ہوئے عرصہ دراز گزر گیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر امام مالکؒ تک کتنے زمانے گزر گئے مگر وہاں کسی نے بھی آج تک ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ (قراءت کے ساتھ) سنّت سمجھ کر نہیں پڑھی۔ اہلِ مدینہ کا یہ تعامل بھی آپ لوگوں کی روایات کا رد کرتا ہے۔

نفل نمازوں کی قراءت میں بسم اللہ

یہ بات ضرور ہے کہ ہمارے (مالکی) علماء نے نفل نمازوں میں بسم اللہ پڑھنے کو پسند کیا ہے اور اس کی

[۱۵۳] صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب حجة من قال: لا يجْهَرُ بالبَسْملة ۱:۲۹۹، امام ابو داؤدؒ، احمدؒ، بیہقیؒ، طیالسیؒ، ابن ماجہؒ اور ابن حبانؒ سب حضرات نے اسے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے۔

[۱۵۴] صحیح مسلم: حوالہ بالا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے، مسند احمد: مسند انس بن مالک رضی الله عنه ۴:۹۶، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب من قال: لايجهر بها ۲:۳۴۸

قراء ت کی جو روایات ملتی ہیں ان کا منشا بھی یہی ہے یا ان سے اتنی رعایت ہی مل سکتی ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: اگر کوئی شخص نفل نمازوں کی قراء ت یا نماز کے علاوہ قرآن مجید سناتے وقت ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

امام مالکؒ اور ان کے ہم خیال علماء کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ان کے نزدیک نہ تو سورۂ فاتحہ کی آیت ہے اور نہ کسی اور سورت کی۔ نمازی کے لئے فرض یا غیر فرض کسی بھی نماز میں اس کا با آواز یا آہستہ کسی بھی طرح پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ البتہ اگر نفل نمازوں میں پڑھ لے تو جواز کی حد تک درست ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کی یہی رائے ان کے مذہب کے فقہاء میں مشہور ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ سے دوسری روایت

امام مالک رحمہ اللہ سے دوسری روایت میں منقول ہے کہ نفل نمازوں میں سورت سے پہلے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھ لی جائے مگر سورۂ فاتحہ سے پہلے وہاں بھی نہ پڑھی جائے۔

امام مالکؒ کی تیسری روایت

امام مالکؒ ہی سے ابن نافعؒ نے نقل کیا ہے کہ فرض اور نفل تمام نمازوں میں قراء ت کی ابتداء اسی سے کی جائے اور اسے کسی حال میں بھی چھوڑنے کی اجازت نہیں ہے۔

مدینہ کے بعض فقہاء کا امام مالکؒ سے اختلاف

علماءِ مدینہ میں سے بعض حضرات کا موقف یہ ہے کہ ہر نماز میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھنا ضروری ہے۔ یہی رائے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور ابن شہاب زہریؒ کی بھی ہے۔ امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام اسحٰقؒ، ابوثور اور ابوعبید رحمہم اللہ کا موقف بھی یہی ہے۔

اس اختلاف کی حیثیت اور متشددین کا رد

ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ کی حیثیت محض اجتہادی ہے نہ کہ قطعی جیسا کہ فقہ دانی کے مدعی بعض جاہلوں نے سمجھ رکھا ہے۔ وہ ان اقوال کی بناء پر مخالفین پر کفر کا فتویٰ لگانے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس مسئلہ کی حیثیت وہ نہیں جو انہوں نے سمجھی ہے کیوں کہ اس کے بارے میں بہت سی مختلف آراء منقول ہیں جو الحمدللہ یہاں ذکر کر دی گئی ہیں۔

احناف کا نقطۂ نظر اور فقہاءِ سلف

علماء کی ایک کثیر جماعت کے نزدیک سورۂ فاتحہ کے ساتھ آہستہ آواز میں ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ پڑھنا چاہئے۔ اس کے قائلین میں امام ابوحنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ بھی شامل ہیں۔ یہی حضرت عمرؓ، علیؓ، ابن مسعودؓ، عمارؓ اور ابن زبیرؓ رضی اللہ عنہم اجمعین سے منقول ہے اور اسی کے قائل حَکَمؒ، حمادؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور ابوعبید وغیرہ تمام حضرات ہیں ۔ امام اوزاعیؒ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے۔یہ ساری تفصیل حافظ ابوعمر بن عبدالبرؒ نے اپنی کتاب ''الاستذکار'' میں نقل کی ہے۔

نماز میں آہستہ بسم اللہ پڑھنے کے قائلین کے دلائل

ان کی دلیل منصور بن زاذان کی وہ روایت ہے جو انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

[۱۵۵] صَلّیٰ بِنا رسول اللّٰه صلی اللہ علیه وسلم فَلَمْ يُسمِعْنَا قِراءَ ةَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نماز پڑھائی تو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہمیں سنا کرنہیں پڑھی۔

اور جو روایت عمار بن زُریق نے اعمش سے، انہوں نے شعبہ سے، انہوں نے ثابت سے اور ثابت نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

[۱۵٦] صَلّيتُ خَلفَ النبي صلی اللہ علیه وسلم وَخلفَ أبي بَكرٍ و عُمَرَ، فلَم أسمَعْ

---

[۱۵۵] سنن نسائی: کتاب الافتتاح، باب ترک الجهر بسم الله الرحمن الرحيم ۲:۱۳۴۔ اس میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی ہے کہ ہم نے حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے بھی نماز پڑھی۔ ان دونوں حضرات سے بھی بسم اللہ الرحمٰن نہیں سنی، نیل الأوطار: باب ماجاء فی بسم الله الرحمن الرحيم وحديث انس فی عدم الجهر ۱:۴۹۳ ، نصب الراية ۱: ۳۲۷-۳۳۱، معاني الآثار ۱:۲۰۲-۲۰۳ میں اس موضوع کی روایات یکجا ملتی ہیں۔

[۱۵٦] سنن نسائی: کتاب الإفتتاح، باب ترک الجَهْرِ ببسم الله الرحمن الرحيم. ۲:۱۳۵۔ اس میں حضرات ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم تینوں کا ذکر ہے، صحیح ابن حبان: کتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۵:۱۰۳، صحیح ابن خزیمہ: کتاب الصلاة، باب ذكر الدليل على أنّ أنسًا إنّما أراد بقوله لم أسمع أحدًا منهم يقرأ...... ۱:۲۵۰، سنن دارقطنی: کتاب الصلاة، باب ذكر اختلاف الرواية فی الجهر ببسم الله الرحمن الرحيم ۱:۳۱۴

أحدًا مِنْهُمْ يَجْهَرُ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔

میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں بھی نمازیں پڑھیں اور حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے بھی پڑھتا رہا مگر میں نے ان میں سے کسی کو ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ بلند آواز سے پڑھتے ہوئے نہیں سنا۔

مؤلف کی نظر میں اس اختلاف کا حل

میں کہتا ہوں: یہ بہت اچھی بات ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی کی تائید میں متفقہ روایات منقول ہیں جن میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ان کو بنیاد بنا کر بسم اللہ کی قراءت میں پائے جانے والے اختلاف سے بھی چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک روایت حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے، فرماتے ہیں:

[۱۵۷] كَانَ الْمُشْرِكُونَ يَحْضُرُونَ بِالمسجِد، فإذَا قرأَ رَسولُ اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ قالُوا: هذا مُحَمَّدٌ يَذْكُرُ رَحْمانَ اليَمَامَةِ۔ يعنون مُسَيلَمَة۔ فأُمِرَ أنْ يُخَافِتَ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، ونزَل ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾۔

مشرکین مسجد حرام میں آیا کرتے تھے اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ”بسم اللہ الرحمٰن الرحیم“ پڑھتے تو وہ کہتے: دیکھو! محمد صلی اللہ علیہ وسلم یمامہ کے رحمان کا ذکر کر رہے ہیں۔ اس سے ان کا اشارہ مسیلمہ کذاب کی طرف ہوتا تھا۔ چناں چہ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ”بسم اللہ“ آہستہ آواز سے پڑھنے کا حکم دے دیا گیا اور اس موقع پر ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِکَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ [الاسراء ۱۷: ۱۱۰] (اور آپ نماز میں نہ تو بہت پکار کر پڑھئے اور نہ (بالکل) چپکے ہی چپکے پڑھئے) نازل ہوا۔ ابو عبداللہ حکیم ترمذی کہتے ہیں: یہ عمل اس وقت سے ہمارے دور تک اسی طرح جاری ہے، اگرچہ اس کی علّت ختم ہو چکی ہے جیسا کہ طواف میں رمل اپنی علّت ختم ہو جانے کے باوجود جاری ہے۔ اور جیسا کہ دن کی نمازوں میں آہستہ آواز سے پڑھنا بھی علّت ختم ہو جانے کے باوجود جاری ہے۔

[۱۵۷] نیل الأوطار، باب ماجاء فی بسم اللہ الرحمن الرحیم ۱:۴۹۳ میں اس سلسلہ کی اکثر احادیث جمع کر دی گئی ہیں اور رحمان الیمامہ والی حدیث حکیم ترمذی اور طبرانی کے حوالہ سے نقل کی ہے، اور مجمع الزوائد کے حوالہ سے اس کے تمام رجال کو موثق لکھا ہے۔

چھٹی بحث: دستاویزات کی ابتداء میں بسم اللہ لکھنا

اس بات پر امت مسلمہ کا اتفاق ہے کہ ہر دستاویز کے شروع میں بسم اللہ الرحمٰن لکھنا جائز ہے خواہ وہ کوئی علمی کتاب ہو یا صرف خط ہو البتہ اشعار کے مجموعوں اور دواوین کا معاملہ مختلف ہے۔ اس کے بارے میں مجالد نے شعبی سے نقل کیا ہے کہ جمہور کے نزدیک شعر سے پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھنا مناسب نہیں۔ زہری[1] کہتے ہیں: پہلے سے طریقہ یہی چلا آ رہا ہے کہ شعر لکھتے وقت "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" نہیں لکھا جاتا۔ سعید بن جبیرؒ شعری کتابوں کے شروع میں بسم اللہ لکھنے کے قائل ہیں اور اکثر متأخرین نے انہی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ ابوبکر الخطیب کہتے ہیں: ہم نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے اور یہی ہمیں پسند ہے۔

ساتویں بحث: بسم اللہ کا مخفف نام

ماوردیؒ[2] کہتے ہیں: جو شخص بسم اللہ پڑھتا ہے اسے "مُبَسْمِلٌ" کہا جاتا ہے اور اس لفظ کا استعمال عہدِ ترقی[3] کی ایجاد ہے۔ یہ لفظ شعر میں بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ عمر بن ابی ربیعہ[4] کہتا ہے:

لَقَدْ بَسْمَلَتْ لَيْلَى غَدَاةَ لَقِيتُهَا　　　فَيَاحَبَّذَا ذَاكَ الحَبِيبُ المُبَسْمِلُ

جس صبح میں لیلیٰ سے ملا اس نے مجھے دیکھ کر بسم اللہ کہا! کتنا پیارا ہے وہ محبوب بسم اللہ کہنے والا۔

۱۔ محمد بن مسلم بن شہاب زہری طبقہ رابعہ کے مشہور فقیہ اور محدث ہیں۔ ان کے بارے میں بعض محدثین کی تنقیدی آراء بھی ملتی ہیں مگر بحیثیت مجموعی ان کی جلالت شان پر پوری امت متفق ہے۔ التقریب ۲: ۲۰۷، تہذیب التہذیب ۹: ۴۴۵

۲۔ ابوالحسین علی بن حبیب البصری الشافعی (م ۴۵۰ھ)۔ مشہور فقیہ، اصولی اور اپنے دور کے سب سے بڑے قاضی تھے۔ "النکت والعیون" المعروف تفسیر الماوردی کے علاوہ بھی ان کی کئی یادگار تصانیف ہیں۔ طبقات الشافعیۃ ۱: ۲۳۰، اعلام زرکلی ۴: ۳۲۷

۳۔ علامہ قرطبیؒ نے "لغة مُوَلَّدَة" کہا ہے اور علمائے لغت کے ہاں اس سے مراد ایسا لفظ ہے جو اصل بادیہ کے اہلِ عرب نے استعمال نہ کیا ہو بلکہ شہری آبادی کے ترقی یافتہ طبقہ نے اسے ایجاد کر لیا ہو۔ ثعلب کے ہاں "مُوَلَّد" وہ لفظ ہے جو اصل میں عربی ہی ہو مگر بعد میں عام گفتگو کے دوران لوگ اسے تبدیل کر دیں۔ رافعی: تاریخ آداب العرب ۱: ۲۰۸

۴۔ عمر بن عبداللہ بن ابی ربیعہ مخزومی قریشی (م ۹۳ھ) غزل گو شاعر تھا۔ اس کے شعر کو آداب عرب کے لئے نقصان دہ شمار کیا گیا مگر فنی لحاظ سے سلاست اور پرتاثیر غزل گوئی اس کا طرہ امتیاز ہیں۔ العقد الفرید ۳: ۱۳۲، المنتخب من أدب العرب ۴: ۱۴۳

مؤلف کی رائے

لفظ "بَسْمَلَ" اہل لغت کے ہاں مشہور و معروف ہے۔ ابن سکّیت [۱]، مُطَرّز [۲] اور ثعالبی [۳] وغیرہم تمام علماءِ لغت کا کہنا ہے کہ جب کوئی شخص بسم اللہ کہے تو کہا جاتا ہے: "بَسْمَلَ الرجُلُ"۔ اسی طرح: "قَدْاَکْثَرْتَ مِنَ البَسْمَلَةِ: آپ نے بسم اللہ کثرت سے کہا بھی مستعمل ہے۔ اسی طرح "لاَحَوْلَ وَلاَ قُوَّةَ إلاّ بِاللّٰهِ" کہنے والے کو "حَوْقَلَ الرَّجُلُ"، لاإلٰهَ إلاَّ اللّٰه" کہنے والے کو "هَلَّلَ"، "سُبْحَانَ اللّٰه" کہنے والے کو "سَبْحَلَ"، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ" کہنے والے کو "حَمْدَلَ"، "حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ" کہنے والے کے لئے "حَيْصَلَ"، "جُعِلْتُ فِدَاکَ" (میں آپ پر قربان ہو جاؤں) کہنے والے کے لئے "جَعْفَلَ"، "أطَالَ اللّٰهُ بَقَاءَ کَ"(اللہ آپ کی عمردراز فرمائے) کہنے والے کے لئے "طَبْقَلَ"، "أدَامَ اللّٰهُ عِزَّ کَ" (اللہ تعالیٰ آپ کا غلبہ ہمیشہ قائم رکھے) کہنے والے کے لئے "دَمْعَزَ" اور "حَيَّ عَلَى الفَلاَحِ" کہنے والے کے لئے" حَيْفَلَ" کہا جاتا ہے۔ ان سب میں سے مُطَرِّز نے صرف " حَيَّ عَلَى الصَّلاَةِ" کہنے کے لئے "حَيْصَلَة" کہنے کا ذکر نہیں کیا۔

آٹھویں بحث: ہر کام سے پہلے بسم اللہ کہنا

شریعت نے کھانے، پینے، قربانی کرنے، حقوق زوجیت کی ادائیگی، طہارت اور بحری سفر وغیرہ تمام افعال کے شروع میں بسم اللہ پڑھنے کی ترغیب دی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ﴾[الأنعام: ٦:١١٨] (سو اس میں سے کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا جائے)۔ نیز فرمایا: ﴿وَقَالَ ارْكَبُوا فِيهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرِيْهَا وَمُرْسَاهَا﴾[هود: ١١:٤١](حضرت نوح علیہ السلام نے) کہا: اس میں سوار ہو جاؤ اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اس کا ٹھہرنا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۵۸] أَغْلِقْ بَابَكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَأَطْفِئْ مِصْبَاحَكَ وَ اذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَخَمِّرْ إِنَاءَ كَ

[۱۵۸] صحیح بخاری: كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده ۳:۱۱۹۵، باب خير مال المسلم علم يتبع بها شعف الجبال ۳:۱۲۰۳، كتاب الأشربة، باب تغطية الإناء ۵:۲۱۳۱، صحیح مسلم: كتاب الأشربة، باب الأمر بتغطية الإناء وإيكاء السقاء۳:۱۵۹۵، صحیح ابن حبان: كتاب الطهارة، باب الأوعية ۴:۸۸، سنن ابو داؤد: كتاب الأشربة، باب في إيكاء الآنية ۳:۳۳۹، صحیح ابن خزیمہ: كتاب الوضوء، باب الأمربتسميةاللّٰه عزوجل عندتخميرالأواني والعلة التي......۱:۶۸، شعب الإيمان، التاسع والثلاثون...... تخمير الإناء وإيكاء السقاء ۵:۱۲۶، مسند احمد: مسند جابر بن عبداللّٰه ۴:۲۶۳۔ قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ سب احادیث کا مفہوم ایک ہی ہے۔

۱۔ ابن سکیت: ابویوسف یعقوب بن اسحاق بغدادی (م۲۴۴ھ) بڑے ادیب، نحوی اور عالم قرآن تھے۔امام کسائی کے شاگرد اور خلیفہ متوکل عباسی کے مقربین میں سے تھے اور اسی نے بغداد میں انہیں قتل کروا دیا معجم المؤلفين ۱۳: ۲۴۳ .... بقیہ آئندہ صفحہ پر

وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ وَأَوكِ سَقَاءكَ وَاذْكُرِ اسْمَ اللّٰهِ۔

اپنا دروازہ بند کر دو اور اللہ کا نام لو، اپنا چراغ بجھا دو اور اللہ کا نام لو، برتن ڈھانپ دو اور اللہ کا نام لو، اپنی مشک کا منہ باندھ کر رکھو اور اللہ کا نام لو۔

نیز فرمایا:

[۱۵۹] لوأنّ أحَدَكُم إذَا أرَادَ أن يأتِيَ أهْلَهُ قالَ بِسمِ اللّٰهِ اللهُمَّ جَنِّبنَا الشيطانَ وجَنِّبِ الشيطانَ مارَزَقْتَنَا، فَإنّه إنْ يُقَدَّر بينهُمَا وَلَدٌ فِي ذلك لم يضره شيطانٌ أبَدًا۔

تم میں سے کوئی شخص جب اپنے اہل خانہ کے ساتھ حقوق زوجیت ادا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اگر وہ یہ دعا پڑھ لے: بِسمِ اللّٰهِ اللهُمَّ جَنِّبنَا الشيطانَ وجَنِّبِ الشيطانَ مارَزَقْتَنَا. یعنی اللہ کے نام سے۔ اے اللہ! شیطان کو ہم سے دور رکھ اور اس (اولاد) سے بھی دور رکھ جو تو ہمیں دے گا تو اگر اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر انہیں اولاد دینا مقدر فرمایا ہوگا تو اس اولاد کو شیطان کبھی نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بن ابی سلمہ(۱) کو ارشاد فرمایا تھا:

بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ

۲۔ ناصر الدین ابوالفتح عبدالسید بن علی الخوارزمی المطرزی (م۶۱۰ھ) صاحب کتاب المغرب في ترتيب المعرّب علوم لغت کے ماہر تھے۔ الاقناع اور مختصر اصلاح المنطق وغیرہ ان کی مشہور تالیفات ہیں۔ معجم المؤلفین ۵: ۲۳۲، ۱۳: ۷۱

۳۔ ابواسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم نیشاپوری ثعلبی (م۴۲۷ھ) لغت وتفسیر کے امام تھے۔ ان کو ثعالبی بھی کہا جاتا ہے ان کی تفسیر: الکشف والبیان عن تفسیر القرآن بہت مشہور ہے۔ معجم المؤلفین ۲: ۶۰

[۱۵۹] صحیح بخاری: كتاب التوحيد، باب السؤال بأسماء الله تعالى و الاستعاذة بها ۴: ۲۷۷، كتاب الوضوء، باب التسمية على كل حال وعندالوقاع ۱: ۶۵، كتاب بدء الخلق، باب صفة إبليس وجنوده ۳: ۱۱۹۳، كتاب النكاح، باب مايقول الرجل إذا أتى أهله ،كتاب الدعوات، باب مايقول إذا أتى أهله ۵: ۲۳۴۷۔ صحیح مسلم: كتاب النكاح، باب مايُستحب أنْ يقُولَ عندالجِماع ۲: ۱۰۵۸، سنن ابو داؤد: كتاب النكاح، باب في جامع النكاح ۲: ۲۴۹، جامع ترمذی: كتاب النكاح، باب مايقول إذا دخل على أهله ۳: ۴۰۱، سنن دارمی: كتاب النكاح، باب القول عندالجماع ۲: ۵۸۳، صحیح ابن حبان: كتاب الرقائق، باب الأدعية ۳: ۲۶۳، مسند احمد: مسند عبدالله بن العباسؓ ۱: ۳۵۸، مصنف عبدالرزاق: كتاب النكاح، القول عندالجماع وكيف يصنع وفضل الجماع ۶: ۱۹۳، سنن بیہقی: كتاب النكاح، باب مايقول الرجل إذا أراد أن يأتي أهله ۱۰: ۳۷۶

۱۔ یہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے تھے جن کی تربیت و پرورش نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں ہوئی۔ ان کی وفات ۸۳ھ میں ہوئی۔ الإصابة ۲: ۵۱۹

[۱۶۰] یاغُلامُ! سَمِّ اللّٰهَ و كُلْ بيَمِينِكَ وَكُلْ مِمَّايَلِيكَ۔
اے لڑکے! اللہ کا نام لو، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔

نیز ارشاد فرمایا:

[۱۶۱] إنَّ الشيطَانَ لَيستَحِلُّ الطَّعَامَ ألاّيُذكَرَ اسمُ اللّٰهِ عَليه۔
اگر کھانے پر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو شیطان کے لئے اس سے کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا:

[۱۶۲] مَنْ لَمْ يَذْبَحْ فَلْيَذْبَحْ باسمِ اللّٰهِ۔
جس نے پہلے ذبح نہ کیا ہو اسے چاہئے کہ اللہ کا نام لے کر ذبح کرے۔

ایک مرتبہ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں میرے جسم میں درد ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ارشاد فرمایا:

[۱۶۳] ضَعْ يَدَكَ عَلَى الذِي تألَّمُ مِنْ جَسَدِكَ وقُلْ بِسْمِ اللّٰهِ ثلاثًا، وقُلْ سَبْعَ مراتٍ: أعُوذُ بِعزّةِ اللّٰه وقُدرته مِنْ شَرِّما أجِدُ وأحَاذِرُ۔

---

[۱۶۰] صحیح بخاری: كتاب الأطعمة، باب التسمية على الطعام والأكل باليمين ۵:۲۰۵۶، صحیح مسلم: كتاب الأشربه، باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما ۳: ۱۵۹۹، سنن ابن ماجہ: كتاب الأطعمة، باب الأكل باليمين ۲:۱۰۸۷، سنن بیہقی: باب الأكل ممايليه ۱۱:۹۸، شعب الإيمان: التاسع والثلاثون...... الأكل ممايليه ۵:۷۷، مسند احمد: حديث عمر بن أبي سلمة رضی اللہ عنہ ۴:۲۰۶

[۱۶۱] صحیح مسلم: كتاب الأشربة، باب آداب الطعام والشراب وأحكامهما ۳: ۱۵۹۷، سنن ابوداؤد: كتاب الأطعمة، باب التسمية على الطعام ۳:۳۴۷، مسند احمد: حديث حذيفة بن اليمانؓ ۶:۵۲۸، شعب الإيمان، التاسع والثلاثون...... فصل في التسمية على... ۵:۷۴

[۱۶۲] صحیح بخاری: كتاب العيدين، باب كلام الإمام والناس في خطبة العيد ۱:۳۳۴، كتاب الأيمان والنذور، باب إذا حنث ناسيًا في الأيمان......۶:۲۴۵۶، كتاب التوحيد، باب السؤال بأسماء الله والاستعاذة بها ۶:۲۶۹۳، كتاب الذبائح والصيد والتسمية على الصيد، باب قول النبی صلی الله عليه وسلم: فليذبح على اسم الله ۳: ۳۱۰، صحیح مسلم: كتاب الأضاحي، باب و قتها ۳: ۱۵۵۱، مسند احمد: حديث جندب البَجليؓ ۵:۴۰۵، سنن بیہقی: كتاب صلاة العيدين، باب الإمام يعلمهم في خطبة عيدالأضحى... ۵:۹۹

[۱۶۳] صحیح مسلم: كتاب السلام، باب استحباب وضع يده على موضع الألم مع الدعاء ۴: ۱۷۲۸، سنن ابن ماجہ: كتاب الطب، باب ماعوذبه النبی صلی الله عليه وسلم ۲: ۱۱۶۳۔ امام مالکؒ، ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبان سب حضرات نے اسے نقل کیا ہے۔

اپنا ہاتھ جسم کے درد والے حصے پر رکھو پھر تین بار بسم اللہ پڑھو۔ اس کے بعد سات مرتبہ یہ دعا پڑھو: أعُوذُ بِعِزَّةِ اللّٰهِ وَقُدرَتِه مِنْ شَرِّمَا أجِدُ واحَاذِرُ" یعنی میں اللہ کی عظمت اور قدرت کی پناہ چاہتا ہوں اس تکلیف سے جو مجھے ہے اور اس سے بھی جس کا مجھے خوف ہے۔

یہ تمام احادیث صحیحین میں سے کسی نہ کسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ امام ابن ماجہؒ اور ترمذیؒ نے بھی نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۱۶۴] سَتْرُ مابَينَ الجِنِّ وعَوراتِ بَني آدم إذا دَخلَ الكنِيفَ أن يَّقُولَ بِسْمِ اللّٰهِ۔

جب کوئی شخص پیشاب پاخانہ کے لئے جاتا ہے تو اس کی شرمگاہ اور جنات کے درمیان پردے کی صرف ایک صورت ہوتی ہے اور وہ یہ کہ وہ بندہ بسم اللہ پڑھ لے۔

امام دارقطنیؒ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتی ہیں:

[۱۶۵] كانَ رسولُ اللّٰه صلى الله عليه وسلم إذا مَسَّ طُهُوره، سمَّى اللّٰهَ تعالى، ثم يُفرِغُ الماء على يديه۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب استنجاء کا ارادہ فرماتے تو بسم اللہ پڑھتے اور پھر اپنے ہاتھوں پر پانی بہاتے۔

بسم اللہ پڑھنے سے فرقہ قدریہ کا رد

ہمارے علماء فرماتے ہیں کہ اس میں فرقہ قدریہ اور ان تمام لوگوں کا رد ہے جو کہتے ہیں کہ ان کا ہر عمل ان کے مقدّر میں لکھا ہوتا ہے۔ ہر کام کے آغاز میں بسم اللہ پڑھنے کے حکم میں ان کے موقف کا رَد ہے۔ بسم اللہ سے مراد یہ ہے کہ یہ کام جسے اللہ نے پیدا کیا اور اسی نے اس کا اندازہ مقرر کیا، اسی کے نام سے شروع کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس میں جہاں تک پہنچانا مناسب سمجھے پہنچا دے۔ اس کی مزید تفصیل اِن شاء اللہ آئندہ آئے گی۔

---

[۱۶۴] سنن ابن ماجہ: كتاب الطهارة، باب ما يقولُ إذا دخلَ الخلا ۱: ۱۰۹، جامع ترمذی: أبواب الصلاة، باب ذكر من التسمية عند دخول الخلاء. امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث "غریب" ہے اور اس سند کے علاوہ ہمیں کہیں نہیں ملی۔ شیخ احمد شاکر نے جامع ترمذی پر اپنے حاشیہ میں اسے کم از کم "حَسَن" کہا ہے۔ البانیؒ نے بھی اپنی کتاب "الارواء" میں اسے صحیح کہا ہے۔

[۱۶۵] سنن دارقطنی: كتاب الطهارة، باب التسمية على الوضوء ۱: ۷۲، اس حدیث کے راوی حارثہ بن محمد کے ضعف پر اکثر علماء رجال کا اتفاق ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں مجھے خبر ملی ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے مسند اسحاق ابن راہویہ کو کھولا تو اس میں پہلی حدیث استفتاح نماز کے بارے میں انہی کی روایت سے نظر پڑی جس پر انہوں نے فرمایا: یہ قطعاً ناقابل اعتبار ہے۔ تهذيب التهذيب ۲: ۵۶۵

اس کا ایک مفہوم یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ''میں اللہ ہی کی مدد، اسی کی توفیق اور اسی کی برکت سے اس کام کی ابتدا کرتا ہوں''۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بندوں کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ قراءت اور دیگر اعمال کی ابتداء کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا کریں تا کہ ان کا افتتاح اللہ تبارک وتعالیٰ کی تائیدونصرت سے ہو جائے۔

دسویں بحث: لفظ ''اسم'' زائد ہے یا مقصود؟

ابو عبیدہ مَعْمَر بن الْمُثَنّٰی [۱] کی رائے یہ ہے کہ یہاں لفظ ''اسم'' زائد ہے۔ انہوں نے دلیل کے طور پر لبید کا یہ شعر پیش کیا:

إِلَى الحَولِ ثُمَّ اسمَ السلامِ عَليكُمَا وَمَن يَبْكِ حَولاً كامِلاً فقدِ اعتذَر [۲]

اب سال بعد پھر تمہیں سلام کریں گے اور جو شخص پورا سال روتا رہتا ہے اس کا عذر قابل قبول ہے۔

اس شعر میں لفظ ''اسم'' زائد ہے اور اصل عبارت: "ثُمّ السلامُ عَليكُما" ہے۔ ہمارے بعض علماء نے لبید کے اس شعر میں اسم سے مراد مُسَمّٰی یعنی صاحبِ اسم لیا ہے۔ اس کا تفصیلی بیان کچھ اس باب میں اور کچھ اس کے بعد ان شاء اللہ آئے گا۔

گیارہویں بحث: یہاں لفظ ''اسم'' زائد لانے کا مقصد؟

یہاں زائد لفظ ''اسم'' کا مقصد متعین کرنے میں اختلاف ہے۔ قُطرب [۳] کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کے ذکر کی جلالتِ شان اور تعظیم کے پیشِ نظر اسے لایا گیا۔ اخفش کہتے ہیں: اگر اصل لفظ "باللّٰہ" لایا جاتا تو اس سے قسم کا معنی پایا جاتا، اس سے بچنے کے لئے لفظ اسم کا اضافہ کر دیا گیا تا کہ اس سے قسم کے بجائے برکت کا مفہوم پیدا ہو۔

۱۔ ابوعبیدہ معمر بن المثنی التیمی البصری (م ۲۰۸ھ) لغت ونحو کے امام تھے۔ روایتِ حدیث میں صدوق ہیں البتہ انسابِ عرب اور تاریخی وقائع میں ان کی مہارت مسلم ہے۔ تھذیب التھذیب: ۱: ۲۴۶

۲۔ ابن النحاس: شرح القصائد المشھورات ص ۱۲۷

۳۔ محمد بن مستنیر بصری (م ۲۰۶ھ) غلام تھے۔ سیبویہ اور بصرہ کے دیگر اہل علم سے استفادہ کیا اور لغت کے بڑے علماء میں شمار ہوئے۔ مذھباً اعتزال کی طرف کچھ میلان رکھتے تھے۔ صبح سویرے اپنے شیخ سیبویہ کے پاس پہنچ جاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے کہہ دیا: تم تو قطرب ہو، اسی سے یہ لقب پڑ گیا کیوں کہ قطرب ایک دائم الحرکت کیڑے کو کہتے ہیں۔ تاریخ آداب العربیۃ ۲: ۱۲۷، معجم المؤلفین ۱۲: ۱۵

بارہویں بحث: بسم اللہ کی باء کا مقصد اور اس کا اعراب

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا ''باء'' یہاں امر کے معنی میں ہے یعنی : "اِبدأبسم اللّٰه" (اللہ کے نام سے شروع کرو) یا خبر کے معنی میں ہے اور اصل عبارت یوں ہے: "ابتَدأتُ بِسم اللّٰه" (میں نے اللہ کے نام سے ابتداء کی)۔ یہ دونوں اقوال منقول ہیں۔ پہلا قول فراء [1] کا ہے اور دوسرا زجاج [2] کا۔

ان دونوں اقوال کی بناء پر بسم اللہ محل نصب میں ہے۔ ایک رائے کے مطابق یہاں تقدیر عبارت "ابتِدائي بِسمِ اللّٰه" (میرے اس کام کی ابتدا اللہ کے نام سے ہے)۔ اس لحاظ سے بسم اللہ مبتداء کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ:"ابتدائي" کی خبر بھی محذوف ہے جو کہ "مُستَقِرٌ" یا "ثابِتٌ" ہے۔ اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو ظاہراً پڑھا جائے تو بسم اللہ "مستقِر"یا"ثابِت" کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: "زيدٌ في الدار" [3]۔

اسی طرح قرآن مجید میں ہے:﴿فَلَمَّا رَآهُ مُسْتَقِرًّا عِنْدَهُ قَالَ هٰذَامِنْ فَضْلِ رَبِّي﴾ [النمل ۲۷: ۴۰] (پھر جب انہوں نے اسے اپنے پاس رکھا دیکھا تو بولے: یہ بھی میرے پروردگار کا ایک فضل ہے)۔ اس میں بھی ''عنده'' محلِ نصب میں ہے۔ یہ بحث بصرہ کے علماءِ نحو سے منقول ہے۔ ایک اور قول کے مطابق تقدیر عبارت اس طرح ہے: "اِبتِدَائي بِبِسْمِ اللّٰهِ مَوجودٌ أو ثَابِتٌ"یعنی میرا بسم اللہ سے ابتداء کرنا ثابت ہے یا موجود ہے۔ اس صورت میں "بِسْمِ" کا محل نصب میں ہونا'' ابتدائي" مصدر کی وجہ سے ہوگا۔

تیرہویں بحث: بسم اللہ لکھنے کا طریقہ

"بِسْمِ اللّٰهِ" کو بغیر الف لکھا جاتا ہے کیوں کہ بولتے اور لکھتے وقت باءِ الصاق اس کی جگہ کافی ہوجاتا ہے اور کثرت استعمال کی وجہ سے الف کوحذف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس ارشاد باری تعالیٰ:

۱۔ امام ادب محمد بن عبدالوہاب نیشاپوری (م۲۷۲ھ) نے لغت اصمعیؒ سے اور حدیث امام مدینیؒ سے سیکھی۔ امام مسلمؒ نے انہیں ثقہ صدوق کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۹: ۳۱۹

۲۔ ابراہیم بن محمد بن سری(م۳۱۰ھ) نحو و ادب کے امام تھے۔شیشے کی صنعت کرتے تھے اس لئے زجاج مشہور ہوئے۔ انہوں نے مبرد سے علم حاصل کیا اور ان کی فقیری کی وجہ سے ان کی مالی امداد بھی کرتے تھے۔ معاني القرآن اور أمالي وغیرہ ان کی بہت سی تصنیفات ہیں۔تاريخ آداب اللغة العربية۲:۱۸۵،معجم المؤلفين ۱:۳۳،۱۳: ۲۴۳۵۵۔

۳۔ اس میں بھی عبارت مقدر مان کر کہا جاتا ہے۔"زيدٌ مستقِر في الدار" یا "زيدٌ ثابتٌ في الدار" یعنی زید گھر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ "ابتدائي ثابت" یا "ابتدائی مستقِر بسم الله" کا معنی بھی یہ ہوگا کہ میرا ابتدا کرنا واقع ہوا ہے اللہ کے نام کے ساتھ۔ واللہ اعلم۔

﴿اِقْرَاْبِاسْمِ رَبِّکَ﴾ [العلق ۹۶: ۱] میں قلّتِ استعمال کی وجہ سے لکھنے میں الف حذف نہیں کیا جاتا۔ رحمان اور قاھر کا الف حذف کرنے (رحمٰن اور قھر) میں بھی اختلاف ہے۔ کسائی اور سعید الاخفش ان میں بھی الف حذف کرنے کے قائل ہیں مگر یحییٰ بن وثاب کہتے ہیں کہ "بِسْمِ اللّٰہِ" کے علاوہ کہیں بھی الف حذف نہ کیا جائے کیوں کہ کثرت استعمال صرف اسی میں پایا جاتا ہے۔

چودھویں بحث: حرف باء کو کسرہ دینے کی وجہ

باء جارہ کو کسرہ دینے میں تین اقوال ہیں: ایک یہ کہ اس کا تلفظ بھی اس کے عمل کے مطابق ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ چوں کہ باء صرف اسماء پر داخل ہوتی ہے اور کسرہ اسماء کی خصوصیات میں سے ہے اس لیے اسے بھی کسرہ دے دیا گیا۔ اس کی تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس میں اور ایسے حروف میں فرق واضح ہو جائے جو کبھی کبھی بطور اسم استعمال ہوتے ہیں جیسے درج ذیل مصرع میں "کاف" استعمال ہوا ہے:

وَرُحْنَا بِكابْنِ الماءِ يُجَنبُ وَسْطَنَا[1]

اور اس طرح گئے جیسے پانی میں رہنے والی مخلوق۔

پندرھویں بحث: اسم کی صرفی تحقیق

"اِسْمٌ" "اِفْعٌ" کے وزن پر ہے اور اس میں "واؤ" محذوف ہے کیوں کہ یہ اصل میں "سَمَوتٌ" سے ماخوذ ہے۔ اس کی جمع "اسماءٌ" اور تصغیر "سُمَیٌّ" آتی ہے۔ "اِسْمٌ" کے اصل میں اختلاف ہے: بعض کہتے ہیں اس کا وزن "فِعْلٌ" اور بعض کے نزدیک "فُعْلٌ" ہے۔ علامہ جوہریؒ کہتے ہیں: اس کی جمع "أسماء" بھی انہی اوزان سے آتی ہے جیسے جِذْعٌ سے أجْذَاعٌ اور قُفْلٌ سے أقفالٌ۔ اس کا یہ وزن صرف سماع سے ثابت ہے۔ پھر اس کو چار طرح سے بولا جاتا ہے۔ کسرہ کے ساتھ "اِسمٌ" اور ضمہ کے ساتھ "اُسمٌ"۔ احمد بن یحییٰ کہتے ہیں: جو اسے ضمہ کے ساتھ پڑھنے کے قائل ہیں ان کے نزدیک یہ "سَمَوتُ أسْمُو" سے ماخوذ ہے اور جو اس میں کسرہ کے قائل ہیں ان کے نزدیک اس کی اصل "سَمیتُ أسْمَی" ہے۔ ان دو صورتوں کے علاوہ اسے "سِمٌ" اور "سُمٌ" بھی پڑھا جاتا ہے۔ جس کی تائید میں درج ذیل شعر پیش کیا جاتا ہے:

1۔ یہ امرؤالقیس کا شعر ہے جس کا دوسرا مصرع: "تُصَوِّبُ فيه العينُ طورًا وتَرتَقِي" ہے۔ رافعی: تاریخ آداب العرب ۳: ۱۹۱ یعنی جس طرح اس پر کبھی کبھار نظر پڑ جاتی ہے اور کبھی بغیر دیکھے گزر جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے درمیانے حصہ تک بھی کسی کی پہنچ نہیں ہوتی۔

وَاللّٰہُ أَسْمَاكَ سُمًا مُبَارَکاً آثَرَكَ اللّٰہُ بِهِ إِیثَارَکَا[1]

اللہ تعالیٰ نے ایک مبارک نام آپ کو دیا ہے۔ اس ذات عالی نے اس مبارک نام کے لیے بھی آپ کو اسی طرح ترجیح دی ہے آپ کی ذات کو ترجیح حاصل ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

وَعَامُنَا أَعجَبنَا مَقدمهُ یُدْعَی أَبَا السَّمحِ وَقِرضَابٌ سُمُهُ

مُبْتَرِکاً لِکُلِّ عَظْمٍ یَلحُمُهُ[2]

اس سال کے آنے سے ہم حیرت زدہ ہیں۔ یہ مشہور تو اُبو السمح (درگزر کرنے والا ہے) مگر اس کا نام "قِرضاب" (خشک چیزوں کو کھانے والا) ہے اور اس کا کام یہ ہے کہ ہر ہڈی کو پکڑتا ہے اور اس وقت تک نہیں چھوڑتا جب تک اس سے گوشت پوری طرح نوچ نہ لے۔

کہا جاتا ہے: "قرضَبَ الرَّجُلُ: إذا أکَلَ شَیئًا یابسًا" یعنی اس نے خشک چیز کھائی۔ اسی وجہ سے اسے "قِرضَابٌ" کہا جاتا ہے۔ اور یہاں جو لفظ "سمه" استعمال ہوا ہے اسے ضمہ کے ساتھ سُمُهُ" اور کسرہ کے ساتھ "سِمُهُ" دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ اس کی تائید کے لیے دوسرے شاعر کا قول ہے:

"بِاسِمِ الَّذِی فِی کُلِّ سُورَةٍ سُمُهُ"

اس ذات کے نام کے ساتھ جس کا نام ہر سورت میں ہے۔

"بِسْمِ" کا سین ساکن پڑھا جاتا ہے جو کہ خلاف قیاس ہے اور اس کا الف وصلی ہے۔ بعض شعراء نے ضرورت شعری کے تحت اسے ہمزہ قطعی کے طور پر بھی استعمال کیا ہے جیسا کہ اَحوص[3] کا قول ہے:

وما أنَا بالْمَخسُوسِ فِي جِذمِ مالِكٍ ولاَمَنْ تَسَمَّی ثم یلتزم الاسمَا

میں مالک کی نسل میں کسی عیب سے رسوا نہیں ہوں، نہ ہی میں ایسا آدمی ہوں جس نے اپنے لیے کوئی نام گھڑ لیا اور پھر اسی کو مستقل طور پر اپنا لیا۔

۱۔ ابن منظور نے اسے غیر منسوب ذکر کیا ہے۔لسان العرب "سما"

۲۔ لسان العرب "سما"۔

۳۔ اَحوص بن محمد بن عاصم (م۱۰۵ھ) قبیلہ اوس میں سے تھا۔ اس کے شعر کا موضوع عام طور پر لہو ولعب اور ہجو گوئی ہوتا تھا مگر اس کی شاعری بے ہودگی سے پاک اور چاشنی سے بھرپور تھی۔ المؤتلف و المختلف ص ۵۷، تاریخ آداب اللغة العربیة ۱:۲۹۲

سولھویں بحث: اسم کی طرف نسبت اور اس کی جمع

اسم کی طرف نسبت کرتے وقت عرب کہتے ہیں: سُمَوِیٌّ" اس کو اصلی حالت پر چھوڑ کر "اسمِیٌّ" بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسم کی جمع اسماءٌ اور جمع الجمع "اسامٍ" آتی ہے۔ فرّاء نے لکھا ہے: "أُعِیْذُکَ بِاسماوَاتِ اللّٰہ" (میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ناموں کی پناہ میں دیتا ہوں)۔

سترہویں بحث: لفظ اسم کا ماخذ

اسم کے ماخذ کے بارے میں دو طرح کی آراء پائی جاتی ہیں:

علماءِ بصرہ کی رائے

علماءِ بصرہ کہتے ہیں یہ "سُمُوٌّ" سے مشتق ہے جس کا معنی رفعت اور بلندی ہے۔ اس لحاظ سے کسی بھی نام کو "اسمٌ" کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مسمّٰی اس نام کے ذریعے بلند مقام پاتا ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ نام اپنے "مُسَمّٰی" کو دوسروں سے ممتاز کر دیتا ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ یہ چوں کہ اپنی قوت کی بنا پر فعل اور حرف سے بلند مقام رکھتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اسم بالاتفاق "فعل اور حرف" سے زیادہ قوی ہے کیوں کہ یہی اصل ہے اور ان دونوں سے بلند تر ہونے کی وجہ سے ہی اسے "اسم" کہا جاتا ہے۔ اس بارے میں یہی تین اقوال ہیں۔

علماءِ کوفہ کی رائے

علماءِ کوفہ کہتے ہیں: یہ "سِمَةٌ" سے مشتق ہے جس کا معنی علامت ہے اور اسم بھی اپنے مُسَمّٰی کی علامت ہوتا ہے۔ اس رائے کے مطابق "اسم" کی اصل "وَسمٌ" ہے مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے کیوں کہ اس سے جب تصغیر بنائی جائے تو "سُمَیٌّ" اور اس کی جمع "أسماء" آتی ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جمع اور تصغیر میں الفاظ اپنے اصل کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ اس کی تصغیر میں "وُسَیمٌ" اور جمع میں أوسَامٌ" نہیں کہا جاتا۔ اس بات کی تائید اختلاف آراء کے نتائج سے بھی ہوتی ہے جیسا کہ ذیل میں آ رہا ہے۔

اٹھارہویں بحث: اسم کے ماخذ میں اختلاف کا خلاصہ

جن علماء کی رائے میں "اسمٌ" رفعت اور بلندی سے مشتق ہے ان کا کہنا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات مخلوق کے وجود سے پہلے بھی اسی طرح موجود تھیں جس طرح ان کی پیدائش کے بعد ہیں اور وہ ان کے فنا ہو

جانے پر بھی اسی طرح موجود رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات میں مخلوق کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی دخل نہیں۔ یہی اہل سنّت کا عقیدہ ہے۔

معتزلہ کا موقف

جو لوگ اسے "سِمَةٌ" سے مشتق مانتے ہیں ان کی رائے یہ ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کا نہ کوئی نام تھا نہ کوئی صفت۔ جب انہوں نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو اس نے اللہ تعالیٰ کے نام بھی رکھے اور صفات بھی بنائیں۔ جب وہ اس مخلوق کو ختم کر دیں گے تو ان کے اپنے نام اور صفات بھی ختم ہو جائیں گے۔ یہ معتزلہ[1] کا قول ہے۔ یہ رائے پوری امت کی متفقہ رائے کے برعکس ہے۔ بلکہ ان کا یہ موقف تو کلام باری تعالیٰ کے بارے میں ان کے اس قول سے بھی زیادہ غلط ہے کہ اللہ کا کلام مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بہت بلند ہے۔ اسی اختلاف کی بنیاد پر اسم اور مسمّی کا اختلاف پیدا ہوا جس کا بیان حسب ذیل ہے:

انیسویں بحث: اسم اور مسمّٰی کے بارے میں مختلف مواقف

اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ اسم ہی دراصل مُسمّٰی ہے جیسا کہ قاضی ابوبکر بن طیب نے ذکر کیا ہے۔ ابن فورک[2] بھی اسی سے متفق ہیں اور ابوعبیدہ اور سیبویہ[3] کا قول بھی یہی ہے۔ چناں چہ اگر کوئی کہتا ہے: "اللّٰہ عالمٌ" (اللہ تعالیٰ عالم ہے) تو اس کا عالم کہنا ہی اس ذات کے وجود کی دلیل ہے جو صفتِ علم سے متصف ہے۔ اب مذکورہ مثال میں علم والا ہی بذاتِ خود مُسمّٰی بھی ہے۔ اسی طرح جب کہا جائے: "اَللّٰهُ خَالِقٌ" (اللہ تعالیٰ پیدا کرنے والے ہیں) تو اس میں بھی پیدا کرنے والا خود اللہ تعالیٰ ہے اور وہی اسم بھی ہے۔ اس طرح اہلِ حق کے نزدیک اسم اور مُسمّٰی ایک ہی چیز ہیں اور ان کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

۱۔ یہ فرقہ اموی دور میں پیدا ہوا اور عباسی دور کے ایک عرصہ تک امت مسلمہ کے لیے درد سر بنا رہا۔ اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ ان کا بانی واصل بن عطاء تھا۔ ان کے پانچ اصول توحید، عدل، وعدہ و وعید، امر بالمعروف نہی عن المنکر اور منزلہ بین المنزلتین مشہور ہیں۔ تاریخ المذاہب الإسلامیۃ ۱:۱۴۷

۲۔ ابوبکر محمد حسن بن فورک (م۴۰۶ھ) شافعیہ کے بڑے فقہاء میں سے تھے۔ بہت بڑے متکلم، اصولی، ادیب اور نحوی تھے۔ طبیعت میں ہیبت و جلال کے باوجود تقویٰ اور خداترسی میں امتیازی شان رکھتے تھے۔ اصولِ فقہ اور معانی قرآن وغیرہ میں ان کی تقریباً ایک سو تصانیف ہیں۔ الفتح المبین، ۱:۲۳۵۔ معجم المؤلفین ۹:۲۰۸

۳۔ سیبویہ: ابو بشر عمرو بن عثمان (م۱۷۷ھ) فارس میں پیدا ہوئے اور بصرہ میں نشوونما پائی۔ نحو میں خلیل نحوی سے خوب استفادہ کیا۔ ان کی "الکتاب" صدیوں سے منفرد مرجع کی حیثیت رکھتی ہے۔ زیات: تاریخ الادب العربی ص ۴۱۸

صفات کے قائلین اور منکرین کے موقف

ابن حصار[1] کہتے ہیں: جو اہلِ بدعت صفات کا انکار کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اسماء کا مدلول براہ راست مسمی کی ذات ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ اسم اور مسمی کو الگ الگ سمجھتے ہیں۔ جبکہ صفات کے قائلین کا کہنا ہے کہ اسماء کی مدلول ذات نہیں بلکہ ذات کی صفات ہوتی ہیں اور صفات الفاظ نہیں بلکہ اصل اسماء کا نام ہے۔ اس کی مزید تفصیل سورۂ بقرہ اور اعراف میں اِن شاء اللہ آئے گی۔

بیسویں بحث: لفظ جلالت ''اللہ'' کی حیثیت

لفظ ''اللہ'' مولیٰ سبحانہ و تعالیٰ کے تمام اسماء مبارکہ میں سب سے عظیم تر ہے۔ بعض علماء نے اسی کو اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم قرار دیا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ نام ذات باری کے علاوہ کسی کا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ نہ اس سے تثنیہ آتا ہے نہ جمع۔ یہی ارشاد باری تعالیٰ: ﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ [مريم ١٩:٦٥] کے دو معانی میں سے ایک ہے۔ مطلب یہ کہ کیا آپ کے علم میں ایسی کوئی ہستی ہے جس کا نام ذاتِ باری تعالیٰ کی طرح ''اللہ'' ہو۔ چناں چہ ''اللہ'' اس ذات کا نام ہے جو موجود برحق ہے۔ الوہیت کی جملہ صفات اس کی ذات میں جمع ہیں۔ اسی کو ربوبیت کے تمام مفاہیم و معانی کی نسبت سجتی ہے اور وہ اکیلا ہی ہے جس کا وجود حقیقی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات پاک ہے۔

''اللہ'' کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ: وہ ذات جو عبادت کے لائق ہے۔ بعض کہتے ہیں، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ واجب الوجود ہستی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور ان سب سے مراد ایک ہی ہے۔

اکیسویں بحث: لفظ ''اللہ'' کے ماخذ کی تحقیق

اس اسم کے اشتقاق کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ مشتق ہے یا ذاتِ باری کے لئے بطور علَم بنایا گیا ہے۔

قائلین اشتقاق کا موقف

بہت سے اہلِ علم اس کے اشتقاق کے قائل ہیں مگر اس کے اصل اشتقاق میں ان کا بھی اختلاف ہے۔

۱۔ قاضی ابوالمطرّف عبدالرحمٰن بن احمد بن سعید (م۴۲۲ھ) المعروف ابن الحصار اپنے وقت میں فقہ مالکی کے مرجع اور تقویٰ و بزرگی کی مثال تھے۔ شجرة النور الزكية ۱:۱۱۳

چناں چہ سیبویہ نے خلیل[1] سے نقل کیا ہے کہ لفظ "اللّٰہ" اصل میں "إلاهٌ" بروزن "فِعَالٌ" ہے جس کے شروع سے ہمزہ ہٹا کر الف لام لگا دیا گیا تو "اللّٰہ" بن گیا۔ سیبویہ کہتے ہیں: یہ اسی طرح ہے جس طرح "أُناسٌ" کے شروع سے ہمزہ ہٹا کر "نَاسٌ" بنا دیا گیا ہے۔ایک رائے یہ ہے کہ "اللّٰہ" اصل میں "لَاہٌ" تھا جس پر تعظیم کے لئے الف لام داخل کر دیا گیاتو "اللّٰہ" ہوگیا۔ سیبویہ نے بھی اسی رائے کو اپنایا ہے اور اس کی تائید کے لئے یہ شعر پیش کیا ہے:

لَاہِ ابنُ عَمِّكَ لَاأفضلتَ فِي حَسبٍ　　عَنِّي وَلا أنتَ دَيَّانِي فَتَخزُونِي[2]

تمہارے چچازاد بھائی کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔تم نہ تو نسب میں مجھ سے افضل ہو اور نہ میرے نگران ہو کہ میرے معاملات تمہارے ہاتھ میں ہوں۔

شعر کی روایت میں اسی طرح خاء کے ساتھ "فَتَخزُونِي" منقول ہے جس کا معنی ''معاملات چلانا'' ہے۔

کسائی[3] اور فرّاء کہتے ہیں: ''بسم اللہ'' اصل میں "بسم الإلٰہ" تھا۔ اس کا ہمزہ حذف کر کے پہلے لام کو دوسرے میں مدغم کر دیا گیا جس سے وہ مشدّد ہوگیا۔ اس کی مثال اسی طرح ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لٰكِنَّا هُوَ اللّٰهُ رَبِّي﴾[الکهف ۱۸ : ۳۸] یہ بھی اصل میں "لٰكِنْ أنا" تھا۔ حسنؒ نے اسے اسی طرح پڑھا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ "وَلَہَ" سے مشتق ہے جس کا معنی حیران ہونا ہے اور "وَلَہٌ" عقل زائل ہو جانے کو کہا جاتا ہے۔ چناں چہ کہا جاتا ہے: ''رَجُلٌ وَالِهٌ وامْرأةٌ والِهَةٌ وَوَالِهٌ" حیران و سرگرداں مرد، حیران و عقل رفتہ عورت اور اسی طرح کہا جاتا ہے: مَاءٌ مُولَہٌ": وہ پانی جو صحراؤں میں کھلا چھوڑ دیا گیا ہو۔اس تسمیہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفات کی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش اور اس کی معرفت کی فکر میں عقلیں حیران رہ جاتی ہیں اور سوچنے کی طاقت کھو بیٹھتی ہیں۔ اس لحاظ سے "إلٰہٌ" اصل میں "وِلَاہٌ" تھا اور اس کا ہمزہ واؤ سے تبدیل شدہ ہے جیسا کہ "إشاحٌ" (تلوار-کمان) اور إسادةٌ (تکیہ) میں ہے جو اصل میں "وِشاحٌ" اور "وِسَادَةٌ" تھے۔ یہ بات خلیل سے بھی منقول ہے۔

ضحاکؒ کہتے ہیں: ''اللہ'' کو إلٰہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنی حاجات لے کر اسی کے سامنے پیش کرتے اور مشکلات میں اسی کے سامنے گڑگڑاتے ہیں۔ خلیل ابن احمدؒ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: "لأنَّ الخلْقَ يَألَهُونَ إليه (بنصب اللام) ويَألِهُونَ (بكسرها). یعنی انہوں نے "یألَھون" لام کی زبر کے ساتھ اور "یَألِھُونَ" لام کی زیر کے ساتھ دونوں طرح جائز قرار دیا ہے۔ یہ دونوں لغتیں موجود ہیں۔

۱۔ ابو عبدالرحمٰن خلیل بن احمد بن عمر الفراہیدی (م۱۷۰ھ) لغت و نحو کے امام اور علم عروض کے بانی ہیں۔ معجم المؤلفین۴: ۱۱۲

۲۔ یہ شعر ذوالاصبع حرثان بن حارث العدوانی المضری کا ہے جو بڑے جاہلی شعراء میں سے ہے۔ اس نے لمبی عمر پائی اور بعثت سے پہلے ہی فوت ہوگیا۔ المنتخب في أدب العرب۴: ۶۲

۳۔ ابوالحسن علی بن حمزہ الکسائی (م۱۸۹ھ) نحو میں کوفی مکتب فکر کے امام تھے۔ انہوں نے قراءت حمزہ زیات سے سیکھی اور اس میں اپنی الگ راہ قائم کی جس کی وجہ سے ان کا شمار بھی قرّاء سبعہ میں ہوا۔ زیات: تاریخ الأدب العربي ص ۴۲۰

ایک رائے یہ ہے کہ یہ ''لاہ'' بمعنی بلندی سے ماخوذ ہے۔ عرب ہر بلند چیز کو ''لاہ'' کہتے تھے چناں چہ جب سورج طلوع ہوتا تو کہتے: ''لاھتِ الشَّمسُ''۔ ایک اور رائے کے مطابق یہ ''أَلَهَ الرَّجُلُ: إذاتعبد'' یعنی ''أَلَهَ'' بمعنی عبادت کی اور ''تألّه: إذاتَنسَّکَ'' یعنی زہدوعبادت کی راہ اختیار کی سے ماخوذ ہے۔ اسی معنی میں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَیَذَرَکَ وَآلِھَتَکَ﴾[الأعراف ۷:۱۲۷] کی یہ قراء ت ہے جس میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر حضرات کے قول کے مطابق ''آلِھَتَکَ'' کا معنی ''عِبادتَکَ'' (یعنی آپ کو بھی چھوڑ دے اور آپ کی عبادت کو بھی) ہے۔ اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ لفظ اللہ مشتق ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ مقصود بالعبادت وہی ذات ہے۔ یہی مراد موحدین کے اس قول سے بھی ہے: لاإلٰهَ إلاّاللّٰهُ'' یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کلمہ میں ''إلاّ'' کا معنی ''غیر'' ہے۔ یہ استثناء کے معنی میں نہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ''اللّٰه'' میں اصل تو صرف اس کی آخری ''ھاء'' ہے جو غائب پر دلالت کرتی ہے۔ ان کے نزدیک وجود باری تعالیٰ کا جو تصور ان کی عقل کی گہرائیوں میں پختہ تھا اسی کی طرف انہوں نے ایک حرف سے اشارہ کر دیا۔ پھر اس کی صفت ملکیت ظاہر کرنے کے لئے ''ھاء'' سے پہلے ''لام'' لگا دیا گیا کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ وہی اشیاء کو پیدا کرنے والا ہے اور وہی ان کا مالک ہے۔ اس طرح یہ لفظ ''لَهُ'' بن گیا پھر اس کی عظمت اور علوشان کے اظہار کے لئے اس کے شروع میں الف لام کا اضافہ کر دیا گیا۔

عدمِ اشتقاق کے قائلین کی رائے

یہ بھی علماء کی ایک جماعت کا موقف ہے جن میں حضرات ابو المعالی، خطابی، غزالی، امام شافعی وغیرہم رحمہم اللہ جمیعاً شامل ہیں۔ خلیل اور سیبویہ سے منقول ہے کہ ''اللّٰه'' کے شروع میں الف لام اسی کے ساتھ لازم ہیں۔ انہیں حذف کرنا جائز نہیں۔ خطابی کہتے ہیں: اس بات کی دلیل کہ الف اور لام لفظ ''اللّٰه'' کے اصلی حروف میں سے ہیں اور یہ معرفہ بنانے کے لئے نہیں لگائے گئے، اس پر حرف ندا کا داخل ہونا ہے جیسا کہ ہم کہتے ہیں: ''یا اللّٰه'' حالاں کہ حروف ندا الف لام کے ساتھ نہیں آسکتے۔ غور کیجئے ہم کبھی یا الرحمن، یا الرحیم نہیں کہتے جیسے ''یااللّٰه'' کہتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ الف لام لفظ اللّٰه کے بنیادی حروف میں سے ہیں۔ واللہ اعلم۔

بائیسویں بحث: رحمٰن اور رحیم کا اشتقاق

باری تعالیٰ کے اسم گرامی ''رحمٰن'' کے اشتقاق کے بارے میں بھی بعض علماء کہتے ہیں یہ مشتق نہیں کیوں کہ یہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے خصوصی اسماء مبارکہ میں سے ہے۔ اگر یہ مشتق ہوتا تو جہاں کسی پر رحم کرنے کا

ذکر ہوتا ہے وہاں رحمٰن اور رحیم کا استعمال برابر ہوتا اور "اللّٰہ رحِیمٌ بِعبَادہ" کی جگہ "اللہ رحمٰن بعبادہ" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر یہ لفظ "رحمة" سے مشتق ہوتا تو عرب اسے سُن کر حیران نہ ہوتے کیوں کہ رب کی رحمت ان کے لئے کوئی نیا لفظ نہیں تھا۔ اس کے بارے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا ارشاد بھی ہے:﴿وَإِذَاقِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوا وَمَا الرَّحْمٰنُ﴾ [الفرقان ۲۵:۶۰](اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں کہ رحمٰن کیا چیز ہے؟)۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی تعمیل میں "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ" لکھا تو سہیل بن عمرو نے کہا:

[۱۶۶] أمّا ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾فمَانَدْري ما﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ولكن أكْتُبْ مَا نَعرِفُ: بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ۔

رہی بات بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کی تو ہم جانتے ہی نہیں کہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے کیا چیز؟ آپ وہ لکھیں جسے ہم بھی جانتے ہیں یعنی "بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ" .

ابن العربیؒ کہتے ہیں: وہ لوگ صفت "رحمٰن" سے ناواقف تھے، نہ کہ موصوف کی ذات عالی سے۔ اس کی دلیل ان کا یہ کہنا ہے: ﴿وَمَا الرَّحْمٰنُ﴾ (اور رحمٰن کیا چیز ہے؟)۔ انہوں نے یہ نہیں کہا: "وَمَنِ الرَّحْمٰنُ" (اور رحمان کون ہے؟)۔ابن حصار کہتے ہیں: ایسا لگتا ہے ابن العربیؒ کی توجہ اس ارشاد باری تعالیٰ کی طرف نہیں گئی:﴿وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ﴾ [الرعد ۱۳:۳۰] (مگر وہ لوگ رحمٰن کے ساتھ کفر کر رہے ہیں)۔

جمہور علماء کی رائے یہ ہے کہ "رَحْمٰن"، "رَحْمَةٌ" سے مبالغہ کا صیغہ ہے اور اس کا معنی ہے:ایسا رحمت والا جس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ اسی لئے اس سے نہ تثنیہ آتا ہے نہ جمع، جیسا کہ "رحیم" کی تثنیہ اور جمع آتی ہے۔

ابن حصارؒ کہتے ہیں: لفظ "رَحْمٰن" کے مشتق ہونے کی ایک دلیل وہ حدیث ہے جسے امام ترمذیؒ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ [1] سے نقل کیا ہے اور اسے صحیح کہا ہے، فرماتے ہیں:میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے سنا:

---

[۱۶۶] یہ صلح حدیبیہ والی طویل حدیث کا حصہ ہے۔ صحیح بخاری: كتاب الشروط، باب الشروط في الجهاد والمصالحة...... ۲:۹۷۴، كتاب المغازي، باب غزوة الحديبية ۳:۴۵، صحیح مسلم: كتاب الجهاد والسير، باب صلح الحديبية في الحديبية ۳:۱۴۱۱،صحیح ابن حبان: كتاب السير، باب الموادعة والمهادنة ۱۱:۲۱۴۔امام حاکم، احمد، ابویعلی، عبدالرزاق، بزار اور بیہقی وغیرہ بہت سے محدثین نے اسے نقل کیا ہے۔

۱۔ مشہور صحابی سابقین اوّلین اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ آپ کی وفات ۳۲ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں ہوئی۔ الإصابة ۲: ۴۱۶

[۱۶۷] قَالَ اللهُ عزَّوجَل: أنَاالرحمٰنُ خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لهااسمًامِن اسمِي، فَمَنْ وصَلَهَا وصَلتُهُ ومَنْ قَطَعَهَا قَطَعْتُه۔

اللہ عزوجل ارشاد فرماتے ہیں: میں رحمان ہوں، رحم کو میں نے پیدا کیا ہے اور اپنے نام سے اس کا نام بھی بنایاہے۔ اب جو صلہ رحمی کرے گا میں بھی اس کے ساتھ اپنا تعلق برقرار رکھوں گا اور جو قطع رحمی کرے گا میں بھی اس سے تعلق توڑ لوں گا۔

یہ حدیث اشتقاق کے ثبوت میں نص ہے۔نہ اس کی مخالفت کا کوئی جواز ہے نہ اس سے اختلاف کا۔ جہاں تک اہل عرب کا لفظ رحمان سے اظہارِ لاعلمی کا تعلق ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے بارے میں ان کی لاعلمی اور حق عبودیت کی عدم معرفت کی وجہ سے تھا۔

تیئیسویں بحث: ''رحمٰن'' اور ''رحیم'' دونوں کو یکجا کرنے کی وجہ

ابن الأنباری نے اپنی کتاب "الزاهر" میں نقل کیاہے کہ "رحمن"عبرانی لفظ ہے جس کے ساتھ "رحیم" کو بھی ذکر کر دیا گیا ہے۔ اس پر انہوں نے درج ذیل شعر بھی پیش کیے:(۱)

لَنْ تُدْرِكُوا المَجْدَ أوتَشْروا عَبَاءَكُمْ ۔۔۔ بِالخَزّ أو تَجعَلُوا اليَنبُوتَ ضَمْرَانَا

أوْ تَترُكُونَ إلى القَسَّين هِجْرَتَكُم ۔۔۔ وَمَسْحَكُمْ صُلْبَهُمْ رَحمانَ قُرْبانَا

ابو اسحاق زجاج نے اپنی کتاب ''معاني القرآن ''میں احمد بن یحییٰ کا قول نقل کیا ہے کہ ''رحیم''عربی لفظ ہے اور ''رحمان''عبرانی، اس لیے دونوں کو اکھٹا ذکر فرمایا مگر یہ بات قابل توجہ نہیں۔ابو العباس مبرد کہتے ہیں: صفت کبھی کبھی مدح کے لیے بھی لائی جاتی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''جريرٌ الشاعر'' (جریر جو کہ شاعر ہے)۔ اسی طرح مُطَرِّف نے قتادہؒ کاقول نقل کیاہے کہ اللہ تعالیٰ نے:﴿بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ﴾ارشاد فرما کر اپنی تعریف کی ہے۔ ابواسحاق (زجاج) کہتے ہیں:یہ اچھا قول ہے۔ قطرب کہتے ہیں:یہ بھی ممکن ہے کہ رحمٰان اور رَحِیْم کو اس لیے اکھٹا ذکر کیا ہو کہ معنی میں تاکید پیدا ہو جائے۔ ابو اسحاق کہتے ہیں:یہ بات بھی اچھی ہے بلکہ

---

[۱۶۷] جامع ترمذی: کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی قطیعة الرحم ۴: ۳۱۵۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ صحیح حدیث ہے۔امام ابوداؤدؒ، احمد بن حنبلؒ، ابن ابی شیبہؒ، حاکمؒ وغیرہ کئی محدثین نے اسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف سے نقل کیا ہے۔

ا۔ ابن منظور نے لسان العرب(رحم)میں ازہری کے حوالہ سے یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف اور یہ اشعار جریر کی طرف منسوب کیے ہیں۔

تاکید کا فائدہ سب سے زیادہ ہے۔ کلامِ عرب میں اس کی بہت مثالیں ملتی ہیں یہاں تائیدی شواہد کرنے کی ضرورت نہیں۔ محمد بن یزید المبرد کے خیال میں یہاں تاکید کا فائدہ یہ ہے کہ یہ مہربانی پر مہربانی ہے، انعام پر انعام ہے، رب کی رحمت پر آس لگانے والوں کی ہمت افزائی ہے اور ایسا وعدہ ہے جس کے ایفاء کی توقع رکھنے والا کبھی ناکام نہیں ہوگا۔

چوبیسویں بحث: رحمٰن اور رحیم کے معانی کا موازنہ

اس میں علماء کی آراء مختلف ہیں کہ ان دونوں صفات کا ایک ہی معنی ہے یا الگ الگ معانی میں ہیں؟ ایک رائے تو یہ ہے کہ دونوں کا ایک ہی معنی ہے جیسے "نَدمان" اور "ندیم" کا۔ یہ ابو عبیدہ کا قول ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ "فَعْلاَن" اور "فَعیل" دونوں اوزان کا استعمال ایک معنی میں نہیں ہوتا بلکہ "فَعْلاَن" صرف مبالغہ کے لیے آتا ہے جیسے "غَضْبَانٌ" اس شخص کو کہتے ہیں جو غصہ سے بھرا ہوا ہو، جب کہ وزن "فَعیل" کبھی صرف فاعل کے معنی میں آتا ہے اور کبھی مفعول کے معنی میں جیسا کہ عَمَلَّس[1] کہتا ہے:

فَأَمَّا إِذَا عَضَّتْ بِكَ الحَرْبُ عَضَّةً فَإِنَّكَ معطوفٌ عليكَ رحيمٌ

مگر جب جنگ تجھے سخت نقصان پہنچا دے تو تجھ پر ترس کھایا جاتا ہے اور تو رحم کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے۔[2]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ "رحمن" ایسا لفظ ہے جو اسم ہونے میں تو خاص ہے مگر اس کی تاثیر عام ہے، جب کہ "رحیم" اسم ہونے کے لحاظ سے عام ہے مگر اس کی فعالیت اور تاثیر خاص ہے[3]۔ یہی جمہور کا قول ہے۔

ابو علی الفارسی[4] کہتے ہیں: "رحمٰن" رحمت کی تمام اقسام کے لیے عام ہے مگر یہ صفت صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت "رحیم" صرف مومنوں کے لیے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا: ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا﴾ [الأحزاب ۳۳:۴۳] اور وہ مومنوں کے حق میں تو رحیم ہی ہے۔

۱۔ اس کا پورا نام عَمَلَّس بن عقیل ہے۔ لسان العرب (رحم)۔

۲۔ یہاں "رَحِیم" مفعول کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۳۔ یعنی "رحمٰن" صرف اللہ تعالیٰ کا نام بن سکتا ہے اور کسی کا نہیں مگر اس صفت کی رو سے رحمت سب کے لیے عام ہے، جب کہ "رحیم" صفت کے طور پر اللہ تعالیٰ کے علاوہ بھی استعمال ہو سکتا ہے مگر اس کی رو سے رحمت الٰہی خاص بندوں کے لیے ہے۔

۴۔ ابو علی حسن بن عبد الغفار (م ۳۷۷ھ) نابغہ روزگار نحوی اور لغوی ہیں۔ ان کی وفات ۹۰ سال کی عمر میں بغداد میں ہوئی۔ معجم المؤلفین ۳ :۲۰۰

عرزمی(۱) کہتے ہیں: "رحمٰن" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ساری مخلوق پر مہربان ہے۔ان کو بارش سے سیراب کرتا ہے، ان کو حواس کی نعمتیں دی ہوئی ہیں اور اس کے علاوہ اس کی بے شمار عمومی نعمتیں ہیں۔ جب کہ "رحیم" سے مراد اللہ تعالیٰ کی مؤمنین پر خصوصی مہربانی ہے کہ انہیں ہدایت سے نوازا اور ان کے ساتھ کرم کا معاملہ فرمایا۔ابن مبارک کہتے ہیں کہ "رحمٰن"کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی اس سے مانگا جائے وہ دیتا ہے اور "رَحِیم" کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس سے نہ مانگا جائے تو ناراض ہوتا ہے۔

امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں اور امام ترمذیؒ نے اپنی جامع میں ابو صالح سے نقل کیا ہے، وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۶۸] مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللّٰهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ۔

جو اللہ تعالیٰ سے نہیں مانگتا اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

یہ الفاظ جامع ترمذیؒ کے ہیں ۔ اور امام ابن ماجہؒ نے اس روایت کو ان الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے :

[۱۶۹] مَن لم يَدْعُ اللّٰهَ سُبحانهُ غضِبَ عليه۔

جو اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں۔

راوی ابو صالح کا تعارف

کہتے ہیں: میں نے ابو زرعہ سے اس ابو صالح کے بارے میں پوچھا تو(۲) انہوں نے کہا: یہ وہی ہیں

---

[۱۶۸] جامع ترمذی: كتاب الدعوات، باب ماجاء في فضل الدعاء ۵:۴۵۶، بخاری: الأدب المفرد، باب من لم يسأل الله يغضب عليه ۱:۱۸۳۔ اس حدیث کا مدار ابو صالح پر ہے جس پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ غالبًا اسی وجہ سے امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی تحسین نہیں کی بلکہ فرمایا ہے:ہمیں یہ حدیث اس سند کے علاوہ کہیں نہیں ملی۔

[۱۶۹] سنن ابن ماجہ: كتاب الدعاء، باب فضل الدعاء ۲:۱۲۵۸، مسند احمد: مسند أبي هريره رضي الله عنه ۲:۴۴۳، ۴۷۷

۱۔ ابو محمد عبد المالک بن ابی سلیمان میسرہ العرزمی (م۱۴۵ھ) صدوق ہیں اور ان سے توہمات بھی منقول ہیں۔تهذيب التهذيب ۷:۳۹۷

۲۔ مؤلف نے قائل کا نام لیے بغیر ہی لکھا ہے: وقال: سالتُ ابوزرعة" (میں نے ابو زرعہ سے پوچھا) مگر سنن ابن ماجہ میں یہ الفاظ نہیں ہیں۔ ابن ابی حاتمؒ نے "سُئلَ أبو زرعة" مجہول کے صیغہ کے ساتھ اس سے ملتے جلتے الفاظ نقل کیے ہیں۔ انہوں نے ابو صالح الخوزی ہی ذکر کیا ہے ابو صالح الفارسی نہیں۔ اور کہا ہے: لاباس به۔ الجرح و التعديل ۹:۳۹۳، حافظ ابن حجرؒ نے ابن الدروی سے یحیی بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ ابو صالح الخوزی ضعیف ہے پھر لکھا ہے: قلت وقال ابوزرعة لاباس به۔ تهذيب التهذيب ۱۲:۱۳۱

جنہیں ابو صالح الفارسی کہا جاتا ہے۔ یہ خوزی ہیں اور ان کا نام تو میں بھی نہیں جانتا(۱)۔

بعض شعراء نے بھی یہ معنی اپنے اشعار میں ذکر کیا ہے۔ اس طرح کا ایک شعر درج ذیل ہے:

اَللّٰهُ يَغْضَبُ إِنْ تَرَكْتَ سُؤَالَهُ وَبُنَيُّ آدَمَ حِينَ يُسْأَلُ يَغْضَبُ

اللہ تعالیٰ اس وقت ناراض ہوتے ہیں جب کوئی ان سے مانگنا چھوڑ دے اور بندے سے اگر کوئی مانگ بیٹھے تو ناراض ہو جاتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "هما اسمانِ رقيقان، أحَدُهُمَا أرقُّ مِنَ الآخَرِ، أي أكثَرُ رحمَةً" (یہ دونوں لطیف اسماء ہیں، جن میں سے ہر ایک لطافت میں دوسرے سے آگے ہے۔ یعنی زیادہ رحمت پر دلالت کرتا ہے)۔ خطابی کہتے ہیں: یہ معنی واضح نہیں ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں رقت کا کوئی عمل دخل نہیں، حسین بن فضل البَجَلِي کہتے ہیں: یہ راوی کا وہم ہے کیوں کہ "رقّت" کا اللہ تعالیٰ کی صفات سے کوئی تعلق نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ :"إنّما هما اسمانِ رفيقانِ أحَدُهُمَا أرْفَقُ مِن الآخَرِ، والرِّفقُ مِن صفاتِ اللّٰه عزَّوجَل"۔ یہ دونوں نرمی اور مہربانی والے نام ہیں: ان میں سے ایک دوسرے سے بڑھ کر نرمی والا ہے اور نرمی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۷۰] إنَّ اللّٰهَ رفيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي علىَ الرِّفقِ مَالاَ يُعطي علىَ العُنفِ۔

اللہ تعالیٰ نرمی والے ہیں، نرمی کو پسند کرتے ہیں اور نرمی پر وہ کچھ دیتے ہیں جو سختی پر نہیں دیتے۔

پچیسویں بحث: "رحمٰن" اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاصہ

اکثر علماء کی رائے یہی ہے کہ صفت "رحمٰن" اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔ ان کے علاوہ کسی کو "رحمن" کہنا جائز نہیں، غور کیجئے! اللہ تعالیٰ نے خود ارشاد فرمایا: ﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ أوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ﴾ [الإسراء

---

[۱۷۰] صحیح مسلم: كتاب البر والصلة والآداب، باب فضل الرفق ۴:۲۰۰۳، سنن ابوداؤد: كتاب الأدب، باب في الرفق ۴:۲۵۴، سنن ابن ماجۃ: كتاب الأدب، باب الرفق ۲:۱۲۱۶، مؤطاامام مالک: كتاب الاستئذان، باب مايؤمربه من العمل في السفر ۲:۹۷۹، صحیح ابن حبان: كتاب البر والإحسان، باب الرفق ۲:۳۰۹، مسند احمد: مسند علي بن أبي طالب رضي اللّٰه عنه ۱:۱۸۱، حديث عبدالله بن مغفل المزني ۵:۲۶، سنن سعید بن منصور: باب ماجاء في الرفق بالبهائم في السير ۲:۲۳۷، ابویعلیٰ، عبدالرزاقؒ، بزارؒ، طبرانیؒ اور بیہقیؒ وغیرہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

۱۔ خوزی ایرانی خوزستان کی طرف نسبت کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے اور یہاں غالباً وہی مراد ہے۔ دوسرا "خوز" مکہ کی ایک وادی کا نام ہے۔ ابن الأثیر: اللباب ۱:۱۷۰

۱۱۰:۱۷] (آپ کہئے: اللہ کہہ کر پکارو یا رحمان کہہ کر پکارو)۔ اس طرح ذات باری تعالیٰ نے صفت رحمٰن کو اپنے اس نام کے برابر قرار دیا جس میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ نیز ارشاد فرمایا: ﴿وَاسْأَلْ مَنْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُسُلِنَا۔ أَجَعَلْنَا مِنْ دُونِ الرَّحْمٰنِ آلِهَةً يُعْبَدُونَ﴾ [الزخرف ۴۳:۴۵] (اور آپ ان سب پیغمبروں سے جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے، دریافت کر لیجئے کہ کیا ہم نے "رحمٰن" کے سوا دوسرے خدا ٹھہرا دیئے تھے کہ ان کی پرستش کی جائے؟)۔ یہاں یہ ارشاد فرمایا کہ رحمٰن جل جلالہ ہی اکیلا عبادت کا مستحق ہے۔ ایک مسیلمہ کذاب ملعون ہی تھا جس نے اپنے آپ کو "رحمٰن الیمامة" کہنے کی جراءت کی تھی، اس کا وہ نام معروف بھی نہ ہوا تھا کہ کذاب کا لقب اس کے کانوں سے آ ٹکرایا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نام کے ساتھ "کذّاب" والی صفت کو ہمیشہ کے لیے لگا دیا۔ اگرچہ ہر کافر جھوٹا ہی ہوتا ہے مگر کذاب کی صفت مسیلمہ کے نام کی جگہ بطور خاص مشہور ہوگئی جسے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے لازمی قرار دے دیا۔ ابن العربیؒ نے ایک رائے یہ بھی نقل کی ہے کہ "رحمٰن" اللہ تبارک وتعالیٰ کا اسم اعظم ہے۔

چھبیسویں بحث: صفت رحیم کی عمومیت

مہدویؒ کہتے ہیں: "رحیم" ایسی صفت ہے جو مخلوق میں سے کسی کے لیے بھی آ سکتی ہے۔ "رحمٰن" میں چوں کہ اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت کی طرف اشارہ ہے اس لیے عام کلام میں بھی قرآن مجید کی پیروی کرتے ہوئے اسے "رحیم" سے پہلے رکھا گیا ہے۔

"رَحِیم" حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت

ایک رائے یہ ہے کہ "رحیم" سے یہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے جن کی اس صفت کا ذکر باری تعالیٰ کے ارشاد: ﴿رؤفٌ رَحِيمٌ﴾ [التوبة ۹:۱۲۹] (بڑے ہی شفیق۔ مہربان) میں ہوا ہے۔ یعنی تم رحیم کے ذریعے اللہ اور رحمٰن کی طرف پہنچ پائے ہو۔ گویا کہ یہاں یہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے: "بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ، وَبِالرَّحِيمِ أَيْ وبِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيهِ وَسَلَّم وَصَلتُم إلَيَّ"۔ (اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان ہے اور تم رحیم یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے مجھ تک پہنچے ہو)۔ مطلب یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور جو دین آپ لائے ہیں اس کی اتباع کے ذریعے تم لوگ میرے ثواب، میری طرف سے عزت افزائی اور میری زیارت کی سعادت کے مستحق بنے ہو۔ واللہ اعلم۔

ستائیسویں بحث: بسم اللہ کے منافع

حضرت علی بن ابی طالب کرّمَ اللہ وجہہ کا ارشاد منقول ہے کہ بِسْمِ اللہ ہر مرض کے لیے شفاء اور ہر دواء میں مدد دینے والی ہے۔ اس میں لفظ "رحمٰن" ہر اس شخص کے لیے مدد کا ذریعہ ہے جو رحمٰن پر ایمان لائے۔ یہ ایسا نام ہے جو اس کی ذات کے علاوہ کسی اور کا نہیں ہے۔ اور جہاں تک "رحیم" کا تعلق ہے تو یہ ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے توبہ کی، ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔

بسم اللہ کے حروف کی تفسیر

بعض حضرات نے اس کی حرف بحرف تفسیر بھی بیان کی ہے چناں چہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی تفسیر کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۷۱] أَمَّا البَاءُ فَبَلاءُ اللّٰهِ وَرَوحه ونَضْرَتُهُ وبَهَاؤه، وأمّا السّينُ فَسَنَاءُ اللّٰه، وأمّا الميمُ فَمُلكُ اللّٰهِ، وأمّا اللّٰهُ فَلا إلٰه غَيرُه، وأمّا الرَّحْمٰنُ فَالعَاطِفُ عَلَى البَرِّ والفاجِر مِنْ خَلقِهِ، وأمّا الرّحِيمُ فَالرَّفِيقُ بِالمُؤمِنِينَ خاصّةً۔

بسم اللہ کی باء سے مراد اللہ تعالیٰ کی خصوصی رحمت، اس کی مہربانی، اس کا لطف اور اس قدرت سے پائی جانے والی رونق ہے۔ "سین" سے ہر شئے میں اس کی قدرت سے پیدا کی ہوئی چمک دمک، "میم" سے اس کے ملک و قدرت کی اشارہ ہے۔ لفظ "اللہ" اس بات کا مظہر ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، "رحمٰن" وہ ذات ہے جو نیک و بد ہر ایک پر مہربانی کرنے والا ہے اور "رحیم" سے مؤمنین کے لیے اس کی خاص رحمت کی طرف اشارہ ہے۔

---

[۱۷۱] معتبر کتب حدیث میں یہ حدیث نہیں مل سکی۔ امام طبری نے یہی الفاظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب نقل کیے ہیں۔ انہوں نے اسماعیل بن فضل کی سند سے یہ حدیث حضرت ابو سعید رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے، آپؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے انہیں استاذ کے پاس پڑھنے کے لیے بھیجا تو معلم نے کہا: لکھو "بسم" عیسیٰ علیہ السلام نے پوچھا: "بسم" کیا ہے؟ معلم نے کہا: یہ مجھے معلوم نہیں۔ اس پر عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: الباء بهاء الله، والسين سناؤه، والميم مملكته"۔ طبریؒ کہتے ہیں: مجھے لگتا ہے راوی کو غلطی لگی ہے اور اس نے "ب س م" علیحدہ حروف کو ملا کر "بسم" بنا دیا جب کہ اصل مقصود حروف ابجد کی طرز پر بچوں کو سکھائے جانے والے الگ الگ حروف ہوں گے جن سے لکھائے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ تلاوت کلام مجید کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے سے اس تاویل کی کوئی مناسبت نہیں اور اس بات کا عرب اہل زبان کے ہاں مشہور مفہوم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ تفسیر طبری۔ المقدمه، القول في تاويل بسم الله الرحمٰن الرحيم ۱:۴۱

کعب احبار سے منقول ہے کہ: باء سے مراد اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پائی جانے والی رونق اور سین سے مراد اس کی پیدا کی ہوئی چمک دمک ہے کیوں کہ کوئی چیز اس سے بلند شان والی نہیں اور میم سے اس کے ملک و قدرت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور کبھی کوئی چیز اس کے لئے رکاوٹ نہیں بنتی۔

ایک رائے یہ ہے کہ بسم اللہ کا ہر حرف اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک اسم کی ابتداء ہے چناں چہ باء سے "بصیر"، سین سے "سمیع"، میم سے "مَلِیک"، الف سے "اللّٰه"، لام سے "لطیف"، ھاء سے "ھادي"، راء سے "رازق"، حاء سے "حلیم" اور نون سے "نور" کی ابتدا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ بندہ جب بھی کوئی کام ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ پڑھ کر شروع کرتا ہے تو وہ یہ سب نام لے کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے۔

اٹھائیسویں بحث: "الرَّحِیْم" کو "اَلْحَمْدُ" کے ساتھ ملانا

اس میں اختلاف ہے کہ "الرحیم" کو "الحمد" کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے یا نہیں۔ اس سلسلہ میں اُم المؤمنین حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرماتی ہیں:

[۱۷۲] آپ صلی اللہ علیہ وسلم الرَّحیم. اَلْحَمْدُ" میم کو ساکن کر کے وقف کرتے اور اَلْحَمْدُ کے الف سے دوبارہ شروع فرماتے تھے۔

قُرّاء کوفہ کی ایک جماعت نے بھی اسی طرح پڑھا ہے۔ عام قُرّاء "الرَّحِیم" کی میم کو کسرہ دے کر "الحمدُ" کے لام کے ساتھ ملا کر "الرَّحِیمِ الْحَمْدُ" پڑھتے ہیں۔ کسائی کہتے ہیں: بعض عربوں سے "الرَّحِیم" کے میم زبر اور اَلحمْد" کے ہمزہ کے وصل کے ساتھ "الرَّحِیمَ الْحَمْدُ" بھی منقول ہے۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ لوگ دراصل میم کو ساکن کر کے الف کو الگ پڑھتے ہیں، مگر پڑھتے ہوئے الف کا فتحہ میم پر پڑھ دیا جاتا ہے اور الف غائب ہو جاتا ہے۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ طریقہ بطور قراءت کسی سے منقول نہیں۔ اور یہی خیال ارشاد باری تعالیٰ: ﴿الٓمّٓ اللّٰهُ﴾ [آل عمران ۳: ۱] میں یحییٰ بن زیاد کا ہے۔

☆☆☆☆☆

[۱۷۲] علامہ سیوطیؒ نے درمنثور ۱:۳۰ میں اسے ابن الأنباری کی طرف منسوب کیا ہے۔ جامع ترمذی: کتاب القراء ات، باب في فاتحة الکتاب ۵:۱۸۵ میں ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم "الحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِین" پرّ وقف فرماتے اور پھر "الرّحْمٰنِ الرّحِیم" سے شروع فرماتے تھے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے اور ابوعبید کی بھی یہی رائے، اس کی سند بھی متصل نہیں البتہ دوسری سند جو لیث بن سعد عن ابی بن ملیکۃ عن یعلی بن مملک عن ام سلمۃ رضی اللہ عنہا زیادہ صحیح ہے، مستدرک حاکم: کتاب التفسیر، باب قراء ات النبی صلی اللہ علیہ وسلم ممالم یخرجاہ وقدصحّ سندہ ۲:۲۵۲

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ
مَكِّيَّةٌ

سُورَةُ الْفَاتِحَةِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۔ اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ غَيْرِالْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَاالضَّآلِّيْنَ۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

ساری تعریف اللہ کے لیے ہے۔ (وہ) سارے جہانوں کا مربی، رحمٰن، رحیم، اور روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور بس تجھی سے مدد چاہتے ہیں۔ چلا ہم کو سیدھے راستہ پر۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تونے انعام کیا ہے۔ نہ ان لوگوں کا (راستہ) جو زیرِ غضب آ چکے ہیں اور نہ بھٹکے ہوؤں کا راستہ۔

سورۂ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی ۔ اس میں سات آیات ہیں اور اس کی تفسیر چار ابواب پر مشتمل ہے

باب:ا

سورۂ فاتحہ کے فضائل اور نام

یہ باب سات مباحث پر مشتمل ہے۔

پہلی بحث: سورۂ فاتحہ کے فضائل

امام ترمذیؒ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۷۳] ما أنزلَ اللّٰه في التوارة ولا في الإنجيلِ مثل أمّ القرآن وهيَ السبع المثاني وهي مقسومة بيني وبين عبدي، ولعبدي مَا سألَ۔

اللہ تعالیٰ نے امّ القرآن جیسی سورت تورات یا انجیل میں نازل نہیں کی۔ یہ ہی سبع مثانی (بار بار دہرائی جانے والی سات آیات) ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان منقسم ہے۔ میرا بندہ مجھ سے جو کچھ مانگتا ہے اسے مل جاتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ نے علاء بن عبد الرحمٰن بن یعقوب سے نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عامر بن کریز کے آزاد کردہ غلام ابو سعید نے انہیں بتایا: ''حضرت ابی کعب رضی اللہ عنہ نماز پڑھ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا''۔ اس کے بعد یہ حدیث بیان کی ہے۔

ابوسعید کا تعارف

حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں اس ابو سعید کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ یہ بات معلوم ہے کہ ان کا شمار اہل مدینہ میں ہوتا ہے وہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے جو روایات نقل کرتے ہیں وہ ، ان کی یہ حدیث اور

---

[۱۷۳] مؤطا امام مالکؒ: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء في أمّ القرآن۔او جزالسالک ۲:۸۶، جامع ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجر ۵:۲۹۷، سنن نسائی: کتاب الإفتتاح، باب تأويل قول الله ﴿وَلَقدْ آتيناكَ سبعًا مِنَ المثاني ۲:۱۳۹، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب قراءۃ القرآن ۳:۵۳

دیگر سب مرسل[1] ہیں۔ یہی حدیث حضرت ابو سعید بن معلیٰ سے بھی مروی ہے جو ایک صحابی ہیں لیکن ان کا نام بھی معلوم نہیں، ان سے یہ حدیث حفص بن عاصم[2] اور عبید بن حنین[3] نے روایت کی ہے۔

مؤلف کا تبصرہ

میں کہتا ہوں کہ ''التمہید'' میں تو حافظ ابن عبد البرؒ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابوسعید کا نام معلوم نہیں[4] لیکن ''کتاب الصحابة'' میں ان کے مختلف نام ذکر کیے ہیں[5]۔

امام بخاریؒ نے ابو سعید بن معلیٰؓ کی یہی حدیث نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں: میں مسجد نبوی میں نماز پڑھ رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا مگر میں نے جواب نہیں دیا، تھوڑی دیر بعد میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا:

[۱۷۴] أَلَمْ يَقُلِ اللّٰه:﴿اسْتَجِيبُوا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ﴾[الأنفال ۸: ۲۴] ثُم قال: إنّي لأعَلِّمنَّكَ سُورةً هِيَ أعْظَمُ السُّوَر في القُرآن قبلَ أنْ تخرُجَ مِن المَسْجِدِ، ثم أخذَ بِيَدي، فَلمَّا أرادَ أن يَخْرُجَ قُلْتُ لَهُ: أَلَمْ تَقُلْ لأعَلِّمنَّكَ سُورَةً هِيَ أعْظَمُ سُورَةٍ فِي القُرآن؟ قال:﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ هِيَ السَّبْعُ المَثَانِي وَالقُرآن العَظِيم الّذِي أُوتِيتُه۔

۱۔ مؤطا امام مالکؒ میں اسی طرح مرسلاً منقول ہے مگر مولانا محمد زکریاؒ نے بحوالہ زرقانی اسے مرفوع ثابت کیا ہے اور امام حاکمؒ نے عبداللہ بن مسلمہ کا قول نقل کیا ہے کہ امام مالک کے سامنے یہ حدیث درج ذیل سند سے بیان کی گئی: عن العلاء بن عبدالرحمن عن أبي سعيد مولى عامر بن كريز عن أبيّ بن كعب عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ۔المستدرک: كتاب التفسير سورة الفاتحة ۲: ۲۵۸، اوجز المسالک ۲: ۸۷۔امام ترمذیؒ، ابن حبانؒ اور نسائیؒ سب نے اسے مرفوعاً ہی ذکر کیا ہے۔

۲۔ حفص بن عاصم بن عمرؓ بن الخطاب (م تقریباً ۹۰ھ) بڑے فقیہ اور کثیر الروایہ تابعین میں سے ہیں۔ امام مسلم نے انہیں مدینہ کے طبقہ اولیٰ میں شمار کیا ہے اور محدثین نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۲: ۴۰۲، سير أعلام النبلاء ۴: ۱۹۶

۳۔ ابو عبداللہ عبید بن حنین مدنی (م ۱۰۵ھ) زید بن خطاب یا بنوزریق کے آزاد کردہ غلام تھے۔ ابن حبان نے انہیں ثقہ اور ابن سعد نے ثقہ قلیل الروایہ کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۷: ۶۳، سير أعلام النبلاء ۴: ۶۰۵

۴۔ حافظ ابن عبد البر کی کتاب کا پورا نام التمهيد لما في الموطا من المعاني والاسانيد ہے۔

۵۔ الاستيعاب في معرفة الاصحاب ہے یہاں غالباً علامہ قرطبیؒ سے تسامح ہوگیا ہے کیونکہ حافظ ابن عبدالبرؒ نے ساری بحث ابوسعید بن المعلیٰ کے بارے میں کی ہے نہ کہ ابو سعید مولی عامر بن کریز کے بارے میں۔ الاستيعاب على هامش الاصابة ۴: ۹۰، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ابو سعید بن المعلیٰ انصاری اور اصلاً مدنی صحابی ہیں جب کہ علاء بن عبدالرحمٰن کے شیخ ابوسعید تابعی اور غلام ہیں۔ علامہ ابن اثیر نے غلطی سے ان دونوں کو ایک ہی سمجھ لیا ہے۔ فتح الباري: تفسير سورة الفاتحة

کیا یہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نہیں کہ جب تمہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بلائیں تو فوراً ان کے حکم کی تعمیل کرو۔ پھر آپ نے فرمایا: مسجد سے نکلنے سے پہلے میں تجھے قرآن مجید کی عظیم ترین سورت کے بارے میں بتاؤں گا۔ پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد سے نکلنے کا ارادہ فرمایا تو میں نے عرض کیا: حضور! آپ نے فرمایا نہیں تھا کہ مجھے قرآن کی عظیم ترین سورت کے بارے میں بتائیں گے؟ آپ نے فرمایا وہ ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ ہے۔ وہی سبع مثانی ہے اور وہی قرآن عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے۔

ابو سعید بن المعلّٰی کا تعارف

حافظ ابن عبدالبرؒ اور دیگر محدّثین کہتے ہیں کہ حضرت ابو سعید بن المعلیؓ المتوفی ۷۴ھ جلیل القدر انصاری سرداروں میں سے ہیں۔ ان سے صرف امام بخاری نے روایت نقل کی ہے[۱]، کسی نے ان کا نام حارث بن نفیع بن المعلی، کسی نے اوس بن معلّٰی اور کسی نے ابو سعید بن اوس ابن معلّٰی بتایا ہے۔[۲] تحویل قبلہ[۳] کے بعد وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے بیت

---

[۱۷۴] صحیح بخاری: کتاب التفسیر، باب ماجاء في فاتحة الكتاب وسميت أم الكتاب ۴:۱۶۲۳، کتاب التفسیر، باب یاَیُّھاَ الذینَ آمَنوا اسْتَجِیبُوا لِلّٰهِ وللرّسُول ۴:۱۷۰۴، کتاب التفسیر، باب وَلقدْ آتیناک سَبْعًا مِنَ المثَانِي وَالْقُرآن ۴:۱۷۳۸، کتاب فضائل القرآن، باب فضل فاتحة الكتاب ۴:۱۹۱۳، سنن داری: کتاب الصلاة، باب أم القرآن هي السبع المثاني ۱:۳۷۲، کتاب فضائل القرآن، باب فضل فاتحة الكتاب ۲:۹۰۲، صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق، باب قراء ة القرآن ۳:۵۶، صحیح ابن خزیمہ: کتاب الصلاة، باب ذکر ماخص الله عزوجل به نبيه صلى الله عليه وسلم...... ۲:۳۸، مسند امام احمد: حديث أبي سعيد بن المعلّٰى رضي الله عنه ۴:۴۸۲، سنن بیہقی، کتاب النكاح، باب ما أبيح لهُ من أن يدعوالمصلي ۱۰:۲۰۶

۱۔ اس حدیث کو دیگر کئی محدثین نے بھی ان سے نقل کیا ہے جن کا ذکر حدیث نمبر ۱۷۴ گزر چکا ہے۔

۲۔ ایک قول کے مطابق معلّٰی ان کے دادا ہیں اور ان کے والد کا نام اوس ہے۔ امام بیہقیؒ نے ان روایات کو یوں تطبیق دی ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔ ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعبؓ کے ساتھ اور دوسری مرتبہ ابوسعید المعلّٰی کے ساتھ۔ فتح الباری ۸:۱۰، الاستيعاب على هامش الاصابة ۴:۹۰

۳۔ یہ حکم ہجرت سے سولہ یا سترہ ماہ بعد نازل ہوا۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ہجرت ماہ ربیع الاول میں ہوئی اور تحویل قبلہ کا حکم جمہور کے قول کے مطابق دوسرے سال رجب کے وسط میں ہوا۔ صحیح بخاری مع فتح الباری: کتاب التفسیر، باب سیقول السفهاء ۱:۱۹۹، صحیح مسلم: کتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب تحويل القبلة۔ شرح النووی ۳:۱۲

اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی۔ابو سعیدؓ نے چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پائی(۱)، اس کی مزید تفصیل آئندہ آئے گی۔

[۱۷۵] حضرت اُبیؓ والی حدیث کو یزید بن زریع نے بھی اپنی سند سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ہمیں روح بن القاسم نے بتایا، انہوں نے علاء بن عبدالرحمٰن سے روایت کیا، انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابی رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے جب کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے، پھر اسی مفہوم کی حدیث ذکر کی۔

علامہ ابن انباریؒ نے اپنی کتاب ''الرد''(۲) میں نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے والد نے بیان کیا، ان سے ابو عبیداللہ الوراق(۳) نے، وہ کہتے ہیں مجھے ابو داؤد(۴) نے بتایا، وہ کہتے ہیں مجھ سے شیبان(۵) نے بیان کیا، شیبان نے منصور (ابن المعتمر) سے اور منصور نے مجاہد سے روایت کی، وہ کہتے ہیں کہ ابلیس ملعون چار مرتبہ خوب رویا: جب اس پر لعنت کی گئی، جب اسے جنت سے اتارا گیا، جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی بنایا گیا اور جب سورہ فاتحہ نازل ہوئی اور یہ مدینہ میں نازل ہوئی(۶)۔

---

[۱۷۵] سنن بیہقی، کتاب الصلاۃ، باب تعیین القراءۃ بفاتحۃ الکتاب ۲:۳۲۹، شعب الإیمان، التاسع عشر من شعب الإیمان......، ذکر فاتحۃ الکتاب ۲:۴۴۲

۱۔ اس قول کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۱۰ ہجری بنتی ہے۔ اور تحویل قبلہ کا حکم ان کی پیدائش سے ساڑھے آٹھ برس پہلے آ چکا تھا۔ حافظ ابن حجرؒ نے ''الاصابہ'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور ''تہذیب'' میں بھی ان کی عمر ۸۴ برس لکھی ہے جس سے تحویل قبلہ کے بعد اس طرف منہ کرنے والا پہلا نمازی ہونے کی گنجائش نکل آتی ہے۔ فتح الباری ۱۰:۸، الإصابۃ۴:۸۸، تعارف نمبر ۵۳۰، تہذیب التہذیب ۱۲:۱۰۸۔ الاستیعاب علی ہامش الإصابۃ ۴:۹۰

۲۔ اس سے مراد ان کی کتاب الرد علی من خالف مصحف عثمان ہے۔اسماعیل باشا البغدادی:إیضاح المکنون ۱:۵۵۶

۳۔ ابو عبیداللہ حماد بن حسن الوراق النہشلی البصری (م ۲۶۶ھ) سامراء (عراق) میں کتابت کا کام کرتے تھے اس لیے وراق کہلائے۔ ابن حبان نے انہیں ثقہ اور ابو حاتم نے صدوق کہا ہے۔ تہذیب التہذیب ۳:۶ تعارف ۷، ۱۲: ۱۵۷ کنیت نمبر ۷۵۲

۴۔ ابو داؤد سلیمان بن داؤد بن الجارود الطیالسی البصری (م ۲۰۴ھ/ ۸۱۹ء) مشہور محدثؒ اور ''المسند'' کے مؤلف ہیں۔انہیں تیس ہزار احادیث یاد تھیں۔ تہذیب التہذیب ۴:۱۸۲،معجم المؤلفین ۴:۲۶۲

۵۔ ابو معاویہ شیبان بن عبدالرحمٰن التمیمی النحوی البصری (م ۱۶۴ھ) کوفہ اور بغداد میں رہے۔امام ابوحنیفہؒ ،امام ابوداؤد طیالسیؒ کے شیوخ میں سے تھے۔ابن معین، نسائی اور ابن سعد وغیرہ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تہذیب التہذیب ۴:۳۷۳

۶۔ ایک قول کے مطابق یہ مکی سورت ہے اور سورۂ حجر میں اس کا ذکر ہونا بذات خود اس کی دلیل ہے۔صرف مجاہدؒ نے اسے مدنی کہا ہے۔بعض نے یہ قول حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، زہریؒ اور عطاء بن یسارؒ کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ حسین بن فضل کہتے ہیں: یہ مجاہدؒ کو غلطی لگی ہے۔ بعض کہتے ہیں سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ ہیثمیؒ نے طبرانیؒ کے حوالہ سے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے اور شبہ مرفوع قرار دیا ہے۔ ابو اللیث سمرقندیؒ نے مجاہدؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔ تفسیر سمرقندي ۱:۷۸، رازیؒ: التفسیر الکبیر ۱:۱۸۳، فتح الباري ۱:۱۱، مجمع الزوائد ۶:۳۱۱

دوسری بحث: قرآنی آیات اور سورتوں کو ایک دوسری پر ترجیح دینا

قرآنی سورتوں، آیتوں اور اسی طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کے مبارک ناموں میں سے بعض کو بعض سے بہتر سمجھنے کے جواز یا عدم جواز میں علماء کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ان میں سے کسی آیت یا سورت کو دوسری کے مقابلے میں فضیلت حاصل نہیں، یہ سب اللہ کا کلام ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے مبارک ناموں میں بھی کوئی فرق نہیں۔ یہ ابوالحسن اشعری[۱] قاضی ابوبکر ابن طیب، ابو حاتم محمد بن حبان بستی اور فقہاء کی ایک جماعت کی رائے ہے اور اسی طرح کی ایک روایت امام مالک رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے[۲]۔ امام یحییٰ بن یحییٰ[۳] کہتے ہیں کہ قرآن کے کسی حصے کو دوسرے پر فضیلت دینا غلط ہے۔ اسی طرح امام مالک بھی کسی ایک سورت کو دہرانے یا دوسری سورتوں کو چھوڑ کر اسی کو بار بار پڑھنے کو ناپسند فرماتے تھے[۴]۔ ارشاد باری تعالیٰ ﴿نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا﴾[البقرۃ ۲: ۱۰۶] (ہم اس سے بہتر یا ویسی ہی اور آیت بھیج دیتے ہیں) کی تفسیر میں یحییٰ بن یحییٰ نے امام مالک کا قول بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ منسوخ آیت کی جگہ محکم لاتے ہیں۔ ابن کنانہ[۵] نے بھی امام مالکؒ سے اسی طرح نقل کیا ہے اور وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ کسی کو افضل قرار دینا مفضول میں نقص کا احساس دلاتا ہے۔ تمام آیات کی بنیاد ایک ہی ہے یعنی اللہ کا کلام ہونا اور اللہ تعالیٰ کے کلام میں کوئی نقص نہیں۔[۶]

۱۔ ابوالحسن علی بن اسماعیل الاشعری (م۳۲۴ھ/۹۳۶ء) کا نسب حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے ساتھ ملتا ہے۔ بصرہ میں پیدا ہوئے اور علم کلام و اجتہاد میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ معتزلہ سے متاثر ہوکر ان کا پورا مذہب سیکھا پھر ان کے خلاف ہوکر مذہب اہل سنت کا دفاع اپنا مشن بنا لیا۔ ''مذہب اشاعرہ'' انہی کی طرف منسوب ہے۔ بغداد میں وفات پائی۔ تصنیفات کی تعداد تین سو ہے۔ اعلام زرکلی ۴: ۲۶۳

۲۔ اوجز المسالک ۲: ۸۹

۳۔ ابوزکریا یحیی بن یحیی بن بکیر تمیمی حنظلی نیشاپوری (م۲۲۶ھ/۸۴۰ء) بڑے علامہ، متقی، عبادت گزار اور محدّث تھے۔ اسحاق بن راہویہ کا قول ہے کہ یحیی اپنی وفات کے وقت پوری دنیا کے امام تھے۔ اعلام زرکلی ۸: ۱۷۶

۴۔ یہ حضرات مالکیہ کا نقطہ نظر ہے۔ احناف کے نزدیک ایک نماز میں ایک ہی سورت بار بار پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ علامہ عینی نے اسے مفصل مدلل ذکر کیا ہے۔ البناية في شرح الهداية ۱: ۷۰۵

۵۔ ابن کنانہ بن عباس بن مرداس السلمی۔ اپنے والد اور امام مالکؒ وغیرہ سے روایت نقل کرتے ہیں۔ امام بخاری کہتے ہیں: ان کی اپنے باپ سے روایت ثابت نہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ان کا نام عبداللہ ذکر کیا ہے اور ابن عدی نے ان باپ بیٹا دونوں پر جرح کی ہے۔ التمهيد ۱: ۶۸، تهذيب التهذيب ۸: ۴۴۹، ۵: ۳۷۰ (عبداللہ بن کنانہ)، الكامل في الضعفاء ۶: ۲۰۹۴۴ (تعارف کنانہ بن عباس)۔

۶۔ شرح النووی علی صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب فضل سورة الكهف وآية الكرسي ۳: ۳۵۴

لبستیؒ کہتے ہیں: تورات اور انجیل میں فاتحہ جیسی سورت نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ری کو اتنا ثواب نہیں دیتے جتنا امّ القرآن کے قاری کو دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اُمت سلمہ کو ساری امتوں پر فضیلت دی ہے اور دوسری امتوں کو کلام اللہ کی تلاوت پر جو ثواب ملتا تھا اس امت کو ان ے زیادہ ثواب کا مستحق ٹھہرایا ہے۔ یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے۔ انہوں نے ''اعظم سورۃ'' (عظیم ین سورت) سے مراد بھی یہ لیا ہے کہ اس کا اجر و ثواب زیادہ ہے نہ یہ کہ قرآن مجید کا کچھ حصہ دوسرے حصے ے افضل ہے۔ البتہ کچھ لوگ اس فرق کے قائل بھی ہیں، ان کا خیال ہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات جو بیان ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ، لَآ اِلٰهَ اِلَّاهُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ [البقرۃ ۲:۱۶۳] (اور ہمارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس بڑے مہربان اور رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں)، آیۃ الکرسی، رۃ الحشر کی آخری آیات اور سورۃ الاخلاص میں ہے وہ ﴿تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ﴾ [اللھب ۱۱۱:۱] (ابولہب ے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک ہو) اور اسی طرح کی دوسری آیتوں میں نہیں ملتا۔ فضیلت کا یہ فرق معنی کی بصورتی اور عظمت کے اعتبار سے ہے نہ کہ صفت کے اعتبار سے، اور یہی بات صحیح ہے۔ تفضیل کے قائلین میں حاق ابن راہویہ اور دیگر علماء و متکلمین شامل ہیں۔ قاضی ابوبکر ابن العربی اور ابن حصار نے بھی اسی رائے کو پسند یا ہے[1]۔ ان کی دلیل حضرت ابوسعید بن المعلی رضی اللہ عنہ والی حدیث اور حضرت ابی بن کعب کی یہ روایت ے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا:

۱۷] يا أُبيّ أيّ آيةٍ مَعَكَ فِي كتابِ اللّٰهِ أعْظَم، قال فقُلت: ﴿اَللّٰهُ لَآاِلٰهَ اِلَّاهُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ﴾ [البقرة ۲:۲۵۵]، قال: فَضَرَبَ فِي صَدري وَقال: لِيَهْنِكَ العِلْمُ يَا أَبَاالمُنذَر۔

۱۷] صحیح مسلم مع شرح النووی: کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا، باب فضل سورۃ الکھف و آیۃ الکرسی ۳:۳۵۴، درک حاکم: کتاب معرفۃ الصحابۃ رضی اللہ تعالی عنھم، ذکر مناقب أبی بن کعب رضی اللہ عنہ ۳:۳۴۴، مسند امام احمد: حدیث شایخ عن أبی بن کعب رضی اللہ عنہ ۶:۱۷۱، مصنف عبدالرزاق: کتاب فضائل القرآن، باب تعلیم القرآن و فضلہ ۳:۳۷۰، بیہقی: ب الإیمان، التاسع عشر من شعب الإیمان......، تخصیص آیۃ الکرسی بالذکر ۲:۴۵۶ الفاظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ے نے اسے نقل کیا ہے۔، مسند احمد، مصنف عبدالرزاق اور شعب الإیمان میں اس پر یہ اضافہ بھی ہے کہ: اس ذات کی قسم جس کے قدرت میں میری جان ہے اس آیت کی زبان اور دو ہونٹ بھی ہیں جن سے عرش کے ستون کے پاس شہنشاہ کون و مکاں کی تسبیح قی ہے، ابوداؤد نے کتاب الصلاۃ، باب ماجاء في آیۃ الکرسی ۲:۷۲ میں قدرے مختلف الفاظ میں اسے نقل کیا ہے۔

[1] التحبیر في علم التفسیر ص ۳۰۵، زرکشی: البرهان ۱:۴۳۸ ومابعد

اے اُبی! تیرے خیال میں کتاب اللہ میں کونسی آیت سب سے زیادہ عظمت والی ہے؟ انہوں نے جواب دیا: ﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ﴾ (خدا وہ معبود برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں)۔ حضرت اُبیؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سینے پر ہاتھ مارا اور فرمایا: ''اے ابو منذر! تجھے علم مبارک ہو۔ یہ حدیث امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے نقل کی ہے۔

سورۂ فاتحہ کے امتیازات

ابن حصار کہتے ہیں: مجھے ان لوگوں پر حیرت ہوتی ہے جو ان نصوص کے ہوتے ہوئے اس مسئلہ میں اختلاف کا ذکر کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فرمانا کہ ''اللہ تعالیٰ نے ایسی سورت نہ تورات میں نازل فرمائی، نہ انجیل میں نہ خود قرآن کریم میں'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زبور وغیرہ دیگر کتابوں اور صحیفوں کے ذکر سے خاموشی اختیار فرمانا اس لیے ہے کہ جن کتابوں کا ذکر کیا وہ ان تمام آسمانی کتابوں اور صحیفوں سے افضل ہیں۔ جب کوئی چیز افضل سے بھی افضل ہو تو سب سے افضل قرار پاتی ہے۔ جیسے ''زید سارے علماء سے افضل ہے'' کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام لوگوں سے افضل ہے[1] اور سورۂ فاتحہ میں ایسی صفات پائی جاتی ہیں جو دوسری سورتوں میں نہیں ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ پورے قرآن کا خلاصہ ہے۔ یہ پچیس الفاظ پر مشتمل ہے جو قرآن کریم کے سارے علوم کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ اس کی امتیازی شان یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اسے اپنے اور اپنے بندے کے درمیان تقسیم فرما دیا ہے، اس کے بغیر (نماز جیسی اہم) عبادت صحیح نہیں ہوتی نہ کوئی دوسرا عمل اس کے ثواب کو پہنچتا ہے۔ اس بنا پر اسے امّ القرآن العظیم ہونے کا شرف حاصل ہے جیسا کہ:

[۱۷۷] ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ تعدِل ثلث القرآن۔

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ تہائی قرآن کے برابر ہے۔

---

[۱۷۷] یہ حدیث ہے۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب صلاۃ المسافرین و قصرھا، باب فضل قراء ۃ، "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد" ۳:۳۵۵-۳۵۶، بخاریؒ نے الجامع الصحیح: کتاب فضائل القرآن، کتاب الأیمان والنذور، کتاب التوحید اور ترمذی، ابوداود، نسائی، ابن ماجہ، امام مالک، دارمی، ابن حبان، حاکم، احمد، ابویعلی، عبدالرزاق، بزار اور بیہقیؒ سب نے مختلف مقامات پر اسے نقل کیا ہے۔ البتہ اس کی وضاحت شراح حدیث نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے۔ امام نوویؒ نے مازری کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد قرآن کریم کے تین پہلو ہیں: قصص، احکام اور باری تعالیٰ کی صفات۔ "قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد" صفات باری تعالیٰ کا مجموعہ ہے جو کہ قرآن مجید کا تیسرا حصہ ہے۔

۱۔ ابن العربی: أحکام القرآن ۱:۷

یہ اس طرح کہ قرآن مجید تین طرح کے موضوعات توحید، احکام اور وعظ پر مشتمل ہے اور پوری ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ [الاخلاص ۱۱۲: ۱] میں توحید ہی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبی سے جو ارشاد فرمایا اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ ''قرآن کی کونسی آیت عظیم ترین ہے؟ تو انہوں جواب دیا: ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ﴾ [البقرة ۲: ۲۵۵] (خدا وہ برحق ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ زندہ اور ہمیشہ رہنے والا ہے)۔ یہ آیت بھی اس لیے عظیم ترین قرار پائی کہ یہ ساری کی ساری توحید پر مشتمل ہے۔ اسی مفہوم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے:

[۱۷۸] أفضلَ ما قُلتُه أنَا وَالنبِيُّونَ مِنْ قَبلِي لَا إلٰه إلّااللّٰه وَحدَهٗ لاشَرِيكَ لهٗ۔

سب سے افضل بات جو میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے کہی: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيکَ لَهٗ﴾ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں) ہے۔

یہ تمام اذکار میں سے بہترین ذکر ہے کیوں کہ اس کے الفاظ میں توحید کے سارے علوم سمائے ہوئے ہیں، اسی طرح سورۂ فاتحہ توحید، عبادت، اور وعظ ونصیحت پر مشتمل ہے۔ اتنے زیادہ علوم اتنی چھوٹی سورت میں سمو دینا اللہ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔

تیسری بحث: سورۂ فاتحہ اور آیاتِ توحید کی عظمت

حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۱۷۹] فَاتحةُ الكِتاب، وآيَةُ الكُرسي، وَ﴿شَهِدَ اللّٰهُ أنَّهٗ لَا إلٰهَ إلّاهُوَ﴾، وَ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ

---

[۱۷۸] مصنف عبدالرزاق: کتاب المناسک، باب فضل أيام العشر والتعرف في الأمصار ۴: ۳۷۸، جامع ترمذی: کتاب الدعوات، باب في دعاء يوم عرفة ۵: ۵۷۲۔ امام ترمذی نے اسے ''حدیث غریب'' اور اس کے راوی حماد بن ابی حمید کو ضعیف کہا ہے۔ان کے ہاں حدیث کے الفاظ افضل ما قلت کی بجائے خیر ما قلت ہیں۔ مؤطا امام مالکؒ: کتاب القرآن، باب ماجاء في الدعاء ۱: ۲۱۴، کتاب الحج، باب جامع الحج ۱: ۴۲۲ بروایت طلحہ بن عبداللہ بن کریز مرسلاً، سنن بیہقی، کتاب الصیام، باب الاختيار للحاج في ترک صوم يوم عرفة ۴: ۲۸۴، کتاب الحج، باب افضل الدعاء بروایت طلحہ بن عبداللہ بن کریز مرسلاً۔اس کے ضمن میں امام بیہقی فرماتے ہیں: یہ امام مالکؒ سے موصولاً بھی منقول ہے مگر موصول سند ضعیف ہے۔ اس طرح حدیث کی تمام روایات کو ملا کر ''حسن'' کہا جا سکتا ہے۔ البانی نے بھی صحیح سنن الترمذي ۲۸۳۷ میں اسے حسن کہا ہے۔

[۱۷۹] اسے دیلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ ابن حبان اور ابن الجوزیؒ نے اس کے راویوں حارث بن عمیر اور محمد بن زنبور کے ضعف نیز اس کی سند میں انقطاع کی وجہ سے موضوع کہا ہے۔ حافظ عراقی اور ابن حجرؒ نے اس کا دفاع کیا ہے۔ شوکانی: الفوائد المجموعة ۲۹۷-۲۹۸ بحوالہ دیلمی، ابن الجوزی: الموضوعات ۱: ۲۴۵

مَالِكَ الْمُلْكِ﴾، هذهِ الآياتُ مُعلَّقاتٌ بِالْعَرْشِ ليس بَينَهُنَّ وبَين اللّٰهِ حِجابٌ۔

سورۂ فاتحہ، آیۃ الکرسی، ﴿شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ [آل عمران ۳:۱۸] (اللہ نے گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں) ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ﴾ [آل عمران ۳:۲٦] (کہہ دیجیے اے اللہ بادشاہی کے مالک) عرش کے ساتھ آویزاں ہیں، اور اللہ کے اور ان کے درمیان کوئی پردہ نہیں)۔ ابو عمرو دانی[۱] نے یہ حدیث اپنی کتاب "البیان"[۲] میں سند کے ساتھ نقل کی ہے۔

چوتھی بحث: سورۂ فاتحہ کے نام

اس کے بارہ نام ہیں:

پہلا نام: الصلاۃ (نماز، دعاء) جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا **"قسمت الصلاة بيني وبين عبدی نصفين"** ("صلاۃ" میرے اور میرے بندے کے درمیان منقسم ہے)۔ یہ حدیث ہے اور اس کا بیان گزر چکا ہے[۳]۔

دوسرا نام: **سورة الحمد** ہے کیوں کہ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی تعریف کا ذکر ہے جیسا کہ **الأعراف** (جنت وجہنم کے درمیان والا مقام) **الأنفال** (أموال غنیمت) اور **التوبه** (توبہ) وغیرہ کے ذکر پر مشتمل ہونے کی وجہ سے سورتوں کے نام رکھے گئے ہیں۔

تیسرا نام: علماء کے نزدیک اس کا متفق علیہ نام **فاتحة الکتاب** ہے۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ قراءتِ قرآن کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے، اس کی کتابت اسی سے شروع کی جاتی ہے اور نمازوں کا افتتاح اسی سے ہوتا ہے[۴]۔

چوتھا نام: أم الکتاب (کتاب کی بنیاد): اس نام میں اختلاف ہے جمہور علماء نے اسے جائز قرار دیا ہے۔ جب

۱۔ ابو عمرو عثمان بن سعید الدانی (م ۴۴۴ھ/۱۰۵۳ء) کا اصل وطن اندلس کا شہر دانیہ تھا، بنو امیہ کے آزادکردہ غلام تھے، علم حدیث میں کمال حاصل کیا اور علوم قرآن وتفسیر میں اپنے ہم عصروں سے سبقت لے گئے۔ مصر اور مشرق میں بھرپور علمی زندگی گزار کر اپنے وطن واپس چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ التیسیر في القراءات السبع اور سو سے زائد دیگر تصنیفات یادگار چھوڑیں۔ اعلام، کا ۴:۲۰٦

۲۔ کتاب کا نام "البیان في عدآی القرآن" ہے۔ حاجی خلیفہ اور عمر رضا کحالہ نے "جامع البیان في القراءات السبع" اور اسماعیل پاشا بغدادی نے "جامع البیان في عدآي القرآن" لکھا ہے۔ اعلام زرکلی ۴:۲۰٦، کشف الظنون ۱:۵۳۸، معجم المؤلفین ۲:۳٦۰، الهدية ۵:٦۵۳

۳۔ سورۂ فاتحہ، پہلی بحث کے ضمن میں اس کی مفصل تخریج گزر چکی ہے۔

۴۔ فتح الباري ۱۰:٦، ۷ بحوالہ مجاز القرآن/ ابوعبیدہ۔

کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ نے پسند کیا ہے(۱)۔ حسن بصری کہتے ہیں: امّ الکتاب تو حلال و حرام کے احکام والی آیات ہیں(۲)۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ﴾ [آل عمران ۳:۷] جس کی بعض آیتیں محکم ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں اور بعض متشابہ ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ اور ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اُمّ الکتاب لوح محفوظ کا نام ہے[۳] جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿وَاِنَّهٗ فِیْٓ اُمِّ الْکِتٰبِ﴾ [الزخرف ۴۳:۴] (اور بے شک یہ قرآن امّ الکتاب میں ہے)۔

پانچواں نام: امّ القرآن (قرآن کی بنیاد): اس میں بھی اختلاف ہے۔ جمہور علماء اسے درست قرار دیتے ہیں جب کہ حضرت انسؓ اور ابن سیرینؒ نے اسے ناپسند کیا ہے۔ احادیث ثابتہ ان دونوں اقوال کی تردید کرتی ہیں۔

امام ترمذیؒ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۸۰] ﴿الحَمْدُلِلّٰهِ﴾ أُمُّ القرآنِ وأُمُّ الكِتابِ والسَّبْعُ المثاني۔

الحمد للہ امّ القرآن، امّ الکتاب اور السبع المثانی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

امام بخاریؒ کہتے ہیں: اسے امّ الکتاب کا نام اس لیے دیا گیا کہ مصاحف کی کتابت کی ابتداء اسی سے ہوتی ہے اور اسی کی قراءت سے نماز شروع کی جاتی ہے[۴]۔ یحییٰ بن یعمر کہتے ہیں کہ اُمّ القریٰ مکہ ہے،

---

[۱۸۰] جامع ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب سورة الحجر ۸:۱۵۱، کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء في فضل فاتحة الکتاب۔ تحفة الأحوذي ۸: ۲۶۸، صحیح بخاری: کتاب التفسیر باب قوله: ﴿ولقد آتیناک سبعاً من المثانی﴾ بروایت ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ: "أم القرآن هي السبع المثاني والقرآن العظيم"۔ اسی کے تحت حافظ ابن حجرؒ نے ابن سیرینؒ کے قول کا رد کیا ہے۔ فتح الباری ۱۰:۳۴۸، ابوداؤد: کتاب الصلاة، باب فاتحة الکتاب ۲:۷۱، سنن دارقطنی: کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة بسم الله الرحمن الرحيم في الصلاة والجهر بها...... ۱:۳۱۲۔ اس روایت میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سبع مثانی میں سے کہا گیا ہے۔ امام دارقطنیؒ نے اس حدیث کے راوی ابوبکر الحنفي کا بیان نقل کیا ہے کہ میں یہ حدیث عبدالحمید بن جعفر سے بحوالہ نوح بن ابی ہلال مرفوعاً سننے کے بعد جب خود نوح بن ابی ہلال سے ملا تو انہوں نے مجھے یہ حدیث مرفوع نہیں سنائی بلکہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ تک موقوف سنائی۔

۱۔ تفسیر ابن عطية ۱:۴۹، حافظ ابن حجرؒ نے سہیلی کے حوالہ سے یہ قول حسن بصریؒ، ابن سیرینؒ اور بقی بن مخلدؒ کی طرف منسوب کیا ہے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کا نام ذکر نہیں کیا۔ فتح الباري ۱۰:۷

۲۔ تفسیر ابن عطية ۱:۹۱

۳۔ تفسیر الماوردي ۱:۴۶، فتح الباري، کتاب التفسیر. باب قوله: ﴿وَلَقَد آتیناکَ سَبعاً مِنَ المَثانِي﴾ ۱:۳۴۸

۴۔ صحیح بخاری: کتاب التفسیر، باب ما جاء في فاتحة الکتاب. وسمّیت أم الکتاب...... فتح الباري ۱۰:۶

اُمّ خراسان مرو ہے اور اُمّ القرآن سورة الحمد ہے[1]۔ ایک اور رائے کے مطابق اسے أم القرآن کا نام اس لیے دیا گیا کہ یہ قرآن کا آغاز ہے اور تمام قرآنی علوم کا خلاصہ اسی میں ہے۔ اسی طرح مکہ کو امّ القریٰ اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ زمین کا اوّلین حصہ ہے اور اسی سے زمین پھیلی۔ ماں کو بھی أمّ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ نسل کی بنیاد ہوتی ہے[2]۔ امیہ بن ابی الصلت زمین کو أم قرار دیتے ہوئے کہتا ہے:

فَالأرضُ مَعْقِلُنَا وَ كَانتْ أُمَّنَا فِيهَا مقَابِرُنا و فيهَا نُولد

زمین ہماری پناہ گاہ ہے، یہی ہماری ماں ہے۔ اسی میں ہماری قبریں ہیں اور اسی میں ہم پیدا ہوئے ہیں۔

عَلَمِ جنگ اس لیے اُمّ کہلاتا ہے کہ وہ فوج کے آگے آگے ہوتا ہے اور فوج اس کے پیچھے ہوتی ہے۔ امّ کی اصل "أُمَّهَة" ہے، اسی لیے جمع أمهات آتی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأُمَّهَاتُكُمْ﴾ [النساء ۴:۲۳] ۔بعض اوقات اس کی جمع ہاء کے بغیر اُمَّاتٌ بھی آتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

فَرَجْتَ الظَّلَامَ بِأُمَّاتِكَا

تو نے اپنی نسبی شرافت سے تاریکی ختم کر دی۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ أمهات کا استعمال انسانوں کے لیے ہے اور أمّات جانوروں کے لیے۔ یہ ابن فارس[3] نے "المجمل" میں لکھا ہے[4]۔

چھٹا نام: المثاني (دہرائی جانے والی): یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ یہ سورت ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ یہ سورت فاتحہ کے نام سے اس لیے موسوم کی گئی کہ یہ صرف اس امت کے لیے بچا کر رکھی گئی تھی اور اس سے پہلے کسی امت پر نازل نہیں کی گئی[5]۔

۱۔ تفسير ابن عطية ۱:۹۲؍۹۷

۲۔ تفسير الماوردي ۱:۴۶، فتح الباري ۱:۷

۳۔ ابوالحسن احمد بن فارس بن زکریا القزوینی الرازی (م ۳۹۵ھ/۱۰۰۴ء) لغت و ادب کے علامہ تھے۔ بدیع الہمدانی اور صاحب ابن عباد جیسے لوگ ان کے شاگرد ہیں۔ ان کی کثیر تصنیفات میں سے مقاییس اللغة اور المجمل بہت مشہور ہیں۔اعلام زرکلی ۱:۱۹۳

۴۔ اُمّ کی یہ ساری تحقیق ابن منظور نے ذکر کی ہے اور مکمل شعر یوں کہا ہے:

إِذِ الأُمَّهاتُ قَبَّحن الوجوهَ فَرَجتَ الظلامَ بَأمّاتِكا: لسان العرب (أم) ۱۲:۲۹-۳۰

۵۔ تفسير ابن عطية ۱:۹۲؍۹۷۔ صحیح بخاری: كتاب التفسير، باب ماجاء في الفاتحة. فتح الباری ۱۰:۳۴۸ ۔ نیز سورۂ حجر کی تفسیر میں حافظ ابن حجرؒ نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔

ساتواں نام: قرآن عظیم: یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ یہ سورت تمام علوم قرآنیہ پر مشتمل ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمال وعظمت ذکر کر کے اس کی تعریف بیان کی گئی ہے، عبادات بجا لانے اور ان میں اخلاص کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کوئی کام نہ کر سکنے کا اعتراف سکھایا گیا ہے، سیدھا راستہ دکھانے کی عاجزانہ دعاء کا ذکر ہے اور اسی طرح عہد و پیمان توڑنے والوں کے پورے حالات کا بیان اور منکرین کے انجام سے خبردار بھی کیا گیا ہے (۱)۔

آٹھواں نام: شفاء: امام دارمی حضرت ابوسعید خدری سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۱۸۱] فَاتِحَةُ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِن كُلِّ سُمّ

سورۂ فاتحہ ہر زہر کا علاج ہے۔

نواں نام: رُقْيَةٌ (دَم): یہ حضرت ابوسعید خدری کی روایت سے ثابت ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آدمی سے پوچھا جس نے قبیلے کے سردار کو فاتحہ سے دم کیا تھا:

[۱۸۲] مَاأدراكَ أنّها رُقيةٌ؟ فقال: يَا رسول اللّٰه! شيءٌ أُلقِيَ في روعِي۔

تجھے سورہ فاتحہ کے دم ہونے کا کیسے علم ہوا؟" اس نے جواب دیا: یا رسول اللہ! میرے ذہن میں یہ بات ڈال دی گئی۔ یہ حدیث ائمہ حدیث نے نقل کی ہے۔ پوری حدیث آئندہ آئے گی۔

دسواں نام: اساس (بنیاد): ایک آدمی نے شعبی سے پہلو میں درد کی شکایت کی تو انہوں نے مشورہ دیا

---

[۱۸۱] سنن دارمی: كتاب فضائل القرآن، باب فضل فاتحة الكتاب۲:۳۲۰۔ اس میں "سم" (زہر) کی بجائے "داء" (بیماری) منقول ہے اور اس کے راوی عبدالملک بن عمیر ہیں۔ شعب الإيمان، التاسع عشر من شعب الإيمان ذكر فاتحة الكتاب ۲:۴۵۰ بروایت حضرت ابوسعید خدریؓ: "فاتحة الكتابِ شفاء من السم" ہے، اسی باب میں "شفا من كل داء" بھی ہے مگر امام بیہقیؒ نے اس روایت کو منقطع کہا ہے۔ شوکانیؒ نے فتح القدير، سورة الفاتحة میں سعید بن منصورؒ اور بیہقیؒ کے حوالہ سے "فاتحة الكتاب شفاء من كل سُقم" نقل کیا ہے۔

[۱۸۲] صحیح بخاری: كتاب الإجارة ، باب مايعطى في الرقية...... فتح الباری ۶:۳۳۸، كتاب الطب. باب الرقي بفاتحة الكتاب. ایضاً ۱۳:۱۰۴، صحیح مسلم بشرح النووی: كتاب السلام، باب جواز أخذ الأجرة على الرقية...... ۷:۴۴۳۔ ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، ابن حبانؒ، حاکمؒ، احمدؒ، بیہقیؒ، اور دارقطنیؒ وغیرہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

---

(۱) یہ تمام باتیں حافظ ابن حجر نے امّ القرآن کے تحت حرف بحرف ذکر کی ہیں۔ فتح الباري ۱۰:۷

کہ تم قرآن مجید کی اساس فاتحۃ الکتاب کو پڑھ کر دم کرو۔ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا کہ ہر چیز کی ایک اساس (بنیاد) ہوتی ہے۔ دنیا کی بنیاد مکہ مکرمہ ہے کیوں کہ اسی سے دنیا پھیلی، آسمانوں کی بنیاد عریبا یعنی ساتواں آسمان ہے۔ زمین کی بنیاد عجیبا یعنی نچلی ساتویں زمین ہے۔ جنتوں کی بنیاد جنت عدن ہے جو کہ ان کا مرکزی حصہ ہے اور اسی پر جنتوں کی بنیاد رکھی گئی۔ آگ کی بنیاد جہنم ہے جو سب سے نچلی ساتویں تہہ کا نام ہے اور اسی پر دوسرے درجات کی بنیاد رکھی گئی۔ انسانوں کی بنیاد حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ پیغمبروں کی بنیاد حضرت نوح علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی بنیاد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں۔ (آسمانی) کتابوں کی بنیاد قرآن مجید، قرآن مجید کی بنیاد سورۂ فاتحہ، اور فاتحہ کی بنیاد بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے۔ اس لیے اگر تو بیمار ہو یا تجھے کوئی تکلیف ہو تو سورہ فاتحہ پڑھا کر شفا پائے گا۔

گیارھواں نام: وافیۃ (مکمل): یہ سفیان بن عُیینہؒ کا قول ہے کیوں کہ یہ نہ تقسیم ہوتی ہے اور نہ اس کے ٹکڑے کیے جا سکتے ہیں۔ اگر کوئی اور سورت آدھی ایک رکعت میں پڑھی جائے اور باقی دوسری رکعت میں پڑھ لی جائے تو جائز ہے مگر فاتحہ کو دو رکعتوں میں تقسیم کرنا جائز نہیں۔

بارھواں نام: کافیۃ (کفایت کرنے والی):[۱] یحییٰ بن ابی کثیر فرماتے ہیں: اس سورت کو کافیۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ دوسری سورتوں کی جگہ پڑھی جائے تو کافی ہو جاتی ہے مگر کوئی دوسری سورت اس کی جگہ کام نہیں دیتی۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی ہے جسے محمد بن خلاد اسکندرانی[۲] نے روایت کیا ہے کہ:

[۱۸۳] أمّ القُرآن عوضٌ مِن غيرها وليس غيرها منها عِوَضًا۔

امّ القرآن دوسری سورتوں کا بدل بن سکتی ہے لیکن دوسری سورتیں اس کا بدل نہیں بن سکتی۔

[۱۸۳] سنن دارقطنی: کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة أم الكتاب في الصلاة وخلف الإمام ۱:۳۲۲۔ امام دارقطنی کہتے ہیں اسے اشہب سے صرف خلاد نے اور اشہب نے ابن عیینہ سے نقل کیا ہے، مستدرک حاکم: کتاب الإمامة وصلاة الجماعة، باب التأمين ۱:۳۶۳۔ امام حاکم کہتے ہیں شیخین اس حدیث کو زہری سے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اور اس حدیث کے اکثر راوی ائمہ ہیں اور سب کے سب شیخین کے معیار کے مطابق ثقہ ہیں۔

۱۔ رازی: التفسير الكبير، الباب الاول ۱:۱۷۹-۱۸۳، فتح الباري ۱۰:۷

۲۔ ابوعبداللہ محمد بن خلاد بن ہلال اسکندرانی (م ۲۳۱ھ) کو حافظ ذہبی نے غیر معروف کہا ہے، ابو سعید بن یونس کہتے ہیں: یہ غیر معروف روایات نقل کرتے ہیں۔ میزان الاعتدال ۳:۵۳۷۔ ابن حجرؒ نے عجلیؒ اور ابن حبانؒ کے حوالہ سے انہیں ثقہ قرار دیا ہے۔ لسان الميزان ۵:۱۵۶

پانچویں بحث: سورہ فاتحہ کا کون سا حصہ رقیہ (دم) ہے؟

مہلب کہتے ہیں: دم کرنے کے لیے﴿اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کے الفاظ ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ پوری سورت ہی دم ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب صحابیؓ نے فاتحہ سے دم کرنے کے متعلق بتایا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمایا: ''تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ دم ہے؟'' یوں نہیں فرمایا کہ اس میں دم ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پوری سورت ہی دم ہے کیوں کہ یہ قرآن مجید کا افتتاح اور اس کی ابتداء ہے اور تمام علوم پر مشتمل ہے، جیسا کہ گزر چکا[1]۔ واللہ اعلم۔

چھٹی بحث: کیا مثاني اور أمّ الکتاب صرف سورۂ فاتحہ ہی کے نام ہیں؟

اسے مثاني اور أمّ الکتاب کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری سورتوں یا آیات وغیرہ کو یہ نام نہیں دیے جا سکتے[2]۔ اللہ جل شانہ کے ارشاد:﴿کِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ﴾ [الزمر ۳۹:۲۳] (کتاب جس کی آیتیں باہم ملتی جلتی ہیں اور دہرائی جاتی ہیں) میں اس کا اطلاق قرآن پر کیا گیا ہے۔ قرآن کو مثانی اس لیے کہا گیا کہ اس میں واقعات دہرائے جاتے ہیں۔ سات لمبی سورتوں کو بھی مثانی کہا جاتا ہے کیوں کہ ان میں فرائض اور واقعات کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سات مثانی عطا کی گئی ہیں اور اس سے مراد سات لمبی سورتیں ہیں۔ یہ روایت امام نسائی نے نقل کی ہے[3]۔ ان میں سے چھ سورتیں تو البقرۃ سے الاعراف تک ہیں اور ساتویں میں اختلاف ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سورہ ''یونس'' ہے اور ایک رائے یہ ہے کہ ''انفال اور توبہ'' ہیں۔ یہ مجاہد اور سعید بن جبیر کا قول ہے۔ اعشیٰ ہمدانی[4] کہتا ہے:

فَلِجُوا المَسْجِدَ وَادعُوا ربَّكُم و ادْرُسوا هٰذِي المثَانِي والطِول[5]

مسجد میں داخل ہو جاؤ اور اپنے رب کو یاد کرو اور یہ مثانی اور طویل سورتیں سیکھ لو۔

۱۔ چوتھی بحث: سورۂ فاتحہ کے نام۔ نواں نام ''رقیہ'' (دم) بحوالہ صحیح بخاری: کتاب الإجارۃ، باب ما يعطى في الرُّقى اور کتاب الطب، باب الرقي بفاتحة الكتاب. فتح الباری ۶:۳۳۸ و۱۳:۱۰۴ وغیرہ۔

۲۔ تفسیر الماوردي ۱:۴۶

۳۔ سنن نسائی: کتاب افتتاح الصلاۃ، تاویل قول اللہ جل ثناوہ: "لقد آتیناک سبعًا من المثانی" ۱:۳۱۸

۴۔ عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن حارث بن نظام المعروف اعشیٰ ہمدان۔ کوفہ کے بہت بڑے شاعر تھے۔ حجاج بن یوسف نے بنو ثقیف کے خلاف شعر کہنے کی وجہ سے انہیں قتل کروا دیا تھا۔

۵۔ تفسیر الماوردي ۱:۴۶

اس کی مزید تفصیل سورۂ حجر میں اِن شاء اللہ آئے گی۔

ساتویں بحث: مثانی اور طُوَل کی تحقیق

مثاني مَثنٰی کی جمع ہے اور مَثنٰی وہ ہے جو اوّل کے بعد آئے۔ اور طُوَل اَطْوَل (لمبی) کی جمع ہے۔سورۂ انفال کو مثانی میں اس لیے شمار کیا گیا کہ مقدار میں طول کے ساتھ ملتی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ اس کی آیات مفصّل سے زیادہ اور مئین سے کم ہیں۔ مئین وہ سورتیں ہیں جن میں سے ہر ایک کی آیات سو سے زیادہ ہوں۔

☆☆☆☆☆

باب:۲

سورۂ فاتحہ کا شانِ نزول اور اس کے احکام

اس باب میں بیس مباحث ہیں:

پہلی بحث: سورۂ فاتحہ کی قرآنیت اور آیات کی تعداد

فاتحہ کی آیات کی تعداد

اس بات پر اُمت کا اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ میں سات آیات ہیں[1]، سوائے اس قول کے جو حسین الجعفی[2] سے نقل کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ اس میں چھ آیات ہیں مگر یہ قول شاذ ہے۔ اسی طرح جو قول عمرو ابن عبید[3] سے منقول ہے کہ وہ "إِیَّاکَ نعبد"[4] کو الگ آیت قرار دیتے ہیں جس کی بنا پر فاتحہ کی آیات کی تعداد آٹھ بن جاتی ہے، یہ قول بھی شاذ ہے اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ آتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي﴾ [الحجر ۱۵:۸۷] (اور ہم نے آپ کو سات آیتیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں عطا فرمائی ہیں)۔

[۱۸۴] اور حدیث قدسی: "قَسَمْتُ الصلاۃ....." ان دونوں اقوال کی تردید کرتے ہیں۔

---

[۱۸۴] جامع ترمذی: کتاب التفسیر القرآن، باب ومن سورۃ الحجر. تحفۃ الأحوذی ۳۶۹/۸

۱۔ ابن العربی:احکام القرآن ۱:۵

۲۔ ابو علی حسین بن علی بن ولید الجعفی (م۲۰۳ھ) کوفہ کے نامور محدّث، ثقہ اور معلم قرآن ہیں۔ اصحاب صحاح نے ان کی روایات نقل کی ہیں۔ تھذیب التھذیب ۲:۳۵۷-۳۵۹

۳۔ ابو عثمان عمرو بن عبید بصری (م۱۴۴ھ) بہت بڑے عابد زاہد تھے مگر بعد میں معتزلی ہوگئے۔ محدّثین نے روایت کے معاملہ میں انہیں ضعیف، متروک اور کذاب قرار دیا ہے۔ تھذیب التھذیب ۸:۷۰-۷۵ الکامل في الضعفاء ۵:۱۷۵۰-۱۷۶۳

۴۔ جبریہ اور قدریہ کی اس رائے کا رد امام رازی نے کیا ہے تفسیر کبیر ۱:۲۵۶ امام طبری نے بھی "ایاک نعبد" پر وقف کی تردید کی ہے۔تفسیر طبری ۱:۵۵

فاتحہ کی قرآنیت

اس بات پر بھی اُمت کا اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ قرآن میں سے ہے۔ اگر کہا جائے کہ فاتحہ قرآن میں سے ہوتی تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اسے ضرور اپنے مصحف میں لکھ لیتے۔ مصحف میں نہ لکھنا ثابت کرتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ قرآن کا حصہ نہیں تھی، جیسا کہ معوذتین (سورۂ فلق اور ناس) کے بارے میں ان کی رائے ہے[1]۔ اس کا جواب علامہ ابوبکر ابن الأنباری نے دیا ہے، وہ کہتے ہیں: ہم سے حسن بن حباب نے بیان کیا، ان سے سلیمان بن اشعث نے، ان سے ابن ابی قدامہ نے، ان سے جریر نے ذکر کیا، جریر نے اعمش سے روایت کی اور کہا کہ میرے خیال میں اعمش نے ابراہیم سے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے مصحف میں سورۂ فاتحہ کیوں نہیں لکھی؟ تو انہوں نے جواب دیا: اگر میں لکھتا تو اسے ہر سورت سے پہلے لکھتا۔ ابوبکر کہتے ہیں اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ہر رکعت کی ابتداء کا طریقہ یہ ہے کہ ام القرآن (سورۂ فاتحہ) سے شروع کی جائے اور اس کے بعد دوسری سورت پڑھی جائے گویا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا کہ میں نے اسے چھوڑ کر اختصار سے کام لیا اور اس بارے میں مسلمانوں کے اہتمام کو کافی سمجھا۔ اسے کسی بھی جگہ اس لئے نہیں لکھا کہ ہر سورت سے پہلے اس کا لکھنا میرے لئے ضروری نہ ہو جائے کیوں کہ یہ نماز میں ہر سورت سے پہلے ہوتی ہے[2]۔

دوسری بحث: سورۂ فاتحہ مکی ہے یا مدنی؟

سورۂ فاتحہ کے مکی یا مدنی ہونے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، قتادہ اور ابو عالیہ ریاحی جن، کا نام رُفَیع ہے اور بعض دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ یہ سورت مکی ہے۔ جب کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ

۱۔ اسے بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں اور علامہ سیوطی نے الإتقان میں ابن سیرین کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ان دونوں سورتوں کی قرآنیت تواتر سے ثابت تھی مگر ہوسکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کے لکھنے کی اجازت خود نہ سنی ہو اس لئے اس تواتر کے باوجود لکھنے سے احتراز فرمایا۔ صحیح بخاری: کتاب التفسیر، باب سورة الناس. الإتقان ۱:۱۸۳ النوع التاسع عشر فی عدد سورہ و آیاتہ.

۲۔ حافظ ابن حجر نے اس پر مفصل بحث کی ہے۔ بزار کہتے ہیں: معوذتین کو قرآن مجید میں نہ لکھنے میں کسی بھی صحابی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے پر عمل نہیں کیا اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی مرتبہ نماز میں معوذتین پڑھنا اور ان کے پڑھنے کا حکم دینا ثابت ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا مقصود معوذتین کی قرآنیت کا انکار ہرگز نہیں بلکہ انہوں نے انہیں اپنے مصحف میں لکھنے سے انکار کیا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ صرف ان آیات کو لکھنے کے قائل تھے جن کے لکھنے کا حکم زبانِ رسالت سے خود سنتے اور معوذتین کے لکھنے کا حکم ان تک نہ پہنچ سکا۔ یہی معاملہ سورۂ فاتحہ کا بھی ہے۔ فتح الباری: کتاب التفسیر، باب سورة الناس. ۸:۶۱۵

عنہ، مجاہد، عطاء بن یسار اور زہری وغیرہم ؒ اس کے مدنی ہونے کے قائل ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آدھی سورت مکہ میں نازل ہوئی اور آدھی مدینہ میں۔ یہ قول ابواللیث نصر بن محمد سمرقندی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ ان میں صحیح ترین پہلا قول ہے کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَقَدْ آتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ﴾ سورۂ حجر میں ہے جس کے مکی ہونے پر اجماع ہے[۱]۔ دوسرے اس بات میں بھی اختلاف نہیں کہ نماز مکہ میں ہی فرض ہوگئی تھی اور یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ اسلام میں کبھی ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ کے بغیر کوئی نماز پڑھی گئی ہو[۲]۔ اس کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا درج ذیل ارشاد گرامی بھی ہے:

[۱۸۵] لاصلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب۔

یعنی سورۂ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔

پھر اس سے مراد نماز میں سورۂ فاتحہ کا حکم ہے نہ کہ نماز کی ابتداء کے بارے میں بتانا، واللہ اعلم۔

قاضی ابن الطیب کہتے ہیں: نزول کے اعتبار سے قرآن کی اولین سورت میں علماء کا اختلاف ہے۔ کوئی "مدثر" کو پہلی سورت قرار دیتا ہے کوئی "اقراء" کو اور کوئی فاتحہ کو۔ امام بیہقی[۳] نے "دلائل النبوۃ" میں ابو میسرہ عمرو بن شرحبیل[۴] سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

[۱۸۶] إنّي إذَا خلوتُ وَحدِي سمعتُ نداء، وقد وَاللّٰه خشيتُ أن يكون هذا أمرًا۔

---

[۱۸۵] جامع ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب لاصلاۃ الابفاتحۃ الکتاب. تحفۃ الاحوذی ۲:۵۵،سنن دارمی: کتاب الصلاۃ، باب لاصلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب ۱:۲۲۷، صحیح بخاری کتاب صفۃ الصلاۃ، باب وجوب القراء ۃ للامام و الماموم.

[۱۸۶] دلائل النبوۃ: جماع أبواب المبعث، باب مبتدأ البعث والتنزیل ۲:۱۳۵۔ امام بخاری نے بھی یہ واقعہ نقل کیا ہے مگر اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ذکر نہیں، نہ نزول فاتحہ کا ذکر ہے، صرف "اقرأ" کے بعد "سورۃ المدثر" کے نزول کا ذکر ہے۔ صحیح بخاری: کتاب الوحی، باب کیف بدا الوحی. البتہ واحدی نے سورۂ فاتحہ کے نزول کے ذکر کے ساتھ یہ واقعہ حضرت ابومیسرہ ہی سے بالاختصار نقل کیا ہے۔ اسباب نزول القرآن ص ۲۲

۱۔ تفسیر السمرقندی ۱/۷۸۔ اسباب نزولِ القرآن/ الواحدی ص ۲۲۔ فتح الباری ۱۰:۱۱، تفسیر کبیر ۱:۱۸۳

۲۔ واحدی: اسباب نزول القرآن ص ۲۳

۳۔ شیخ خراسان، ابوبکر احمد بن حسین بن علی البیہقی (م ۴۵۸ھ/۱۰۶۶ء) بلند پایہ محدث اور اپنے وقت میں علم حدیث کے امام تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک ہزار کے قریب کتابیں تصنیف کیں جن میں سے السنن الکبیر. السنن الصغیر، شعب الایمان اور دلائل النبوۃ وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ معجم المولفین ۱:۲۰۶

۴۔ ابومیسرہ عمرو بن شرحبیل الھمدانی الکوفی (م ۶۳ھ) زہد و عبادت میں مشہور اور کوفہ میں مسجد بنی وادعہ کے امام تھے۔ انہوں نے حضرت عمر، علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم اور دیگر حضرات سے روایات نقل کی ہیں۔ ابن حبان نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تہذیب التہذیب ۸:۴۶۔ سیر اعلام النبلاء ۴:۱۳۵۔ ثقات ابن حبان: ۵:۱۶۸

قالتْ: معاذَ اللّٰه!ماكان اللّٰه لِيَفعلَ بِكَ، فوَ اللّٰهِ إنّكَ لَتُؤَدّي الأمانَة، وتَصِلُ الرَّحِمَ، و تَصْدُقُ الحديثَ۔

میں جب اکیلا ہوا تو ایک آواز سنی۔ اللہ کی قسم مجھے خطرہ ہوا کہ کوئی مصیبت نہ ہو۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اللہ کی پناہ! اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز مصیبت میں مبتلا نہ کریں گے، اللہ کی قسم آپ تو امانت ادا کرتے ہیں، صلہ رحمی کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں۔

پھر کچھ دیر بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی غیر موجودگی میں ان سے یہ واقعہ بیان کیا اور فرمایا: اے عتیق! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ بن نوفل [1] کے پاس لے چلیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپ کا ہاتھ تھام لیا اور کہا: آیئے ورقہ بن نوفل کے پاس چلتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: آپ کو کس نے بتایا ہے تو انہوں نے جواب دیا: خدیجہؓ نے۔ پھر وہ دونوں ورقہ کے پاس گئے اور واقعہ سنایا جس میں آپ نے فرمایا: ''إذا خلوتُ وَحْدِی سمعتُ نداء خلفي يا محمَّد يا محمَّد فانطلِقُ هاربًا في الأرض''۔ (جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو پیچھے سے اے محمد اے محمد کی آواز سنائی دیتی ہے چناں چہ میں ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہوں)۔ ورقہ نے کہا: آئندہ ایسا نہ کریں اور جب ایسی آواز آئے تو ٹھہر جائیں اور جو آواز آتی ہے اسے غور سے سنیں پھر میرے پاس آکر بتائیں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا ہوگئے تو آواز آئی: ''اے محمدؐ'' کہیے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ. اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ......﴾ یہاں تک کہ وَلَاالضَّآلِّيْنَ تک پہنچ گئی۔ پھر آواز آئی کہ لَا إلٰهَ إلَّا اللّٰه کہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ورقہ کے پاس تشریف لائے اور سارا واقعہ بیان کیا۔ ورقہ نے کہا: آپ کے لئے خوش خبری ہو، پھر آپ کے لئے خوش خبری ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ وہی ہیں جن کی بشارت حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام نے دی تھی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو شریعت دی گئی تھی ویسی ہی آپ کو بھی ملے گی۔ آپ اللہ کی طرف سے بھیجے ہوئے نبی ہیں۔ آج کے بعد آپ کو جہاد کا حکم دیا جائے گا۔ اگر یہ وقت

۱۔ ورقہ بن نوفل بن اسد امّ المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے چچازاد بھائی تھے۔ عیسائیت کے پیروکار، بہت بڑے عبادت گزار اور تورات و انجیل دونوں کا علم رکھتے تھے۔ ہجرت سے بارہ سال پہلے وفات پائی۔ الکامل ۲:۴۹، ذکر ابتداء امرِ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

میری زندگی میں آیا تو میں ضرور آپ کی معیت میں لڑوں گا۔ پھر جب ورقہ بن نوفل وفات پا گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:''لَقد رأيتُ القَسَّ في الجنّةِ عليهِ ثيابُ الحرير لأنّه آمنَ بِي و صَدّقَنِي''۔ (میں نے اس پادری کو جنت میں ریشم کا لباس پہنے ہوئے دیکھا، کیوں کہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی)۔ یہاں پادری سے مراد ورقہ بن نوفل ہیں۔ امام بیہقی فرماتے ہیں یہ حدیث منقطع ہے۔ اگر یہ ثابت بھی ہوتی تو احتمال ہے کہ سورۂ فاتحہ کے نزول کا یہ واقعہ ﴿اِقْرأْ بِاسْمِ رَبِّکَ﴾ [العلق ۹۶: ۱] اور ﴿ يٰأَ يُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ [المدثر ۷۴: ۱] کے بعد کا ہوگا۔

تیسری بحث: سورۂ فاتحہ جبریل علیہ السلام لے کر آئے یا کوئی اور فرشتہ؟

ابن عطیہ کہتے ہیں: کچھ علماء کا خیال ہے کہ سورۃ الحمد کا نزول حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے نہیں ہوا۔ امام مسلم نے حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ:

[۱۸۷] بينمَا جبريل قاعدٌ عِندَالنبيِّ صلى اللّٰه عليهِ وسلَّم سَمِع نقيضًا من فوقِه، فَرفَعَ رأسهُ فقال: هٰذا بابٌ مِنَ السّماءِ فُتِح اليَومَ لم يُفتَحِ قطّ إلاالیومَ، فنزَل منهُ ملَكٌ فقال: هٰذا مَلَكٌ نَزَلَ إلى الأرضِ لمُ يَنزِل قطّ إلّااليوم، فسلّمَ وقال: أبْشِرْ بنُورَينِ أُوتيتَهُمَا لمُ يُؤْتَهُمَا نَبِيٌّ قبلكَ: فاتحة الكتاب، وخواتيم سورة البقرة، لن تقرأَ بِحَرفٍ مِنهما إلا أعْطِيتَه۔

جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اسی اثناء میں اوپر سے ایک آواز سنی۔ چناں چہ انہوں نے سر اٹھایا اور کہا کہ یہ آسمان کا ایک دروازہ ہے جو آج ہی کھلا ہے اور آج سے پہلے کبھی نہیں کھولا گیا۔ اس دروازے سے ایک فرشتہ اترا۔ پھر جبریل علیہ السلام نے کہا کہ یہ وہ فرشتہ ہے جو آج ہی زمین پر اترا ہے، آج سے پہلے کبھی نہیں اترا۔ پھر اس فرشتے نے آکر سلام کیا اور کہا کہ آپ کو دونوں نور مبارک ہوں جو آپ کو دیئے گئے ہیں اور آپ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دیئے گئے، ایک سورۂ فاتحہ ہے اور دوسرا

[۱۸۷] صحیح مسلم: كتاب صلاة المسافرين و قصرها باب فضل الفاتحة و خواتيم سورة البقرة. ۱:۵۵۴، سنن نسائی: كتاب الإفتتاح، باب فضل فاتحة الكتاب ۲:۱۳۸، حاکم: كتاب فضائل القرآن، أخبار فى فضائل القرآن جملة ۱: ۷۴۰، أبو يعلى: مسند ابن عباس ۴:۳۷۱، بيهقي: شعب الإيمان، التاسع عشر......، ذكر فاتحة الكتاب ۲:۴۴۵

سورۂ بقرہ کی آخری آیتیں۔ ان میں سے جیسے ہی آپ کوئی حرف زبان پر لائیں گے آپ کی بات پوری کی جائے گی۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں کہ اس حدیث کا یہ مطلب لینا درست نہیں۔ بلکہ اس سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتے سے پہلے آئے اور اس فرشتے کی اور جو کچھ وہ لا رہا تھا اس کی اطلاع آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ اس طرح سورۂ فاتحہ کے نزول میں وہ بھی شریک رہے[1]۔ واللہ اعلم۔

مؤلف کا تبصرہ

میں کہتا ہوں کہ ظاہری طور پر اس حدیث سے یہی پتہ چلتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورت کے بارے میں کوئی بات نہیں بتائی مگر یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سورۂ فاتحہ مکہ میں نازل ہوئی اور حضرت جبریل علیہ السلام اسے لے کر آئے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ [الشعراء ۲۶: ۱۹۳] (اسے لے کر روح الامین اترے)، اس میں پورا قرآن شامل ہے۔ اس طرح فاتحہ کی تلاوت تو حضرت جبریل علیہ السلام مکہ میں لے کر آئے اور اس کے ثواب کی خبر اس فرشتے کے ذریعے مدینہ میں نازل ہوئی، واللہ اعلم۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ سورت مکی بھی ہے اور مدنی بھی اور یہ جبریل علیہ السلام کے ذریعے دو مرتبہ نازل کی گئی[2]۔ یہ رائے ثعلبی[3] نے نقل کی ہے مگر جو توجیہ ہم نے ذکر کی ہے وہ زیادہ بہتر ہے، کیوں کہ اس سے قرآن اور حدیث دونوں میں مطابقت ہو جاتی ہے۔ اس پر اللہ کا شکر اور اسی کا احسان ہے۔

چوتھی بحث: نماز میں سورۃ فاتحہ سے پہلے کچھ پڑھا جا سکتا ہے یا نہیں؟

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ صحیح قول کے مطابق بسم اللہ سورۂ فاتحہ کی آیت نہیں ہے اور جب یہ ثابت

۱۔ تفسیر ابن عطیہ، آیت مذکورہ

۲۔ امام ابواللیث سمرقندی نے ایک رائے یہ بھی نقل کی ہے کہ فاتحہ آدھی مکہ میں نازل ہوئی اور آدھی مدینہ میں۔ علامہ سیوطی نے بھی یہی لکھا ہے کہ بعض لوگوں کے خیال میں سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی۔ تفسیر سمرقندی ۱: ۷۸، سیوطی: التحبیر ص ۴۳

۳۔ ابو اسحاق احمد بن محمد بن ابراہیم الثعلبی (م ۴۲۷ھ/۱۰۳۵ء) نیشاپور کے مشہور قاری، واعظ اور مفسر تھے۔ ان کی تصنیفات میں سے "الکشف والبیان عن تفسیر القرآن" تفسیر ثعلبی کے نام سے بہت مشہور ہوئی۔ معجم المؤلفین ۲: ۶۰

ہو چکا تو نمازی کے لئے حکم یہ قرار پایا کہ فاتحہ کو تکبیر تحریمہ کے فوراً بعد پڑھے[1]۔ نہ خاموش رہے، نہ "إنّي وجّهتُ" یا ثناء پڑھے جیسا کہ حضرت عائشہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما کی احادیث گزر چکی ہیں اور ان کے علاوہ بھی اس بارے میں احادیث ملتی ہیں۔

ثناء کا ثبوت

توجیہ (إنّي وجّهت......)، تسبیح (ثناء) اور سکوت کے متعلق بھی احادیث موجود ہیں اور علماء کی ایک جماعت اس کی قائل بھی ہے۔ چناں چہ حضرت عمر بن خطاب اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے متعلق روایت ہے کہ جب وہ نماز شروع کرتے تو کہتے:

[۱۸۸] سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالىٰ جَدُّكَ وَلَآ اِلٰهَ غَيْرُكَ۔

اے اللہ! تو پاک ہے، تیری حمد سے شروع کرتا ہوں، تیرا نام مبارک ہے، تیری شان بلند ہے اور تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔

سفیان ثوری[2]، امام احمد، اسحاق اور احناف بھی اسی کے قائل ہیں[3]۔

---

[۱۸۸] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب حجۃ من قال لایجهر بالبسملۃ. ۱:۲۹۹۔ائمہ حدیث ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، ابن حبان، ابن خزیمہ، ابویعلی، عبدالرزاق، طبرانی، بیہقی اور دارقطنی وغیرہم نے بھی متعدد مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم کی نمازوں کی ابتداء یہی لکھی ہے۔ امام شوکانیؒ نے نیل الاوطار، باب ما جاء فی بسم اللہ الرحمن الرحیم و حدیث انس فی عدم الجهر ۱:۴۹۳ میں بھی یہ روایات جمع کی ہیں۔

۱۔ حضرات فقہاء مالکیہ کے نزدیک سورۂ فاتحہ سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھنی چاہئے اور ان کی دلیل حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان ہے کہ میں نے حضرت ابوبکر، عمر، عثمان رضی اللہ عنہم سب کے پیچھے نمازیں پڑھیں۔ اُن میں سے کوئی بھی سورت فاتحہ سے پہلے بسم اللہ نہیں پڑھا کرتا تھا۔ حنفیہ کے نزدیک بسم اللہ پڑھنی تو چاہئے لیکن آہستہ آواز سے، کیوں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کے اس قول میں دوسری روایت بھی منقول ہے جس میں ''بسم اللہ'' نہیں پڑھتے تھے کی بجائے ''بلند آواز سے نہیں پڑھتے تھے'' کے الفاظ ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے ان روایات اور ان کی اسانید پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ شیخ الحدیث مولانا زکریاؒ نے امام بخاری، احمد اور نسائیؒ کے حوالہ سے بھی حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہی ارشاد نقل کیا ہے کہ وہ حضرات بسم اللہ بلند آواز سے نہیں پڑھا کرتے تھے۔ اس مسئلہ پر کتب تفسیر، حدیث اور فقہ میں تفصیلی مباحث ہیں۔ دیکھئے موطا امام مالک، العمل فی القراءۃ، اوجز المسالک ۲/۷۸، التمهید لما فی الموطا من المعانی والإسانید ۲/۲۲۸: احادیث حمید الطویل، احکام القرآن / ابن العربی ۱ : ۲۱، جصاص احکام القرآن ۱:۱۵، رد المختار ۱:۳۶۲

۲۔ ابو عبداللہ سفیان بن سعید بن مسروق ثوری (م۱۶۱ھ / ۷۷۷ء) کوفہ کے نامور فقیہ اور سید الحفاظ ہیں۔ ان کو امیر المومنین فی الحدیث کا لقب دیا گیا ہے۔ تهذیب التهذیب ۴:۱۱۱

۳۔ مرغینانی: الهدایہ کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ. عینی: شرح الهدایۃ ۱:۶۱۱

امام شافعیؒ کا نقطہ نظر وہی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

[۱۸۹] أنّه كانَ إذا افتتَحَ الصلاةَ كبّرَثم قال: "وَجَّهْتُ وَجْهِيَ"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو پہلے تکبیر کہتے پھر فرماتے: "وجّهتُ وَجْهِي......(۱)"۔ یہ حدیث امام مسلم نے نقل کی ہے۔

سورۂ انعام کے آخر میں پوری حدیث ذکر ہوگی اور وہیں ان شاء اللہ اس مسئلہ پر مکمل بحث بھی ہوگی۔

ابن منذر(۲) کہتے ہیں کہ یہ بات بھی ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز کے لئے تکبیر تحریمہ کہتے تو کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتے اور قراءت سے پہلے فرماتے:

[۱۹۰] اللّٰهُمّ باعِدْ بَيني و بينَ خطاياي كما باعدتَ بينَ المشرق و المغرب، اللّٰهم نقّني من خطاياي كما يُنَقَّى الثوبُ الأبيضُ منَ الدَّنَسِ، اللهم اغسلني مِن خطاياي بالماء و الثلج و البردِ۔

اے اللہ! میرے اور میری غلطیوں کے درمیان اتنی دوری پیدا کر، جتنی دوری تو نے مشرق و مغرب میں پیدا کی ہے۔ اے اللہ! مجھے میری خطاؤں سے ایسا پاک کر جیسے سفید کپڑے میل سے پاک کئے جاتے ہیں۔ اے اللہ! میری خطاؤں کو پانی، برف اور اولوں سے دھو دے۔

---

[۱۸۹] صحیح مسلم: كتاب صلاة المسافرين و قصرها، باب الدعاء في صلاة الليل وقيامه ۱:۵۳۴۔ اس کے علاوہ محدثین نے پچاس کے قریب مقامات پر اس طرح کے الفاظ نقل کئے جن میں سے بعض کا حوالہ سورۂ انعام میں اس بحث کے ضمن میں ان شاء اللہ آئے گا۔

[۱۹۰] صحیح بخاری: كتاب صفة الصلاة، باب مايقول بعد التكبير ۱ : ۲۵۹، صحیح مسلم: كتاب المساجد و مواضع الصلاة، باب ما يقال بين تكبيرة الاحرام والقراءة ۱:۳۱۹، سنن ابو داؤد: كتاب الصلاة، باب السكتة عند الإفتتاح ۱:۲۰۷، سنن نسائی: كتاب الطهارة، باب الوضوء بالثلج ۱:۵۰، كتاب الإفتتاح، باب الدعاء بين التكبيرة والقراءة ۲:۱۲۸، سنن ابن ماجہ: كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب افتتاح الصلاة ۱:۲۶۴، سنن داری: كتاب الصلاة، باب في السكتتين ۱:۳۰۱، صحیح ابن حبان: كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۵:۷۴، صحیح ابن خزیمہ: كتاب الصلاة، باب إباحة الدعاء بعد التكبير وقبل القراءة...... ۱:۲۳۷، مسند ابویعلی: مسند أبي هريرة رضي الله عنه ۱۰:۳۶۶، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب في سكتتي الإمام ۲:۳۰

۱۔ إنّي وجّهتُ وَجْهِيَ للذِى فطرَالسموات والأرضَ......الخ. الانعام ۶:۷۹، الأم، باب افتتاح الصلاة ۱:۱۲۸، عینی: شرح الهداية ۱ :۲۱۱

۲۔ شیخ الحرم ابوبکر محمد بن ابراہیم بن منذر نیشاپوری (م۳۰۹ھ) نامور محدث، فقیہ اور مجتہد ہیں۔ الإشراف على مذاهب أهل العلم. وغیرہ ان کی متعدد تصانیف ہیں۔ سیر اعلام النبلاء: تعارف: ۲۷۹۶، لسان الميزان، تعارف: ۶۹۴۵

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کا معمول بھی یہی تھا۔

ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن[۱] کہتے ہیں: امام کے لئے خاموشی کے دو مواقع ہیں۔ ان میں کچھ پڑھنے کو غنیمت جانو۔ امام اوزاعی، سعید بن عبدالعزیز[۲] اور امام احمد بن حنبل اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پر عمل ہی کو ترجیح دیتے تھے[۳]۔

پانچویں بحث: نماز میں سورۂ فاتحہ کا حکم

ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ

نماز میں فاتحہ کی قراءت واجب ہے یا نہیں، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال فقہاء کہتے ہیں کہ امام اور منفرد دونوں کے لئے ہر رکعت میں فاتحہ کی قراءت واجب ہے۔ ابن خویز مند بصری مالکی[۴] کہتے ہیں کہ امام مالک کے اس قول میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کوئی شخص دو رکعات والی نماز میں سے ایک رکعت میں سورۂ فاتحہ بھول جائے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ البتہ تین یا چار رکعات والی نماز میں سے ایک رکعت میں فاتحہ بھول جانے کے متعلق ان کے مختلف اقوال ہیں۔ ایک قول یہ ہے کہ نماز لوٹائے اور دوسرا یہ ہے کہ سہو کے دو سجدے کرے۔ ان سے ابن عبدالحکم[۵] اور بعض دیگر حضرات نے امام مالک رحمہ اللہ سے یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن خویز منداد نے ایک رائے یہ ذکر کی ہے کہ اس رکعت کو لوٹائے اور سلام کے بعد سجدہ سہو کرے۔

۱۔ ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن بن عوف الزہری المدنی (م۹۴ھ یا ۱۰۴ھ) غالباً ان کا نام عبداللہ اور بعض کے مطابق اسماعیل یا ابوسلمہ ہے۔ ابن سعد نے انہیں فقیہ اور کثیرالحدیث کہا ہے۔ ابوزرعہ اور ابن حبان نے بھی انہیں ثقہ کہا ہے۔ تھذیب التھذیب ۱۲:۱۱۷

۲۔ ابو محمد یا ابوعبدالعزیز سعید بن عبدالعزیز بن ابویحییٰ التنوخی الدمشقی (م ۱۶۷ھ) سفیان ثوریؒ، شعبہؒ اور ابن مبارکؒ جیسے حضرات ان کے تلامذہ میں شامل ہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ میرے نزدیک شام میں کوئی شخص سعید بن عبدالعزیز سے زیادہ صحیح حدیث والا نہیں اور میرے نزدیک وہ اور اوزاعی برابر ہیں۔ تھذیب التھذیب ۴:۶۰۰

۳۔ اکثر فقہاء کی طرح امام احمد بن حنبل بھی "سبحانک اللھم" ہی سے نماز شروع کرنے کے قائل ہیں۔ مسند الامام احمدؒ، مسند أبي سعيد الخدري رضي الله عنه ۳:۵۰، ۶۹، العدۃ شرح العمدۃ، باب صفة الصلاۃ ۱:۱۰۲۔

۴۔ محمد بن احمد عبداللہ بن خویز المالکی العراقی (م۳۹۰ھ تقریباً) فقہاء مالکیہ میں بلند مقام رکھتے ہیں معجم المؤلفین ۸:۲۸۰

۵۔ ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم (م۲۶۸ھ) فقہ مالکی کے مصری علماء میں سے تھے۔ انہیں امام شافعیؒ اور ابوعبدالرحمٰن المقریؒ جیسے حضرات کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ بعض نے انہیں ثقہ اور بعض نے صدوق کہا ہے۔ تھذیب التھذیب ۹: ۲۰۶

حافظ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں: صحیح رائے یہ ہے کہ اس رکعت کی جگہ دوسری رکعت پڑھے، جیسے سجدہ بھول جانے والا سجدہ لوٹاتا ہے۔ ابن قاسم نے بھی یہ رائے اختیار کی ہے(۱)۔

پوری نماز میں ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ

حسن بصری رحمہ اللہ، اہل بصرہ کی اکثریت اور مغیرہ ابن عبد الرحمٰن مخزومی مدنی(۲) کہتے ہیں کہ نماز میں ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ پڑھ لینے سے نماز ادا ہو جاتی ہے۔ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں اور یہ پوری نماز ہے، کیوں کہ اس میں امّ القرآن (فاتحہ) پڑھی گئی ہے جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

[۱۹۱]　لَاصَلَاةَ لِمَن لَم يَقرأ بِأُمِّ القُرآن۔

اس شخص کی نماز نہیں ہوئی جس نے اُم القرآن نہیں پڑھی۔

اور یہاں تو فاتحہ پڑھی گئی ہے۔

مؤلف کا تبصرہ

اس حدیث کے معنی میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ جس نے ہر رکعت میں فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز ادا نہیں ہوئی۔ یہی بات صحیح ہے جیسا کہ اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ جس نے اکثر رکعتوں میں فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز ادا نہیں ہوئی اور اختلاف کی بنیاد بھی یہی ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[۱۹۱]　صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة ۱:۲۹۵، مسند احمد: حديث عبادة بن الصامت رضي الله عنه ۶:۴۳۹، طبرانی: المعجم الصغير، باب العين من اسمه عبدالله ۱:۲۷۴، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب الاقتصار على فاتحة الكتاب ۲:۳۶۷ ، باب من قال يقرأ خلف الإمام فيما يُجهر فيه بالقراءة بفاتحة الكتاب ۲:۵۳۷، باب تعيين القراءة المطلقة فيما روينا بالفاتحة ۳:۳۴۲۔ ان سب حضرات کے ہاں علامہ قرطبیؒ والے الفاظ ہیں جب کہ صحیح ابن حبان: كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۵:۸۷، ۵:۹۵، مسند احمد: حديث عبادة بن الصامتؓ ۶:۴۴۰، مصنف عبدالرزاق: كتاب الصلاة، باب قراءة أم القرآن ۲:۹۳، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب تعيين القراءة المطلقة فيما روينا بالفاتحة ۳۴۲۳ میں "فصاعدًا" کے الفاظ بھی ہیں یعنی جو شخص سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ مزید نہیں پڑھتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔

۱۔　المدونۃ: كتاب الصلاة باب ماجاء في تركِ القراءة في الصلاة ۱:۱۶۴

۲۔　ابو ہاشم مغیرہ بن عبد الرحمٰن بن الحارث المخزومی (م ۱۸۶ یا ۱۸۸ھ) امام مالکؒ اور ہم عصر علماء سے کسب فیض کیا۔ عباس دوری نے انہیں ابن معین کے حوالہ سے ثقہ کہا ہے جب کہ آجری نے امام ابو داؤدؒ سے ان کا ضعف نقل کیا ہے۔ تھذیب التھذیب ۱۰:۲۶۴

امام ابو حنیفہؒ، امام ثوریؒ اور امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے اپنی نماز میں فاتحہ جان بوجھ کر چھوڑ دی اور اس کی جگہ کوئی اور سورت پڑھ لی تو نماز ادا ہو گئی۔ امام اوزاعی سے اس میں کچھ اختلاف بھی منقول ہے۔ امام ابو یوسف(۱) اور امام محمد بن حسن (۲) کہتے ہیں کہ یہ قراءت کم از کم تین آیات یا ایک لمبی آیت پر مشتمل ہو جیسا کہ آیت دَین(۳) ہے۔ امام محمد بن حسن کا دوسرا قول یہ ہے کہ میں نماز میں قرآن مجید کی ایک آیت کے برابر اور ایک بامعنی کلمہ کے برابر پڑھنا بھی جائز قرار دیتا ہوں، جیسے ''الحمد للہ''۔ مگر ایسے حروف کی قراءت کو جائز نہیں کہہ سکتا جو کلام شمار نہ ہو سکیں۔

سورۂ فاتحہ یا اس کے برابر آیات

امام طبریؒ کہتے ہیں کہ نمازی ہر رکعت میں امّ القرآن پڑھے۔ اگر یہ نہ پڑھی گئی تو صرف اس صورت میں نماز ادا ہو گی کہ اس کے بدلے اس کی آیات اور حروف کے برابر قرآن کی کسی اور جگہ سے قراءت کر لی جائے۔ حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں: یہ بے معنی بات ہے، کیوں کہ نص حدیث میں سورۂ فاتحہ کی تخصیص ہے، کسی اور کا ذکر نہیں۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ جس پر یہ واجب ہے اسے طاقت کے باوجود چھوڑنے اور اس کی جگہ کچھ اور پڑھنے کی اجازت دی جائے۔ نمازی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا ہی واجب ہے، اسی کی طرف واپس آئے جیسا کہ عبادات میں مقرر شدہ دیگر واجبات کو ادا کیا جاتا ہے(۴)۔

۱۔ قاضی القضاۃ امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم (م غالباً ۱۸۲ھ) امام ابو حنیفہؒ کے شاگردِ خاص اور ان کے علم کے وارث تھے۔ امام طحاویؒ نے ابراہیم بن ابو داوٗد برلسیؒ کے حوالہ سے یحییٰ بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ اہل رائے میں ابو یوسف سے بڑا اور قابل اعتماد محدّث کوئی نہیں۔ میزان الاعتدال ۴: ۴۴۷

۲۔ ابو عبد اللہ محمد بن حسن بن فرقد شیبانی حنفی (م۱۸۹ھ/۸۰۵ء) بہت بڑے محدث، مجتہد، فقیہ اور امام ابو حنیفہؒ کے دوسرے بڑے شاگرد ہیں۔ ان کی کتابوں میں المبسوط، الجامع الکبیر، الجامع الصغیر بہت مشہور ہیں۔ معجم المؤلفین: ۹: ۲۰۷

۳۔ ارشاد باری تعالیٰ: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ... الخ مراد ہے۔ البقرہ ۲: ۲۸۲

۴۔ اس مسئلہ پر کتب فقہ میں مفصل مباحث موجود ہیں جن کا خلاصہ مولانا زکریاؒ کے الفاظ میں یوں ہے کہ حقیقتاً قراءت کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف کوئی شدید اختلاف نہیں ہے بلکہ اسے صرف لفظی اختلاف کہا جا سکتا ہے۔ فرض اور واجب کے درمیان فرق احناف کے دقیق مسائل میں سے ہے یہ تقسیم دیگر فقہاء کے ہاں نہیں ملتی۔ احناف کے نزدیک فرض یا تو قرآن سے ثابت ہوتا ہے یا حدیث متواتر سے جو قرآن ہی کے حکم میں ہوتی ہے یا اجماع سے۔ اس مسئلہ قراءت میں ارشاد باری تعالیٰ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ (قرآن مجید میں سے جتنا میسر ہو پڑھو) سے صرف قراءت کی فرضیت ثابت ہوتی ہے، سورۂ فاتحہ کی تعیین نہیں ہوتی۔ فاتحہ کا ثبوت چوں کہ حدیث پاک سے ملتا ہے اس لیے کہا جائے گا کہ فاتحہ فرض تو نہیں مگر حدیث میں اس کا حکم ہونے کی وجہ سے اسے چھوڑنے والا گناہ گار ہو گا .... بقیہ آئندہ صفحہ پر

چھٹی بحث: رکوع میں ملنے والے کی قراءت

اگر مقتدی نے امام کو رکوع میں پایا تو امام کی قراءت مقتدی کی طرف سے بھی ادا ہوگئی۔ اس پر اجماع ہے کہ مقتدی امام کو رکوع میں پائے تو تکبیر کہے اور رکوع میں شامل ہو جائے، قراءت نہ کرے البتہ اگر امام قیام میں ہو تو مقتدی بھی قراءت کرے۔ آئندہ زیر بحث مسئلہ کا موضوع یہی ہے۔

ساتویں بحث: سرّی نمازوں میں مقتدی کی قراءت

کسی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ سرّی نماز میں امام کے پیچھے قراءت چھوڑ دے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو برا کیا۔ مگر امام مالک رحمہ اللہ اور فقہاء مذہب کے نزدیک اس پر سجدہ سہو نہیں[1]۔ جہری نمازوں میں مقتدی کی قراءت کا حکم اس کے بعد زیر بحث آ رہا ہے۔

بقیہ از صفحہ گزشتہ:

اور جس سے بھولے سے رہ گئی اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا اور جس نے جان بوجھ کر چھوڑی اس پر نماز کا دہرانا ضروری ہوگا۔ یہی بات ارشاد باری تعالیٰ: "فَاقْرَأُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنْهُ" (اس میں سے جتنا میسر ہو پڑھو) اور ارشاد نبوی "ثُمَّ اقْرَأْ مَاتَيَسَّرَ مَعَكَ مِنَ القُرْآنِ" (پھر قرآن مجید میں سے جتنا سہولت سے پڑھ سکو پڑھو) اور "لا صلاةَ إلاَّ بِقُرآنٍ ولو بِفَاتِحة الكتابِ فَمَازاد" (قراءت قرآن کے بغیر نماز نہیں ہوتی اگرچہ یہ قراءت صرف سورۂ فاتحہ اور کچھ مزید آیات پر ہی مشتمل ہو) سے ثابت ہوتی ہے۔ یہ تو فرضیت قراءت کی بات ہے باقی جہاں تک فاتحہ کی تخصیص کا تعلق ہے تو احناف نے احادیث کی بنا پر اسے واجب قرار دیا ہے اور واجب کو جان بوجھ کر چھوڑنے والے کے لیے نماز دوبارہ پڑھنے کا فتوی دیا ہے۔ جب فاتحہ چھوڑنے سے نماز دوبارہ پڑھنا پڑتی ہے تو گویا اس کی نماز ہوئی ہی نہیں۔ اس طرح تمام فقہی مکاتب کی آرا کا نتیجہ ایک ہی نکلا۔ جہاں تک فاتحہ کی فرضیت کا تعلق ہے تو مذکورہ حدیث یا اس معنی کی دیگر احادیث کو عموم قرآن کے مقابلے میں کسی عمل کی فرضیت کی دلیل قرار دینے میں بہت پیچیدگیاں ہیں جن سے علماء و فقہاء خوب واقف ہیں۔ واللہ اعلم۔ أوجز المسالک ۲:۹۱، رد المحتار ۱:۳۲۹، ابو داوٗد ،کتاب الصلاۃ، بذل المجهود ۵:۳۵، عینی: شرح الهداية ۱:۶۲۹

۱۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سرّی نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی کی قراءت امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک بھی مستحب ہے نہ کہ واجب۔ اگر ان میں قراءت واجب ہوتی تو وہ اس کے چھوڑنے پر کم از کم سجدہ سہو کا حکم تو دیتے مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا جب کہ جہری نمازوں میں وہ ویسے ہی مقتدی کی قراءت کے قائل نہیں جیسا کہ انہوں نے خود حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل فرمائی ہے کہ: جس نے کوئی رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی گویا اس نے نماز پڑھی ہی نہیں، سوائے اس کے کہ اس نے نماز امام کے پیچھے پڑھی ہو۔ اس طرح اس مسئلہ میں امام مالک رحمہ اللہ اور فقہاء احناف کی رائے میں تطبیق ہوسکتی ہے جو امام کے پیچھے مقتدی کی قراءت کے بالکل ہی قائل نہیں۔ المدوّنة الكبرىٰ. كتاب الصلاة. باب ما جاء في ترك القراءة في الصلاة ۱:۱۶۵، اوجز المسالک. القراءة خلف الإمام فيما لا يجهر فيه بالقراءة ۲:۹۳،۱۰۳

آٹھویں بحث: جہری نمازوں میں مقتدی کی قراءت

امام مالکؒ کا مشہور قول یہ ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی نہ فاتحۃ الکتاب پڑھے نہ اس کے علاوہ کوئی اور سورت کیوں کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا﴾ [الأعراف ۷:۲۰۴] (جب قرآن پڑھا جاتا ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو فرمایا تھا:

[۱۹۲] "مالي أنازع القرآن"۔کیا بات ہے کہ مجھ سے قرآن میں جھگڑا کیا جا رہا ہے۔

اسی طرح امام کے بارے میں فرمایا:

[۱۹۳] "إذا قرأ فَأَنصِتُوا"۔ جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔

---

[۱۹۲] اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی سننے کے بعد جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کرنا چھوڑ دی۔ اس مسئلہ میں مالکیہ اور احناف کا ایک ہی قول ہے۔ مؤطا امام مالک، كتاب الصلاة. باب ترك القراءة خلف الإمام فيما جهر فيه. أوجز المسالك ۲:۱۰۴، امام ابو داؤدؒ نے اسی حدیث کے تحت زہریؒ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کے بعد لوگوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔ امام ابن حبان نے یہی قول اس طرح نقل کیا ہے کہ: لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت مان لی اور اس کے بعد وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قراءت نہیں کیا کرتے تھے۔ امام احمد رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ضمن میں نقل کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تو لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قراءت کرنا چھوڑ دی۔ امام بیہقی نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ پھر لوگ اس سے باز آگئے۔ ایک اور حدیث کے ضمن میں انہوں نے ابن شہاب زہریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس ارشاد سے مسلمانوں نے نصیحت پکڑی اور وہ اس کے بعد آپ کی اقتداء کے دوران قراءت نہیں کرتے تھے۔ ایک اور مقام پر انہوں نے نقل کیا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تو لوگ (آپ کی اقتداء کے دوران) قراءت کرنے سے باز آگئے۔

[۹۳] صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب التشهد في الصلاة ۱:۳۰۴۔ امام مسلم نے ان الفاظ کو صحیح قرار دیا ہے، سنن ابوداؤد: كتاب الصلاة، باب الإمام يصلي من قعود ۱:۱۶۵ امام ابوداؤد نے اسے غیر محفوظ قرار دیا ہے، سنن نسائی: كتاب الإفتتاح، باب تاويل قوله تعالى: وَ إذا قُرِئَ القُرآنُ فَاسْتَمِعُوا...... ۲:۱۴۱، ۱۴۲۔ امام نسائی نے مخرمی کا قول نقل کیا ہے کہ میرے نزدیک اس حدیث کے راوی محمد بن سعد انصاری ثقہ ہیں۔ ابن خزیمہ نے اپنی صحیح، كتاب الجمعة، باب فضل انصات المأموم عند خروج الإمام قبل الإبتداء في الخطبة ۳:۱۳۸ میں یہ حدیث ذکر کر کے اس کی اور ارشاد باری تعالیٰ: "وَإذا قُرِئَ القرآن فاستَمِعُوا له وأنصِتُوا" کی تاویل کی ہے اور اس سے مراد نماز میں عام بات چیت سے باز رہنا لیا ہے حالاں کہ آیت کریمہ اور حدیث مبارکہ کے الفاظ اس تاویل کی نفی کرتے ہیں، مسند احمد: مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ ۳:۲ ۷، ۱۴۸، مسند ابو یعلی: حديث ميمونة زوج النبي صلى الله عليه وسلم ۱۳:۲۵۵، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب من قال بترك المأموم القراءة فيما جَهَر فيه الإمام بالقراءة ۲:۵۲۵۔ امام بیہقی نے یہ حدیث ذکر کر کے تائید کے لئے امام مسلم کی روایت کا حوالہ بھی دیا ہے، سنن دارقطنی: كتاب الصلاة، باب ذكر قوله صلى الله عليه وسلم: من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة...... ۱:۳۲۷۔ امام دارقطنی کہتے ہیں: "وإذا قرأفانصِتُوا" کی متابعت محمد بن سعد اشہلی نے بھی کی ہے، اسی باب میں صفحہ نمبر ۳۲۸ پر اسی حدیث کو.............بقیہ آئندہ صفحہ پر

نیز فرمایا:

[۱۹۴] من کان له إمام فقراء ة الإمام له قراء ة۔

جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھتا ہو تو امام کی قراء ت ہی اس کی قراء ت ہے۔

بقیہ از صفحہ گزشتہ:

نقل کر کے مخرمی کا قول نقل کیا ہے کہ محمد بن سعد ثقہ ہے، پھر صفحہ نمبر ۳۳۰ پر نقل کیا ہے کہ سفیان ثوری رحمہ اللہ نے بھی سلیمان تیمی سے اس روایت کو اسی طرح نقل کیا ہے جب کہ دیگر متعدد طرق میں یہ الفاظ نہیں ملتے۔ دورِ حاضر کے مشہور محقق علامہ ناصر الدین البانی مرحوم نے بھی صحیح سنن ابن ماجہ، کتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب إذا قرأ الإمام فأنصِتُوا ۱:۱۴۰ میں اسے نقل کیا ہے جس سے اس کی صحت کی مزید تائید ہوجاتی ہے واللہ اعلم۔

[۱۹۴] سنن ابن ماجہ: كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب إذا قرأ الإمام فأنصِتُوا ۱:۲۷۷، مسند احمد: مسند جابر بن عبدالله رضی الله عنه ۴:۲۹۵، مصنف عبدالرزاق: كتاب الصلاة، باب القراء ة خلف الإمام ۲:۱۳۶، امام عبدالرزاقؒ کے ہاں بروایت عبداللہ بن شداد بن الہاد اللیثی منقول ہے وہ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو ایک شخص نے آپ کے پیچھے قراء ت کرنا شروع کر دی اور دوسرا شخص اسے منع کرنے لگا، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوئے تو اس شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قراء ت کر رہا تھا اور یہ مجھے منع کر رہا تھا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کا امام ہو اس امام کی قراء ت ہی اس مقتدی کی قراء ت بھی ہوتی ہے۔ سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب من قال لا يقرأ خلف الإمام على الإطلاق ۲:۵۳۱، امام بیہقی نے اسے عبداللہ بن مبارک، عبدان بن عثمان، سفیان ثوری، شعبہ، امام ابوحنیفہ سب کی روایت سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے اور موسیٰ نے عبداللہ بن شداد سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کی دو مزید اسناد ذکر کی ہیں اور تمام رواۃ کو ثقات اور اثبات قرار دیا ہے، اسی باب میں اسی صفحہ پر امام بیہقی نے اس حدیث کو حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور اس کے بعد راویوں میں کلام کیا ہے، امام بیہقی نے اسی باب کے صفحہ نمبر ۵۳۲ پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے: جو شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے اسے امام کی قراء ت کافی ہوتی ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا یہی قول صحیح ہے۔ امام دارقطنی نے اسے اپنی سنن کی كتاب الصلاة، باب ذكر قوله صلى الله عليه وسلم من كان له إمام...... ۱:۳۲۳، ۳۲۵، ۳۳۱، ۳۳۳، باب ذكر نيابة الإمام عن قراء ة المامومين ۱:۴۰۳ میں بالترتیب حضرت جابر، سالم بن عبدالله عن أبيه، حضرت جابر، اور دو روایات میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور بعض کے راویوں کو مجروح قرار دیا ہے۔ علامہ سیوطی نے بھی الجامع الصغير میں اسے نقل کیا ہے۔ علامہ مناوی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ حدیث تمام طرق سے ضعیف ہے اس حدیث کو امام طحاوی نے بھی ذکر کیا ہے اور اس کی تائید میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور حدیث بھی نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے راشاد فرمایا: "إنّما جُعِلَ الإمامُ لِيُؤتَمَّ به فإذا قرأ فأنصِتُوا" (امام اس لئے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے چناں چہ جب وہ پڑھے تو خاموش رہا کرو) اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ والی حدیث: نعمان رضی الله عنه عن موسى بن أبي عائشه عن عبدالله بن شداد عن جابر بن عبدالله أن النّبى صلى الله عليه وسلم قال: کو بھی امام ابوطیفہؒ والی سند کے ساتھ نقل کیا ہے، یہی روایت امام محمدؒ نے موطا، كتاب الأثار اور كتاب الحجة على أهل المدينة میں ....

بقیہ آئندہ صفحہ پر

بقیہ از صفحہ گزشتہ:...

اور اسی طرح ابونعیم نے مسند امام ابوحنیفہ میں نقل کی ہے۔طحاوی کے محقق محمد زہری نجار مصری نے حاشیہ میں محمد بن منیع اور ابن ہمام کا قول نقل کیا ہے کہ یہ اسناد صحیح اور شیخین کی شرط کے مطابق ہے۔امام طحاویؒ نے متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے ارشادات بھی نقل کئے ہیں۔حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں''میری رائے یہ ہے کہ جب کسی جماعت کو امام نماز پڑھائے تو اس کی قراءت ان کے لئے کافی ہے''، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی: ''مَالِي أُنَازَعُ القرآن'' (میں نے سوچا کیا بات ہے میرے ساتھ قرآن میں جھگڑا کیا جا رہا ہے) کے ضمن میں ایسے الفاظ بھی منقول ہیں کہ یہ ارشاد سن کر مسلمانوں نے سبق حاصل کیا اور پھر وہ امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے۔حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''قرآن کی تلاوت ہو رہی ہو تو خاموش ہو جاؤ کیوں کہ نماز بذاتِ خود ایک مصروفیت ہے۔ باقی رہی تلاوت کی بات تو اس میں تمہاری طرف سے امام کی تلاوت ہی کافی ہے''۔ انہی سے ایک اور روایت منقول ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے کاش اس کا منہ مٹی سے بھر دیا جائے، حضرات ابن عمر، زید بن ثابت اور جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے ''کسی بھی نماز میں امام کے پیچھے قراءت نہ کرو''۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ابوحمزہ نے پوچھا کہ جب امام میرے سامنے ہو تو کیا میں قراءت کروں؟ آپ نے فرمایا: نہیں انہی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ نماز پڑھائی پھر نمازیوں کی طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا: جب امام قراءت کر رہا ہو تو کیا تم لوگ بھی قراءت کرتے ہو؟ تو سب خاموش ہوگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ یہی فرمایا تو لوگوں نے عرض کیا: جی ہاں ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ ایسا نہ کیا کرو۔ جب فریقین کے پاس اس قدر دلائل ہوں تو ظاہر ہے ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دینے کے لئے اجتہاد کرنا پڑے گا اور یہی کام حضرات فقہاء کرام نے کیا ہے۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں وجہ ترجیح یہ ہے کہ جب اس بات پر تمام فقہاء کرام متفق ہیں کہ جو شخص رکوع میں شامل ہو اس کی پوری رکعت شمار ہوتی ہے اور کوئی یہ نہیں کہتا کہ چوں کہ اس نے امام کے پیچھے کھڑے ہو کر قراءت نہیں کی اس لئے اس کی نماز نہیں ہوئی تو جب اس صورت میں امام کی قراءت مقتدی کے لئے کافی ہو جاتی ہے تو عام حالت میں بھی ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ بھی پتہ چل جاتا ہے کہ قیام اور قراءت اہمیت میں ہرگز برابر نہیں ہیں۔ رکوع میں شامل ہونے سے پہلے مقتدی کے لئے قیام کی صورت بنانا ضروری ہے جب کہ قراءت کو سب ساقط مانتے ہیں۔ واللہ اعلم۔ امام مالک رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا اسی حدیث سے ملتا جلتا قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: إذا صلّى أحدُكم خلفَ الإمام فَحَسْبُهُ قِراءةُ الإمام وإذا صلّى وحْدَهُ فليقرأ'' (جب تم میں سے کوئی امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اسے امام کی قراءت ہی کافی ہے اور جب اکیلا نماز پڑھے تو اپنی قراءت کرے۔ مولانا زکریاؒ نے متعدد حوالہ جات کے ساتھ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے اس قول کے متعدد طریق جمع کئے ہیں۔ ا[illegible] سے بھی مندرجہ بالا حدیث کو تقویت ملتی ہے۔ تفصیل کتب فقہ و شروح حدیث میں دیکھی جا سکتی ہے۔ امام مالکؒ نے اسی قول [illegible] بنیاد بنا کر جہری نمازوں میں مقتدی کی قراءت کو منع فرمایا ہے اگرچہ اس میں سرّی جہری کی کوئی تخصیص نہیں۔ مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے، مؤطا امام مالکؒ، كتاب الصلاة، باب ترك القراءة خلف الإمام فيما جهرية اوجز المسالك ۲:۱۰۵، فیض القدیر ۶:۲۰۸ حدیث نمبر ۸۹۷۲، شرح معانی الآثار: ۲۱۵-۲۲۰، كتاب الصلاة، باب القراءة خلف الإمام، ابو نعيم [illegible]صبهاني: مسند [illegible] ابوحنيفه باب الفاء. روايتاً عن فرات بن عبدالرحمن ۲۱۰، امام محمدؒ: كتاب الآثار ص ۱۶، باب القراءة خل[illegible] الاما[illegible] كتاب [illegible]حجة ع[illegible]ى اهل المدينة :باب القراءة، خلف الإمام ۱:۱۱۶

امام بویطیؒ(۱) نے امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے اور یہی امام احمد بن حنبل سے منقول ہے کہ کسی کی نماز اس وقت تک جائز نہیں جب تک وہ ہر رکعت میں فاتحۃ الکتاب نہ پڑھے، خواہ امام ہو یا مقتدی اور خواہ امام جہری نماز پڑھ رہا ہو یا سرّی(۲)۔ امام شافعی رحمہ اللہ جب عراق میں تھے تو مقتدی کے بارے میں فرماتے تھے کہ وہ سرّی نماز میں قراءت کرے اور جہری میں نہ کرے، جیسا کہ امام مالکؒ کا مشہور قول ہے۔ جب امام شافعی رحمہ اللہ مصر تشریف لے گئے تو جہری نماز کے بارے میں ان سے یہ اقوال مروی ہیں: ایک یہ کہ قراءت کرے اور دوسرا یہ کہ قراءت نہ کرے اور امام کی قراءت پر اکتفاء کرے۔ یہ اقوال ابن منذر نے نقل کئے ہیں۔ ابن وہب، اشہب، ابن عبدالحکم، ابن حبیب(۳) اور فقہاء کوفہ (احناف) کہتے ہیں کہ مقتدی کچھ نہیں پڑھے گا خواہ امام جہر کرے یا آہستہ قراءت کرے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۱۹۵] ''فقراءۃُ الإمامِ له' قِراءَ ۃٌ'' توامام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔

اور یہ ارشاد نبوی عام ہے اس میں سرّی یا جہری نمازوں کی کوئی تخصیص نہیں۔ اسی طرح حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی ایک حدیث مروی ہے:

[۱۹۶] مَن صلّی رکعۃً لم یقرأ فیها بأم القرآن فَلَمْ یُصِلَ إِلّا وراءَ الإمام۔

جس نے امّ القرآن کے بغیر کوئی رکعت پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی سوائے اس کہ امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو۔

---

[۱۹۵] سنن دارقطنی، کتاب الصلاۃ، باب ذکر قوله: من کان له امام...... ۱:۳۲۹-۳۳۱، شرح معاني الآثار ۱:۲۱۵، کتاب الصلاۃ باب القراۃ خلف الأمام، ابونعیم الاصبہانی: مسند الإمام أبي حنیفة، باب الفاء، روایة عن فرات بن عبدالرحمن ص کتاب الآثار، باب القراءۃ خلف الإمام، ص ۱۶، مسند احمدؒ: مسند جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ ۳:۳۳۹
سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب من قال لایقرأ خلف الإمام علی الإطلاق ۲:۵۳۶، مؤطاامام مالکؒ: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء في أم القرآن ۱:۸۴

۱۔ ابو یعقوب یوسف بن یحییٰ بویطی مصری (م ۲۳۱ھ / ۸۴۲ء) امام شافعیؒ کے شاگردِ خاص اور ان کی وفات کے بعد تدریس و افتاء میں ان کے جانشین تھے۔ عباسی خلیفہ واثق باللہ کے دور میں بغداد میں وفات پائی۔ معجم المؤلفین ۱۳: ۲۴۲

۲۔ امام شافعیؒ: الأم، کتاب الصلاۃ باب القراءۃ بعد التعوّذ ۱:۱۲۹، ابن قدامہ الحنبلیؒ: المغني، کتاب الصلاۃ، باب ما یبطل الصلاۃ بذکرہ عمدًا أو ساهیًا. ۱: ۳۸۱

۳۔ ابوعقیل یحییٰ بن حبیب الاسدی الکوفی۔ سُرّ مَن رأی میں رہتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے انہیں صدوق کہا ہے۔ ابن حبان نے ثقات میں ان کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے اور کبھی یہ غیر معروف روایات بھی نقل کرتے ہیں۔ تہذیب التہذیب ۱۱:۱۹۵، الجرح والتعدیل ۹:۱۳۷، ثقات ابن حبان ۹:۲۷۰

نویں بحث: ان آراء پر مؤلف کا تبصرہ

ان اقوال میں سے صحیح قول امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور امام مالکؒ کا دوسرا قول ہے، اور وہ یہ کہ سورۂ فاتحہ بلااستثناء ہر کسی کے لئے ہر رکعت میں پڑھنا ضروری ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے:

[۱۹۷] لاصلاة لمن لم يقرأ فيها بفاتحة الكتاب۔
جس نے فاتحۃ الکتاب نہیں پڑھی اس کی نماز ادانہیں ہوئی۔

اسی طرح ارشادگرامی ہے:

[۱۹۸] من صلّى صلاةً لم يقرأ فيها بأمّ القرآن فهي خداجٌ ثلاثًا۔
جس نے امّ القرآن یعنی فاتحہ کے بغیر نماز پڑھی اس کی نماز ادھوری ہے اور آپ نے تین مرتبہ یہ ارشاد فرمایا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یہ منادی کرنے کا حکم دیا کہ:

---

[۱۹۷] صحیح بخاری: کتاب الاذان، باب وجوب القراءة للإمام والماموم...... فتح الباری ۲:۲۳۶، کتاب صفة الصلاة، باب وجوب القراءة للامام والماموم......۱:۲۶۳، صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة عن عبادة بن الصامت، ۲:۲۶۰، جامع ترمذی: أبواب الصلاة، باب ماجاء أنهٗ لاصلاة إلابفاتحة الكتاب ۲:۲۵، باب ماجاء في القراءة خلف الإمام ۲:۱۱۶، باب ماجاء في ترک القراءة خلف الإمام إذا جَهَرَ ۲:۱۱۸۔ اس روایت کے تحت امام ترمذی نے امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا نقطہ نظر نقل کیا ہے کہ وہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کی بناء پر اس حدیث کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہو تو فاتحہ کے بغیر اس کی نماز نہیں ہوتی،طبرانی: المعجم الصغير، باب الألف، من اسمه إبراهيم ۱:۹۵، امام طبرانی کہتے ہیں کہ اس روایت کو موسیٰ بن عقبہ سے صرف ابوقُرّہ نے ہی نقل کیا ہے اور اس کی روایت میں صامت بن معاذ الجندی متفرد ہیں، امام ابوداؤد نے اپنی سنن: کتاب الصلاة باب من ترک القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب ۱:۲۱۷ میں اس کے ساتھ ''فصاعدًا'' یعنی سورۂ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی کے الفاظ نقل کئے ہیں اور سفیان ثوریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ حکم اکیلے نماز پڑھنے کے لئے ہے، نسائی رحمہ اللہ نے بھی اپنی سنن: کتاب الصلاة، باب ایجاب قراءة فاتحة الكتاب ۲:۱۳۷ میں بھی ''فصاعدا'' کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

[۱۹۸] صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة---- ۱:۲۹۶، ۲۹۷،سنن ابو داؤد:کتاب الصلاة، باب من ترک القراءة في صلاته بفاتحة الكتاب ۱:۲۱۶۔ امام ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، امام مالک، ابن حبان، ابن خزیمہ، احمد، ابویعلی، عبدالرزاق، بزار، بیہقی، اور دارقطنی وغیرہم نے اس حدیث کو مختلف الفاظ کے ساتھ ساٹھ کے قریب مقامات پر نقل کیا ہے اور اس کے بعض طرق کے رواۃ پر جرح بھی کی گئی ہے۔

[۱۹۹] لَا صَلاۃَ إلّا بقراءَ ۃِ فاتِحَۃِ الکِتابِ فَمَازاد۔

وہ نماز ہی نہیں جس میں فاتحۃ الکتاب اور کچھ مزید قراء ت نہ کی گئی ہو۔ یہ حدیث امام ابوداؤد نے نقل کی ہے۔

چناں چہ جس طرح ایک رکعت کے سجدے اور رکوع دوسری رکعت کے سجدوں اور رکوع کی جگہ کام نہیں دے سکتے اسی طرح ایک رکعت کی قراء ت بھی دوسری رکعت کی قراء ت کی جگہ شمار نہیں کی جا سکتی۔

عبداللہ بن عون[۱]، ایوب سختیانی[۲]، امام شافعیؒ کے اصحاب میں سے ابوثور وغیرہ اور اسی طرح امام داؤد بن علی[۳] کا یہی قول ہے۔ امام اوزاعی سے بھی اسی طرح کی ایک روایت منقول ہے اور مکحول بھی اسی کے قائل ہیں۔ حضرات عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، ابی بن کعب ابو ایوب انصاری، عبداللہ بن عمرو بن عاص، عبادہ بن صامت، ابوسعید خدری، سعید بن ابی العاص اور خوات بن جبیر رضی اللہ عنہم اجمعین[۴] سے منقول

---

[۱۹۹] سنن ابوداؤد: کتاب الصلاۃ باب من ترکَ القِراءَ ۃ فی صلاتِہ. بفاتحۃ الکتاب ۱:۲۱٦، امام ابوداؤد نے دوسرے الفاظ میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ باہر نکلو اور مدینہ میں اعلان کر دو کہ قرآن کی قراء ت کے بغیر نماز نہیں ہوتی اگرچہ سورۂ فاتحہ اور کچھ مزید ہی ہو، صحیح ابن حبان: کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ ۵:۹۳، مستدرک حاکم: کتاب الإمامۃ وصلاۃ الجماعۃ، باب التامین ۱:۳٦۵، امام حاکم کہتے ہیں یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں کوئی بھی قابل اعتراض چیز نہیں کیوں کہ جعفر بن میمون العبدی بصرہ کے ثقہ راویوں میں سے ہیں اور یحییٰ بن سعید بھی ثقات کے علاوہ کسی سے نقل نہیں کرتے، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب فرضِ القراءۃ فی کل رکعۃ بعد التعوذ ۲:۳۲۸، باب القراءۃ بعد أم القرآن ۲:۳٦۳، سنن دارقطنی: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ أم الکتاب فی الصلاۃ و خلف الإمام ۱:۳۲۱۔ بعض احادیث میں "فمازاد" کی جگہ اسی کا ہم معنی لفظ "فصاعدا" منقول ہے جیسا کہ گزرا۔ یہاں صرف انہی روایات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں "فمازاد" کے الفاظ ہیں۔

۱۔ ابوعون عبداللہ بن عون بن ارطبان المزنی البصری الخراز (م۱۵۱ھ) جلیل القدر ثقہ تابعی ہیں۔ تہذیب التہذیب ۵:۳۴٦

۲۔ ابوبکر ایوب بن ابی تمیمہ کیسان السختیانی البصری (م۱۳۱ھ) مشہور تابعی ہیں۔ تہذیب التہذیب ۱:۳۹۷

۳۔ ابوسلیمان داؤد بن علی بن خلف الأصبہانی الظاہری (م۲۷۰ھ/۸۸۳ء) کوفہ میں پیدا ہوئے، نیشاپور اور بغداد میں علم حاصل کیا۔ حدیث و فقہ سے بہت شغف اور امام شافعیؒ کے مذہب کے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ بڑے عبادت گزار اور شب بیدار تھے مگر محدثین کے ہاں درجہ ثقاہت کو نہ پہنچ سکے۔ خلق قرآن کا قول بھی ان کی طرف منسوب ہے۔ اسی بناء پر امام احمد بن حنبلؒ نے انہیں اپنی مجلس میں آنے کی اجازت نہ دی۔ ان کے متبعین ظاہریہ کے نام سے مشہور ہیں۔ نباتی وغیرہ نے ان کا دفاع بھی کیا ہے۔ میزان الاعتدال ۲:۱۴، لسان المیزان ۲:۴۲۲، معجم المؤلفین ۴:۱۳۹

۴۔ ابوعبداللہ یا ابو صالح خوات بن جبیر بن نعمان الانصاری الاوسیؓ (م۴۰ھ) مشہور صحابی عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ مدینہ منورہ میں ۷۴ برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ أسد الغابۃ ۲:۱۲۵-۱۲٦

ہے وہ سب حضرات فرماتے تھے کہ فاتحۃ الکتاب کے بغیر کوئی نماز نہیں۔ یہی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ[1] اور امام اوزاعی کا مشہور قول بھی ہے۔ یہ صحابہ ہی دین کے امام ہیں اور انہی کی زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے، یہ سب سورۂ فاتحہ کو ہر رکعت میں واجب سمجھتے تھے۔

امام ابوعبداللہ محمد بن یزید بن ماجہ قزوینیؒ نے اپنی ''سنن'' میں ایک ایسی روایت نقل کی ہے جس سے سارا اختلاف ختم اور ہر احتمال زائل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ہم سے ابوکریب[2] نے ان سے محمد بن فضیل[3] نے بیان کیا، (دوسری سند میں)، ہم سے سوید بن سعید[4] نے اور ان سے علی بن مسہر[5] نے بیان کیا، یہ سب ابوسفیان سعدی[6] سے، وہ ابونضرہ سے اور وہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

۱۔ مؤطا امام مالک: کتاب الصلاۃ، باب ترک القراءۃ خلف الإمام فیما جھرفیہ. اوجز المسالک ۲:۱۰۵، طحاوی: شرح معاني الآثار: کتاب الصلاۃ، باب القراءۃ خلف الإمام ۱:۲۱۹، ۲۲۰ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا مشہور قول یہ منقول ہے کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں بھی قراءت نہ کی جائے۔

۲۔ ابوکریب محمد بن العلا بن کریب الھمدانی الکوفی (م۲۴۸ھ) کو ابو حاتم نے صدوق کہا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں ان کا ذکر کیا ہے۔ تھذیب التھذیب ۹:۳۸۵

۳۔ ابوعبدالرحمٰن محمد بن فضیل بن غزوان بن جریر الضّبی الکوفی (م۲۹۵ھ) کے بارے میں علماء حدیث کی مختلف آراء ہیں۔ بعض نے ثقہ، بعض نے صدوق اور بعض نے لا بأس بہ کہا ہے مگر ان کے تشیع پر تقریباً سب کا اتفاق ہے۔ امام ابوداؤد نے انہیں انتہا پسند شیعہ اور ابن حبان نے غالی شیعہ لکھا ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں: یہ صدوق ثقہ اور کثیر الحدیث نقل کرنے کے بعد لکھا ہے: وہ شیعہ تھے اور بعض محدثین ان کو حجت نہیں مانتے۔ تھذیب التھذیب ۹:۴۰۵-۴۰۶

۴۔ ابومحمد سوید بن سعید بن سھل بن شہریار الھروی الأنباری (م۲۴۰ھ) کے بارے میں ابوحاتم کہتے ہیں کہ وہ صدوق تھے مگر تدلیس کرتے تھے۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے اور انہیں ایسی احادیث بھی سنائی جاتی تھیں جو بے اصل تھیں۔ حاکم کہتے ہیں نابینا ہونے سے پہلے کی ان کی احادیث قابل قبول ہیں۔ امام نسائی کہتے ہیں: وہ نہ ثقہ ہیں نہ محفوظ۔ یحیٰ کہتے ہیں کہ سوید کو قتل کرنا جائز ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں کہ ان کی روایات سے بچنا چاہئے۔ تھذیب التھذیب ۴:۲۷۲

۵۔ ابوالحسن علی بن مسہر الکوفی (م۱۸۹ھ) موصل اور ارمینیہ کے قاضی رہے۔ عجلی کہتے ہیں یہ اصل قریشی تھے اور حدیث و فقہ دونوں میں ماہر اور ثقہ تھے۔ امام احمدؒ سے ان کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: سمجھ نہیں آتی میں ان کے بارے میں کیا کہوں۔ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی اور وہ صرف یادداشت سے احادیث بیان کیا کرتے تھے۔

۶۔ ابوسفیان طریف بن شہاب (یا ابن سعد یا ابن سفیان) سعدی الأشل کو امام احمدؒ، بخاریؒ اور ابوداؤدؒ وغیرہ نے ضعیف کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں: یہ سادہ لوح اور بے خبر آدمی تھے۔ احادیث میں اپنے تخیلات سے اضافے کر کے ثقات کے نام لگا دیتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں: ان کے ضعیف الحدیث ہونے پر محدثین کا اتفاق ہے۔ تھذیب التھذیب ۵:۱۱، میزان الاعتدال ۲:۳۳۶، الکامل في ضعفاء الرجال ۴:۱۴۳۶

[۲۰۰] لَاصَلاۃَ لِمَنْ لَمْ یَقْرأْ فِی کُلِّ رَکعَۃٍ بِالْحَمْدِ لِلّٰہِ و سُورۃٍ فِی فَرِیضَۃٍ أوغیرھا۔

جو شخص ہر نماز کی ہر رکعت میں خواہ وہ فرض ہو یا نفل "الحمدللّٰہ" اور کوئی سورت نہ پڑھے تو اس کی نماز ادا نہیں ہوتی۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو نماز سکھاتے ہوئے فرمایا:

[۲۰۱] وَافْعَلْ ذٰلکَ فی صَلاتِکَ کُلِّھا۔

اسی طرح اپنی پوری نماز میں کیا کرو۔ اس کا بیان آئندہ آئے گا۔

اس کی ایک دلیل نافع[۱] بن محمود بن ربیع انصاریؒ کی وہ روایت ہے جو امام ابوداودؒ نے نقل کی ہے،

---

[۲۰۰] جامع ترمذی: ابواب الصلاۃ، باب ماجاء فی تحریم الصلاۃ و تحلیلھا ۲:۳، سنن ابن ماجہ: کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب القراءۃ خلف الإمام. ۱:۲۷۴. علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا یہ ارشاد محلِ نظر ہے کہ اس روایت سے اختلافات ختم اور احتمالات زائل ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اول تو یہ روایت ہی قابلِ اعتماد نہیں جیسا کہ اس کے راویوں کے تعارف سے ظاہر ہے۔ مثلاً محمد بن فضیل غالی شیعہ تھے اور محدثین نے ان پر سخت جرح کی ہے۔ سوید بن سعید تدلیس کیا کرتے تھے اور پھر نابینا ہونے کی وجہ سے سنی سنائی باتیں حدیث سمجھ کر بیان کرتے تھے حتیٰ کہ یحییٰ بن معین نے ان کا قتل جائز قرار دیا۔ علی بن مسہر کے بارے میں بھی امام احمد بن حنبلؒ ان کی نظر نہ ہونے اور صرف یادداشت سے احادیث بیان کرنے کی وجہ سے فرماتے ہیں کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتی کہ ان کے بارے میں کیا رائے دوں اور ابوسفیان سعدی جو اس روایت کی سند میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں، بالاتفاق ضعیف، سادہ لوح اور بے خبر تھے اور اگر اس حدیث کو ثابت مان بھی لیا جائے یا اس سلسلہ میں دوسری احادیث کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے جن میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ وَمَا تیسّرَ اور فمازاد وغیرہ کے الفاظ ہیں جیسا کہ امام ابوداوٗد اور ابن حبان وغیرہم نے احادیث ذکر کی ہیں تو ان کے اپنے اپنے مفاہیم اور مواقع ہیں۔ ہر نماز کی ہر رکعت یا ہر نمازی کے لئے اس سے صرف سورۂ فاتحہ کا وجوب کسی طرح ثابت نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ یہ رائے جمہور فقہاء کرام کی رائے کے بھی خلاف ہے کہ سورۂ فاتحہ اور ساتھ کسی سورت کی قراءت کو ہر نماز کی ہر رکعت میں مقتدی ومنفرد سب کے لئے واجب قرار دیا جائے۔ اس کی وضاحت تمام فقہی مذاہب کی کتب میں موجود ہے۔

[۲۰۱] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ، ۱:۲۹۸ صحیح بخاری: کتاب صفۃ الصلاۃ، باب وجوب القراءۃ للإمام والمأموم فی الصلوات ۱:۲۶۳، باب حد اتمام الرکوع والاعتدال فیہ والطمانینۃ ۱:۲۷۴ جامع ترمذی: أبواب الصلاۃ، باب ماجاء فی وصف الصلاۃ بروایت حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ ۲:۲۰۳، سنن نسائی: کتاب الافتتاح، باب فرض التکبیرۃ الاولی ۲:۱۲۴، سنن ابوداوٗد: کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ من لایقیم صلبہ فی الرکوع والسجود ۱:۲۲۶، مزید امام بیہقی، ابن خزیمہ، احمد، ابویعلی، ابن حبان، ابن ماجہ وغیرہم نے متعدد مقامات پر اس حدیث کو الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۱۔ نافع بن محمود بن ربیع انصاری: ایلیاء (بیت المقدس) میں رہتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے انہیں مجہول کہا ہے۔ امام ذہبیؒ کہتے ہیں: اس حدیث کے علاوہ نافع کا کہیں پتہ نہیں ملتا: نہ ان کا ذکر ابن ابی حاتم نے کیا ہے نہ بخاری نے۔ ابن حبان نے ان کا ذکر ثقات میں کیا ہے اور کہا ہے کہ نافع بن محمود بن ربیع اور خود محمود بن ربیع کی روایات میں عبارات مختلف ہیں۔ تھذیب التھذیب ۱۰:۴۱۰، ثقات ابن حبان ۵:۴۷۰، میزان الإعتدال ۴:۲۴۲

کہتے ہیں:

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کو نماز فجر میں دیر ہوگئی تو ابونعیم(۱) مؤذن نے نماز کی اقامت کہہ دی اور خود ہی نماز پڑھانا شروع کر دی۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ آ ئے اور میں بھی ان کے ساتھ تھا۔ ہم ابونعیم کے پیچھے کھڑے ہوگئے۔ ابونعیم بلند آواز سے قراء ت کر رہے تھے۔ حضرت عبادہ نے سورۂ فاتحہ پڑھنا شروع کر دی۔ جب ہم نماز سے فارغ ہوگئے تو میں نے ان سے پوچھا: میں نے آپ کو امّ القرآن پڑھتے سنا حالاں کہ ابو نعیم بلند آواز سے پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے جواب دیا: ہاں، ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں جہری نماز پڑھا رہے تھے کہ (مختلف آوازوں کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قراء ت میں دشواری پیش آئی۔ چناں چہ جب آپ فارغ ہوئے تو ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "هل تقرأون إذا جَهرتُ بالقِراءَ ة"(جب میں بلند آواز سے قراء ت کرتا ہوں تو کیا تم لوگ بھی کچھ پڑھتے ہو؟)۔ہم میں سے کسی نے عرض کیا جی ہاں ہم ایسا ہی کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۰۲] فلا! وأنا أقولُ مالي يُنازعني القرآن۔ فلا تقرأوا بِشَيءٍ مِن القُرآنِ إذا جَهرتُ إلّا بأمّ القُرآن۔

ایسا نہ کرو، میں سوچ رہا تھا کہ کیا وجہ ہے یوں لگتا ہے جیسے قرآن کی تلاوت میں کوئی مجھ سے جھگڑ رہا ہے۔ اس لئے جب میں بلند آواز سے تلاوت کروں تو تم امّ القرآن کے علاوہ کوئی چیز نہ پڑھو۔

[۲۰۲] سنن ابو داوٗد: كتاب الصلاة، باب من تركَ القِراءة في صلاتِه بفاتحة الكتاب ۱:۲۱۷،سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب من قال يقرأ خلف الإمام فيما يجهر فيه بالقراءة بفاتحة الكتاب وفيما يسر فيه بفاتحة الكتاب فصاعدًا ۲:۵۳۸، ۵۳۹،سنن دارقطنی: كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة أم الكتاب في الصلاة و خلف الإمام ۱:۳۱۹، ۳۲۰،سنن نسائی: كتاب الإفتتاح، باب قراءة أم القرآن خلف الإمام فيما جهر به ۲:۱۴۱

۱۔ ابونعیم الموذن کا تعارف نہیں مل سکا۔ امام دارقطنی نے صرف اتنا ذکر کیا ہے کہ ابونعیم بیت المقدس میں اذان دینے والے پہلے شخص تھے۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد ۳:۳۶

یہ مقتدی کے متعلق واضح نص ہے۔ (۱)

۱۔ امام ابو داؤد نے یہ حدیث ربیع بن سلیمان ازدی سے نقل کی ہے اور انہوں نے عبداللہ بن یوسف سے اور انہوں نے ہثیم بن حمید سے روایت کی ہے۔ ہثیم کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے۔ امام ابو داؤد کہتے ہیں کہ وہ ثقہ تو تھے مگر قدری تھے۔ امام نسائی کہتے ہیں کہ ان سے روایت لینے میں کوئی حرج نہیں مگر ابومسہر غسانی نے انہیں قدری بھی کہا ہے اور ضعیف بھی۔ ان کی رائے یہ بھی ہے کہ وہ اہل علم اور صاحب تصانیف تو تھے مگر قابل اعتماد اور حافظ نہ تھے۔ میں نے تو ان کے کمزور ہونے کی وجہ سے ان سے حدیث نقل کرنا چھوڑ دی۔ تہذیب التہذیب ۹۲:۱۱، میزان الإعتدال ۳۲۱:۴۔ ہیثم بن حمید نے یہ روایت زید بن واقد دمشقی سے اورانہوں نے مکحولؒ سے نقل کی ہے۔ مکحول شام کے بہت بڑے فقیہ اور مشہور تابعی ہیں مگر بعض علماء رجال نے ان پر بھی جرح کی ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے انہیں تابعین کے طبقہ متوسطہ میں شمار کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ایسے صحابہ رضی اللہ عنہم سے مرسلاً روایات نقل کرتے ہیں جنہیں انہوں نے پایا نہیں۔ اسی طرح ایسے قدیم تابعین سے بھی روایات کرتے ہیں جن کے ساتھ میں نہیں سمجھتا کہ ان کی ملاقات بھی ہوئی ہوگی۔ وہ زہریؒ کے ہم عصر تھے اور ۱۱۲ھ یا ۱۱۳ھ میں وفات پائی۔ تہذیب التہذیب ۲۸۹:۱۰، بخاری: تاریخ کبیر ۲۱:۸، سیر اعلام النبلاء ۱۵۵:۵ پھر یہ روایت مکحول رحمہ اللہ نے محمود بن ربیع اور ان کے بیٹے نافع بن محمود بن ربیع دونوں سے نقل کی ہے اور دونوں روایات کی عبارات مختلف ہیں جیسا کہ ابن حبان نے یہ بات اہتمام سے ذکر کی ہے۔ یہی روایت سفیان نے زہری سے نقل کی ہے، وہ محمود بن ربیع سے اور محمود حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں اور اس روایت کے الفاظ ان دونوں عبارات سے مختلف ہیں۔ اس میں **"فصاعدًا"** (یعنی سورۂ فاتحہ اور کچھ مزید) کے الفاظ کا اضافہ ہے جس کی مزید وضاحت سفیانؒ نے **"لمن يُصلّي وحده"** کے جملے سے کی ہے کہ قراءت فاتحہ اور کچھ مزید اس شخص کے لئے ضروری ہے جو اکیلا نماز پڑھ رہا ہو۔ اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ اضافہ ہے: چناں چہ اس کے بعد لوگوں نے جہری نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قراءت کرنا چھوڑ دی۔ دوسری روایت میں جہری نمازوں کا ذکر بھی نہیں صرف **"فانتهى الناس"** ہے یعنی لوگوں نے امام کے پیچھے قراءت کرنا چھوڑ دی۔ پھر غالباً اس کی وضاحت امام زہریؒ نے اپنے خیال کے مطابق کرتے ہوئے فرمایا: اس بات سے لوگوں کو نصیحت ہوگئی اور اس کے بعد وہ جہری نمازوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کچھ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ سنن ابوداؤد: **كتاب الصلاة، باب من ترك القراءة في صلاته و باب من كره القراءة بفاتحة الكتاب "إذا جهر الإمام.** بذل المجهود ۴۲/۵-۶۰، و ۶۴-۶۶، مؤطا امام مالکؒ: **كتاب الصلاة، باب ترك القراءة خلف الإمام فيما جهرفيه. اوجز المسالك** ۱۰۵:۲، **شرح معاني الآثار: كتاب الصلاة، باب القراءة خلف الإمام** ۲۱۵:۱-۲۲۰، ثقات ابن حبان ۴۷۰:۵، تعارف: نافع بن محمود۔ ان روایات کے علاوہ زیر نظر روایت کی اپنی عبارت میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ بیت المقدس کی مسجد کے امام تھے اور ابن حبان، ابن حجر اور ذھبی وغیرہمؒ کے مطابق نافع بن محمود بھی وہیں کے رہنے والے تھے جس سے ظاہر ہے کہ وہ نمازیں یقیناً حضرت عبادہ ہی کے پیچھے پڑھتے ہوں گے۔ اس موقع پر ان کا تعجب سے پوچھنا کہ ابونعیم کے بلند آواز سے قراءت کرنے کے باوجود میں نے آپ کو ام القرآن پڑھتے سنا ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہاں عام طور پر نمازی امام کے پیچھے کم از کم جہری نمازوں میں کچھ نہیں پڑھتے تھے، ورنہ نافع کو نہ تو حضرت عبادہ کے سورۂ فاتحہ پڑھنے سے تعجب ہوتا اور نہ وہ صرف ان کو مخاطب کر کے کہتے کہ میں نے آپ کو ام القرآن پڑھتے سنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے یہ مسئلہ اس موقع سے پہلے عوام کو نہیں بتایا تھا۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے بھی سورۂ فاتحہ پڑھنے کو واجب سمجھتے تو پہلے سے عوام کو اس سے مطلع فرما دیتے۔ ان کے اس عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ **"لاصلاة إلاّ بفاتحة الكتاب"** فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں) سے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا وجوب مراد نہیں لیتے تھے بلکہ صرف اس کی فضیلت اور استحباب کے قائل تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہاں نفی سے مراد بھی نفی فضیلت ہے نہ کہ صحت نماز کی نفی جیسا کہ کتب حدیث وفقہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ **بذل المجهود** ۴۹:۵، ثقات ابن حبان ۴۷۰:۵، **تهذيب التهذيب** ۴۱۰:۱۰، **ميزان الاعتدال** ۲۴۲:۴

[۲۰۳] اس معنی میں امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ نے محمد بن اسحاق کی سند سے حدیث نقل کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے۔
اکثر اہلِ علم صحابہ و تابعین امام کے پیچھے قراءت کے بارے میں اسی حدیث پر عمل کے قائل ہیں۔ امام مالک بن انسؒ، ابن مبارکؒ، امام شافعیؒ، امام احمدؒ اور اسحاق بن راہویہؒ کی رائے بھی امام کے پیچھے قراءت کرنے کی ہے۔

[۲۰۴] دار قطنیؒ نے بھی یہ حدیث نقل کی ہے اور اس کی سند کو حسن اور تمام رواۃ کو وای ثقہ کہا ہے۔

محمود بن ربیع کا تعارف

محمود بن ربیع(۱) کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایلیاء (بیت المقدس) میں رہتے تھے اور یہ کہ ابونعیم پہلے شخص ہیں جنہوں نے بیت المقدس میں اذان دی تھی۔ ابو محمد عبدالحقؒ کہتے ہیں کہ نہ تو امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں نافع بن محمود کا ذکر کیا ہے، نہ ہی ابن ابی حاتمؒ نے اور نہ بخاریؒ یا مسلمؒ نے ان سے کوئی روایت نقل کی ہے۔ حافظ ابو عمروؒ انہیں مجہول قرار دیتے ہیں۔

[۲۰۵] امام دار قطنیؒ نے یزید بن شریک(۲) کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے امام کے پیچھے قراءت کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا: قراءت کیا کرو۔ میں نے عرض کیا اگرچہ آپ خود امامت کر رہے ہوں؟ انہوں نے فرمایا: اگرچہ میں خود امامت کروں۔ میں نے عرض کیا: اگرچہ آپ بلند آواز سے قراءت کر رہے ہوں؟ انہوں

---

[۲۰۳] جامع ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی القراءۃ خلف الامام ۲: ۱۱۶، یہاں سند میں صرف محمد بن اسحاق عن مکحول ہے اور ابن اسحاق پر محدثین نے جرح کی ہے۔ محمود بن الربیع والی روایت بھی امام جامع ترمذی نے باب ما جاء أنه لا صلاۃ الابفاتحۃ الکتاب ۲: ۲۵ میں ذکر کی ہے۔ ان دونوں روایات کے بارے میں فقہاء اور محدثین کی آراء گزر چکی ہیں۔

[۲۰۴] سنن دار قطنی: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ ام الکتاب فی الصلاۃ و خلف الامام ۱: ۳۱۸

[۲۰۵] سنن دار قطنی: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ أم الکتاب فی الصلاۃ و خلف الإمام: ۳۱۷

۱۔ ابونعیم یا ابومحمد محمود بن الربیع بن سراقہ الخزرجی الانصاری (م۹۹ھ) کی عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت ۴ یا ۵ سال تھی۔ ابن حاتم کہتے ہیں کہ وہ صحابی نہیں ہیں انہوں نے صرف بچپن ہی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ وہ ثقہ نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے ذکر کیا ہے کہ وہ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کے داماد تھے۔ تهذیب التهذیب ۱۰: ۶۳، کتاب الجرح والتعدیل ۸: ۲۸۹

۲۔ یزید بن شریک بن طارق التیمی الکوفی مشہور تابعی ہیں۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت بھی دیکھا۔ ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ تهذیب التهذیب ۱۱: ۳۳۷، بخاری: تاریخ کبیر ۸: ۳۴۰، أسد الغابۃ ۵: ۱۱۵

نے فرمایا: اگرچہ میں بلند آواز سے قراءت کروں۔ امام دارقطنیؒ نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے[1]۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۰۶] الإمامُ ضَامِنٌ فَمَا صَنَعَ فَاصْنَعُوا۔

امام ذمہ دار ہے، اس لئے جو وہ کرتا ہے تم بھی کرو۔

ابوحاتمؒ کہتے ہیں: امام کے پیچھے قراءت کے قائلین کے لئے یہ صحیح دلیل ہے۔ فارسی[2] نے جب حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا: کیا میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھوں تو انہوں نے جواب دیا کہ دل میں پڑھ لیا کرو، پھر آپؓ نے دلیل کے طور پر یہ حدیث قدسی سنائی:

[۲۰۷] قسمتُ الصلاةَ بَينِي و بينَ عَبدى نِصفَين، فِنصفُهالِي و نِصفُها لِعَبْدِى، وَلِعَبدى مَاسَال۔

---

[۲۰۶] سنن دارقطنی: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ ام الکتاب فی الصلاۃ و خلف الإمام ۱:۳۲۲۔ یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور امام احمد وغیرہم کے ہاں مختلف الفاظ سے ملتی ہے جن میں سے اکثر میں یہ الفاظ مذکور ہیں: "الإمام ضامِنٌ والمؤذّن مؤتمنٌ، اللهم أرشِدِ الأئمة واغفرللمؤذنین" (امام ضامن ہے اور موذن امانتدار۔ اے اللہ ائمہ کی رہنمائی فرما اور موذنین کو معاف فرما) اور علامہ سیوطی نے اس کے الفاظ یوں ذکر کئے ہیں: ''امام ضامن ہے، اگر وہ نماز ٹھیک طرح سے ادا کرے گا تو اس کا بھی بھلا ہوگا اور مقتدیوں کا بھی اور اگر وہ غلطی کرے گا تو اس کا وبال اسی پر ہوگا نہ کہ مقتدیوں پر''۔ جامع ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء أن الإمام ضامن...... تحفۃ الاحوذی ۱:۵۴۱، ابو داؤد: کتاب الصلاۃ، باب مایجب علی المؤذن من تعاهد الوقت. بذل المجهود ۴:۷۵، الجامع الصغیر ۱:۱۸۴، حرف الهمزۃ۔ علامہ مناوی الإمام ضامن کا معنی یہ لکھتے ہیں کہ وہ مقتدیوں کی نماز صحیح ہونے کا کفیل ہے کیونکہ ان کی نماز اس کی نماز کے ساتھ مربوط ہے اور اس لئے بھی کہ اگر مقتدی رکوع میں آکر ملے تو اس کی طرف سے سورۂ فاتحہ کی قراءت بھی امام کی قراءت کی وجہ سے ادا ہو جاتی ہے۔ فیض القدیر ۳:۱۸۲

[۲۰۷] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ...... ۱:۲۹۶

۱۔ سنن الدارقطنی: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ ام الکتاب فی الصلاۃ و خلف الإمام ۱:۳۱۷، بخاری: تاریخ کبیر ۸:۳۴۰، تعارف: ۳۲۳۹، یزید بن شریک، بذل المجہود میں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے موسیٰ بن عقبہ کا قول منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر، عمر اور عثمان رضوان اللہ اجمعین سب امام کے پیچھے قراءت سے منع فرماتے تھے۔ بذال المجهود ۵:۵۲

۲۔ علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں فارسی سے مراد ابوالسائب ہیں، یہی اس حدیث کے راوی ہیں۔ وہ ہشام بن زہرہ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ انہوں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ابوسعید وغیرہما سے روایات نقل کی ہیں۔ عمدة القاري ۶:۱۴، تهذیب التهذیب ۱۲:۱۰۴، مصنف عبدالرزاق ۲:۱۲۸ میں یا فارسی کی جگہ یا اعرابی ہے اور وہ شخص ابوالسائب ہی ہیں۔

فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں تقسیم ہے، آدھی میرے لئے ہے اور آدھی میرے بندے کے لئے، اور میرے بندے کو مل جاتا ہے جو وہ مانگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۰۸] اقراء وا! یقولُ العبدُ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾۔

پڑھو! بندہ کہتا ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾.

دسویں بحث: امام کے پیچھے ترک قراءت کے قائلین کے دلائل کا تجزیہ

پہلی دلیل: امام کے پیچھے خاموش رہنے کے قائلین کی پہلی دلیل ارشاد نبوی:

[۲۰۹] وإذَا قَرأَ فأنْصِتُوا.

جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو

ہے جسے امام مسلمؒ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے اور فرمایا ہے کہ جریر نے جو حدیث سلیمان سے اور انہوں نے قتادہؒ سے روایت کی ہے اس میں یہ جملہ "وَإِذَا قَرأَ فَأنْصِتُوا" زیادہ ہے(۱)۔ امام دارقطنیؒ کہتے ہیں: سلیمان التیمی (۲) کے علاوہ کسی نے قتادہؒ سے یہ الفاظ نقل نہیں کئے۔ بلکہ قتادہؒ کے حافظ شاگردوں نے اس کی مخالفت کی ہے اور اسے ذکر نہیں کیا ہے۔ ان میں سے شعبہ، ہشام(۳)، سعید بن ابی عروبہ(۴)،

---

[۲۰۸] سنن ابوداود: کتاب الصلاۃ ، باب من ترک القراء ۃ في صلاته بفاتحة الکتاب ۱:۲۱۶

[۲۰۹] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراء ۃ الفاتحة فی کل رکعة...... مع شرح الابیّ والسنوسی ۲:۲۶۲

۱۔ امام مسلمؒ نے اس جملہ کو صحیح قرار دیا ہے۔اور اس حدیث پر مفصل بحث إعلاء السنن ۳:۴۴-۵۴ میں موجود ہے۔

۲۔ ابو المعتمر سلیمان بن طرخان التیمی البصری (م۱۴۳ھ)۔ابن معین، نسائی، عجلی اور ابن سعد وغیرہ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ ربیع بن یحییٰ نے سعید بن اَبی عروبہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے سلیمان التیمیؒ سے سچا شخص نہیں دیکھا۔ تھذیب التھذیب ۴:۲۰-۲۰۳

۳۔ ابوبکر ہشام بن ابی عبداللہ سنبر الدستوائی (م۱۵۴ھ) بصرہ کے حافظ حدیث اور قتادہؒ کے معتمد شاگردوں میں سے تھے۔ اکثر علماءِ رجال و حدیث نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تھذیب التھذیب ۱۱:۴۳

۴۔ ابو النضر سعید بن ابی عروبہ مہران العدوی البصری (م۱۵۷ھ) کو ابن معینؒ، نسائیؒ اور ابوزرعہ وغیرہم نے ثقہ کہا ہے مگر عمر کے آخری نو یا پانچ سالوں میں ان کی یادداشت بہت کمزور ہوگئی تھی جس کی وجہ سے سند کو الٹ دیتے تھے اور کبھی اپنے قریبی ساتھیوں کو نہیں پہچان سکتے تھے اس لئے احتیاطاً کہا گیا ہے کہ ان کی بیماری کے بعد کی روایات سے اجتناب کیا جائے۔ تھذیب التھذیب ۴:۶۳

ہمام(۱)، ابوعوانہ(۲)، معمر اور عدی بن ابی عمارہ(۳) کے نام قابل ذکر ہیں۔ امام دارقطنیؒ کہتے ہیں: ان سب کا اجماع(۴) اس بات کی دلیل ہے کہ یہ جملہ سلیمان التیمی کے گمان کا نتیجہ ہے(۵) البتہ عبداللہ بن عامر سے منقول ہے کہ انہوں نے قتادہؒ سے یہ الفاظ نقل کرنے میں سلیمان تیمیؒ کی متابعت کی ہے مگر وہ ثقہ نہیں ہیں اور قطان نے انہیں متروک قرار دیا ہے۔

[۲۱۰] یہ الفاظ امام ابو داوٗدؒ نے بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے نقل کئے ہیں اور کہا ہے کہ یہ اضافہ "إِذَا قَرَأَفَأَنْصِتُوا" ثابت نہیں ہے۔

---

[۲۱۰] سنن ابو داوٗد: کتاب الصلاۃ، باب الإمام یُصلّی من قعود۔ بذل المجهود ۴:۲۳۹۔ امام ابوداوٗدؒ کے خیال میں یہ جملہ ابوخالد کے وہم کا نتیجہ ہے۔ ابو خالد سلیمان بن حیان الازدی الکوفی الأحمر (م۱۹۰ھ) پر اگرچہ بعض علماء رجال نے کچھ کلام کیا ہے مگر مشہور ماہرین فن ابن معینؒ، ابن حبانؒ اور عجلیؒ وغیرہم نے ان کی توثیق کی ہے اورابو ہشام نے انہیں ثقہ اور امین کہا ہے۔ تهذیب التهذیب ۴:۱۸۱

۱۔ ابوعبداللہ یا ابوبکر ہمام بن یحییٰ بن دینار الأزدی العوذی (م۱۶۴ھ) کوبعض محدثین نے ثقہ کہاہے اوربعض نے ان پر جرح کی ہے۔ یحییٰ بن سعید اکثر ان کی بات کو رد کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ابراہیم بن عروہ کو صرف ان کی روایت بیان کرنے پر ڈانٹ دیااور کہا: چپ ہو جا تیرا ناس ہو۔ اکثر محدثین نے ان کی لکھی ہوئی روایت کو قابل اعتماد قراردیا ہے اور جووہ زبانی بیان کرتے تھے اس کا اعتبار نہیں کیا۔ ہمام نے خود بھی اس کا اقرار کرتے ہوئے استغفار کیا۔ تهذیب التهذیب ۱۱:۶۷

۲۔ ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ الیشکری البزاز (م۱۷۶ھ) بعض محدثین نے انہیں ثقہ اور بعض نے صدوق کہا ہے۔ اکثر کی رائے یہ ہے کہ جو روایات وہ اپنی کتاب سے بیان کریں وہ قابل اعتماد ہیں اور جو حافظہ سے نقل کریں ان کا اعتبار نہیں کیوں کہ انہیں اکثر غلطی لگ جاتی تھی۔ ابن المدینی کہتے ہیں: انہوں نے جو روایات قتادہؒ سے نقل کی ہیں، ضعیف ہیں کیوں کہ ان کی کتاب ضائع ہوگئی تھی اور بعض اوقات وہ عجیب وغریب روایات بیان کرتے تھے۔ تهذیب التهذیب ۱۱:۱۱۶

۳۔ عدی بن ابی عمارہ الذراع الوراق البصری قتادہؒ سے، زیادہ نمیری اور معاویہ بن قرہ کے شاگرد ہیں۔ ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ ذہبیؒ نے ان کی احادیث میں اضطراب بتایا ہے اورحافظ ابن حجرؒ نے ان کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔ ثقات ابن حبان: ۷:۲۹۲، بخاری: تاریخ کبیر ۷:۴۶، الجرح والتعدیل ۷:۴، المیزان ۳:۶۲، لسان المیزان ۴:۱۶۰

۴۔ امام دارقطنیؒ کا یہ فرمانا کہ یہ جملہ قتادہؒ سے منقول نہ ہونے پر ان سب حضرات کا اجماع ہے، محل نظر ہے کیوں کہ خود انہی حضرات میں سے سعید بن ابی عروبہؒ نے قتادہؒ سے یہی جملہ نقل کیا ہے۔ یہی جملہ ابوعوانہؒ نے ابوعبیدہ کی روایت سے قتادہ سے نقل کیا ہے اور سلیمان التیمی کی اس روایت کو امام مسلم جیسی جلیل القدر شخصیت نے صحیح قرار دیا ہے۔ صحیح مسلم بشرح الابی والسنوسی: باب التشهد فی الصلاۃ ۲:۲۸۷، مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الصلاۃ، باب من کرہ القراءۃ خلف الامام ۱:۴۱۲، بذل المجهود ۴:۲۴۵

۵۔ سلیمان تیمیؒ کے اس قول پر یہ رائے امام دارقطنیؒ کی اپنی تحقیق ہے۔ جن حضرات کے اجماع کی طرف انہوں نے اشارہ فرمایاہے ان میں سے اکثر پر محدثین نے جرح کی ہے جیسا کہ ذکر ہوا جب کہ سلیمان تیمیؒ کو سعید بن ابی عروبہ نے جوکہ انہی حضرات میں سے ہیں سچا ترین شخص قراردیاہے۔ انہی میں سے ایک مشہور محدث شعبہؒ کہتے ہیں کہ ابن عون اور سلیمان التیمی کا شک بھی یقین کے درجہ میں ہے۔ ابن سعد نے انہیں ثقہ، کثیر الحدیث اور صاحب ریاضت بزرگ کہا ہے۔ تهذیب التهذیب ۴:۲۰۱-۲۰۲

ابو محمد عبدالحق کہتے ہیں:

[۲۱۱] امام مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صحیح قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ یہ جملہ میرے نزدیک صحیح ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں کہ حدیث کے اس جملے کو امام مسلم کا اپنی کتاب میں حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کر لینا ہی اس کے صحیح ہونے کی دلیل ہے۔ جملہ اس کی صحت پر تمام محدثین کا اجماع نہ سہی مگر امام احمد بن حنبلؒ اور امام ابن منذرؒ جیسی ہستیوں نے اسے صحیح قرار دیا ہے(1)۔

[۲۱۱] صحیح مسلم بشرح الابی والسنوسی: کتاب الصلاۃ، باب التشهد في الصلاة ۲:۲۸۷، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں یہ عبارت صحیح مسلم کے بعض نسخوں میں خود نص حدیث کے اندر موجود ہے۔ عمدۃ القاری: كتاب الصلاة، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم ۱۵:۶، یہ اضافہ: وإذا قرأ فأنصتوا" امام مسلمؒ، امام دارقطنیؒ اورامام ابو داؤد کے علاوہ دیگر ائمہ حدیث نسائی، ابن ماجہ، طحاویؒ، بیہقیؒ، بزارؒ، ابوعوانہؒ ابن ابی شیبہؒ وغیرہم نے بھی مختلف طرق سے نقل کیا ہے جن میں سے بعض طرق کو علماءِ حدیث نے ضعیف کہا ہے اور بعض کی بڑے بڑے ائمہ حدیث نے توثیق فرمائی ہے۔ ان ثقہ طرق سے ان الفاظ کی صحت ثابت ہوجاتی ہے اور طرق ضعیفہ ایک طرح سے اس کے مؤید بن جاتے ہیں۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے بذل المجهود ۴:۲۴۵ میں اس کے بارہ طرق جمع کرکے ان سب پر محدثانہ بحث کی ہے۔ سنن نسائی: كتاب افتتاح الصلاة باب قراءة أم القرآن خلف الإمام فيما جهربه الإمام ۱:۳۲۰ طحاوی: شرح معانی الآثار: كتاب الصلاة، باب القراءة خلف الإمام ۱:۲۱۷، البانی: صحیح سنن ابن ماجہؒ: كتاب الصلاة، باب إذا قرأ الإمام فأنصتوا ۱:۱۴۰ بروایت ابی ہریرہؓ و ابی موسیٰ الاشعریؓ بیہقی: السنن الكبرى، كتاب الصلاة، جماع ابواب صفة الصلاة ۲:۵۲۵۔ حضرت ابوہریرہ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کی حدیث مختلف طرق سے نقل کی گئی ہے، مصنف ابن ابی شیبہ: كتاب الصلاة، باب مَن كَرِه القراءة خلف الإمام ۱:۴۱۲، عمدۃ القاری ۱۵:۶

۱۔ علامہ قرطبیؒ نے یہ رائے اپنے فقہی مسلک کے خلاف ہونے کے باوجود اس اضافہ کی صحت وثبوت کی تائید فرمائی ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ بھی خود قراءت فاتحہ خلف الامام کے قائل ہونے کے باوجود روایات میں تطبیق دینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ایک مقام پر انہوں نے فرمایا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ان کے صحابہ کرامؓ، حضرات تابعین، اہل حجاز میں سے امام مالک، اہل عراق میں سے ثوری، اہل شام میں سے اوزاعی اور اہل مصر میں سے لیثؒ سب حضرات میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس نے کہا ہو کہ جو شخص امام کی قراءت کے باوجود خود قراءت نہیں کرتا اس کی نماز نہیں ہوتی۔ ابن قدامہؒ نے اس موضوع پر مستقل عنوان قائم کیا ہے: "فإن لم يفعل فصلاتهٗ تامّةٌ، لأنَّ مَن كَانَ لهٗ إمامٌ فقِراءَةُ الإمامِ لهٗ قِرَاءَةٌ" (اگر کسی نے امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ سرے سے پڑھی ہی نہیں تو اس کی نماز بالکل مکمل ہے کیوں کہ امام کی قراءت مقتدی کی بھی قراءت ہے۔ المغنی، کتاب الصلاۃ باب صفة الصلاة، مسئلہ ۱۸۳: والمأموم إذا سمع قراءة الإمام فلا يقرأ بالحمد...... ۲:۲۶۲، مسئلہ ۲۶۸/۲۱۸۵۔ میں فرماتے ہیں: یہی اکثر اہل علم کا قول ہے...... اور یہی زہری، اسود، ابراہیم، سعید بن جبیر، ثوری، ابن عیینہ، امام مالک، اصحاب رائے اسحاقؒ وغیرہم سب حضرات کا قول ہے۔

دوسری دلیل: جہاں تک ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا﴾[الأعراف ۷:۲۰۴] (جب قرآن پڑھا جاتا ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو) کا تعلق ہے تو یہ مکہ مکرمہ میں نازل ہوا اور نماز میں باتوں سے ممانعت زید ابن ارقم[1] کے قول کے مطابق مدینہ منورہ میں نازل ہوئی اس لئے یہ زیر بحث مسئلہ میں دلیل نہیں بنتی، کیوں کہ اس ارشاد باری تعالیٰ کے مخاطب تو مشرکین تھے جیسا کہ سعید بن مسیب نے فرمایا ہے۔

[۲۱۲] امام دارقطنیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ یہ ارشاد باری تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز میں آوازیں بلند کرنے کے بارے میں نازل ہوا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس حدیث کا راوی عبداللہ بن عامر ضعیف ہے۔

تیسری دلیل: جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:

[۲۱۳] "مالي أنازع القرآن"۔ کیابات ہے میری قراءت میں خلل ڈالا جارہا ہے۔

کا تعلق ہے اسے امام مالکؒ نے ابن شہاب سے نقل کی ہے جنھوں نے اسے ابن اکیمہ لیثی سے روایت کیا ہے۔

---

[۲۱۲] سنن دارقطنیؒ: کتاب الصلاۃ ،باب ذکر قوله صلى الله عليه وسلم : من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة ...... ۱: ۳۲۶۔ اس آیت کریمہ کا نماز کے بارے میں نازل ہونا صرف عبداللہ بن عامرؒ سے ہی منقول نہیں بلکہ کئی طرق سے حضرت ابوہریرہؓ، قتادہؒ، حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد وغیرہم سے بھی منقول ہے۔ ابن قدامہ الحنبلیؒ ان سب روایات کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ مقتدی جب امام کی قراءت سن رہا ہو تو اس پر نہ قراءت واجب ہے نہ ایسا کرنا پسندیدہ ہے۔ ہمارے امام (احمد بن حنبلؒ) زہریؒ، ثوریؒ، مالکؒ، ابن عیینہؒ، ابن مبارکؒ، اسحاقؒ اور اصحاب رائے سب اس بات پر متفق ہیں اور امام شافعیؒ کا ایک قول بھی یہی ہے۔ واحدی: اسباب نزول القرآن، الأعراف: ۲۰۴ ص ۲۳۳، جصاص: أحكام القرآن ،الأعراف: ۲۰۴، باب القراءة خلف الإمام ۳:۳۹، ابن قدامہ: المغنی، کتاب الصلاۃ، باب صفة الصلاۃ، مسئلة ۱۸۳، ۲:۲۵۹: تفسیر الطبري (الأعراف ۲۰۴)، ۹:۱۱۰-۱۱۲۔ امام طبریؒ نے اس ضمن میں انتیس (۲۹) روایات ذکر کر کے خلاصہ یہ بیان کیا ہے کہ ہمارے خیال میں یہی رائے سب سے بہتر ہے کہ یہ آیت کریمہ نماز میں امام کے پیچھے اس کی قراءت کے دوران خاموش رہنے اور خطبہ جمعہ وغیرہ خاموشی سے سننے کے بارے میں ہے۔ پھر انہوں نے اس پر مزید مدلل بحث بھی کی ہے، بیہقی: السنن الکبری، کتاب الصلاۃ، باب من قال یترکُ المأموم القراءة فيما جَهَرَ فيه الإمام بالقراءة ۳:۵۲۴۔ اس میں امام بیہقیؒ نے آٹھ روایات نقل کر کے اس رائے کی تائید میں واقعات اور صحابہ، تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال نقل کئے ہیں۔

[۲۱۳] مؤطاامام مالکؒ: کتاب الصلاۃ، باب ترک القراءة خلف الإمام فیماجهر فيه. أوجز المسالک ۲:۱۰۶،سنن ابو داؤد: کتاب الصلاۃ، باب من کره القراءة بفاتحة الکتاب إذا جَهَرَالإمام، بذل المجهود ۵:۶۱، مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ، باب القراءة خلف الإمام ۲:۱۳۵

۱۔ جلیل القدر صحابی حضرت زید بن ارقم بن زید الخزرجی الأنصاری (م۶۸ھ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سترہ غزوات میں شریک ہوئے اور کوفہ میں وفات پائی۔ تهذیب التهذیب ۳:۳۹۴

ابن اکیمہؒ کا تعارف

امام مالکؒ کے ارشاد مطابق ابن اکیمہ کا نام عمرو ہے۔ کچھ لوگ عامر بتاتے ہیں۔ بعض نے یزید، بعض نے عمارہ اور بعض نے عباده بھی بتایا ہے۔ ان کی کنیت ابو الولید تھی۔ ۱۰۱ھ میں اناسی برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس حدیث کے علاوہ زہریؒ نے ان سے کوئی روایت نقل نہیں کی۔ وہ ثقہ ہیں[1]۔ ان سے محمد بن عمرو وغیرہ روایت کرتے ہیں[2]۔

ان کی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "جب میں بلند آواز سے قراءت کروں تو تم بلند آواز سے نہ پڑھا کرو کیوں کہ اس سے آوازوں میں ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور بات خلط ملط ہو جاتی ہے اور جھگڑے کی کیفیت بن جاتی ہے تم دل میں پڑھو"۔ اس حدیث کی وضاحت حضرت عباوۃ کی حدیث اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے فتویٰ سے ہوتی ہے ۔ دونوں حدیثوں کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں، اگر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "مالي أنازع القرآن" کا مطلب سرّی و جہری تمام نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت سمجھتے تو اس کے خلاف فتویٰ نہ دیتے[3]۔ ابن اکیمہ والی حدیث میں امام زہری نے جو یہ فرمایا ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سن لی توان کے پیچھے جہری نمازوں میں قراءت کرنا چھوڑ دی ،اس سے ان کی مراد سورۂ فاتحہ ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کی قراءت ہے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے[4]۔ اللہ ہی ہمیں توفیق دینے والے ہیں۔

۱۔ ابو الولید عمارہ بن اکیمہ اللیثی الخبدعي المدنی (م۱۰۱ھ) کے نام میں اختلاف ہے۔ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے اور کئی محدثین نے مجہول کہا ہے ۔ یہ امام مالکؒ کے شیخ عمرو بن مسلم کے دادا ہیں۔ تهذيب التهذيب ۷:۴۱۰

۲۔ ابوعبداللہ یا ابوالحسن محمد بن عمرو بن علقمہ اللیثي المدنی (م۱۴۴ھ) نے عمرو بن مسلم بن عمارہ بن اکیمہ سے روایات نقل کی ہیں نہ کہ ان کے دادا عمارہ بن اکیمہ سے جیسا کہ امام قرطبی نے ذکر فرمایا ہے۔ تهذيب التهذيب ۹:۳۷۵

۳۔ حضرت عبادہ بن الصامتؓ والی حدیث پر پہلے بات ہو چکی ہے اور سیدنا عمرؓ کے بارے میں امام عبدالرزاقؒ نے نقل کیا ہے کہ وہ امام کے ساتھ قراءت سے منع فرماتے تھے،انہوں نے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم سے نقل کیا ہے ، وہ اپنے والد گرامی سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود امام کے پیچھے قراءت کرنے سے منع فرمایا۔امام عبدالرزاقؒ کہتے ہیں مجھے اپنے اساتذہ نے یہ بھی بتایا کہ سیدنا علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ جو امام کے پیچھے قراءت کرتا ہے اس کی نماز ہی نہیں ہوتی۔ اور اسی طرح موسیٰ بن عقبہ نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر ، عمر، عثمانؓ سب حضرات امام کے پیچھے قراءت سے منع فرماتے تھے۔ مصنف عبدالرزاق: كتاب الصلاة ،باب القراءة خلف الإمام ۲:۱۳۸،۱۳۹،۱۴۰

۴۔ ظاہر حدیث سے تو یہی اشارہ ملتا ہے کہ یہ جملہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا نہ کہ زہریؒ نے اور اسی کی تائید امام احمد اور طبرانی وغیرہما والی روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں قال کے الفاظ ہی نہیں البتہ امام بخاریؒ، ابن فارسؒ، ابوداؤدؒ، ابن حبانؒ اور خطابیؒ وغیرہم نے اسے امام زہری کا قول قرار دیا ہے۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ فرماتے ہیں :اگر اسے امام زہری کا قول ہی قرار دے دیا جائے تو باقی حدیث یہاں تک رہ جائے گی: "مالي أنازع القرآن" یعنی میں نے سوچا کہ میرے ساتھ قرآن میں جھگڑا کیوں کیا جا رہا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے قراءت کو ناپسند فرمایا۔ بعض روایات میں صرف "فَانْتَهَى النَّاسُ" (تو لوگوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا) کے الفاظ پائے بھی جاتے ہیں ۔ بذل المجهود ۵:۶۲-۶۷، اوجز المسالك ۲:۱۰۷

چوتھی دلیل: جہاں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی

[۲۱۴] من كان له امام فقراءة الإمام له قراءة۔

جو امام کے پیچھے نماز پڑھے تو امام کی قراءت اس کی قراءت ہے۔

کا تعلق ہے تو یہ حدیث ضعیف ہے۔اس کے راویوں میں سے ایک حسن بن عمارہ ہیں(1) جو کہ

---

[۲۱۴] یہ حدیث کئی طرق سے نقل کی گئی ہے۔اگر اس کی ہر سند ضعیف قرار دے دی جائے پھر بھی کثرت طرق کی وجہ سے یہ حسن کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے ۔اسے حسن بن عمارہ کے علاوہ بھی کئی راویوں نے نقل کیا ہے اور اس کی تائیدی روایات کی بھی کمی نہیں۔معاصر محقق علامہ البانیؒ نے بھی اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔سنن ابن ماجہ: كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها،باب إذاقرأ الإمام فانصتوا ۱:۲۷۷بروایت علي بن محمد عن عبيدالله بن موسىٰ عن الحسن بن صالح عن جابر عن أبي الزبير عن جابر رضى الله عنه قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ،سنن دارقطنیؒ: كتاب الصلاة، باب ذكر قوله: من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة واختلاف الروايات ۱:۳۲۳(متعدد طرق)، مسند احمدؒ : مسند جابر بن عبدالله رضى الله عنه، عن أسود بن عامر عن حسن بن صالح عن ابى الزبير عن جابر عن النبى صلى الله عليه وسلم ۳:۳۳۹،فیض القدیر ۶:۲۰۸، شرح معاني الآثار: ۱:۲۱۷ عن أحمد بن عبدالرحمن عن عبدالله بن وهب عن الليث عن يعقوب عن النعمان عن ابى موسى بن ابى عائشه عن عبدالله بن شداد عن جابرؓ، اس کے علاوہ امام طحاویؒ نے مزید پانچ طرق نقل کیے ہیں،امام محمد بن حسنؒ: كتاب الآثار ص۱۷، كتاب الحجة على اهل المدينة ۱:۱۱۸-۱۱۹،ابونعیم الأصبہانیؒ: مسندأبي حنيفة ص ۲۱۰، باب الفاء، روايةً عن فرات بن عبدالرحمن، مصنف عبدالرزاق: باب القراءة خلف الإمام ۲:۱۳۶،سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب من قال لايقرأ خلف الإمام على الإطلاق ۲:۵۳۱-۵۳۲ امام بیہقیؒ نے حضرت جابرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ والی روایات کو صحیح قرار دے کر اسے ان دونوں حضرات کی ذاتی رائے قرار دیا ہے اور اسی حدیث کو مزید کئی طریق سے ذکر کیا ہے،مصنف ابن ابی شیبہ: كتاب الصلاة، من كره القراءة خلف الإمام۔ بروايت شريك و جرير عن موسى بن أبى عائشة عن عبدالله بن شداد ۱:۴۱۲،مؤطا امام مالکؒ: كتاب الصلاة، باب ترك القراءة خلف الإمام فيما جهرفيه ۲:۱۰۴-۱۰۵،البانیؒ: صحیح سنن ابن ماجہ:كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب إذا قرأ الامام فانصتوا ۱:۱۴۱،مرغینانی:الهداية، كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة، فصل في القراءة ۱:۱۰۸،عینی: عمدة القاري ۶:۱۳،مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ نے لکھا ہے کہ یہ حدیث متعدد صحابہؓ سے منقول ہے ۔حضرت جابرؓ کی حدیث کو ابن ماجہؒ نے، حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کو دارقطنیؒ نے، حضرت ابوسعید خدریؓ کی حدیث کو طبرانیؒ نے، ابوہریرہؓ کی حدیث کو دارقطنیؒ نے اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کو بھی دارقطنیؒ نے نقل کیا ہے، حضرت جابرؓ والی حدیث متعدد طرق سے منقول ہے، جن میں سے بعض اگرچہ ضعیف ہیں لیکن اس کے دیگر طرق کی بنیاد ثقہ رواۃ پر ہے۔ بذل المجهود ۵:۵۰-۵۱

۱۔ ابومحمد حسن بن عمارہ بن مضرب البجلی الکوفی (م۱۵۳ھ) منصور کے عہد میں بغداد کے قاضی رہے، فقہ میں خوب دسترس رکھتے تھے اکثر علماء حدیث نے انہیں متروک الحدیث قرار دیا ہے مگر اس کے باوجود ان کی فضیلت، نیکی اور زہد وتقویٰ کی تعریف کی ہے۔ تهذيب التهذيب ۲:۳۰۴ ميزان الاعتدال ۱:۵۱۳

متروک ہیں۔اور اسی طرح ابوحنیفہؒ ہیں اور وہ بھی ضعیف ہیں(۱)۔ دونوں نے اسے موسیٰ بن ابی عائشہ سے نقل

۱۔ سراج الامۃ امام الائمہ ابوحنیفہؒ النعمان بن ثابت بن زُوطی التیمی (م۱۵۰ھ/۷۶۷ء) کا زہد و صفا مشہوراورعلم کے میدان آپؒ کی امامت مسلّم ہے۔ امام دارقطنیؒ کا علم حدیث میں ان کو ضعیف کہنا عجیب بات ہے۔ حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں: حصول علم حدیث کے لئے انہوں نے کئی سفر کئے اور اس کا بڑا اہتمام فرمایاجب کہ فہم وادراک اور تعمق فکر میں مرکزی حیثیت آپؒ ہی کو حاصل ہے جس میں سب لوگ آپؒ کے خوشہ چین ہیں۔ آپؒ سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ سیر أعلام النبلاء ۶:۳۹۲-۳۹۳۔ امام خُرَیبِی کہتے ہیں: ابوحنیفہؒ کی شان میں گستاخی کرنے والا یا تو حاسد ہوسکتا ہے یا جاہل۔ یحییٰ بن سعید قطان کہتے ہیں: ہم اللہ کی پاک ذات کی طرف جھوٹ کی نسبت نہیں کر سکتے ،حق یہی ہے کہ ہم نے ابوحنیفہؒ سے بہتر رائے والا کوئی نہیں دیکھا اوراکثر انہی کے اقوال کو اختیار کیا ہے۔مرجع سابق ۶:۴۰۲، تاریخ بغداد ۱۳:۳۴۵۔ علی بن عاصم کہتے ہیں: ابوحنیفہؒ کے علم کا موازنہ ان کے تمام ہم عصر علماء کے علم سے کیا جائے تو ابوحنیفہؒ کا پلڑا بھاری ہوگا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں: فقہ میں لوگ ابوحنیفہؒ کے خوشہ چیں ہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے ان کی شان میں ایک شعر نقل کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:(جب نوبت یہاں تک پہنچے کہ دن بھی محتاج دلیل ہو۔ تو سمجھ لو کہ ان پراگندہ ذہنوں کو کچھ بھی صحیح نظر نہیں آئے گا) مرجع سابق ۶:۴۰۳، تاریخ بغداد ۱۳:۳۴۶۔ اسرائیل (بن یونس) کہتے ہیں:ابوحنیفہؒ کمال کے آدمی تھے، وہ ایسی احادیث کو خوب محفوظ فرما لیتے تھے جن کا تعلق فقہی مسائل سے ہوتا اورآپؒ ایسی احادیث کی تلاش کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے۔آپؒ ان احادیث سے مستنبط ہونے والے مسائل کو خوب سمجھتے تھے۔آپؒ نے حمادؒ سے علم سیکھا اور اس کی ایسی حفاظت کی کہ خلفاء، حکام اور وزراء بھی ان کی قدر کیا کرتے تھے۔ تاریخ بغداد ۱۳:۳۳۹۔ ابن الصباح کہتے ہیں :ابوحنیفہؒ کے پاس اگر کوئی ایسا مسئلہ آتا جس کے بارے میں صحیح حدیث موجود ہوتی تو وہ اسی پر عمل کرتے، اگر صحابہ اور تابعین میں سے بھی کسی کا قول مل جاتا تو اسے اختیار کرتے ورنہ قیاس کرتے اور ان کے قیاس کا انداز بڑا کمال تھا ۔ تاریخ بغداد ۱۳:۳۴۰۔ امام ابویوسفؒ کہتے ہیں: جہاں تک مجھے معلوم ہے حدیث کی وضاحت کرنے اور اس کے فقہی نکات بیان کرنے میں ابوحنیفہؒ سے بڑھ کر کوئی شخص نہیں۔ مرجع سابق ۱۳:۳۴۰۔عبداللہ بن داوٗد الخریبی کہتے ہیں: اپنی نمازوں کی دعاؤں میں ابو حنیفہؒ کے لئے دعا کرنا اہل اسلام پر واجب ہے۔ پھر انہوں نے حفاظت حدیث و فقہ میں حضرت امام کی خدمات کا ذکر کیا۔ مرجع سابق ۱۳:۳۴۴۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ جب آپؒ اپنی کوفہ اور بغداد کی تجارت کا سالانہ منافع جمع فرماتے تو اس سے مشائخ اور محدثین کی ضروریات کا سامان خریدتے اور باقی مال ان کو نقد تقسیم کرتے ہوئے فرماتے: انہیں اپنی ضروریات میں خرچ کر لیں۔ اللہ کی قسم! اس ذات نے آپ لوگوں کا جو رزق میرے ہاتھوں میں رکھا ہے اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہیں۔ تهذيب الاسماء ۲:۲۲۰

علامہ عینیؒ نے دارقطنیؒ کی رائے کو تعصب پر مبنی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے علمی مقام کے معترف تو اہل مشرق و مغرب بھی ہیں۔ یحییٰ بن معین جیسے حضرات ان کی ثقاہت کی گواہی دیتے اور جھوٹ کی ان کی طرف نسبت کو رد کرتے ہیں۔ شعبہ بن الحجاج جیسے بلند پایہ محدّث حدیث میں ان کی مہارت کا اعتراف کرتے ہیں جب کہ خود دارقطنیؒ کی حیثیت حضرت امام کے مقابلہ میں کچھ بھی نہیں اور ان کی سنن میں معلول، منکر، ضعیف اور موضوع ہر طرح کی روایات موجود ہیں۔ عمدة القاري : كتاب الصلاة، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم. ۶:۱۲۔ امام ابوحنیفہؒ کی عظمت اور ان کے علمی وفقہی مقام کے بارے میں ہردور کے مصنفین نے مستقل کتب تالیف کی ہیں۔جن میں امام ذہبیؒ کی ''مناقب أبي حنيفة''، موفق مکی کی ''مناقب أبي حنيفة''، ابن حجر ہیثمیؒ کی'' الخيرات الحِسان ''۔

بقیہ آئندہ صفحہ پر

کیا ہے ، موسیٰ (۱) نے عبداللہ بن شداد (۲) سے اورانہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔
اس حدیث کو امام دارقطنیؒ نے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں.

[۲۱۶] یہ حدیث سفیان ثوریؒ، شعبہؒ، اسرائیل ابن یونسؒ،شریکؒ (۳)، ابوخالدالدالانی(۴)،

بقیہ حاشیہ ازصفحہ گزشتہ :.........................

سیوطیؒ کی ''تبییض الصحیفة''،ابن بزاز الکردی کی ''مناقب الإمام الأعظم''، ابو زہرہ کی ''أبوحنیفه: حیاته و عصره، و آراؤ ہ و فقهه''، سید عفیفی کی "حیاة الإمام أبي حنیفة"، عبدالحلیم جندی کی ''أبوحنیفة''، اور اردو میں دیگر بیش بہا تصانیف کے علاوہ شاہ ابوالحسن زید فاروقی دہلوی کی سوانح بے بہائے امام اعظم ابوحنیفہؒ دیکھی جا سکتی ہیں۔خطیب بغدادیؒ نے تاریخ بغداد میں موافقین و مخالفین کی آراء سوصفحات میں لکھ کر ''خلاصۃ''میں حضرت امام کی جلالت شان بیان کی ہے۔حافظ ذہبیؒ نے سیر أعلام النبلاء میں چودہ صفحات میں آپ کی جلالت شان، علمی مرتبہ، حدیث و فقہ میں مہارت اور زہد و عبادت میں سبقت کاذکر فرماتے ہوئے اظہار عقیدت کیا ہے۔ اس کے علاوہ مشرق و مغرب میں دو تہائی مسلمانوں کا ان کے مکتب فکر کی پیروی کرنا بذات خود ان کی قرآن و سنت میں مہارت کی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔علاوہ ازیں حافظ ذہبیؒ نے اپنی مشہور کتاب ''تذکرۃ الحفاظ''میں بھی امام ابوحنیفہؒ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے۔

....

[۲۱۵] سنن دارقطنیؒ: کتاب الصلاۃ، باب ذکر قوله: من کان له إمام فقراءۃ الامام له قراءۃ. ۱:۳۲۵۔ اس حدیث کی تحقیق آٹھویں بحث میں گزر چکی ہے۔اس کی سند کی تحقیق ہردور کے محدثین نے اپنے اپنے انداز سے کی ہے ۔عصر حاضر کے مشہور محقق مولانا سرفراز خان صفدر مدظلہ نے اس کے متعلق کئی محققین کی آراء نقل کی ہیں جن میں سے چند درج ذیل ہیں: مبارکپوری صاحب کہتے ہیں یہ روایت بظاہر صحیح ہے کیوں کہ موصول بھی ہے، اس کے تمام رواۃ بالاتفاق ثقہ ہیں اور کوئی علت قادحہ بھی بظاہر اس میں نہیں پائی جاتی۔ بحوالہ تحقیق الکلام ۲:۱۴۸۔ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں: امام سفیان ثوریؒ، شریک، جریر اور ابوالزبیر وغیرہم صحیح اسانید کے ساتھ اس روایت کو مرفوع نقل کرتے ہیں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے اس کو مرفوع روایت نہیں کیا ان کا قول سراسر باطل ہے۔ مطلب یہ کہ اس حدیث کو مرفوعاً نقل کرنے میں امام ابوحنیفہؒ اکیلے نہیں بلکہ یہ دیگر ائمہ حدیث و فقہ سے بھی مرفوعاً منقول ہے۔نواب صدیق حسن صاحب مرحوم فرماتے ہیں: خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث مرسلاً اور مرفوعاً متعدد طرق سے منقول ہے اور اس میں دلیل ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے کیوں کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔ بحوالہ ہدایت السائل ص ۲۰۲: یہ حدیث تو مرفوعاً منقول ہے اور اگر بعض طرق میں مرسل بھی ہو تو بنیادی طور پر مرفوع ہونے کی وجہ سے اس میں مزید قوت آ جاتی ہے۔ فرض کیجئے اگر صرف مرسل بھی ہوتی تو ائمہ حدیث و فقہ کی کثیر تعداد اس بات کی قائل ہے کہ ثقات کی مرسل روایت بھی قابل حجت ہوتی ہے اور اس حدیث کے راویوں کا شمار ائمہ حدیث میں ہوتا ہے۔مزید تفصیل کے لئے : أحسن الکلام ص ۳۱۸-۳۲۴۔ اسلاف محدثین میں سے امام حاکمؒ نے علم اصول حدیث کی مشہور کتاب معرفة علوم الحدیث مطبع قاہرہ ص ۲۲ میں تیئیسویں (۲۳) نوع کا عنوان یہ قائم فرمایا ہے: "هذا النوع من هذا العلم معرفة المشهور من الأحادیث المرویة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم صلی الله علیه وآله وسلم. ان مشہور احادیث میں انہوں نے یہ حدیث بھی ذکرفرمائی ہے اور آخر میں خلاصہ یہ بیان فرمایاہے: یہ تمام احادیث اپنے اسانید اور طرق کے اعتبار سے مشہور ہیں۔ احسن الکلام ص ۳۲۹۔ دور جدید کے مشہور محقق ناصر الدین البانیؒ نے اپنے شدید ترین منہج کے باوجود صحیح سنن ابن ماجہ: کتاب إمامة الصلاۃ والسنة فیها، باب اذا قرأ الإمام فانصتوا ۱:۱۴۱ میں اس حدیث کو حسن شمار کیا ہے۔.........................بقیہ آئندہ صفحہ پر

ابوالاحوص(۱)، سفیان بن عیینہ اور جریر بن عبدالحمید(۲) وغیرہ نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے، انہوں نے عبداللہ بن شداد سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً نقل کی ہے اور یہی بات صحیح ہے۔

پانچویں دلیل: حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے قول "من صلّى ركعة لم يقرأ فيها بأمّ القرآن فلم يُصلّ إلاّ وراء الإمام" (جس نے کوئی رکعت امّ القرآن کے بغیر پڑھی تو اس نے نماز نہیں پڑھی سوائے اس کے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو)۔ کو امام مالکؒ نے وہب(۳) بن کیسان سے اور انہوں نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں: اسے صاحب تفسیر یحییٰ بن سلام نے امام مالکؒ سے، امام مالکؒ نے ابی نعیم وہب بن

بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ:

۱۔ ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشہ المخزومی الکوفی بڑے زاہد اور عبادت گزار تابعی تھے۔ انہوں نے روایت حدیث میں بڑا مقام پایا۔ سفیان ثوریؒ ان کی بہت تعریف کیا کرتے تھے، سفیان بن عیینہ، ابن معین اور دیگر کبار محدثین نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۱۰:۳۵۲، ابن حبان: کتاب الثقات ۵:۴۰۴، بخاری: التاريخ الكبير ۴:۲۸۹

۲۔ ابوالولید عبداللہ بن شداد بن الہاد اللیثی المدنی (م۸۱ھ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں پیدا ہوئے۔ ان کا شمار کبار تابعین اور کثیر الحدیث ثقہ محدثین میں ہوتا ہے۔ انہوں نے فقہ میں بھی بلند مقام پایا۔ تهذيب التهذيب ۵:۲۵۱، التاريخ الكبير ۵:۱۱۵، الجرح والتعديل ۵:۸۰، الاستيعاب على هامش الاصابة ۲:۳۸۸

۳۔ ابوعبداللہ شریک بن عبداللہ بن ابی نمر اللیثی المدنی (م۱۴۴ھ) ابن سعد نے انہیں ثقہ اور کثیر الحدیث کہا ہے۔ امام ابوداؤد بھی انہیں ثقہ کہتے ہیں۔ حافظ ابن عدیؒ کہتے ہیں: جب ان سے روایت کرنے والے ثقہ ہوں تو یہ بھی ثقہ ہیں۔ امام ابن معینؒ اور امام نسائیؒ کہتے ہیں: ان کی روایت میں کوئی حرج نہیں۔ تهذيب التهذيب ۴:۳۳۷، ميزان الاعتدال ۲:۲۶۹

۴۔ ابو خالد الدالانی الاسدی الکوفی کا نام بعض علماء سیر نے یزید بن عبدالرحمٰن بن ابی سلامہ نقل کیا ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے انہیں مشہور محدث اور ابو حاتم نے صدوق کہا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں ان کی روایات قابل قبول ہیں۔ ابن معینؒ اور نسائیؒ بھی یہی کہتے ہیں۔ ابن حبانؒ کے نزدیک یہ ضعیف ہیں۔ تهذيب التهذيب ۱۲:۸۲، کنیت نمبر ۳۵۸، ميزان الاعتدال ۴:۴۳۲

۱۔ ابوالاحوص مشہور محدث ہیں، بعض نے ان کو بنو لیث اور بعض نے بنو غفار کے موالی میں شمار کیا ہے۔ مدینہ میں رہتے تھے۔ ابن حبان نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ تهذيب التهذيب ۱۲:۵

۲۔ ابو عبداللہ جریر بن عبدالحمید الضبی الرازی (م۱۸۸ھ) اصفہان میں پیدا ہوئے اور کوفہ میں پرورش پائی۔ ثقہ تھے اور لوگ سفر کر کے ان سے حدیث سننے آتے تھے۔ ابن عمار الموصلی کہتے ہیں: جریر خود حجت اور ان کی کتابیں صحیح کا درجہ رکھتی ہیں۔ امام نسائیؒ نے بھی انہیں ثقہ کہا ہے۔ ابوالقاسم لالکائی کہتے ہیں: ان کی ثقاہت پر سب کا اتفاق ہے۔ تهذيب التهذيب ۲:۷۵

۳۔ ابونعیم وہب بن کیسان القرشی المدنی (م۱۲۷ھ) جلیل القدر تابعی ہیں۔ امام نسائی، ابن حبان اور ابن سعد وغیرہم سب نے ان کو ثقہ کہا ہے، مکہ مکرمہ میں حدیث کے شیخ شمار ہوتے تھے۔ تهذيب التهذيب ۱۱:۱۶۶

کیسان سے، انہوں نے حضرت جابرؓ سے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے مگر صحیح یہ ہے کہ یہ حدیث حضرت جابرؓ پر موقوف ہے، جیسا کہ مؤطا میں موجود ہے(۱)۔ اس حدیث میں فقہی بات یہ ہے کہ جس رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ باطل ہو جاتی ہے اور یہ بات ابن القاسم کی رائے کی تصدیق کرتی ہے جس میں انہوں نے امام مالکؒ کا ارشاد بھی نقل کیا ہے کہ نمازی اگر کسی رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے تو اس رکعت کو شمار میں نہ رکھے اور باقی ماندہ رکعتوں کے حساب سے اپنی نماز مکمل کرے(۲)۔ نیز اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے۔ یہ حضرت جابرؓ کا مذہب ہے اور دیگر حضرات نے

۱۔ مؤطا امام مالکؒ: كتاب الصلاة، باب ما جاء في أم القرآن. ۱:۸۴،سنن بیہقی: كتاب الصلاة ،باب من قال لايقرأ خلف الإمام على الإطلاق۲:۵۳۱۔ اس حدیث کو امام طحاویؒ نے مرفوعاً بروایت: بحر بن نصر، قال ثنا يحيىٰ بن سلام، قال ثنا مالک، عن وهب بن كيسان عن جابر بن عبدالله عن النبي صلى الله عليه واله وسلم نقل کیا ہے جس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔ صرف یحییٰ بن سلام پر امام بیہقی، دارقطنیؒ اور دیگر بعض حضرات نے جرح کی ہے اور دیگر بعض حضرات نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ ابن حبان نے ان کو ثقات میں ذکر کر کے لکھا ہے کہ کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی تھی۔حافظ ابن عدیؒ فرماتے ہیں ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیث لکھی جا سکتی ہے۔ ابن ابی حاتم نے انہیں شیخ اور صدوق کہا ہے۔ اس سند کے ساتھ یہ حدیث ''حسن'' کے درجہ سے کسی طرح کم نہیں۔طحاوی: شرح معاني الآثار ، باب القراءة خلف الامام ۱:۲۱۸،ابن حبان:كتاب الثقات ۹:۲۶۱، لسان الميزان ۶:۲۵۹،الجرح والتعديل ۹:۱۵۵، ميزان الاعتدال ۴:۳۸۰۔ ابن قدامہ المقدسیؒ نے المغنی ، كتاب الصلاة مسئلہ ۱۸۳،ج۲:۲۶۳ میں بروایت خلال یہ حدیث حضرت جابرؓ سے مرفوعاً نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہی روایت حضرت جابرؓ سے موقوفاً بھی منقول ہے۔ جامع ترمذیؒ: كتاب الصلاة، باب ماجاء في ترك القراءة خلف الامام میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں اسلاف کی آراء کے ضمن میں امام احمد بن حنبلؒ کا نقطہ نظر یوں منقول ہے کہ صحابی رسول حضرت جابرؓ نے حضرت عبادہؓ والی حدیث ''لاصلاة الابفاتحة الكتاب'' (سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں) سے مراد منفرد کی نماز لی ہے نہ کہ مقتدی کی، اس لئے ہم بھی اس سے مراد یہی لیتے ہیں۔ اس کے بعد آپؒ نے اس حدیث کو حضرت جابرؓ سے موقوفاً نقل کر کے حسن صحیح کہا ہے۔تحفة الأحوذي ۲:۲۱۲۔ نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم نے بھی اس موقف کو صحیح اور اس حدیث کو مرفوع و موقوف دونوں طرح سے ثابت تسلیم کیا ہے۔ بحوالہ ہدایۃ السائل ص ۲۰۴۔اس طرح حضرت جابرؓ کی مذکورہ دونوں حدیثیں مرفوع اور مرسل دونوں طرح اسنادِ معتبرہ کے ساتھ منقول ہیں اور ائمہ حدیث و فقہ ان سے استدلال فرماتے آئے ہیں۔اگر اس حدیث کو صرف مرسل بھی مان لیا جائے تو ائمہ حدیث و فقہ کی بڑی تعداد مراسیل کو حجت مانتی ہے اور مراسیل صحابہ کے حجت ہونے پر تقریباً تمام علماء کرام متفق ہیں۔ احسن الکلام ص ۳۲۵-۳۲۸

۲۔ ابن القاسمؒ فرماتے ہیں: یہ امام مالکؒ کا پرانا قول ہے اور میں نے آخری ملاقات کے وقت جب یہ مسئلہ ان سے پوچھا تو انہوں نے فرمایا: میرے خیال میں جس شخص کی سورۂ فاتحہ کسی رکعت میں رہ گئی ہو،اگر وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کر لے تو کافی ہوگا مگر خود ان کا کہنا ہے کہ مجھے امام مالکؒ کی پہلی رائے زیادہ پسند ہے۔ ابن القاسمؒ نے یہ بات منفرد کی نماز کے متعلق فرمائی ہے، مقتدی کے امام کے پیچھے پڑھنے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔المدوّنة : كتاب لصلاة الأول، ماجاء في ترك القراءة في الصلاة ۱:۱۶۴

ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے(۱)۔

۱۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں :میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اسی حدیث پر عمل کرتا ہوں۔ یہ حدیث ابن القاسمؒ نے امام مالکؒ کی پرانی رائے کی دلیل کے طور پر ذکر کی ہے جس کے مطابق نمازی کی وہ رکعت شمار نہیں ہوتی جس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی گئی ہو اور حدیث کا آخری جملہ ''سوائے اس کے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا ہو'' اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہاں بحث منفرد کی نماز کی ہے مقتدی کی نہیں۔حوالہ بالا

حنابلہ میں سے امام ابن قدامہ المقدسی لکھتے ہیں کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی اسی حدیث کی بناء پر اکثر اہل علم زہریؒ، اسودؒ، ابراہیم (نخعیؒ)، سعید بن جبیرؒ، سفیان ثوریؒ، ابن عیینہؒ، امام مالکؒ، اصحاب رائے (فقہاء حنفیہؒ) اور اسحاق بن راہویہؒ وغیرہ سب حضرات یہی فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز بالکل مکمل ہے۔ اس حدیث کو حسن بن صالح نے لیبب بن ابی سلیم سے اور جابر سے، انہوں نے ابوالزبیر سے، انہوں نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ پانچ دیگر طرق سے بھی مروی ہے اور حضرت ابن عمرؓ، ابن عباسؓ، علیؓ، عمران بن حصینؓ اور ابوالدرداءؓ نے بھی اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ المغنی: کتاب الصلاۃ ،مسئلہ ۱۸۵: فان لم یفعل فصلاته تامة لأن من كان له إمام فقراء ة الامام له قراء ة. ۲:۲۶۸-۲۶۹

الغرض امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے یا نہ پڑھنے میں حضرات صحابہ کرامؓ سے لے کر آج تک اختلاف چلا آ رہا ہے ہر کوئی قرآن وحدیث سے اپنے انداز کے مطابق استدلال کرتا ہے جیسا کہ تمام کتب حدیث وفقہ میں مفصل موجود ہے۔ علامہ عینی نے لکھا ہے کہ اَسی (۸۰) سے زیادہ صحابہ کرام سے امام کے پیچھے قراء ت کو منع کرنا ثابت ہے، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، بیہقی، دارقطنیؒ، طحاوی وغیرہ نے دونوں آراء کے دلائل کے ساتھ ساتھ حضرات صحابہ وتابعین کے مواقف بھی ذکر کیے ہیں۔حضرات ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ اور حضرت علیؓ کے اقوال امام کے پیچھے قراء ت کرنے والے کے بارے میں بہت سخت ہیں۔ ابراہیم نخعیؒ سے منقول ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ کا رواج لوگوں نے مختار ثقفی کے پیچھے پڑھنے سے ڈالا کیوں کہ وہ اس کو اپنا امام بنانا پسند نہیں کرتے تھے۔

ان سب مباحث کے باوجود اس کے قائلین اور مخالفین ایک دوسرے کی نمازیں باطل ہونے کا فتویٰ نہیں دیتے جیسا کہ حضرات مالکیہ اور حنابلہ کی کتب میں وضاحت، موجود ہے۔ فاتحہ خلف الامام کے موضوع پر مستقل کتب بھی تصنیف کی گئی ہیں اور بعض بڑی کتابوں میں اس پر مفصل مباحث بھی موجود ہیں جن کے مطالعہ سے علمی طور پر مسئلہ کی وضاحت ہوسکتی ہے چند کتابوں کے نام یہ ہیں:

شرح معانی الآثار، كتاب الصلاة، باب القراء ة خلف الامام ۱:۲۱۵، بدرالدین عینیؒ:عمدة القاری شرح صحیح البخاری، كتاب الصلاة، باب وجوب القراء ة للامام والماموم ۶:۱۳، مصنف عبدالرزاقؒ :كتاب الصلاة، باب القراء ة ۲:۱۳۶-۱۴۱، مصنف ابن ابی شیبہؒ: كتاب الصلاة، من كره القراء ة خلف الامام ۱:۴۱۲-۴۱۴، ابن قدامہ المقدسی الحنبلیؒ: المغنی، كتاب الصلاة، مسئلہ ۱۸۵: فان لم یفعل فصلاته تامة، لأن من كان له إمام فقراء ة الامام له قراء ة ۲:۲۶۸، نواب صدیق حسن خانؒ :هداية السائل، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ: توثيق الكلام فی القراء ة خلف الامام ،مولانا رشید احمد گنگوہیؒ: هداية المعتدي في قراء ة المقتدي، مولانا سرفراز خان صفدر: أحسن الكلام في ترك القراء ة خلف الامام، مولانا فقیر اللہ: خاتمة الكلام في ترك القراء ة خلف الامام.

گیارہویں بحث: نماز میں فاتحہ کے متعلق امام مالکؒ کی راجح رائے

شیخ ابن العربیؒ ارشاد نبوی:

[۲۱۶] لا صلاۃ لِمَنْ لم یَقْرأ بفاتحۃِ الکتابِ (جس نے فاتحۃ الکتاب نہ پڑھی، اس کی نماز نہیں ہوئی)

کے متعلق کہتے ہیں: اس حدیث کے معنی کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز میں درجہ کمال کی نفی ہے یا یہ ہے کہ جو فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ہوتی ہی نہیں؟ علماء کے مختلف نقطہ ہائے نظر کی وجہ سے ان کے فتاوی میں بھی اختلاف رونما ہوا اور چوں کہ اس حدیث کا زیادہ مشہور اور مضبوط مفہوم یہ ہے کہ یہ نفی عام ہے اس لئے امام مالکؒ کا بھی وہی قول زیادہ قوی شمار ہوگا کہ جس نے سورۂ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز باطل ہوگئی[۱]۔ پھر ہر رکعت میں اس کے تکرار پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ارشاد نبوی:

[۲۱۷] اِفْعَل ذٰلِکَ فِیْ صَلاتِکَ کُلِّھا (اپنی پوری نماز میں یہی کچھ کیا کرو)

کی بنا پر لازم ہوا کہ جس طرح رکوع یا سجدہ رہ جائے تو اس کا اعادہ کرنا پڑتا ہے اسی طرح قراء ت رہ جانے سے اس کا بھی اعادہ کرنا ہوگا[۲]۔ واللہ اعلم۔

بارہویں بحث: سورۂ فاتحہ کی تخصیص کے بارے میں فقہاءِ کوفہ کے نقطۂ نظر کا تجزیہ

نماز کی قراء ت میں سورۂ فاتحہ تخصیص کے ساتھ فرض ہونے کے بارے میں جو احادیث اور دلائل ہم نے بیان کیے ہیں، ان سے فقہاءِ کوفہ کی رائے کی تردید ہوتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قراء ت میں سورۂ فاتحہ کی تخصیص فرض نہیں، فاتحہ پڑھیں یا کسی اور مقام سے قرآن مجید کی تلاوت کریں سب برابر ہیں۔ حالاں کہ نبی کریم

[۲۱۶] صحیح بخاری: کتاب صفۃ الصلاۃ، باب وجوب القراءۃ للإمام والمأموم۔ عمدۃ القاری ۶:۱۰، صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ. مع شرح الأبی والسنوسی ۲:۲۶۰

[۲۱۷] یہ حدیث المسیء فی الصلاۃ (یعنی نماز میں غلطی کرنے والے کی حدیث) کے عنوان سے مشہور ہے۔ صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ...... مع شرح الأبی والسنوسی ۲:۲۶۹

۱۔ اس مسئلہ کی تفصیل امام ابن القاسمؒ کے ذکر کے ساتھ المدوّنہ کے حوالہ سے دسویں بحث میں گزر چکی ہے۔

۲۔ اس حدیث میں صرف قراء ت کا ذکر ہے،سورۂ فاتحہ کا ذکر نہیں۔ اکیلے نمازی اور امام کے لئے صرف پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ واجب ہے جو دوسری احادیث سے ثابت ہے۔ تیسری اور چوتھی رکعتوں میں واجب نہیں۔ تفصیل چودھویں بحث میں آ رہی ہے۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد کے ذریعے سورۂ فاتحہ کی تخصیص کر دی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾[البقرۃ۲: ۱۱۰] کی تفسیر بھی یہی ہے۔ امام ابوداؤدؒ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں:

[۲۱۸] أُمِرْنا أَنْ نَقْرأ بفاتحةِ الكِتابِ وما تَيَسَّر.

ہمیں حکم دیا گیا کہ فاتحۃ الکتاب اور اس کے ساتھ قرآن مجید کا جتنا حصہ آسانی سے پڑھ سکیں پڑھیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ دیہات سے آنے والے شخص کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:

[۲۱۹] إقرأ مَاتيسَّرَ مَعَكَ مِنَ القرآنِ (قرآن مجید میں سے جتنا آسانی سے پڑھ سکو پڑھو)

کا مطلب یہ ہے کہ فاتحہ کے علاوہ جتنا پڑھ سکو پڑھ لو اور یہی ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَاقْرَءُ وْا مَا تَیَسَّرَ مِنْهُ﴾[المزمل۷۳: ۲۰] (اس میں سے جتنا پڑھ سکو پڑھو) کی تفسیر ہے۔ امام مسلمؒ نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۲۰] لاصَلاةَ لِمَن لَمْ يَقرأ بِأُمِّ القرآنِ۔

جس نے امّ القرآن نہ پڑھی اس کی کوئی نماز نہیں۔ایک روایت میں "فصَاعدًا" کے الفاظ زیادہ ہیں (یعنی فاتحہ اور کچھ مزید)۔ اورآپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "هِيَ خِداجٌ" (یعنی وہ نماز مکمل نہیں ہوئی) بھی تین مرتبہ فرمایا۔

مطلب یہ کہ مذکورہ دلائل کی روشنی میں وہ نماز ادا نہیں ہوئی۔ "خِدَاج" کا معنی نقص اور خرابی ہے۔ اخفش کہتے ہیں: خَدَجَتِ النَّاقَةُ اس وقت کہتے ہیں جب اونٹنی نامکمل بچہ دے اور أخدجَتْ اس وقت کہتے ہیں جب وہ وقت ولادت سے پہلے بچہ جنے، خواہ بچہ مکمل ہی ہو[1]۔ اس طرح واضح ہوگیا کہ نقص والی نماز نہیں

[۲۱۸] سنن ابوداؤد: کتاب الصلاة، باب من ترک القراءة فی صلاة. بذل المجهود ۵:۳۴

[۲۱۹] صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة...... مع شرح الأبی والسنوی ۲:۲۶۹

[۲۲۰] صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة مع شرح الأبي والسنوسي ۲:۲۶۲۔

۱۔ لسان العرب (خدج)

ہوتی کیوں کہ وہ مکمل ادا ہی نہیں ہوتی۔ جو شخص اپنی نماز مکمل کرنے سے پہلے ابن سے فارغ ہو بیٹھتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ صحیح طریقے کے مطابق اسے دوبارہ پڑھے جیسا کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا۔ جو شخص نماز میں نقص کے اعتراف کے باوجود یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی نماز ادا ہو گئی، اسے چاہیے کہ دلیل پیش کرے اور اس دعویٰ کے ثبوت کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں[1]۔ واللہ اعلم۔

تیرہویں بحث: نماز میں قراءت کے عدمِ وجوب کے قائلین کی رائے کا تجزیہ

امام مالکؒ سے ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ نماز میں سرے سے قراءت واجب ہی نہیں۔ اسی طرح امام شافعیؒ جب تک عراق میں رہے ان کا قول یہ تھا کہ جو شخص نماز میں قراءت کرنا بھول جائے اس کی نماز ہو جاتی ہے۔ جب آپؒ مصر تشریف لے گئے تو اس سے رجوع کرلیا اور فرمایا کہ جو شخص سورۂ فاتحہ اچھی طرح پڑھ سکتا ہے اس کی نماز نہ صرف یہ کہ اس کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک حرف بھی کم کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی فاتحہ نہ پڑھے یا اس کا کوئی بھی حرف چھوڑ دے تو اپنی نماز دوبارہ پڑھے اگرچہ اس نے کوئی اور سورت پڑھ بھی لی ہو اور ۲۱، مسئلہ میں یہی بات درست ہے[2]۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے جو نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے نمازِ مغرب

۱۔ حضرات مالکیہ سورۂ فاتحہ کو نماز کا رکن اور فرض قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فرض اور واجب ایک ہی چیز ہے۔ احناف کے نزدیک فرض اور واجب میں دقیق فرق ہے۔ ان کے نزدیک فرض یا تو قرآن مجید سے ثابت ہو سکتا ہے یا حدیث متواتر سے یا اجماع سے جب کہ واجب خبر واحد سے بھی ثابت ہو جاتا ہے جیسا کہ نماز میں قراءت کی فرضیت ارشاد باری تعالیٰ ﴿فَاقْرَءُ وامَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ (جتنا آسانی سے پڑھ سکو پڑھو) اور ﴿فَاقْرَءُ وامَاتَيَسَّرَ مِنْهُ﴾ اور دیگر آیات سے ثابت ہوتی ہے۔ اس کی تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں غلطی کرنے والے نمازی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قراءت بتلائی اور سورۂ فاتحہ کی تخصیص نہیں فرمائی، جب کہ سورۂ فاتحہ کی تخصیص کے بارے میں جو احادیث آئی ہیں وہ اپنی جگہ نہایت اہم ہونے کے باوجود اس نص قطعی کے درجہ کی نہیں۔ اس طرح احناف کے ہاں اکیلے نمازی اور امام کے لیے نماز میں صرف قراءت رکن اور فرض ہے۔ قراءت اگر جان بوجھ کر چھوڑ دی جائے یا بھولے سے رہ جائے تو دونوں صورتوں میں نماز صحیح نہیں ہو گی اور اس کی جگہ سجدہ سہو بھی کام نہیں دے سکتا۔ ان کے اس اصول کی رو سے سورۂ فاتحہ واجب ہے۔ اس کا حکم یہ ہے اگر اسے جان بوجھ کر چھوڑ دیا گیا تو نماز نہیں ہو گی اور اگر وہ بھولے سے رہ گئی تو سجدہ سہو اس کی جگہ کام دے جائے گا۔ امام مالکؒ کے نزدیک سورۂ فاتحہ اور کچھ مزید پڑھنا دونوں نماز کا رکن ہیں اس کے باوجود ان کے آخری قول کے مطابق اگر سورۂ فاتحہ بھولے سے رہ جائے تو سجدہ سہو کر لینے سے نماز ہو جائے گی۔ اس طرح دونوں آراء کا نتیجہ ایک ہی ہے اور اس میں کوئی وجہ نزاع نہیں۔ المدوّنة الكبرى: كتاب الصلاة الأول، باب ماجاء في ترك القراءة ۱۲۴:۱، أوجز المسالك: كتاب الصلاة، باب ماجاء في أمّ القرآن ۹۱:۲

۲۔ قراءت نماز کا رکن ہے اور کسی امام کا اس میں اختلاف نہیں۔ یہ نص قرآنی سے ثابت ہے اور حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے البتہ بعض حضرات تخصیص کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی رکنیت کے قائل ہیں۔ امام شافعیؒ سے مشہور قول میں یہی منقول ہے مگر انہوں نے کتاب الأم میں یہ فرضیت و رکنیت اکیلے نمازی اور امام کے ساتھ خاص فرمائی ہے اور مقتدی کی قراءت کے بارے میں فرمایا ہے کہ میں اس کا ذکر آئندہ کروں گا۔ الأم: باب القراءة بعد التعوّذ ۱۲۹:۱

پڑھی اور اس میں قراء ت ہی نہیں کی اور جب ان کو یاد دلایا گیا تو پوچھا: میرے رکوع اور سجدے کیسے تھے؟ عرض کیا گیا: وہ تو اچھے تھے۔ آپ نے فرمایا: پھر کوئی بات نہیں[1]۔ اس روایت کا متن غیر معروف اور سند منقطع ہے کیوں کہ اسے ابراہیم بن حارث تیمی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ دوسری سند میں یہی ابراہیم اسے ابوسلمہ بن عبد الرحمٰن سے اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ دونوں اسناد منقطع ہیں اور ان میں کوئی حجت نہیں۔ امام مالکؒ نے بھی مؤطا میں یہ روایت نقل کی ہے۔ لیکن یہ بعض لوگوں کا وہم ہے۔ یحییٰ[2] اور ان کے دیگر ساتھی اس کے قائل نہیں کیوں کہ بعد میں امام مالکؒ نے اپنی کتاب سے اسے نکال دیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس حدیث پر کسی کا عمل نہیں[3] کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۲۲۱] كلّ صَلاةٍ لايُقرأ فِيهَا بأمِّ القُرآن فَهي خِدَاجٌ

جس نماز میں امّ القرآن نہیں پڑھی گئی وہ ناقص ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی ایک روایت منقول ہے کہ انہوں نے وہ نماز دوبارہ پڑھی تھی اور یہی روایت صحیح ہے۔ یحییٰ بن یحییٰ نیشا پوری نے ابو معاویہ سے، انہوں نے اعمش سے، انہوں نے ابراہیم سے اور انہوں نے ہمام بن حارث سے روایت کیا ہے:

[۲۲۲] کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مغرب کی نماز میں قراء ت بھول گئے تو وہ نماز دوبارہ پڑھائی۔

حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں: یہ حدیث متصل ہے۔ ہمامؒ نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ عمل دیکھا ہے اور یہ بات کئی طرق سے روایت کی گئی ہے۔

---

[۲۲۱] صحیح مسلم: کتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة فی کل رکعة...۔ شرح الأبی والسنوسی ۲:۲۶۲

[۲۲۲] مصنف عبد الرزاق: کتاب الصلاة، باب من نسِیَ القراءة ۲:۱۲۳-۱۲۵۔ یہاں بھی مطلق قراء ت کا ذکر ہے سورۂ فاتحہ کی تخصیص نہیں۔ عکرمہ بن خالد، زیاد بن عیاض الأشعری، شعبی اور قتادہ سب نے الگ الگ طرق سے یہ روایت نقل کی ہے جس میں عشاء کی نماز کا ذکر ہے۔

۱۔ یہ حدیث امام عبد الرزاقؒ نے حضرت أبوسلمہ بن عبد الرحمٰن کی روایت سے نقل کی ہے مگر اس میں نماز مغرب کی تخصیص نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دوسری روایات میں ثابت ہے کہ وہ قراء ت بھول گئے تو نماز دوبارہ پڑھائی۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز میں قراء تِ چھوڑ دے تو میری رائے یہ ہے کہ وہ نماز دوبارہ پڑھے خواہ وقت گزر ہی چکا ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا قول پر کسی کا عمل نہیں۔ المدونة الکبریٰ: کتاب الصلاة الأول، ماجاء فی ترک القراءة فی الصلاة ۱:۱۶۳، مصنف عبد الرزاق: کتاب الصلاة، باب لاصلاة إلاّ بقراءة، ۲:۱۲۲ باب من نسِيَ القراءة ۱۲۳

۲۔ أبوسعید یحییٰ بن سعید بن قیس المدنی القاضی الأنصاری (م ۱۴۴ھ) حضرت امام مالکؒ کے قریبی شاگردوں میں سے تھے، وہ بڑے محدّث، ثقہ اور عبادت گزار تھے۔ تهذيب التهذيب ۱۱:۲۲۱

۳۔ المدوّنة الکبریٰ: کتاب الصلاة، باب ماجاء فی ترک القراءة فی الصلاة ۱:۱۶۴

اشہبؒ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ سے اس شخص کے بارے میں پوچھا گیا جو نماز میں قراء ت بھول جائے اور کہا گیا کہ کیا آپ اس مسئلہ میں حضرت عمرؓ کے قول سے متفق ہیں تو آپؒ نے اس روایت سے انکار کیا اور فرمایا: میں نہیں مانتا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا ہوگا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ لوگوں کی موجودگی میں ان سے قراء ت رہ گئی ہو اور انہوں نے سبحان اللہ وغیرہ کہہ کر انہیں یاد نہ دلایا ہو؟۔ میری رائے یہ ہے کہ جس نے نماز میں قراء ت نہیں کی وہ اپنی نماز لوٹائے۔(۱)

چودھویں بحث: پہلی اور آخری رکعات کی قراء ت میں فرق

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ قراء ت کے بغیر نماز ادا نہیں ہوتی۔ اس بارے میں ان کے دلائل ذکر کئے جا چکے ہیں۔ اس پر بھی اجماع ہے کہ سورۂ فاتحہ کی قراء ت کے بعد وقفہ نہیں ہے البتہ فاتحہ کے ساتھ سورت ملانا مستحب ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ اکثر ایسا کرتے تھے(۲)۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: قراء ت میں سنت یہ ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں امّ القرآن اور کوئی سورت پڑھی جائے اور آخری دو رکعتوں میں فاتحہ پڑھی جائے۔ امام اوزاعیؒ کہتے ہیں کہ آخری دو رکعتوں میں امّ القرآن پڑھے اور اگر امّ القرآن کی بجائے کچھ اور پڑھ لیا تو بھی جائز ہے۔البتہ اگر تین رکعتوں میں پڑھنا بھول گیا تو نماز دوبارہ پڑھے۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کہ پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ اور کوئی دوسری سورت پڑھے اور آخری دو رکعتوں میں اگر چاہے تو تسبیح پڑھ لے، چاہے تو قراء ت کرے اور اگر نہ قراء ت کی نہ تسبیح تو بھی نماز ادا ہو جائے گی۔ یہی امام ابوحنیفہؒ اور

۱۔ وکیعؒ اعمش سے اور وہ خیثمہ سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مجھے اس شخص نے بتایا جس نے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا کہ اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور نہ پڑھے۔ اسی طرح وکیع نے عیسیٰ بن یونس سے، انہوں نے ابو اسحاق سے اور انہوں نے شعبی سے روایت کیا ہے: وہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے مغرب کی نماز پڑھائی تو اس میں قراء ت نہ کی، پھر اس نماز کو دوبارہ پڑھایا اور فرمایا: قراء ت کے بغیر کوئی نماز نہیں ہوتی۔ **المدوّنۃ الکبری: کتاب الصلاۃ الاول. ماجاء فی ترک القراء ۃ فی الصلاۃ، ۱/۱۶۵**۔ ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ قراء ت نماز کا رکن ہے اور اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ اسی طرح یہ بھی کہ قراء ت سے مراد صرف قراء ت ہے جو سورۂ فاتحہ بھی ہو سکتی ہے اور کچھ اور بھی۔

۲۔ فرض نمازوں کی پہلی دو رکعات اور نوافل کی تمام رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورت یا کم از کم ایک بڑی آیت پڑھنا احناف کے نزدیک واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قولی اور فعلی احادیث جس کثرت اور تسلسل سے منقول ہیں وہ اس کے واجب ہونے پر کافی دلیل ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے عمل سے اس کی مزید تائید ہو جاتی ہے۔ قراء ت کے سلسلہ میں قرآنی آیات اور احادیث طیبہ میں تطبیق کی بھی یہی صورت ہے۔صحیح بخاری: **کتاب صفۃ الصلاۃ، باب القراء ۃ فی الظھر، باب القراء ۃ فی العصر**۔عمدۃ القاری ۲:۴-۱۰، ۶:۲۰، ۶:۲۲، ابو داؤد: **باب ماجاء فی القراء ۃ فی الظھر، بذل المجھود ۵:۱۲**، **اوجز المسالک ۲:۹۱**،مرغینانی:**الھدایۃ، کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ، فصل فی القراء ۃ ۱:۱۰۵**

تمام فقہاء کوفہ کا قول ہے[۱]۔ ابن منذر کہتے ہیں: ہمیں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے روایت پہنچی ہے کہ انہوں نے فرمایا: پہلی دو رکعتوں میں قراءت کرو اور آخری دو میں تسبیح[۲]۔ نخعیؒ کی رائے بھی یہی ہے[۳]۔ سفیانؒ کہتے ہیں کہ اگر تین رکعتوں میں قراءت نہیں کی تو نماز لوٹائے کیوں کہ صرف ایک رکعت کی قراءت کافی نہیں۔ اسی طرح اگر نماز فجر کی ایک رکعت میں قراءت کرنا بھول گیا تو نماز لوٹائے۔ ابوثورؒ کہتے ہیں کہ کسی بھی رکعت میں سورۂ فاتحہ کی قراءت رہ گئی تو نماز نہیں ہوگی۔ یہی بات امام شافعیؒ نے مصر میں فرمائی اور اس پر تمام شوافع کا عمل ہے۔ ابن خویز منداد مالکیؒ کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک ہر رکعت میں فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور اس مسئلہ میں یہی رائے صحیح ہے[۴]۔

۱۔ یہ قول فرض نمازوں کے بارے میں ہے کیوں کہ نوافل کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی قراءت اور مزید کچھ پڑھنا واجب ہے۔ نوافل میں اصل دو رکعتیں ہیں۔ دوسری دو رکعتیں الگ دو رکعات کی طرح ہیں اور تیسری رکعت کے لئے اٹھانئے سرے سے تکبیر تحریمہ کہنے کے قائم مقام ہے۔ فرائض کی آخری دو رکعات میں سورۂ فاتحہ پڑھنا بہتر ہے اگر نہ بھی پڑھی جائے اور صرف تسبیح وغیرہ کرلی جائے تو بھی جائز ہے۔ اگران میں نمازی صرف خاموش رہے تو بھی جائز ہے جیسا کہ حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے منقول ہے مگران رکعتوں میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ محمد بن حسن الشیبانیؒ: المبسوط، کتاب الصلاۃ، باب ماجاء في القیام في الفریضۃ ۱:۱۶۳، کتاب الحجۃ علی أھل المدینۃ، کتاب الصلاۃ، باب القراءۃ في الصلاۃ ۱:۱۰۶

۲۔ یہ روایت ابواسحاق نے حضرت علیؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے اور دیگر طرق کے مطابق ابواسحاق نے حارث سے اور انہوں نے سیدنا علیؓ سے نقل کی ہے۔ مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الصلاۃ، من کان یقول یُسَبِّحُ في الأخریین ولایقرأ ۱:۴۰۸-۴۰۹۔ محمد بن حسنؒ: کتاب الحجۃ ، کتاب الصلاۃ، باب القراءۃ في الصلاۃ ۱:۱۰۷۔ آخری دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ بھی ثابت ہے، صرف تسبیح و تحمید بھی اور سورۂ فاتحہ کے ساتھ کچھ اور آیات یا کوئی سورت ملانا بھی اور اسی طرح سورۂ فاتحہ پڑھ کر مسنون دعائیں پڑھنا بھی ۔ سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب من قال یقتصر في الأخریین علی فاتحۃ الکتاب، و باب من استحب قراءۃ السورۃ بعد الفاتحۃ في الأخریین ۲:۳۶۹-۳۷۲، امام طحاویؒ: شرح معاني الآثار، کتاب الصلاۃ، باب القراءۃ في الظھر والعصر، ۱:۲۰۶-۲۱۰، مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ، باب کیف القراءۃ ۲:۱۰۰-۱۰۱ (علیؓ وعلقمہؒ و ابراہیمؒ)

۳۔ مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الصلاۃ،باب من کان یقول یسبح في الأخریین ولا یقرأ ۱:۴۰۹

۴۔ یہاں شاید علامہ قرطبیؒ نے اپنا نقطہ نظر بیان فرمایا ہے۔ امام مالکؒ ہر رکعت میں فاتحہ کے ساتھ کوئی سورت پڑھنے کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ المدونۃ الکبریٰ ۱:۱۶۵۔ امام شافعیؒ نے بھی امام مالکؒ سے ایک روایت نقل کی ہے جسے بیہقیؒ نے بھی ابوعبداللہ الصنابحی سے نقل کیا ہے،فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مدینہ منورہ میں مغرب کی نماز پڑھائی تو پہلی دونوں رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور قصار سور میں سے ایک پڑھی۔ جب آپؓ تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہوئے تو میں آپؓ کے نہایت قریب ہوگیا حتیٰ کہ میرے کپڑے آپؓ کے کپڑوں کے ساتھ لگنے لگے تو میں نے سنا کہ انہوں نے تیسری رکعت میں سورۂ فاتحہ اور ﴿رَبَّنَا لَاتُزِغْ قُلُوْبَنَا......الخ﴾ پڑھی ۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں: ابوسعید کی روایت کے مطابق امام شافعیؒ نے سفیان بن عیینہؒ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب یہ سنا تو فرمانے لگے: اس سے پہلے تو میرا عمل کچھ اور تھا مگر جب سے میں نے یہ روایت سنی ہے اسی پر عمل شروع کر دیا ہے۔ سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ: باب من استحب قراءۃ السورۃ بعد الفاتحۃ في الأخریین ۲:۳۷۱-۳۷۲۔ معلوم ہوا کہ آخری رکعتوں میں صرف سورۂ فاتحہ کی قید صحیح نہیں بلکہ ان میں تمام مذکورہ صورتیں جائز ہیں ۔

امام مسلم نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ [1] سے نقل کیا ہے کہ:

[۲۲۳] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں نماز پڑھایا کرتے تھے تو ظہر و عصر کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ اور دو سورتیں تلاوت فرماتے اور کبھی کبھار ہم کوئی آیت سن بھی لیتے تھے۔ آپ ظہر کی پہلی رکعت طویل پڑھتے تھے اور دوسری مختصر۔ نماز فجر میں بھی آپ کا عمل مبارک یہی تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری دو رکعتوں میں بھی سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے۔

یہ واضح نص اور صحیح حدیث ہے جس کے مطابق امام مالکؒ کا قول ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کی قراءت کی تخصیص ہے۔ اس میں ان لوگوں کے خلاف دلیل بھی ہے جو اس کا انکار کرتے ہیں کیوں کہ دلیل سنت سے ہوا کرتی ہے نہ کہ خلاف سنت قول سے [2]۔

پندرہویں بحث: فاتحہ کے علاوہ مزید قراءت کا حکم

جمہور کا مسلک یہ ہے کہ فاتحہ سے زائد قراءت نماز میں واجب نہیں جیسا کہ

[۲۲۴] امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ہر نماز میں قراءت ہے۔ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سنایا وہی ہم نے تمہیں سنا دیا اور جو کچھ ہم سے خفیہ رکھا وہی ہم نے تم سے خفیہ رکھا۔ جس نے امّ القرآن پڑھ لی اس کی نماز ہوگئی اور جس نے زائد پڑھا تو یہ افضل ہے۔

[۲۲۵] صحیح بخاری میں ہے کہ اگر تو نے زائد پڑھا تو یہ بہتر ہے۔

---

[۲۲۳] صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب القراءة في الظهر والعصر. مع شرح الأبي والسنوسي ۲:۳۳۵-۳۳۷

[۲۲۴] صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة، شرح الابي والسنوسي ۲/۲۶۷-۲۶۸

[۲۲۵] صحیح بخاری: كتاب الاذان، باب القراءة في الفجر. عمدة القاری ۶:۳۲

۱۔ حضرت ابوقتادہ بن ربعی الانصاری الخزرجی السلمی (م۵۴ھ) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شاہسوار مشہور تھے، ان کے اسم گرامی میں اختلاف ہے مگر زیادہ مشہور حارث بن ربعی ہے۔ تهذيب التهذيب ۱۲:۲۰۴۔ کنیت ۶۴۳۶، الإصابة ۴:۱۵۸، ۹۲۱

۲۔ امام مالکؒ کا قول صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کا نہیں اس کے ساتھ اور سورت ملانے کا بھی ہے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل مبارک سے وجوب ثابت ہو رہا ہے تو اس میں فاتحہ کی روایات بھی ہیں، اس کے ساتھ سورت ملانے کی بھی اور صرف تسبیح وتحمید کی بھی جیسا کہ گزر چکا ہے۔ مزید تفصیل الهداية، كتاب الصلاة، باب النوافل، فصل في القراءة ۱:۱۳۰-۱۳۱ میں موجود ہے

حضرت عمران بن حصینؓ ،ابو سعید خدریؓ خوات بن جبیرؓ، مجاہدؒ، ابووائلؒ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ وغیرہ بہت سے اہل علم مجبوری یا عدم مجبوری کسی حال میں بھی فاتحہ کے ساتھ سورت نہ ملانے کوقابل قبول نہیں سمجھتے۔وہ کہتے ہیں:

[۲۲۶] لا صلَاۃَ لِمَن لَمْ یقْرأ فِیھَا بفاتحۃِ الکتابِ و شَیی ءِ معھا مِنَ القُرآن.

اس شخص کی نماز ادا نہیں ہوئی جس نے اس میں فاتحۃ الکتاب اور قرآن کا کچھ حصہ نہ پڑھا۔

ان میں سے بعض حضرات نے کم از کم دو آیتوں کی حد مقرر کی ہے، بعض نے ایک آیت کی اور بعض نے کوئی حد مقرر نہیں کی، صرف یہ فرمایا کہ فاتحہ کے ساتھ قرآن کا کچھ حصہ پڑھنا ضروری ہے[1]۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فاتحہ کے علاوہ قرآن کا کچھ اور حصہ بھی سیکھنا ضروری ہے۔ جیسا کہ حضرت عبادہؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایات سے بھی ثابت ہے[2]۔''المدونہ'' میں وکیعؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے اعمش سے اور انہوں نے خیثمہ[3] سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ میں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو یہ فرماتے سنا: ''لاتُجزیٔ صلاۃ منْ لَمْ یُقرأ فِیھا بفاتحۃِ الکتاب و شییء معھا''[4] (اس شخص کی نماز ادا نہیں ہوئی جس نے فاتحہ کے ساتھ قرآن کا کچھ حصہ نہ پڑھا)۔اس طرح فاتحہ کے ساتھ سورت کی قراء ت میں تین اقوال ہیں: کسی نے اسے سنت کہا ہے، کسی نے مستحب اور کسی نے واجب قرار دیا ہے[5]۔

---

[۲۲۶] یہ مرفوع حدیث ہے ۔سنن ابو داؤد: باب من ترک القراء ۃ فی صلاتہ، بروایت حضرت ابو سعید خدریؓ و حضرت ابوہریرہؓ ۔ بذل المجھود ۵:۳۳-۳۶، سنن نسائی: کتاب افتتاح الصلاۃ، باب إیجاب قراء ۃ فاتحۃ الکتاب فی الصلاۃ، بروایت حضرت عبادہ بن الصامتؓ ۱:۳۱۷، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب القراء ۃ بعدأمّ القرآن، بروایت حضرت ابوہریرہؓ ۲:۳۶۳، مصنف عبدالرزاق: باب قراء ۃ أم القرآن بروایت حضرت عبادہ بن صامتؓ و ابن عمرؓ ۲:۹۳-۹۴،مصنف ابن ابی شیبہ: کتاب الصلاۃ، باب من کان یقرأ فی الأولیین بفاتحۃ الکتاب و سورۃ و فی الأخریین بفاتحہ الکتاب بروایت حضرت جابرؓ ۱:۴۰۷، صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراء ۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ...... بروایت حضرت عبادہ بن الصامتؓ ۲:۲۶۲

۱۔ جصاص:احکام القرآن ۱:۱۸ سورۂ فاتحہ

۲۔ احادیث کی تخریج گزر چکی ہے۔

۳۔ خیثمہ بن عبدالرحمٰن بن ابی سبرہ یزید بن مالک الجعفی الکوفی (م۸۰ھ) کے والد اور دادا دونوں صحابی تھے۔ یہ خود سخی اور نیک آدمی تھے۔ ابن معین، نسائی اور عجلی نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تھذیب التھذیب ۳:۱۷۸

۴۔ المدوَّنۃ الکبری: کتاب الصلاۃ الأول، ماجاء فی ترک القراء ۃ فی الصلاۃ ۱:۱۶۵

۵۔ فقہاءِ حنفیہ مندرجہ بالا احادیث کی روشنی میں اسے واجب قرار دیتے ہیں۔الھدایۃ : کتاب الصلاۃ، باب صفۃ الصلاۃ، فصل فی القراء ۃ ۱:۱۰۶۔ امام مالکؒ بھی یہی فرماتے ہیں کہ جس شخص نے پہلی دو رکعتوں میں سے کسی میں سورۂ فاتحہ تو پڑھ لی مگر سورت ملانا بھول گیا تو سجدہ سہو کرے۔ المدونۃ الکبری: کتاب الصلاۃ الأول، ما جاء فی ترک القراء ۃ فی الصلاۃ ۱:۱۶۴

سولہویں بحث: جو قرآن پڑھنا نہ جانتا ہو اس کی قراءت

اگر کوئی شخص سورۂ فاتحہ یا قرآن مجید کا کچھ حصہ بھرپور کوشش کے باوجود نہ سیکھ سکا یا اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے ذہن میں نہ بیٹھ سکی تو وہ قراءت کے مقام پر جیسے ہو سکے اللہ کا ذکر کرے: اللہ اکبر کہے، لا إلٰہ إلا اللہ کہے، الحمد للہ کہے، سُبحانَ اللہ کہے، سبحان اللہ والحمدللہ ولاإلٰہ إلااللہ پڑھے یا لاحول ولا قوۃ إلا باللہ پڑھتا رہے۔ خواہ وہ اکیلا نماز پڑھ رہا ہو یا امام کے پیچھے آہستہ قراءت والی نماز ہو۔ امام ابوداؤدؒ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن ابی اوفی رضی اللہ عنہ[1] سے روایت نقل کی ہے کہ ایک آدمی نبی کے پاس آیا اور عرض کیا: میں قرآن میں سے کچھ حفظ نہیں کر سکا، اس کی جگہ مجھے کچھ اور سکھا دیجئے جس سے کام چل سکے تو آپ نے ارشاد فرمایا: کہو:

[۲۲۷] سُبۡحَانَ اللّٰہِ وَالۡحَمۡدُلِلّٰہِ وَلَاۤإِلٰہَ إِلَّااللّٰہُ وَاللّٰہُ أَکۡبَرُولَاحَوۡلَ وَلَاقُوَّۃَ إِلَّابِاللّٰہِ۔قال یارسول اللّٰہ! ھذاللّٰہ فمالي؟ قال: قُلِ اللّٰھُمَّ ارۡحَمۡنِي وَعَافِنِي وَاھۡدِنِي وَارۡزُقۡنِي۔

اللہ کی ذات پاک ہے، سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ کی توفیق کے بغیر نہ کوئی کام کرنے کی ہمت ہے نہ کسی چیز سے بچنے کی طاقت۔ اس نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ تو اللہ کے لئے ہے، میرے لئے کیا ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہو: اے اللہ مجھ پر رحم فرما، مجھے معاف کر دے، مجھے ہدایت دے اور رزق دے۔

سترہویں بحث: ذکر یا دعا بھی یاد نہ ہو تو نمازی کیا کرے؟

اگر کوئی شخص دعا کے مذکورہ الفاظ بھی یاد کرنے سے قاصر رہے تو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا اہتمام کرتا رہے۔ اِن شاء اللہ امام اس کا یہ بوجھ اٹھاتا رہے گا۔ لیکن اس پر ہمیشہ لازم رہے گا کہ سورۂ فاتحہ اور قرآن کا کچھ حصہ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اگر سیکھنے کی کوشش کرتے کرتے موت آ گئی تو اللہ کے ہاں اس کا عذر قبول ہوگا۔

---

[۲۲۷] سنن ابوداؤد: کتاب الصلاۃ، باب مایجزیٔ الأمّی والأعجمی من القراءۃ. بذل المجھود ۵:۷۵

۱۔ ابومعاویہ حضرت عبداللہ بن ابی اوفی علقمہ بن خالد الاسلمی (م۸۷ھ)۔ بیعت رضوان، خیبر اور متعدد غزوات میں شامل ہوئے۔ آپؓ کوفہ میں وفات پانے والے سب سے آخری صحابی تھے۔ تھذیب التھذیب ۵:۱۵۱، الاصابۃ ۲:۲۷۹

اٹھارہویں بحث: مجبوری ہو تو غیر عربی زبان میں ذکر و دعاء کا حکم

غیر عربی ہونے یا کسی اور وجہ سے اگر کوئی شخص عربی زبان کے الفاظ کہنے پر قادر نہ ہوسکے تو اس کے لئے دعاء کا ترجمہ اس کی اپنی زبان میں کر دیا جائے جسے وہ سمجھتا ہے تا کہ نماز پڑھ سکے۔ اس سے بھی ان شاء اللہ اس کا کام چل جائے گا۔

انیسویں بحث: بلاعذر غیر عربی زبان میں قراءت

جمہور کے نزدیک عربی میں پڑھ سکنے کے باوجود فارسی ترجمہ سے نماز ادا نہیں ہوگی۔ امام ابوحنیفہؒ بلاعذر بھی فارسی ترجمہ کے ساتھ نماز کے جواز کے قائل ہیں کیوں کہ مقصود تو اصل معنی کی ادائیگی ہے۔ ابن منذر کہتے ہیں: ایسے شخص کی نماز نہیں ہوگی کیوں کہ یہ چیز اللہ تعالیٰ کے حکم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور جمہور کی رائے کے خلاف ہے۔ اور ہمیں کوئی شخص ایسا معلوم نہیں جس نے امام ابوحنیفہؒ سے اس رائے میں اتفاق کیا ہو[1]۔

بیسویں بحث: دورانِ نماز قراءت کرنا آجائے تو کیا کرے؟

قراءت سے ناواقف آدمی نے حکمِ خداوندی کے مطابق نماز شروع کی اور دورانِ نماز اچانک وہ قراءت پر قادر ہوگیا۔ اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنے طور پر تلاوت کر رہا تھا کہ نمازی نے دوران نماز اس کی آواز سن لی اور صرف سننے سے وہ اس کو ذہن نشین ہوگئی تو ایسے شخص کو نئے سرے سے نماز

۱۔ امام ابوحنیفہؒ کی اس رائے کی بنیاد یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (الشعراء ۲۶:۱۹۶) (یہ کلامِ الٰہی گزشتہ قوموں کی کتابوں میں بھی ہے)۔ چوں کہ گزشتہ قوموں کی زبانیں غیر عربی تھیں، اس لئے غیر عربی زبان میں قرآن کی تلاوت بھی جائز ہوگی۔ یہ امام رحمہ اللہ کی ذاتی رائے تھی جس سے فقہاء اُمت نے اختلاف کیا۔ نورالانوار شرح منار میں آپؒ کی اس رائے کو توحیدِ الٰہی میں استغراق اور تعلق باللہ کی شدت کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے تا کہ آسان ترین زبان میں توجہ الی اللہ ممکن ہو جب کہ صاحبین اور جمہور فقہاء نے قرآنی نظم و بلاغت ہی کو تعلق مع اللہ کا مضبوط ترین ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسی پر فقہاء اُمت کا اجماع اور حنفیہ کا فتویٰ ہے۔ الهداية: كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۱:۹۵ حاشیہ (۹) بحوالہ نور الانوار، و، (۱۰) بحوالہ النہایہ۔ صاحب ہدایہ اور علامہ ابن عابدینؒ کی تحقیق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ نے اپنے قول سے رجوع فرما کر جمہور کی رائے سے اتفاق کیا۔ ردّ المحتار على الدرالمختار: كتاب الصلاة، فصل آداب الصلاة، مطلب في حديث الأذان ۱:۳۵۷، مطلب في حكم القراءة بالفارسية أوالتوراة والانجيل ۱:۳۵۸، مطلب في الدعاء بغير العربية ۱:۳۸۵

شروع کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو کچھ اس نے اب تک ادا کیا وہ حکم کے مطابق تھا۔ اس اداشدہ حصے کو ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں[۱]۔ یہ بات ابن سحنون نے اپنی کتاب میں لکھی ہے[۲]۔

☆☆☆☆☆

۱۔ یہ منفرد نمازی کے بارے میں فقہاء مالکیہ کی رائے ہے۔ حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک اس صورت میں اس کی نماز ٹوٹ جائے گی اور اسے نئے سرے سے ابتداء کرنا ہوگی۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح تیمم والے کو جونہی پانی کے استعمال پر قدرت حاصل ہو جائے اس کا تیمم ختم ہو جاتا ہے اور اسے وضو کرنا پڑتا ہے۔الهداية: كتاب الصلاة، باب الحدث في الصلاة ۱:۱۱۷،ابن قدامة: المغني، كتاب الصلاة، فصل: وإن لم يحسن القراءة بالعربية لزمه التعلم ۲:۱۵۹-۱۶۰

۲۔ ابو عبداللہ محمد بن عبدالسلام سحنون بن سعید التنوخی القیروانی (م۲۵۶ھ/۸۷۰ء) فقہ مالکی کے علامہ اور مناظر تھے۔آپؒ کی دیگر ضخیم تصنیفات کے علاوہ ایک کتاب فقہاءِ شافعیہ اور علماءِ عراق کے رد میں بھی ہے۔غالبًا علامہ قرطبیؒ کا اشارہ اسی کی طرف ہے۔معجم المؤلفين:۱۰:۱۲۹

باب:۳

آمین کا بیان

''آمین'' کا بیان آٹھ مباحث پر مشتمل ہے۔

پہلی بحث: آمین کہنے کا موقع

قرآنِ مجید کی تلاوت کرنے والے کے لئے مسنون ہے کہ سورۂ فاتحہ سے فارغ ہونے کے بعد ﴿وَلاَالضَّالِّينَ﴾ کے نون پر ہلکا سا رُکے اور پھر آمین کہے تاکہ قرآن مجیداور غیر قرآن کا فرقِ واضح ہوجائے۔

دوسری بحث: آمین کہنے سے کب مغفرت ہوتی ہے؟

حدیث کی بنیادی کتب میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادمنقول ہے:

[۲۲۸] إذا أمَّنَ الإمامُ فَأمِنُّوا فإنّهٗ مَنْ واَفقَ تأمينُه' تأمينَ المَلاَئِكَةِ غُفِرلهٗ ماتقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِه۔

جب امام آمین کہے تو تم بھی کہو کیوں کہ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ مل گئی اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

ہمارے علماء فرماتے ہیں: اس حدیث مبارک کی بناء پر گناہوں کی بخشش کا انحصار چار چیزوں پر ہے: پہلی چیز امام کی آمین، دوسری مقتدیوں کی آمین، تیسری فرشتوں کی آمین اور چوتھی آمین کا فرشتوں کی آمین کے ساتھ مل جانا(۱)۔ اس آمین کے فرشتوں کی آمین کے ساتھ ملنے کے بارے میں مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں بارگاہِ الٰہی میں قبولیت کی موافقت مراد ہے، بعض کے نزدیک ملائکہ کی آواز کے ساتھ نماز؛ کی آواز کا مل جانا مراد ہے اور بعض

[۲۲۸] صحیح بخاری: كتاب الأذان، باب جهر الامام بالتأمين. عمدة القاري ۴۹:۶، صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب التسميع والتحميد والتامين. شرح الأبي والسنوسي ۲۹۳:۲، مؤطاامام مالکؒ: باب ماجاء في التأمين خلف الإمام. أوجز المسالک ۱۰۸:۲

(۱) ابن العربی: أحكام القرآن ۶:۱

حضرات کا خیال ہے کہ دعا میں اخلاص ایسا ہو جیسا فرشتوں کی دعاء میں ہوتا ہے[1]۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۲۲۹] أدعُوالله وأنتُم مُوقِنُونَ بالإجابةِ، وَاعلَمُوا أنّ الله لاَ يَستَجِيبُ دُعاءً مِنْ قلبِ غافلٍ لاهٍ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو، اس یقین کے ساتھ کہ تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی اور آگاہ رہو کہ اللہ تعالیٰ غافل اور لاپرواہ دل کی دعا قبول نہیں فرماتے۔

تیسری بحث: آمین کے فضائل

امام ابوداؤدؒ نے ابو مصبح مقرائی[2] کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم ایک صحابی حضرت ابو زہیر نمیری رضی اللہ عنہ[3] کی مجلس میں بیٹھا کرتے تھے، وہ ہمیں بہت اچھی اچھی باتیں سنایا کرتے تھے۔ جب ہم میں سے کوئی دعا کرتا تو وہ کہتے اسے آمین پر ختم کرنا۔ آمین کی حیثیت دستاویز پر مہر لگانے کی سی ہے۔ ایک دن حضرت ابوزہیر نے کہا: میں تمہیں اس کی تفصیل بتاتا ہوں: ایک رات ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک آدمی کے پاس پہنچے جو بہت عاجزی سے گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی دعا سننے کے لئے رک گئے اور فرمایا:

[۲۳۰] أوجَبَ إنْ خَتَمَ ۔فقال له رجل من القوم: بأي شيئ يختم؟قال: بآمين ! فإنه إن ختم بآمين فقد أوجب ۔ فانصرف الرجل الذي سأل النبي صلى الله عليه وسلم فأتى الرجل فقال له:اختم يافلان وأبشر .

---

[۲۲۹] جامع ترمذی: کتاب الدعوات، باب...... امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث "غریب" ہے اور اس سند کے علاوہ ہمیں یہ کہیں نہیں ملی۔ ۵:۵۱۷، تحفۃ الاحوذی ۹:۲۶۰، مستدرک حاکم: کتاب الدعاء، لايقبَل دعاء من قلب غافل لاه". امام حاکم فرماتے ہیں: اس حدیث کی سند صحیح ہے، البتہ اسے صالح المری نے اکیلے روایت کیا ہے اور وہ بصرہ کے ایک پرہیزگار آدمی تھے۔ ۱:۴۹۳

[۲۳۰] سنن ابو داؤد: کتاب الصلاۃ، باب التأمين وراء الإمام. بذل المجهود ۵:۲۳۹

۱۔ تفسیر ابن عطیۃ ۱:۱۳۳

۲۔ أبو مصبح المقرئي الأوزاعي الحمصي. ابوزرعہ اور ابن حبان نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۱۲:۲۳۷

۳۔ أبوزهير النميري يا أنماري. صحابی ہیں مگر ان کا نام معلوم نہیں۔ الإصابة ۴:۷۷ کنیت: ۴۵۶، أسد الغابة ۵:۲۰۱

اگر اس نے دعا پر مہر لگا دی تو اس کی قبولیت یقینی ہو جائے گی۔ اس جماعت میں سے ایک شخص نے پوچھا: کس چیز سے مہر لگا دے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آمین سے! اگر یہ آمین سے مہر لگا دے تو دعا کی قبولیت یقینی ہو جائے گی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے والا شخص وہاں سے نکل کر اس آدمی کے پاس گیا اور کہا: اے فلاں! اپنی دعا پر مہر لگا دو اور خوشخبری سُن لو۔

حضرت ابوزہیر نمیریؓ کا تعارف

حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں: حضرت ابوزہیر نمیری رضی اللہ عنہ کا نام یحییٰ بن نفیر ہے[۱]۔ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا:

[۲۳۱] لَاتَقتُلُوا الجَرَادَ فإنَّه' جُندُاللّٰهِ الأعظَم

ٹڈی کو قتل نہ کرو، یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم فوج ہے۔

وہب بن منبہ[۲] کہتے ہیں: آمین میں چار حرف ہیں، ہر حرف سے اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ پیدا کرتے ہیں جو یہ دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ! جس نے آمین کہا، اسے بخش دے۔ ایک حدیث میں ہے:

[۲۳۲] لقَّنَنِي جِبرِيلُ آمينَ عِند فَراغِي مِن فاتحةِ الكتابِ وقال: إنهُ كالخاتَم على

---

[۲۳۱] شعب الإيمان: السبعون من شعب الإيمان وهوباب في الصبر على المصائب وممانتزع إليه...... فصل في محنة الجراد والصبر عليها۷:۲۳۲، طبرانی: المعجم الكبير، مسند من يعرف بالكنى من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم ممن لم ينقل إلينا اسمه، باب أبوزهير النميري اسمه حاتم ۲۲:۵۰۰۔ ہیثمیؒ کہتے ہیں اس کی سند میں محمد بن اسماعیل بن عیاش ہے جو کہ ضعیف ہے۔ مناویؒ: فيض القدير ۶:۳۱۶، حدیث ۹۸۴۲، أسد الغابة ۵:۲۰۱ (أبوزہیر)، الإصابة ۴:۷۸ (ابوزہیر)، الاستيعاب بحاشية الإصابة ۴:۷۹

[۲۳۲] زمخشری: الكشاف ۱:۱۸، تفسير أبي السعود ۱:۱۹، روح البيان ۱:۲۵

۱۔ حافظ ابن حجرؒ نے ابو الازہر اور ابوزہیر دونوں انہی کی کنیتیں نقل کی ہیں، ابن ابی حاتم فرماتے ہیں: وہ شام کے رہنے والے تھے اور ان کا نام معلوم نہیں۔ ہمیں عبدالرحمٰن نے بتایا کہ ایک مرتبہ میرے والد (ابوزرعہ) کے سامنے کسی نے ان کا نام یحییٰ بن نفیر ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا: ان کی کنیت یقینی طور پر واضح نہیں تو ان کے نام کی پہچان کس طرح ہو سکتی ہے۔ الاستيعاب على هامش الإصابة ۴ : ۷۹، تهذيب التهذيب ۲:۷، کنیت: ۲۲ (ابوالازہر)، الجرح والتعديل ۹:۳۷۴، کنیت: ۱۶۷۴

۲۔ ابوعبداللہ وہب بن منبہ بن کامل الیمانی الابناوی (م ۱۱۴ھ) تابعی ہیں، صنعاء کے قاضی رہے، عجلی، ابن حبان ابوزرعہ اور نسائی نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ قدریت کی طرف مائل تھے پھر رجوع کر لیا۔ تهذيب التهذيب ۱۱:۱۶۸

الکتاب۔

جب میں سورۂ فاتحہ پڑھ چکا تو جبریل نے مجھے آمین سکھائی اور کہا کہ یہ ایسے ہے جیسے کسی دستاویز پر مہر ہوتی ہے۔

دوسری حدیث میں ہے:

[۲۳۳] آمينُ خاتَم ربِّ العالمين۔ آمین رب العالمین کی مہر ہے۔

ہرویؒ نے ابوبکر ابن الانباریؒ سے نقل کیا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آمین بندوں پر اللہ تعالیٰ کی مہر ہے کیوں کہ وہ اس کی برکت سے ان سے آفتیں اور مصیبتیں دور فرماتے ہیں۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح خط پر مہر لگا دی جاتی ہے جو اسے محفوظ کر دیتی ہے، خراب ہونے سے بچاتی ہے اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے ظاہر ہونے سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے:

[۲۳۴] آمين درجة في الجنة۔ آمین جنت کے ایک درجہ کا نام ہے۔

ابوبکر کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ آمین وہ لفظ ہے جس کا کہنے والا جنت میں ایک درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

چوتھی بحث: آمین کا معنی

اکثر اہل علم کے نزدیک آمین کا معنی ہے: اے اللہ! ہماری دعا کو قبول فرما۔ آمین کو دعا کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ ابن العربی کہتے ہیں: جعفر بن محمد، مجاہد اور ہلال بن یساف [۱] سے روایت ہے کہ یہ باری تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے [۲]۔ اسی طرح حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا گیا ہے لیکن یہ روایت صحیح نہیں۔ جوہری کہتے ہیں: آمین کا معنی یہ ہے کہ ''اسی طرح ہو جائے''۔ کلبی نے ابو صالح سے اور انہوں نے

---

[۲۳۳] فیض القدیر ۱:۵۹، حدیث: ۲۰، ابن الاثیر: النهاية ۱:۷۲، تفسير ابن عطية ۱:۱۳، الكامل في الضعفاء، تعارف مؤمل بن عبدالرحمن الثقفي ۸:۱۹۳

[۲۳۴] ابن الأثير: النهاية ۱:۷۲

۱۔ ہلال بن یساف الأشجعی الکوفی تابعی ہیں۔ ابن معینؒ، عجلیؒ اور ابن حبانؒ وغیرہم نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۱۱:۸۲

۲۔ ابن العربیؒ نے یہ نام ذکر نہیں کئے اور ابو اللیث سمرقندیؒ نے اسے مجاہدؒ سے نقل کیا ہے۔ أحكام القرآن ۱:۶، تفسير السمرقندي ۱:۸۳۔۸۴، ابن عطية ۱:۱۳۳، مصنف عبد الرزاق: باب آمین عن الثوری عن منصور عن ہلال ابن یساف وأبي هريرةؓ ۲:۹۹

حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آمین کا معنی پوچھا تو آپ نے ارشاد فرمایا:

[۲۳۵] رَبِّ افعل۔ اے میرے رب یہ کام کر دیجئے۔

مقاتل[۱] کہتے ہیں: آمین دعا کی طاقت اور نزول برکت کی خواہش ہے[۲]۔ امام ترمذی کہتے ہیں: اس کا معنی یہ ہے، ''کہ ہماری امید کو ناکام نہ فرما''

پانچویں بحث: آمین کی لغوی تحقیق

آمین دو طرح بولا جاتا ہے۔ یاسین کی طرح مد کے ساتھ فاعیل کے وزن پر اور بغیر مد ''یمین'' کے وزن پر۔ مَد کی مثال شاعر کا یہ قول ہے:

یاربِّ لاتَسلبنِی حُبَّهَا أبداً وَيَرْحَمُ اللّٰهُ عَبْداً قَالَ آمِينا

اے میرے رب مجھ سے اس کی محبت کبھی نہ چھیننا اور اللہ اس بندے پر رحم کرے جو میری دعاء پر آمین کہے۔

دوسرا شاعر کہتا ہے:

آمین آمین لا أرضَى بوَاحِدةٍ حتّى أبلّغها ألفينِ آمينا

آمین! آمین! میں ایک بار کہنے سے خوش نہیں ہوتا جب تک کہ دو ہزار آمین نہ کہہ لوں

بغیر مد ''امین'' کی مثال شاعر کا یہ قول ہے:

تباعَدَ منّي فُطحُلٌ إذ سألتُهُ أمِينَ فزادَ اللّٰه مابَيْنَنَا بُعدا[۳]

میں نے دعا مانگ کر آمین کہی کہ فُطحل مجھ سے دور رہے تو اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان دوری میں اضافہ کر دیا۔

---

[۲۳۵] تفسیر ابن کثیر، سورۂ فاتحہ بروایت جویبر عن الضحاک عن ابن عباس رضی اللہ عنہ، شوکانی: فتح القدیر، سورۂ فاتحہ۔

۱۔ ابو الحسن مقاتل بن سلیمان الأزدی البلخی (م ۱۵۰ھ) مشہور مفسر ہیں، امام شافعیؒ نے تفسیر میں ان کی تعریف کی ہے اور سند حدیث و روایت میں ان پر جرح کی ہے۔ تہذیب التہذیب ۱۰:۲۷۹

۲۔ کلبی کی روایت سے حضرت ابن عباسؓ اور مقاتلؒ دونوں کے اقوال سمرقندیؒ نے اپنی تفسیر ۱:۸۳-۸۴ میں ذکر کیے ہیں۔

۳۔ تفسیر السمرقندي ۱:۸۴، تفسیر ابن عطیة ۱:۱۲۲، ابن العربي: أحكام القرآن ۱:۶

جوہری کہتے ہیں کہ میم پر شد پڑھنا غلط ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور جعفر صادقؒ سے میم کی شد نقل کی گئی ہے۔ حسین بن فضل[1] کا بھی یہی قول ہے۔ وہ کہتے ہیں: شد کے ساتھ "آمّین" أمّ (ارادہ کرنا، قصد کرنا) سے مشتق ہے جس کا معنی یہ ہے: ہم تیری طرف آنے والے ہیں۔ اسی معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلاآمِّينَ الْبيتَ الْحَرَامَ﴾ [المائدة٥: ٢] (اور نہ ہی بیت الحرام کی طرف جانے والوں پر......)۔ جوہریؒ کہتے ہیں: التقائے ساکنین سے بچنے کے لیے آمین کو فتحہ دے دیا گیا جیسے أین اور کیفَ کو دیا گیا۔ اس طرح یہ سب مبنی علی الفتح ہیں۔ اسی سے کہا جاتا ہے: أمَّن فلانٌ تأمينا[2]. (فلاں نے آمین کہی)۔

چھٹی بحث: آمین کے احکام

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ امام آمین کہے یا نہ کہے اور اگر کہے تو بلند آواز سے کہے یا آہستہ۔ امام شافعیؒ اور فقہاءِ مدینہ کی روایت کے مطابق امام مالکؒ دونوں حضرات کی رائے یہ ہے کہ امام آمین کہے اور بلند آواز سے کہے۔ فقہاء کوفہ اور بعض علماءِ مدینہ بلند آواز سے آمین نہ کہنے کے قائل ہیں۔ امام طبریؒ اور ہمارے علماء (مالکیہ) میں سے ابن حبیب کی بھی یہی رائے ہے۔ ابن بکیر کہتے ہیں امام کو اختیار ہے[3] چاہے تو بلند آواز سے کہے اور چاہے تو آہستہ۔ ابن قاسم امام مالکؒ کا قول نقل کرتے ہیں کہ امام آمین نہ کہے بلکہ مقتدی کہیں۔ ابن قاسمؒ اور مصر کے مالکی فقہاء کی اپنی بھی یہی رائے ہے۔ ان کی دلیل حضرت ابو موسیٰ اشعری کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا جس میں ہمیں سیدھا راستہ اور طریقہ بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

[۲۳۶] إذا صَلَّيتُم فَأقِيمُوا صُفُوفَكُم ثمّ ليؤمّكُم أحَدُكُم، فإذاَ كَبّر فَكَبّروا، وإذا قَالَ غَيرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ فَقُولُوا آمِين يُجِبكُمُ اللهُ۔

---

[۲۳۶] صحیح مسلم: كتاب الصلاة باب التشهد، شرح الأبي والسنوسي ۲:۲۸۴-۲۸۵

۱۔ ابو علی حسین بن فضل البجلی الکوفی النیشابوری (م۲۸۳ھ) تفسیر اور معانی القرآن میں نابغۂ روزگار تھے۔ لسان المیزان ۲:۳۰۷

۲۔ علامہ ابن منظورؒ کہتے ہیں: حق تو یہ تھا کہ ان پر وقف کیا جاتا کیوں کہ یہ اگر کسی فعل سے متفق نہ مانے جائیں تو اصوات کے قائم مقام ہیں مگر چوں کہ وقف کرنے سے التقاء ساکنین لازم آتا تھا اس لئے ان کے نون کو فتحہ دے دیا گیا۔ کسرہ اس لئے نہیں دیا گیا کہ وہ یاء کے بعد ثقیل نہ ہو۔ یہ اسی طرح ہے جس طرح أین اور کیف کو فتحہ دیا گیا۔ لسان العرب (أمن)

۳۔ ابن العربی: احکام القرآن ۱:۷، تفسیر ابن عطیہ ۱:۱۳۲

جب تم نماز پڑھنے لگو تو صفوں کو درست کرو، پھر تم میں کوئی امامت کے لیے آگے بڑھے، جب امام تکبیر کہے تو تم بھی کہو اور جب وہ ﴿غَیرِ الْمَغْضُوبِ عَلَیْهِمْ وَلاالضَّالِّیْنَ﴾ کہے تو تم آمین کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری دعا قبول کرے گا۔اور پوری حدیث ذکر فرمائی جسے امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

سُمَیؒ(۱) نے بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس معنی کی ایک حدیث روایت کی ہے جسے امام مالکؒ(۲) نے نقل کیا ہے لیکن پہلی بات ہی صحیح ہے جیسا کہ حضرت وائل بن حجر(۳) رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ:

[۲۳۷] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ﴿وَلاَالضَّالِّیْنَ﴾ پڑھتے تو بلند آواز سے آمین کہتے۔ یہ حدیث امام ابو داؤد اور امام دارقطنیؒ نے نقل کی ہے۔امام دارقطنیؒ نے کچھ اور بھی ذکر کیا ہے۔

ابوبکر کہتے ہیں: یہ بھی سنت ہے جسے صرف فقہاءِ کوفہ نے اختیار کیا ہے(۴)۔ یہ بھی صحیح ہے اور اس کے بعد والی بھی۔ امام بخاریؒ نے بھی ایک باب کا عنوان یوں قائم فرمایا ہے:

---

[۲۳۷] سنن ابوداؤد: كتاب الصلاة، باب التأمين وراء الإمام. ۱:۲۴۶، بذل المجهود ۵:۲۲۱-۲۲۲،۷،سنن دارقطنیؒ: كتابُ الصلاة، باب التأمين في الصلاة بعد فاتحة الكتاب والجهربها ۱:۳۳۵،سنن دارمی: كتاب الصلاة ،باب الجهر بالتأمين ۱:۳۰۲

۱۔ ابوعبداللہ سُمَي المدنی (م۱۳۱ھ) ابوبکر بن عبدالرحمٰن مخزومی کے غلام تھے۔ امام احمد، ابو حاتم اور ابن حبان وغیرہم نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تهذيب التهذيب۴:۲۳۸

۲۔ مؤطاامام مالکؒ: كتاب الصلاة، باب ماجاء في التامين. أوجز المسالک ۲:۱۱۰

۳۔ ابو ہنیدہ وائل بن حجر الحضرمی الکندیؒ جلیل القدر صحابی ہیں۔حضر موت کے شاہ زادوں میں سے تھے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنے منبر پر بٹھا کران کی عزت افزائی فرمائی۔آپؓ کوفہ میں مقیم رہے۔ تهذيب التهذيب ۱۱:۱۰۸

۴۔ شاید اس سے مصنفؒ کا اشارہ امام دارقطنیؒ کی اس حدیث کی طرف ہے جس میں ''يرفع بهاصوته''(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آمین بلند آواز سے کہی) کی بجائے ''واخفى بها صوته''(آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آہستہ آواز میں آمین کہی)ہے۔ دارقطنیؒ: كتاب الصلاة، باب التأمين في الصلاة بعد فاتحة الكتاب والجهربها ۱:۳۳۴، اورفقہاءِ کوفہ سے مراد فقہاءِ حنفیہ ہیں واللہ اعلم۔امام حاکم نے مستدرک ،كتاب التفسير،باب قراء ات النبي صلى الله عليه وسلم مما لم يخرجاه وقد صح سنده ۲:۲۵۳میں،امام احمدؒ نے اپنی مسند، حديث وائل بن حجر رضی الله عنه ۵:۴۱۳میں اوربیہقیؒ نے: السنن الكبرى، كتاب الصلاة ،باب جهر الإمام بالتأمين ۲:۳۶۰میں اسی مفہوم کی حدیث نقل کی ہے۔

[۲۳۸] بابُ جَهرِ الإمام بِالتَّأمين۔وقال عطاء: آمين دعاء ،أَمَّنَ ابن الزبير ومن وراء ه حتی إن للمسجد للجَّةً۔

باب اس امر کے بیان میں کہ امام بلند آواز سے آمین کہے۔ عطاء کہتے ہیں کہ آمین دعا ہے۔ حضرت ابن زبیرؓ اور ان کے مقتدی سب آمین کہتے تھے یہاں تک کہ مسجد میں ان کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی تھیں(۱)۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ فقہاء صحابہ اور ان کے بعد آنے والے علماء میں سے ایک سے زیادہ حضرات کی رائے یہی ہے کہ آمین کہتے وقت آواز بلند ہو آہستہ نہ ہو۔ امام شافعی امام احمد اور اسحاق بھی اسی کے قائل ہیں(۲)۔

[۲۳۹] مؤطا اور صحیحین میں ابن شہاب سے منقول ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی آمین کہا کرتے تھے۔

---

[۲۳۸] صحیح بخاری: کتاب الصلاۃ، باب جهر الإمام بالتامين...... عمدۃ القاری ۶:۴۷

[۲۳۹] مؤطا امام مالکؒ: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء في التامين خلف الإمام. أوجز المسالک ۲:۱۰۹، صحیح بخاری: کتاب الصلاۃ، باب جهرالإمام بالتامين. عمدۃ القاری ۶:۴۹، صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ، باب التسميع والتحميد والتأمين، مع شرح الأبي والسنوسي ۲:۲۹۴

۱۔ صحیح بخاری: کتاب صفة الصلاة، باب جهر الإمام بالتأمين وقال عطاء : آمين دعاء...... ۱:۱۰۷، مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ ،باب آمین ۲:۹۶، ۹۷، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ ،باب جهر المأموم بالتامين ۲:۳۶۳ میں "لَلَجَّةً" ہے۔اور اس کے ہم معنی الفاظ "رَجَّةً" اور "لَجَبَةً" ہیں۔سبکا معنی "ملی جلی آوازیں" ہے اور ضروری نہیں کہ اس سے ارادی طور پر آواز بلند کرنا ہی مراد ہو بلکہ یہ تو مشاہدہ کی بات ہے کہ نمازیوں سے بھری مسجد میں کچھ نہ کچھ نمازی ایسے ہوتے ہیں جو تسبیحات، تکبیرات اور تشہد وغیرہ کی ادائیگی میں زیادہ توجہ سے کام لیتے ہیں جس سے مبالغہ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور آواز کچھ نہ کچھ بلند ہو ہی جاتی ہے۔ اگر ایسا کرنے والے کئی لوگ ہوں تو لَجَّة اور رَجَّة وغیرہ کی کیفیت کا پیدا ہونا ایک طبعی امر ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سنن ابن ماجہؒ : کتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب الجهر بآمين ۱:۲۷۸ میں حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب آمین فرماتے تو پہلی صف والے اسے سن لیتے۔سنن ابوداود: کتاب الصلاۃ ،باب التامين وراء الإمام ۱:۲۴۶ میں ہے کہ" پہلی صف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے لوگ اسے سن لیتے"۔سنن نسائی: کتاب الإفتتاح ، باب قول المأموم إذاعطس خلف الإمام ۲:۱۴۵ میں عبدالجبار بن وائلؓ سے ان کے والد گرامی کا ارشاد منقول ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء میں نماز پڑھی...... جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ﴿غَيرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيهِمْ وَلاَالضَّالِّين﴾ پڑھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "آمین" کہا جسے میں نے سن لیا کیوں کہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے کھڑا تھا۔عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ ، باب آمین ۲:۹۵ میں زہریؒ سے مرسلاً منقول ہے کہ اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے لوگ سن لیتے۔ یہ بہت واضح بات ہے۔

۲۔ جامع ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ما جاء في التامين. ۲:۲۷

[۲۴۰] سنن ابن ماجہؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ لوگوں نے آمین کہنا چھوڑ دیا حالاں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ﴿غَيْرِالْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلاَالضَّالِّيْنَ﴾ پڑھتے تو آمین کہتے، یہاں تک کہ پہلی صف والے لوگ اسے سن لیتے اور پھر مسجد میں آمین کی ملی جلی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔

جہاں تک حضرت ابوموسیٰؓ والی اور سمیؒ والی حدیث کا تعلق ہے تو ان دونوں سے مراد اس موقع کی نشاندہی کرنا ہے جہاں آمین کہی جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب امام﴿وَلاَ الضَّالِّيْنَ﴾ کہے تو اس کے ساتھ ہی سب لوگ آمین کہیں۔ مقتدی امام سے پہلے نہ کہہ لیں(۱) جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا۔ واللہ اعلم۔اس کی ایک اور دلیل یہ ارشاد نبوی بھی ہے:

[۲۴۱] إذا أمَّنَ الإمامُ فَأمِّنُوا۔جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔

ابن حارث کی کتاب میں ابن نافع کا قول منقول ہے کہ مقتدی جب تک امام سے ﴿وَلاَالضَّالِّيْنَ﴾ سن نہ لے "آمین" نہ کہے اور اگر اس قدر دور ہو کہ امام کی آواز نہ سن سکے تو آمین ہی نہ کہے۔ ابن عبدوس(۲) کہتے ہیں کہ امام کی قراءت کا اندازہ لگا لے اور اس کے مطابق آمین کہے(۳)۔

---

[۲۴۰] سنن ابن ماجہؒ: كتاب اقامة الصلاة والسنة فيها، باب الجهر بآمين ۱:۲۷۸۔ اس حدیث کی سند میں ابوعبداللہ غیر معروف ہیں اور بشر بن رافع کو امام احمد نے ضعیف اور ابن حبان نے حدیثیں گھڑنے والا کہا ہے۔ ابن معین کہتے ہیں: یہ منکرات کو روایت کرنے والے ہیں،امام نسائیؒ کہتے ہیں قوی نہیں ہیں، امام بخاریؒ فرماتے ہیں: ان کی حدیث قابل عمل نہیں، حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں: ان کی روایات مناکیر ہوتی ہیں۔ اس بات پر علماء حدیث کا اتفاق ہے۔ تهذيب التهذيب ۱:۴۴۸، الكامل في الضعفاء ۲:۴۴۴، الجرح والتعديل ۲:۳۵۷، ميزان الإعتدال ۱:۳۱۷۔ اسی حدیث کو امام ابوداوٗد نے اپنی سنن: كتاب الصلاة، باب التامين وراء الإمام میں ذکر کیا ہے مگر اس میں مسجد میں ملی جلی آوازیں آنے کا ذکر نہیں۔ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑے لوگوں کے آمین سن لینے کا ذکر ہے۔بذل المجهود ۵:۲۲۷، ۲۳۳۔ ابویعلیٰ نے بھی اپنی مسند میں اسے ان الفاظ کے بغیر ہی ذکر کیا ہے۔ دورِ جدید کے مشہور محقق علامہ البانیؒ نے بھی صحیح سنن ابن ماجہؒ میں اسے ذکر نہیں کیا۔

[۲۴۱] صحیح بخاری: كتاب الصلاة، باب جهر الإمام بالتامين...... عمدة القاری ۶:۴۹، صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب التسميع والتحميد والتأمين. مع شرح الأبي والسنوسي ۲:۲۹۴، مؤطاامام مالکؒ:كتاب الصلاة، باب ماجاء في التامين خلف الإمام ۲:۱۰۹

۱۔ مؤطا امام مالک: كتاب الصلاة، باب ماجاء في التامين خلف الإمام. اوجز المسالک ۲:۱۱۰

۲۔ ابوعبداللہ محمد بن ابراہیم بن عبدوس (م تقریباً ۲۶۰ھ) سحنونؒ کے خصوصی شاگرد اور فقیہ مغرب مشہور تھے۔ ابو العرب کہتے ہیں: وہ ثقہ، فقیہ، بہت متقی اور زاہد تھے۔ سیر اعلام النبلاء ۱۳:۶۳

۳۔ تفسير ابن عطية ۱:۱۳۲

ساتویں بحث: فقہاءِ حنفیہ کے دلائل پر بحث

فقہاءِ حنفیہ کہتے ہیں: آمین خفیہ کہنا بلند آواز سے کہنے سے بہتر ہے کیوں کہ یہ دعا ہے اور دعاء کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾[الاعراف۷:۵۵](اپنے رب کو گڑگڑا کر آہستہ آواز میں پکارا کرو)۔اُن کا کہنا ہے کہ ہماری دلیل وہ تفسیری اقوال ہیں جو ارشاد باری تعالیٰ:﴿قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾[یونس ۱۰:۸۹](تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی ہے)کے تحت منقول ہیں۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام دعا مانگتے رہے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے رہے لیکن اللہ نے دونوں کو دعا کرنے والا قرار دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خفیہ دعا مانگنا اس لئے افضل ہے کہ اسے ظاہر کرنے میں ریاکاری کا احتمال ہوتا ہے۔ جب کہ باجماعت نماز میں شریک ہونابذات خود ایک ظاہری شعار کو ظاہری طور پر بجا لانا اور ایسے حق کا اظہار کرنا ہے جس کے اظہار کی طرف بندوں کو دعوت دی جاتی ہے۔ سورۂ فاتحہ کوجوکہ دعا پر مشتمل ہے علی الإعلان پڑھنا امام کے ذمہ لگایا گیا ہے اور اسی کے آخر میں آمین ہے۔ جب یہ دعاء بلندآواز میں پڑھی جاتی ہے تو اس پر کہی جانے والی آمین بھی اسی کے تابع اور اسی کے قائم مقام ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے[1]۔

آٹھویں بحث: لفظ آمین کن اُمتوں کو عطا کیا گیا؟

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کے علاوہ ہم سے پہلے لفظ آمین کسی کو عطا نہیں کیا گیا۔ حکیم ترمذی نے نوادرالاصول میں نقل کیا ہے کہ ہم سے عبدالوارث بن عبدالصمد[2] نے بیان کیا۔ وہ کہتے ہیں مجھ سے میرے والد نے ذکر کیا، وہ کہتے ہیں ہم سے ہشام بن حسان[3] کی مسجد کے مؤذن رزین نے بیان کیا وہ کہتے ہیں ہمیں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بتایا وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

۱۔ آمین بلند آواز سے یا آہستہ کہنے کا اختلاف صدیوں سے چلا آرہا ہے جس میں ہر دو فریق کے دلائل کتب حدیث وفقہ میں موجود ہیں جن میں سے کچھ باتیں گزشتہ صفحات میں گزرچکی ہیں۔علامہ عینی نے بھی عمدۃ القاری: کتاب الصلاۃ، باب الجهر بالتامين ۶:۵۰-۵۲میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ امام شافعیؒ کی کتاب الأم، باب التامين عندالفراغ من قراءة أم القرآن ۱:۱۳۱ اورابن قدامہ الحنبلی کی المغني ، كتاب الصلاة، مسألہ:۱۵۱میں بھی کافی تفصیل موجود ہے۔

۲۔ ابوعبیدہ عبدالوارث بن عبدالصمدالعنبری البصری (م۲۵۲ھ)کو ابن حبان نے ثقات میں ذکر کیا ہے اور ابوحاتم نے صدوق کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۶:۴۴۳

۳۔ ابوعبداللہ ہشام بن حسان الأزدی البصری (م۱۴۸ھ) مشہور محدث ہیں۔حسن بصریؒ کے شاگرد تھے۔عجلی اورابن حبان وغیرہ نے انہیں ثقہ اور ابو حاتمؒ نے صدوق کہاہے۔ امام ابو داؤد کہتے ہیں :عطاء سے ان کی روایت میں کلام کیا گیا ہے ۔ وہ مرسل روایات نقل کرتے تھے اورغالباً یہ سب روایات حوشب کی کتب سے نقل کی گئی ہیں۔ تهذيب التهذيب ۱۱:۳۴ ، سير اعلام النبلاء ۶:۳۵۵

[۲۴۲] إنَّ اللّٰہ أعطٰی أمّتي ثلاثاً لم تُعطَ أحدًا قبلھم: السلام وھو تحیّۃ أھل الجنّۃ، وصفوف الملائکۃ وآمین إلّا ما کان من موسیٰ و ھارون۔

اللہ نے میری اُمت کو تین چیزوں سے نوازا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہیں دی گئیں۔ سلام کا وہ طریقہ جو کہ اہل جنت کا ہے، فرشتوں کی طرح صفیں بنانا اور آمین۔ سوائے اس ایک موقعہ کے جب حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہ السلام نے آمین کہی۔ ابوعبداللہ (حکیم ترمذی) کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لئے بددعا کی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے آمین کہا مگر جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر کیا: تو دونوں کو شامل کر کے:﴿قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا﴾[یونس ۸۹:۱۰] (تم دونوں کی دعا قبول ہو گئی ہے) فرمایا۔ ہارون علیہ السلام کی دعا کا الگ ذکر نہیں فرمایا۔ صرف :﴿وَقَالَ مُوْسٰى: رَبَّنَا......﴾ (موسیٰ علیہ السلام نے دعا مانگی: اے ہمارے رب......) ہی ارشاد فرمایا حالاں کہ ہارون علیہ السلام تو اس دعا پر صرف آمین کہتے رہے تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو اپنے ارشاد گرامی میں دعا کرنے والا قرار دیا ہے اور ہارون علیہ السلام کی آمین ہی دعا شمار ہوئی۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ ''آمین'' صرف اس اُمت کے لئے خاص ہے، جیسا کہ امام ابن ماجہؒ نے حماد بن سلمہ سے نقل کیا ہے، انہوں نے سہیل بن ابی صالح سے، انہوں نے اپنے والد سے اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۴۳] ما حَسَدَتْکُمُ الیھودُ علَی شيءٍ ما حسَدتْکم علی السلامِ والتَّامین۔

یہود کسی چیز میں تم سے اتنا حسد نہیں کرتے جتنا کہ سلام اور آمین میں کرتے ہیں۔

---

[۲۴۲] متقی الہندی :کنز العمال ۱۷۲:۱۲، حدیث ۳۴۵۳۳، اسی معنی کی حدیث ہیثمی نے بحوالہ طبرانی حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نقل کی ہے اور اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ مجمع الزوائد، کتاب الصلاۃ، باب التامین ۱۱۳:۲، عبدالرزاق نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ موسیٰ بن عمران علیہ السلام جب دعا کرتے تو ہارون علیہ السلام آمین کہتے۔ مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ ، باب آمین ۹۹:۲

[۲۴۳] سنن ابن ماجہؒ: کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب الجھر بآمین ۲۷۸:۱، بخاری: الأدب المفرد، باب فضل السلام ۲۶۸:۱، صحیح ابن خزیمۃ: کتاب الصلاۃ ،باب حسد الیھود المؤمنین علی التأمین......۲۸۸:۱، مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاۃ باب آمین ۹۸:۲، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب التامین ۳۵۹:۲ قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ۔

انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی اسی طرح کی حدیث نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۴۴] ماحسَدُتُکم الیھودُ علٰی شیءٍ ماحسدتکم علیٰ آمین فَاکثروا من قولِ آمین۔

یہود تم سے آمین میں جتنا حسد کرتے ہیں کسی اور چیز میں اتنا نہیں کرتے۔لہٰذا تم کثرت سے آمین کہا کرو۔

ہمارے علماء (مالکیہ) کہتے ہیں کہ اہل کتاب ہم سے اس لئے حسد کرتے ہیں کہ فاتحہ میں ہم پہلے اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتے ہیں، پھر عاجزی اور بندگی کا اظہار کرتے ہیں، پھر سیدھے راستے پر چلنے کی دعا کرتے ہیں، پھر ان کے لئے بددعا کرتے ہیں اور اس پر "آمین" کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

---

[۲۴۴] سنن ابن ماجہؒ: کتاب اقامۃ الصلاۃ والسنۃ فیھا، باب الجھر بآمین ۲۷۹:۱۔ اس حدیث کی سند میں ایک راوی طلحہ بن عمرو کو متفقہ طور پر ضعیف قرار دیا گیا ہے۔ تھذیب التھذیب ۵:۲۳

باب:۴

فاتحہ کی تفسیراور حمد کرنے والوں کے فضائل

یہ باب چھتیس مباحث پر مشتمل ہے۔

پہلی بحث: ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ﴾

ارشاد باری تعالیٰ:﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ﴾ (سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں)کے بارے میں حافظ ابومحمد عبدالغنی بن سعید نے حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۴۵] إذا قَالَ العَبدُ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ﴾ قَالَ: صدقَ عبدي، اَلْحَمْدُ لِي۔

جب بندہ ﴿الحمدللہ﴾کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے نے سچ کہا: سب تعریفیں میرے لئے ہیں۔

امام مسلمؒ حضرت انس بن مالکؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۴۶] إنّ اللّٰه لَيرضَى عَنِ العَبدِ أن يَأكُلَ الأكلةَ فيَحمَدُهُ عليهَا أو يَشرَبَ الشُّربَةَ فيَحمَدُهُ عَليهَا۔

اللہ تعالیٰ اس بندے سے خوش ہوتے ہیں جو کچھ کھاتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور کچھ پیتا ہے تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔

[۳۴۵] یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے جس میں بندے کے ذکر کرنے اور اللہ تعالیٰ کے جواب دینے کا بیان ہے ۔وہاں الفاظ''اَلحَمدُ لي'' کی بجائے ''لي اَلحَمدُ'' ہیں اورحدیث کے راوی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ ہی ہیں۔سنن ابن ماجہ:کتاب الأدب، باب فضل لاإله إلاالله۲:۱۲۴۶،صحیح ابن حبان:کتاب الرقائق ، باب الأذكار۳:۱۳۱،مستدرک حاکم: کتاب الإیمان ۱:۴۶،مسندابویعلی: مسند أبي سعيد الخدري رضي الله عنه ۲:۴۴۹،مسند أبي هريرة رضى الله عنه ۱۱:۱۴، شعب الإيمان: العاشر من شعب الإيمان وهوباب في محبة الله عزوجل ، فصل في إدامة ذكر الله عزوجل ۱:۴۴۵

[۳۴۶] صحیح مسلم: كتاب الذكر والدعا، والتوبة والاستغفار باب استحباب حمدالله تعالى بعد الاكل والشرب. شرح الابى والسنوسي ۹:۱۳۹

حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ "اَلْحَمْدُلِلّٰهِ" کہنا سب نعمتوں سے افضل نعمت ہے۔ امام ابن ماجہؒ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۴۷] مَاأَنْعَمَ اللّٰه علی عبدٍ نِعْمَةً فَقَالَ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ إِلَّا كَانَ الَّذِی أَعْطَاهُ أَفْضَلَ مِمَّا أَخَذَ۔

اللہ جل شانہ بندے کو جو بھی نعمت دیتے ہیں اور وہ اس پر الحمدللہ کہتا ہے تو بندے نے جو کچھ دیا وہ اس نعمت سے بہتر ہے جو اسے ملی۔

نوادر الأصول میں حضرت انس بن مالکؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۴۸] لوأنَّ الدّنيا كلّها بِحَذ افِيرِها بيدِ رَجُلٍ مِن أمّتی ثُمّ قَالَ: اَلْحَمْدُلِلّٰهِ: لَكَانَتْ اَلْحَمْدُلِلّٰهِ أفضلَ مِنْ ذٰلك۔

اگر میری اُمت میں سے کوئی شخص پوری دنیا کا مالک بن جائے اور اس پر الحمدللہ کہہ دے تو اس کا الحمدللہ کہنا پوری دنیا سے بہتر ہے۔

ابوعبداللہ (حکیم ترمذی) کہتے ہیں: میرے خیال میں اس ارشاد نبوی کا معنی یہ ہے کہ اگر اس شخص کو پوری دنیا دی گئی اور پھر الحمدللہ کہنے کی توفیق بخشی گئی تو یہ کلمہ اس کے حق میں پوری دنیا سے بہتر ہے کیوں کہ دنیا فانی ہے اور کلمہ باقی رہنے والا ہے۔ اور یہ ہمیشہ رہنے والی نیکیوں میں سے ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا﴾ [الکهف۱۸: ۴۶] (اور نیکیاں جو باقی رہنے والی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں)۔

ایک روایت میں:

[۲۴۹] لكان ما أعطى أكثر مما أخذ۔ تو جو اس نے دیا وہ اس سے زیادہ شمار ہوگا جو اس نے لیا، ہے۔

یوں اس کلمہ "الحمدللہ" کو بندے کی طرف سے دینا شمار کیا گیا اور دنیا کو بندے کا اللہ تعالیٰ سے لینا شمار کیا گیا ہے۔ عام طور پر محاورے میں بھی اسی طرح کہا جاتا ہے کہ کلمہ بندے کی طرف سے ہے اور دنیا اللہ کی طرف سے، حالاں کہ درحقیقت یہ دونوں اللہ کی طرف سے ہیں، دنیا بھی اور کلمہ بھی۔ یہ اسی کی شان ہے کہ دنیا

[۲۴۷] سنن ابن ماجہؒ: كتاب الأدب، باب فضل الحامدين ۲: ۱۲۵۰

[۲۴۸] حکیم ترمذی: نوادر الأصول، الأصل الحادی والسبعون والمائة ۲: ۱۰، علامہ سیوطی نے جامع صغیر، حدیث نمبر ۷۰۹۸، میں اسے ابن عساکر کی طرف منسوب کرکے ضعیف کی علامت لگائی ہے، فیض القدیر، حرف اللام، حدیث ۷۳۹۸

[۲۴۹] شعب الإيمان: الثالث والثلاثون من شعب الإيمان وهو باب في تعديد نعم الله عزوجل ومايجب من شكرها ۴: ۹۸، ۹۹

بندے کو دی اور اسے غنی کر دیا۔ پھر اس کو یہ کلمہ کہنے کی توفیق دے کر آخرت میں عزت بخش دی۔ امام ابن ماجہؒ حضرت ابن عمرؓ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

[۲۵۰] أنّ عبدًا من عبادِاللّٰهِ قال يا ربّ لكَ الْحَمْدُ كمَا ينبغِي لِجَلَالِ وجهكَ و عَظِيمِ سُلطانِكَ فَعَضَلتُ بِالْمَلَكَين فلَمْ يَدْرِيَا كيف يَكْتُبَانِها فصعِدا إلى السماءِ وقالا: يَا ربَّنا إنَّ عبدَكَ قد قالَ مقالَةً لا نَدرِي كيفَ نَكتُبُها، قال عزو جل۔ و هو أعلم بمَا قالَ عبدُه۔ ماذا قال عَبْدِي؟ قالا: يا ربِّ إنهٗ قد قالَ: يا رَبِّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا يَنبَغِي لِجَلَالِ وَجْهِكَ وَعَظِيمِ سُلْطَانِكَ، فقالَ اللّٰه لهُمَا: اُكْتُبَاهَا كَمَاقَالَ عَبدِي حتّٰى يَلقاني فَأجزِيهِ بِهَا

جب اللہ کا کوئی بندہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! تیری ایسی تعریف کرتا ہوں جیسی تیری ذات عالی اور عظیم قدرت کے شایان شان ہے تو لکھنے والے فرشتے مشکل میں پڑ جاتے ہیں اور سمجھ نہیں پاتے کہ اس حمد کو کیسے لکھیں۔ چناں چہ آسمان پر جا کر عرض کرتے ہیں: اے ہمارے رب! تیرے بندے نے ایسی عظیم بات کہی ہے جس کے بارے میں ہم سمجھ نہیں پا رہے کہ اسے کیسے لکھیں۔ اللہ عزوجل باوجودیکہ وہی بہتر جانتے ہیں کہ بندے نے کیا کہا پھر بھی پوچھتے ہیں: اس بندے نے کیا کہا؟ فرشتے عرض کرتے ہیں تیرے بندے نے کہا ہے: ''لَکَ الْحَمْدُ کَمَایَنبَغِي لِجَلَالِ وَجْهِکَ وَعَظِیمِ سُلْطَانِکَ'' یعنی تیری ایسی تعریف کرتا ہوں جیسی تیری ذات عالی اور عظیم قدرت کے شایان شان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کو فرماتے ہیں تم ان الفاظ کو اسی طرح لکھ دو جس طرح میرے بندے نے کہے ہیں، جب وہ مجھ سے ملاقات کرے گا تو میں خود اس کو بدلہ دوں گا۔

اس حدیث میں لفظ ''عَضَلَتْ'' کے بارے میں اہل لغت کہتے ہیں ''أعضَلَ الأمرُ'' کا معنی ہے معاملہ سخت اور مشکل ہوگیا۔ اسی سے المعضّلات ضاد کی شد، کے ساتھ آتا ہے جس کا معنی سختیاں ہے۔ اسی طرح ''عَضَّلَتِ المراۃُ والشّاۃ'' اس وقت کہتے ہیں جب کسی عورت یا بکری کا پیدا ہونے والا بچہ اٹک جائے اور اس کی ولادت میں مشکل پیش آ رہی ہو۔ غالباً اسی اسلوب کو مدِنظر رکھتے ہوئے باء کے صلہ کے بغیر أعضلت الملکین یا عضّلت الملکین کہا جاتا ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[۱] سنن ابن ماجہؒ: کتاب الأدب ،باب فضل الحامدین ۲:۱۲۴۹

امام مسلمؒ نے حضرت ابو مالک اشعریؓ (۱) سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۵۱] الطّھور شطر الإیمان وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ تَملأُ الْمِیزَان، وَسُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُلِلّٰهِ تَملآنِ أو تملأ مابَین السَّمَاءِ وَالأَرْضِ۔

پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے، اور الحمدللہ میزان کو بھرنے والا ہے اور سبحان اللہ والحمدللہ دونوں آسمان و زمین کے درمیان کو بھرنے والے ہیں۔

دوسری بحث: اَلْحَمدُلِلّٰه اور لا إله إلا اللّٰه کی فضیلت کا موازنہ

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ بندے کا ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ کہنا افضل ہے یا'' لا إله إلا اللّٰه''۔ ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ افضل ہے کیوں کہ اس میں حمد کے ساتھ توحید کا مفہوم بھی شامل ہے جو'' لا إله إلا اللّٰه''میں ہے یعنی اس میں توحید اور حمد دونوں ہیں جب کہ'' لا إله إلا اللّٰه''میں صرف توحید ہے۔ دوسرے طبقہ کا خیال ہے کہ'' لا إله إلا اللّٰه'' افضل ہے کیوں کہ یہ کفر و شرک کو ختم کرتا ہے اور اسی کی خاطر لوگ جنگ کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۵۲] أمِرتُ أنْ أقاتِلَ النَّاسَ حَتیَّ یَقولُوا لَا إلٰهَ إلّا اللّٰه۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار نہ کرلیں۔

یہ رائے ابن عطیہ نے اختیار کی ہے اور کہا ہے کہ اس کا ماخذ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے:

[۲۵۳] أفضلَ ماقلتُ أنَا وَالنبیّونَ مِن قَبْلي لَا إلٰه إلّا اللّٰهُ وَحْدَه' لَاشَریكَ لَه۔

---

[۲۵۱] صحیح مسلم: کتاب الطھارۃ، باب فضل الوضوء ۱:۲۰۳،سنن دارمی: کتاب الصلاۃ والطھارۃ، باب ماجاء فی الطھور ۱:۱۳۲

[۲۵۲] صحیح بخاری: کتاب الإیمان، باب فَإنْ تَابُوا وَاَقَامُو الصلاۃَ وَآتُوا الزکوۃ...... ۱:۱۷

[۲۵۳] مؤطاامام مالکؒ:کتاب القرآن، باب ماجاء في الدعاء ۱:۲۱۴،مصنف عبدالرزاقؒ:کتاب المناسک ،باب فضل أیام العشر والتعریف في الأمصار ۴:۳۷۸،جامع ترمذیؒ : کتاب الدعوات باب فی دعاء یوم عرفۃ ۵ :۵۷۲ میں ''خیر ماقلت''منقول ہے اوراس حدیث کو''حسن غریب'' کہا ہے ۔انہوں نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اس کی سند میں حماد بن ابی حمید علماء حدیث کے نزدیک قوی نہیں ہے۔

۱۔ حافظ ابن حجرؒ نے تین صحابہ کرامؓ کی کنیت ابومالک الاشعری ذکر کی ہے ، ابن عبدالبرؒ نے ان کے مختلف نام کعب بن مالک، کعب بن عاصم، عبید اور عمرو ذکر کئے ہیں۔الإصابۃ ۴:۱۷۱، کنیت ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، الإستیعاب بھامش الإصابۃ ۴:۱۷۵، ملا علی قاریؒ نے انہیں کعب بن عاصمؓ ہی لکھا ہے ۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں وفات پائی ۔ المرقاۃ: کتاب الطھارۃ، الفصل الأول ۲:۵

میں نے اور مجھ سے پہلے انبیاء نے سب سے افضل بات جو کہی وہ یہ ہے:'' لا إلٰہ إلا اللّٰہ وَحدَہٗ لا شَریکَ لہٗ ''(اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔وہ اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں)

تیسری بحث: افعال کا خالق کون ہے؟

مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بناء پر اس کی تعریف کی جاتی ہے اور ان نعمتوں میں سے ایک ایمان بھی ہے۔لہذا ثابت ہوا کہ ایمان بھی دیگر نعمتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کا فعل اور اسی کی مخلوق ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ میں اس کی دلیل موجود ہے۔ جب اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کو پالنے والا ہے تو سارے جہاں اس کی مخلوق ہیں ۔ انہی میں سے ایمان بھی ہے۔ اس سے فرقہ قدریہ [1] کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ایمان انسان کا اپنا پیدا کیا ہوا ہے ۔ اس کی تفصیل آئندہ إن شاء اللہ آئے گی۔

چوتھی بحث: حمد کی لغوی تحقیق

کلامِ عرب میں ''اَلْحَمْدُ'' کا معنی پوری کی پوری تعریف ہے اس میں الف اور لام استغراق جنس (یعنی ہر طرح کی حمد کے احاطہ) کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے پوری کی پوری حمد کا مستحق ہے کیوں کہ وہ حسین ترین ناموں اور بلند ترین صفات کا مالک ہے۔ایک شاعر نے اپنے درج ذیل شعر میں حمد کی جمع قِلّت ذکر کی ہے:

وأبلجَ محمودَ الثّناءِ خصّصتُہ بِأفضل أقوالي وأفضلِ اَحْمُدِي

وہ صبح کی طرح روشن اور خوب تعریف کا مستحق ہے ۔میں نے اپنے بہترین کلام اوراعلی ترین تعریفوں کے لئے اسی کو منتخب کیا ہے۔

حمد، ذم کا متضاد ہے۔ کہا جاتا ہے:حمدتُ الرجلَ، میں نے اس آدمی کی تعریف کی۔ جس کی تعریف کی جائے اس کو حمید بھی کہہ سکتے ہیں اور محمود بھی۔اس کا مصدر تحمید، حمد سے زیادہ بلیغ ہے اور حمد شکر سے زیادہ وسیع معنی رکھتا ہے۔ مُحَمَّد وہ ہوتا ہے جس میں قابل تعریف خصائل کثرت سے پائے جاتے ہوں۔ شاعر کہتا ہے:

إلیَ المَاجِدِ القَرْمِ الجَوادِ المُحَمَّدِ [2]

اس سردار کی طرف جو بہت محترم، بڑا سخی اور خوبیوں والا ہے

۱۔ یہ لوگ تقدیر خداوندی کے منکر ہیں اور انسان کو اپنے ارادے اور افعال کا خالق مانتے ہیں۔محمد ابوزہرہ: تاریخ المذاہب ۱:۱۳۰

۲۔ یہ شعر اعشیٰ کا ہے اور اس کا پہلا مصرع یوں ہے : إلَیکَ أبَیتَ اللَّعنَ کانَ کلالُھَا لسان العرب (حمد)

یہی نام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رکھا گیا۔ اسی پر ایک شاعر کہتا ہے:

فَشقّ له عَنِ اسْمِهِ لِيُجِلّهٗ فَذُو العَرشِ مَحمُودٌ وَهذا مُحَمّدٌ

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اپنے نام سے نکالا ہے، چناں چہ عرش والا محمود ہے (جس کی تعریف کی جاتی ہے)اور یہ محمد (جس میں قابل تعریف خصائل کی کثرت ہے)

مَحْمَدَةٌ (تعریف)"مُذَمَّة"(مذمت) کا متضاد ہے۔ أَحْمَدتُهٗ کا معنی ہے: میں نے اسے قابل تعریف پایا چناں چہ کہا جاتا ہے:"أَتَيْتُ مَوضِعَ كذَا فَاحْمَدْتُهٗ" یعنی میں فلاں جگہ پہنچا تو اسے قابل تعریف اور موافق پایا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جگہ رہائش اور خوراک وغیرہ کے لحاظ سے مجھے پسند آئی۔ هُمَزَة کے وزن پر حُمَدَة اس شخص کو کہتے ہیں جو چیزوں کی تعریف میں مبالغہ سے کام لے۔ میم پر زبر کے ساتھ "حَمَدَةُ النّارِ" آگ کے شعلوں کی آواز کو کہتے ہیں۔

پانچویں بحث: حمد اور شکر میں فرق

ابو جعفر طبری اور ابو العباس مبرد کا خیال ہے کہ حمد اور شکر دونوں کا ایک ہی معنی ہے لیکن یہ بات ٹھیک نہیں۔ ابو عبدالرحمٰن السلمی نے بھی اپنی کتاب "الحقائق" میں جعفر صادقؒ اور ابن عطاءؒ سے یہی نقل کیا ہے۔ ابن عطاء کہتے ہیں کہ "الحمد لِلّٰہ" کا معنی "الشکر لِلّٰہ" ہے۔ (یعنی اللہ کا شکر ہے) کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی ہمیں یہ کلمہ سکھا کر ہم پر احسان فرمایا، جس سے ہم اس کی حمد کرنے کے قابل ہوئے۔ امام طبری اپنے موقف کی دلیل میں کہتے ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰه شُكْراً (اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے) کہنے کے جواز سے معلوم ہوتا ہے کہ حمد اور شکر ایک ہی چیز ہیں۔ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ "الحمد لِلّٰہ شکراً" کہنے میں دلیل امام طبریؒ کے حق میں نہیں بلکہ ان کے خلاف جاتی ہے کیوں کہ یہاں حمد کو شکر کے ساتھ خاص کر کے اسے ایک نعمت قرار دیا گیا ہے (یعنی میں بطور شکر اللہ کی حمد کرتا ہوں)جب کہ حمد الگ چیز ہے جو کہ ایک نعمت ہے اور شکر الگ ہے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ شکر کا معنی حمد سے زیادہ وسعت رکھتا ہے کیوں کہ شکر زبان سے بھی ہوتا ہے، اعضاء و جوارح سے بھی اور دل سے بھی ادا کیا جاتا ہے جب کہ حمد صرف زبان سے کی جاتی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ حمد میں زیادہ وسعت ہے کیوں کہ اس میں شکر اور مدح دونوں کے معانی پائے جاتے ہیں اور یہ وسعت کی دلیل ہے کیوں کہ لفظ حمد شکر کی جگہ استعمال ہوتا ہے مگر شکر حمد کی جگہ استعمال نہیں ہوتا جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: "الحمد للّٰہ" ہر شاکر کا کلمہ ہے۔ اسی طرح جب حضرت آدم علیہ السلام کو چھینک آئی تو فرمایا: "الحمدللّٰہ"۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کو خود سکھایا: ﴿فَقُلِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی نَجّانَا مِنَ الْقَومِ الظّٰلِمِینَ﴾[المؤمنون۲۳: ۲۸] (تو کہہ دیجئے سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے ہمیں ظالم لوگوں سے نجات دی)۔قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول منقول ہے:﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی وَھَبَ لِی عَلَی الْکِبَرِ اِسْمَاعِیْلَ واِسْحَاقَ﴾[ابراھیم۱۴: ۳۹](سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے بڑھاپے میں مجھے اسماعیل اور اسحاق عطا فرمائے)۔حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے متعلق ارشاد ربانی ہے: ﴿وَقَالاَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِی فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیرٍ مِّنْ عِبَادِہِ الْمُؤمِنِینَ﴾[النمل۲۷: ۱۵](ان دونوں نے کہا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں اپنے بہت سے مومن بندوں پر فضیلت دی)۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے:﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَداً﴾[بني إسرائیل۱۷: ۱۱۱](اور کہہ دیجئے سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے کسی کو اپنا بیٹا نہیں بنایا)۔اسی طرح اہل جنت کہیں گے:﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾[فاطر۳۵: ۳۴](سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہم سے غم دور کر دیا)۔اور ﴿وَآخِرُ دَعوَاھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِینَ﴾[یونس۱۰: ۱۰] (اور ان کا آخری قول یہ ہوگا کہ سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے)۔اس سے ثابت ہوا کہ'' اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ''ہر شکر کرنے والے کا سپاسنامہ ہے۔

مؤلف کی رائے

میری رائے میں صحیح یہ ہے کہ حمد سے مراد ممدوح کی صفات کی بنا پر اس کی ایسی تعریف ہے جو اس کے کسی احسان کے بغیر کی جائے اور شکر سے مراد وہ تعریف ہے جو اس کے احسان کے بدلے میں کی جائے۔ اس فرق کی وجہ سے ہمارے علماء کہتے ہیں کہ حمد کے معنی میں شکر سے زیادہ وسعت ہے کیونکہ حمد کا اطلاق ثناء، تحمید اور شکر تینوں پر ہوتا ہے جب کہ شکر میں تخصیص ہے کیوں کہ وہ صرف بھلائی کرنے والے کے بدلے کے طور پر کیا جاتا ہے۔ اس طرح آیت کریمہ میں حمد کا معنی زیادہ وسیع ہوا کیونکہ اس میں شکر کے علاوہ دیگر معانی بھی شامل ہیں۔ لفظ حمد رضا اور خوشی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: بَلَوتُہُ فَحَمِدتُہُ" (میں نے اسے آزمایا تو اس کی کارکردگی سے خوش ہوا)۔ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿مَقَامًامَّحْمُوْدًا﴾[بني اسرائیل۱۷: ۷۹](پسندیدہ مقام) کا بھی یہی معنی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا:

[۲۵۴] أَحْمَدُ إِلَیکم غَسْلَ الإِحْلِیلِ۔ تم لوگوں کا شرمگاہ کو دھونا مجھے پسند ہے۔

---

[۲۵۴] یہ قول مجھے مرفوع حدیث میں نہیں ملا۔مصنف ابن ابی شیبۃ: کتاب الطھارات،باب من کان یحب أن یغسل ذکرہ وأن یغسل بعد البول۱:۱۷۳ میں یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔ علامہ زمخشری نے الفائق (حمد)۱:۳۱۴میں،ابن اثیر نے النھایۃ (حل)۱:۴۳۳ میں اور ابن منظورؒ نے لسان العرب (حمد)میں بھی اسی طرح کیا ہے۔

حضرت جعفر صادقؒ ارشاد باری تعالیٰ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ کے ضمن میں فرماتے ہیں: جس نے اللہ کی تعریف ان صفات سے کی جن سے اس نے خود کو موصوف کیا ہے تو اس نے تعریف کا حق ادا کیا کیوں کہ حمد، حاء، میم اور دال پر مشتمل ہے۔ اس کی حاء وحدانیت سے، میم ملک سے اور دال دیمومت (ہیشگی) سے ماخوذ ہے۔ جس نے اللہ کی تعریف وحدانیت، دیمومت ودوام اور ملک کی صفات کے ساتھ کی اسی نے کماحقہ اس کی تعریف کی۔ یہی الحمد للّٰہ کی حقیقت ہے۔ شقیق بن ابراہیم(۱) اس ارشاد باری تعالیٰ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ تعریف کے تین مراحل ہیں: پہلا یہ کہ جب اللہ تعالیٰ تمہیں کسی نعمت سے نوازیں تو تجھے پہچان ہو کہ یہ نعمت کس نے عطا کی ہے، دوسرا یہ کہ اس نے جو کچھ دیا تم اس پر راضی ہو اور تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جب تک اس نعمت کا اثر تمہارے جسم میں رہے تم اس مُنعِم ہستی کی نافرمانی نہ کرو۔ یہ تینوں حمد کی شرائط ہیں۔

چھٹی بحث: خود تعریفی

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ''الحمد'' کہہ کر اپنی تعریف خود فرمائی اور اپنی کتاب کا آغاز بھی اپنی تعریف ہی سے کیا حالاں کہ دوسروں کو اپنی تعریف خود کرنے سے منع فرمایا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى﴾ [النجم ۵۳: ۳۲] (اپنی پاکیزگی کا دعویٰ نہ کرو وہی بہتر جانتا ہے کہ کون متقی ہے)۔

حضرت مقداد(۲) ابن الاسود رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۵۵] أُحْثُوا فِی وُجُوهِ المدَّا حِیْنَ التُّرابَ۔ خوشامدیوں کے منہ میں مٹی ڈالو۔

اس کی مزید وضاحت اِن شاء اللہ سورۂ نساء میں آئے گی۔

یوں ارشاد باری تعالیٰ ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ کا مطلب یہ ہوا کہ میں نے مخلوق سے پہلے ازل

---

[۲۵۵] صحیح مسلم: كتاب الزهد والرقائق، باب عن المدح إذا كان فيه إفراط......۴: ۲۲۹۷، جامع ترمذی: كتاب الزهد، باب ماجاء في كراهية المدحة والمداحين ۴: ۵۹۹، سنن ابن ماجہ: كتاب الأدب، باب المدح ۲: ۱۲۳۲، مسند احمد: حديث المقداد بن الأسودؓ ۷: ۱۰

۱۔ ابوعلی شقیق بن ابراہیم بلخی (م ۱۹۴ھ) بڑے عالم اور زاہد تھے۔ تین سو شہروں کے مالک تھے مگر سب کچھ صدقہ کر دیا اور جب غزوہ کولان میں شہید ہوئے تو ان کے لئے کفن نہ تھا۔ صفة الصفوة ۴: ۱۰۶، لسان الميزان ۳: ۱۵۱

۲۔ ابوعمرو یا ابوالاسود مقداد بن عمرو بن ثعلبہ الکندی الزہری (م ۳۳ھ) ہے۔ سابقین اولین اور بدری صحابہ کرام میں سے ہیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں: انہیں مقداد بن اسود اس لئے کہا جاتا ہے کہ اسود بن عبد یغوث بن وہب بن عبد مناف بن زہرہ نے انہیں زمانہ جاہلیت میں اپنا بیٹا بنایا ہوا تھا۔ الاستيعاب على هامش الاصابة ۳: ۴۷۲، تهذيب التهذيب ۱۰: ۲۸۵

میں اپنی تعریف کی تو اس میں کوئی عیب نہ تھا، جب کہ مخلوق میری تعریف کرتی ہے تو اس میں مخلوق کی کمزوریاں شامل ہوتی ہیں۔ ہمارے علماء فرماتے ہیں: اسی لئے اللہ تعالیٰ یہ پسند نہیں فرماتے کہ مخلوق اپنی تعریف خود کرے کیوں کہ اسے کمال تو دیا نہیں گیا اور اس کمزوری کی وجہ سے جب وہ اپنی تعریف خود کرے گی تو اس کے پیش نظر کسی نفع کا لالچ یا کسی نقصان سے بچنے کی خواہش ضرور ہوگی جب کہ باری تعالیٰ ان کمزوریوں سے پاک ہیں۔
ایک رائے یہ ہے کہ جب اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اپنی حمد کا حق ادا کرنے سے قاصر پایا تو ازل میں اپنی تعریف خود کی اور بندوں کی کمزوری کو دیکھتے ہوئے ان سے یہ بوجھ اتار دیا۔ ذرا دیکھیے تو سہی سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے کس طرح فرمایا:
[۲۵۶] لا أُحصِي ثَناءً عَلَيكَ۔ مجھ میں تیری تعریف کا حق ادا کرنے کی طاقت نہیں۔

شاعر کہتا ہے:

إذا نحن أَثْنَينا عليكَ بِصالحٍ فأنت كمانُثْنِي وفَوقَ الّذي نُثْنِي

ہم جس قدر اچھے الفاظ میں آپ کی تعریف کریں، کوئی مبالغہ نہیں کیوں کہ آپ ان تعریفوں کے بھی اہل ہیں جو ہم نے کی ہیں اور اس سے کہیں زیادہ مزید تعریفوں کے بھی لائق ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل میں ہی جانتے تھے کہ بندوں پر ان کی نعمتیں اتنی زیادہ ہوں گی کہ وہ ان کے شکر کا حق ادا کرنے سے قاصر رہیں گے۔ اسی لئے ان کی طرف سے اپنی حمد خود بیان فرما دی تاکہ بندوں سے احسان کا بوجھ اتر جائے اور وہ نعمتوں سے خوب لطف اندوز ہوں۔

ساتویں بحث: ﴿اَلحَمْدُلِلّٰهِ﴾ کی لغوی تحقیق اور قراءات

قُرّاء سبعہ اور جمہور کا اجماع ہے کہ الحَمْدُ لِلّٰہ کی دال پر رفع (پیش) ہے البتہ سفیان بن عیینہ اور رؤبہ بن عجاج [1] سے دال کے نصب (زبر) کے ساتھ اَلْحَمدَلِلّٰہ منقول ہے اس صورت میں حمد کو مفعول مانا جائے گا اور اس سے پہلے فعل محذوف ہوگا۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿اَلحَمْدُ لِلّٰهِ﴾ مرفوع ہو تو یہ مبتداء اور خبر ہوں گے جب کہ خبر

---

[۲۵۶] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ ،باب مایقال في الرکوع والسجود ۱:۳۵۲۔ابوداودؒ، ترمذیؒ ، ابن ماجہؒ وغیرہ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

۱۔ ابوالجحاف رؤبۃ بن العجاج (عبداللہ) بن رؤبۃ التیمی البصری (م ۱۴۵ھ)۔ رجز گو شاعر تھے۔ ابن حبانؒ نے انہیں ثقات میں ذکر کیا ہے۔ امام نسائی اور ابن معین نے انہیں ضعیف کہا ہے ۔ تہذیب التہذیب ۳:۲۹۰

کے لئے ضروری ہے کہ کوئی فائدہ دے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں خبر کس بات کا فائدہ دیتی ہے؟ اس کا جواب سیبویہ کے الفاظ میں یہ ہے کہ الحمدللہ رفع کے ساتھ کہنے اور "حَمِدْتُ اللّٰہ حَمْدًا" (یعنی میں نے اللہ کی خوب تعریف کی) نصب کے ساتھ کہنے میں فرق یہ ہے کہ جو شخص الحمدُ کو مرفوع پڑھتا ہے وہ یہ خبر دیتا ہے کہ جو تعریف میں نے کی اور جو ساری مخلوق کرتی ہے سب کی سب اللہ کے لئے ہے۔ جو حَمدًا کو منصوب پڑھتا ہے وہ یہ خبر دیتا ہے کہ اس اکیلے نے جو تعریف کی وہ اللہ کے لئے ہے۔ سیبویہ کے علاوہ دیگر علماء فرماتے ہیں کہ اس میں بندہ اشارے کنائے میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے، اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتا ہے اور اس کی عظمت و کبریائی بیان کرتا ہے اور اس اسلوب میں سوال کا مفہوم پایا جاتا ہے نہ کہ خبر کا جیسا کہ حدیث مبارک میں ہے:

[۲۵۷] مَن شُغِلَ بِذِكْرِي عَنْ مَسْأَلَتِي أعطَيتهُ أفضَل ما أُعْطِي السَّائلين۔

جو شخص میرے ذکر میں مشغول رہنے کی وجہ سے مجھ سے کچھ مانگ نہیں سکتا میں اسے وہ کچھ دیتا ہوں جو مانگنے والوں میں سے کسی کو بہتر سے بہتر عطا کرتا ہوں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو تعلیم دینے کے لئے اپنی تعریف خود فرمائی۔ اس لحاظ سے معنی یہ ہوگا کہ تم یوں کہو "الحمدللہ"۔ امام طبری کہتے ہیں کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ ثناء ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اپنی تعریف فرمائی ہے اور اسی میں بندوں کو یہ حکم ہے کہ تم بھی اس کی تعریف کرو، گویا کہ باری تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا: "قُولُوا: اَلْحَمْدُلِلّٰہِ" (تم الحمدُ للّٰہ کہو) اسی طرح "اِیَّاکَ" بھی اصل میں "قُولُوا اِیَّاکَ" ہوگا۔ جیسا کہ عرب کلام میں وہاں حذف کرتے ہیں جہاں سیاق کلام سے معنی معلوم ہو جائے۔ شاعر کہتا ہے:

وَأعلمُ أنّنِي سأكُون رَمْسًا   إذَا سار النّواعجُ لَا يسِيرُ

فقالَ السائلُون لِمَنْ حَفرْتُم   فَقَالَ القائِلونَ لهُمُ وزيرٌ

میں جانتا ہوں کہ جب اونٹنیاں تیز بھاگ رہی ہوں گی تو میں قبر میں دفن ہو جاؤں گا اور چل نہ سکوں گا۔ اس وقت لوگ پوچھیں گے کہ تم نے کس کے لئے گڑھا کھودا ہے تو اسے جواب دینے والے کہیں گے کہ یہ ہمارا ہی ایک ساتھ ہے۔

---

[۲۵۷] "من شغله ذكري عن مسألتي......" کے الفاظ کے ساتھ یہ حدیث امام بیہقیؒ نے شعب الإيمان ،العاشر من شعب الإيمان ......، فصل في إدامة ذكر الله عزوجل ۱:۴۱۳،۴۱۴،الخامس والعشرين من شعب الإيمان ......، الوقوف يوم عرفة بعرفات و......۳:۴۶۶میں مختلف طرق سے نقل کی ہے جب کہ جامع ترمذیؒ : کتاب فضائل القرآن ،باب......۵:۱۸۴،مصنف عبدالرزاق: كتاب الصلاة ، باب التسبيح والقول وراء الصلاة ۲:۲۳۸ اورمسند بزار: مسند عمر بن الخطاب ، ماروى عمر بن محمد عن سالم عن أبيه عن عمر ۱:۲۴۷میں مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔

دوسرے شعر کے آخر میں اصل عبارت تو ''المَحْفُور لهُ وَزير'' ہے مگر سیاق سے معنی واضح ہو جانے کی وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔ یہ اسلوب کلامِ عرب میں کثرت سے پایا جاتا ہے۔ ابن ابی عبلہ سے دال کے ضمہ کی مناسبت سے لام پر بھی پیش لگا کر ''اَلْحَمْدُلُلّٰهِ'' منقول ہے تاکہ دونوں لفظوں میں مماثلت پیدا ہو جائے۔اسے تجانس لفظی کا نام دیا جاتا ہے اور اس کی مثالیں کلامِ عرب میں بہت ہیں۔ جیسا کہ ''اَجُوءُ کَ اور هُوَ مُنحدُر مِنَ الجبَلُ'' دال اور جیم کی پیش کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

إِضُربِ الساقينُ أُمُّكَ هَابِل[1]

تیری ماں تجھے گم کر دے دونوں پنڈلیوں پر ضرب لگاؤ۔

یہاں ہمزہ پر پیش کی وجہ سے نون پر بھی پیش آ گیا۔ اہل مکہ ''مُرُدِفِينَ'' کے راء کو میم کی مناسبت سے پیش کے ساتھ ''مُرُدِفِين'' پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ''مُقُتِلِينَ'' میں قاف پر پیش اور ''لأُمِّکَ'' میں لام کی مناسبت میں ہمزہ کے نیچے زیر لگا کر ''لِإِمِّکَ'' کہا جاتا ہے۔نعمان بن بشیر[2] کا ایک شعر ہے:

وَيلِ اِمِّهَا فِي هواء الجوّ طالبةً ولا كهذا الّذي فى الأرضِ مطلوب

اس کی ماں مر جائے وہ تو فضاؤں میں شکار تلاش کرتا ہے وہ اس کی طرح نہیں جس کے پیچھے زمین میں بھی شکاری لگے رہتے ہیں۔

یہاں اصل میں ''وَيلٌ لِأُمِّهَا'' تھا پہلے لام کو حذف کر دیا گیا تو دوسرے لام کے نیچے زیر کے بعد ہمزہ کا پیش ثقیل نظر آیا چناں چہ اسے لام کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ پھر میم کے نیچے زیر ہونے کی وجہ سے لام کو بھی اسی کے مطابق بنا دیا گیا تو ''وَيلِ اِمِّهَا'' ہوگیا۔ حسن بن ابی حسنؒ اور زید بن علیؒ [3] سے دال کی زیر کیساتھ ''الحَمدِلِلّٰه'' منقول ہے جس میں دال کی حرکت کو لام کی حرکت کے مطابق بنایا گیا ہے۔

آٹھویں بحث: ربّ کے معنی کی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ:﴿رَبِّ الْعَالَمِيْنَ﴾ کا معنی ہے وہ تمام جہانوں کا مالک ہے کسی چیز کے مالک کو اس کا

۱۔ لسان العرب (هبل)

۲۔ ابوعبداللہ نعمان بن بشیر الانصاری الخزرجی رضی اللہ عنہ (م ۶۶ھ) صاحب دیوان شاعر صحابی ہیں۔ ان کے والدین کریمین بھی شرف صحابیت سے بہرہ ور ہوئے۔ حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں کوفہ اور حمص کے گورنر رہے۔ تهذیب التهذیب، ۱۰: ۴۴۷

۳۔ ابوحسینؒ زیدؒ بن علیؒ بن الحسینؒ بن علیؓ بن ابی طالب (م ۱۲۲ھ) خانوادہ سادات کے چشم وچراغ تھے۔ فرقہ زیدیہ انہی کو اپنا امام مانتا ہے۔ انہیں بھی سیدنا حسینؓ کی طرح اہل کوفہ نے اپنے ہاں دعوت دے کر ۴۲ سال کی عمر میں شہید کیا۔ تهذیب التهذیب ۳: ۴۱۹

رب کہتے ہیں۔ صحاح میں ہے کہ ''ربّ'' اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ میں سے ہے اور جب یہ ذات باری کے علاوہ کسی اور کے لئے استعمال ہو تو اس میں کسی خاص چیز کی طرف اضافت ضروری ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں لفظ ربّ (بغیر اضافت) بادشاہ کے لئے بھی استعمال ہوتا تھا۔ جیسا کہ حارث بن حِلِّزَہ (۱) کہتا ہے:

وهو الرّبُّ والشهيدُ علىٰ يَو　　مِ الحِيَارَينِ وَالبلاءُ بَلاء (۲)

وہی بادشاہ ہے اور جب مقام حیاران پر لڑائی ہوئی تو وہ اس میں بھی موجود تھا۔ وہ دن بڑی آزمائش کا دن تھا۔

ربّ آقا کو بھی کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اُذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ﴾ [یوسف ۱۲: ۴۲] (یعنی اپنے آقا کے پاس میرا ذکر کرنا) میں ہے اور حدیث پاک میں ہے:

[۲۵۸] أنْ تَلِدَ الأَمَةُ رَبَّتَهَا۔ اور یہ کہ کنیز اپنی مالکن کو جنم دے گی۔

ہم نے اپنی کتاب التذکرۃ میں اس کی وضاحت کر دی ہے۔ ربّ کے معانی میں: اصلاح کرنے والا، کام کی تدبیر کرنے والا، طاقت کا مالک اور باقی رہنے والا سب شامل ہیں۔ ہروی اور دیگر علماءِ لغت کہتے ہیں کہ رب وہ ہے جو کسی چیز کی اصلاح اور تکمیل کرے۔ اسی سے کہا جاتا ہے: "رَبَّه' يَرُبُّهٗ فَهُوَ رَبٌّ لَهٗ" ۔کبھی رَبٌّ کی بجائے رَابٌّ بھی استعمال ہوتا ہے۔اسی مادہ سے "رَبَّانِيُّونَ" (رب والے) آیا ہے کیوں کہ ان لوگوں نے کتابوں کی ذمہ داری سنبھالی۔ حدیث شریف میں ہے:

[۲۵۹] هل لكَ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا عَلَيهِ۔

کیا تمہارا اس پر کوئی احسان ہے جسے تم نے محفوظ رکھا ہوا ہے۔

ربّ کا ایک معنی معبود بھی ہے جیسا کہ معنی میں شاعر کہتا ہے:

أرَبٌّ يَبُولُ الثّعلبانُ بِرأسِهِ　　لَقَدْ ذَلَّ مَنْ بالَتْ عَليهِ الثَّعَالِب (۳)

کیا وہ معبود ہوسکتا ہے جس کے سر میں لومڑیاں آکر پیشاب کر جائیں۔ وہ تو بہت حقیر ہوتا ہے جس پر لومڑیاں پیشاب کر جائیں۔

---

[۲۵۸] یہ حدیثِ جبریل کا ایک حصہ ہے۔ صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب بیان الایمان والإسلام والإحسان ۱: ۹۱

[۲۵۹] صحیح مسلم: کتاب البر والصلة، باب في الحب في الله ۸: ۵۲۱

۱۔ حارث بن حِلِّزَہ الیشکری (م ۵۰ ق ھ) زمانہ جاہلیت کا عراقی شاعر تھا، اس نے ایک معلقہ بھی مرتب کیا۔ معجم المؤلفین ۳: ۱۷۵

۲۔ لسان العرب (ربب)

۳۔ تفسیر ابن عطیہ ۱: ۱۰۱

نحاس کہتے ہیں کہ ''رَبَّہ'' کی بجائے اس کے حروف میں اضافہ کر کے ''رَبَّاہُ، رَبَّبَہُ اور رَبَّتَہُ بھی کہا جاتا ہے[1]۔ صحاح میں ہے: ''رَبَّ فُلَانٌ وَلَدَہ''' (فلاں نے اپنے بیٹے کی تربیت کی)۔ اسی معنی میں رَبَّبَہُ اور تَرَبَّبَہُ بھی بولا جاتا ہے۔ جس کی تربیت کی جائے اس کو ''مَرْبُوبٌ'' اور مُرَبّیَ کہتے ہیں[2]۔

نویں بحث: کیا ''ربّ'' اسم اعظم ہے؟

بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے ''ربّ'' ہی اسم اعظم ہے کیوں کہ دعا کرنے والے اکثر یہی نام لے کر پکارتے ہیں۔ قرآن میں اس بات پر غور کر لیجئے جیسا کہ سورۂ آل عمران کے آخر اور سورۂ ابراہیم وغیرہ میں ہے[3]۔ اس اسم مبارک کو اسم اعظم کہنے کی دوسری وجہ اس تعلق کا احساس و ادراک ہے جو پالنے والے اور پالے جانے والے کے درمیان ہوتا ہے جس میں پالنے والے کی مہربانی اور رحمت اور پالے جانے والے کا ہر حال میں اس کا محتاج ہونا وغیرہ شامل ہے۔

لفظ "ربّ" کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ ایک رائے کے مطابق یہ تربیت سے مشتق ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کے کام چلانے والے اور ان کی تربیت کرنے والے ہیں۔ اسی معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَرَبَائِبُكُمُ الّٰتِي فِي حُجُورِكُمْ﴾[النساء۴: ۲۳] (اور تمہاری بیوی کی بیٹیاں جنہوں نے تمہاری گودوں میں پرورش پائی ہے)۔ چناں چہ بیوی کی بیٹی "رَبِيبَة" کہلاتی ہے کیوں کہ شوہر اس کی تربیت کرتا ہے۔ اب اگر اس کا معنی مخلوق کا کام چلانے والا اور پالنے والا کیا جائے تو یہ فعل ربوبیت کی صفت بنے گی اور اگر معنی مالک اور آقا لیا جائے تو یہ باری تعالیٰ کی ذات کی صفت ہوگی۔

دسویں بحث: لفظ ربّ کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تخصیص

لفظ ربّ کے شروع میں الف لام لگ جائے تو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہو جاتا ہے کیوں یہ الف لام عہد کے لئے ہوتا ہے جسے حذف کر دیا جائے تو لفظ رب اللہ اور بندوں پر یکساں بولا جا سکتا ہے جیسے: "اَللّٰهُ رَبُّ العِبَادِ" (اللہ تعالیٰ بندوں کا مالک ہے) اور "زَيدٌرَبُّ الدَّارِ (زید گھر کا مالک ہے)۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ "رَبُّ الأرباب" ہے جو مالک اور مملوک سب کا مالک ہے، خالق ہے اور رزّاق ہے۔اس کے سوا ہر رب نہ خالق ہوتا

۱۔ اعراب القرآن ۱: ۱۲۱

۲۔ لسان العرب (ربب)

۳۔ آل عمران۳: ۱۹۱-۱۹۳، ابراہیم۱۴: ۴۰-۴۱

ہے نہ رازق۔اب جو مملوک ہے اسے محرومی کے بعد ایک نہ ایک دن مالک بنادیا جائے گا۔ اور جو کچھ کسی کی ملک میں دیا گیا وہ ایک دن چھن جانے والا ہے۔ ایک چیز اگر کسی کی ملک میں ہوتی ہے تو دوسری نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کی صفتِ ربوبیت میں یہ کمزوریاں نہیں پائی جاتیں۔ یہی خالق اور مخلوقات کی صفت میں فرق ہے۔

گیارہویں بحث: عالمین کی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اَلْعٰلَمِیْنَ﴾ کے معنی میں علماء سے مختلف آراء منقول ہیں۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ یہ عالم کی جمع ہے اور اللہ کے سوا ہر موجود شئے عالم ہے۔ لفظ عالَم کا کوئی واحد نہیں جیسا کہ "رھط" اور "قوم" وغیرہ کا واحد نہیں آتا۔ حسین بن فضل کہتے ہیں: ہر زمانے کے لوگ ایک عالم ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِیْنَ﴾[الشعراء۲۶: ۱۶۵] (کیا تم اہل عالم میں سے لڑکوں پر مائل ہوتے ہو) میں العالَمین سے مراد لوگ ہیں۔ اسی طرح عجاج کہتا ہے:

فَخَنْدِفٌ هَامَةُ هٰذَا العَالَمِ (۱)

لوگوں میں آوارہ ترین خندف قبیلہ ہے۔

اور جریر بن خطفی نے کاایک شعر ہے:

تَنَصَّفُهُ البَرِيَّةُ وهُو سامٍ ويُضَحّي العالَمُونَ له' عِيالاَ

اس سے لوگ انصاف طلب کرتے ہیں۔ وہ تو موت ہے جس کے لئے لوگ اپنی اولاد قربان کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: العالَمین سے مراد جنات اور انسان ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا﴾[الفرقان۲۵: ۱] (تا کہ وہ سارے دنیا جہان والوں کے لئے ڈرانے والا ہو)۔ چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جانوروں کو ڈرانے والے بن کر نہیں آئے (صرف جن و انس کی طرف مبعوث ہوئے)۔ فراء اور ابوعبیدہ کے نزدیک عالَم ذوی العقول کو کہتے ہیں اور وہ چار جنسیں ہیں: انسان، جنات، فرشتے اور شیاطین۔ عالَم کا اطلاق چوپائیوں پر نہیں ہوتا کیوں کہ "اَلْعالَمِیْنَ" وہ جمع ہے جو صرف ذوی العقول کے لئے آتی ہے۔ اَعشیٰ کہتا ہے:

مَا إنْ سَمِعْتُ بِمِثْلِهِم فِي العَالَمِينَا

میں نے نہیں سنا، کہ ان جیسا بھی لوگوں میں کوئی ہے۔

۱۔ تفسیر الماوردي ۱: ۵۴

زید بن اسلمؒ کہتے ہیں: عالَم کا اطلاق ان مخلوقات پر ہوتا ہے جن کو رزق دیا جاتا ہے۔ ابوعمرو بن علاء کہتے ہیں: تمام ذی روح چیزیں عالَم ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے نزدیک زمین پر چلنے والا ہر ذی روح عالم ہے[۱]۔ وہب بن منبہؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا کئے ہیں جن میں سے ایک دنیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں: مشرق سے مغرب تک دنیا ایک عالم ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے چالیس ہزار عالم پیدا کئے ہیں۔ مقاتلؒ کہتے ہیں۔ کُل اسّی ہزار عالم ہیں جن میں سے چالیس ہزار خشکی میں اور چالیس ہزار سمندر میں ہیں۔ ربیع بن انس[۲] نے ابوالعالیہؒ سے نقل کیا ہے کہ جنات الگ عالم ہیں اور انسان الگ۔ ان کے علاوہ زمین کے چار گوشے ہیں جن میں سے ہر گوشے میں پندرہ سو عالم ہیں اور ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے(۳)۔

مؤلف کی رائے

میرے نزدیک ان سب میں پہلا قول صحیح ترین ہے کیوں کہ اس میں ہر مخلوق اور ہر وجود شامل ہے۔ اس کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ. قَالَ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَابَيْنَهُمَا﴾ [الشعراء۲۶: ۲۳] (فرعون نے کہا: رب العالمین کیا ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا: آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے ان سب کا رب)۔ یہ لفظ عَلَم اور علامت سے ماخوذ ہے اور اپنے پیدا کرنے والے پر دلالت کرتا ہے[۴]۔ زجاجؒ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں جتنی مخلوقات پیدا کی ہیں عالَم کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے۔ خلیل کہتے ہیں کہ عَلَمٌ، عَلَامَةٌ اور مَعْلَمٌ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے وجود پر دلالت کرے۔ اسی طرح عَالَم اپنے پیدا کرنے والے اور نظام چلانے والے کی موجودگی پر دلالت کرتا ہے اور یہ ایک واضح بات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جنید بغدادیؒ[۵] کے سامنے ایک آدمی نے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا تو انہوں نے فرمایا: پورا جملہ کہو جس طرح باری

۱۔ تفسیر الطبري ۱: ۴۸

۲۔ ربیع بن انس البکری الحنفی البصری الخراسانی (م ۱۴۰ھ) تابعی ہیں۔ابن حبانؒ کہتے ہیں: لوگ ان کی حدیث سے بچتے ہی تھے۔ عجلیؒ اور ابو حاتمؒ نے انہیں صدوق کہا ہے۔ تهذیب التهذیب ۳: ۲۳۸

۳۔ تفسیر الطبري ۱: ۴۹، تفسیر السمرقندي ۱: ۸۰

۴۔ تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۰۳

۵۔ ابوالقاسم جنید بن محمد القواریری الخزار (م ۲۹۷ھ) کی پیدائش اور پرورش بغداد میں ہوئی، ۲۰ سال کی عمر میں انہوں نے فتویٰ دینا شروع کر دیا۔آپؒ کے اساتذہ میں ابوثورؒ، شافعیؒ اور سری سقطیؒ شامل ہیں۔ صفة الصفوة ۱: ۲۵۱، جمهرة الاولياء ۲: ۱۴۹

تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: ﴿اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾۔ اس نے عرض کیا عالَمین کون ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا ذکر کیا جائے؟ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اے بھائی! تم پورا ہی کہو کیوں کہ جب حادث کو قدیم کے ساتھ ملایا جائے تو اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔

بارہویں بحث: لفظ ''ربّ'' کا اعراب

ربّ کو مرفوع اور منصوب دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔اسے منصوب پڑھیں تو بطور مفعول ہوگا اور مرفوع پڑھیں تو یہ الگ جملہ ہوگا جس کی عبارت ھُو ربُّ العَالَمِین بنے گی۔

تیرہویں بحث: صفت ربّ العٰلَمِین کے بعد الرّحمٰن الرحیم لانے میں حکمت

اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی صفت ﴿رَبِّ الْعَالَمِیْنَ﴾ ذکر فرمانے کے بعد ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کا ذکر اس لئے فرمایا کہ ﴿رَبِّ الْعَالَمِینَ﴾ میں ملکیت و ربوبیت کا ذکر سن کر ایک طرح کا خوف پیدا ہوتا ہے جب کہ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ میں اس خوف کو کم کرنے اور رغبت دلانے کا پہلو نمایاں ہیں، یہاں ان دونوں صفات کو یکجا فرما دیا تاکہ اطاعت کا شوق پیدا کرنے اور نافرمانی سے بچنے میں بہتر معاون ثابت ہو۔ یہی اسلوب درج ذیل ارشادات باری تعالیٰ میں بھی اختیار کیا گیا: ﴿نَبِّیءْ عِبَادِیْ أَنِّی أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِیْمُ وَأَنَّ عَذَابِی هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴾[الحجر ۱۵: ۴۹-۵۰] (میرے بندوں کو خبر کر دیجئے کہ میں یقیناً بڑا مغفرت والا ہوں، بڑا رحمت والا ہوں اور یہ کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے)۔اورارشاد فرمایا: ﴿غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ﴾[غافر (المؤمن) ۴۰: ۳] (اللہ تعالیٰ گناہ معاف کرنے والا ہے، توبہ قبول کرنے والا ہے، سخت سزا دینے والا ہے اور بڑی طاقت والا ہے)۔صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۶۰] لَویَعلمُ المُؤمنُ ما عندَاللّٰهِ مِن العقُوبةِ ما طمِعَ بجنّتِهِ أحَدٌ، وَلو یَعلمُ الکافرُ مَا عِنْدَاللّٰهِ مِنَ الرَّحمةِ ماقنطَ مِن جَنَّتِهِ أحَدٌ۔

اگر مومن کو معلوم ہو جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سزا کس قدر سخت ہے تو کبھی کوئی شخص اس کی جنت کا شوق نہ رکھتا اور اگر کافر کو معلوم ہو جاتا کہ اللہ کی رحمت کس قدر وسیع ہے تو کبھی کوئی شخص اس کی جنت سے مایوس نہ ہوتا۔

---

[۲۶۰] صحیح مسلم: کتاب التوبۃ، باب فِی سَعَةِ رَحْمةِ اللّٰه تَعالیٰ وانّها سَبَقَتْ غَضَبَهُ ۹:۱۶۴

ان دو ناموں میں جو معانی و معارف ہیں ان کا بیان گزر چکا ہے اس لئے اعادہ کی ضرورت نہیں(۱)۔

چودہویں بحث: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ﴾ میں قراءات

ارشاد باری تعالیٰ:﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ میں محمد بن سمیفعؒ(۲) نے اسے نصب کے ساتھ (مَالِكَ) پڑھا ہے۔ اس میں چار صورتیں منقول ہیں: مالِكِ، مَلِكِ، لام کے سکون کے ساتھ مَلْكِ اور مَلِيكِ۔ شاعر کہتا ہے:

وأيامٍ لَنَا غُرٍّ طِوالٍ عَصَينَا المَلْكَ فِيهَا أنْ نَدِينَا(۳)

ہمارے وہ دن بڑے شاندار تھے جب ہم نے بادشاہ کی اطاعت کرنے سے بھی انکار کردیا تھا۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

فَاقْنَعْ بِمَاقَسَّمَ المَلِيكُ فَإِنَّمَا قَسَّمَ الخَلاَئِقَ بينَنَا عَلاَّمُهَا(۴)

اسی پر قناعت کرو جو بادشاہ نے ہماری قسمت میں لکھ دیا ہے کیوں کہ ہمارے درمیان مزاج اس ہستی نے تقسیم کئے ہیں جو ان کو سب سے زیادہ جاننے والی ہے۔

خلائق اس مزاج کو کہتے ہیں جو انسان کی جبلت میں رکھ دیا گیا ہو۔ امام نافع سے "مَلِكِ" کے کسرہ میں اشباع منقول ہے جس کی بناء پر اسے "مَلِكِي" پڑھا جاتا ہے اور حرکات میں اشباع لغات عرب میں ایک مستقل لہجہ ہے جسے مہدویؒ وغیرہ نے ذکر کیا ہے(۵)۔

پندرہویں بحث: مَلِک اور مالِک کی بلاغت کا موازنہ

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ مَلِک اور مَالِک میں سے کون سا لفظ زیادہ بلیغ ہے۔ امام ترمذیؒ نے ذکر کیا ہے کہ

۱۔ مقدمة تفسير القرطبي: بسم الله الرحمن الرحيم، بحث: ۲۲تا۲۸

۲۔ محمد بن سمیفع الیمانی (م ۹۰ھ) مشہور قاری ہیں لیکن ان سے منقول قراءات کی اکثر روایات منقطع السند اور شاذ ہیں۔حافظ ذہبی نے ان پر سخت جرح کی ہے۔ میزان الاعتدال ۳: ۵۷۵

۳۔ شاعر کا نام عمرو بن کلثوم التغلبی ہے:ابن النحاس: شرح المعلقات ۲:۸۹

۴۔ شاعر لبید بن ربیعہ ہے۔ابن النحاس: شرح المعلقات ص ۱۲۹

۵۔ پوری بحث تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۰۳-۱۰۴ اور إعراب القرآن نحاس ۱: ۱۲۱-۱۲۲ میں ہے۔

[۲۶۱] یہ دونوں قراءتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکرؓ وعمرؓ سے منقول ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ مَلِک میں مَالِک سے زیادہ وسعت اور بلاغت ہے کیوں کہ ہر مَلِک (بادشاہ) مَالِک ہوتا ہے لیکن ہر مَالِکُ مَلِک (بادشاہ) نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ مَلِک (بادشاہ) کا حکم مالِک کی ملکیت کے بارے میں اس پر نافذ ہوتا ہے جب کہ وہ اپنی ملکیت میں مَلِک (بادشاہ) کی سرپرستی کے بغیر تصرف نہیں کر سکتا۔ یہ ابوعبیدہ اور مبرد کی رائے ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ مالک زیادہ بلیغ ہے کیوں کہ وہ انسانوں کا مالک بھی ہوتا ہے اور دیگر چیزوں کا بھی، اس لئے اس کے اختیارات زیادہ بھی ہوتے ہیں اور وسیع بھی۔ قوانین جاری کرنا بھی اسی کے اختیار میں ہوتا ہے اور اس کے ملکیتی اختیارات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ابوعلی کہتے ہیں: ابوبکر بن سراج مَلِک والی قراءت کے قائلین میں سے بعض حضرات کا قول نقل کرتے ہیں کہ اللہ تبارک تعالیٰ نے ﴿رَبِّ الْعَالَمِين﴾ میں خودکو ہر چیز کا مالک قرار دے دیا تھا اب دوبارہ مَالِک پڑھنا اسی کا تکرار ہوگا جس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ابوعلیؒ کہتے ہیں: یہ کوئی دلیل نہیں کیوں کہ قرآنِ مجید میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں کہ پہلے لفظ عام ذکر فرمایا پھر اس کے بعد خاص لایا گیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ﴾ [الحشر ۵۹: ۲۴] (وہی اللہ تو پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھیک بنانے والا ہے، صورت بنانے والا ہے۔ اس کے اچھے اچھے نام ہیں)۔ اس میں "الخالق" (پیدا کرنے والا) میں مصور کا معنی بھی شامل ہے مگر اس کے بعد "المصوّر" کا خاص لفظ بھی ذکر فرما دیا کیوں کہ اس میں باری تعالیٰ کی کاریگری کی طرف متوجہ کرنے کا معنی زیادہ واضح ہے۔ اسی طرح ﴿اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ [البقرہ۲: ۳] (جو غیب پر ایمان لاتے ہیں) کے بعد ﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾ [البقرۃ۲: ۴] (اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں) ارشاد فرمایا۔ حالاں کہ غیب میں آخرت بھی شامل ہے لیکن اس کا دوبارہ ذکر فرما کر اس کی عظمت کو مزید واضح فرمایا گیا ہے اور اس پر ایمان لانے کی اہمیت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ کفار اور آخرت کے منکرین کی تردید بھی کی گئی ہے یہی مثال ﴿الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ کی ہے کہ پہلے "رحمٰن" کا ذکر فرمایا جو کہ عام ہے اور پھر "رحیم" فرمایا جو کہ مومنوں کے لئے خاص ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا﴾ [الأحزاب۳۳: ۴۳] (اور اللہ مومنوں پر مہربان ہے)۔

ابو حاتمؒ کہتے ہیں: اگر خالق کے حق میں استعمال کرنا مقصود ہو تو "مالِک" زیادہ بلیغ ہے اور مخلوق کے حق میں استعمال کرنا ہو تو "ملِک" زیادہ بلیغ ہے اور ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ملوک میں سے جو مالک ہوگا ضروری نہیں کہ وہ ملِک (بادشاہ) بھی ہو مگر جب یہی لفظ اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوگا تو وہ مالک بھی ہے اور

[۲۶۱] جامع ترمذی: کتاب القراءت، باب فی فاتحة الکتاب. تحفة الاحوذی ۸: ۲۰۷-۲۰۹۔ امام ترمذیؒ نے دونوں حدیثوں کو غریب کہا ہے اور ان کے راویوں پر بحث کرتے ہوئے ان میں سے بعض کو ضعیف قرار دیا ہے، تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۰۷

مِلک (بادشاہ) بھی۔ اسی قول کو قاضی ابوبکر ابن العربی نے بھی اختیار کیا ہے اور اس کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل تین صورتیں بیان فرمائی ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ خاص اور عام کی طرف اس کی اضافت کی جائے جیسے "مالک الدار والأرض والثوب" (گھر، زمین اور کپڑے کا مالک)۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کہا جائے مالک الملوک (بادشاہوں کا مالک)۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مالک کی اضافت کم ملکیت کی طرف بھی کی جا سکتی ہے اور زیادہ کی طرف بھی جیسے "مالک القلیل والکثیر"۔ ان دونوں صورتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کوئی فرق نہیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ جو معنی "مالک الملک" کہنے سے ادا ہوتا ہے اس کی بجائے "مَلِکُ الْمُلْک" نہیں کہا جا سکتا۔ ابن حصار اس کی وضاحت یوں کرتے ہیں کہ مالک ملکیت پر تو دلالت کرتا ہے مگر اس میں "مَلِک" کا معنی شامل نہیں جب کہ "مَلِک" کے مفہوم میں ملک اور ملکیت دونوں شامل ہیں، اس لئے (مخلوق کے حق میں) یہ زیادہ بلیغ ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مَلِک (بادشاہ) کے مفہوم میں کمال بھی شامل ہے جس کی بنا پر وہ اپنے ماتحتوں کا حاکم بننے کا مستحق ٹھہرا۔ مَلِک (بادشاہ) کی ایسی ہی صفات کا ذکر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے:﴿اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾ [البقرۃ۲: ۲۴۸] (کہ اسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں منتخب کر لیا ہے اور اسے علم وجسم دونوں میں کشادگی زیادہ دی ہے)۔اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۶۲] اَلإمَامَةُ فِي قُرَيشٍ۔ امامت قریش میں رہے گی۔

کیوں کہ قریش عرب میں افضل ترین تھے اور عرب عجمیوں سے زیادہ شان والے اور لفظ (مَلِک) میں اقتدار اور اختیار کا مفہوم بھی موجود ہے جو کہ منصب بادشاہی کے لئے بہت ضروری ہے۔ اگر وہ اقتدار و اختیار نہ رکھتا ہواور اس کا حکم نافذ نہ ہوسکتا ہوتو اس کا دشمن اسے زیر کر لے گا اور رعایا اسے حقیر سمجھ کر اس کی اطاعت سے انکار کر دے گی۔ مَلِک کے مفہوم میں سخت گرفت، حکم، وعدہ اور وعید کی صلاحیت بھی شامل ہے جیسا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس قول سے ظاہر ہے:﴿مَالِيَ لَآ أَرَى الْهُدْهُدَ أَمْ كَانَ مِنَ الْغَآئِبِيْنَ۔ لَأُعَذِّبَنَّهٗ عَذَابًا شَدِيْدًا﴾[النمل۲۷: ۲۱-۲۲](یعنی کیا بات ہے کہ مجھے ہد ہد نظر نہیں آ رہا کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا)۔کئی دیگر لطائف اور عمدہ معانی بھی مَلِک میں پائے جاتے ہیں جو مَالِک میں نہیں۔

---

[۲۶۲] صحیح بخاری: کتاب المناقب، باب مناقب قریش ۳:۱۲۸۹، ۱۲۹۰،کتاب الأحکام، باب الأمراء من قریش میں ۶:۲۶۱۱ میں "إنَّ هذا الأمر في قُرَيش" ۔ مستدرک حاکم : کتاب معرفة الصحابة رضی الله عنهم، باب ذکر فضائل قریش ۴:۸۵اور دیگر متعدد کتب حدیث میں: "الأئِمَّةُ مِنْ قُرَيش" ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں جن لوگوں نے ''مالِک'' کو زیادہ بلیغ کہا ہے وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ''مالِک'' میں ''مَلِک'' سے ایک حرف زیادہ ہے اس لئے اس کے پڑھنے والے کو دس نیکیاں زیادہ ملتی ہیں اس لحاظ سے بھی اس میں زیادہ بلاغت ہے۔ میری رائے میں یہ صیغے کے لحاظ سے ہے نہ کہ معانی کے لحاظ سے اور مَلِک والی قراءت بھی ثابت شدہ ہے اور اس میں وہ معانی پائے جاتے ہیں جو مالِک میں نہیں ہیں جیسا کہ پہلے ہم بیان کر چکے ہیں۔ واللہ اعلم۔

سولہویں بحث: مَلِک نام رکھنے کا حکم

ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ اپنا نام ملک رکھ لے یا ملک ہونے کا دعویٰ کرے۔ امام بخاریؒ اورامام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۶۳] يَقْبِضُ اللّٰهُ الأَرْضَ يَومَ القِيَامَةِ وَيَطْوِي السّماءَ بِيَمِينِهِ ثُمَّ يقول: أنَا المَلِكُ؟ أينَ مُلوكُ الأرض؟

قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اپنے دائیں ہاتھ میں زمین اور آسمان لے کر پکارے گا۔ میں ملک (بادشاہ) ہوں، آج زمین کے مُلوک (بادشاہ) کہاں ہیں؟

حضرت ابوہریرہؓ ہی سے دوسری حدیث منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۶۴] إنَّ أَخْنَعَ اسمٍ عِندَاللّٰهِ رُجلٌ تَسَمَّى مَلِكَ الأملَاكِ۔ زاد مسلمٌ:لَامالِكَ إلّا اللّٰه عزّوجَلّ۔

اللہ تبارک و تعالیٰ کے نزدیک سب سے برا نام ملکُ الأملاک (بادشاہوں کا بادشاہ) ہے۔ امام مسلم کی روایت میں مزید یہ الفاظ ہیں: اللہ عزوجل کے سوا کوئی مالک نہیں۔

---

[۲۶۳] صحیح مسلم: كتاب صفات المنافقين وأحكامهم، باب صفة القيامة والجنة والنار، شرح الأبى والسنوسي ۹:۲۲۹، صحیح بخاری: كتاب الرقاق، باب يقبض الله الأرض يوم القيامة. عمدۃ القاری ۲۳:۱۰۱

[۲۶۴] صحیح بخاری: كتاب الادب، باب أبغض الأسماء عندالله. عمدۃ القاری ۲۲: ۲۱۵، صحیح مسلم: كتاب الأدب، باب تحريم التسمي بملك الأملاک وملک الملوک ۳:۱۶۸۸،بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ۔

سفیانؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد شہنشاہ اور اس جیسے دوسرے نام ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ میں نے شیبانی[1] سے ''أَخْنَع'' کا معنی پوچھا تو انہوں نے فرمایا: جو سب سے کمتر اور حقیر ہو[2]۔ حضرت ابو ہریرہؓ ہی سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۶۵] أَغْيَظَ رجُلٍ علىَ اللّٰهِ يومَ القِيامَةِ وأخبَثه' رَجُلٌ كانَ يُسَمَّى مَلِكَ الأملاك

قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور خبیث آدمی وہ ہوگا جس کا نام ملک الاملاک (بادشاہوں کا بادشاہ) ہوگا کیوں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے سوا کوئی ملک (بادشاہ) نہیں۔

ابن حصارؒ کہتے ہیں: اسی طرح ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (روز جزاء کا مالک) اور ''مالک الملک'' (بادشاہی کا مالک) کے بارے میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہونا چاہیے کہ بالکل ''ملک الاملاک'' کی طرح ان کا اطلاق بھی کسی مخلوق پر کرنا حرام ہے۔ البتہ صرف مَالِک اور مَلِک کا اطلاق مخلوق پر کرنے کا بیان درج ذیل ہے۔

سترہویں بحث: مَالِک اور مَلِک کے الفاظ مخلوق کے لیے استعمال کرنا

اگر کسی کے اندر مَالِک یا مَلِک کی صفت پائی جاتی ہو تو اسے اس نام سے پکارنا جائز ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا﴾[البقرة۲: ۲۴۷](بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طالوت کو ملک (بادشاہ) مقرر کر دیا ہے)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۲۶۶] نَاسٌ مِن أمّتِي عُرِضُوا عَلَيَّ غزاةً فِي سبيلِ اللّٰه يَركَبُونَ ثبَجَ هذا البَحرِ ملوكًا علىَ الأسِرَّةِ أومِثلَ المُلُوكِ عَلىَ الأسِرَّةِ۔

مجھے میری امت کے کچھ مجاہد دکھائے گئے جو جہاد کے لئے سمندر میں ایسے سفر کریں گے گویا کہ وہ تختوں پر بیٹھے ہوئے بادشاہ ہیں۔

---

[۲۶۵] صحیح مسلم: كتاب الاداب، باب تحريم التسمي ملك الا، ذک ۱۶۸۸:۳

[۲۶۶] صحیح بخاری مع حاشیۃ السندی: كتاب الجهاد والسير، باب الدعاء بالجهاد ۱۳۵:۲

۱۔ ابو عمرو اسحاق بن مرار الشیبانی النحوی اللغوی الکوفی (م۲۰۶ھ)۔ امام احمد بن حنبلؒ ، ابو عبید قاسم بن سلامؒ وغیرہ کے استاذ ہیں۔ ابو عبید اور ابن الندیم وغیرہ نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تهذيب التهذيب۱۲: ۱۸۳

۲۔ مسند امام احمدؒ: مسند أبي هريره رضى الله عنه ۲:۴۹۲

اٹھارہویں بحث: قیامِ قیامت سے پہلے اس کی ملکیت کا مطلب

یہ سوال کہ باری تعالیٰ نے ﴿مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ کیسے فرما دیا حالاں کہ قیامت تو ابھی قائم ہوئی ہی نہیں؟ تو اس کا ایک جواب یہ ہے کہ "مَالِکٌ مَلَکَ يَمْلِکُ سے اسم فاعل کا صیغہ ہے اور اسم فاعل کی اضافت کلام عرب میں بعد میں آنے والی چیز کی طرف بھی ہوسکتی ہے اور وہ فعل مستقبل کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ عربوں کے نزدیک یہ اسلوب بالکل معقول اور صحیح ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: "ضَارِبُ زَيْدٍغَدًا" (یہ آدمی زید کو کل مارے گا) اسی طرح "هٰذا حَاجُّ بَيْتِ اللّٰهِ فِي العَامِ المُقْبِل" کا مطلب یہ ہے کہ یہ آدمی آئندہ سال حج ادا کرے گا۔ ان مثالوں سے معلوم ہوا کہ فعل کبھی فاعل سے صادر ہونے سے پہلے ہی اس کی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کا صدور مستقبل میں ہوگا۔ اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ "مٰلِكِ يَوْمِ الدِّين" بھی مستقبل کے معنی میں ہے، یعنی باری تعالیٰ روز جزاء کے مالک ہوں گے یا جب جزاء کا دن آئے گا تو مالک اللہ تعالیٰ ہی ہوں گے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ یہاں مالک کا معنی قدرت والا ہوگا یعنی وہ بدلے کے دن پر اور اس کو قائم کرنے پر قادر ہے کیوں کہ کسی چیز کا مالک وہی ہوسکتا ہے جو اس میں تصرف کرسکتا ہو اور اس پر قادر ہو۔ اللہ عزوجل تمام اشیاء کے مالک بھی ہیں اور اپنے ارادے کے مطابق ان میں تصرف کرنے والے بھی جن میں سے اس کے لئے کوئی چیز ناممکن نہیں۔ ابوالقاسم[1] زجاجی کہتے ہیں کہ پہلی توجیہ عربی زبان کے ساتھ زیادہ مناسب اور اس کے اسلوب سے قریب تر ہے۔

تیسری صورت: یہ سوال کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے خاص طور پر روز جزاء کا ذکر کیوں فرمایا جب کہ وہ تو ہر چیز کے مالک ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں تو فرعون، نمرود وغیرہ اور ان جیسے دوسرے اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بادشاہت کے دعوے کرتے تھے مگر بدلے کے دن اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بادشاہت کا دعوی دار کوئی نہ ہوگا اور ہر کوئی اس کے سامنے عاجز ہوگا۔ اس روز اللہ تعالیٰ پوچھے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ (آج بادشاہت کس کی ہے؟) اسی بناء پر ارشاد فرمایا: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ﴾[غافر (المومن) ۴۰: ۱۶] (اللہ کی جو یکتا اور غالب ہے) اسی بناء پر ارشاد فرمایا: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (اس دن اس کے بغیر نہ کوئی مالک ہوگا، نہ کوئی فیصلہ کرنے والا اور نہ ہی کوئی بدلہ دینے والا ہوگا)۔ اسی کی ذات پاک ہے اور اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

انیسویں بحث: دونوں صفات مَلِک اور مَالِک میں فرق

اگر اللہ تعالیٰ کی صفت مَلِک ذکر کی جائے تو یہ ذاتِ باری کی صفت ہے اور مَالِک کہا جائے تو یہ اس

۱۔ ابوقاسم یوسف بن عبداللہ الزجاجی الجرجانی (م ۴۱۵ھ) مشہور لغوی، ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ معجم المؤلفين- ۱: ۳۱۲

ذاتِ عالی کے فعل کی صفت ہوگی۔

بیسویں بحث: لفظ ''یوم'' کی تحقیق

لفظِ یوم کا اطلاق طلوع فجر سے غروب آفتاب تک کے وقت پر ہوتا ہے۔یہاں اسے مجازاً آغاز قیامت سے لے کر اس وقت تک کے لئے استعمال کیا گیا ہے جب جہنم والے جہنم میں اور جنت والے جنت میں پہنچ جائیں گے۔ اصل کا اطلاق دن کے کسی حصے پر بھی ہوتا ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ﴾ [المائدۃ۵: ۳](آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا)۔ یوم کی جمع أیام ہے جو دراصل ''أیوَامٌ''تھی جس میں ادغام کر کے ایام بنا دیا گیا۔کبھی شدت ظاہر کرنے کے لئے بھی لفظ یوم استعمال ہوتا ہے چناں چہ شدید ترین دن کے لئے ''یَومٌ أیوَمُ'' استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شدید ترین رات کو ''لَیلَۃٌ لَیلاَءُ'' کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے:

نِعْمَ أخُوالھَیجاءِ فِي الیومِ الیَمِي۔

اَلیَمِي ''یَومٌ'' سے مقلوب ہے، اس کی واؤ موخر کر کے میم کو پہلے لایا گیا یَمُوٌ (ہوگیا) پھر واؤ چوں کہ ایک طرف آ گئی تھی اس لئے اس کو یاء میں بدل دیا گیا جیسا کہ دَلْوٌکی جمع اَدْلِ بنائی جاتی ہے[1]۔

اکیسویں بحث: یہاں دین کا معنی

[۲۶۷] ''الدِّین''اعمال کے حساب اور بدلے کو کہتے ہیں۔حضرات ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ، ابن جریج، قتادہ اور دیگر کئی علماء سے یہی منقول ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی طرح نقل کیا گیا ہے۔

یہی مفہوم ارشادِ باری تعالیٰ کا ہے:﴿یَومَئِذٍ یُّوَفِّیْھِمُ اللّٰہُ دِیْنَھُمُ الْحَقَّ﴾[النور۲۴: ۲۵](اس دن اللہ

---

[۲۶۷] مرۃ الہمدانی نے حضرت عبداللہ بن مسعود اوردیگر متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ ﴿یَومِ الدِّین﴾یَومُ الحِسَابِ ہے۔متدرک حاکم: کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ الفاتحۃ ۲:۲۸۳۔امام حاکم کہتے ہیں:یہ حدیث امام مسلم کی شرط کے مطابق ہے،شعب الإیمان، التاسع عشر......وھو باب في تعظیم القرآن، ذکر فاتحۃ الکتاب ۲:۴۴۷۔ راوی کہتے ہیں کہ ﴿یَومِ الدِّین﴾ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یوم الحساب ہے۔

۱۔ لسان العرب (یوم) یہ شعر ابو الاخزر الحمانی کا ہے۔

تعالیٰ انہیں ان کا پورا پورا بدلہ دے دیں گے) کا ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ ان کا حساب چکا دیں گے۔ اسی طرح فرمایا:﴿اَلْیَوْمَ تُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ﴾[الغافر (المؤمن) ۴۰: ۱۷](اس دن ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا)۔نیز فرمایا:﴿اَلْیَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الجاثیة ۴۵: ۲۸](آج تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا)۔اورارشاد فرمایا:﴿أَ ئِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ﴾[الصّٰفّٰت ۳۷: ۵۳](کیا ہمیں بدلہ دیا جائے گا اور ہمارا محاسبہ بھی ہوگا)۔لبید کہتا ہے:

حَصَادُكَ يَوْمًا مَازَرَعْتَ وَإِنَّمَا يُدانُ الفَتَى يومًا كَمَا هُوَ دائِنٌ

آج وہی فصل کاٹو گے جو کاشت کی تھی، بے شک ہر آدمی ایک دن اپنے کئے کا بدلہ پاتا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

إذَا مَا رَمَونَا رَمَينَاهُمُ وَدِنَّاهُم مِثلَ مايُقرِضُونَا

جب انہوں نے ہمیں نشانہ بنایا تو ہم نے بھی انہیں نشانہ بنا لیا۔ اور جیسا انہوں نے ہم پر قرض چڑھایا ویسا ہم نے ان کا حساب چکا دیا۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:

وَاعلَم يقينًا أنَّ مُلكَكَ زائلٌ وَاعلمْ بِأنَّ كَما تَدينُ تُدَانُ

اور یقین رکھو کہ تمہاری بادشاہی ختم ہونے والی ہے۔ اور جان لو کہ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

علماءِ لغت کہتے ہیں:"دِنْتُهُ بِفِعلِهِ دَيْنًا" (میں نے اسے اس کے کئے کا بدلہ دیا) یہاں دَينًا کے دال پر زبر بھی پڑھتے ہیں اور زیر بھی[1]۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفت "دَیّان" (بدلہ دینے والا) بھی اسی سے مشتق ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

[۲۶۸] الكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ. دانش مند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہتا ہے۔

دین کا ایک معنی فیصلہ کرنا بھی ہے۔ یہی معنی حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اور طرفہ[2] نے بھی

---

[۲۶۸] جامع ترمذی: کتاب صفة القيامة والرقائق والورع، ۴: ۶۳۸، سنن ابن ماجہ: كتاب الزهد، باب ذكر الموت والإستعداد له ۲: ۱۴۲۳

۱۔ تفسیر ابن عطية ۱: ۱۱۲، لسان العرب (يوم)

۲۔ ابو عمرو طرفہ بن العبد بن سفیان البکری الوائلی (م ۶۰ ق ھ) زمانہ جاہلیت کا بحرینی شاعر ہے۔ بادشاہ عمرو بن ہند کے حاشیہ نشینوں میں رہا، پھر اسی کے حکم پر قتل کیا گیا۔ معجم المؤلفین ۵: ۴۰

اپنے شعر میں یہی معنی مراد لیا ہے:

لَعَمْرُكَ ماکانَتْ حَمُولَةُ مَعْبَدٍ عَلَى جُدِّهَا حَرْبًا لِدِينِكَ مِنْ مُضَر

تیری زندگی کی قسم! قبیلہ معبد نے جب سے بنو مضر سے جنگ کا فیصلہ کیا ہے ان کی اونٹنیاں سبزہ زار میں کنویں کے کنارے نہیں چریں۔

یہ تینوں معانی ایک دوسرے کے قریب قریب ہیں۔ ''دین'' کا ایک معنی اطاعت بھی ہے جیسا کہ عمرو بن کلثوم [1] نے کہا ہے:

وَأَيَّامٍ لنا غُرٍّ طوالٍ عَصَيْنَا المَلِكَ فِيها أَنْ نَدِينَا [2]

ہماری زندگی کے وہ دن بڑے لمبے اور شاندار تھے جب ہم نے بادشاہ کی اطاعت سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اس لحاظ سے اس لفظ کو لفظ مشترک (ذومعانی) کہہ سکتے ہیں۔ اس کی مزید وضاحت درج ذیل ہے:

بائیسویں بحث: دین کے معانی کی مزید تحقیق

ثعلب [3] کہتے ہیں: دَانَ کا ایک معنی اطاعت کرنا اور دوسرا نافرمانی کرنا ہے۔ اسی طرح ایک معنی عزت والا ہونا اور دوسرا ذلیل ہونا ہے۔ ایک اور معنی غلبہ حاصل کرنا بھی منقول ہے۔ اس طرح یہ لفظ اضداد میں سے ہے (یعنی باہم متضاد معانی پر دلالت کرتا ہے)۔ لفظ دین کا اطلاق عادت اور حالت پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ ایک شاعر نے کہا ہے:

لَدِينِكَ مِن أُمِّ الحُويرِثِ قَبلَهَا

جیسے تمہاری حالت اس سے پہلے اُم الحویرث کے ساتھ تھی۔

مُثَقِّب [4] نے اپنی اونٹنی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

۱۔ ابو عباد عمرو بن کلثوم بن عمرو تغلبی (م تقریباً ۴۰ ق ھ) جاہلی شاعر ہے۔ شام، عراق، نجد وغیرہ مختلف علاقوں میں گھومتا رہا۔ بہت بہادر تھا۔ بادشاہ عمرو بن ہند کو اسی نے قتل کیا۔ اس کا معلقہ بھی مشہور ہے۔ معجم المؤلفین ۸: ۱۱

۲۔ لسان العرب (دین)

۳۔ ابوالعباس احمد بن یحییٰ الشیبانی الکوفی المعروف ثعلب (م ۲۹۱ھ) مشہور نحوی، لغوی اور ادیب ہیں۔ بغداد میں وفات پائی اور کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ معجم المؤلفین ۲: ۲۰۳

۴۔ عائذ بن محصن بن ثعلبہ المعروف مُثَقِّب عبدی ہے (م تقریباً ۳۵ ق ھ) بنو عبدالقیس کا مشہور جاہلی شاعر ہے۔ عمرو بن ہند اور نعمان بن منذر دونوں بادشاہوں کی مدح کرتا تھا۔ اس کا اصل وطن عراق تھا۔ معجم المؤلفین ۵: ۵۵، لسان العرب (دین)

تَقُولُ إذا دَرَأْتُ لهَا وَضِينِي أهذَا دِينُه' أبَدًا و دِينِي

جب میں اپنی اونٹنی پر ہودہ کا تنگ کسنے لگتا ہوں تو کہتی ہے کیا اس کا اور میرا حال اسی طرح رہے گا۔

''دِین'' کا معنی کسی بادشاہ کی عمل داری والا علاقہ بھی ہے جیسا کہ ایک شعر میں ہے:

لَئِن حلَلْتَ بِجَوّ فِي بَنِي أسَدٍ فِي دِين عَمرو و حَالتْ بيننا فَدَكُ

اگر تم کبھی بنو اسد کے مقام جو میں بادشاہ عمرو کی عمل داری میں آ کر ٹھہرو اور ہمارے تمہارے درمیان مقام فدک کا فاصلہ ہو۔

یہاں دین سے مراد عمرو کی عمل داری والا علاقہ ہے۔ دین کا ایک معنی بیماری بھی ہے جیسا کہ لحیانی نے کہا ہے:

يَا دينَ قَلبِكَ مِن سَلْمَى وَقَدْ دِينا[1]

سلمیٰ کی وجہ سے تمہارے دل کی بیماری پر افسوس ہے جسے بھی بیمار کر دیا گیا۔

تیئیسویں بحث: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کی تفسیر

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں صیغہ غائب سے مخاطب کی طرف التفات ہے کیوں کہ آغاز سورت سے یہاں تک غائب کے صیغے میں اللہ تعالیٰ کے متعلق خبر اور اس کی تعریف کا بیان تھا۔ یہی اسلوب اس ارشاد باری تعالیٰ میں ہے: ﴿وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا﴾ (ان کا پروردگار انہیں پاکیزہ مشروب پینے کو دے گا) صیغہ غائب میں یہ فرمانے کے بعد خطاب کی طرف التفات کرتے ہوئے فرمایا: ﴿إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً﴾ [الدھر ۷۶: ۲۱-۲۲] (بے شک یہ تمہارا بدلہ ہے)۔ پھر اسی اسلوب میں اس مثال کے برعکس ارشاد فرمایا: ﴿حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَ جَرَيْنَ بِهِمْ﴾ [یونس: ۲۲] (چناں چہ جب تم کشتی میں سوار ہوتے ہو اور وہ کشتیاں لوگوں کو لے کر چلتی ہیں)۔ اس کی مزید وضاحت ان شاء اللہ بعد میں آئے گی۔

﴿نَعْبُدُ﴾ کا معنی ہے ہم اطاعت کرتے ہیں۔ عبادت: اطاعت اور عاجزی ہی کو کہتے ہیں اور ''طریق مُعَبَّدٌ'' اس راستے کو کہتے ہیں جسے چلنے کے لئے برابر کیا گیا ہو۔ یہ ہروی کا قول ہے اور ایک مکلف آدمی جب ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہتا ہے تو وہ اس کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور حق عبادت کا اقرار ہوتا ہے جب کہ بہت سے لوگ اللہ کے سوا بتوں وغیرہ کو بھی پوجتے ہیں۔

۱۔ مکمل بحث اور شواہد تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۱۰-۱۱۱، لسان العرب (دین) میں موجود ہے۔

﴿اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ہم تجھ ہی سے مدد، تائید اور توفیق مانگتے ہیں۔ سُلَمی اپنی کتاب ''حقائق'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے محمد بن عبداللہ بن شاذان سے سنا اور انہوں نے ابوحفص فرغانی سے سنا کہ جس نے ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ کا اقرار کر لیا اس نے جبر و قدر کے (پیچیدہ) مسائل سے نجات پالی۔

چوبیسویں بحث: مفعول کی تقدیم اور فعل کی تاخیر میں حکمت

اگر کوئی کہے کہ فعل سے مفعول پہلے کیوں لایا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مفعول کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ایسا کیا گیا کیوں کہ عرب اہم چیز کو پہلے ذکر کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دیہاتی نے کسی کو گالی دی تو گالی کھانے والے نے کچھ پرواہ نہیں کی۔ اس پر گالی دینے والے نے کہا "اِیَّاکَ اَعۡنِی" یعنی میں تجھ ہی کو گالی دیتا ہوں۔ سننے والے نے جواب دیا: "وَعَنۡکَ اُعۡرِضُ" (میں تجھ سے منہ موڑتا ہوں) یہاں دونوں نے اہم بات کو پہلے ذکر کیا[1]۔ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ بندے اور بندگی کا ذکر معبود سے پہلے نہ ہو اسی لئے یہ جائز نہیں کہ کوئی "نَعۡبُدُکَ ونستعِینُکَ" یا "نَعبُدُ اِیَّاکَ وَنَسۡتَعِینُ اِیَّاکَ" کہے اور فعل کو کنایۂ مفعول پر مقدم کر لے بلکہ یہاں اسلوب قرآن کی پیروی ضروری ہے۔ عجاج کہتا ہے:

اِیَّاكَ اَدۡعُو فَتَقبَّلۡ مَلَقِي وَاغۡفِرۡ خَطَایایَ وَکَثِّرۡ وَرِقِي

آپ ہی سے دعا کرتا ہوں۔ میری عاجزی قبول کیجئے اور میرے رزق میں برکت دیجیے۔اس شعر میں کَثِّر کی جگہ ثَمِّرۡ کی روایت بھی ملتی ہے۔

ایک شاعر نے یہ بھی کہا ہے:

اِلیكَ حَتّٰی بَلَغۡتُ اِیَّاکا

میں تیری طرف روانہ رہا یہاں تک کہ تجھ تک پہنچ گیا۔

مگر یہ اسلوب شاذ ہے اور اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ ورق میں راء کے نیچے زیر ہو تو درہم کو اور راء پر زبر ہو تو مال کو کہتے ہیں[2]۔ اس ارشاد باری تعالیٰ میں اسم مفعول (اِیَّاکَ) دو دفعہ ذکر فرمایا تاکہ یہ وہم نہ ہو جائے کہ ہم عبادت تو تیری کرتے ہیں مگر مدد کسی اور سے مانگتے ہیں۔

۱۔ تفسیر ابن عطیۃ ۱:۱۱۴

۲۔ لسان العرب (ورق)

پچیسویں بحث: اِیَاکَ کی قراءت

جمہور علماء اور قُرّاء کے نزدیک ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ میں دونوں جگہ "اِیّاکَ" کی یاء پر شد ہے۔ عمرو بن فائد[1] نے ہمزہ کے نیچے زیر اور یاء کو بغیر شد کے پڑھا ہے۔ ان کے خیال میں زیر والے ہمزہ کے بعد یاء کو شد کے ساتھ پڑھنا ثقیل ہے جو کہ مناسب نہیں لیکن اس قراءت کو پسند نہیں کیا گیا کیوں کہ بغیر شد "اِیَاکَ" پڑھنے سے معنی یہ بنتا ہے کہ ہم تیرے سورج یا تیری روشنی کی عبادت کرتے ہیں۔ ہمزہ کے نیچے زیر کے ساتھ "اِیَاۃُ الشمس" سورج کی روشنی کو کہتے ہیں۔ کبھی کبھی اس کے ہمزہ پر زبر بھی آتا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

سَقَتۡهُ إِيَاةُالشّمسِ إلّا لِثاتِه　　　أُسِفَّ فَلَمۡ تَكۡدِمۡ عَلیهِ بِإِثۡمدِ

اس کا رنگ اس قدر سفید ہے کہ گویا سورج کی شعاعوں نے اسے سیراب کیا ہے۔ سوائے اس کے مسوڑوں کے جن پر شعاعیں اثر انداز نہ ہوئیں۔ چناں چہ وہ موتیوں کی اس لڑی کی طرح نظر آتے ہیں جس پر سرمہ چھڑک دیا گیا ہو۔

کبھی "إياةٌ" کی "ۃ" کو حذف کر کے "إيَاه" بھی کہا جاتا ہے۔ سورج کے گرد دائرے کو بھی "إياةٌ" کہتے ہیں جیسا کہ چاند کے گرد دائرے کو "هَالَةٌ" کہا جاتا ہے[2]۔

فضل رقاشی[3] نے اسے ہمزہ پر زبر کے ساتھ "أَيَاکَ" پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک مشہور لہجہ ہے۔ ابو سوار غنوی نے دونوں جگہ "هِيَّاکَ" پڑھا ہے۔ یہ بھی ایک لہجہ ہے[4]۔ شاعر کہتا ہے:

فَهِيّاكَ وَالأمۡرُ الّذِي إنۡ توَسَّعَتۡ　　　مَوَارِدُہ' ضاقَتۡ عَلَيۡكَ مَصَادِرُہ'

تم اس کام سے بچو جس میں آنے کے راستے اگر تمہارے لئے کشادہ ہوں تو نکلنے کے راستے تنگ ہو جائیں۔

چھبیسویں بحث: ﴿اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ﴾ میں قراءات اور صرفی نحوی تحقیق

اس جملے کا ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ﴾ پر عطف ہے۔ یحیی بن وثاب اور اعمش نے نون کی زیر کے ساتھ

۱۔ ابوعلی عمرو بن فائد الاسواری البصری (م بعد ۲۰۰ھ) کو دارقطنیؒ نے متروک، ابن المدینی نے ضعیف اور ابن عدی نے منکر الحدیث کہا ہے۔ عقیلی کہتے ہیں: قدریت اور اعتزال کی طرف مائل تھے۔ لسان المیزان ۴: ۳۷۲ ، الکامل فی الضعفاء ۵: ۱۷۹۷

۲۔ صحاح الجوہری ۱: ۱۲۷

۳۔ ابوالعباس فضل بن عبدالصمد بن فضل رقاشی بصری (م ۲۰۰ھ) فارسی الاصل بغدادی شاعر ہے۔ اعلام زرکلی ۵: ۳۵۶

۴۔ تفسیر ابن عطیۃ ۱: ۱۱۴

"نِسْتَعِينُ" پڑھا ہے تا کہ یہ اپنے اصل "اِستَعانَ" پر دلالت کرے۔ یہ بنوتمیم، اسد، قیس اور ربیعہ کا لہجہ ہے۔ اس میں نون کو اسی طرح زیر دی گئی ہے جس طرح ہمزۃ الوصل کو دی جاتی ہے۔﴿نَسْتَعِيْنُ﴾اصل میں "نَسْتَعْوِنُ" تھا۔ واؤ کی حرکت عین کو منتقل کر دی گئی اور واؤ کو یاء سے بدل دیا گیا۔ اس کا مصدر "اِسْتِعانَةٌ" ہے جو اصل میں "اِسْتِعْوَانٌ" تھا۔ واؤ کی حرکت عین کو منتقل کر دی گئی اور واؤ کو الف سے بدل دیا گیا۔ اب چوں کہ دو ساکن اکٹھے نہیں رہ سکتے تھے اس لئے دوسرے الف کو جو کہ زائد تھا حذف کر دیا گیا۔ ایک رائے یہ ہے کہ دوسرے الف کو نہیں بلکہ پہلے کو حذف کیا گیا کیوں کہ دوسرا معنی کی ادائیگی کے لئے ضروری تھا۔ پھر اس حذف شدہ الف کی جگہ لفظ کے آخر میں "ھاء" لگا دی گئی تو "اِستعانة" ہوگیا۔

ستائیسویں بحث:﴿اِهْدِنَاالصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ کی تفسیر

﴿ اِهْدِنَا﴾ میں دُعاء اور بندہ کے اپنے آقا کی طرف متوجہ ہونے کا اشارہ ہے جس کا معنی ہے کہ ہمیں سیدھی راہ دکھا اور اس کی طرف ہماری رہنمائی فرما (1)۔ اپنی ہدایت کا وہ راستہ ہمیں دکھا جو تیری محبت اور قرب تک پہنچانے والا ہو۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے دعا کی عظمت اور اس کے اندازکو اس سورت کا موضوع بنایا ہے۔ آدھی سورت حمد و ثنا پر مشتمل ہے اور باقی آدھی طلب حاجات پر ۔جو دعاء اس سورت میں سکھائی گئی ہے اسے اس دعاء سے افضل قرار دیا گیاہے جو بندہ خود مانگتا ہے کیوں کہ یہ رب العالمین کے کلام پر مشتمل ہے۔ اس طرح آپ رب العالمین سے ایسے الفاظ میں دعا کرتے ہیں جو اس کے اپنے ہیں اور ان سے خود ذاتِ باری تعالیٰ نے کلام فرمایا ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

[۲۶۹] لَيسَ شَيئٌ أكرَمُ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعاءِ

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعا سے بڑھ کر شرف و کرامت والی کوئی چیز نہیں۔

اس کا ایک معنی یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ فرائض کی ادائیگی ہمیں سنت کے مطابق کرنے کی توفیق عطا فرما۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿ اِهْدِنَا﴾کا اصل معنی مائل کرنا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿إِنَّاهُدْنَا إِلَيْكَ﴾[الأعراف۷: ۱۵۶](ہم تیری طرف مائل ہوئے)۔ حدیث پاک میں ہے:

[۲۶۹] جامع ترمذی: کتاب الدعوات، باب ماجاء فی فضل الدعاء، عن ابی ہریرۃؓ ، تحفة الاحوذی ۹: ۲۵۲

---

(1) پوری بحث تفسیر ابن عطیہ ۱: ۱۱۶ سے منقول ہے۔

[۲۷۰] خَرَجَ علیہِ السلام فِي مَرَضِهِ يَتَهَادَى بَينَ اثْنَين۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیماری کی حالت میں اس طرح باہر تشریف لائے کہ دو آدمیوں کے درمیان دائیں بائیں جھکتے جا رہے تھے۔

اسی سے لفظ "هَدِيَّةٌ" ہے جس کا معنی تحفہ ہے۔ اس کو بھی "هدية" اس لیے کہتے ہیں کہ وہ ایک کی ملکیت سے دوسرے کی ملکیت کی طرف جاتا ہے۔ قربانی کے لئے حرم کی طرف ہانکے جانے والے جانور کو هَدْی کہتے ہیں۔ اس طرح "اِهْدِنَا" کا معنی یہ ہوا کہ ہمارے دل حق کی طرف مائل فرما دے۔ فضیل بن عیاضؒ کہتے ہیں کہ "صِراط مُستقیم" سے مراد حج کا قصد ہے لیکن یہ ایک خاص مفہوم ہے اوراس لفظ کا عام معنی مراد لینا ہی بہتر ہے۔ محمد بن حنفیہ[1] فرماتے ہیں کہ "صِراط مستقیم" وہ دین ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ بندوں سے کسی اور دین کو قبول نہیں کرتا۔ عاصم احول نے ابو عالیہ سے نقل کیا ہے کہ صراط مستقیم سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے دونوں ساتھی (حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ) ہیں۔ عاصم (احول) کہتے ہیں کہ میں نے حسن سے اس قول کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ابو عالیہ نے سچ کہا اور خیر خواہی کی بات کی۔

اٹھائیسویں بحث: "صِرَاط" میں قراءات اور لغوی تحقیق

درحقیقت کلام عرب میں "صراط" کا معنی راستہ ہے[2] جیسا کہ عامر بن طفیل[3] کہتا ہے:

شَحَنَّا أَرْضَهُمْ بِالخَيلِ حَتَّى تَرَكنَاهُمْ أَذَلَّ مِنَ الصِّراطِ

ہم نے ان کی زمین کو گھوڑوں سے بھر دیا۔ یہاں تک کہ انہیں راستے سے زیادہ روندا ہوا کر دیا۔

---

[۲۷۰] صحیح بخاری: کتاب الاذان، باب حدّالمریض أن یشهَدَ الجماعة، بروایت ام المؤمنین عائشہؓ، عمدة القاری ۵: ۱۸۶، لسان العرب (هدی)

۱۔ ابوالقاسم محمد بن علی بن ابی طالب الہاشمی القرشی المعروف ابن الحنفیہ (م تقریباً ۹۳ھ) سیدنا علیؓ کے فرزند ارجمند ہیں۔ والدہ ماجدہ خولہ بنت جعفر بن قیس کا تعلق بنو حنیفہ سے تھا۔ اسی نسبت سے ابن الحنفیہ کہلائے۔ اہل تشیع ان کو مہدی کہتے ہیں اور ان کا عقیدہ ہے کہ یہ زندہ ہیں اور آخر زمانہ میں ان کا ظہور ہوگا۔ تهذيب التهذيب ۹: ۳۵۴

۲۔ تفسیر ابن عطية ۱: ۱۱۸، ۱۲۰

۳۔ ابوعلی عامر بن طفیل العامری (م ۱۱ھ) زمانۂ جاہلیت کا مشہور شاعر اور قبائلی سردار تھا۔ نجد میں پیدا ہوا اور بڑی جنگوں میں حصہ لیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام لانے کی مشروط پیش کش کی جو کہ رد کر دی گئی۔ معجم المؤلفین: ۵: ۵۴

أميرُالمؤمنينَ علىَ صِراطِ إذا اعوجَّ الموارِدُ مُستَقِيمٌ

جب اور لوگوں کے پانی کو جانے والے راستے ٹیڑھے ہو جائیں تب بھی امیرالمومنین سیدھے راستے پر ڈٹے رہتے ہیں۔

ایک اور شاعر کا قول ہے:

فَصَدَّ عن نَهجِ الصِّرَاطِ الوَاضِحِ

چناں چہ اس نے سیدھے راستے پر جانے سے روک لیا۔

نقاش کہتے ہیں: صراط رومی زبان میں راستے کو کہتے ہیں۔ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ قول بہت ضعیف ہے۔ صراط کو سین کے ساتھ "سِرَاط" بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ قراءت لفظ "استراط" سے ماخوذ ہے جو کہ نگلنے کے معنی میں آتا ہے(۱)۔ گویا کہ راستہ اپنے چلنے والے کو نگل لیتا ہے۔ بعض نے اسے زاء اور صاد کی درمیانی آواز سے اور بعض نے خالص زاء کے ساتھ بھی پڑھا ہے جب کہ اس میں اصل سین ہی ہے۔ سلمہ(۲) نے فراء کا قول نقل کیا ہے کہ خالص "زاء" کے ساتھ "صراط" کی بجائے "زراط" پڑھنا بنو عذرہ، بنو کلب اور بنو قین کا لہجہ ہے۔ یہ لوگ "أصْدَق" کو "أزْدَق"، "أسْد" کو "أزْد"۔ اسی طرح "لَسِقَ به" اور "لَصِقَ به" بھی کہا جاتا ہے۔

﴿اَلصِّرَاطَ﴾ مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے منصوب ہے کیوں کہ "هِدَايَة" مصدر سے جو فعل آتا ہے وہ حرف جر کے صلہ کے ساتھ بھی مفعول ثانی کی طرف متعدی ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿فَاهْدُوْهُمْ إِلىٰ صِرَاطِ الْجَحِيْمِ﴾[الصّٰفّٰت۳۷: ۲۳] (انہیں جہنم کے راستے کی طرف لے چلو) میں ہے اور بغیر حرف جر کے بھی ہوتا ہے جیسے زیر نظر آیت کریمہ میں ہے۔ ﴿اَلْمُسْتَقِيْمَ﴾ "الصِّرَاطَ" کی صفت ہے جس سے مراد وہ راستہ ہے جس میں نہ کجی ہو نہ موڑ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَنَّ هٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾[الأنعام۶: ۱۵۳] (یہ میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلتے رہو)۔ "مُسْتَقِيْمٌ" اصل میں "مُسْتَقْوِمٌ" تھا، واؤ کی حرکت قاف کو دے دی گئی اور ماقبل کے نیچے زیر آ جانے کی وجہ سے اسے یاء سے بدل دیا گیا۔ "مُسْتَقِيْمٌ" ہوگیا(۳)۔

۱۔ تفسیر ابن عطية ۱: ۱۱۸

۲۔ ابومحمد سلمہ بن عاصم (م۳۱۰ھ) امام فراء نحوی کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ ان کی تمام کتابیں انہی سے منقول ہیں۔ تفسیر و حدیث اور دیگر موضوعات پر ان کی اپنی بھی متعدد تصنیفات ہیں۔ معجم المؤلفین ۴: ۲۴۰

۳۔ تفسیر ابن عطية: ۱: ۱۲۱

انیسویں بحث:﴿ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾کی ترکیب،تفسیر اور قراء ات

یہاں لفظ ﴿صِرَاطَ﴾ گزشتہ "صِرَاط" سے بدل ہے اور بدل و مبدل منہ کا مدلول ایک ہی ہے جیسے "جَاءَ نِي زَيْدٌ أَبُوكَ" (تمہارا باپ زید میرے پاس آیا) میں "زید" اور "ابو" دونوں کا مدلول ایک ہے۔ زیرِنظر ارشادِ باری تعالیٰ کا معنی یہ ہوا کہ ہماری ہدایت کو دوام بخش دے کیوں کہ انسان کبھی ہدایت پانے کے بعد بھی راستہ سے بھٹک جاتا ہے۔ جعفر بن محمد فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ عزوجل کی پہچان اور اس کی معرفت کا علم حاصل کرنا ہے۔

﴿الَّذِينَ﴾ کی نحوی تحقیق

قرآن مجید میں "الذین" رفع، نصب اور جر تینوں حالتوں میں ایک جیسا ہوتا ہے۔ البتہ بنو ہذیل اسے حالت رفع میں "اَلَّذُونَ" کہتے ہیں۔عرب کے بعض لہجات میں "اَللُّذُ و"اور بعض میں "الَّذِي" استعمال ہوتا ہے جس کی مزید تفصیل اِن شاء اللہ آئندہ آئے گی۔

﴿عَلَيْهِمْ﴾ میں قراء ات اور لہجات

﴿عَلَيْهِمْ﴾ میں دس صورتیں منقول ہیں جن میں سے عام طور پر درج ذیل صورتیں قراء ات میں ملتی ہیں:

ہاء کے پیش اور میم کے سکون کے ساتھ "عَلَيْهُمْ"،ہاء کی زیر اور میم کے سکون کے ساتھ "عَلَيهِمْ"، ہاء اور میم دونوں کی زیر اور میم کے بعد یاء کے اضافہ کے ساتھ "عَلَيهِمِي"، ہاء کی زیر، میم کے پیش اور میم کے بعد واوَ کے اضافہ کے ساتھ "عليهِمُوا"، ہاء اور میم دونوں کے پیش اور میم کے بعد واوَ کے اضافہ کے ساتھ "عَلَيْهُمُوا" اور ہاء اور میم دونوں کے پیش کے ساتھ، میم کے بعد واوَ کے اضافہ کے بغیر "عَليهُمُ"، تیسرا لہجہ ہاء کے کسرہ اور میم کے ضمہ کے ساتھ میم کے بعد واوَ کے اضافہ کے بغیر "عَلَيْهِمُ" اور چوتھا لہجہ ہاء اور میم دونوں کے کسرہ کے ساتھ میم کے بعد یاء کے اضافہ کے بغیر "عَليهِمِ" ہے۔ابن الانباری کہتے ہیں: یہ سب صورتیں ٹھیک ہیں [1]۔

تیسویں بحث: "مُنعَم عَليهمْ" کی تحقیق

حضرت عمر بن الخطاب ؓ نے اسے "صِرَاطَ مَنْ اَنْعَمتَ عَلَيهِمْ" پڑھا ہے [2]۔ "مُنْعَم عَلَيهِمْ" کون

۱۔ تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۲۲-۱۲۴

۲۔ تفسیر ماوردی ۱: ۵۹

لوگ ہیں، اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور مفسرین کے نزدیک اس سے مراد حضرات انبیاء کرام، صدیقین، شہداء اور صلحاء کا راستہ ہے۔ ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾[النساء۴: ۶۹] (جس نے اللہ اور رسول کی اطاعت کی تو وہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیا اور وہ پیغمبر، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ ان لوگوں کی رفاقت بہت اچھی رفاقت ہے)۔ اس آیتِ کریمہ کا تقاضا یہ ہے کہ یہی لوگ صراط مستقیم پر ہیں اور سورۃ الحمد کی آیت میں یہی صراط مستقیم مانگا گیا ہے اور اس بارے میں جتنے اقوال بھی منقول ہیں سب کا محور یہی ہے۔ یہاں ان اقوال کو دہرانا تحصیلِ حاصل ہوگا اور اللہ تعالیٰ ہی کی یہ شان ہے کہ اس سے مدد مانگی جائے۔

اکتیسویں بحث: قدریہ، معتزلہ اور امامیہ کا رد

اس آیت میں قدریہ، معتزلہ اور امامیہ کا رد ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا ارادہ صدورِ فعل کے لئے کافی ہوتا ہے خواہ وہ اطاعت کا ارادہ کرے یا نافرمانی کا۔ ان کے نزدیک انسان اپنے فعل کا خود خالق ہے اور صدورِ فعل کے لئے اللہ تعالیٰ کا محتاج نہیں۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے اس باطل خیال کی نفی کی ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ ہی سے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت مانگ رہے ہیں۔ اگر یہ سب کچھ ان کے ہاتھ میں ہوتا اور وہ خود ہی نیکی بدی کا انتخاب بھی کر سکتے تو اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگنے کی ضرورت نہ رہتی، نہ ہی وہ ہر نماز میں اس سوال کو دہراتے۔ یہی حال ناپسندیدہ راستے سے بچنے کے لئے ان کے اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑانے کا ہے۔ یہ ناپسندیدہ راستہ وہی ہے جو ہدایت کے برعکس ہے۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّاۗلِّيْنَ﴾ (ان لوگوں کا راستہ جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا، نہ ان کا جن پر غصے ہوتا رہا اور نہ گمراہوں کا)۔ تو انہوں نے جس طرح ہدایت مانگی اسی طرح گمراہی سے بچنے کی دعا بھی کی۔ اسی طرح وہ یہ دعا بھی کرتے ہیں:﴿رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا﴾[آل عمران۳: ۸] (اے پروردگار جب تو نے ہمیں ہدایت بخشی ہے تو اس کے بعد ہمارے دلوں میں کجی پیدا نہ کر)

بتیسویں بحث: غضب کے مستحق اور گمراہ کون ہیں؟

﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ اور﴿ضَاۗلِّيْنَ﴾ کون لوگ ہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور کی رائے میں ﴿اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد یہود اور﴿الضَّاۗلِّيْنَ﴾ سے مراد نصاریٰ ہیں۔ اس آیت کریمہ کی یہ تفسیر حضرت

عدی بن حاتم(۱) والی حدیث اور ان کے قبولِ اسلام کے واقعہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ یہ حدیث امام ابوداؤد طیالسی نے اپنی مسند میں اور امام ترمذی نے اپنی جامع میں نقل کی ہے(۲)۔ اسی تفسیر کی تائید قرآن مجید میں یہود کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِنَ اللّٰهِ﴾ [البقرۃ۲: ۶۱، آل عمران۳: ۱۱۲] (اور وہ اللہ کی طرف سے غضب میں گرفتار ہوئے) اور نصاریٰ کے بارے میں ﴿وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ﴾ [الفتح۴۸: ۶] (اللہ نے ان پر غضب کیا) میں موجود ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَضَلُّوْا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيْلِ﴾ [المائدۃ۵: ۷۷] (وہ پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے)۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد مشرکین اور "ضالّین" سے مراد منافقین ہیں۔ سُلَمیؒ نے اپنی کتاب حقائق میں اور ماوردیؒ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ کچھ لوگوں نے ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے وہ لوگ مراد لئے ہیں جنہوں نے نماز میں فاتحہ کی فرضیت سے انکار کیا۔ ان کے نزدیک "ضالین" وہ ہیں جو فاتحہ کی قراءت کی برکت سے محروم رہے مگر اس قول کی کوئی حیثیت نہیں۔ ماوردیؒ کہتے ہیں کہ یہ قول ناقابل قبول ہے کیونکہ جس مسئلہ میں متعارض احادیث اور مختلف آثار موجود ہوں اور فقہی اختلاف سے لوگ واقف ہوں اس پر ایسا حکم لگانا ناجائز نہیں(۳)۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ ﴿مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ﴾ سے مراد بدعات اختیار کرنے والے اور "ضالّین" سے مراد ہدایت کا طریقہ چھوڑ کر بھٹک جانے والے لوگ ہیں۔ میرے نزدیک یہ اچھی تفسیر ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر سب سے زیادہ مناسب، سب سے اعلیٰ اور عمدہ ترین ہے۔

﴿عَلَيْهِمْ﴾ محلِ رفع میں ہے کیوں کہ تقدیر عبارت "غُضِبَ عَلَيْهِمْ" ہے (یعنی ان پر غضب کیا گیا)۔ غضب کا لغوی معنی شدت ہے اور "غَضُوْبٌ" سخت مزاج آدمی کو کہتے ہیں۔ موذی سانپ کو بھی اس کی سختی کی وجہ سے "غَضُوب" کہتے ہیں۔ "غَضَبَۃٌ" اونٹ کے چمڑے سے بنی ہوئی ڈھال کو کہا جاتا ہے جسے چمڑے کی کئی تہوں کو لپیٹ کر تیار کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ نام بھی اس کی مضبوطی کی وجہ سے ہے۔ جب غضب اللہ تعالیٰ کی

۱۔ صحابیِ جلیل ابوطریف یا ابو وہب حضرت عدی بن حاتم بن عبداللہ الطائی (م۶۸ھ) شعبان سن ۷ھ میں مشرف باسلام ہوئے۔ فتنہ انکارِ زکاۃ میں سب سے پہلے بنوطی کی زکاۃ لاکر حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں پیش کی۔ جنگ جمل اور صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ رہے۔ پھر کوفہ شہر چھوڑ دیا اور فرمایا: میں ایسے شہر میں نہیں رہ سکتا جس میں عثمانؓ کو برا بھلا کہا جاتا ہو۔ تہذیب التہذیب ۷: ۱۶۶

۲۔ جامع ترمذی: ابواب التفسیر، باب مِن سورۃ الفاتحۃ. تحفۃ الأحوذی ۸: ۲۴۲، تفسیر ماوردی ۱: ۶۰

۳۔ سورۂ فاتحہ کی فرضیت یا عدم فرضیت کی بحث مفصل گزر چکی ہے۔

صفت کے طور پر ذکر ہوتو اس کا معنی سزا کا ارادہ ہوتا ہے(۱)۔ اس معنی میں یہ باری تعالیٰ کی ذاتی صفت ہے جیسا کہ ارادہ ذاتی صفت ہے۔ غضب سے خود سزا بھی مراد لی جاتی ہے اس لحاظ سے اسے صفتِ فعل کہا جا سکتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے:

[۱۷۲] أَنَّ الصَّدَقَةَ تُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ ۔ بے شک صدقہ رب کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

تینتیسویں بحث: ''ضَلال'' کا لغوی معنی

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلا الضَّالِّيْنَ﴾: کلامِ عرب میں ضَلال اسلوب اعتدال اور حق کا راستہ چھوڑنے کو کہتے ہیں چناں چہ کہا جاتا ہے: ضَلَّ اللَّبَنُ فِي المَاءِ" (دودھ پانی میں غائب ہوگیا)۔ اسی معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذَا ضَلَلْنَا فِي الأَرْضِ﴾[السجدة ۳۲ : ۱۰] (جب ہم زمین میں ملیامیٹ ہو جائیں گے تو......) یعنی جب ہم موت کے ذریعے غائب ہو جائیں گے اور مٹی بن جائیں گے۔ اسی طرح شاعر کہتا ہے:

أَلَمْ تَسْأَلْ فَتُخبِرَكَ الدِّيارُ عَنِ الحَيِّ المُضَلَّلِ أَينَ سَارُوا

کیا تم نے برباد گھروں سے نہیں پوچھا کہ وہ تمہیں بتا دیتے کہ گم شدہ قبیلہ کہاں گیا؟

"ضُلَضِلَةٌ" اس چکنے پتھر کو کہتے ہیں جسے گھاٹی میں پانی الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے(۲)۔ اسی طرح "غَضَبَةٌ" پہاڑ کی اس چٹان کو کہتے ہیں جس کا رنگ اپنے پہاڑ کے رنگ سے مختلف ہوتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

أو غَضْبَةٌ فِي هَضْبةٍ ما أَمْنَعا(۳)

یا پہاڑی میں مختلف رنگوں کا پتھر ہو تو وہ کتنا مضبوط ہوتا ہے۔

چونتیسویں بحث: ﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْنَ﴾ کی قراءت اور نحوی تحقیق

حضرت عمر بن الخطاب اور اُبی بن کعب رضی اللہ عنہما نے اسے "غَيرِ المَغضُوبِ عَلَيهِمْ وَغَيرِ الضَّالِّين" پڑھا ہے۔ ان حضرات سے دونوں جگہ "غَيرَ" منصوب اور مجرور دونوں طرح نقل کیا گیا ہے(۴)۔

---

[۱۷۲] جامع ترمذی: أبواب الزكاة، باب ماجاء في فضل الصدقة۔ تحفة الأحوذي ۳:۲۸۳

۱۔ لسان العرب (غضب)

۲۔ لسان العرب (ضلل)

۳۔ لسان العرب (غضب)

۴۔ تفسير ابن عطية ۱: ۱۲۸، تفسير الماوردي ۱: ۶۱ یہ قراءت شاذ ہے بلکہ اسے تفسیری قول قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔

مجرور اس بنا پر کہ وہ "الذین" یا" عَلَیْھِم" کی "ھِمْ" سے بدل ہے، یا اس لیے کہ "الَّذِینَ" کی صفت ہے۔ الَّذِینَ" دراصل معرفہ ہے اور معرفہ کی صفت نکرہ نہیں آسکتی،نہ ہی نکرہ کی صفت معرفہ ہوسکتی ہے۔البتہ یہاں "الذین" سے مراد خاص لوگ نہیں بلکہ یہ عام ہے (اسی لیے اس کی صفت نکرہ لائی گئی ہے) گویا یہ یہاں: "إنّي لَأَمُرُّ بِمِثْلِکَ فَأُکْرِمُهُ" (میں تم جیسے آدمی کے پاس سے گزرتا ہوں تو اس کی عزت کرتا ہوں) کے اسلوب پر ہے [۱]۔ اس کی دوسری توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ لفظ "غیر"دو ایسی چیزوں کے درمیان آنے سے معرفہ بن گیا جن کا کوئی درمیانی درجہ نہیں ہوتا جیسے:"اَلحَيُّ غَیرُ الْمَیِّتِ" (زندہ مردے کے علاوہ ہے) اور "السَّاکِنُ غَیرُ الْمُتَحَرِّکِ"(ساکن متحرک کے علاوہ ہے)اور"اَلْقَائِمُ غَیرَ الْقَاعِدِ" [۲] (کھڑا بیٹھے ہوئے کے علاوہ ہے)۔ پہلا قول ابوعلی الفارسی کا اور دوسرا زمخشری [۳] کا ہے۔

راء کے نصب والی قراءت کی دو توجیہات نقل کی گئی ہیں: ایک یہ کہ "غَیرِ" "الذین" سے یا "عَلَیْھِمْ" کے ھاء اور میم سے حال ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: "أَنْعَمتَ عَلَیْھِمْ لا مغضوباً علیھِم" (جن پر آپ نے انعام کیا نہ کہ جن پر آپ کا غضب ہوا)۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ وہ استثناء کی بناء پر منصوب ہے، گویا کہ اصل عبارت: "إلَّا الْمَغْضُوبِ عَلَیْھِم" (سوائے ان لوگوں کے جن پر غضب ہوا) ہے۔ اس کے علاوہ فعل "أَعْنِي" مقدر مان کر بھی اس کو نصب دینا جائز ہے [۴]۔

پینتیسویں بحث: ﴿وَلَا الضَّالِّیْنَ﴾ کے "لا" کی تحقیق

﴿وَلَا الضَّالِّیْنَ﴾ کے "لا" میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام طبریؒ کہتے ہیں: یہ زائدہ ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا مَنَعَکَ أَلَّا تَسْجُدَ﴾[الأعراف۷: ۱۲] (کس چیز نے تجھے روکا ہے کہ تو سجدہ نہیں کرتا)۔ مکیؒ اور مہدویؒ کہتے ہیں کہ "لاَ" تاکید کے لئے ہے تاکہ "الضَّالِّین"کو "الَّذِینَ" پر معطوف نہ سمجھا جائے۔کوفہ کے علماءِ نحو کا خیال ہے کہ "لا" بمعنیٰ "غیر" ہے [۵]۔ یہی حضرت عمر اور حضرت ابی رضی اللہ عنہما کی قراءت ہے جیسا کہ گزر چکا۔

۱۔ تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۲۴-۱۲۵

۲۔ مطلب یہ کہ وہ یا تو زندہ ہوگا یا مردہ۔ان دونوں حالتوں کے درمیان کوئی حالت نہیں کہ نہ مردہ ہو نہ زندہ۔ اسی طرح کوئی چیز یا تو ساکن ہوتی ہے یا متحرک اور انسان یا کھڑا ہوتا ہے یا بیٹھا۔ ایسی چیزوں کے درمیان لفظ غیر آنے سے وہ بھی معرفہ بن جاتا ہے۔

۳۔ جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر الخوارزمی الزمخشری (م ۵۳۸ھ) صاحب کشاف مشہور عالم ہیں۔معجم المؤلفین ۱۲: ۱۸۶

۴۔ تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۲۵، نحاس: إعرابُ القرآن ۱: ۱۲۵

۵۔ تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۲۷

چھتیسویں بحث: ”ضَالِّيْنَ“ کی صرفی ولغوی تحقیق

”ضَالِّيْن“ اصل میں ”ضَالِلِين“ تھا۔ پہلے لام کی حرکت کو حذف کر کے لام کو لام میں مدغم کر دیا۔ اس طرح ”ضا“ کا الف اور ”لین“ کا ادغام شدہ لام دو ساکن جمع ہوگئے۔ ایوب سختیانیؒ نے مد کے بغیر الف کی جگہ ہمزہ لگا کر ”وَلاَالضَّألِين“ پڑھا ہے اور اس طرح اجماع ساکنین سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی ایک لہجہ ہے[1]۔ ابوزید کہتے ہیں کہ میں نے عمرو بن عبید کو یوں پڑھتے سنا: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لاَيُسْأَلُ عَنْ ذَنْبِهٖ إِنْسٌ وَلاَجَأنٌّ﴾[الرحمن ۵۵: ۳۹] (اس روز نہ تو کسی انسان سے اس کے گناہوں کے بارے میں پرسش کی جائے گی اور نہ کسی جن سے) تو مجھے ان پر لحن کا گمان ہوا یہاں تک کہ میں نے عربوں کو ”دَأْبَةٌ“ اور شَأْبَةٌ کہتے ہوئے خود سن لیا۔

ابوالفتح [2] کہتے ہیں کہ اسی لہجہ کی بنا پر کُثَيّر [3] کا یہ شعر ہے:

إِذَا مَا الْعَوَالِي بِالْعَبِيطِ احمأَرَّتْ[4]

اور جب خون سے نیزوں کے پھل سرخ ہوگئے۔

اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ سورۃ الحمد کی تفسیر اختتام کو پہنچی

۱۔ نحاس :إعراب القرآن ۱: ۱۲۶، تفسير ابن عطية ۱: ۱۲۹

۲۔ ابوالفتح عثمان بن جنّي الموصلي (م ۳۹۲ھ) مشہور ادیب، نحوی اور متعدد علوم کے ماہر ہیں۔ زیادہ تر حصول علم بغداد میں کیا اور وفات تک وہیں رہے۔ ان کی متعدد کتب مشہور ہوئیں۔ جن میں سے ایک ”المحتَسَب في القراء ات“بھی ہے۔ معجم المؤلفين ۶: ۲۵۱

۳۔ ابو صخر كُثَيّر بن عبدالرحمن الخزاعي القحطاني (م ۱۰۵ھ) بلند پایہ شاعر ہیں۔ آبائی وطن مدینہ منورہ تھا مگر زیادہ تر مصر میں رہے۔ ان کا تعلق شیعہ کے ذیلی فرقہ کیسانیہ سے تھا۔ اپنی محبوبہ عزّہ بنت جمیل ضمریہ کی نسبت سے كُثَيّر عَزّة مشہور ہوئے۔ معجم المؤلفين ۸: ۱۴۱

۴۔ تفسیر ابن عطیۃ ۱: ۱۳۱

مَدَنِيَّةٌ

سورۂ بقرہ

اللہ تعالیٰ کی توفیق اور احسان سے جس کے سوا کوئی پالنے والا نہیں

کلام کی ابتداء سورت کے نزول، اس کی فضیلت اور اس بارے میں دیگر روایات کے ذکر سے کی جا رہی ہے۔ آئندہ بھی جس سورت میں ایسی روایات میسر آئیں گی انہی سے ابتداء کی جائے گی۔

مقام و مدتِ نزول

سورۂ بقرہ مدنی ہے اور یہ مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ ایک رائے یہ ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿واتقوا یومًا ترجعون فیہ الی اللہ﴾[البقرہ۲: ۲۸۱](اوراس دن سے ڈرتے رہو جس میں تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے) کے علاوہ پوری سورۂ بقرہ مدینہ میں نازل ہونے والی پہلی سورت ہے۔ مذکورہ آیت نزول کے اعتبار سے سب سے آخری آیت ہے جو حجۃ الوداع کے موقعہ پر دس ذی الحجہ کو منٰی میں نازل ہوئی۔ اسی طرح آیات ربا بھی آخری زمانہ میں نازل ہونے والی آیات میں سے ہیں۔

فضیلت و اہمیت

سورۂ بقرہ کی فضیلت بہت زیادہ اور ثواب بہت بڑا ہے۔ حضرت خالد بن معدان[1] کہتے ہیں کہ سورۂ بقرہ کی عظمت، حسنِ ترتیب، کثرتِ احکام اور وعظ و نصیحت کی وجہ سے اسے قرآن کا خیمہ کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کے مضامین و احکام سیکھنے میں بارہ سال صرف کیے جب کہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے آٹھ سال لگائے جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ فرماتے ہیں: میں نے اپنے بعض مشائخ کو یہ فرماتے سنا کہ اس سورت میں ایک ہزار اوامر، ایک ہزار نواہی، ایک ہزار احکام اور ایک ہزار قصے ہیں۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قافلہ روانہ فرمایا جس میں بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے مگر آپ نے ان میں سب سے کم عمر شخص کی صرف اس لئے عزتِ افزائی فرمائی کہ اسے سورۂ بقرہ یاد تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا:

۱۔ ابو عبداللہ خالد بن معدان بن ابی کریب الکلاعی الحمصی (م ۱۰۳ھ) تابعی ہیں۔ علماء رجال نے انہیں ثقہ کہا ہے۔
تہذیب التہذیب ۳: ۱۱۸

[۲۷۲] إذهَبْ فَأنتَ أميرُهُم ۔ جاؤ تم ان کے امیر ہو۔

امام ترمذیؒ نے اسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرکے صحیح قرار دیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوامامۃ باہلی رضی اللہ عنہ سے مقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

[۲۷۳] إقرَءُوا سُورَةَ البقَرةِ فإنَّ أخذَ هَا بَركةٌ وتَرْكَها حَسرةٌ ولاَ يَستطِيعُها البَطَلَةُ۔

سورۂ بقرہ پڑھو بلاشبہ اس کا حاصل کرنا باعث برکت اوراس کا ترک کرنا حسرت ہے ۔ شیاطین بھی اس کے سامنے ٹھہرنے کی طاقت نہیں رکھتے)۔اس کے راوی معاویہؒ [1] کہتے ہیں: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ "بطلة"جادوگروں کو کہتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۲۷۴] لَا تَجعَلُوا بيُوتَكُم مقابرَ۔إنّ الشيطانَ ينفِرُ مِنَ البيتِ الذى تُقرأُفيه سُورةُ البقرةِ۔

اپنے گھروں کو قبرستان نہ بناؤ بے شک جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے اس سے شیطان بھاگ جاتے ہیں۔

امام دارمیؒ نے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا:

[۲۷۵] مَامِن بَيتٍ يُقرأُ فِيهِ سورةُ البَقَرَةِ إلّا خَرَجَ مِنه الشّيطانُ وَلَه' ضُرَاطٌ۔

جس گھر میں بھی سورۂ بقرہ پڑھی جائے اس سے شیطان بھاگ جاتا ہے اور بھاگتے ہوئے اس کی ریح خارج ہوتی جاتی ہے۔

---

[۲۷۲] جامع ترمذی: کتاب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل سورۃ البقرۃ وآیۃ الکرسی ۵: ۵۶ ۔ امام ترمذیؒ کہتے ہیں: یہ حدیث حسن ہے اور عطاء مولی ابی احمد سے مرسلاً بھی منقول ہے۔ عطاء کو ابن حبانؒ نے ثقہ کہا ہے مگر البانیؒ نے اسے ضعیف ابن ماجہ میں ذکر کیا ہے۔

[۲۷۳] صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین وقصرها باب فضل قراءة القرآن و سورة البقره ۱: ۵۵۳

[۲۷۴] صحیح مسلم: کتاب صلاۃ المسافرین، باب استحباب صلاۃ النافلۃ فی بیته و جوازها فی المسجد ۱:۵۳۹

[۲۷۵] سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فضل سورۃ البقرۃ ۲: ۲۲۱

۱۔ ابوسلام معاویہ بن سلام بن ممطور الحبشی الدمشقی (م تقریباً ۱۷۰ھ) حمص میں رہتے تھے پھر دمشق منتقل ہوگئے۔ ابن معین، امام احمد اور دیگر حضرات نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ تهذیب التهذیب ۱۰: ۲۰۸

نیز فرمایا:

[۲۷۶] إنّ لِكُلّ شيءٍ سَنامًا وإنّ سَنامَ القُرآنِ سورةُ البَقَرَة۔ وإنّ لكُلّ شيءٍ لُبابًا وإنّ لُبابَ القُرأنِ المفَصَّلُ۔

ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی سورۂ بقرہ ہے۔ اسی طرح ہر چیز کا ایک خلاصہ ہوتا ہے اور قرآن کا خلاصہ المفصل یعنی سورۂ بقرہ ہے۔امام ابو محمد دارمیؒ فرماتے ہیں کہ لباب سے مراد خالص ہے۔

صحیح بُستی (۱) میں حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۲۷۷] إنّ لكُلّ شيءٍ سَنامًا وإنّ سَنامَ القُرآنِ سورةُ البَقَرَةِ، ومَن قَرَأها فِي بيته ليلاً لم يدخُلِ الشيطانُ بيتَهُ ثلاثَ ليالٍ ومَنْ قَرأها نَهارًا لم يدْخُلِ الشيطانُ بَيتَهُ ثلاثةَ أيّامٍ۔

کہ ہر چیز کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن کی چوٹی سورۂ بقرہ ہے جو شخص اس کو اپنے گھر میں رات کو پڑھے اس کے گھر میں تین رات تک شیطان داخل نہیں ہوتا اور جو اس کو دن میں پڑھے تو تین دن تک اس کے گھر میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔ابو حاتم بستیؒ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی: "اس کے گھر میں شیطان تین دن تک داخل نہیں ہوتا" سے سرکش شیاطین مراد ہیں۔

امام دارمیؒ نے اپنی مسند میں شعبیؒ کی روایت سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے کہ:

---

[۲۷۶] حوالہ بالا

[۲۷۷] صحیح ابن حبان :کتاب الرقائق ، باب قراءة القرآن ۳:۵۹، مسند ابویعلی: حديث ميمونة زوج النبي صلى الله عليه وسلم ۱۳:۴۶۵۔اس کے راوی خالد بن سعید المدنی پر عقیلیؒ ،ذہبیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے جرح نقل کرکے اس روایت کو نا قابل اعتبار کہا ہے ۔ المیزان ۱: ۶۳۱ ، ہیثمیؒ نے بھی مجمع الزوائد ۶: ۳۱۲ میں اس حدیث کو ضعیف کہا ہے البتہ دیگر شواہد کی بنا پر اسے تقویت مل جاتی ہے ۔

امام ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد التمیمی البُستی الشافعی (م۳۵۴ھ) مشہور محدث مؤرخ اور فقیہ ہیں اور فن رجال کے ائمہ میں سے ہیں۔ ان کی کتاب الثقات بہت مشہور ہے۔ متن میں مذکور "صحیح بستی" کا پورا نام "المسند الصحیح فی الاحادیث" ہے۔ معجم المؤلفین ۹: ۱۷۳

[۲۷۸] جو شخص رات کو سورۂ بقرہ کی دس آیات پڑھے اس رات صبح تک اس کے گھر میں شیطان داخل نہیں ہوتا۔ یہ دس آیات سورۂ بقرہ کی پہلی چار آیات، آیۃ الکرسی، اس سے متصل دو آیات اور سورت کی آخری آیات ہیں جن کی ابتداء ﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ﴾ سے ہوتی ہے۔

شعبیؒ نے آپؐ کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے:

اس دن اس کے یا اس کے اہل خانہ کے قریب نہ شیطان آئے گا، نہ ہی انہیں کوئی اور تکلیف ہوگی اور اگر ان آیات کو کسی مجنون پر پڑھا جائے تو اسے افاقہ ہو جائے۔

[۲۷۹] مغیرہ بن سبیع جو کہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اصحاب میں سے تھے کہتے ہیں کہ وہ شخص قرآن مجید بھی نہیں بھولے گا۔ اسحاق بن عیسیٰ کہتے ہیں: "لَمْ يَنْسَ ماقدحِفظَهُ" (جو کچھ اس نے یاد کر لیا اسے نہیں بھولے گا)۔ ابو محمد دارمیؒ فرماتے ہیں کہ بعض لوگوں نے مغیرہ بن سبیع کی بجائے مغیرہ بن سمیع کہا ہے۔

حافظ ابن عبدالبرؒ کی کتاب "الإستیعاب" میں ہے کہ لبید بن ربیعہ بن عامر بن مالک بن جعفر ابن کلا[ب] بن ربیعہ بن عامر بن صعصعہ زمانۂ جاہلیت کے شعراء میں سے ہیں۔ انہوں نے زمانہ اسلام پایا، اچھے مسلمان بنے اور اسلام میں آ کر شعر گوئی چھوڑ دی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ایک مرتبہ ان سے شعر کے بارے میں پوچھا اور کچھ شعر سنانے کی فرمائش بھی کی تو انہوں نے سورۂ بقرہ سنائی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے تمہیں شعر سنانے کو کہا تھا تو انہوں نے جواب میں عرض کیا: جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے سورۂ بقرہ اور آل عمران سکھا دی ہیں اس وقت سے میں نے شعر کہنا چھوڑ دیا ہے۔ ان کی اس بات سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت خوش ہوئے اور ان کا وظیفہ دو ہزار سے اڑھائی ہزار کر دیا۔ بہت سے سوانح نگاروں نے لکھ[ا ہ]ے کہ [اسل]ام لانے کے بعد سے لبید رضی اللہ عنہ نے کوئی شعر نہیں کہا۔ بعض کا خیال ہے کہ انہوں نے درج ذیل [قو]ل [کے] علاوہ کوئی شعر نہیں کہا:

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ إذلَمْ يَأتِنِي أَجَلِي حتی اکتسیت من الإسلامِ سِربالاً

اللہ کا شکر ہے کہ میری موت اس وقت تک نہیں آئی جب تک میں نے اسلام کو نہیں اپنا لیا۔

حافظ ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں: ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ شعر قَرَدهِ بن نُفَاثه السَّلُولی کا ہے اور میرے

---

[۲۷۸] سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فضل أول سورة البقرة وآية الكرسي ۲:۹۰۵

[۲۷۹] سنن دارمی: کتاب فضائل القرآن، باب فضل اوّل سورة البقره و آية الكرسي ۲: ۹۰۶

نزدیک یہی زیادہ صحیح ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ حالتِ اسلام میں لبید رضی اللہ عنہ نے جو شعر کہا وہ یہ ہے:

ماعاتبَ المَرْءَ الكريمَ كَنفسِهِ والمرءُ يُصلِحُه القرينُ الصالحُ

عزت دار آدمی کو اس کے اپنے نفس سے زیادہ تنبیہ کرنے والا کوئی نہیں۔ اور آدمی کا اچھا ساتھی اس کی اصلاح کا سبب بنتا ہے۔

آیت الکرسی اور سورہ بقرہ کی آخری آیات کے بارے میں جو روایات آئی ہیں ان کا مزید تذکرہ آئندہ آ رہا ہے۔ آل عمران کے شروع میں بھی اس سورۂ مبارکہ کی مزید فضیلت اِن شاء اللہ بیان ہوگی۔

☆☆☆☆☆

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے

ارشادِ باری تعالیٰ:

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ہُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲﴾

الم۔ یہ کتاب ایسی ہے جس میں ذرا شک نہیں۔ اللہ سے ڈرنے والوں کی رہنما ہے۔

حروف مقطعات کا مفہوم مفسرین کی نظر میں

بعض سورتوں کے شروع میں جو حروف آئے ہیں ان کی تاویل میں مفسرین کی مختلف آراء ہیں۔ عامر شعبیؒ، سفیان ثوریؒ اور ایک طبقہ کا کہنا ہے کہ یہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کے راز ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہر کتاب میں اس کا کوئی نہ کوئی راز ہوتا ہے۔ یہ حروف متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور اس کے متعلق بحث کی ضرورت نہیں۔ ان پر ایمان رکھنا اور جیسے وہ نازل ہوئے ہیں اسی طرح پڑھنا ضروری ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔ ابواللیث سمرقندی نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور ابن مسعودؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ حروف مقطعات ان رازوں میں سے ہیں جن کی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔ ابو حاتم کہتے ہیں: آغاز سُور کے علاوہ قرآن میں حروف مقطعات ہمیں کہیں نہیں ملے اور ہم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کی اس سے کیا مراد ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: ابوبکر ابن الانباری نے بھی ایسا ہی قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں: ہم سے حسن بن حُباب نے بیان کیا ہے، وہ کہتے ہیں ہم سے ابوبکر بن ابی طالب نے ذکر کیا، انہوں نے ابوالمنذر واسطی سے، انہوں نے مالک بن مِغول سے، انہوں نے سعید بن مسروق سے اور انہوں نے ربیع بن خُثَیم سے روایت کی ہے، وہ کہتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے یہ قرآن مجید نازل کیا اور اس میں سے جس چیز کا علم چاہا صرف اپنے ساتھ خاص کر لیا اور جو چاہا تمہیں سکھا دیا۔ اب جسے اس نے اپنی ذات کے لیے مخصوص کیا ہے تم اس کو نہیں پا سکتے اس لیے اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ جس علم پر اللہ تعالیٰ نے تمہیں مطلع فرمایا ہے اس کے بارے میں تم سوال کر سکتے ہو اور اسی کے بارے میں تمہیں

بتایا جائے گا۔ تم تمام قرآنی علوم و معارف کا احاطہ نہیں کر سکتے اور نہ ہی اپنے تمام علم پر عمل کرتے ہو۔

ابوبکر (ابن الانباری) کہتے ہیں: اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور امتحان و آزمائش بعض حروف کے معانی تمام جہان سے پوشیدہ رکھے گئے ہیں۔ اب جو ان پر ایمان لائے اسے بدلہ ملے گا اور وہ کامیاب ہوگا اور جو کفر اور شرک کرے گا وہ گناہ گار اور رحمت سے دور ہوگا۔ قاضی ابویوسف بن یعقوب(۱) نے ہم سے بیان کیا، وہ کہتے ہیں ہم نے محمد بن ابوبکر سے، انہوں نے عبدالرحمٰن بن مہدی سے، انہوں نے سفیان سے، انہوں نے اعمش سے، انہوں نے عمارہ سے، انہوں نے حریث بن ظہیر سے اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ: کسی مومن کا افضل ترین ایمان وہ ہے جو وہ بن دیکھے لائے۔ پھر آپ نے قرآن کریم کی آیت ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ تلاوت فرمائی۔

حروف مقطعات کے بارے میں مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: یہ قول متشابہات اور ان کے حکم کے بارے میں ہے اور یہی صحیح ہے جیسا کہ اس کا بیان سورۂ آلِ عمران میں اِن شاء اللہ آئے گا۔ علماء کی ایک کثیر تعداد کی رائے ہے کہ ان پر بحث کرنا اور ان میں پوشیدہ فوائد و معانی کو تلاش کرنا ہمارے لیے ضروری ہے(۲)۔ ان فوائد و معانی کے بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حروف مقطعات قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا اسم اعظم ہیں مگر ہم یہ نہیں جانتے کہ ان میں سے کون کون سے حروف ملا کر اسمِ اعظم بنتا ہے۔ قطرب، فراء اور دیگر حضرات کا کہنا ہے کہ یہ حروف تہجی کی طرف اشارہ ہے جن کو ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو قرآنِ مجید کے مقابلہ کا چیلنج کیا۔ اس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ قرآن مجید بھی انہی حروف سے مرکب ہے جن سے ان کا کلام بنا ہے مگر اس کے باوجود وہ ایسا کلام بنانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یہ ان کی قرآن مجید کے مقابلہ میں بے سروسامانی کی واضح ترین دلیل ہے کیوں کہ قرآن مجید ان الفاظ سے باہر نہیں جنہیں یہ اپنے کلام میں استعمال

۱۔ ابویوسف القاضی سے مراد صاحب ابی حنیفہ نہیں بلکہ یہ محمد بن ابی بکر بن علی بن عطاء المقدمی (م ۲۳۴ھ) کے شاگردِ خاص ہیں جنہیں حافظ ابن حجرؒ نے "وھُوَ راویتُہٗ" کہا ہے۔ قرطبیؒ کے ہاں ان کا نام ابویوسف بن یعقوب ہے مگر حافظ ابن حجرؒ اور دیگر اکثر علماءِ رجال نے محمد بن ابی بکر کے تعارف میں انہیں لفظ "ابو" کے بغیر یوسف بن یعقوب لکھا ہے اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تھذیب التھذیب ۹: ۷۹

۲۔ علماءِ متکلمین کی ایک اچھی خاصی تعداد کا موقف یہ ہے کہ قرآن میں کسی ایسی چیز کا نازل ہونا محال ہے جسے مخلوق سمجھ نہ سکے۔ فریقین کے دلائل امام رازی نے تفسیر کبیر ۲: ۴ اور علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر ۱: ۳۵-۳۸ میں مفصل ذکر کیے ہیں۔

کرتے ہیں۔ قطرب کہتے ہیں کہ جب قرآن مجید پڑھا جاتا تو وہ بھاگ جاتے تھے مگر جب انہوں نے ﴿الٓمّٓ﴾، ﴿الٓمّٓصٓ﴾ کے الفاظ سنے تو ان کو عجیب لگا اور وہ اسے غور سے سننے لگے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مربوط قرآنی آیات سنانا شروع فرما دیں تاکہ وہ ٹھیک طرح سے سن لیں اور ان پر حجت قائم ہو جائے۔ ایک قول ہے کہ جب مشرکین نے مکہ میں قرآن سننے سے منہ پھیرا اور کہا: ﴿لَاتَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيْهِ﴾ [فصلت: ۲۶] (اس قرآن کو نہ سنو اور اس میں خلل ڈالو) تو یہ آیت نازل ہوئی تاکہ وہ اس کو دلچسپ سمجھ کر اس طرف کان لگائیں اور اس طرح ان الفاظ کے بعد قرآن مجید بھی ان کے کانوں میں پہنچ جائے اور ان پر حجت تمام ہو جائے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ حروف ان اسماء کی علامات ہیں جن کے بقیہ حروف کو حذف کر دیا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور دوسرے حضرات کا قول ہے کہ الف اللہ سے لام جبریل سے اور میم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے لیا گیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ الف اللہ کا ابتدائی حرف لام لطیف کا اور میم ذات باری تعالیٰ کے نام مجید کا ابتدائی حرف ہے۔ ابوالضحیٰ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ الٓمّٓ سے اناالله أعلم (میں اللہ ہی بہتر جانتا ہوں) ﴿الٓرٰ﴾ سے أنااللّٰه أرٰی (میں اللہ دیکھتا ہوں) ﴿الٓمّٓصٓ﴾ سے أنَااللّٰهُ أفصِلُ" (میں اللہ فیصلہ کرتا ہوں) مراد ہے۔ چناں چہ الف سے أنا کا، لام سے اسم اللّٰه کا اور میم سے عِلم کا معنیٰ ادا ہوتا ہے۔ اسی قول کو زجاج نے بھی اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ میری رائے میں ان حروف میں سے ہر حرف سے کوئی نہ کوئی معنیٰ ادا ہوتا ہے۔ اہل عرب نے بھی اپنے اشعار میں حروف مُقطعات کو کلمات کی جگہ استعمال کیا ہے چناں چہ شاعر کا قول ہے:

فَقُلْتُ لهاقِفِي فقالَتْ قَاف[1]

پس میں نے اس سے کہا ٹھہر جاؤ تو اس نے کہا ٹھہر گئی۔ یہاں پر قاف سے مراد وَقَفْتُ ہے۔

زہیر[2] کہتا ہے:

بِالخَيرِ خَيراتٌ وَإن شرًّا فَا　　　وَلا أُرِيدُالشَّر إلَّا أنْ تَا[3]

بھلائی کے ساتھ بھلائیاں ہیں اور اگر برائی ہو تو برائی اور میں نہیں ارادہ کرتا برائی کا،

۱۔ شرح شواهد الشافية ص ۲۶۴۔ شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا اور شعر کا دوسرا مصرع یوں ہے: لَاتَحْسَبِنَا أنَا نَسِينا الإيجاف

۲۔ زہیر بن ابی سُلمیٰ ربیعہ بن رباح المُزني (م ۱۳ ق ھ) دورِ جاہلیت کے بلند پایہ شاعر تھے۔ ان کے بیٹے، بیٹی اور پوتے سب شاعر تھے۔ معجم المؤلفین ۴: ۱۸۶

۳۔ شرح شواهد الشافية ص ۲۶۲۔ اس شعر کو علامہ ابن منظورؒ افریقی نے لسان العرب میں حکیم بن اوس تمیمی کی طرف منسوب کیا ہے۔

ہاں اگر تو چاہے تو ٹھیک ہے۔ پہلے مصرع میں فَا سے مراد فشرٌ ہے اور دوسرے مصرع میں تَا اصل میں تشاء ہے۔

ایک اور شاعر کا قول ہے:

نَادُوهُم ألاَ ألجِمُوا ألاَتَا قَالُوا جَمِيعًا كُلُّهم ألافَا

انہوں نے پکارا کہ خبردار ان کو لگام دو خبردار تم سوار نہیں ہوتے ان تمام نے کہا سنو! تم سوار ہو جاؤ۔

پہلے مصرع میں ''ألاَتَا'' سے ''ألاتَركَبُون'' اور دوسرے مصرعے میں ''ألافَاركبوا'' مراد ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں آیا ہے:

[۲۸۰] مَن أعانَ على قَتلُ مُسلِمٍ بِشَطرِ كَلِمةٍ۔

جس شخص نے مسلمان کے قتل میں آدھا لفظ بول کر اعانت کی......

شقیقؒ کہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ پورے کلمہ'' أقتل ''(قتل کرو) کی بجائے'' أُقْ'' کہہ دے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

[۲۸۱] كفى بالسيف شا۔ یہاں'' شا'' سے مراد'' شافياً ''(شفا دینے والا) ہے۔

زید بن اسلم کہتے ہیں کہ حروف مقطعات سورتوں کے نام ہیں۔ کلبیؒ کہتے ہیں کہ یہ حروف قسمیہ ہیں کہ

---

[۲۸۰] سنن ابن ماجہ: كتاب الدّيات، باب التغليظ في قتل مسلمٍ ظُلمًا ۲: ۸۷۳، مسند ابویعلیٰ: مسند أبي هريرة رضى الله عنه ۱۰: ۳۰۶، سنن بیہقی: كتاب النفقات، باب تحريم القتل من السنة ۱۲: ۲۱۔ ابن الجوزیؒ نے الموضوعات: كتاب ذم المعاصي، باب إثم قتل النفس المحرمة ۳: ۱۰۳ میں اس کی تمام اسانید پر بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ اس حدیث میں کوئی صحت نہیں ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اللآلي ۲: ۱۰۲ میں اس کا دفاع کیا ہے۔ علامہ مناویؒ نے بھی فیض القدیر میں حافظ ذہبیؒ کے حوالہ سے اس کے راوی یزید بن ابی زیاد کو نا قابل اعتماد کہا ہے۔ دیگر علماءِ رجال وحدیث نے بھی انہیں مجروح کہا ہے۔ تهذيب التهذيب ۱۱: ۳۲۸، ابن عدیؒ نے اس کے دو طرق ذکر کے لکھا ہے کہ یہ دونوں محفوظ نہیں۔ الكامل فى الضعفاء ۷: ۲۷۱۴۔ مذکورہ بالا حدیث کا بقیہ حصہ: "لقِيَ اللّٰهَ مكتُوبًا بينَ عينيه آيسا مِن رحمة اللّٰه" ہے۔

[۲۸۱] سنن ابن ماجہ: كتاب الحدود، باب الرجل يجدمع امرأته رجلاً ۲: ۸۶۸ اور سنن ابوداود: كتاب الحدود، باب الرجم ۴: ۱۴۴ میں "كفى بالسيف شاهدًا" ہے۔ البتہ امام عبدالرزاقؒ نے المصنف: كتاب العقول، باب الرجل يجد على امرأته رجلاً ۹: ۴۳۴ میں حسن بصریؒ سے مرسلاً "كفى بالسيف شا" نقل کیا ہے جس کی وضاحت میں انہوں نے "شاهدا" لکھا ہے اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس حدیث میں گواہوں کا ذکر ہے۔ شافیاً کے الفاظ مجھے کہیں نہیں ملے۔

ان کی فضیلت اور عظمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں قسم کے طور پر ارشاد فرمایا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں سے لیے گئے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے۔ بعض علماء نے اس قول کو رد کیا ہے اور کہا ہے ان حروف کو حروف قسمیہ کہنا صحیح نہیں کیوں کہ قسم "اِن"، "قدْ"، "لقد" اور "ما" کے ساتھ آتی ہے اور یہاں ان چاروں حروف میں سے کوئی حرف موجود نہیں لہذا اس کا قسم کہنا درست نہ ہوا۔ اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں قسم کا اصل مقام اللہ تعالیٰ کا فرمان "لاریب فیه" (اس میں کوئی شک نہیں) ہے۔ چناں چہ اگر کوئی انسان قسم اٹھاتے ہوئے یوں کہے: "واللّٰه هذاالکتاب لارَیب فیه" (خدا کی قسم اس کتاب میں کوئی شک نہیں) تو اس کا کلام صحیح ہوگا اور حرف لا جواب قسم ہو جائے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کلبیؒ کا قول اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کی گئی رائے درست ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے قسم اٹھانے میں کیا حکمت ہے حالاں کہ نزول قرآن کے وقت لوگ دو طرح کے تھے: تصدیق کرنے والے اور جھٹلانے والے۔ تصدیق کرنے والا تو بغیر قسم کے بھی تصدیق کرتا ہے اور جھٹلانے والا قسم کے باوجود بھی نہیں مانتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن لغتِ عرب میں نازل ہوا اور اہل عرب کلام کی تاکید کی غرض سے قسم کھاتے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے خلاف اپنی حجت کی تاکید کے لیے قسم کھائی ہے کہ قرآن اس کی طرف سے ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ﴿الٓمٓ﴾ سے مراد أنزلتُ علیکَ هٰذَا الْکِتَابَ مِنَ اللوحِ المَحْفُوظِ (میں نے آپ پر یہ قرآن لوحِ محفوظ سے اتارا ہے)۔ قتادہؒ فرماتے ہیں کہ ﴿الٓمٓ﴾ قرآن کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ محمد بن علی الترمذیؒ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سورت کے تمام احکام اور قصص کو اس کی ابتداء میں حروف مقطعات میں سمو دیا ہے۔ اس بات کو نبی یا ولی کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔ پھر یہ احکام وقصص لوگوں کو سمجھانے کے لیے انہیں پوری سورت میں تفصیل سے بیان فرما دیا۔ اس کے علاوہ ان حروف کے بارے میں اور اقوال بھی ملتے ہیں اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

حروف مقطعات کا اعراب

حروفِ مقطعات سب مبنی علی السکون ہیں کیوں کہ یہ مکمل الفاظ نہیں، البتہ اگر انہیں بطور مبتداء یا بطور معطوف استعمال کیا جائے تو ان پر اعراب آئے گا۔ پھر اس بات میں اختلاف ہے کہ یہ حروف کسی محلی اعراب کے تحت آتے ہیں یا نہیں چناں چہ ایک قول یہ ہے کہ اعراب میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ اس لیے کہ نہ تو یہ اسماء متمکنہ ہیں نہ افعال مضارعہ بلکہ یہ حروف تہجی کی طرح ہیں اور صرف حکایۃً بولے جاتے ہیں۔ یہ خلیل اور سیبویہ کی رائے ہے۔ جن لوگوں نے انہیں سورتوں کے نام قرار دیا ہے ان کے نزدیک یہ مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ

سے محل رفع میں ہیں جس سے تقدیر عبارت یوں ہے۔ "هذهٖ الٓمٓ" (یہ الف لام میم ہے)، جیسا کہ آپ کہیں هذه سورة البقرة۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہیں اور "ذٰلک" ان کی خبر ہے جیسے کہیں "زیدٌ ذٰلکَ الرجلُ"۔ابن کیسان نحوی کہتے ہیں کہ ﴿الٓمٓ﴾ محل جر میں ہے ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول بھی گزر چکا ہے کہ یہ وہ حروف ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے قسمیں کھائی ہیں(۱)۔

ذٰلک کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾ میں ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد هذاالکتاب ہے اور﴿ذٰلک﴾ اگرچہ دراصل دُور کی طرف اشارہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر کبھی قریب کے لیے بھی آتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بارے میں ارشاد فرمایا:﴿ذٰلِکَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ﴾[السجدة۳۲: ۶](وہی ہے ہر پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا، زبردست اور رحیم)۔ اسی طرح خفاف بن ندبہ کا قول ہے:

أقولُ له، والرُّمْحَ يأطِرُمَتْنَهُ   تَأَمَّلْ خُفَافًا إِنَّنِي أناذَلِكا (۲)

جب نیزہ اس کی پیٹھ کو ٹیڑھا کر رہا ہوتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں:غور سے دیکھو میں وہی خفاف ہوں۔

أناذلکا سے راد أناهذا ہے ۔ اس آیت کریمہ میں بھی ﴿ذٰلِکَ﴾ سے اشارہ قرآن کی طرف ہے۔ وہ یہاں بھی "هذا" کی جگہ استعمال ہوا ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: "الٓمٓ هٰذَاالْکِتَابُ لَارَيْبَ فِيْهِ" یہ قول ابوعبیدہ، عکرمہ اور دیگر کئی حضرات کا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ:﴿وَتِلْکَ حُجَّتُنَا آتَيْنَاهَاإِبْرَاهِيْمَ﴾[الأنعام۶ : ۸۳](اور یہ ہماری حجت تھی جو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو دی تھی)اور﴿ تِلْکَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْکَ بِالْحَقِّ﴾[البقرة۲: ۲۵۲](یہ اللہ تعالیٰ کی آیات ہیں جنہیں ہم سچ سچ آپ کو سنا رہے ہیں) میں " هذه" کی جگہ "تلک" استعمال ہوا ہے لیکن جب یہ واقعات و حالات ماضی کا حصہ بن گئے تو حال سے دور ہوگئے اس لیے اس آیت میں ان کے لیے اسم اشارہ "تلک" استعمال کیا گیا۔ صحیح بخاری میں معمرؒ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ:"ذٰلِکَ الْکِتَابُ يَعْنِي هٰذَا الْقُرْآنُ"(ذلک الکتاب سے مراد یہ قرآن ہے)۔ ارشادِ باری تعالیٰ:﴿ هُدًى لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ سے مرادوضاحت اور رہنمائی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:﴿ذٰلِکُمْ حُکْمُ اللّٰهِ يَحْکُمُ بَيْنَکُمْ﴾[الممتحنة۶۰ : ۱۰]میں" ذَالِکُمْ حُکْمُ اللّٰه" سے مراد بھی "هذاحُکم اللّٰه" ہے۔

۱۔ تفسیر طبری ۱: ۸۸، نحاس:معاني القرآن ۱: ۷۵

۲۔ خفاف بن عمیر بن حارث کی ماں سودہ بنت شیطان بن قنان کو ندبہ کہا جاتا تھا۔المؤتلف والمختلف ص ۱۱۲ ،تفسیر الطبري ۱: ۷۴

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: هذا بھی ذلک کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ اُمّ حرام والی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کاارشاد گرامی "یَرکَبُونَ ثَبَجَ هٰذَا الْبحر" (یہ لوگ سمندر کے بہت بڑے حصے کو عبور کریں گے) کرہوا۔یہاں هذا البحر سے مرد ذلک البحر ہے۔ واللہ اعلم۔

"کتاب" کی تحقیق

ایک رائے یہ ہے کہ﴿ ذٰلِکَ ﴾اصلی معنی اشارۂ بعید کے لئے استعمال ہوا ہے اور اس کے مشارٌ الیہ کے بارے میں دس اقوال ہیں:

۔ ﴿ ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾ أي الکتاب الذی کَتَبْتُ علی الخلائِقِ بِالسعادةِ والشقاوةِ وَالأجَلِ والرِّزقِ "رَیبَ فِیهِ أي لامُبَدِّل لهٗ"(وہ کتاب جس میں میں نے مخلوق کی نیک بختی، بدبختی، موت اور رزق لکھے ہیں اس میں کوئی شک وشبہ نہیں اور اس کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا)۔

۔ ﴿ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾ أي الذي کَتبتُ علیٰ نَفْسِي في الأزل أنَّ رَحْمَتِي سَبَقَتْ غَضَبِي" (وہ تحریر جو میں نے ازل میں اپنے بارے میں لکھ دی کہ میری رحمت میرے غصے سے مقدم ہے)۔صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۲۸۳] لَمَّا قَضَى اللّٰهُ الخَلْقَ کَتَبَ فِي کِتابِهٖ عَلیٰ نفسِهٖ فَهُوَ مَوضوعٌ عِندهٗ أنَّ رَحْمَتِي تَغْلِبُ غَضَبِي۔

جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کیا تو اپنی اس کتاب میں جو اس کے پاس رکھی ہوئی ہے اپنی ذات عالی کے بارے میں لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غضب پر غالب رہے گی۔ ایک دوسری روایت میں سبَقَتْ کا لفظ ہے۔یعنی میری رحمت میرے غضب سے بڑھی ہوئی ہے۔

۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان پر ایسی کتاب نازل کریں گے کہ اس کو پانی نہ مٹا سکے گا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عیاض بن حمار المجاشعی رضی اللہ عنہ [۱] سے منقول ہے کہ نبی

[۲۸۳] صحیح مسلم: کتاب التوبة، باب سعة رحمة اللّٰه تعالیٰ وأنّها سبقت غضبه ۴: ۲۱۰۷۔ امام بخاریؒ، احمدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ اور ابن حبانؒ وغیرہ بہت سے محدثین نے اس حدیث کو تھوڑے بہت مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

حضرت عیاض بن حمار بن ابی حمار بن ناجیۃ المجاشعی التمیمیؓ (م تقریباً ۵۰ ھ) بصرہ میں رہتے تھے۔ تہذیب التہذیب ۸: ۲۰۰

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۸۳] إنَّ اللّٰهَ نظَرَ إلٰى أهلِ الأرضِ فَمَقَتَهُم عَرَبَهُم و عَجَمَهُم إلا بقايَا مِن أهْلِ الْكِتابِ وقالَ: إنّما بَعَثْتُك لأبتَلِيَكَ وأبتَلِي بِكَ وأنزَلتُ عَليكَ كِتابًا لايغسِلهُ الماءُ تَقْرؤهُ نائِمًا ويَقْظَانَ۔

اللہ تعالیٰ نے زمین والوں کی طرف نظر فرمائی تو اہل کتاب میں سے باقی ماندہ کچھ لوگوں کے علاوہ عرب اور عجم کے سب لوگوں کو ناپسند کیااور ارشاد فرمایا کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی اپنی آزمائش کے لیے اور آپ کے ذریعے دوسروں کی آزمائش کے لیے بھیجا ہے اور آپ پر ایسی کتاب نازل کی ہے جس کو پانی نہیں دھو سکتا آپ سوتے ہوئے بھی اس کی تلاوت کریں گے اور جاگتے ہوئے بھی۔

۴۔ ذالک سے قرآن کے اس حصے کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں نازل ہوا۔

۵۔ جب اللہ تعالیٰ نے مکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل فرمائی: ﴿إنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْکَ قَوْلاً ثَقِيْلاً﴾ [المزمّل ۷۳: ۵] (ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل کرنے والے ہیں) تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے اس وعدے کے پورے ہونے کا انتظار فرماتے رہے یہاں تک کہ مدینہ منورہ میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿الٓمّ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لارَيْبَ فِيْهِ﴾ جس کا مطلب یہ تھا: "هٰذَا الْقُرآنُ الّذِی أنْزَلْتُهُ عَلَيکَ بِالمدينةِ ذٰلِکَ الكتابُ الذي وَعَدْتُکَ أنْ أُوحِيَهُ إليکَ بِمَكَّةَ" (یہ قرآن جو میں نے مدینہ میں آپ پر نازل کیا وہی ہے جس کا وعدہ میں نے آپ سے مکہ میں کیا تھا)۔

۶۔ ذٰلِکَ سے ان مضامین کی طرف اشارہ ہے جو تورات اور انجیل میں ہیں۔ اس صورت میں "الٓمّ" قرآن کا نام ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: هٰذَاالْقُرآنُ ذٰلِکَ الْكِتَابُ المُفَسّر فِي التوراةِ وَالإنْجِيلِ" (یہ قرآن وہی کتاب ہے جس کی وضاحت تو[illegible]ت وانجیل میں موجود ہے) یعنی یہ کہ توریت اور انجیل بھی اس بات کی گواہ ہیں کہ قرآن حق ہے اور اس میں دونوں کتابوں کے تمام مضامین کے ساتھ ساتھ مزید مضامین کا اضافہ ہے۔

۷۔ ﴿ذٰلِکَ الْکِتَابُ﴾ سے توریت اور انجیل دونوں کی طرف اشارہ ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: "الٓمّ ،ذَالِکَ الكِتَابَانِ أوْمِثلَ ذَينِکَ الكِتابَينِ" (اس قرآن میں ان دونوں کتابوں کے مضامین موجود ہیں یا یہ قرآن مجید ان دونوں کتابوں کی طرح ہے)۔ اس طرح ذٰلِکَ بول کر ان دونوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک اور

[۲۸۳] صحیح مسلم: كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب الصفات التي يُعرَف بها في الدنيا أهل الجنة وأهل النار ۴: ۲۱۹۷

آیت میں اس کی دلیل موجود ہے جہاں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَا فَارِضٌ وَلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذَٰلِكَ﴾[البقرۃ ۲: ۶۸] (وہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا بلکہ اوسط عمر کی ہو)۔ "أي عوانٌ بَينَ تَينِكَ أي الفارضِ والبكرِ (ان دونوں بوڑھی اور بچھیا کے درمیانی عمر میں ہو) جیسا کہ اس کا ذکر آئندہ آئے گا۔

۸۔ ذٰلِکَ سے لوحِ محفوظ کی طرف اشارہ ہے۔ کسائی کہتے ہیں کہ اس قرآن کی طرف اشارہ مقصود تھا جو آسمان میں تو تھا مگر اس وقت تک نازل نہیں ہوا تھا۔

۹۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ کتاب سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک کتاب نازل کرنے کا وعدہ فرمایا تھا۔ ﴿ذٰلِکَ﴾ سے اسی وعدہ کی طرف اشارہ ہے۔ مبرد کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ یہ قرآن وہی کتاب ہے جس کے عنقریب نازل ہونے کا ذکر کر کے تم کافروں کو اپنے غلبہ کی دھمکیاں دیا کرتے تھے۔

۱۰۔ جن لوگوں کے خیال میں ﴿الٓمٓ﴾ سے مراد وہ حروف ہیں جن کا ذکر کے اللہ تعالیٰ نے کفار کو اپنے شعروں کے ذریعے قرآن کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی ہے، ان کی رائے میں ﴿ذٰلِکَ﴾ سے حروفِ تہجی کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿الْكِتَابُ﴾ مصدر ہے كَتَبَ يكتُبُ سے جس کا معنی جمع کرنا ہے۔ كَتِيبة بمعنی لشکر بھی اسی سے مشتق ہے کیوں کہ اس میں بھی (فوجی) جمع ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے۔ تَكَتَّبَتِ الخَيلُ (گھوڑے گروہوں کی شکل میں جمع ہوگئے)۔ جب کوئی شخص مادہ خچر کے رحم کے دونوں کناروں کو کسی حلقہ یا رسی کے ذریعہ اکٹھا کر دے تو وہ کہتا ہے: "كَتَبتُ البَغْلَةَ"۔ شاعر کہتا ہے:

لاتأمَنَنَّ فَزارِيًّا حَلَلْتَ بِهِ عَلىٰ قَلُوصِكَ وَاكتُبْهَا بِأَسْيار [1]

اگر تو بنو فزارہ کے کسی شخص کے پاس ٹھہرے تو اپنی تیز رفتار اونٹنی کو اس کے سہارے نہ چھوڑ بلکہ اسے رسیوں کے ساتھ باندھ دے

کاف کے ضمہ کے ساتھ "الكُتْبَة" تسمہ کو کہتے ہیں جس کی جمع الكُتَبُ ہے جب کہ کاف کے فتحہ کے ساتھ "الكتَبُ" پتھر یا شیشے کے چھدے ہوئے نگینوں کو کہتے ہیں۔ ذوالرمۃ کا ایک شعر ہے:

وَفْرَاءَ غَرْفِيَّةٍ أَثْأَى خَوَارِزُهَا مُشَلْشِلٌ ضَيَّعَتْهُ بينَها الكُتَبُ [2]

یہ ایک لمبی چوڑی رنگی ہوئی کھال ہے جس کی سلائی والے سوراخ کمزور پڑ چکے ہیں۔ اس کا پانی بہتا رہتا ہے جسے اس سلائی کے دھاگے ان سوراخوں میں پھیلا دیتے ہیں۔

۱۔ لسان العرب (کتب)، العقد الفرید ۲: ۳۰۰

۲۔ جمهرة أشعار العرب ص ۱۷۷، لسان العرب (کتب)

''کِتَاب'' حروف تہجی کی اس لکھائی کو کہتے ہیں جس کو لکھنے والا الگ الگ حروف کی شکل میں یا ملا کر لکھتا ہے۔ یہ لکھائی اگرچہ اصل میں مکتوب کہلاتی ہے لیکن اسی کو ''کتاب'' بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تُؤَمِّلُ رَجْعَةً مِنِّي وَفِيهَا　　کِتَابٌ مِثْلَ مَالصِقَ الغِرَاءُ

وہ مجھ سے واپس لوٹنے کی امید رکھتی ہے مگر ایک لکھی ہوئی عبارت اس میں رکاوٹ ہے جو اتنی اٹل ہے جیسے سریش کسی چیز کے ساتھ چپک گئی ہو۔

کتاب کے دیگر معانی میں: کوئی چیز لازم یا فرض کرنا، فیصلہ کرنا اور تقدیر شامل ہیں۔ نابغہ جعدی[1] کہتا ہے:

یابنةَ عمِّي کتابُ اللّٰهِ أخْرَجنِي　　عَنْکُم وَهَل أمنعَنَّ اللّٰهَ مافعَلا

اے میرے چچا کی بیٹی! اللہ تعالیٰ کے فیصلے نے مجھے تم سے دور کر دیا ہے تو کیا میں اللہ تعالیٰ کو اس کام سے روک سکتا ہوں جو وہ کرتا ہے۔

''رَیب'' کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ؛ (لاریبَ) نفی جنس ہے اس لیے منصوب ہے۔ لفظ ریب کے تین معانی آتے ہیں:

۱۔ **شک کرنا:** جیسا کہ عبداللہ بن الزبعری نے کہا ہے:

لَيسَ فِي الحقِّ یاأُمَیمَةُ رَیبٌ　　إنَّمَا الرَّیبُ مَا یقُولُ الجَهُولُ

اے امیمہ حق میں کوئی شک نہیں۔ شک تو اس چیز میں ہے جو جاہل کہتا ہے۔

۲۔ **تہمت:** جیسا کہ جمیل کہتا ہے:

بُثَینَةُ قَالَتْ یاجَمِیلُ اربتَنِي　　فَقُلْتُ کِلَانا یابُثَینُ مُرِیبٌ

بثینہ نے کہا اے جمیل! تو نے مجھ پر تہمت لگائی ہے۔ میں نے کہا: اے بثینہ ہم دونوں ہی تہمت لگانے والے ہیں۔

۳۔ **حاجت وضرورت:** جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

۱۔ نابغہ الجعدی: قیس بن عبداللہ بن عدس دورجاہلیت کے مشہور شاعر ہیں۔ بعثت نبوی کے بعد بھی کچھ عرصہ زندہ رہے۔ المؤتلف والمختلف ص ۲۵۲

قَضَينَا مِن تِهَامَةَ كُلَّ رَيبٍ وَخَيبَرَ ثُمَّ أَجْمَعْنَا السُّيوفَا (۱)

ہم نے تہامہ اور خیبر سے ہر قسم کی ضرورت پوری کی، پھر ہم نے تلواروں کو سمیٹ لیا

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ قرآن اپنی ذات میں ہر طرح کے شک سے پاک ہے اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے نہ کہ اس کی مخلوق۔ قرآن عدم سے وجود میں نہیں آیا خواہ کفار شک میں مبتلا رہیں۔ ایک موقف یہ ہے کہ اس ارشاد باری تعالیٰ کا ظاہری معنی تو خبر والا ہے مگر درحقیقت اس سے مقصود نہی ہے یعنی تم اس میں شک نہ کرو اور اسی پر بات پوری ہوگئی ۔گویا کہ اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا کہ یہ کتاب بلاشبہ اسی کے ارشادات کا مجموعہ ہے۔ جب کسی معاملہ کی وجہ سے بندہ کے دل میں شک اور خوف پیدا ہو جائے تو کہا جاتا ہے: "رَابَنِي هٰذَا الأمر" (مجھے اس بات نے ڈرادیا ہے)۔ أَرَابَ کا معنی ہے شک والا ہونا ۔اس سے اسم فاعل مُرِیب ہے اور رَابَنِي أمرُه (مجھے اس کے معاملے میں شک ہے) اور رَیبُ الدَّهر کا معنی زمانہ کے مصائب ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ﴾ کی تفسیر چھ مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث: فِیهِ کی تحقیق

اس میں "ہ" ضمیر حرف جر "في" کی وجہ سے محل جر میں ہے اور اس میں پانچ قراء ات منقول ہیں جن میں سب سے بہتر ﴿فِيهِ هُدًى﴾ ہے۔ اس کے بعد ہا ء کے ضمہ کے ساتھ واؤ کے بغیر هُدًى والی قراء ت ہے جو کہ زُہری اور سلام ابوالمنذر سے منقول ہے ۔ تیسرا درجہ ابن کثیرؒ کی قراء ت کا ہے جو کہ فيه کے آخر میں یاء کے اضافہ کے ساتھ فِيهِي هُدًى ہے۔ اسے واؤ کے ساتھ فيهُو هُدًى پڑھنا بھی جائز ہے۔ پانچویں قراء ت ہا کو ہا میں ادغام کر کے فِيهُ هُدًى پڑھنا ہے۔

﴿هُدًى﴾ متبداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر "فيهِ" ہے۔ کلام عرب میں الهُدیٰ کا معنی رہنمائی اور وضاحت ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس قرآن میں عقل و بصیرت رکھنے والوں کے لیے رہنمائی، رشد و ہدایت اور مزید وضاحت موجود ہے۔

۱۔ یہ شعر ابوعبداللہ حضرت کعب بن مالک انصاریؓ کا ہے۔ ان کی کنیت جاہلیت میں ابوبشیر تھی۔ الإصابة ۳: ۳۰۲، لسان العرب (ریب)

دوسری بحث: ہدایت کا معنی اور اس کی اقسام

انبیاء وصلحاء کے اختیار میں ہدایت

ہدایت کی دو قسمیں ہیں: ایک ہدایت بمعنی رہنمائی ہے اور یہ وہی ہے جو پیغمبروں اور ان کے پیروکاروں کے بس میں ہوتی ہے ۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾[الرعد ۱۳: ۷](اور ہر قوم کا ایک رہنما ہے) نیز فرمایا: ﴿وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾[الشوریٰ ۴۲: ۵۲](اورآپ سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں)۔اس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان ہستیوں کے لیے ہدایت کی وہ صورت مقرر فرمادی جس کا معنی رہنمائی ،دعوت اور تنبیہ کرنا ہے۔

ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ خاص ہدایت

ہدایت کی دوسری قسم کو جو کہ مدد اور توفیق کے معنی میں ہے باری تعالیٰ نے صرف اپنی ذات عالی کے ساتھ خاص رکھا ہے۔ اسی لیے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں خطاب فرمایا: ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ﴾[القصص ۲۸: ۵۶] (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے)۔اس اعتبار سے کہ ہدایت دل کے اندر ایمان پیدا کرنے کے معنی میں ہے اور اس بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ﴾[البقرۃ ۲: ۵](ایسے لوگ اپنے رب کی طرف سے راہ راست پر ہیں)۔ ارشاد گرامی: ﴿وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾[یونس ۱۰: ۲۵](اور جسے وہ چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے)سے بھی یہی مراد ہے ۔الھُدیٰ: خود ہدایت پانے کے معنی میں بھی آتا ہے اور اس میں جو صیغہ بھی استعمال کیا جائے اس کا معنی ہدایت و رہنمائی والا ہی بنتا ہے۔ ابوالمعالیؒ [۱] کہتے ہیں: کبھی ہدایت کا لفظ استعمال کر کے اس سے مراد جنت کے راستوں اور ان تک پہنچانے والے اعمال کی طرف مومنوں کی رہنمائی کرنا بھی لیا جاتا ہے جیسا کہ باری تعالیٰ نے مجاہدین کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿فَلَن يُضِلَّ أَعْمَالَهُمْ سَيَهْدِيهِمْ﴾[محمد ۴۷: ۴-۵] (اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو ہرگز ضائع نہ کرے گا۔ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا)۔ اسی طرح ارشاد ہے: ﴿فَاهْدُوهُمْ إِلَىٰ صِرَاطِ الْجَحِيمِ﴾ [الصّٰفّٰت ۳۷: ۲۳] (جہنم کے راستے کی طرف ان کی راہنمائی کرنا) یعنی ان کو اس راہ پر لے چلو۔

۱۔ ضیاء الدین ابوالمعالی عبدالملک بن عبداللہ الجوینی النیسابوری الشافعی الاشعری (م ۴۷۸ھ) امام الحرمین کے لقب سے مشہور تھے۔ بہت بڑے فقیہ، متکلم، مفسر اور اصولی تھے۔ متعدد تصانیف ان کی یادگار ہیں۔معجم المؤلفین ۶: ۱۸۴

تیسری بحث: ہدایت کی لغوی تحقیق

لفظ "الھُدٰی" مؤنث ہے۔ فراء کہتے ہیں کہ بنو اسد اسے بطور مؤنث استعمال کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "ھُدًی حَسَنَةٌ"۔ لحیانی کہتے ہیں: یہ مذکر ہے اور اس پر ظاہری اعراب نہیں آتا کیوں کہ یہ اسم مقصور ہے اور اسم مقصور کے آخر میں الف پر حرکت نہیں آ سکتی۔ "ھُدًی" حرف جر کے صلہ کے ساتھ اور بغیر صلہ دونوں طرح متعدی ہوتا ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں گزر چکا ہے۔ اس طرح هَدَيْتُه' الطريقَ، هَدَيْتُهُ إِلَى الطريقِ هَدْيًا (میں نے اسے راستہ کی طرف رہنمائی کی) اور اسی طرح هديتُهُ الدارَ، هدَيتهُ إلَى الدَّارِ (میں نے اسے گھر کی طرف رہنمائی کی) دونوں طرح کہا جا سکتا ہے۔ پہلی لغت (صلہ کے بغیر) اہل حجاز کی ہے اور دوسری لغت (صلہ کے ساتھ) اخفش نے ذکر کی ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (ہمیں سیدھے راستہ پر چلا)۔ نیز ارشاد ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا﴾ [الأعراف۷: ۴۳] (سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں یہ راستہ دکھایا)۔ دن کے وقت کو بھی "الھُدٰی" کہا جاتا ہے کیوں کہ اس میں لوگ اپنی معاشی اور دیگر ضروریات کی طرف راہ پاتے ہیں۔ اسی معنی میں ابن مقبل کہتا ہے:

حَتَّى اسْتَبَنْتُ الهُدٰى وَالبِيدُ هَاجِمَةٌ يخْشَعْن فِي الآلِ غُلْفًا أَو يُصَلِّينا

چوتھی بحث: ﴿لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ کی تفسیر

قرآن کریم اگرچہ ساری مخلوق کے لیے ہدایت ہے مگر یہاں صرف متقین کا ذکر ان کے بلند مرتبہ کے اظہار کے طور پر کیا کیوں کہ وہ ایمان لائے اور قرآن میں جو کچھ ہے اس کی تصدیق کی۔ ابوروق سے منقول ہے کہ ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ میں ہدایت کی نسبت متقین کی طرف ان کی عزت افزائی اور عظمت شان واضح کرنے کے لیے کی گئی۔ "لِلْمُتَّقِين" اصل میں بغیر شد اور دو یاؤں کے ساتھ "لِلْمُوتَقِيِينَ" تھا۔ پہلی یاء پر کسرہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کیا گیا پھر دو ساکن جمع ہو جانے کی وجہ سے ایک یاء کو حذف کر دیا گیا، پھر "مُوتقين" کی واؤ کو فی قاعدہ کے مطابق تاء سے بدل کر تاء کو تاء میں ادغام کر دیا گیا تو "مُتَّقِينَ" ہوگیا۔

پانچویں بحث: تقویٰ کی تحقیق اور مؤلف کی رائے

لغوی طور پر تقویٰ قلتِ کلام کو کہتے ہیں۔ یہ ابن فارس کا قول ہے۔ میں کہتا ہوں: درج ذیل حدیث کا بھی یہی معنی ہے:

[۲۸۴] التَّقِيّ مُلجَمٌ والمُتقِي فَوقَ المُؤمنِ والطّائِع۔

پرہیزگار آدمی اتنا کم بولتا ہے گویا کہ اس کے منہ میں لگام ہو اور متقی ایماندار اور فرماں بردار سے زیادہ درجہ رکھتا ہے۔

اس سے مراد وہ آدمی ہے جو اپنے اعمال صالحہ اور دعائے خالصہ کے ذریعے عذاب خداوندی سے بچتا ہے اور یہ اتِّقَاءُ الْمَکرُوہ (یعنی تکلیف سے بچنے) سے لیا گیا ہے۔جس کی مناسبت یہ ہے کہ بچنے کا یہ عمل آپ کے اور تکلیف کے درمیان رکاوٹ بن جاتا ہے۔ نابغہ کہتا ہے:

سَقَطَ النَّصِيفُ ولم تُرِدْ إِسْقَاطَهُ فَتَنا وَلَتْهُ وَاتَّقَتنا بِالْيَدِ[1]

دوپٹہ گر گیا حالاں کہ وہ اسے گرانا نہ چاہتی تھی۔ چناں چہ اس نے اس کو پکڑا اور اپنے ہاتھ کے ذریعے اپنے آپ کو ہم سے چھپا لیا۔

دوسرا شاعر کہتا ہے:

فَأَلْقَتْ قِنَاعًا دَونه الشَّمسُ وَاتَّقَتْ بِأَحْسَنِ مَوصُولَيْنِ كَفٍّ وَمِعْصَمِ[2]

اس نے نقاب اتار پھینکا جس کے پیچھے سورج (جیسا چہرہ) تھا۔ اور دو خوبصورت اعضاء ہاتھ اور کلائی سے اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

ابو محمد عبدالغنی الحافظ نے سعید بن زربی ابی عبیدہ[3] کی روایت سے نقل کیا ہے، انہوں نے عاصم بن بہدلہ سے، انہوں نے زر بن حبیش[4] سے اور انہوں نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے کہ ایک دن آپ نے اپنے بھتیجے سے کہا: اے بھتیجے تو دیکھ رہا ہے لوگ کتنے زیادہ ہیں؟ اس نے کہا جی ہاں آپؓ نے فرمایا: ان میں سے توبہ کرنے والے اور متقی کے علاوہ کسی میں بھلائی نہیں ہے۔ دوسری مرتبہ پھر فرمایا کہ اے بھتیجے! کیا تو دیکھ رہا

---

[۲۸۴] یہ حدیث مرفوعاً مجھے نہیں ملی۔ امام بیہقیؒ نے شعب الإیمان، التاسع والثلاثون ......، الفصل الثالث في طیب المطعم والملبس......۵:۶۳ میں اسے اپنی سند کے ساتھ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول نقل کیا ہے: "التَقِي مُلجَمٌ لايَستَطِيعُ كُلّ ما يُرِيد۔

۱۔ لسان العرب (نصف)

۲۔ یہ شعر ابو حَیّہ النمیری کا ہے جو کہ اپنے وقت میں سب سے بڑا شاعر تھا۔ جاحظ: البیان والتبیین ۲: ۲۲۸

۳۔ ابوعبیدہ یا ابومعاویہ سعید بن زَربی البصری العبادانی کو اکثر علماء رجال نے ضعیف کہا ہے۔ الکامل فی الضعفاء ۴:۴۰۶

۴۔ ابومریم زر بن حبیش الاسدی الکوفی (م ۸۲ھ) تابعی ہیں۔ انہوں نے زمانہ جاہلیت بھی پایا اور ایک سو بیس سال کی عمر میں وفات پائی۔ ابن معین نے انہیں ثقہ اور ابن سعد نے ثقہ کثیر الحدیث کہا ہے۔ تہذیب التہذیب ۳: ۳۲۱، اعلام زرکلی: ۳: ۴۵

ہے لوگ کس قدر زیادہ ہیں؟ اس نے عرض کیا جی ہاں! حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ان میں سے سوائے عالم اور طالب علم کے کسی میں بھلائی نہیں۔

ابو یزید بسطامیؒ(۱) فرماتے ہیں: متقی وہ آدمی ہے کہ جب بولے تو اللہ کے لیے بولے اور جب کوئی کام کرے تو اللہ تعالیٰ کے لیے کرے۔ ابوسلمان دارانیؒ کا کہنا ہے: متقی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں سے اللہ تعالیٰ نے خواہشات نفسانی کی محبت کو ختم فرما دیا ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ متقی وہ آدمی ہے جو شرک سے بچے اور نفاق سے خالی ہو۔ ابن عطیہؒ کہتے ہیں: یہ بات صحیح نہیں ہے کیوں کہ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ بندہ شرک سے بھی بچے، نفاق سے بھی پاک ہو مگر دیگر گناہوں میں مبتلا ہو۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے ابی بن کعبؓ سے تقویٰ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

هَلْ أَخَذْتَ طَرِيقًا ذَاشَوكٍ؟ قال: نَعم۔ قال: فَما عمِلْتَ فيهِ؟ قالَ: تَشَمَّرْتُ وحَذَرْتُ، قالَ: فذاكَ التقوَى۔

کیا آپؓ کبھی کانٹے دار راستے پر چلے ہیں؟ فرمایا: ہاں! حضرت ابی نے پوچھا: آپ نے وہاں کیا طریقہ اختیار کیا؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں نے کپڑے سمیٹے اور احتیاط سے گزرا حضرت ابیؓ نے فرمایا بس یہی تقویٰ ہے۔

یہی بات ابن معتز نے نظم میں بیان کی ہے:

خَلِّ الذنُوبَ صغيرَهَا وَكَبِيرَهَا ذَاكَ التُّقَى
وَاصْنَعْ كَمَاشٍ فوقَ أَرْ ضِ الشَّوكِ يَحْذَرُ مَايَرَى
لا تحقِرَنَّ صَغِيرةً إِنَّ الجِبَالَ مِنَ الحِصَى

چھوٹے بڑے سب گناہوں کو چھوڑ دو یہی تقویٰ ہے اور ایسے کام کرو جیسے کانٹے دار زمین پر چلنے والا کرتا ہے۔ وہ جس چیز کو دیکھتا ہے اس سے احتیاط کرتا ہے۔ چھوٹے گناہ کو کبھی چھوٹا نہ سمجھو کیوں کہ پہاڑ چھوٹے چھوٹے کنکروں سے بنتے ہیں۔

چھٹی بحث: تقویٰ کی افادیت

تقویٰ میں ساری بھلائی جمع ہے اور اوّل سے آخر تک سب لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے اور وہ سب سے بہتر چیز ہے جس سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ حضرت ابودرداءؓ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ آپؓ

۱۔ ابو یزید طیفور بن عیسی البسطامی (م ۲۶۱ھ) مشہور عابد زاہد بزرگ ہیں۔ یہ تین بھائی تھے اور تینوں بڑے عبادت گزار تھے۔ ان کے دادا مجوسی تھے جس سے تائب ہوکر مسلمان ہوئے۔ جمهرة الاولياء ۲: ۱۳۷

کے ساتھی تو شعر و شاعری کرتے ہیں مگر آپ سے کوئی شعر منقول نہیں اس کی کیا وجہ ہے؟ تو آپؓ نے ارشاد فرمایا:

يُرِيدُ المرءُ أنْ يُؤتى مُناهُ　　وَيأبَى اللّٰهُ إلّا ما أرادَا

يَقُولُ الْمَرءُ فَائِدَتِي وَمَالِي　　وَتَقوَى اللّٰهِ أفضلُ مَا اسْتَفادَا

آدمی چاہتا ہے کہ اس کی آرزو پوری ہو مگر اللہ تعالیٰ صرف وہی کرتے ہیں جو خود چاہتے ہیں۔ آدمی کہتا ہے میرے مفادات محفوظ رہیں اور مجھے مال ملے حالاں کہ اللہ کا خوف سب سے بہتر چیز ہے جس سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں حضرت ابو امامۃ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۲۸۵] مَا استفَادَ المُؤمِنُ بَعْدَ تَقْوَى اللّٰهِ خيرًا لهُ مِن زَوجةٍ صالحةٍ إن أمرَها أطاعتْهُ وإنْ نظَرَ إليهَا سرَّتهُ وَإن أقسمَ عليهَا أبَرّتهُ وإنْ غابَ عَنْها نَصَحتْهُ فِي نَفْسِهَا وَمَالِه۔

تقویٰ کے بعد مومن کے لیے اس نیک بیوی سے زیادہ مفید کوئی چیز نہیں جسے وہ کوئی بات کہے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور اگر اس کی طرف دیکھے تو اس کو اچھی لگے اور اگر وہ اسے قسم دے تو اس کی قسم کو پورا کرے اور اگر وہ اس کے پاس موجود نہ ہو تو اپنے نفس اور خاوند کے مال میں خیانت نہ کرے۔

تَقْوَى اصل میں وَقْوَى بروزن فَعْلَى تھا جس کی واؤ کو تاء سے بدل دیا گیا۔ یہ وَقَيْتُهُ اَقِيهِ سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے: میں نے اس کو روکا۔ اسی طرح رَجُلٌ تَقِيٌّ (ڈرنے والا آدمی) بھی اصل میں وَقِيٌّ اور تُقَاةٌ اصل میں وُقَاةٌ تھا جیسا کہ "تُجَاهٌ اور تُرَاثٌ" اصل میں وُجَاهٌ اور وُرَاثٌ تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ:

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾

جو غائب پر ایمان لاتے ہیں اور آداب کے ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر چھبیس مباحث پر مشتمل ہے:

[۲۸۵] سنن ابن ماجہ: کتاب النکاح، باب أفضل النساء ۱:۵۹۶، امام ابن ماجہ کی سند میں علی بن یزید اور قاسم بن عبدالرحمٰن ضعیف ہیں مگر ابوداود، نسائی، حاکم، ابویعلی، عبدالرزاق اور بیہقیؒ کی روایات اس کی مؤید ہیں۔

پہلی بحث: ﴿ اَلَّذِيْنَ ﴾ کا اعراب اور ایمان کی تفسیر

ارشاد باری تعالیٰ ﴿اَلَّذِيْنَ﴾ محل جر میں ہے کیوں کہ وہ ﴿ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ کی صفت ہے۔ اسے ﴿ الْمُتَّقِيْنَ﴾ سے الگ قرار دے کر مرفوع کہنا بھی جائز ہے اور اس صورت میں اصل عبارت: "هُم الَّذِيْنَ" ہوگی۔ اس میں اعراب کی تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ بطور مفعول منصوب ہو۔ ﴿يُؤْمِنُوْنَ﴾ کا معنی يَصَدِّقُوْنَ(تصدیق کرنا) ہے۔ لغت میں ایمان تصدیق کو ہی کہتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿ وَمَا أَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَنَا ﴾[یوسف ۱۲: ۱۷] (آپ ہماری بات نہیں مانیں گے)۔"ایمان" باء اور لام دونوں کے صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ﴾[آل عمران ۳: ۷۳] (اور اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو) اور ﴿فَمَا آمَنَ لِمُوْسٰى﴾[یونس ۱۰: ۸۳] (موسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لائے)۔ حجاج بن حجاج الاحول جن کا لقب زق العسل (شہد کا پیالہ) ہے روایت کرتے ہیں کہ میں نے قتادہ کو یہ کہتے سنا:

يَابنَ آدم! إنْ كُنتَ لاتُريدُ أن تَأتِيَ الخيرَ إلَّا عَنْ نَشَاطٍ فَإنَّ نَفسَكَ مائِلَةٌ إلى السَّأمَةِ والفَتْرَةِ والمَلَّة، ولكنَّ المُؤمِنَ هُوَ المُتَحَامِلُ، والمُؤمِنُ هُوَ المُتَقوّي، وَالمُؤمِنُ هُوَالمتشَدِّد، وَإنَّ المؤمِنينَ هُمُ العَجَّاجونَ إلى اللّٰهِ اللَّيلَ وَالنَّهارَ، وَاللّٰهِ مَايَزالُ المؤمِنُ يَقولُ: رَبَّنا رَبَّنا فِي السِّرِّ وَالعَلانِيَةِ حتّٰى استجابَ لَهُمْ فِي السِّرِّ وَالعَلَانيةِ

اے ابن آدم! اگر تم یہ چاہتے ہو کہ بھلائی کے کام صرف اس وقت کرو جب تمہاری طبیعت میں چستی ہو تو سمجھ لو کہ تمہاری طبیعت اکتاہٹ، کوتاہی اور تنگ دلی و بے زاری کی طرف مائل ہے۔ مؤمن وہ ہوتا ہے جو تکلیف و مشقت کے باوجود زبردستی کام کرے۔ طاقت نہ ہو تو بھی طاقت کا اظہار کرے اور پورے زور سے کام لے۔ مؤمنین تو رات دن اللہ تعالیٰ کے دربار میں گڑگڑانے والے ہوتے ہیں۔ خدا کی قسم مؤمن خفیہ اور اعلانیہ ہر حال میں اپنے رب کو پکارتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ خفیہ اور اعلانیہ ہر حال میں اس کی دعا قبول کر لیتا ہے۔

دوسری بحث: غیب کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ ﴿بِالْغَيْبِ﴾: کلام عرب میں غیب ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو آپ سے پوشیدہ ہو۔ یہ اجوف یائی ہے چناں چہ کہا جاتا ہے: غَابَتِ الشَّمسُ (سورج غروب ہوگیا) تَغِيبُ (غروب ہوتا ہے) اور لفظ غیبت تو مشہور ہے۔ جب کسی عورت کا خاوند اس سے غائب ہو جائے تو کہا جاتا ہے: "أغابت المَرأة"۔ اسی سے

اسم فاعل "مُغِيبَةٌ" آتا ہے۔ اگر کوئی شخص نیچی زمین میں چلا جائے تو کہاجاتا ہے: "وَقَعْنَا فِي غَيْبَةٍ و غِيَابَةٍ"۔ درختوں کے جھنڈ کو بھی جس میں آدمی جائے تو گم ہو جائے "غِيابةٌ" کہاجاتا ہے۔اسی طرح پست زمین بھی "غِيابةٌ" کہلاتی ہے کیوں کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔

تیسری بحث: "غَیب" کی تفسیر

یہاں غیب سے مراد کیا ہے؟ اس کے بارے میں مفسرین کی آراء مختلف ہیں۔ ایک جماعت کا قول ہے کہ غیب سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات ہے مگر ابن العربی نے اس رائے کو ضعیف قرار دیا ہے۔ دوسری جماعت کا قول ہے کہ اس سے مراد تقدیر ہے۔ ایک اور قول یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن اور اس کے راز ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جس تک انسانی عقل خود نہیں پہنچ سکتی تھی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی خبر دی جیسے قیامت کی علامات، عذاب قبر، حشر ونشر، پل صراط، میزان، جنت اور جہنم۔ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ ان اقوال میں باہم کوئی تعارض نہیں بلکہ غیب کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: یہی وہ شرعی ایمان ہے جس کی طرف حدیث جبرئیل میں اشارہ کیا گیا ہے جب جبرئیل علیہ السلام نے حضور علیہ الصلاۃ والتسلیم سے عرض کیا:

[۲۸۶] فَأَخبِرْنِي عَنِ الإيمانِ۔ قال: أن تُؤمِنَ بِاللّٰهِ و ملائِكَتِهِ وكُتُبِهِ وَ رُسُلِهِ وَاليومِ الآخِرِ وتُؤمِنَ بِالقَدرِ خَيرِهِ وشَرِّهِ" قالَ: صَدَقْتَ۔

مجھے ایمان کے بارے میں بتادیجیے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تو اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن اور اچھی بری ہر طرح کی تقدیر پر ایمان لائے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا: آپؐ نے صحیح فرمایا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

کوئی مومن اس سے بہتر ایمان نہیں لا سکتا کہ بغیر دیکھے ایمان لائے۔ پھر آپؓ نے قرآن پاک کی آیت کریمہ ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ تلاوت فرمائی۔

---

[۲۸۶] حدیث جبریل مشہور اور متفق علیہ ہے۔ اس کی تخریج بھی گزر چکی ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: قرآن پاک کی آیات ﴿وَمَا كُنَّا غَائِبِيْنَ﴾ [الأعراف۷: ۷] (اور ہم غائب نہیں تھے) اور ﴿اَلَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ﴾ [الأنبياء۲۱: ۴۹] (وہ جو بن دیکھے اپنے رب سے ڈرتے ہیں) سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مخلوق کی نظروں سے غائب ہیں اور اس دنیا میں نظر نہیں آتے مگر وہ غور و فکر اور دلائل کے لحاظ سے غائب نہیں ہیں۔ مومن اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ ان کا ایک ایسا قدرت والا پروردگار ہے جو ان کو اعمال کا بدلہ دے گا۔ اس لیے وہ خلوت اورتنہائی میں بھی جب لوگ انہیں نہیں دیکھ پاتے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں دیکھ رہا ہے۔اس طرح ان آیات کے معانی پر اتفاق ہے اور اس ضمن میں کوئی اختلاف یا تضاد نہیں۔ ایک اور رائے کے مطابق "بالغیب" کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیروں کو حاضر کر کے دل سے ایمان لاتے ہیں نہ کہ منافقین کی طرح زبانی دعویٰ سے کام لیتے ہیں اور یہ بہت اچھا قول ہے، شاعر کہتا ہے:

وَبِالْغَيْبِ آمَنَّا وَقَدْ كَانَ قَوْمُنَا يُصَلُّوْنَ لِلأَوْثَانِ قَبْلَ مُحَمَّدٍ[1]

ہم دلوں سے ایمان لائے ہیں حالاں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہماری قوم بتوں کی پوجا کیا کرتی تھی۔

چوتھی بحث: اقامتِ نماز

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ﴾ کا عطف پہلے جملہ ﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ پر ہے اور نماز کا قائم کرنا یہ ہے کہ اسے اس کے ارکان، سنن اور طریقہ کے مطابق اس کے وقت میں ادا کیا جائے جس کا بیان آگے آئے گا۔ قامَ الشیءُ اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی چیز کا مستقل قائم رہنا مراد ہو، اس سے پاؤں پر کھڑا ہونا مراد نہیں چناں چہ کہا جاتا ہے قامَ الحقُّ: حق غالب آگیا اور ثابت ہوگیا۔ شاعر کہتا ہے:

وَقَامَتِ الحربُ بِنَا علىٰ سَاقٍ

جنگ ہمیں لے کر پنڈلی پر کھڑی ہوگئی۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

وَإِذَا يُقَالُ أُتِيتُم لَمْ يَبْرَحُوا حتّٰى تُقِيمَ الخَيلُ سُوقَ طِعَانٍ[2]

۱۔ لسان العرب (أمن)

۲۔ شاعر کا نام مرار بن سعید الفقعسی ہے۔ خزانة الأدب۳: ۲۳۳، تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۴۶

جب انہیں بتایا جائے کہ تم پر حملہ ہوگیا ہے تو وہ ڈٹ جاتے ہیں یہاں تک کہ گھڑ سوار اپنے نیزے تان لیتے ہیں۔

﴿وَيُقِيْمُوْنَ﴾ کا ایک معنٰی ''يُدِيمُونَ'' (وہ ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں) بھی منقول ہے۔ اس طرح ''اقامه'' کا معنٰی ''أدامهٗ'' (اس نے ہمیشہ یہ کام کیا) ہوگا۔ اسی معنی کی طرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے اس قول میں اشارہ فرمایا ہے:

[۲۸۷] مَنْ حَفِظَهَا وَحَافَظَ عَليهَا حِفظَ دِينَهٗ، وَمَنْ ضَيَّعَهَا فَهُوَ لِمَا سِواهَا أضْيَع

جس نے نماز کی حفاظت کی اور اسے ہمیشہ قائم رکھا تو اس نے اپنے دین کو محفوظ رکھا اور جس نے نماز کو ضائع کیا وہ اس کے علاوہ دوسرے احکامات کو ضائع کرنے والا ہے۔

پانچویں بحث: نماز کے لیے اقامت کہنے کا حکم

نماز کے لیے اقامت سے سب لوگ واقف ہیں اور وہ جمہور علماء کے نزدیک سنت ہے اور اس کے چھوڑنے والے پر نماز لوٹانا ضروری نہیں۔ امام اوزاعی، عطاء، مجاہد اور ابن ابی لیلیٰ کے نزدیک اقامت واجب ہے اور اس کے چھوڑنے پر نماز لوٹانا ضروری ہے۔ اہل ظاہر کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام مالکؒ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے۔ اسی کو ابن العربی نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے کہ چوں کہ دیہاتی والی حدیث میں (لفظ) ''واَقِم''[1] صیغہ امر کے ساتھ موجود ہے اس لیے یہاں بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اسی طرح سمجھا جائے گا جس طرح تکبیر تحریمہ، استقبال قبلہ اور وضو کے بارے میں سمجھا گیا ہے۔ ابن العربیؒ فرماتے ہیں: اب جب تمہیں حدیث مل گئی ہے تو ضروری ہے کہ تم امام مالک کے دو اقوال میں سے اس قول پر فتویٰ دو جو حدیث کے مطابق ہے اور وہ یہ کہ اقامت فرض ہے۔ حافظ ابن عبدالبرؒ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی:

---

[۲۸۷] مؤطا امام مالکؒ: کتاب وقوت الصلاۃ، باب وقوت الصلاۃ ۱: ۶، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب کراھیۃ تأخیر العصر ۲: ۲۲۳

۱۔ یہ لفظ مشہور حدیث المُسِیء فی الصلاۃ کی بعض روایات میں ہے جیسا کہ سنن ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی وصف الصلاۃ ۲: ۱۰۰، سنن ابو داوٗد: کتاب الصلاۃ، باب صلاۃ مَن لایُقیم صُلْبَهٗ فی الرکوع والسجود ۱: ۲۲۸، صحیح ابن خزیمۃ: کتاب الصلاۃ، باب إجازۃ الصلاۃ بالتسبیح والتکبیر والتحمید...... ۱: ۲۷۴ بروایت رفاعہ بن رافعؓ ......: ''فتوضّأ كما أمَرَكَ اللّٰهُ جلّ و عَزّ، ثُمّ تَشَهَّدْ فَأقِمْ......''۔ اس کی سند راوی یحییٰ بن علی الزرقی کی وجہ سے حسن ہے مگر ''ثم تشهّد کے بعد فَأقِمْ'' کی اقامت نماز کے ساتھ مناسبت سمجھ میں نہیں آتی بلکہ بظاہر یہ اعتدال ارکان کا حکم معلوم ہوتا ہے ورنہ تمام روایات میں یکساں ہوتا اور تشہد کے بعد نہ ہوتا۔ واللہ اعلم

[۲۸۸] تَحْرِيمُهَا التَّكْبِير (اس کی ابتداء تکبیر ہے)

کے ضمن میں کہتے ہیں: یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جس نے تکبیر تحریمہ نہ کہی وہ نماز میں داخل نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جو چیزیں تکبیرِ تحریمہ سے پہلے ہیں ان کو چھوڑنے کی وجہ سے نماز کا اعادہ نہیں کرنا پڑے گا البتہ اگر کسی چیز پر فقہاء کا اجماع ہو جائے تو اسے اجماع کی وجہ سے تسلیم کیا جائے گا جیسے طہارت، قبلہ رخ ہونا اور وقت وغیرہ کہ ان کو چھوڑنے سے اعادہ ضروری ہے۔ ہمارے علماء (مالکیہ) کہتے ہیں کہ جو قصداً اقامت ترک کر دے وہ نماز کا اعادہ کرے مگر یہ حکم وجوب اقامت کی وجہ سے نہیں، سنت کی توہین کی وجہ سے تعزیر کے طور پر ہے۔ اس لیے کہ اگر وجوب اقامت کی وجہ سے اعادہ لازمی ہوتا تو اس کا بھول کر چھوڑنا یا جان بوجھ کر چھوڑنا برابر ہوتا، واللہ اعلم۔

چھٹی بحث: نماز کی طرف جاتے ہوئے دوڑنے کا حکم

علماء کے اس بارے میں مختلف اقوال ہیں کہ جس شخص نے اقامت سنی ہو وہ نماز کے لیے دوڑ سکتا ہے یا نہیں۔ غالب رائے یہی ہے کہ نہ دوڑے اگرچہ رکعت نکل جانے کا اندیشہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

[۲۸۹] إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاةُ فَلَاتَأتُوهَا تَسْعَونَ وأتوها تَمشُونَ، وعَلَيكُم السكينةَ فما أدرَكتُم فَصَلُّوا وما فَاتَكُمْ فأتِمُّوا۔

جب نماز کھڑی ہو جائے تو نماز کی طرف دوڑ کر نہ آؤ بلکہ اطمینان سے چلتے ہوئے آؤ پھر جتنی نماز پا لو پڑھ لو اور جو تم سے رہ جائے پوری کر لو۔ اسے امام مسلمؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[۲۸۸] سنن ابو داؤد: كتاب الطهارة، باب فرض الوضوء ۱:۱۶؛ سنن ترمذی: كتاب الطهارة، باب ماجاء أنّ مفتاحَ الصّلاةِ الطّهور ۱: ۸۔ امام احمدؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ، حاکمؒ اور بیہقیؒ سب نے اسے حضرت علیؓ سے نقل کیا ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو اپنے موضوع پر صحیح ترین حدیث قرار دیا ہے۔ اس کے ایک راوی محمد بن عقیل کے بارے میں بعض علماء نے کلام کیا ہے مگر امام بخاریؒ کہتے ہیں: احمدؒ، اسحاقؒ اور حمیدیؒ وغیرہم اس کی حدیث پر اعتماد کرتے تھے۔ امام حاکمؒ نے بھی اسے امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق قرار دیا ہے۔ حافظ ذہبیؒ نے بھی ان کی تائید کی ہے۔ امام نوویؒ نے خلاصہ میں اسے حسن کہا ہے اور زیلعیؒ نے ان کی تائید کی ہے۔ نصب الراية ۱: ۳۰۷

[۲۸۹] صحیح مسلم: كتاب المساجد ومواضع الصلاة، باب استحباب إتيان الصلاة بِوَقارٍ وسكِينة والنهي عن إتيانها سعياً: ۴۲۰۔ امام بخاریؒ، ابو داؤدؒ، ترمذیؒ، ابن ماجہؒ، نسائیؒ اور امام احمدؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ یہ دیگر طرق میں حضرت ابو قتادہؓ سے بھی منقول ہے۔

[۲۹۰] إذَاثُوِّبَ بِالصّلاةِ فَلا يَسْعَ إليها أحَدُكُم ولٰكِن لِيَمْشِ، و عليهِ السكينةُ والوَقارُ۔صلِّ ما أدركْتَ وَاقْضِ ماسَبَقَكَ۔

جب نماز کے لیے پکارا جائے تو تم سے کوئی شخص نماز کی طرف دوڑ کر نہ آئے بلکہ سکون اور وقار سے چلے جو پالے پڑھ لے، جو رہ جائے اسے پورا کر لے۔

یہ تو نص حدیث ہے اور اس میں حکمت یہ ہے کہ جب نمازی دوڑتا ہے تو ہانپنے لگتا ہے اوراس کی نماز کی ابتداء، قراء ت اور خشوع میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ علماءِ سلف کی ایک جماعت اورحضرت ابن عمراور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی رائے اس سے مختلف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر نماز باجماعت فوت ہو جانے کا خطرہ ہو تو اس کو پانے کے لیے دوڑ سکتا ہے۔ اسحاقؒ کہتے ہیں کہ اگر رکعت فوت ہونے کا خوف ہوتو بھی دوڑ سکتا ہے۔ امام مالکؒ سے بھی اس طرح کا ایک قول منقول ہے۔امام مالکؒ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو آدمی گھوڑے پر سوار ہو اس کے لیے گھوڑا تیز چلا لینے میں کوئی حرج نہیں ۔بعض لوگوں نے اس قول کو پیدل چلنے والے نمازی اور سوار میں فرق کرنے پر محمول کیا ہے کیوں کہ سوار آدمی پیدل چلنے والے کی طرح ہانپتا نہیں ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر ہر حال میں عمل کرنا بہتر ہے اس لیے وقار اور سکون سے ہی چلے جیسا کہ حدیث پاک میں آیا ہے کیوں کہ نماز کی طرف چلنے والا بھی نماز میں شمار ہوتا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ جو کچھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمائیں وہ خلاف واقع ہو۔ جیسے سکون اور وقار نماز کے اندر ضروری ہے اسی طرح نماز کو جانے والے کے لیے ہے تاکہ اس کی مشابہت اس نماز کے ساتھ ہو جائے جو نماز پڑھ رہا ہے اور اسی جیسا ثواب اسے بھی مل جائے۔ اس کی دلیل وہ حدیث مبارک ہے جو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ حدیث بھی ہے جو امام دارمیؒ نے اپنی کتاب میں ذکر کی ہے، فرماتے ہیں: ہمیں محمد بن یوسف نے حدیث سنائی، وہ کہتے ہیں ہم سے سفیان نے بیان کیا، انہوں نے محمد بن عجلان سے، انہوں نے مقبری سے اور انہوں نے کعب[1] بن عجرہ سے روایت کی وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۔نے ارشاد فرمایا:

---

[۲۹۰] اس حدیث کو ان الفاظ کے ساتھ امام مسلم نے حوالہ بالا کے تحت نقل کیا ہے۔

۱۔ کعب بن عجرہؓ (م ۵۱ یا ۵۲ ھ) انصاری صحابی ہیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حالت احرام میں حلق اور فدیہ کی رعایت انہی کے لیے نازل ہوئی تھی۔ تہذیب التہذیب ۸: ۴۳۵

[۲۹۱] إذَا تَوَضَّأتَ فَعمِدتَ إلى الْمَسجِدِ فَلا تُشَبِّكَنَّ بَينَ أصابِعِكَ فإنَّكَ فِي صلاةٍ

جب تو وضو کر لے اور مسجد کی طرف چل پڑے تو اپنی انگلیاں ایک دوسری میں مت داخل کر کیوں کہ تو نماز میں ہے۔

اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس چیز سے منع فرمایا جو دوڑنے سے کم ہے اور مسجد کی طرف جانے والے کو بھی نماز میں شمار کیا۔ ان احادیث طیبہ نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَاسْعَوا إلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ [الجمعة۶۲: ۹] (اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو) کا معنی واضح کر دیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس سے مراد قدموں پر زور دے کر دوڑنا نہیں بلکہ بالفعل ذکر و عبادت میں لگ جانا ہے۔ امام مالکؒ نے اس کی یہی تفسیر بیان کی ہے اور یہی درست ہے۔ واللہ اعلم۔

ساتویں بحث: قضاء اور اتمام میں فرق

دونوں احادیث مبارکہ ''وَمَافَاتَكُمْ فَأتِمُّوا'' اور ''وَاقْضِ مَا سَبَقَكَ'' کے بارے میں علماء سے مختلف آراء منقول ہیں ۔ بعض حضرات کے نزدیک ان دونوں ارشادات کا ایک ہی معنی ہے کیوں کہ کبھی ''قضاء'' بول کر مراد ''تکمیل'' بھی لیا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :﴿فَإذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ﴾[الجمعة ۶۲: ۱۰] (جب نماز پوری ہوجائے) اور﴿ فَإذَاقَضَيْتُمْ مَنَاسِكَكُمْ﴾[البقرة ۲: ۲۰۰] (چناں چہ جب تم اپنے مناسک حج پورے کرلو) دونوں میں ''قضاء'' سے مراد پورا کرنا ہی ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ دونوں کے معانی مختلف ہیں اور یہی صحیح ہے ۔

مسبوق کی نماز کا حکم

اسی اختلاف آراء کی بناء پر اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے کہ اگرکوئی شخص نماز شروع ہوجانے کے بعد جماعت میں شامل ہو تو نماز کا جو حصہ اسے امام کے ساتھ ملا ہے وہ اس کی نماز کا ابتدائی حصہ شمار کیا جائے گا یا آخری ؟

فقہاءِ مالکیہ کا پہلاقول اورمؤیدین: علماءِ مالکیہ کی ایک جماعت پہلی صورت کی قائل ہے۔ ابن قاسم رحمہ اللہ کی رائے بھی یہی ہے مگر مزیدان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ایسا نمازی امام کے نماز سے فارغ ہوجانے پر اپنی بقیہ نماز کوسورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ سورت ملاکر شروع کرے گا ۔ اس طرح وہ نماز کے افعال (یعنی قیام ، رکوع ،

[۲۹۱] سنن دارمیؒ: کتاب الصلاة، باب النهي عن الاشتباک إذا خرج إلى المسجد:۱۳۴۸

سجدہ وغیرہ)میں توامام کے ساتھ پڑھی گئی نماز کو بنیاد بنا کر باقی کی تکمیل کرے گا مگر نماز کے اقوال (قراءت وغیرہ) میں وہ قضاء کرنے والا شمار ہوگا اور انہیں ابتداء سے ترتیب کے ساتھ ادا کرے گا۔ حافظ ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں: یہی مشہور مذہب ہے۔ ابن خویز منداد کہتے ہیں: ہمارے علماء کا اسی پر عمل ہے اور یہی اوزاعی، شافعی، محمد بن حسن، مسند امام احمدؒ بن حنبل، طبری اور داؤ د بن علی رحمہم اللہ کا قول بھی ہے۔

مالکیہ کا دوسرا قول: اشہبؒ نے ایک اور قول بھی نقل کیا ہے، یہی قول بروایت ابن عبدالحکم امام مالک رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔عیسیٰ نے ابن قاسمؒ سے اور انہوں نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ: نمازی کو جو حصہ امام کے ساتھ مل گیا وہ اس کی نماز کا آخری حصہ شمار ہوگا اور امام کے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی نماز کا چھوٹا ہوا حصہ ابتداء سے پڑھے گا۔

فقہاء حنفیہ کا نقطہ نظر: علماءِ کوفہ کی رائے بھی یہی ہے اور قاضی ابومحمد عبد الوہاب کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کا مشہور قول بھی یہی ہے۔

پہلے قول کے دلائل: حافظ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں: جن حضرات نے امام کی اقتداء میں ادا کیے گئے حصے کو پہلا حصہ شمار کیا میرے خیال میں انہوں نے تکبیر تحریمہ کا لحاظ رکھا ہے کیوں کہ تکبیر تحریمہ صرف نماز کی ابتداء میں ہوتی ہے اور تشہد وسلام نماز کے آخر میں آتے ہیں۔اس بنا پر ان کا کہنا ہے کہ چوں کہ اس نے تکبیر تحریمہ اس حصہ میں کہی جو اس نے امام کے ساتھ ادا کیا اس لیے وہ حصہ اس کی نماز کا پہلا حصہ شمار ہوگا۔ اس قول کی تائید حدیث شریف کے الفاظ ''فَأَتِمُّو'' سے بھی ہوتی ہے۔کسی چیز کا مکمل کرنا تو آخر میں ہی ہوتا ہے نہ کہ شروع میں۔

دوسرے قول کے دلائل: ان کی دلیل حدیث پاک کے الفاظ ''فَاقْضُوا'' ہیں جس میں قضاء کرنے کو کہا گیا ہے اور قضاء چھوٹ جانے والی چیز کی ہی ہوتی ہے۔البتہ ارشاد نبوی ''فَأَتِمُّوا'' سے استدلال کرنے والے فقہاء کی تعداد زیادہ ہے۔

مالکیہ کا تیسرا قول: پہلے قول والا نقطۂ نظر ایک تیسری رائے رکھنے والے فقہاء کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جہاں وہ امام کے ساتھ ملے گا وہیں سے اس کی نماز کی ابتداء ہو جائے گی اور اسی کو وہ آخر تک جاری رکھے گا۔ یہ بات صرف اسی صورت میں پوری ہوسکتی ہے جو عبد العزیز بن ابی سلمہ الماجشون، مزنی، اسحاق اور داؤد رحمہم اللہ نے بتائی ہے اور وہ یہ کہ نمازی امام کے ساتھ شامل ہوتے ہی سورۂ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی اور سورت ملا کر پڑھ لے اور جب امام کے فارغ ہونے کے بعد بقیہ نماز پڑھنے لگے تو صرف سورۂ فاتحہ پڑھے۔ اس رائے سے قول وفعل دونوں میں مطابقت پیدا ہوجاتی ہے۔

آٹھویں بحث : اقامت کے بعد سنت اور نفل

جب نماز کے لیے اقامت کہہ دی جائے تو اس کے بعد کوئی غیر فرض نماز نہیں پڑھی جا سکتی ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

[۲۹۲] إِذَاأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ ـ

جب نماز کی اقامت ہوجائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی نماز نہیں ہوتی۔اسے امام مسلم اور دیگر محدثین نے نقل کیا ہے۔

البتہ اگر پہلے سے کوئی نماز شروع کی تھی تو اقامت ہوجانے پر اسے نہ توڑے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے : ﴿وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴾ [محمد ۴۷ : ۳۳] (اور اپنے اعمال کو برباد نہ کرو) خصوصاً اگر نمازی ایک رکعت مکمل کر چکا ہو تو اس نفل نماز کو نہ توڑے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ جب اقامت ہوجائے اور کوئی شخص، غیر فرض نماز پڑھ رہا ہو تو اسے توڑ دے کیوں کہ مذکورہ حدیث عام ہے اور اس میں کسی نماز کا استثناء نہیں ،واللہ اعلم۔

نویں بحث : اقامت کے بعد فجر کی سنتوں کا حکم

اس مسئلہ میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوااوراس کے بخر کی سنتیں ادا کرنے سے پہلے جماعت کھڑی ہوگئی تو وہ کیا کرے؟

امام مالکؒ کی رائے: امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ امام کے ساتھ شامل ہوجائے اور فجر کی دورکعت سنت نہ پڑھے ۔ اگر مسجد میں داخل نہیں ہواتھا اور جماعت کھڑی ہوگئی تو مسجد کے باہر ہی دورکعتیں پڑھ لے بشرطیکہ جماعت کی کوئی رکعت ضائع ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔ مسجد کے صحن یا اس میں شامل کسی ایسے حصہ میں انہیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے جونماز جمعہ کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں ۔ اسی طرح اگر یہ دورکعتیں پڑھنے کی وجہ سے جماعت کی پہلی رکعت نکل جانے کا اندیشہ ہوتو سنت نہ پڑھے اور مسجد میں جاکر امام کے ساتھ نماز میں

---

[۲۹۲] امام بخاریؒ نے اپنی صحیح:کتاب الجماعة والإمامة میں اس عنوان: ''إِذَاأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ '' کے تحت ایک باب قائم کیا ہے ، حدیث کے الفاظ صحیح مسلم: کتاب صلاة المسافرين وقصرها ، باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن ۱: ۴۹۳ ،سنن ابوداؤد:کتاب الصلاة ، باب إذاأدرک الإمام ولم يصل ركعتي الفجر۲:۲۲، جامع ترمذی: کتاب الصلاة ، باب ماجاء إِذَاأُقِيمَتِ الصَّلَاةُ فَلَا صَلَاةَ إِلَّا الْمَكْتُوبَةَ ۲: ۲۸۲ میں منقول ہیں۔ ائمہ حدیث احمدؒ، نسائی، ابن ماجہ ، ابن حبان، بیہقی، ابن خزیمہ ، ابویعلی ، عبد الرزاق ،دارمی ، ابوعوانہ اورطبرانی وغیرہ نے بھی بروایت حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسے نقل کیا ہے۔

شامل ہو جائے ، پھر اگر چاہے تو سورج نکلنے کے بعد سنتیں پڑھ لے ۔ میرے نزدیک ان کا سورج نکلنے کے بعد ادا کر لینا چھوڑنے سے بہتر بھی ہے اور پسندیدہ بھی ۔

احناف کا نقطہ نظر : امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ان کے ہم خیال فقہاء فرماتے ہیں کہ اگر اسے خطرہ ہو کہ سنتیں ادا کرتے کرتے دونوں رکعتیں نکل جائیں گی اور اسے دوسری رکعت کا رکوع بھی امام کے ساتھ نہیں مل سکے گا تو اس صورت میں سنتیں چھوڑ کر امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہو جائے اور اگر اسے امید ہو کہ ایک رکعت امام کے ساتھ مل جائے گی تو فجر کی دو سنتیں مسجد سے باہر ادا کر لے اور جماعت میں شامل ہو جائے ۔ امام اوزاعی کا بھی یہی قول ہے مگر وہ عام حالات میں فجر کی سنتیں مسجد میں پڑھنے کو جائز نہیں سمجھتے ۔ان کے نزدیک صرف اس وقت مسجد میں فجر کی سنتیں ادا کرنے کی اجازت ہے جب یہ اندیشہ ہو کہ کسی اور جگہ ادا کرنے کی صورت میں فرض نماز کی آخری رکعت بھی ضائع ہو جائے گی۔ امام ثوریؒ کہتے ہیں: اگر ایک رکعت بھی فوت ہو جانے کا خطرہ ہو تو جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے اور سنت کی دو رکعتیں نہ پڑھے ۔ اگر ایسا اندیشہ نہ ہو تو انہیں پہلے پڑھے اگرچہ مسجد کے اندر ہی ہو ۔ حسن بن حی جن کا نام بعض روایات کے مطابق حسن بن حیان ہے[1]، کہتے ہیں کہ جب مکبّر اقامت کہنا شروع کر دے تو فجر کی دو رکعتوں کے علاوہ کوئی نفل نماز جائز نہیں۔

فقہاءِ شافعیہ کا نقطۂ نظر اور مؤلف کی تائید: امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : جو شخص مسجد میں اس وقت داخل ہو جب نماز کھڑی ہو چکی ہو تو جماعت کے ساتھ شامل ہو جائے ۔اس وقت سنت نماز نہ مسجد میں پڑھنے کی اجازت ہے نہ مسجد سے باہر ، امام طبریؒ بھی اسی کے قائل ہیں ،امام احمدؒ بن حنبل رحمہ اللہ کی بھی یہی رائے ہے ، امام مالک رحمہ اللہ سے بھی ایک روایت میں یہی منقول ہے اور اس مسئلہ میں یہی رائے صحیح ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادگرامی ہے:" إِذَا أُقِيمَتِ الصَّلاةُ فَلاَ صَلاَةَ إِلاَّ المكتوبة "(جب نماز کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے علاوہ کوئی اور نماز نہیں ہوتی)۔ فجر کی نماز سے پہلے کی دو رکعات بھی یا سنت ہیں یا نفل یا مستحب ۔ جب کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو حجت وہی ہوتی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے ثابت ہو ۔

مالکیہ اور حنفیہ کے دلائل : امام مالکؒ کے مشہور قول اور امام ابوحنیفہؒ کے نقطہ نظر کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ والی روایت ہے کہ آپؐ اس وقت تشریف لائے جب امام نماز پڑھا رہا تھا تو آپؐ نے فجر کی سنتیں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں پڑھیں اور پھر امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہو گئے ۔

۱۔ ابوعبداللہ حسن بن صالح بن حی (م ۱۶۷ھ) علی بن صالح کے بھائی، بڑے عبادت گزار اور فقیہ تھے ، کہا جاتا ہے کہ ان کا میلان تشیع کی طرف تھا مگر بڑے محدث اور ثقہ تھے ۔ان کی وفات کوفہ میں روپوشی کے دوران ہوئی۔ تھذیب الکمال :تعارف نمبر ۱۲۷۳

امام اوزاعیؒ اور ثوریؒ کی دلیل : ان دونوں حضرات کی دلیل حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ عمل ہے کہ وہ مسجد میں اس وقت داخل ہوئے جب جماعت کھڑی تھی تو انہوں نے ایک ستون کے پیچھے کھڑے ہوکر دو رکعات سنت ادا کی اور پھر امام کے ساتھ جماعت میں شامل ہوگئے ۔ اس موقع پر حضرت حذیفہ اور حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہما دونوں موجود تھے ۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ اگر باجماعت نماز شروع ہوجانے کے باوجود مسجد سے باہر نماز سنت ادا کرنا جائز ہے تو مسجد کے اندر بھی جائز ہے۔امام مسلم نے حضرت عبد اللہ بن مالک ابن بُحَینہ (۱) رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے ، وہ فرماتے ہیں:

[۲۹۳] أُقِيمَت صلاة الصبح فرأى رسول الله صلى الله عليه وسلم رَجُلاً يصلّي والمؤذن يقيم ، فقال : أتُصَلِّي الصبح أربعاً۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ صبح کی نماز کے لیے اقامت کہی جارہی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : کیا تم صبح کی نماز چار رکعات پڑھتے ہو؟

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت کھڑی ہو جانے کے بعد فجر کی سنتیں پڑھنے کو ناپسند فرمایا۔ یہ حدیث اس بات کی دلیل بھی بن سکتی ہے کہ اگر کسی نے جماعت کھڑی ہونے کے باوجود فجر کی سنتیں پڑھ لیں تو اس کی نماز ہو جائے گی کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو اس کی نماز تڑوا سکتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قدرت کے باوجود ایسا نہیں کیا ، واللہ اعلم ۔

---

[۲۹۳] صحیح مسلم : كتاب صلاة المسافرين ، باب كراهة الشروع في نافلة بعد شروع المؤذن في الإقامة ۱:۴۹۴ ،سنن نسائی : كتاب الإمامة،باب مايكره من الصلاة عند الإقامة ۲: ۱۱۷ ،سنن دارمی: كتاب الصلاة ، باب إذا أقيمت الصلاة فلا صلاة إلا المكتوبة ۱: ۳۶۰، صحیح ابن حبان : كتاب الصلاة ، باب النوافل ۶ :۲۲۱۔ یہاں یہ واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا ، مستدرک حاکم :كتاب صلاة التطوع ۱: ۴۵۱ ،مسند امام احمدؒ: مسند عبد الله بن عباس بن عبد المطلب رضی الله عنه ۱:۳۹۳ ،مصنف عبد الرزاق : باب إذا أقيمت الصلاة فلا صلاة ۲: ۴۴۰ ،سنن بیہقی:باب كراهية الإشتغال بهما بعد ما أقيمت الصلاة ۲:۴۸۳میں یہ روایت جعفر بن محمد رحمہ اللہ نے اپنے والد گرامی سے نقل کی ہے اور اس کے مطابق یہ واقعہ حضرت ابن قشب رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا۔ امام بیہقیؒ نے اسی باب میں صفحہ نمبر ۴۸۴ پر اسی طرح کا واقعہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی نقل کیا ہے۔

---

(۱) ان کا اسم گرامی عبد اللہ بن مالک بن القشب ہے ۔ امام بخاریؒ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : ان کی والدہ بُحَینہ بنت حارث بن عبد المطلب تھیں ۔ یہ صحابی رسول اور کئی احادیث کے راوی ہیں ۔ الإصابة۲: ۳۶۴

دسویں بحث : ''صلاۃ'' کی لغوی تحقیق

۱۔ دعا : ''صلوٰۃ'' کا لغوی معنی دعا ہے اور یہ ''صلّٰی یُصلّی'' سے ماخوذ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

[۲۹۴] إذادُعِي أحدُکم إلى طعامٍ فليُجِب فإن کان مُفطِرا فليطعم وإن کان صائمافليُصلِّ۔

جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو اسے چاہیے کہ قبول کرلے ۔ پھر اگر وہ روزے سے نہ ہوتو وہاں کھانا کھالے اور اگرروزے سے ہو تو دعوت دینے والے کے لیے دعا کردے۔

اس حدیث میں'' فليُصلِّ ''کا معنی دعا کرنا ہے۔بعض علماء کہتے ہیں کہ یہاں'' فليُصلِّ '' سے دعا نہیں بلکہ نماز مراد ہے یعنی دعوت دینے والے کے ہاں جاکر دورکعت نماز پڑھے اور واپس چلا جائے۔اس میں پہلا معنی زیادہ مشہور ہے اور یہی اکثر علماء کی رائے ہے ۔ اسی طرح حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے ہاں جب حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو انہوں نے نو مولود بچے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا ۔ اس واقعہ کو وہ یوں بیان فرماتی ہیں :

[۲۹۵] ثم مسحه وصلّى عليه (أي دعاله)۔

پھر آپؐ نے اس پر اپنادست مبارک پھیرااور اس کے لیے دعافرمائی

اسی مفہوم میں ارشاد باری تعالی ﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ﴾[التوبة : ۱۰۳] بھی ہے جس کا معنی أدعُ لهم (ان کے لیے دعا کیجئے)بیان کیا گیا ہے ۔اَعشی کہتا ہے:

تقول بنتي وقد قربتُ مُرتحلا یارب جَنِّب أبي الأوصابَ والوجَعا

[۲۹۴] صحیح مسلم :کتاب النكاح، باب الأمر بإجابة الداعي إلى دعوة ۲: ۱۰۵۴ ،سنن ابوداوٗد :کتاب الصوم، باب في الصائم يدعى إلى وليمة۲: ۳۳۱ ، جامع ترمذی :کتاب الصوم، باب ماجاء في إجابة الصائم الدعوة۳:۱۵۰ ،سنن بیہقی:کتاب التصادق، باب يجيب المدعوصائماکان أو مفطراومايفعل کل واحد منهما ۱۱:۶۷،شعب الإيمان : التاسع والثلاثون......،باب تخمير الإناء وإيكاء السقاء ۱۲۹:۵، مسندامام احمدؒ : مسند أبي هريرة رضي الله عنه۳:۳،۲۷۳: ۳۰۴، ۵۴۴:۲۔صحیح ابن حبان: کتاب الأطعمة، باب الضيافة ۱۱۹:۱۲،مسندابویعلی :مسند ابي هريرة رضى الله عنه ۱۰: ۴۲۴ بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۔الفاظ تھوڑے بہت مختلف ہیں۔

[۲۹۵] صحیح مسلم: کتاب الآداب، باب استحباب تحنيک المولود عند ولادته وحمله۳:۱۶۹۰

عليكِ مثلَ الذي صلّيتِ فاغتمضي نوماًفإن لجنب المرء مُضطجعا (۱)

جب میرے سفر کا وقت قریب آیا تو میری بیٹی کہنے لگی: اے پروردگار! میرے والد کو بیماریوں اور تکلیفوں سے بچا۔ میں نے کہا: جو دعا تم نے مجھے دی ہے تمہیں بھی وہی کچھ ملے، اب آنکھیں بند کرو اور سو جاؤ، انسان کے پہلو کو آرام کی ضرورت بھی ہے۔

اسی نے ایک اور مقام پر کہا ہے:

وقابلها الريح في دَنِّهَا وصَلَّى على دَنِّهَا وارتسم

ہوائیں اس کی قیام گاہ میں جا کر اس سے ملیں، اس کی قیام گاہ کو دعائیں دیں اور ذکر و تسبیح کرتی رہیں۔

علامہ جوہریؒ اپنی کتاب ''الصحاح'' میں کہتے ہیں کہ ''ارتسم'' کا معنی ہے ''دَعَاوَكَبَّرَ'' اس نے دعا کی اور اللہ کی بڑائی بیان کی۔

۲۔ پیٹھ کا درمیانی حصہ: بعض کہتے ہیں: ''صَلاۃ'' لفظ ''صَلا'' سے ماخوذ ہے جو پیٹھ کے درمیان والی اس رگ کو کہتے ہیں جو سُرین کے پاس پہنچ کر پھیل جاتی ہے۔ اسی سے گھڑ دوڑ میں دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کو ''مصلّي'' کہا جاتا ہے کیوں کہ جب وہ دوڑ کے آخری نقطہ پہنچتا ہے تو اس کا سَر پہلے گھوڑے کی کمر کے برابر ہوتا ہے۔ لفظ ''صلاۃ'' کے اس سے ماخوذ ہونے کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس کا ذکر ایمان کے بعد دوسرے نمبر پر آیا ہے اس لیے اسے مقابلے میں دوسرے نمبر پر آنے والے گھوڑے کی نسبت سے یہ نام دے دیا گیا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ نمازی چوں کہ رکوع میں جاتے وقت اپنے مقعد کے دونوں حصوں کو موڑتا ہے اور عربی میں گھوڑے کی اس جگہ کو ''صلا'' کہتے ہیں جہاں سے اس کی دُم شروع ہوتی ہے۔ اس کا تثنیہ ''صلوان'' آتا ہے۔

۳۔ پہلے کے بعد آنے والا: ''مصلّي'' پہلے کے بعد آنے والے یعنی دوسرے کو کہتے ہیں کیوں کہ اس کا سر پہلے کی سرین کے پاس ہوتا ہے (۲)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے:

[۲۹٦] سبق رسول الله صلى الله عليه وسلم، وصَلَّى أبوبكر وثَلَّثَ عمر۔

---

[۲۹٦] مسند امام احمدؒ: مسند علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ۱: ۲۰۰، ۲۲۷، ۲۳۸، مستدرک حاکم: کتاب معرفۃ الصحابۃ، باب ابی بکر الصدیق بن ابی قحافۃ رضی اللہ عنہما ۳: ۶۷ میں ''وصلّى أبوبكر'' کی جگہ ''وثنىَّ أبوبكر'' ہے۔

۱۔ یہ شعر اعشی کے اس قصیدہ میں سے ہیں جو اس نے ہوذہ حنفی کی مدح میں کہا۔ دیوان اعشی ص ۱۰۱، تفسیر ابن عطیۃ ۱: ۱۴۷

۲۔ جوہری: الصحاح ٦: ۲۴۰۲، ۲۴۰۳

سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے، ان کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ اور تیسرے نمبر پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرے۔

۴۔ ہمیشہ ساتھ رہنا: ایک قول یہ ہے کہ لفظ ''صلاۃ'' ''صَلِیَ'' سے ماخوذ ہے جو ہمیشہ ساتھ رہنے کے معنی میں آتا ہے چناں چہ کہا جاتا ہے: ''صَلِيَ بالنار'' (وہ ہمیشہ آگ میں رہا) اسی معنی میں ارشاد باری تعالی ہے: ﴿تَصْلَى نَاراً حَامِيَةً﴾[الغاشية :۴] (وہ شدید آگ میں جھلتے رہیں گے) اسی طرح حارث بن عباد کہتے ہیں:

لم أكن من جُناتها عَلِمَ اللّٰـــــــــــــهُ وإني بِحرِّها اليوم صال

اللہ جانتا ہے کہ میں اس کا قصوروار نہیں ہوں، میں تو آج خود اس کی گرمی کی شدت برداشت کررہا ہوں) یعنی اس میں جھلس رہا ہوں۔

اس لحاظ سے لفظ ''صلاۃ'' کا معنی اللہ تعالی کے حکم کے مطابق عبادت کی پابندی کرنا ہے۔

۵۔ آگ پر تاپنا: ایک قول کے مطابق یہ ''صَلَيت العود بالنار'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی لکڑی کو آگ پر تاپ کر سیدھا اور نرم کرنا ہے۔ اس کا تلفظ صاد کی زیر اور الف کے بعد ہمزہ کے ساتھ ''صِلاء النار'' آتا ہے۔ صاد پر زبر پڑھی جائے تو آخر کا ہمزہ ختم کر کے اسے ''صَلا النار'' کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے ارشاد باری تعالیٰ کا مطلب یہ ہوگا کہ گویا نمازی مشقت برداشت کر کے اپنے آپ کو سیدھا اور نرم کرتا ہے۔ اسی معنی میں خارزنجی[1] کا شعر ہے:

فلا تعجل بأمرك واستدمهٗ فما صلَّى عصاك كمستديم

اپنے معاملے میں جلدی نہ کرو اور مسلسل محنت کرتے رہو کیوں کہ تمہاری لاٹھی اس وقت تک سیدھی نہیں ہوسکتی جب تک اسے مستقل آگ نہ دکھائی جائے۔

ان معانی کے علاوہ لفظ ''صَلاۃ'' دعا اور رحمت کے معنی میں بھی آتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں:

[۲۹۷] اللھمَّ صلِّ علی محمَّد وارد ہے۔

---

[۲۹۷] صحیح بخاری: كتاب الأنبياء، باب يزفون النسلان بالمشي۳:۱۲۳۲،۱۲۳۳، كتاب التفسير، باب إن الله وملائكته يصلون على النبى ......۴:۱۸۰۲، كتاب الدعوات، باب الصلاة على النبى صلى الله عليه وسلم ۵: ۲۳۳۸، ۲۳۳۹، كتاب الدعوات، باب هل يصلى على غير النبي۵:۲۳۳۹، صحیح مسلم: كتاب الصلاة، باب الصلاة على النبى بعد التشهد ۳۰۵،۳۰۶، سنن ابوداود: كتاب الصلاة، باب الصلاة على النبي بعد التشهد ۱:۲۵۷،۲۵۸۔ امام ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، دارمیؒ، امام مالکؒ، عبدالرزاقؒ، امام احمدؒ، ابن حبان، بیہقی، حاکم، ابویعلی اور طبرانی وغیرہ نے مختلف طرق سے اسے نقل کیا ہے۔

۱۔ الصحاح ۶: ۲۴۰۲، لسان العرب (قیس بن زہیر الخارزنجی)۔ لسان العرب میں ''عصاکَ'' کی بجائے ''عصاه'' ہے۔

''صلاۃ'' کاایک معنی عبادت بھی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:﴿وَمَاكَانَ صَلَاتُهُمْ عِندَالْبَيْتِ﴾ [الأنفال ۸: ۳۵]''صلاۃ'' کا ایک معنی نفلی عبادت بھی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ﴾ [طہ۲۰ :۱۳۲]۔تسبیح کوبھی ''صلاۃ'' کہا گیاہے جیسا کہ ارشادہے:﴿فَلَوْلَآ أَنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِينَ﴾[الصافات۳۷ : ۱۴۳]اس کا معنی ''مِنَ الْمُصَلِّين''یعنی نماز پڑھنے والا منقول ہے۔ اسی سے چاشت کی نماز کو''سُبْحةُ الضُّحى'' کہا گیاہے ۔ ارشاد باری تعالی ﴿نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ﴾[البقرة ۲: ۳۰] (ہم تیری تسبیح کرتے ہیں) کی تفسیر میں ''نُصَلِّي''(ہم نماز پڑھتے ہیں) بھی منقول ہے۔''صلاۃ'' کا ایک معنی ''قراء ت'' بھی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے :﴿ وَلَاتَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ﴾ [الإسراء۱۷ : ۱۱۰] (یعنی نماز میں بلندآواز سے قراء ت نہ کریں)۔ اس طرح لفظ''صلاۃ'' متعددمعانی کا حامل مشترک لفظ ہے ۔ ابن فارس کہتے ہیں :''صلاۃ'' ایسے گھر کو کہتے ہیں جس میں نماز ادا کی جاتی ہے ۔ایک قول یہ بھی ہے کہ''صَلاۃ'' اسم علم ہے جو نماز کے لیے وضع کیا گیا ہے کیوں کہ دنیا میں ایسا کوئی زمانہ نہیں گزرا جس میں اللہ تعالی نے کوئی شریعت نہ بھیجی ہو اور کوئی شریعت ایسی نہیں جو نماز سے خالی ہو ۔یہ بات ابونصر القشیری نے ذکر کی ہے۔

میرے خیال میں اس قول کے لحاظ سے یہ لفظ مشتق نہیں ہے۔ جمہور کی رائے کی تفصیل درج ذیل ہے:

گیارہویں بحث :''صَلاۃ'' کی اصطلاح

علماءِ اصول کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ''صلاۃ''اور اسی طرح کے دیگر الفاظ''إیمان''، ''زکاۃ''، ''صیام'' اور''حج'' وغیرہ اپنے اصل لغوی معنی پر ہیں اور شریعت نے اس میں صرف شروط اور احکام متعین کیے ہیں یا شریعت نے اپنے طور پر ان الفاظ کو نئے سرے سے متعارف کروایاہے ؟۔ یہی دراصل نقطۂ اختلاف ہے ۔ ان دونوں آراء میں سے پہلی رائے زیادہ صحیح ہے کیوں کہ شریعت تو عربی زبان میں مرتب ہوئی اور قرآن مجید بھی واضح عربی زبان میں نازل ہوا البتہ جس طرح خود اہل عرب چیزوں کے ناموں میں ردوبدل کرتے رہے اسی طرح شریعت نے بھی اسماء میں تبدیلیاں کیں جیسے لفظ''دابّة'' جو بنیادی طور پر ہر رینگنے والی چیز کے لیے استعمال ہوتا تھا بعد میں صرف چوپاؤں کے لیے مخصوص ہوگیا، واللہ اعلم۔

بارہویں بحث :''صَلاۃ'' سے کس قسم کی نماز مراد ہے؟

اس بارے میں آراء مختلف ہیں ۔ بعض کے نزدیک اس سے مراد فرائض ہیں اور بعض کے نزدیک فرائض ونوافل دونوں ہیں اور یہی رائے صحیح ہے کیوں کہ یہ لفظ عام ہے اور متقی دونوں کو بجالاتا ہے۔

تیرہویں بحث : نماز سے مشکلات کا حل

نماز رزق میں فراخی کا ذریعہ ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلاةِ﴾ [طٰہٰ ۲۰ : ۱۳۲] میں اس کا ذکر ہے۔ اس کا تفصیلی بیان سورۂ ''طٰہٰ'' میں اِن شاء اللہ آئے گا۔ نماز پیٹ کے درد کے لیے بھی شفاء ہے جیسا کہ امام ابن ماجہؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی سند سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :

[۲۹۸]　هَجَّرَ النبی صلی اللّٰه علیه وسلم فهجّرتُ فَصَلَّيتُ ثم جلستُ ، فالتفتَ إليّ النبی صلّی اللّٰه علیه وسلم فقال: أشكمت درده۔ قلتُ نعم يارسول اللّٰه، قال : قم فصلِّ فإن في الصلاة شفاء ۔وفي رواية : أشكمت درد۔يعني تشتكي بطنك ۔ بالفارسية ۔

ظہر کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نکلے اور میں بھی نکلا ۔ پھر میں نے نماز پڑھی اور بیٹھ گیا ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے ؟ میں نے عرض کیا جی ہاں اللہ کے رسول ! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اٹھو اور نماز پڑھو کیوں کہ نماز میں شفاء ہے ۔ دوسری روایت میں ''اشکمت درده'' کی بجائے ''اشکمت درد'' کے الفاظ ہیں جس کا معنی یہی ہے : کیا تمہارے پیٹ میں درد ہے؟　خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ یہ تھی :

[۲۹۹]　إذا حزبه أمر فزع إلى الصلاة۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو فوراً نماز کا سہارا لیتے ۔

---

[۲۹۸]　سنن ابن ماجہ :کتاب الطب باب الصلاة شفاء ۲:۱۱۴۴، مسند امام احمدؒ : مسند أبي هريرة رضي الله عنه ۳:۹۶ میں ''اشكنب ذرد'' ہے ۔ فیروزآبادیؒ کہتے ہیں : جتنی حدیثیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فارسی بولنے کے بارے میں منقول ہیں جیسے ''اشکمت درده'' ۔ یا ''شب دودو وتمریک یک'' ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ۔ زیرِ نظر حدیث کے راوی لیث ابی سُلیم جمہور کے نزدیک ضعیف ہے جیسا کہ بوصیری نے زوائد میں ذکر کیا ہے۔ اس کے دوسرے راوی ذوّاد بن علبہ بھی ضعیف ہیں جیسا کہ تقریب اور میزان میں اس کی وضاحت موجود ہے ، امام ابن حبانؒ کہتے ہیں : وہ منکر الحدیث ہے اور ثقات سے ایسی روایتیں بیان کرتا ہے جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔

[۲۹۹]　سنن ابوداؤد :کتاب الصلاة ، باب وقت قيام النبي صلى الله عليه وسلم من الليل ۲:۳۵، مسند امام احمدؒ: حديث حذيفة بن اليمان ۶:۵۲۷، شعب الإيمان: الحادي والعشرون من شعب الإيمان ...... ، باب تحسين الصلاة والإكثار منها ليلا ونهاراً...... ۳:۱۵۴ ۔ ان سب حضرات نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے '' إذا حزبه أمر صلى '' کے الفاظ نقل کئے ہیں ۔ البتہ امام ابن حبان نے اپنی کتاب الثقات ۸:۱۶۸، تعارف حسن بن زیاد میں تفسیر قرطبیؒ کے متن والے الفاظ نقل کئے ہیں۔ اس حدیث کی سند میں محمد بن عبداللہ بن ابی قدامہ کے علاوہ تمام راوی ثقہ ہیں ، محمد مذکور بھی مقبول ہیں جیسا کہ تقریب میں ہے ۔ کئی دیگر شواہد سے بھی اس کو تقویت ملتی ہے جس سے یہ حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے ۔ حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اپنی تفسیر ۱:۹۱ میں اس پر بحث کی ہے ۔

چودہویں بحث : نماز کے فرائض اور شرائط

نماز کی شرائط

نماز کے کچھ فرائض اور کچھ شرائط ہیں جن کے بغیر وہ ادا نہیں ہوتی ۔ اس کی شرائط میں سے ایک طہارت ہے جس کے احکام کا مفصل بیان سورۂ نساء اور مائدہ میں آئے گا ۔ اس کی دوسری شرط شرمگاہ کا ڈھانپنا ہے جس کا بیان اِن شاء اللہ تعالیٰ سورۂ اعراف میں آئے گا۔

نماز کے فرائض

اس کے فرائض میں قبلہ کی طرف منہ کرنا ، نیت کرنا ،قیام کی حالت میں تکبیر تحریمہ کہنا ، قیام کی حالت میں سورۂ فاتحہ پڑھنا ، اطمینان کے ساتھ رکوع کرنا ، رکوع سے سر اٹھانااور اطمینان کے ساتھ سیدھے کھڑے ہوجانا، اطمینان کے ساتھ سجدہ کرنا، سجدے سے سر اٹھانا ،دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھنا اور دوسرا سجدہ اطمینان سے کرنا شامل ہیں ۔ ان تمام احکام کی بنیاد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول وہ حدیث ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو نماز سکھائی جس نے نماز ٹھیک نہیں پڑھی تھی ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۰۰] إذاقُمتَ إلى الصلاةِ فَأسبِغِ الوضوءَ ثم استقبِل القبلةَ ثم كبِّر ثم اقرأ ماتيسّر معكَ من القرآنِ ثمّ ارْكَع حتى تطمئنّ راكعاثم ارفعْ حتى تعتدلَ قائماًثم اسجُدْ حتى تطمئنَّ ساجداً ثم ارفعْ حتى تطمئنَّ جالساً ثم افعَلْ ذلكَ في صلاتكَ كلِّها۔

---

[۳۰۰] صحیح بخاری: كتاب صفة الصلاة ، باب وجوب القراءة للإمام والمأموم في الصلوات ۱:۲۶۳، باب حد إتمام الركوع والاعتدال فيه والطمانينة ۱:۲۷۴،كتاب الإستئذان ، باب من رد فقال عليك السلام وقالت عائشة وعليه ۵:۲۳۰۷،كتاب الأيمان والنذور ، باب إذاحنث ناسيا في الأيمان وقول الله ......۶:۲۴۵۵،صحیح مسلم : كتاب الصلاة ، باب وجوب قراءة الفاتحة في كل ركعة وأنه إذا ...... ۱: ۲۹۸ ،سنن ابوداؤد:كتاب الصلاة ، باب من لايقيم صلبه في الركوع والسجود ۱:۲۲۶ ، جامع ترمذی :كتاب الصلاة ، باب ماجاء في وصف الصلاة ۲:۱۰۳ ،سنن نسائی:كتاب الإفتتاح، باب فرض التكبيرة الأولى ۲: ۱۲۴ ،سنن ابن ماجہ : كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها ، باب إتمام الصلاة ۱:۳۳۶ ، صحیح ابن حبان : كتاب الصلاة ، باب صفة الصلاة ۵:۲۱۲،صحیح ابن خزیمۃ :كتاب الصلاة ، باب التكبير لافتتاح الصلاة ۱:۲۳۴۔ ان کے علاوہ امام احمدؒ، بیہقی اورابویعلی وغیرہ بہت سے محدثین نے اسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے نقل کیا ہے اور یہ حدیث عام طور پر '' حدیث المسيئ صلاته '' کے عنوان سے مشہور ہے ۔

جب تم نماز کا ارادہ کرو تو صحیح طریقہ سے وضو کرو، پھر قبلہ رخ ہو جاؤ، پھر تکبیر تحریمہ کہو، پھر قرآن میں سے جتنا پڑھ سکتے ہو پڑھو، پھر اطمینان سے رکوع کرو، پھر رکوع سے سر اٹھاؤ حتیٰ کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر اطمینان سے سجدہ کرو، پھر سجدہ سے سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ، پھر پوری نماز میں اسی طرح کرو۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

[۳۰۱] اسی طرح حضرت رفاعہ بن رافع(۱) کی حدیث ہے جسے امام دارقطنی اور دیگر محدثین نے نقل کیا ہے۔(۲)

مسئلہ رفع یدین

ہمارے علماءِ کرام (حضرات مالکیہ) فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی میں نماز کے ارکان تو بیان کئے گئے ہیں مگر اقامت، رفع یدین، قراءت کی مقدار، تکبیرات انتقال، رکوع اور سجدے میں

---

[۳۰۱] سنن دارقطنی میں مجھے یہ حدیث نہیں مل سکی البتہ جامع ترمذیؒ: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی وصف الصلاۃ ۲:۱۰۰، صحیح ابن خزیمہ: کتاب الصلاۃ، باب إجازة الصلاة بالتسبیح والتکبیر والتحمید والتهلیل لمن لم یحسن القرآن ۱:۲۷۴، سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ، باب جماع أبواب أقل مایجزئ من عمل الصلاة وأكثره ۳:۳۴۰ میں منقول ہے۔ امام ابن خزیمہؒ نے باب الأمر بإعادة الصلاة إذا لم یطمئن المصلی فی الرکوع ......۱:۲۹۸ میں بھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ میں نے رفاعہ بن رافع کی حدیث اپنی کتاب الکبیر میں نقل کر دی ہے۔

۱۔ ابومعاذ حضرت رفاعہ بن رافع بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ (م ۴۱ھ) جلیل القدر صحابی ہیں، غزوہ بدر اور جنگ صفین میں شریک ہوئے، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ان سے ۲۴ احادیث منقول ہیں۔ اعلام زرکلی ۳:۵۵

۲۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے یہ شرائط و فرائض مذہب امام مالک رحمہ اللہ کے مطابق ذکر کیے ہیں، ان حضرات کے نزدیک فرض اور واجب ایک ہی چیز ہے، فقہاءِ احناف کے نزدیک چوں کہ فرض اور واجب میں دقیق فرق ہے اس لیے کتب فقہ میں فرائض واجبات اور شرائط کو الگ الگ ذکر کیا گیا ہے۔ چناں چہ ان کے نزدیک نماز کی شروط وہ ہیں جن کا نماز شروع کرنے سے پہلے پورا ہونا ضروری ہے اور فرائض وہ ارکان ہیں جنہیں نماز کے اندر بجالانا ضروری ہے۔ ان سب کی ادائیگی کا طریقہ اور شروط کتب فقہ میں مفصل مذکور ہیں۔ مراقی الفلاح شرح نور الإیضاح: کتاب الصلاۃ، باب شروط الصلاة وأرکانها ص ۱۱۱-۱۲۹۔

فقہاءِ حنفیہ کے نزدیک واجب کا درجہ فرض سے کم اور سنت سے زیادہ ہے، یہ ایسی دلیل شرعی سے ثابت ہوتا ہے جو قطعیت میں فرض کی دلیل سے کسی قدر کم ہو اور اس کا حکم یہ ہے کہ نماز میں فرض رہ جانے سے نماز ہوتی ہی نہیں جب کہ واجب رہ جانے کی دو صورتیں ہیں، اگر جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر بھول کر رہ جائے تو سجدہ سہو سے اس کی کمی پوری ہو جاتی ہے۔ مراقی الفلاح شرح نور الإیضاح: کتاب الصلاۃ، باب شروط الصلاة وأرکانها ص ۳۴-۱۰۵

تسبیحات، درمیانی قعدہ، تشہد، قعدہ اور سلام کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ۔ اقامت اور سورۂ فاتحہ کی تعیین پر بحث تو گزر چکی ہے اور جہاں تک رفع یدین کا تعلق ہے تو یہ عمل علماء کی ایک جماعت اور جمہور فقہاء کے نزدیک واجب نہیں ہے کیوں کہ حضرت ابوہریرہ اور رفاعہ بن رافع رضی اللہ عنہما دونوں کی احادیث میں ان کا ذکر نہیں ۔ امام داؤد ظاہری رحمہ اللہ اور ان کے ہم مسلک بعض دیگر علماءِ تکبیر تحریمہ کے ساتھ رفع یدین کے وجوب کے قائل ہیں۔ ان کے ہم مسلک دیگر علماءِ کہتے ہیں کہ یہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ رکوع کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت بھی واجب ہے اور جو ان مواقع پر رفع یدین نہیں کرتا اس کی نماز باطل ہے۔ امام حمیدی کا بھی یہی قول ہے اور ایک روایت امام اوزاعی رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کی منقول ہے۔ ان کی دلیل یہ ارشاد نبوی ہے :

[۳۰۲] صلّوا كما رأيتموني أصلي

نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسے امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

ان علماء کا کہنا ہے کہ اس حدیث کی بنا پر ہم پر اسی طرح کرنا واجب ہے جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اللہ تعالی کے احکام کی اصل مراد لوگوں تک پہنچانے والے ہیں(۱) ۔

---

[۳۰۲] صحیح بخاری :كتاب الأذان ، باب الأذان للمسافر إذا كانوا جماعة و الإقامة ۱: ۲۲۶، كتاب الأدب ، باب رحمة الناس والبهائم ۵: ۲۲۳۸، كتاب التمني، باب ماجاء في إجازة خبر الواحد الصدوق...... ۶: ۲۶۴۷، الأدب المفرد، :باب الرجل راع في أهله ۱: ۷۶، سنن دارمی :كتاب الصلاة ، باب من أحق بالإمامة ۱: ۳۰۳، صحیح ابن حبان: كتاب الصلاة ،باب الأذان ۴: ۵۴۱، باب صفة الصلاة ۵: ۱۹۰، باب فرض متابعة الإمام ۵: ۵۰۳، صحیح ابن خزیمہ :كتاب الصلاة، باب ذكر الخبر المفسر للفظة المجملة...... ۱: ۲۰۶، باب الدليل على أن النبي صلى الله عليه وسلم أمر برفع اليدين عند إرادة الركوع...... ۱: ۲۹۵، سنن بیہقی: كتاب الصلاة ، باب من سها فترك ركنا عاد إلى ماترك...... ۳: ۳۰۱، باب إذا استووا في الفقه والقراءة أمهم أكبرهم سنا ۳: ۲۹۶، سنن دارقطنی: كتاب الصلاة ، باب في ذكر الأمر بالأذان والإمامة وأحقهما ۱: ۲۷۲، ۲۷۳، باب ذكر الركوع والسجود ومايجزئ فيهما ۱: ۳۴۶۔ یہ الفاظ ایک لمبی حدیث کے ضمن میں منقول ہیں۔

۱۔ امام مالک رحمہ اللہ بھی حضرات حنفیہ کی طرح تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی جگہ رفع یدین کے قائل نہیں جیسا کہ مدونہ میں ہے : ''ولا أعرف رفع اليدين في شيئ من تكبير الصلاة لا في خفض ولا في رفع إلا في افتتاح الصلاة '' المدونة الكبرى :كتاب الصلاة ، باب رفع اليدين في الركوع والإحرام ۱: ۶۸۔ مؤطا میں بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول منقول ہے: ''الا أصلي بكم صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم؟ قال فصلى فلم يرفع يديه إلا مرة'' ۔مؤطا امام مالکؒ : باب افتتاح الصلاة ص ۳۵ (حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا : کیا میں تم لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح نماز پڑھ کر دکھاؤں؟ راوی کہتے ہیں : پھر آپ نے نماز پڑھی اور ایک مقام کے علاوہ کہیں رفع یدین نہیں کیا)۔ تبیين الحقائق شرح كنز الدقائق ۱: ۱۱۹ ، الهداية ۱: ۸۴۔ امام شافعیؒ اور دیگر فقہاء کے ہاں تکبیر تحریمہ کے علاوہ رکوع میں جاتے اور اس سے سر اٹھاتے ہوئے دونوں مقامات پر رفع یدین مستحب ہے۔

تکبیراتِ انتقال

تکبیر تحریمہ کے علاوہ تکبیر کہنا جمہور فقہاء کے نزدیک مذکورہ حدیث کی بناء پر سنت ہے ۔ امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد خاص قاسم رحمہ اللہ فرماتے تھے : جس شخص نے نماز میں تین یا اس سے زائد تکبیریں چھوڑ دیں وہ سلام سے پہلے سجدہ سہو کرے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز نہیں ہوگی ۔ اور اگر ایک یا دو تکبیرات رہ گئیں تو بھی سجدہ سہو کر لے البتہ اس صورت میں سجدہ سہو نہ کرنے سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ انہی سے ایک روایت میں یہ بھی منقول ہے کہ اگر کوئی صرف ایک تکبیر بھول گیا تو اسے سجدہ سہو کرنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تکبیرات کی اجمالی طور پر ادائیگی یا اکثر تکبیرات کا کہنا ان کے نزدیک فرض ہے ، البتہ ان میں تھوڑی بہت کوتاہی ہوجائے تو معاف ہے۔ اصبغ ابن الفرج[1] اور عبداللہ بن عبدالحکم کہتے ہیں :جو شخص تکبیر تحریمہ کہہ لے اور اس کے علاوہ کوئی تکبیر بھی نہ کہے تو کوئی حرج نہیں ۔ تکبیر تحریمہ بھی اگر بھول جائے تو سجدہ سہو کر لے ۔ اگر کسی نے اس پر سجدہ سہو نہ کیا تو بھی اس کی نماز ہو جائے گی مگر کسی کو جان بوجھ کر تکبیرا ت چھوڑ نی نہیں چاہیئں کیوں کہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے ، اگر کسی نے ایسا کیاتو براکیا البتہ اس سے اس کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، نماز ہوجائے گی۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں یہی صحیح ہے ۔ اور اکثر علاقوں کے فقہاء شافعی ،حنفی ، مالکی اور حضرات محدثین کا اسی پر اتفاق ہے سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے ابن القاسم رحمہ اللہ کی رائے کو اختیار کیا ہے۔امام بخاریؒ رحمہ اللہ نے بھی اس عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے : ''باب إتمام التكبير في الركوع والسجود''اور اس کے تحت حضرت مُطرِّف بن عبد اللہ کی درج ذیل حدیث بھی نقل کی ہے:

[۳۰۳] میں نے اور عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز

---

[۳۰۳] صحیح بخاری: كتاب صفة الصلاة ، باب يكبر وهوينهض من السجدتين وكان ابن الزبير......۱:۲۸۴،صحیح مسلم: كتاب الصلاة،باب إثبات التكبيرفي كل خفض ورفع في الصلاة:۲۹۵،مسندامام احمدؒ:حدیث عمران بن حصین رضی اللہ عنہما۵:۶۰۹،امام ابوداودؒ، نسائیؒ اور بیہقیؒ نے بھی اسے قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

۱۔ ابوعبد اللہ اصبغ بن الفرج بن سعید المالکی المصری (م ۲۲۵ھ) ابن قاسمؒ ، اشہبؒ اور ابن وہبؒ کے شاگرد ہیں۔ ابن ماجشون ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ: مصر۔نے اصبغ جیسا کوئی عالم پیدانہیں کیا۔ اعلام زرکلی ۱: ۳۳۶

پڑھی، آپ جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے، سجدے سے سر اٹھاتے تو تکبیر کہتے اسی طرح جب دو رکعتوں کے بعد اٹھتے تو بھی تکبیر کہی۔ جب انہوں نے نماز مکمل کر لی تو حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ نے میرا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: انہوں نے تو مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز یاد دلا دی۔ یا یوں فرمایا: انہوں نے ہمیں ایسی نماز پڑھائی ہے جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پڑھایا کرتے تھے۔

اسی طرح انہوں نے عکرمہ رحمہ اللہ کی درج ذیل حدیث بھی نقل کی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

[۳۰۴] میں نے ایک شخص کو مقام ابراہیم کے پاس اس طرح نماز پڑھتے دیکھا کہ وہ اوپر نیچے جاتے اور اٹھتے بیٹھتے ہر موقع پر تکبیر کہہ رہا تھا۔ میں نے یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کو بتائی تو آپؓ نے ارشاد فرمایا: ''أولیس تلک صلاة النبي صلی اللہ علیه وسلم لاأمّ لک!'' تیری ماں مرے کیا یہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز نہیں ہے؟

امام بخاریؒ کے اس عنوان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر موقع پر تکبیر کہنے کا ان حضرات کے ہاں عام رواج نہ تھا۔ابواسحاق سبیعیؒ نے یزید بن ابی مریم سے اور انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے،آپؓ فرماتے ہیں:

[۳۰۵] جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہمیں ایسی نماز پڑھائی کہ ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز یاد آ گئی۔ اس نماز میں اوپر نیچے آتے اور اٹھتے بیٹھتے ہر موقع پر تکبیرات کہتے رہے۔حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم یا تو ان تکبیرات کو بھول چکے ہیں یا ہم نے جان بوجھ کر چھوڑ دی ہیں۔

---

[۳۰۴] صحیح بخاری: کتاب صفة الصلاة، باب إتمام التکبیر في السجود ۱:۲۷۲،صحیح ابن خزیمۃ:کتاب الصلاة، باب ذکر خبر روی عن النبي صلی اللہ علیه وسلم في تکبیره في الصلاة ......۱:۲۹۰،مسند امام احمدؒ: مسند عبد اللہ بن العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنهما ۱:۵۳۷، مسند ابویعلیٰ :مسند ابن عباس رضی اللہ عنه ۴:۳۶۱،یہاں'' لاأم لعکرمة'' کے الفاظ ہیں۔امام بخاریؒ نے کتاب صفة الصلاة، باب التکبیر إذا قام من السجود ۱:۲۷۲میں اور امام احمدؒ رحمہ اللہ نے مسند عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنه ۱:۴۸۰میں یہی حدیث مختلف الفاظ سے نقل کی ہے جس میں'' لاأم لک ''کی بجائے ''ثکلتک أمک'' ہے۔

[۳۰۵] سنن ابن ماجہ:کتاب إقامة الصلاة والسنة فیها،باب التسلیم ۱:۲۹۶،مسند امام احمدؒ : حدیث أبي موسیٰ الأشعري رضي اللہ عنه ۵:۵۴۶، ۵۶۸

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں تمہارا کیا خیال ہے ؟ کیا انہوں نے اپنی نمازیں لوٹائی ہوں گی ؟ اگر انہوں نے نہیں لوٹائی ہوں گی تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جس نے تکبیر چھوڑ دی اس کی نماز باطل ہوگئی ؟۔ فرض کریں اگر یہ موقف تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس طرح سنت اور فرض میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا ۔ اصول یہ ہے کہ جب کسی چیز کے اجزاء واجب نہ ہوں تو پوری چیز بھی واجب نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والے ہیں ۔

پندرہویں بحث : رکوع اور سجدے کی تسبیحات کا حکم

مذکورہ بالا حدیث کی بناء پر جمہور فقہاء کے نزدیک رکوع اور سجدے میں تسبیحات واجب نہیں ہیں جبکہ اسحاق بن راہویہ ان کو واجب قرار دیتے ہیں اور ان کے نزدیک جو شخص تسبیحات چھوڑ دے اس پر نماز کا لوٹانا واجب ہے۔ ان کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے :

[۳۰۶] أمّاالركوع فعَظِّموافيه الرَّبَّ وأمّاالسجود فاجتهدوافى الدعاء فَقَمِنٌ أن يستجابَ لكم۔

رکوع میں اپنے رب کی عظمت بیان کرو اور سجدے میں خوب محنت سے دعا کرو، امید ہے تمہاری دعا قبول کرلی جائے گی۔

سولہویں بحث : درمیانی قعدے اور تشہد کا حکم

قعدے اور تشہد کے بارے میں علماءِ کا اختلاف ہے ۔ امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کے نزدیک

---

[۳۰۶] صحیح مسلم : كتاب الصلاة، باب النهى عن قراء ة القرآن فى الركوع والسجود۱:۳۴۸، سنن ابوداؤد: كتاب الصلاة ، باب فى الدعاء فى الركوع والسجود۱:۲۳۲، سنن دارمی : كتاب الصلاة، باب النهى عن القراء ة فى الركوع والسجود ۱:۳۲۳،۳۲۴، صحیح ابن حبان: كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۵:۲۲۲، صحیح ابن خزیمۃ : كتاب الصلاة ، باب النهى عن قراء ة القرآن فى الركوع والسجود۱:۲۷۶ ،مسند امام احمدؒ: مسند على بن ابى طالب رضى الله عنه ۱:۲۵۰،۲۵۱،مسند عبد الله بن عباس بن عبد المطلب رضى الله عنهما۱:۳۶۲،مسند ابو یعلی : مسند على بن أبى طالب رضى الله عنه ۱:۲۵۵،۳۳۴،مصنف عبد الرزاق : كتاب الصلاة ،باب القراء ة فى الركوع والسجود۲:۱۴۵،مسند بزار: مسند على بن أبى طالب رضى اللهعنه ،وماروى النعمان بن سعد عن على رضى الله عنه ۲:۲۷۸،سنن بیہقی : كتاب الصلاة ،باب النهى عن قراء ة القرآن فى الركوع ولسجود ۲:۴۰۵ ۔بعض حضرات نے یہ حدیث زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے ۔

پہلا قعدہ اور اس میں تشہد دونوں سنت ہیں جبکہ فقہاء کی ایک جماعت نے پہلے قعدہ کو واجب قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تمام فرائض میں سے اس کی یہ خصوصیت ہے کہ سجدہ سہو اس کا قائم مقام بن سکتا ہے۔ اس کی مثال اسی طرح ہے جیسے مساکین کو درختوں کے اوپر موجودتر کھجوریں فروخت کرنے کی خصوصی اجازت دی گئی تھی جب کہ عام لوگوں کو یہ اجازت نہ تھی۔ اور جیسا کہ تجارت کے لیے اپنامال کسی کو نفع کی شراکت پر دینے کی خصوصی اجازت ہے جبکہ عام اجارات میں اس طرح کی گنجائش نہیں۔ یہی استثنائی صورت اس معمولی قیام کی ہے جو تکبیر تحریمہ کہہ کر امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہونے والے نمازی کے مکمل قیام کے قائم مقام قراردیا گیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ قعدہ بھی نماز کی دوسری سنتوں کی طرح سنت ہوتا تو اسے جان بوجھ کر چھوڑنے سے نماز نہ ٹوٹتی جیسا کہ دوسری سنتوں کو چھوڑنے سے نہیں ٹوٹتی۔

جو حضرات اسے واجب قرار نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ فرض ہوتا تو اسے بھول کر چھوڑ جانے والے کو اس کی ادائیگی کے لیے اس کی طرف لوٹنا پڑتا جیسا کہ سجدہ یا رکوع چھوڑنے والے کو کرنا پڑتا ہے اور اس میں رتبے کے تسلسل کو اسی طرح مدنظر رکھنا ضروری ہوتا جس طرح رکوع اور سجدہ میں ہوتا ہے، پھر اس کی تاخیر سے ادائیگی پر سجدہ سہو کیا جاتا جیسے اس شخص کو کرنا پڑتا ہے جو رکوع یا سجدہ بھول جائے اور پھر یاد آنے پر انہیں ادا کرلے۔ حضرت عبداللہ بن بحینہ کی حدیث میں ہے:

[۳۰۷] أن رسول اللہ قام من رکعتین ونسی أن یتشهد فسبح الناس خلفه کیمایجلس فثبت قائمافقاموا، فلمافرغ من صلاته سجد سجدتي السهوقبل التسلیم۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو رکعات پڑھنے کے بعد بھول گئے اور تشہد پڑھنے کی بجائے سیدھے کھڑے ہوگئے، اس پر نمازیوں نے سبحان اللہ کہنا شروع کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ

[۳۰۷] جامع ترمذی: کتاب الصلاۃ، باب ماجاء فی سجدتي السهو قبل التسلیم ۲: ۲۳۵۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: اسی حدیث پر اہل علم کا عمل ہے اور یہ پہلے والی احادیث کے لیے ناسخ ہے، سنن ابن ماجہ: کتاب إقامة الصلاة والسنة فیها، باب من جاء فیمن قام من اثنتین ساهیا ۱: ۳۸۱، مسند امام احمدؒ: حدیث عبد اللہ بن مالک بن بحینة ۶: ۴۷۲، سنن ابوداود: کتاب الصلاة، باب من نسی أن یتشهد وهو جالس ۱: ۲۷۴، سنن بیہقی: کتاب الصلاة، باب من سهافقام من اثنتین ثم ذکر ...... ۳: ۲۹۸، مصنف عبدالرزاق: کتاب الصلاة، باب القیام فیما یقعد فیه ۲: ۳۱۰ وغیرہ میں یہ حدیث حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے الفاظ کے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ منقول ہے، امام ترمذی رحمہ اللہ نے کتاب الصلاة، باب ماجاء فی الإمام ینهض فی الرکعتین ناسیا ۲: ۱۹۸ میں ابن ابی لیلی عن الزہری نقل کر کے اس کے بعض رواۃ پر جرح کی ہے اور پھر حضرت عبد اللہ بن بحینہ کی روایت ذکر کر کے اسے زیادہ قابل اعتماد قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اہل علم کا عمل اسی پر ہے کہ اگر کوئی دو رکعات کے بعد تشہد بھول کر سیدھا کھڑا ہوجائے تو دوبارہ نہ بیٹھے اور آخر میں سجدہ سہو کرلے۔ یہ حدیث نقلا یا عملا متعدد صحابہ کرام سے متعدد اسناد کے ساتھ منقول ہے۔

وسلم کو معلوم ہوجائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جائیں مگر جب دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بدستور کھڑے ہیں تو سب لوگ کھڑے ہوگئے ۔ جب آپ نماز مکمل کر چکے تو سلام سے پہلے ہی سہو کے دو سجدے کر لیے۔

اب اگر درمیانہ قعدہ فرض ہوتا تو بھول جانے کی وجہ سے اس کی ادائیگی معاف نہ ہوتی کیوں کہ نماز کے فرائض میں کوئی فرض چھوٹ جائے تو نماز نہیں ہوتی خواہ بھولے سے رہ گیا ہو یا نمازی نے اسے جان بوجھ کر چھوڑ دیا ہو۔ البتہ اگر کوئی شخص امام کی اقتداء میں نماز پڑھ رہا ہو تو اس کی نماز ہوجائے گی[1] ۔ نماز کے آخری قعدہ کے حکم اور اس کے مقصد کے بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

سترہویں بحث : آخری قعدہ ، تشہد اور سلام کا حکم

اس کے بارے میں درج ذیل پانچ اقوال مروی ہیں:

پہلا قول ، یہ سب فرض ہیں: امام شافعیؒ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آخری قعدہ میں بیٹھنا ، تشہد پڑھنا اور سلام تینوں الگ الگ فرض ہیں ۔ایک روایت میں امام احمدؒ سے بھی یہی منقول ہے۔اسی کو ابومصعب نے اپنی مختصر میں امام مالک اور فقہاء مدینہ سے نقل کیا ہے۔ امام داؤد ظاہری کا بھی یہی قول ہے۔امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں : جس نے پہلے قعدہ میں نہ تشہد پڑھا نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا وہ سہو کے دو سجدے کر لے تو اس کی نماز ہو جائے گی مگر جس نے آخری تشہد چھوڑ دیا خواہ بھول کر چھوڑا ہو یا جان بوجھ کر اسے نماز دوبارہ پڑھنا پڑے گی۔ ان کا کہنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نماز کے بارے میں یہ ارشاد ہی اس کی فرضیت کی دلیل ہے کہ:

[۳۰۸] صلّوا کما رأیتمونی أصلي۔

نماز اس طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

اس کی فرضیت حدیث کے ،،مال کے اندر خود بخود موجود ہے اور اس کی مزید تفصیل کے لیے الگ وضاحت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اس کی اجمالی فرضیت سے کسی چیز کا اخراج کسی دلیل کی بنیاد پر ہی ہوسکتا ہے۔

---

[۳۰۸] اس کا مفصل حوالہ رفع یدین کی بحث میں گزر چکا ہے۔

۱۔ یہ ساری بحث اس تناظر میں ہے کہ حضرات فقہاء مالکیہ کے نزدیک فرض اور واجب ایک ہی چیز ہیں جبکہ احناف کے ہاں ان دونوں کے درمیان دقیق فرق ہے جس کی بناء پر ان کے نزدیک درمیانی قعدہ نہ فرض ہے نہ سنت بلکہ واجب ہے اور واجب بھول کر رہ جائے تو اس کی تکمیل سجدہ سہو سے ہوجاتی ہے فرض کی نہیں ہوتی خواہ امام سے رہ جائے یا مقتدی سے یا منفرد سے ۔ مراقي الفلاح شرح نور الإیضاح : کتاب الصلاۃ ، باب شروط الصلاۃ وأرکانها ص ۱۳۴، ۱۳۶

دوسرا قول ، تینوں سنت ہیں: اس قول کے مطابق آخری قعدہ میں بیٹھنا ، تشہد پڑھنا اور سلام تینوں فرض نہیں بلکہ سنت ہیں ۔ یہ بعض بصری فقہاء کا قول ہے ۔ یہی رائے ابراہیم بن عُلَیّہ نے اختیار کی ہے ۔انہوں نے اس کو بھی پہلے قعدہ پر قیاس کیا ہے مگر ان کی یہ رائے شاذ اور جمہور کی رائے کے خلاف ہے۔ البتہ اس بات کے قائل وہ بھی ہیں کہ اگر کوئی شخص ان تینوں میں سے کوئی چیز بھی چھوڑ دے تو اسے نماز دوبارہ پڑھنا پڑے گی۔ان کی دلیل حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے منقول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے :

[۳۰۹] إذا رفعَ الإمام رأسه من آخر سجدة في صلاته ثم أحدث فقد تمت صلاته۔

جب امام آخری سجدے سے سر اٹھالے تو اس کے بعد اگر اس کا وضوء ٹوٹ جائے تو اس کی نماز مکمل ہوجائے گی۔حافظ ابوعمرو ابن عبدالبرؒ کہتے ہیں : یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ ہم نے بھی اپنی کتاب المقتبس میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ دوسرے یہ بات بھی ہے کہ اس حدیث سے سلام کی عدم فرضیت تو ظاہر ہوتی ہے مگر قعدہ میں بیٹھنے کی نہیں ہوتی۔

تیسرا قول ، قعدہ فرض ہے اور تشہد وسلام واجب: اس قول کے مطابق آخری قعدہ میں تشہد کی مقدار بیٹھنا فرض ہے مگر تشہد پڑھنا اور سلام دونوں فرض نہیں ہیں۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ، ان کے تلامذہ اور فقہاء کوفہ کی ایک جماعت کا قول ہے۔ ان کی دلیل ابن مبارک سے مروی حدیث ہے جو انہوں نے عبدالرحمٰن بن زیاد افریقی سے نقل کی ہے جو کہ ضعیف ہے۔ اس حدیث میں ہے:

[۳۱۰] إذا جلس أحدكم في آخر صلاته ثم أحدث فقد تمت صلاته۔

جب تم میں سے کوئی اپنی نماز کے آخر میں بیٹھ جائے اور پھر اس کا وضوء ٹوٹ جائے تو اس کی نماز مکمل ہوجائے گی۔

---

[۳۰۹] سنن بیہقی: کتاب الصلاۃ ،باب تحلیل الصلاۃ بالتسلیم ۲:۵۵۳،امام بیہقی رحمہ اللہ نے اس کے راوی عاصم بن ضمرہ کو ضعیف کہا ہے ،امام ترمذیؒ نے اپنی جامع ،کتاب الصلاۃ ، باب ماجاء فی الرجل یحدث فی التشہد ۲:۲۶۱ میں اور دارقطنیؒ نے اپنی سنن : کتاب الصلاۃ ، باب من أحدث قبل التسلیم فی آخر صلاته أو أحدث قبل تسلیم الإمام فقد تمت صلاته ۱: ۳۷۹ میں اسے تین وجوہ سے ،بیہقی نے السنن الکبری ، کتاب الصلاۃ ، باب مبتدأ فرض التشہد ۲:۴۹۶ اور بزار نے البحر الزخار ،مسند عبد اللہ بن عمرو بن العاص ۶:۴۲۱ میں ، امام ابوداودؒ نے السنن:کتاب الصلاۃ ،باب الإمام یحدث بعد ما یرفع رأسه من آخر......۱:۱۶۷ میں مختلف الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ امام دارقطنیؒ ، ترمذیؒ ،امام احمدؒ اور نسائیؒ نے عبد الرحمٰن بن انعم الأفریقی کو ضعیف کہا ہے مگر امام بخاریؒ کی رائے میں وہ قوی ہیں۔

[۳۱۰] سنن دارقطنی: کتاب الصلاۃ ، باب من أحدث قبل التسلیم فی آخر صلاته أو أحدث قبل تسلیم الإمام فقد تمت صلاته ۱:۳۷۹

علامہ ابن العربیؒ کہتے ہیں: ہمارے شیخ فخر الاسلام اپنے سبق میں اس رائے پر یہ شعر سنایا کرتے تھے:

ویری الخروج من الصلاۃ بضرطۃ   أین الضُّراط من السلام علیکم

وہ سمجھتا ہے کہ نماز سے فارغ ہونا ہوا خارج کر کے بھی ہوسکتا ہے۔ ہوا خارج ہونا السلام علیکم کے برابر کیسے ہوسکتا ہے[1]

ابن العربی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ہمارے بعض علماء نے اس مسئلہ میں دو کمزور آراء اختیار کی ہیں جن میں سے ایک عبد الملکؒ سے مروی ہے جو انہوں نے عبد الملک سے نقل کی ہے، وہ کہتے ہیں: ''أنَّ مَنْ سلّم مِن رکعتین متلاعبا فخرجَ'' (جس نے کھیل کھیل میں سلام پھیر لیا وہ نماز سے فارغ ہوگیا[2])

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر چار رکعات والی نماز پڑھتے ہوئے اس نے دو رکعات کے بعد ایسا کیا تو اس کی دو رکعات والی نماز ہوگئی، اہل عراق (حنفیہ) کا بھی بعینہ یہی مذہب ہے۔ دوسری رائے وہ ہے جو ہماری متروک کتب میں موجود ہے اور وہ یہ کہ اگر امام تشہد کے بعد جان بوجھ کر وضو توڑ دے تو اس کے مقتدیوں کی نماز ہوجائے گی۔ یہ رائے اس قابل نہیں کہ فتوی میں اس کو بنیاد بنایا جائے اگرچہ علمی مجالس میں تعلیمی نقطۂ نظر سے اس کا ذکر عام ہے[3]۔

۱۔ بات دراصل ہوا خارج ہونے کی نہیں، اصل مسئلہ تو نماز سے خروج کی نیت سے اپنے کسی ایسے فعل کے ذریعے نماز سے باہر آنا ہے جس کی فرضیت کے قائل نہ صرف فقہاء احناف ہیں بلکہ خود مالکیہ کی ایک جماعت کے علاوہ فقہاء کی ایک معتد بہ تعداد ہے جن کا ذکر علامہ قرطبیؒ نے خود کر کے ان کا رد کیا ہے، اس لیے مسئلہ کے ظاہر کو نہ دیکھا جائے بلکہ اس اختلاف پر غور کیا جائے جو نماز سے فارغ ہونے کے لیے لفظ سلام کی فرضیت اور عدم فرضیت میں ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے۔ اور احناف کی ایک جماعت بھی لفظ سلام کی فرضیت کی قائل ہے جبکہ دیگر فقہاء مذہب اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ اعلاء السنن: باب وجوب الخروج من الصلاۃ بالسلام وبیان کیفیتہ ۳: ۱۷۵، ۱۷۶ میں اس پر تفصیلی بحث موجود ہے۔

۲۔ اس قول کے راوی عبد الملک بن حبیب ہیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے اور جن سے روایت کی ہے وہ فقہ مالکی کے مشہور امام اور خود صاحب مذہب حضرت امام مالک رحمہ اللہ کے شاگرد ابن ماجشون مدنی رحمہ اللہ ہیں۔

۳۔ یہ مؤلف رحمہ اللہ کی ذاتی رائے ہے۔ باقی جہاں تک مذکورہ مسئلہ کا تعلق ہے تو یہ حنفی غیر حنفی بہت سے فقہاء کی رائے ہے جس کی بنیاد مذکورہ حدیث ہے۔ البتہ اسے متفق علیہ قول نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ خود احناف کا بھی اس میں اسی طرح اختلاف ہے جس طرح حضرات مالکیہ کا ہے، اور خروج عن الصلاۃ بالحدث اصل مسئلہ نہیں بلکہ اپنے ارادہ سے کوئی ایسا عمل کر کے نماز سے نکلنا ہے جو نماز کے منافی ہو، اسی کے لیے فقہاء کے ہاں'' خروج بصنعہ'' کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اعلاء السنن ۳: ۱۷۵، ۱۷۶

چوتھا قول ، قعدہ اور سلام فرض ہیں ، تشہد نہیں ہے: اس قول کے مطابق آخری قعدہ میں بیٹھنا بھی فرض ہے اور سلام بھی مگر تشہد واجب نہیں ۔ یہ امام مالک بن انس رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کا مذہب ہے۔ یہی ایک روایت میں امام احمدؒ بن حنبل رحمہ اللہ سے بھی منقول ہے۔وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ اور سورۂ فاتحہ کے علاوہ پڑھنے کی کوئی چیز بھی واجب نہیں۔

پانچواں قول ، قعدہ اور تشہد واجب ہیں مگر سلام واجب نہیں: اس قول کے مطابق آخری قعدہ میں بیٹھنا بھی فرض ہے اور تشہد کا پڑھنا بھی مگر سلام فرض نہیں ۔ یہ فقہاء کی ایک جماعت کا قول ہے جن میں اسحاق بن راہویہ بھی شامل ہیں ۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو تشہد سکھایا تو ان کو ارشاد فرمایا:

[۳۱۱] إذافرغتَ من هذافقد تمت صلاتك وقضيتَ ماعليكَ

جب تو اس سے فارغ ہوگیا تو تیری نماز مکمل ہوگئی ۔

---

[۳۱۱] مؤلف رحمہ اللہ والے الفاظ مجھے یکجا کہیں نہیں مل سکے البتہ اس کے ہم معنی الفاظ متداول ومشہور کتب احادیث میں منقول ہیں جن کے مرفوع یا موقوف ہونے میں علماءِ حدیث نے بحث کی ہے ۔ اس عبارت سے قریب ترین الفاظ :"**إذافرغت من هذا فقد قضيت صلاتک فإن شئت فقم وإن شئت فاقعد**" ہیں جنہیں امام بیہقیؒ نے السنن الكبرى : **كتاب الصلاة ، باب تحليل الصلاة بالتسليم** ۲:۵۵۴ میں نقل کیے ہیں، اس کے ہم معنی الفاظ ، ابوداؤد نے السنن: **كتاب الصلاة، باب التشهد** ۱:۲۵۴ ، طحاوی نے **معانی الآثار** : ۱:۲۷۵ ، ابوداؤد طیالسی : بسند **زهير بن معاويه عن الحسن بن حر عن القاسم بن مُخَيمَرَة عن علقمه عن ابن مسعودؓ** حدیث تشہد کے ضمن میں ذکر کیے ہیں جہاں "**إذافرغتَ**" کی بجائے "**إذاقُلتَ هذَا**" کے الفاظ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کیساتھ مذکور ہیں۔ صحیح ابن حبان :**كتاب الصلاة ، باب صفة الصلاة** ۵:۲۹۳ میں یہ الفاظ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہیں اس کے بعد تشہد کے الفاظ والی حدیث ایک اور سند کے ساتھ مذکور ہے جس کے بعد حسن بن حر کا قول منقول ہے کہ محمد بن ابان نے مجھے اس پر مزید یہ الفاظ بھی بتائے :"**فإذا قلتَ هذَافإن شئت فقم**" اوراس پر اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے کہ: ابن ابان ضعیف ہے اور ہم نے اپنی تصنیف : کتاب المجروحین میں اس سے براءت کا اظہار کردیا ہے، سنن بیہقی :،**كتاب الصلاة ، باب تحليل الصلاة بالتسليم** ۲:۵۵۳، سنن دارقطنی:**كتاب الصلاة ، باب صفة التشهد ووجوبه واختلاف الروايات فيه** ۱:۳۵۳، امام ترمذیؒ نے اپنی جامع: **كتاب الصلاة ، باب ماجاء في الرجل يحدث في التشهد** ۲:۲۶۱ ضمناً یہ الفاظ نقل کیے ہیں۔ ائمۂ حدیث ترمذیؒ ، دارقطنیؒ ، بیہقیؒ اوردیگر حضرات نے اپنی تحقیق کا خلاصہ یہی بیان فرمایا ہے کہ حدیث تشہد تو مرفوع اور صحیح ہے مگر اس کے ساتھ ان الفاظ کا اضافہ موقوف اورحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا اپنا ارشاد ہے۔ علامہ زیلعی نے بھی **نصب الراية** ۱: ۴۲۴-۴۲۵ میں اس پر بحث کی ہے۔ مولانا ظفر احمدؒ عثمانی رحمہ اللہ نے **اعلاء السنن : باب افتراض القعدة الأخيرة قدر التشهد** ۳: ۱۴۱ میں اورباب **وجوب الخروج من الصلاة بالسلام وبيان كيفيته** ۳: ۱۷۵ میں اس کی تحقیق کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ یہ روایت موقوف بحکم مرفوع ہے۔ اسی وجہ سے اس سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی اور احناف کی اصطلاح میں اسے واجب قرار دیا گیا ہے۔

روایت کی تحقیق

یہ الفاظ کسی نے زہیر سے نقل کر کے حدیث کے اندر شامل کر دیئے ہیں اور ان کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کردی ہے، البتہ شَبابَہ نے اس عبارت کو کلام نبوی سے الگ کر کے اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا کلام قرار دیا ہے۔ اور انہی کا قول اس قول کے مقابلے میں زیادہ درست ہے جس میں ان الفاظ کو کلام نبوی کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ شبابہ ثقہ راوی ہیں اور غسان بن ربیع نے بھی اس روایت میں ان کی تائید کی ہے اور حدیث کے آخری الفاظ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کہنے کی بجائے ان کی نسبت حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف کی ہے۔

اٹھارہویں بحث: نماز میں سلام کا حکم

اس کے بارے میں فقہاء سے مختلف آراء منقول ہیں: بعض کے نزدیک لفظ سلام کہنا واجب ہے اور بعض کے نزدیک واجب نہیں، اور صحیح یہی ہے کہ سلام واجب ہے جس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ صحیح حدیث ہے جسے امام ابو داؤد اور امام ترمذیؒ نے نقل کیا ہے اور جس کے راوی سفیان ثوری رحمہ اللہ ہیں، انہوں نے اسے عبد اللہ بن محمد بن عقیل سے، انہوں نے محمد بن الحنفیہ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۱۲] مفتاح الصلاة الطهور وتحريمها التكبير وتحليلها التسليم۔

نماز کی چابی طہارت ہے، اس کی ابتداء تکبیر تحریمہ ہے اور اختتام سلام ہے۔

یہی حدیث تکبیر اور سلام دونوں کے واجب ہونے کی اصل دلیل ہے۔ اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح طہارت کے قائم مقام بالاتفاق کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی اسی طرح تکبیر اور سلام کے قائم مقام بھی اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ عبد الرحمٰن بن مہدیؒ کہتے ہیں: اگر تکبیر تحریمہ نہ کہے اور اس کی بجائے اللہ تعالی کے اسماء حسنی میں سے ستر نام بھی لے کر نماز شروع کرے تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوگی اور اسی طرح اگر کسی نے سلام سے پہلے وضو توڑ دیا تو نماز صحیح ہونے کے لیے کافی نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ کی حدیث کی یہ تشریح عبدالرحمٰن بن مہدی نے کی ہے جو کہ علم حدیث اور اس میں صحیح سقیم کی پہچان کے فن میں امام ہیں، اس سلسلہ میں ان کی شہادت کافی ہے۔

---

[۳۱۲] اس حدیث کی تخریج آیت نمبر ۳ کی پانچویں بحث میں گزر چکی ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والی حدیث عنقریب ان شاء اللہ آرہی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ نماز کے افتتاح کے وقت تکبیر تحریمہ کے واجب ہونے یا نہ ہونے میں علماءِ سے مختلف آراء منقول ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے[1] :

انیسویں بحث : نماز میں تکبیر تحریمہ کا حکم

ابن شہاب زہریؒ، سعید بن المسیبؒ، اوزاعیؒ، عبدالرحمٰنؒ وغیرہ فقہاء کے ایک طبقہ کی رائے یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ واجب نہیں ہے ۔ امام مالک سے بھی مقتدی کے بارے میں ایک قول ایسا منقول ہے جس سے یہی معلوم ہوتا ہے مگر ان کی ثابت شدہ رائے کے مطابق تکبیر تحریمہ نہ صرف ضروری ہے بلکہ یہ ان کے نزدیک فرض اور نماز کے ارکان میں سے ایک رکن ہے ۔ یہی بات صحیح ہے اور جمہور کا مذہب بھی یہی ہے۔ جو رائے اس کے خلاف ہوگی سنت کی دلیل سے اس کو رد کیا جائے گا۔

بیسویں بحث: تکبیرِ تحریمہ کے الفاظ

نماز کی ابتداء کے لیے تکبیرِ تحریمہ کے موقعہ پر کیا الفاظ کہے جائیں ، اس بارے میں فقہاء سے مختلف آراء منقول ہیں۔ امام مالک رحمہ اللہ ،ان کے تلامذہ اور جمہور علماءِ کہتے ہیں کہ یہاں ''اللّٰہ اکبر'' کے علاوہ اور کوئی لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا، نہ اس کی جگہ ''لاالٰہ إلااللہ '' کہنا کافی ہے ، نہ ''سبحان اللہ '' ، نہ ''سبحان ربي العظيم '' اور نہ ہی ''الحمد للہ ''۔ یہی فقہاء حجاز اور اکثر اہل عراق کا بھی قول ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ ''اللہ اکبر'' کے علاوہ یہاں کچھ بھی اور کہنا جائز نہیں ۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی اسی طرح کا قول منقول ہے البتہ ان کے نزدیک اسی کے صیغہ کو بدل کر ''اللہ الأکبر'' اور ''اللہ الکبیر'' کہنا جائز ہے۔ امام مالکؒ کے قول کی دلیل حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد:

[۳۱۳] كان رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم يستفتح الصلاة بالتكبير، والقراءة بِالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

[۳۱۳] صحیح مسلم: کتاب الصلاۃ ، باب مایجمع صفة الصلاة ومایفتتح به ويختتم به ۱:۳۵۷، سنن بیہقی: كتاب الصلاة ، باب يضع كفيه ويرفع مرفقيه ولايفترش ذراعيه ۲:۴۵۲، باب ختم الصلاة بالتسليم ۲:۵۵۰، سنن ابوداود: كتاب الصلاة ، باب من لم ير الجهر ببسم اللہ الرحمن الرحيم ۱:۲۰۸، صحیح ابن حبان : كتاب الصلاة ، باب صفة الصلاة ۵:۶۴، مسند ابویعلیٰ: مسند عائشة رضى اللہ عنها ۸:۱۲۶، مسند امام احمدؒ: حديث السيدة عائشة رضى اللہ عنها ۷:۴۹، ۲۷۸

۱۔ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے جس کی کچھ تفصیل سلام کے بیان میں گزر چکی ہے اور کچھ عنقریب آرہی ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نماز کی ابتداء تکبیر تحریمہ سے اور قراء ت کی ابتداء ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ﴾ سے کیا کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث :

[۳۱۴] وتحريمها التكبير۔ اور اس کی ابتداء تکبیر تحریمہ سے ہے۔

اعرابی کی حدیث :

[۳۱۵] فكَبِّر۔ پھر تکبیر کہو۔

اسی طرح ایک اور حدیث بھی ہے جو سنن ابن ماجہؒ میں ابوبکر بن ابی شیبہ اور علی بن محمد الطنافسی کے حوالہ سے منقول ہے وہ دونوں کہتے ہیں : ہم سے ابواسامہ نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں مجھے عبد الحمید بن جعفر نے بتایا، وہ کہتے ہیں ہم سے محمد بن عمرو بن عطاء نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں میں نے ابوحمید الساعدی کو یوں کہتے سنا :

[۳۱۶] كان رسول الله إذاقام إلى الصلاة استقبل القبلة ورفع يديه وقال : اللّٰه أكبر۔

رسول اللہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو قبلہ رخ ہوکر ہاتھ اٹھاتے اور فرماتے : ''اللّٰه أكبر''۔

یہ لفظ تکبیر کی تخصیص میں نص صریح اور حدیث صحیح ہے۔ اس بارے میں ایک شاعر کہتا ہے:

رأيتُ اللّٰه أكبَرَ كلَّ شيءٍ محاولةً وأعظمه جنود [1]

میں نے دیکھا کہ اللہ تعالی سب سے بڑی قدرت والے اور ان کے لشکر سب سے عظیم تر ہیں۔

---

[۳۱۴] اس کا حوالہ گزر چکا ہے۔

[۳۱۵] اس کا حوالہ حدیث المسیء صلاته کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

[۳۱۶] سنن ابن ماجہ: كتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب افتتاح الصلاة ۱:۲۶۴، صحیح ابن حبان: كتاب الصلاة، باب صفة الصلاة ۵:۱۸۷۸، سنن بیہقی :كتاب الصلاة، باب رفع اليدين عند القيام من الركعتين ۲:۴۹۲، سنن ابوداؤد :كتاب الصلاة، باب افتتاح الصلاة ۱:۱۹۴، سنن داری: كتاب الصلاة، باب صفة صلاة رسول الله صلى الله عليه وسلم ۱:۳۴۳، صحیح ابن خزیمہ: كتاب الصلاة، باب السنة في الجلوس بين السجدتين ۱:۳۳۷، جامع ترمذی: كتاب الصلاة، باب ومنه ۲:۱۰۵، یہ الفاظ امام ابن ماجہ کے ہیں جبکہ امام ابوداؤد اور بعض دیگر ائمہ حدیث نے اسے قدرے مفصل ذکر کیا ہے جس کی ابتداء انہی الفاظ سے ہے۔ یہ حدیث صحیح اور متصل الاسناد ہے، دیگر کئی احادیث بھی اس کی مؤید ہیں۔

۱۔ یہ شعر بنوبکر بن ہوازن کے شاعر خداش بن زہیر کا ہے۔ شرح ابن عقیل ۱: ۲۳۸، ابن ہشام: قطر الندی، شاہد نمبر ۶۷

پھر یہ بات بھی ہے کہ "اللہ اکبر" میں باری تعالیٰ کی شانِ قِدَم کا جو بیان ہے وہ "کبیر" اور "عظیم" میں ناپید ہے لہٰذا معنی کے لحاظ سے بھی یہی الفاظ مناسب ترین ہیں واللہ اعلم۔

احناف کی رائے

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں : اگر نماز کی ابتداء "لا إله إلّا الله" کہہ کر کی تب بھی جائز ہے۔ اور اگر اس کی جگہ "اللهم اغفرلي" کہہ دیا تو کافی نہ ہوگا، یہی امام محمد بن الحسنؒ کی رائے ہے۔ امام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر تکبیر ٹھیک طرح کہہ سکتا ہے تو "لا إله إلّا الله" کہنا کافی نہ ہوگا۔ حکم بن عتیبہ کہا کرتے تھے کہ اگر تکبیر کی جگہ اللہ کا ذکر کیا تو بھی کافی ہے ۔ ابن منذر (۱) کہتے ہیں : جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے تو فقہاء کا اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں کہ جو شخص قراءت جانتا ہو اور اس کے باوجود نہ کرے اور اس کی بجائے "لا إله إلّا الله" اور "اللہ اکبر" کہہ دے تو اس کی نماز نہیں ہوگی ۔ اب جن لوگوں کی یہ رائے ہو ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ تکبیر کی جگہ کسی اور ذکر کے جواز کے قائل نہ ہوں جیسا کہ وہ قراءت کی جگہ کسی اور چیز کے جواز کے قائل نہیں ۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تکبیر فارسی میں کہنا بھی جائز ہے اگر چہ نمازی اچھی طرح عربی جانتا ہو، ابن المنذر کہتے ہیں : ایسا کرنا جائز نہیں کیوں کہ یہ امت مسلمہ کے تمام طبقات کی رائے کے خلاف ہے اور اس کے بھی خلاف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سکھایا نیز ہمارے علم میں ایسا کوئی شخص بھی نہیں جس نے اس رائے میں امام موصوف رحمہ اللہ سے اتفاق کیا ہو واللہ اُعلم ۔

اکیسویں بحث: نماز کی نیت اور اس کا حکم

تکبیرِ تحریمہ کہتے وقت نماز کی نیت کے وجوب پر پوری امت کا اتفاق ہے سوائے چند مالکی علماءِ کے جن کی رائے پر بحث آیت طہارت کے ضمن میں اِن شاء اللہ آئے گی۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ عمل کا حکم دینے والی ذات کے مطلوبہ طریقہ کے مطابق اس عمل کو بجالاکر اس ذات کا قرب حاصل کرنے کا ارادہ کرے ۔ ابن العربیؒ کہتے ہیں : نیت کے بارے میں اصل حکم یہ ہے کہ جس عمل کی نیت مقصود ہے وہ اور نیت بیک وقت ساتھ ساتھ ہوں یا نیت اس عمل سے پہلے ہو مگر اس کے ساتھ ہی عمل شروع ہوجائے ۔ اگر کسی نے نیت کی، پھر کسی اور طرف متوجہ ہوگیا اور اس کے بعد عمل شروع کیا تو اس

۱۔ ابوبکر محمد بن المنذر نیشاپوری (م ۳۱۹ھ) مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے علماء اور حرم مکی کے مشائخ میں سے تھے ان کی تصنیف "اختلاف العلماء" بہت مشہور ہے ۔ الكنى والألقاب ۶: ۱۸۴

نیت کا اعتبار نہ ہوگا جیسا کہ اس نیت کا کوئی اعتبار نہیں جو عمل شروع کرنے کے بعد کی گئی ہو۔البتہ روزے کی نیت اس کی ابتداء سے پہلے کرنے کی اجازت دی گئی ہے کیوں کہ روزے سے بالکل متصل پہلے نیت کی شرط لگانے میں بڑی مشقت ہے۔

ابن العربیؒ کہتے ہیں: ابوالحسن القرویؒ نے عسقلان کی سرحد کے قریب ہمیں فرمایا: میں نے امام الحرمین کو یہ فرماتے سنا کہ نمازی کو چاہیے کہ نماز شروع کرتے وقت نیت کو دماغ میں حاضر کرے اور وہ اس طرح کہ خالق کائنات کا خیال دل میں لائے ، اس کائنات کے بارے میں سوچے کہ یہ اسی کی بنائی ہوئی ہے اور زبان نبوت سے جتنی پیش گوئیاں ہوئی ہیں وہ سچ ثابت ہونے والی ہیں ، ان سب امور میں غور کرتے کرتے اس کا خیال نماز کی نیت کی طرف منتقل ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے لیے زیادہ وقت کی ضرورت نہیں بلکہ لحہ بھر میں یہ کام ہوسکتا ہے۔ جملے سکھانے میں تو زیادہ وقت لگتا ہے مگر انہیں صرف ذہن میں لانا تو ایک لحظہ کا کام ہے۔ نیت کی تکمیل یہ ہے کہ پوری نماز کے دوران ذہن میں حاضر رہے مگر چوں کہ ایسا کرنا تقریبا ناممکن ہے اس لیے نماز کے دوران کسی لحہ اگر توجہ نہ رہے تو اس کی معافی دی گئی ہے۔ میں نے مسجد اقصیٰ میں اپنے شیخ ابوبکر الفہری کو یہ فرماتے سنا کہ میں نے محمد بن سحنون سے یہ بات سنی ، وہ کہتے ہیں میں اپنے والد گرامی سحنون رحمہ اللہ کو بعض اوقات نماز پڑھنے کے بعد دوبارہ اسے لوٹاتے دیکھا تو اس کی وجہ پوچھی ، انہوں نے فرمایا: نماز کے دوران کچھ وقت کے لیے میری توجہ نماز میں نہ رہی تھی اس لیے اسے دوبارہ پڑھا۔

دیگر مباحث نماز

میں کہتا ہوں: یہاں تک نماز کے کئی احکام کا بیان تھا، اس کے بقیہ احکام ان شاء اللہ اس کتاب میں موقع بموقع آتے رہیں گے۔ رکوع ، جماعت کی نماز ، قبلہ ، نماز کو ابتدائی اوقات میں ادا کرنے اور نماز خوف کے کچھ احکام کا بیان تو اسی سورت میں آئے گا ، نماز قصر اور نماز خوف کا بقیہ بیان سورۂ نساء میں ، اوقات نماز کا بیان سورۂ ہود ، بنی اسرائیل اور روم میں ، قیام اللیل سورۂ مزمل میں، سجدہ تلاوت سورۂ اعراف میں اور سجدہ شکر سورۂ ص میں ذکر ہوں گے اور ہر ایک کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر ان شاء اللہ بیان ہوگی۔

بائیسویں بحث : رزق کا مفہوم اور انفاق کا حکم

ارشاد باری تعالیٰ : ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ (اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں) میں ﴿رَزَقْنٰهُمْ﴾ کا معنی ''أَعْطَيْنَاهُمْ'' ہے (یعنی جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے)۔

رزق کے مفہوم میں اہلسنت اور معتزلہ کا اختلاف

اہل سنت کے نزدیک رزق اس چیز کا نام ہے جس سے نفع اٹھایا جاسکے خواہ وہ چیز حلال ہو یا حرام۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ حرام کو رزق نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اس پر ملکیت کا دعوی جائز نہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں کو رزقِ حلال ہی دیتے ہیں حرام نہیں دیتے اور کسی چیز کے رزق ہونے کا مفہوم اس وقت تک ادا نہیں ہوتا جب تک اس میں ملکیت کا پہلو شامل نہ ہو۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی بچہ چوروں کے ساتھ پلتا بڑھتا رہا اور اس کا کھانا پینا بھی صرف چوری کے مال سے رہا یہاں تک کہ وہ بڑا ہو کر طاقت ور بن گیا اور خود چوری شروع کردی، پھر موت تک اس کا یہی کام رہا اور یہی کھاتا پیتا رہا تو یہ ایسا شخص ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے کوئی رزق نہیں دیا کیوں کہ وہ چوری کے مال کا حقیقی مالک نہ تھا۔ اس طرح اس نے اپنی پوری زندگی اللہ کے رزق میں سے کچھ بھی نہ کھایا۔

معتزلہ کی یہ رائے درست نہیں ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ اگر رزق بمعنی ملکیت ہی ہو تو اس کا یقینی مطلب یہ ہوا کہ نہ بچوں کو رزق ملتا ہے، نہ جنگل میں چرنے والے جانوروں کو اور نہ پالتو جانوروں کے بچوں کو کیوں کہ ان کی ماؤں کا دودھ تو ان کے مالکوں کی ملکیت ہوتا ہے ان کی اپنی ملکیت نہیں ہوتا۔ چوں کہ اس بات پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ بنی آدم کے بچے، جانوروں کے دودھ پیتے بچے اور خود چرنے والے جانور سب کو رزق ملتا ہے اور اللہ تعالیٰ ان میں ملکیت کی صالحیت نہ ہونے کے باوجود انہیں رزق دیتے ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ رزق "غذاء" کا نام ہے۔ اسی طرح پوری امت کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ غلاموں اور باندیوں کو مالک نہ ہونے کے باوجود رزق دیا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ رزق کا مفہوم وہی ہے جو ہم نے کہا نہ کہ وہ جو معتزلہ کہتے ہیں۔ قرآن بھی اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی رازق نہیں چناں چہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ﴾ [فاطر ۳۵: ۳] (کیا اللہ کے بغیر بھی کوئی خالق ہے جو زمین و آسمان میں تمہیں رزق دے؟) نیز ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ﴾ [الذاریات ۵۱: ۵۸] (اللہ تعالیٰ ہی تو رزق دینے والا، طاقتور اور مضبوط ہے) اسی طرح ارشاد گرامی ہے: ﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا﴾ [هود ۱۱: ۶] (جو چیز بھی زمین پر چلنے پھرنے والی ہے اس کا رزق اللہ کے ذمہ ہے)۔

مخلوق کا رازق ہونا

یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ رازق حقیقی ہیں البتہ مجازی طور پر انسانوں پر بھی اس لفظ کا اطلاق ہوسکتا ہے کیوں کہ انسانوں کی ملکیت ہمیشہ رہنے والی نہیں بلکہ ان سے واپس لے لی جاتی ہے جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ مجازی طور پر رازق کہلانے والا یہ انسان بھی حقیقتاً خود مرزوق ہے

اور انہی جانوروں کی طرح ہے جن کی ملکیت ہوتی ہی نہیں ، ہاں جس چیز کے استعمال کی اجازت مل جائے وہ اس کے لیے حلال ہوتی ہے اور جس کے استعمال کی اجازت نہ ہو اسے حرام کہا جاتا ہے۔ یہ حرام اور حلال دونوں رزق ہی شمار ہوتے ہیں ۔ بعض فضلاء نے ارشاد باری تعالیٰ : ﴿كُلُوا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ۚ بَلْدَةٌ طَيِّبَةٌ وَّ رَبٌّ غَفُوْرٌ﴾[سبا ۳۴ : ۱۵] (اپنے پروردگار کا رزق کھاؤ اور اس کا شکر ادا کرو، تمہارے رہنے کو یہاں پاکیزہ شہر ہے اور وہاں بخشنے کو رب غفور ہے) کی تفسیر میں کہا ہے کہ یہاں رزق کے ساتھ مغفرت کا ذکر اس لیے کیا کہ بعض اوقات بندہ کے رزق میں حرام بھی شامل ہوتا ہے ۔

تیئیسویں بحث: ''رزق '' کی لغوی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ ﴾(اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا ہے) میں لفظ ''رِزْقٌ'' مصدر ہے ''رَزَقَ یَرْزُقُ رَزْقاً وَرِزْقاً'' سے اس طرح راء کے فتحہ کے ساتھ مصدر ہے اور راء کے کسرہ کے ساتھ اسم ہے اور اس کی جمع ''ارزاق'' ہے۔ ''رزق'' کا معنی عطاء کرنا ہے ۔ ''رازقية'' کتان (السی) کے بنے ہوئے سفید کپڑے کو کہتے ہیں ، نیز کہا جاتا ہے : ''ارتزق الجند'' (لشکر نے اپنا رسد وصول کیا) ۔ ''رِزْقَة'' ایک دفعہ ملنے والے عطیہ کو کہتے ہیں ۔ یہ علماءِ لغت کا قول ہے ۔ ابن سکیت کہتے ہیں : ازدشنوء ہ کے لہجہ میں ''رزق'' کا معنی شکر ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے : ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾[الواقعة ۵۶: ۸۲] (اور تم شکر یوں ادا کرتے ہو کہ اسے جھٹلاتے ہو) مطلب یہ کہ تم لوگوں نے شکر کی بجائے جھٹلانے کا رویہ اپنایا ہوا ہے۔ اِسی طرح کہا جاتا ہے : ''رزقنی'' یعنی ''شکرنی'' اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔

چوبیسویں بحث: انفاق کا مفہوم

ارشاد باری تعالیٰ : ﴿يُنْفِقُوْنَ﴾ کا معنی ہے ''يُخْرِجُونَ'' یعنی نکالنا ہے اور ''إِنْفَاق'' کا معنی اپنے ہاتھ سے مال نکالنا ہے، اسی سے کہا جاتا ہے : ''نَفَقَ البَيعُ'' (بیع رائج ہوگئی)یعنی فروخت شدہ چیز فروخت کنندہ کے ہاتھ سے نکل کر خریدار کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ''نَفَقَتِ الدابَّةُ '' یعنی جانور کی روح نکل گئی ۔ اسی سے لفظ ''نافِقَاءُ'' ہے جو چوہے کے اس بل کو کہتے ہیں جس میں سے وہ اس وقت نکلتا ہے جب دوسری طرف سے اس کو گھیرا ڈال لیا جائے ، اسی سے لفظ ''منافق'' ہے کیوں کہ وہ بھی ایمان سے نکل جاتا ہے یا ایمان اس کے دل سے نکل جاتا ہے اور ''نیفقُ السراویل'' کا معنی سب کو معلوم ہے جو کہ شلوار کے پائنچے کو کہتے ہیں کیوں کہ اس سے پاؤں نکالا جاتا ہے [1]۔

۱۔ اردو میں لفظ ''نیفہ'' بمعنی ازار بند یا نالا ڈالنے کے لیے بنائی گئی لمبی پٹی بھی اصل میں ''نیفق'' ہی ہے۔

سفر میں کھانا وغیرہ ختم ہوجائے تو کہا جاتا ہے: ''نَفِقَ الزاد'' کیوں کہ مسافر اس کو خرچ کر کے ختم کر دیتا ہے، اسی طرح جب کسی جماعت کا توشہ ختم ہوجائے تو کہا جاتا ہے: ''أنفَقَ القومُ'' یعنی ان کا کھانا وغیرہ ختم ہوگیا۔ اسی سے ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِذاً لَّأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنفَاقِ﴾[الإسراء ١٧: ١٠٠] (تو تم خرچ ہوجانے کے ڈر سے ان کو روک کر رکھتے)۔

پچیسویں بحث: نفقہ کا مفہوم

بعض علماء کے نزدیک اس آیت کریمہ میں ''نفقة'' سے مراد'' فرض زکاۃ'' ہے کیوں کہ یہ نماز کے ساتھ متصل مذکور ہے، یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد وہ اخراجات ہیں جو کوئی شخص اپنے اہل خانہ کے لیے کرتا ہے کیوں کہ یہی افضل ترین اخراجات ہیں، یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے۔ امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۱۷] دينارٌ أنفقتَه في سبيل اللّٰه و دينار أنفقته في رَقَبة ودينار تَصدّقت به على المسكين و دينار أنفقته على أهلك۔ أعظمها أجراً الذي أنفقته على أهلك۔

ایک دینار وہ ہے جو تم اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو، ایک وہ ہے جو کسی کی جان چھڑانے کے لیے دیتے ہو، ایک وہ ہے جو کسی مسکین کو صدقہ کے طور پر دیتے ہو اور ایک وہ ہے جو اپنے اہل خانہ پر خرچ کرتے ہو۔ ان سب میں سے زیادہ اجر والی رقم وہ ہے جو تم نے اپنے اہل خانہ کی ضروریات کے لیے خرچ کی۔

اور حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ[1] سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۳۱۷] صحیح مسلم: كتاب الزكاة، باب فضل النفقة على العيال والمملوك وإثم من......۲:۶۹۲، مسند امام احمدؒ: مسند أبي هريرة رضی اللہ عنہ ۳:۲۴۳، سنن بیہقی: كتاب النفقات، باب فضل النفقة على الأهل ۱۱:۴۶۶، شعب الإيمان، الستون من شعب الإيمان ......۶:۴۱۴، بخاری: الأدب المفرد، باب نفقة الرجل على أهله ۱:۴۰۷

۱۔ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام اور جلیل القدر صحابی ہیں کافی عرصہ تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے، آپ کی وفات کے بعد شام منتقل ہوگئے اور سن ۵۴ ھ میں حمص میں وفات پائی۔ تقریب التهذيب ۱:۱۳۴

[۳۱۸] أفضلُ دينارٍ ينفقه الرجل دينارٌ ينفقه على عياله و دينار ينفقه الرجل على دابته في سبيل اللّٰه عزّوجلّ و دينارٌ ينفقه على أصحابه في سبيل اللّٰه۔

سب سے بہتر رقم وہ ہے جسے کوئی شخص اپنے اہل خانہ کی ضروریات پر خرچ کرتا ہے یا اللہ کے راستے میں اپنی سواری پر خرچ کرتا ہے یا اللہ کے راستے میں اپنے ساتھیوں پر خرچ کرتا ہے۔ ابوقلابہ کہتے ہیں: یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے سے فرمائی ہے۔ پھر انہوں نے کہا: ''وای رجل أعظم أجرامن رجل ينفق على عيال صغار يعفهم أو ينفعهم الله به ويغنيهم '' (اس شخص سے زیادہ اجر کا مستحق کون ہوسکتا ہے جو اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے اخراجات کا صحیح انتظام کرکے انہیں سوال کی ذلت سے بچائے یا اللہ تعالیٰ اس کو ان کے نفع کا ذریعہ بنا دے یا انہیں اس کی وجہ سے غنی کردے)(۱)۔

ایک قول یہ ہے کہ اس آیت میں ''نفقة'' سے مراد نفلی صدقات ہیں۔ یہ ضحاک رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اس سے مرادفرض زکاۃ ہوتی تو اس کا ذکر اپنے مخصوص لفظ ''زکاۃ'' کے ساتھ ہوتا۔ جہاں وہ مخصوص لفظ ذکر نہ کیا جائے وہاں اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں: فرض زکاۃ کا بھی اور نفلی صدقہ کا بھی اور جب لفظ ''انفاق '' استعمال ہوتو اس سے مراد نفلی صدقہ ہی ہوتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ ''نفقة'' ایسے صدقہ کوکہا جاتا تھا جوفرض صدقات کا حکم نازل ہونے اورسورۂ براءت کی آیات میں پرانے احکام کے منسوخ ہونے سے پہلے لوگ ثواب کے لیے اپنی اپنی وسعت کے مطابق دیا کرتے تھے(۲)۔

---

[۳۱۸] صحیح مسلم: كتاب الزكاة،باب فضل النفقة على العيال والمملوك وإثم من...... ۲: ۶۹۱،سنن ابن ماجہ: كتاب الجهاد، باب فضل النفقة في سبيل الله۲: ۹۲۲،مسند امام احمدؒ: ومن حديث ثوبان رضى الله عنه ۶: ۶۷۷،سنن بیہقی:كتاب الزكاة ، باب الاختيار في صدقة التطوع ۶: ۱۲۷،باب فضل النفقة على الأهل ۱: ۴۷۸،شعب الإيمان ، الثاني والعشرون من شعب الإيمان ، فصل في الإختيار في صدقة التطوع ۳: ۲۳۷،بخاری: الأدب المفرد، باب نفقة الرجل على أهله۱: ۲۰۶،صحیح ابن حبان : كتاب الرضاع ، باب النفقة ۱۰: ۵۳، كتاب السير ، باب فضل النفقة في سبيل الله ۱۰: ۵۰۳،جامع ترمذی :كتاب البر والحسنة ، باب ماجاء في النفقة في الأهل ۴: ۳۴۴

۱۔ ابوقلابہ عبد اللہ بن زید بن عمرو یا عامرجرمی ، بصری (م۱۰۴ھ یا ۱۰۷ھ) رحمہ اللہ جلیل القدر تابعین اور ثقہ راویوں میں سے ہیں ۔ ان کی وفات شام میں ہوئی۔تقریب التهذيب ۱: ۳۰۴، الكاشف۲: ۸۸۔ ان کا یہ قول مندرجہ بالاحدیث کے ساتھ یہ حدیث کے ساتھ ائمہ حدیث امام مسلم ،جامع ترمذی ، صحیح ابن حبان ،بیہقی اور امام مسندامام احمدؒ وغیرہم سب نے نقل کیا ہے۔

۲۔ ان آیات سے مراد: ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينَ ...اور وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ ......﴾ ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد تو صدقات واجبہ ہی ہیں مگر یہ وہ صدقات ہیں جو زکاۃ کے علاوہ مختلف وجوہات کی بنا پر لازم ہوجاتے ہیں۔ یہ صدقات واجبہ اس لیے ہیں کہ ان کا ذکر نماز کے ساتھ ہوا ہے اوران سے فرض زکاۃ اس لیے مراد نہیں کہ یہاں اس کا مخصوص لفظ استعمال نہیں کیا گیا، لہذا یہاں انفاق سے مراد زکاۃ کے علاوہ دیگر مالی واجبات ہی ہوں گے۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہاں لفظ''انفاق'' عام ہے اور اس میں ہر طرح کے صدقات شامل ہیں کیوں کہ یہاں ان لوگوں کی تعریف کی گئی ہے جو اللہ کے دیئے ہوئے رزق میں سے خرچ کرتے ہیں اورتعریف اسی خرچ کی کی جاسکتی ہے جو رزق حلال میں سے کسی حیثیت سے بھی کیا گیا ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو شریعت کی طرف سے فرض کردہ زکاۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ ایسے دیگر مالی واجبات بھی ادا کرتے ہیں جو بعض حالات میں ان کے ذمہ ہوجاتے ہیں اوراس کے علاوہ نفلی صدقات بھی دیتے ہیں ۔ ایک قول یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں''ایمان بالغیب'' سے مراد دل کا حصہ،''اقامت صلاۃ'' سے مراد بدن کا حصہ اور﴿وَمِمَّارَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ﴾ سے مراد مال کا حصہ ہے اور یہ بات بالکل واضح ہے۔بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ارشادِ باری تعالیٰ:﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُوْنَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ''وَمِماَّ عَلَّمْنَاهُمْ يُعَلِّمُونَ'' یعنی جو علم ہم نے انہیں سکھایا ہے اس میں سے وہ دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں۔یہ قول ابونصر عبد الرحیم بن عبدالکریم القشیریؒ نے ذکر کیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾﴾

اورجو ایمان لاتے ہیں اس کتاب پر جو آپ پر نازل ہوئی اور ان کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے نازل ہوئیں اور وہ آخرت کا بھی یقین رکھتے ہیں۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے جیسے حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ[1] ۔ یہ آیت انہی حضرات کے بارے میں نازل ہوئی جب کہ اس سے پہلی آیت عرب مومنین کے بارے میں اتری۔بعض کا خیال ہے کہ دونوں آیات بلاتخصیص مومنین کے بارے میں نازل ہوئیں۔

۱۔ جلیل القدر صحابی ابویوسف عبداللہ بن سلام بن الحارث رضی اللہ عنہ حضرت یوسف علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ابتداء میں یہودیت کے پیروکار رہے۔جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور دیکھنے کے بعد سلام کو عام کرنے اور کھانا کھلانے کا وعظ سنا تو بہت متاثر ہوئے اورتہہ دل سے مسلمان ہوگئے۔ ۱۱لإصابۃ۲: ۳۲۰، ۳۲۱

''الَّذِيْنَ'' کا اعراب

اس صورت میں ﴿الَّذِيْنَ﴾ پہلی آیت پر عطف کی وجہ سے مجرور ہوگا مگر اس کو نیا جملہ قرار دے کر مرفوع کہنا بھی درست ہے جس سے تقدیرِ عبارت ''هُمُ الَّذِيْنَ'' ہوگی۔ بعض علماء نے اس کے دو اعراب بیان کئے ہیں۔ پہلا یہ کہ ﴿الَّذِيْنَ﴾ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ﴿أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى﴾ (یہی لوگ ہیں جو ہدایت پر ہیں) اس کی خبر ہے اور دوسرا اعراب یہ ہوسکتا ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ﴾ پہلے جملے پر عطف کی وجہ سے مجرور ہے۔

کتب سابقہ کی تعداد اور ان پر ایمان کی نوعیت

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ﴾ سے مراد قرآن مجید اور ﴿وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ سے مراد سابقہ آسمانی کتابیں ہیں۔ یہ یہود ونصاریٰ کے رویہ کے برعکس ہے جن کا حال قرآن نے یوں بیان کیا ہے: ﴿وَإِذَا قِيْلَ لَهُمْ آمِنُوا بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوا نُؤْمِنُ بِمَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا﴾[البقرہ ۲: ۹۱] (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کتاب اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے اس کو مانو تو کہتے ہیں: ہم تو اس کتاب کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل ہو چکی ہے)۔ کہا جاتا ہے کہ جب ارشاد باری تعالیٰ: ﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ نازل ہوا تو یہود ونصاریٰ کہنے لگے ہم بھی غیب پر ایمان لائے ہیں، جب یہ ارشاد فرمایا گیا: ﴿وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ تو کہنے لگے کہ ہم بھی نماز قائم کرتے ہیں، اور جب فرمایا گیا: ﴿وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ﴾ تو کہنے لگے کہ ہمیں جو رزق دیا گیا ہے ہم بھی اس میں سے خرچ کرتے ہیں اور صدقہ بھی دیتے ہیں۔ پھر جب یہ ارشاد ہوا کہ: ﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَآ أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾ تو اس سے بدک گئے۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۳۱۹] مائة كتاب وأربعة كتب۔ أنزل الله على شِيث خمسين صحيفة و على أخنوخ

---

[۳۱۹] صحیح ابن حبان: کتاب البر والإحسان، باب ماجاء في الطاعات وثوابها ۲: ۷۶، کتاب الثقات: المقدمة ۲: ۹۹، السيرة النبوية وأخبار الخلفاء، السنة العاشرة من الهجرة، ابن کثیر: قصص الأنبياء، قصة ابني آدم هابيل وقابيل، ذكر وفاة آدم ووصيته إلى ابنه شيث عليه السلام، البداية والنهاية: ذكر وفاة آدم ووصيته إلى ابنه شيث عليه السلام، تاریخ طبري: ذكر ولادة حواء شيثا، وذكر وفاة إبراهيم عليه السلام، حلية الأولياء ۱: ۱۶۶-۱۶۸۔ شیخ شعیب ارناؤط کہتے ہیں: اس کے راوی ابراہیم بن ہشام غسانی ہے کو ابوحاتم اور ابو زرعہ نے کذاب جب کہ حافظ ذہبیؒ نے متروک کہا ہے۔ ابن عدیؒ نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ یحییٰ بن سعید القرشی نے اس کی متابعت کی ہے خود اسے غیر معروف کہا ہے۔ ابن حبانؒ کہتے ہیں: یحییٰ القرشی روایات کو الٹ پلٹ کر کے بیان کرتے تھے۔

ثلاثین صحیفة و علی إبراهیم عشر صحائف وأنزل علی موسی قبل التوراة عشر صحائف وأنزل التوراة والإنجیل والزبور والفرقان۔

اللہ تعالیٰ نے کل ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں ۔جن میں سے حضرت شیث علیہ السلام پر پچاس صحیفے ،حضرت اخنوخ علیہ السلام[1] پر تیس صحیفے، ابراہیم علیہ السلام پر دس صحیفے اور موسیٰ علیہ السلام پر تورات سے پہلے دس صحیفے نازل فرمائے۔ ان کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے تورات ، انجیل ، زبوراور فرقان نازل فرمائے ۔اس حدیث کو محمد بن حسین آجری[2] اور ابوحاتم البُستی نے نقل کیا ہے۔

تمام کتب پر بیک وقت ایمان سے مراد

یہاں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان سب کتابوں پر بیک وقت کیسے ایمان لایاجاسکتا ہے حالاں کہ ان کے احکام تو ایک دوسری سے مختلف ہیں؟ اس اشکال کے دوجواب ہیں:

پہلا یہ کہ ان پر بیک وقت ایمان لانے سے مراد یہ ماننا ہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہیں۔ یہ ان علماءِ کا قول ہے جو سابقہ شریعتوں کے احکام کی پابندی کے قائل نہیں ہیں۔ دوسراجواب یہ ہے کہ ان میں سے ایسے احکام پر ایمان لانا مراد ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں منسوخ نہیں ہوئے ، یہ ان علماء کرام کا قول ہے جو شرائع سابقہ کی پابندی کو ضروری قرار دیتے ہیں ۔ اس کی تفصیل اِن شاء اللہ آئندہ آئے گی۔

۱۔ اخنوخ : حضرت ادریس علیہ السلام کا لقب ہے جیسا کہ امام ابن حبانؒ نے اپنی صحیح میں مندرجہ بالاروایت کے ضمن میں نقل کیاہے۔ بڑے عابد و زاہد پیغمبر تھے ، کبھی اللہ کا ذکران کی زبان سے منقطع نہیں ہوتا تھا ۔ کہا جاتاہے کہ آپ درزی کا پیشہ کرتے تھے۔اگر کام کے دوران کبھی ذکر کرنا بھول جاتے تواس وقت سیا ہوا تمام کپڑا پھاڑ دیتے تھے ۔انسانوں میں سے حضرت ادریس علیہ السلام نے ہی سب سے پہلے قلم سے لکھااورکتابیں تیار کیں۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے نجوم اور حساب پر تحقیق کی ، انہی پر سب سے پہلے جبریل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے کپڑاسیااور سلاہوا پہنا۔صحیح ابن حبان : کتاب البر والإحسان ، باب ماجاء فی الطاعات وثوابها ۲:۷۶،امام حاکم نے محمد بن اسحاق بن یسار سے ان کا نسب یوں نقل کیا ہے :أخنوخ بن یزید بن أهلابیل بن قینان بن ناشر بن شیث بن آدم علیه السلام۔المستدرک: کتاب تواریخ المتقدمین من الأنبیاء والمرسلین، باب ذکر إدریس النبی صلی الله علیه وسلم ۲:۵۹۸، سنن بیہقی : کتاب قسم الفیئ والغنیمة، باب إعطاء الفیئ علی الدیوان ومن یقع به البدایة ۱۰:۶۲میں ان کا نام أخنوخ بن یردبن مهلائیل بن قینان بن قوش بن شیث بن آدم علیه السلام اور شعب الإیمان :الرابع عشر من شعب الإیمان ......فصل فی شرف أصله وطهارة مولده صلی الله علیه وسلم ۲:۱۳۴میں أخنوخ بن یرد بن مهلاهیل بن قینان بن أنوش بن شیث بن آدم علیه السلام مذکور ہے ۔

۲۔ ابوبکر محمد بن حسین الآجری (م ۳۶۰ھ) محدث اور مذہب شافعی کے مقتدر فقیہ تھے ۔ بغداد کی نواحی بستی، آجر میں پیدا ہوئے اورعرصہ تک بغداد میں درس حدیث دیتے رہے پھروفات تک مکہ مکرمہ میں رہے ۔ان کی بہت سی تصانیف ہیں۔ أعلام زرکلی ۶:۹۷

آخرت کا یقین

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ﴾ (اور وہ آخرت کا یقین رکھتے ہیں) ۔ مطلب یہ ہے کہ مرکر جی اٹھنے اور اور اللہ کے دربار میں پیش ہونے کا پختہ علم رکھتے ہیں ۔ یقین ایسے علم کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی شک نہ ہو۔ اسی سے "يَقِنْتُ الأمرَ" (قاف کی زیر کے ساتھ) "يَقْنًا"، "أيقنتُ"، "استيقنتُ" اور "تيقّنتُ" سب ایک ہی معنی میں آتے ہیں نیز کہا جاتا ہے: "وَأَنَاعلی يقينٍ منه" (مجھے اس بات کا یقین ہے)۔ اس سے اسم فاعل "مُوقِنٌ" میں واؤ اس لیے آتی ہے کہ اس کے ماقبل پر ضمہ ہے، اگر اسی اسم فاعل کی تصغیر بنائی جائے تو اس کی یاء واپس لوٹ آئے گی اور "مُيَيقِنٌ" کہا جائے گا کیوں کہ تصغیر اور جمع بنانے سے صیغے اپنے اصل مادہ کی طرف لوٹ آتے ہیں ۔ بعض اوقات لفظ "یقین" بول کر اس سے مراد "ظن" لیا جاتا ہے ۔ اس کی مثال ہمارے علماء کے ہاں یمین لغو کی تعریف میں استعمال ہونے والے الفاظ ہیں جس کی تعریف یوں کی گئی ہے: "هو أن يحلف بالله على أمر يوقنه ثم يَتَبيَّن أنه خلاف ذلک فلاشيئ عليه" (یمین لغو یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے گمان کی بناء پر کسی چیز کے بارے میں اللہ کی قسم کھالے مگر بعد میں معلوم ہو کہ وہ معاملہ یوں تو نہ تھا تو اس صورت میں قسم کھانے والے پر کوئی سزا نہیں ہوگی)۔ شاعر کہتا ہے:

تَحَسَّبَ هَوَّاسٌ وأيْقَنَ أنَّنِي بها مُفْتَدٍ مِن واحِدٍ لا أُغَامِرُهْ (1)

یہاں "تَحَسَّبَ" کا معنی "تَشَمَّمَ" یعنی اس نے سونگھا اور "أَيقَنَ" کا معنی "يَظُنُّ" یہ گمان کرتے ہوئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیر نے میری اونٹنی کو سونگھا، اس کا خیال تھا کہ میں اونٹنی اس کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچاؤں گا اور اس سے لڑائی کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالوں گا ۔ "ظن" بمعنی "یقین" قرآن مجید میں بھی آیا ہے اور عربی اشعار میں تو اس کا ستعمال بہت زیادہ ہے۔ جس کی تفصیل اِن شاء اللہ آئندہ آئے گی ۔

"الآخرة" "تأخر" سے ماخوذ ہے جس کا معنی پیچھے رہ جانا ہے۔ اسے آخرت اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ ہم سے بعد میں آئے گی یا اس لیے کہ ہم اس سے پیچھے ہوں گے، یہ اسی طرح ہے جیسے "دُنيا" "دُنُوٌّ" سے ماخوذ ہے، جس کی تفصیل آئندہ اِن شاء اللہ آئے گی۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٥﴾﴾

بس یہی لوگ اس صحیح راہ پر ہیں جو ان کو اپنے رب کی جانب سے ملی ہے اور یہی لوگ ہیں صحیح فلاح پانے والے۔

---

(1) یہ شعر أبو سدره الأسدي کا ہے ۔ ابن منظور نے اسے ہجیمی کہا ہے ۔ لسان العرب: (یقن)

''أُولٰٓئِکَ'' کی لغوی تحقیق

نحاسؒ کہتے ہیں: اہل نجد اس کو ''أُلاکَ'' کہتے ہیں اور بعض ''أُلالِکَ'' بھی کہتے ہیں ۔ اس میں ''کاف'' ضمیر خطاب ہے ۔ کسائی کہتے ہیں اگر اسے ''أُلٰئِکَ'' کہا جائے تو اس کا واحد 'ذلکَ' ہوگا اور اگر ''أُلاکَ'' کہا جائے تو مفرد 'ذَاکَ'' ہوگا البتہ معنی کے لحاظ سے ''أُلٰئکَ'' اور ''أُلالِکَ'' دونوں ایک ہی ہیں۔ اس پر ابن سکیت نے یہ شعر پیش کیا ہے:

أَلَا لِكَ قومي لم يكونوا أُشَابَةً و هل يَعِظُ الضِّلِّيل إلَّا أُلالِكَا

یہ میری قوم کے لوگ ہیں ان کا نسب خلط ملط نہیں ہے ، کیا وہ شخص جس کو خود کچھ معلوم نہیں انہیں نصیحت کرنے چلا ہے۔

کبھی لفظ ''أُلٰئِکَ'' غیر ذوی العقول کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

ذُمّ المنازل بعد منزلة اللِّوَى والعيشَ بعد أولئك الأيام(۱)

مقام ''لِوَی'' والے گھر کے بعد سب گھر برے اور ان دنوں والی زندگی کے بعد زندگی بے کار ہے۔

یہی معنی اس ارشادِ باری تعالیٰ کا بھی ہے: ﴿إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا﴾ [الإسراء ۱۷: ۳٦] (بے شک کان ، آنکھ اور دل ، ان کی پوچھ ہر شخص سے ہوگی)

قدریہ کا رد

ہمارے علماءِ کرام فرماتے ہیں: ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ میں فرقہ قدریہ کے اس نظریہ کا رد ہے کہ لوگ اپنے ایمان اور اپنی ہدایت کے خالق خود ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے بہت بلند ہیں جو یہ کہتے ہیں ۔ اگر ان کی بات صحیح ہوتی تو اللہ تعالیٰ ﴿مِنْ رَّبِّهِمْ﴾ (یعنی ہدایت کی نسبت رب کی طرف کرنے) کی بجائے ''مِنْ أَنفُسِهِمْ'' فرماتے (یعنی ان کی اپنی طرف سے)۔ اس مسئلہ پر اور لفظ ''هداية'' پر بحث پہلے گزر چکی ہے جسے دہرانے کی ضرورت نہیں۔

۱۔ یہ شعر جریر کا ہے جیسا کہ لسان العرب میں ہے۔

''ھُمْ'' کا اعراب

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ میں ''ھُمْ'' کی ترکیب میں درج ذیل تین صورتیں ہو سکتی ہیں: پہلی یہ کہ ''ھُمْ'' مبتدا ثانی ہے اور ﴿الْمُفْلِحُونَ﴾ اس کی خبر ہے [1]۔ دوسری ''ھُمْ'' مبتداء ثانی ہے او راس کی خبر بھی مبتدا اول والی [یعنی ﴿عَلَىٰ هُدًى مِنْ رَبِّهِمْ﴾] ہے۔ اورتیسری یہ کہ ﴿ھُمْ﴾ زائدہ ہے اور ﴿الْمُفْلِحُونَ﴾ ﴿أُولَٰئِكَ﴾ کی خبر ہے۔ ایسے زوائد کو علماءِ بصرہ ''فاصلة'' اور علماءِ کوفہ ''عِماد'' کہتے ہیں۔

''فَلاح'' کی لغوی تحقیق

لفظ ''فلح'' کا اصل معنی لغت عرب میں ''پھاڑنا'' اور ''کاٹنا'' ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

إنَّ الحديدَ بِالحديدِ يُفْلَح [2] (لوہے کو لوہے کے ساتھ ہی کاٹا جاتا ہے)۔

زمینوں میں ہل چلانے کو بھی اسی لیے ''فلاحة الأرضين'' کہا جاتا ہے کیوں کہ اسے ہل کے ذریعے پھاڑا جاتا ہے۔ جس شخص کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا ہو اسے ''أفلح'' کہتے ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: ''هو بَيِّنُ الفَلَحَةِ'' یعنی اس کا ہونٹ کٹا ہوا صاف نظر آتا ہے۔ یہاں لفظ ''مُفْلِحٌ'' کے استعمال سے بھی گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ جن لوگوں کے بارے میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ مشکلات کو کاٹ کر نکل آئے ہیں یہاں تک کہ اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ کبھی کبھی یہی لفظ کامیاب ہونے اور باقی رہنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی اس کا اصل لغوی معنی ہی ہے۔ اس کی مثال کسی مرد کا اپنی عورت کو یہ کہنا ہے: ''استفلحي بأمرک'' یعنی ''فُوزِي بأمرک'' (تم اپنے معاملے میں کامیابی حاصل کرو) اور شاعر کہتا ہے:

لو كان حَيٌّ مدرِكَ الفَلَاحِ أدرَكَه مُلاعِبُ الرماحِ

اگر کسی زندہ کے لیے بقاء دوام کا حصول ممکن ہوتا تو نیزوں سے کھیلنے والا اسے حاصل کرلیتا۔

اضبط بن قریع السعدی نے زمانہ جاہلیت میں کہا:

لِكُلِّ هَمٍّ مِنَ الهموم سعَةْ والمُسْيُ والصُّبْحُ لا فَلَاحَ مَعَهْ [3]

غم جیسا بھی ہو اس کا اپنا اثر ہوتا ہے مگر رات دن کے آنا جانے کے ساتھ انسان باقی نہیں رہتا۔

۱۔ جب کہ مبتداء اول ''أُولَٰئِكَ'' ہے۔

۲۔ شعر کا پہلا مصرع: ''قد عَلِمَتْ خَيلُكَ أني الصحصح'' لسان العرب (فلح)، ابوعبیدہ: مجاز القرآن ۱: ۳۰

۳۔ [لسان العرب (فلح)

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

نَحِلُّ بلاداً کلّها حلّ قبلنا　و نرجو الفلاح بعد عاد و حِمْيَرَ(۱)

ہم انہی علاقوں میں رہتے ہیں جن میں ہم سے پہلے لوگ رہ چکے ہیں اور پھر یہ امید بھی رکھتے ہیں کہ عاد اور حمیر جیسی قوموں کے ختم ہوجانے کے باوجود ہم دنیا میں باقی رہیں گے ۔

یہاں بھی ''فلاح'' کا معنی بقاء ہی ہے۔ اسی طرح عبید کا ایک شعر ہے:

أَفْلِحْ بما شئتَ فقد يُدرَك بالضَّـ　ـعْف وقد يُخَدَّ عُ الأرِيبُ (۲)

تو جس انداز میں چاہے زندگی گزار کیوں کہ کبھی کم عقل کی بھی داد رسی ہوجاتی ہے اور کبھی بڑے بڑے عاقل محروم رہ جاتے ہیں ۔

﴿مُفْلِحُونَ﴾ کی تفسیر

ان تمام شواہد کی روشنی میں ﴿وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ سے مراد ایسے لوگ ہیں جو جنت حاصل کرنے اور اس میں باقی رہنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ ابن ابی اسحاق کہتے ہیں: ''مفلحون'' وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی طلب مل گئی اور جس چیز سے وہ دور بھاگتے تھے اس سے نجات حاصل ہوگئی۔ ان دونوں اقوال کا مقصد ایک ہی ہے۔ لفظ ''فلاح'' کبھی سحری کے کھانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:

[۳۲۰] حتى كاد يفوتنا الفلاح مع رسول الله صلى الله عليه وسلم ۔ قلت: وما الفلاَحُ؟ قال: السَّحور۔

ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قدر دیر ہوگئی کہ ''فلاح'' رہ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔ راوی کہتے ہیں میں نے عرض کیا ''فلاح'' کیا ہوتا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا: اس سے مراد سحری کا کھانا ہے ۔اس حدیث کو امام ابو داؤدؒ نے نقل کیا ہے۔

اس طرح حدیث کا مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ سحری کھانا ہی روزے کی بقا کا سبب ہے اسی لیے سحری کھانے کے لیے ''فلاح'' کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اگر یہی لفظ لام کی تشدید کے ساتھ ''فَلَّاح'' ہو تو اس کا معنی مزدوری پر جانور چلانے والا ملازم ہوتا ہے جیسا کہ درج ذیل شعر میں ہے:

---

[۳۲۰] سنن ابوداؤد: كتاب الصلاة ، باب تقريع أبواب شهر رمضان ۲:۵۰، جامع ترمذی: كتاب الصوم، باب ماجاء في قيام شهر رمضان ۳:۱۶۹، .... بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ......................

سنن نسائی: کتاب السهو، باب ثواب من صلى مع الإمام حتى ينصرف ۳: ۸۳، اس روایت کے آخر میں امام نسائی نے داؤد (بن ابی ہند) کا قول نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے پوچھا کہ "فلاح" کیا ہے؟، کتاب قيام الليل وتطوع النهار، باب قيام شهر رمضان ۳: ۲۰۲، سنن ابن ماجہ: کتاب إقامة الصلاة والسنة فيها، باب ماجاء في قيام شهر رمضان ۱: ۴۲۰، سنن دارمی: من كتاب الصوم، باب في قيام شهر رمضان ۱: ۴۵۲، مسند امام احمدؒ: حديث أبي ذر الغفاري رضي الله عنه ۶: ۲۰۰، ۲۰۵، مصنف عبدالرزاق: كتاب الصيام، باب ليلة القدر ۴: ۲۵۴، سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب من زعم أنها بالجماعة أفضل ۴: ۵۸، شعب الإيمان: الحادي والعشرون من شعب الإيمان ...... فضل قيام شهر رمضان ۳: ۱۷۸، ان سب حضرات نے طویل حدیث میں یہ الفاظ تھوڑی بہت تقدیم وتاخیر سے نقل کئے ہیں مگر "حتى كاد يفوتنا الفلاَح" کے ساتھ "مع رسول الله" کے الفاظ مجھے نہیں ملے حالاں کہ مصنف رحمہ اللہ نے سنن ابوداؤد کا حوالہ بھی دیا ہے، شاید انہوں نے یہ حدیث روایت بالمعنی کے تحت نقل کی ہو۔ اسی طرح مصنف رحمہ اللہ کی نقل کردہ عبارت میں "قلت: وما الفلاَح؟" کے قائل کا تعین بھی نہیں ہوسکا۔ مراجع حدیث کی ورق گردانی سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سوال تابعی راوی جُبیر بن نُفَیر رحمہ اللہ نے صحابی راوی حضرت أبوذر رضی اللہ عنہ سے کیا اور اس کے بعد "قال: السَّحور" کے قائل بھی صحابی راوی حضرت أبو ذر رضی اللہ عنہ ہیں۔ مندرجہ بالا مراجع میں سے سنن أبی داود، مسند امام احمدؒ، مصنف عبد الرزاق اور سنن نسائی کی دوسری روایت میں "قال قُلت: وما الفلاَح؟"، ترمذی میں: "قلتُ له وما الفلاَح؟"، سنن نسائی کی پہلی روایت میں "قال داود قلت: ما الفلاَح؟"، سنن ابن ماجہ میں "قيل: وما الفلاَح؟"، سنن دارمی اور شعب الإیمان میں "قلنا: وما الفلاَح؟" اور امام بیہقی کی السنن الکبری میں "قال: وما الفلاَح؟" کے الفاظ ہیں، جہاں تک داود بن ابی ہند کے نام کا ذکر ہے تو ہوسکتا ہے انہوں نے اپنے طور پر اپنے شیخ ولید بن عبدالرحمٰن سے یہ بات پوچھی ہو مگر بنیادی طور پر اس قول کی ان کی طرف نسبت صحیح معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ اس کے جواب میں "قال: السَّحور" کا قائل ہی "ثم لم يقم بنا ياابن أخي شيئ من الشهر" کا قائل بھی ہے جس میں دوباتیں قابل ملاحظہ ہیں: ایک "ثم لم يقم بنا ...... شيئ من الشهر" جس میں یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا ذکر ہے اور راوی صحابی کی اس میں موجودگی بھی یقینی ہے جس کا قرینہ لفظ "ثم لم يقم بنا" ہے اور دوسری بات صحابی راوی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا "ياابن أخي" فرمانا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائل انہی کا کوئی برخوردار یا شاگرد ہے جس کے والد گرامی سے ان کا بھائیوں کا سا تعلق ہے۔ اس سے تقریباً اس بات کا تعین ہوجاتا ہے کہ "قلتُ له وما الفلاَح؟" کے قائل تابعی راوی جبیر بن نفیرؒ ہی ہیں۔ کتب حدیث میں زیر نظر حدیث کے مذکورہ بالا الفاظ اس طرح ہیں: "عن أبي ذر قال صمنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم رمضان... جمع رسول الله صلى الله عليه وسلم أهله واجتمع له الناس فصلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم حتى كاد يفوتنا الفلاَحُ. قال قلت: وما الفلاَحُ؟ قال: السَّحور ثم لم يقم بنا ياابن أخي شيئ من الشهر"۔

۱۔ یہ شعر لبید بن ربیعہ العامری کا ہے۔ دیوان لبید ۱: ۸۱

۲۔ یہ شعر عبید بن ابرص کا ہے۔ دیوان عبید ص ۷، لسان العرب (فلح)

لها رِطلٌ تكيلُ الزيتَ فيه و فَلّاحٌ يسوق لها حِمارًا

اس کے پاس ایک پیمانہ ہے جس سے وہ تیل کی پیمائش کرتی ہے اور ایک ملازم ہے جو اس کا گدھا ہانکتا ہے۔

البتہ "فلاح" کا مشہور معنی مطلوبہ مقصد میں کامیابی حاصل کرلینا اور جس چیز کا خوف ہو اس سے بچ جانا ہے۔

﴿رَبِّهِمْ﴾ کی قراءات

اگر کوئی کہے کہ حمزہ سے "عليهِم، إليهِم اورلديهِم" کی قراءت ہاء کے ضمہ کے ساتھ "عليهُم، إليهُم اورلديهُم" منقول ہے، انہوں نے "ربِّهِم، فيهِم، اورجَنَّتَيهِم" میں "رَبهُم،فيهُم اورجَنَّتَيهُم" کیوں نہیں پڑھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "عليهِم، إليهِم، اورلديهِم" میں یاء الف سے بدلی ہوئی ہے اور اصل الفاظ "علاهُم، إلاهُم اورلداهُم" ہیں۔ حمزہ رحمہ اللہ کی قراءت میں ہاء کے ضمہ کو باقی رہنے دیا گیا جب کہ "ربِّهِم، فيهِم اورجَنَّتَيهِم" میں یہ معاملہ نہیں ہے۔ کسائیؒ نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿عَلَيْهِمُ الذِّ لَّةُ﴾[آل عمران۳: ۱۱۲] اور ﴿إِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ﴾[یس ۳۶: ۱۴] میں امام حمزہؒ سے اتفاق کیا ہے جیسا کہ ان دونوں حضرات کی روایات مشہور ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

إِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ أَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لاَ يُؤْمِنُونَ ﴿٦﴾

بے شک جو لوگ کفر اختیار کیے ہوئے ہیں ان کے حق میں برابر ہے خواہ آپ انہیں ڈرائیں یا آپ انہیں نہ ڈرائیں وہ ایمان نہ لائیں گے۔

کفر کیا ہے؟

جب اللہ تعالیٰ مومنین اور ان کے حالات کا ذکر فرما چکے تو کفار اور ان کے انجام کا ذکر فرمایا۔ کفر ایمان کا متضاد ہے اور اس آیت کریمہ میں یہی معنی مراد ہے۔ کبھی کبھی اس کا معنی نعمت کی ناقدری اور احسان کی ناشکری بھی ہوتا ہے یہی معنی حدیثِ کسوف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد میں پایا جاتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں فرمایا:

[۳۲۱] وَرأَيتُ النار فلم أرَ منظراً كاليوم قطّ أفظعَ ورأيت أكثرَ أهلِها النساء. قيل: بِمَ يا رسول الله ؟ قال: بكفرهن؛ قيل أيكفُرْنَ بالله؟ قال: يكفرُن العَشِيرَ و يكفرن الإحسانَ لو أحسنتَ إلى إحداهُنَّ الدهرَ كلَّه ثم رأتْ منكَ شيئاً قالتْ ما رأيتُ منكَ خيراً قَطُّ۔

اور میں نے آگ کو دیکھا، اس کا منظر ایسا تھا کہ میں نے اس سے زیادہ خوف ناک منظر کبھی نہیں دیکھا، میں نے دیکھا کہ آگ میں جانے والوں کی زیادہ تعداد عورتوں پر مشتمل ہے۔ عرض کیا گیا حضور! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا: ان کے کفر کی وجہ سے۔ عرض کیا گیا: کیا وہ اللہ کی ذات کے ساتھ کفر کرتی ہیں؟ فرمایا نہیں، بلکہ خاوندوں کی ناشکری کرتی ہیں اور احسان کو بھول جاتی ہیں۔ اگر کوئی اپنی اہلیہ کے ساتھ پوری زندگی حسن سلوک کرتا رہے اور کبھی کہیں کوئی ایسا کام ہو جائے جو اسے پسند نہ آئے تو کہتی ہے: میں نے زندگی بھر تجھ سے بھلائی نہیں دیکھی۔

لغت عرب میں ''کفر'' کا اصل معنی چھپانا اور ڈھانپنا ہے، شاعر کہتا ہے:

في ليلة كفر النجومَ غمامُها[۱]

ایسی رات میں جس کے بادلوں نے ستاروں کو ڈھانپ لیا۔

عربی میں رات کو بھی ''کافر'' کہتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے اندھیرے سے ہر چیز کو ڈھانپ لیتی ہے چناں چہ ایک شاعر کہتا ہے

---

[۳۲۱] صحیح بخاری: كتاب الإيمان، باب كفران العشير وكفر بعد كفر ۱:۱۹، كتاب الكسوف، باب صلاة الكسوف جماعة...... ۱:۳۵۷، كتاب النكاح، باب كفران العشير وهو الزوج وهو...... ۵:۱۹۹۴، سنن نسائی: كتاب الكسوف، باب قدر القراءة في صلاة الكسوف ۳:۱۳۶، مؤطا امام مالک: كتاب صلاة الكسوف، باب العمل في صلاة الكسوف ۱:۱۸۶، صحیح ابن حبان: كتاب الصلاة، باب صلاة الكسوف ۷:۷۲، ۹۷، صحیح ابن خزیمہ: كتاب الصلاة، باب ذكر قدر القراءة من صلاة الكسوف وتطويل القراءة فيها ۲:۳۱۲، مسند امام احمدؒ: مسند عبد الله بن عباس بن عبد المطلب رضي الله عنهما ۱:۲۹۰، عبد الرزاق: كتاب الصلاة، باب الآيات ۳:۹۸، سنن بیہقی: كتاب صلاة الخسوف، باب كيف يصلي في الخسوف ۵:۳۱۱ بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما۔

۱۔ یہ لبید بن ربیعہ کے معلقہ کے ایک شعر کا دوسرا مصرع ہے، پہلا مصرع اس طرح ہے: ''عَفَتِ الديارُ محلها فمقامُها''۔
ابن النحاس: شرح المعلقات ۱:۱۵۲

فَتَذَكَّرَا ثَقَلاً رَثِيداً بَعْدَمَا أَلقَتْ ذُكَاءُ يَمِينَهَا فِي كَافِر (۱)

ان دونوں کو اوپر نیچے رکھا ہوا اپنا سامان اس وقت یاد آیا جب سورج اپنا دایاں حصہ رات کے اندھیرے میں داخل کر چکا تھا۔

ایک اور شاعر کا قول ہے:

فَوَرَدَتْ قبلَ انبلاج الفجرِ وابنُ ذُكَاءٍ كَامِنٌ فِي كَفْرِ (۲)

تو وہ فجر طلوع ہونے سے پہلے آئی جب کہ سورج ابھی رات کے اندھیرے میں چھپا ہوا تھا۔

یہاں ''کَفْر'' کا معنی رات ہے۔ ''کَافِر'' کا ایک معنی سمندر یا بڑا دریا بھی ہے، اسی طرح کھیتی باڑی کرنے والے کو بھی ''کَافِر'' کہتے ہیں جس کی جمع ''کُفَّار'' آتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ أَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهُ﴾ [الحدید ۵۷: ۲۰] (گویا کہ مینہ ہے کہ اس کی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے)۔ یہاں ''کُفَّار'' سے مراد کاشتکار ہیں۔ انہیں ''کُفَّار'' اس لیے کہا گیا کہ وہ دانے زمین میں چھپا دیتے ہیں۔ جس ریت پر ہوا مٹی ڈال دے اسے ''رَمادٌ مكفورٌ'' کہتے ہیں۔ اور ایسی زمین کو جو بہت دور ہو، نہ وہاں کوئی جاتا ہو نہ وہاں سے گزرتا ہو ''کافر من الأرض'' کہتے ہیں۔ ایسی زمین میں اگر کچھ لوگ جا کر رہنے لگیں تو انہیں ''أهل الكفور'' کہا جاتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بستی کو بھی ''کفور'' کہہ دیا جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ﴾ (ان کے لیے برابر ہے) اس سے مراد یہ ہے کہ ان کے نزدیک آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔ یہاں اسلوب استفہام بھی برابری کا معنی ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿سَوَآءٌ عَلَيْنَآ أَوَعَظْتَ أَمْ لَمْ تَكُنْ مِّنَ الْوَاعِظِيْنَ﴾ [الشعراء ۲۶: ۱۳۶] (تم ہمیں نصیحت کرو یا نہ کرو ہمارے لیے یکساں ہے)۔ شاعر کہتا ہے:

وليلٍ يقولُ النّاسُ من ظُلماتِه سواءٌ صحيحاتُ العيون وعورُها (۳)

اور ایسی رات جس کے سخت اندھیرے کی وجہ سے لوگ کہتے ہیں: اس میں صحیح آنکھوں والی اور ٹیڑھی آنکھوں والی برابر ہیں۔

۱۔ یہ ثعلبہ بن صعیرہ المازنی کا شعر ہے۔

۲۔ یہ شعر حمید بن ثور کا ہے۔ لسان العرب (کفر)

۳۔ یہ معترس بن ربعی الاسدی کا شعر ہے۔ البیان والتبیین ۳: ۱۸۶، تفسیر ابن عطیہ ۱: ۱۵۲

''اِنْذَار'' کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ءَ أَنذَرْتَهُمْ﴾ میں'' إنذار'' کا اصل معنی پہنچانااور بتانا ہے مگر اب اس کا استعمال تقریباً ایسے ڈرانے میں منحصر ہوگیا ہے جس میں اس چیز سے بچنے کا مناسب وقت باقی ہو جس سے ڈرایا گیا ہے۔ اگر اس سے بچنے کا موقع باقی نہ ہو تو اس کے لیے لفظ ''إشعار'' (آگاہ کرنا) استعمال ہوتا ہے''اِنذار'' نہیں، شاعر کہتا ہے :

أنذرتَ عَمراً وهو في مَهَلٍ　　　قبلَ الصباح فَقد عصَى عَمْرُو

تم نے عمرو کو صبح سے پہلے اس وقت متنبہ کیا جب اس کے پاس بچنے کے لیے کافی وقت تھا مگر اس نے تمہاری نصیحت نہ مانی۔

کہا جاتا ہے : ''تَنَاذَرَ بنو فلان'' (فلاں قوم کے لوگوں نے ایک دوسرے کو متنبہ کیا)

آیت میں کفار سے مراد کون لوگ ہیں ؟

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں علماء سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ بعض کہتے ہیں : یہ آیت لفظ کے لحاظ سے عام ہے مگر معنی کے لحاظ سے ان کفار کے ساتھ خاص ہے جن کے حق میں عذاب کا فیصلہ ہو چکا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم ہے کہ وہ لوگ کفر کی حالت میں مریں گے۔ یہ ارشاد فرمانے سے مقصد یہ ہے کہ باری تعالیٰ کسی کی تعیین کئے بغیر لوگوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کفر میں اس انتہاء کو پہنچ چکے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور کلبی سے منقول ہے کہ یہ آیت کریمہ یہودی سرداروں کے بارے میں نازل ہوئی جن میں حُیَي ابن اخطب ، کعب بن اشرف اور ان جیسے دیگر رؤساء شامل ہیں ۔ ربیع بن انس کہتے ہیں :اس سے مراد کفار کے لشکروں کے وہ کمان دار ہیں جو جنگ بدر میں مارے گئے ۔مگر پہلاقول زیادہ صحیح ہے۔ اگر کسی نے اپنی تفسیر میں کسی خاص کافر کا تعین بھی کیا ہے تو وہ بھی انہی لوگوں کے نام ہیں جن کی کفر پر موت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں خود ظاہر فرما دیا۔ ایسے لوگ پہلے سے اس آیت کے حکم میں شامل تھے۔

نحوی تراکیب اور قراء ات

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿لَا يُؤْمِنُونَ﴾ یہ ﴿إِنَّ﴾ کی خبر کے طور پر محل رفع میں ہے ۔معنی یہ ہے کہ ''إِنَّ الَّذِينَ

كَفَرُوالَا يُؤْمِنُونَ ''یعنی جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ بعض کہتے ہیں ﴿إِنَّ﴾ کی خبر﴿سَوَاءٌ﴾ ہے اور اس کے بعد والی عبارت اس کے صلہ کے قائم مقام ہے۔ یہ ابن کیسان کا قول ہے۔ محمد بن یزید کہتے ہیں ﴿سَوَاءٌ﴾ مبتداء ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور ﴿ءَ أَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ اس کی خبر ہے، پھر یہ مکمل جملہ ﴿إِنَّ﴾ کی خبر ہے۔ نحاس اس کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ جان بوجھ کر بے وقوف بن گئے تو ڈرانے سے ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

ارشاد باری تعالیٰ:﴿ءَ أَنْذَرْتَهُمْ﴾ میں مختلف قراءات منقول ہیں۔ علماءِ مدینہ، ابو عمرو، اعمش، اور عبداللہ بن ابی اسحاق نے اسے پہلے ہمزہ کے تلفظ اور دوسرے کی تسہیل کے ساتھ ﴿آنْذَرْتَهُمْ﴾ پڑھا ہے، اسی قراءت کو خلیل اور سیبویہ نے اختیار کیا ہے اور یہی قریش اور بنوسعد بن بکر کا لہجہ ہے۔ اسی لہجہ میں شاعر کا یہ قول ہے:

أَيَا ظَبْيَةَ الوَعْساءِ بين جُلاَجِلٍ وَ بَيْنَ النَّقا آنْتِ أَمْ أُمُّ سالِمِ[1]

اے ریتیلے ٹیلے کی ہرنی! جلاجل اور نقا کے درمیان تم ہو یا ام سالم ہے؟

اس میں بھی ''آنتِ'' کا تلفظ ایک ہی ہمزہ کے ساتھ ہے۔ایک اور شاعر کا قول ہے:

تَطالَلْتُ فَاستَشْرَفْتُه فعرفتُهٗ فَقلتُ لهٗ آنتَ زَيْدُ الأرانِبِ[2]

میں نے گردن لمبی کر کے اس کی طرف جھانکا اورغور سے دیکھا تو اس کو پہچان لیا۔ پھر میں نے کہا: کیا تم خرگوشوں والے زید ہی ہو؟

ابن محیصن سے منقول ہے کہ انہوں نے اسے ایک ہمزہ کے ساتھ ﴿أَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ﴾ پڑھا اور ہمزہ کے بعد الف نہیں پڑھا۔ انہوں نے یہ الف یا تو التقائے ساکنین کی وجہ سے حذف کردیا یا اس لیے کہ ﴿أَمْ﴾ اکیلا بھی استفہام کا معنی دے رہا ہے۔جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

تَرُوحُ مِنَ الْحَيِّ أَمْ تَبْتَكِرُ وَماذَا يَضيرُكَ لو تَنْتَظِرُ

تم اپنے قبیلے سے شام کو نکل جاؤ یا صبح سویرے سویرے تمہارے لیے برابر ہے۔اور اگر تم انتظار بھی کرلو تو تمہارا کیا نقصان ہے؟

۱۔ یہ شعر ذوالرمہ کا ہے۔ لسان (جلل)،سیبویہ: الکتاب ۲: ۱۶۸

۲۔ التذکرۃ والتبصرۃ میں ۱: ۴۴۱ یہ شعر شاخ کے بھائی مزرد بن ضرار کی طرف منسوب کیا گیا ہے جب کہ لسان العرب اور زیادات دیوان ذی الرمۃ ص ۱۸۴۹ میں ذوالرمۃ کی طرف۔

یہ اصل میں ''أَتَرُوحُ'' ہے مگر شاعر نے صرف ''أم'' کہنے پر اکتفاء کیا ہے۔ ابن ابی اسحاق سے منقول ہے کہ انہوں نے اسے دوہمزوں کے تلفظ کے ساتھ اور ان دونوں کے درمیان الف مدہ کوداخل کر کے ﴿ءَ اَأَنذَرْتَهُمْ﴾ پڑھا ہے تا کہ دونوں ہمزے ایک جگہ جمع نہ ہوجائیں۔ ابوحاتم کہتے ہیں ان دونوں ہمزوں کے درمیان ایک الف داخل کر کے دوسرے ہمزہ کی تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ ابوعمرو اور نافع اکثر اسی طرح پڑھتے تھے۔ حمزہ، عاصم اورکسائی نے دونوں ہمزوں کے تلفظ کے ساتھ ﴿ءَ أَنذَرْتَهُمْ﴾ پڑھا ہے اور اسی کو ابوعبید نے پسند کیا ہے مگر خلیل کے خیال میں یہ مستبعد ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں: یہ ثقل میں ''ضَنِنُوا'' کی طرح ہے۔ اخفش کہتے ہیں: دونوں ہمزوں میں سے پہلے کی تخفیف بھی جائز ہے مگر یہ بے کار بات ہے کیوں کہ تخفیف ہمیشہ ثقل کے بعد اور ایک حرف کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں دونوں ہمزوں کو بیک وقت تخفیف کے ساتھ پڑھنا جائز ہے۔ یہاں قراءات کی یہ سات صورتیں ہیں۔ ایک آٹھویں صورت بھی ہے اور وہ صرف قرآن مجید کے علاوہ جائز ہے۔ کیوں کہ وہ جمہورامت مسلمہ کی قراءت کے خلاف ہے۔ وہ صورت اخفش (سعید) کا یہ قول ہے کہ ﴿ءَ أَنذَرْتَهُمْ﴾ کے پہلے ہمزہ کو ہاء سے بدل کر ﴿هَأَنذَرْتَهُمْ﴾ کہا جائے جیسا کہ ''هِيَّاكَ اور إِيَّاكَ'' میں کیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿هَاأَنتُمْ أُولَآءِ﴾ [آل عمران ۳: ۱۱۹] اصل میں ''ءَ أَنتُمْ'' ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَ عَلٰۤى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ؗ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۷﴾

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگادی ہے اوران کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، اور ان کے لیے بڑی سزا تیار ہے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر دس مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث: کفار کے ایمان نہ لانے کی وجہ

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ﴾ میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے ایمان نہ لانے کی وجہ بیان فرمائی ہے۔ لفظ ''ختم'' مصدر ہے۔ کہا جاتا ہے: ''خَتَمْتُ الشَّيْئَ خَتْماً فهو مختوم''۔ یہاں ''مختوم'' کی بجائے ''مُخَتَّمْ'' بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس میں تشدید اس کے معنی میں مبالغہ ظاہر کرنے کی وجہ سے لائی گئی ہے۔ ''ختم'' کا معنی کسی چیز کو ڈھانک دینا اور مضبوط کر کے بند کرنا ہے تا کہ اس میں باہر سے کوئی چیز داخل نہ ہو سکے۔ اسی

سے ''ختم الکتاب'' (خط کو مہر لگانا) ''ختم الباب''(دروازے کو مقفل کر کے مہر لگا دینا) استعمال ہوتا ہے تاکہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے اور مزید اس میں کچھ شامل نہ کیا جاسکے۔

کفار کے دلوں کی دس حالتیں

مفسرین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن مجید میں کفار کے دلوں کی دس حالتیں بیان فرمائی ہیں جو کہ ''ختم''(مہر لگا ہونا) ''طبع'' (مضبوط بند کر دینا)، ''ضیق''(تنگی محسوس کرنا)، ''مرض''(بیماری)، ''رَین'' (زنگ آلود ہونا)، ''موت''(مرجانا)، ''قساوۃ''(سختی)، ''انصراف''(پھر جانا)، ''حَمِیَّۃ''(عصبیت) اور ''انکار''(انکار) ہیں:

انکار کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ﴾[النحل۱۶: ۲۲] (ان کے دل انکار کررہے ہیں اور وہ سرکش ہورہے ہیں)۔ عصبیت کے بارے میں فرمایا: ﴿اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ﴾ [الفتح۴۸: ۲۶] (جب ان کافروں نے اپنے دلوں میں عصبیت کو جگہ دی)۔ پھر جانے کے بارے میں فرمایا: ﴿ثُمَّ انْصَرَفُوْا ؕ صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ [التوبۃ۹: ۱۲۷](پھر وہ چل دیئے، اللہ تعالیٰ نے ان کا دل ہی پھیر دیا ہے، اس وجہ سے کہ یہ سمجھ سے کام نہ لینے والے لوگ ہیں)۔ سختی کے بارے میں ارشاد ہوا: ﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ﴾[الزمر۳۹: ۲۲](سو بڑی خرابی ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دل اللہ کے ذکر کی طرف سے سخت ہیں)، نیز فرمایا: ﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ﴾ [البقرۃ۲: ۷۴](پھر تمہارے دل اس کے بعد بھی سخت ہی رہے)۔ ان کے دلوں کی موت کا ذکر یوں فرمایا: ﴿اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ﴾[الأنعام۶: ۱۲۲] (کیا جو شخص مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندہ کردیا)، نیز فرمایا: ﴿اِنَّمَا يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ؔ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ﴾ [الأنعام۶: ۳۶] (قبول تو بس وہی لوگ کرتے ہیں جو سنتے ہیں۔ اور مُردوں کو اللہ جلا کھڑا کرے گا)۔ زنگ آلود ہونے کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿كَلَّا بَلْ ٚ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ [المطففین۸۳: ۱۴] (ہرگز ایسا نہیں۔ اصل یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے کرتوتوں کا زنگ بیٹھ گیا ہے)۔ بیماری کے بارے میں فرمایا: ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾[البقرۃ۲: ۱۰] (ان کے دلوں میں بیماری ہے)۔ تنگی کے بارے میں فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا﴾[الأنعام۶: ۱۲۵](اور جس کے لیے وہ ارادہ کرلیتا ہے کہ اسے گمراہ رکھے اس کے سینہ کو وہ تنگ، بہت تنگ کردیتا ہے)۔ مضبوط بند کردینے کے بارے میں ارشاد ہوا: ﴿فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ﴾ [المنافقون۶۳: ۳] (سو ان کے دلوں پر مہر کردی گئی تو یہ اب نہیں سمجھتے)، نیز ارشاد فرمایا: ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ [النساء۴: ۱۵۵](بلکہ ان کے

کفر کی وجہ سے اللہ نے ان پر مہر کردی ہے)۔ مہر لگے ہونے کا ذکراس آیت کریمہ میں فرمادیا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے) اور ان میں سے ہر ایک کی وضاحت اِن شاء اللہ اس کے اپنے مقام پر اِن شاء اللہ آئے گی۔

دوسری بحث : دلوں اورکانوں پر مہر کی کیفیت

ایک مہر تو حسی ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا اورایک مہر معنوی بھی ہوتی ہے۔ اس آیت کریمہ مین بھی مہر سے مراد یہی ہے ۔ دلوں پر مہر لگانے سے مراد یہ ہے کہ وہ حق تعالیٰ جل شانہ کے ارشادات کو سمجھ نہیں پاتے نہ ہی اس کی آیات میں غوروفکر کرتے ہیں ۔ کانوں پر مہر لگانے کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کو قرآن سنایاجاتاہے تو وہ اسے سمجھتے نہیں اور جب توحید باری تعالیٰ کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو اس کا ادراک نہیں کرتے۔ آنکھوں پر پردے کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غورکرنے کی اور قدرت کی کاریگری کے عجائبات دیکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ آیت کی یہ تفسیر حضرات ابن عباس ، ابن مسعود رضی اللہ عنہما اور قتادہ رحمہ اللہ کے اقوال کا خلاصہ ہے۔

تیسری بحث : مسئلہ خلق اعمال اورقدریہ کا رد

اس آیت کریمہ میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہدایت وگمراہی اور کفروایمان سب کا خالق ہے ۔ یہ بات سننے والے اس سے سبق حاصل کریں اورفرقہ قدریہ کے عقول کو دیکھ کر حیران ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ وہ خود اپنے ایمان اور ہدایت کے خالق ہیں ۔ ''ختم'' کا معنی مہر ہے اور مہر لگ جانے کے بعد وہ کوشش کریں بھی تو انہیں ایمان کہاں نصیب ہوسکتا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ ان کے دلوں اورکانوں پرمہریں لگی ہیں اور ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہیں ۔ اس حال میں وہ ہدایت کیسے پاسکتے ہیں ؟ اور جب خود اللہ تعالیٰ نے انہیں گمراہ ہونے دیا ، ان کوبہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا تو اس کے بعد انہیں ہدایت دے بھی کون سکتا ہے؟ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے : ﴿وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ﴾[غافر ۴۰: ۳۳](اور جسے اللہ گمراہ کرے اسے کوئی راہ دکھانے والانہیں)۔ ان کفار کوگمراہ رکھنے اور ذلیل کرنے کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عین عدل وانصاف پرمبنی ہے۔ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے کسی حق سے محروم نہیں کیا کہ اس سے اس کی صفت عدل پرحرف آئے بلکہ اس نے تو ان سے اپنے فضل کو روک لیاہے جو وہ چاہتا تو کرسکتا تھا نہ کہ اس نے ان کاکوئی حق دبایاہے جو اس کے ذمہ واجب تھا ۔

قدریہ کا اعتراض اور اس کا جواب

اگر وہ لوگ یہ کہیں کہ "ختم" (مہر لگا ہونا) "طبع" (مضبوط بند کردینا) اور "غِشَاوَۃٌ" (پردہ) سے یہاں مراد صرف ان کا ذکر کرنا اور یہ خبر دینا ہے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے، عملی طور پر مہر لگانا نہیں۔ تو ہم کہیں گے کہ یہ بات غلط ہے کیوں کہ "ختم" (مہر لگا ہونے) اور "طبع" (مضبوط بند کردینے) کی حقیقت عملاً ایسا کام کرنا ہے جس سے ان کے دل مہر زدہ ہوجائیں۔ یہ کہنا ہرگز درست نہیں کہ اس مہر کی حقیقت صرف نام لے دینا اور خبر دے دینا ہے۔غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے: "فلان طبع الکتابَ و خَتمَہٗ" (فلاں شخص نے خط پر مہر لگا دی اور اسے بند کردیا) تو اس کا حقیقی مطلب یہی ہوگا کہ اس نے ایسا کام کیا جس سے خط پر مہر لگ گئی اور وہ بند بھی ہوگیا نہ کہ اس سے صرف ذکر کرنا اور خبر دینا مقصود ہوگا۔اس معنی میں علماءِ لغت کا کوئی اختلاف نہیں اور پوری امت کا بھی اس پر اجماع ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہاں "ختم" (مہر لگا ہونے) اور "طبع" (مضبوط بند کردینے) کے الفاظ فرما کر ان کے کفر کی پاداش میں ان کے دلوں پر مہر لگانے والا اور انہیں بند کردینے والا اپنی ذات عالی کو قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ [النساء ۴:۱۵۵] (بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر مہر کردی ہے)۔ اس بات پر بھی امت کا اجماع ہے کہ کفار کے دلوں پر مہر لگانا اور انہیں بند کردینا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، ملائکہ اور مومنین کی طرف سے ناممکن ہے۔ اگر اس کا یہ مطلب لیا جائے جو قدریہ کہتے ہیں تو صرف اس کا ذکر کرنا اور خبر دینا انبیاء کرام علیہم السلام اور مومنین سے کیسے ناممکن ہوسکتا ہے جب کہ یہ بات واضح ہے کہ یہ سب حضرات اس کا اعلان کرتے رہے ہیں کہ کفار کے دلوں کو بند کردیا گیا ہے، ان پر مہر لگی ہوئی ہے، یہ گمراہ ہیں اور ایمان نہیں لاتے۔ مومنین ہمیشہ سے کفار کے بارے میں یہی فیصلہ سناتے آئے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ "ختم" اور "طبع" معنوی لحاظ سے صرف بتانے اور حکم سنانے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسا مفہوم ہے جو اللہ تعالیٰ دلوں میں پیدا کردیتے ہیں اور وہ مفہوم انہیں اللہ کی ذات پر ایمان لانے سے روکتا ہے جس کی دلیل ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ. لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ﴾ [الحجر ۱۵: ۱۲،۱۳] (اسی طرح ہم اس (تکذیب وضلال) کو مجرمون کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں چناں چہ وہ اس پر ایمان نہیں لاتے) نیز: ﴿وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾ [الاسراء ۱۷: ۴۶] (ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے تاکہ وہ اسے سمجھ نہ سکیں)۔اور اسی طرح کی دیگر آیاتِ کریمہ ہیں۔

چوتھی بحث: قلب کی حقیقت اور مقام

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ (ان کے دلوں پر) میں اس بات کی دلیل ہے کہ دل تمام اعضاء

سے افضل ہے۔ دل انسان کا بھی ہوتا ہے اور غیر انسان کا بھی ، ہر چیز کی بنیاد اور اس کا افضل ترین مقام بھی دل کہلاتا ہے اور دل تمام افکار کا مرکز ہے ۔ لغت میں "قَلْبٌ" مصدر ہے چناں چہ: "قَلَبْتُ الشيئَ اَقْلِبُهٗ قَلْباً" کسی چیز کو اس کی ابتدائی حالت کی طرف لوٹانے کو کہتے ہیں ۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: "قَلَبْتُ الإناءَ" (میں نے برتن کو منہ کے بل الٹ دیا)۔ پھر اس لفظ کو بالخصوص دل کے لیے استعمال کیا جانے لگا کیوں کہ یہی جانداروں کے جسم میں افضل ترین مقام ہے۔ اس کا یہ نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ خیالات تیزی سے اس کی طرف آتے ہیں اور بار بار اسی کا رخ کرتے ہیں یہی بات درج ذیل شعر میں کہی گئی ہے :

ما سُمِّيَ القلبُ إلاّ مِنْ تقلُّبِه فاحذَرْ علىَ القلبِ مِن قَلْبٍ و تحويل

دل کو قلب صرف اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ الٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا دل کے تقلبات اور اس پر آنے والی تبدیلیوں سے خبردار رہو ۔

اس کے بعد جب اہل عرب نے یہ مصدر اس عظیم القدر عضو کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تو اس لفظ کی ادائیگی میں حرف قاف کو پُر کر کے بولنے کا خاص اہتمام کیا گیا تا کہ اس کے اصل استعمال اور نئے معنی میں فرق واضح رہے۔ امام ابن ماجہؒ نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے ، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۳۲۲] مَثَلُ القلب مَثَلُ ريشة تقلّبها الرياح بفلاة۔

دل کی مثال ایسے ہے جیسے پرندے کا پر کسی صحراء میں پڑا ہو اور ہوا اسے الٹ پلٹ کرتی رہے۔

اسی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یوں دعا فرمایا کرتے تھے:

[۳۲۳] اللهم يا مُثَبِّتَ القلوبِ ثَبِّت قلوبَنا علىَ طاعتِكَ۔

اے اللہ ! دلوں کو مضبوط رکھنے والے ! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر قائم رکھ۔

---

[۳۲۲] سنن ابن ماجہ :باب القدر ۱:۳۴، شعب الإيمان: الحادي عشر ......۱:۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۷، مسند امام احمدؒ: حديث أبي موسى الأشعري رضيَ الله عنه ۵:۵۵۸۔ بروایت حضرت ابوموسی اشعری رضی اللہ عنہ۔ امام بیہقیؒ کی دوسری روایت کے راوی حضرت اُنس رضی اللہ عنہ ہیں ۔

[۳۲۳] تفسیر قرطبی کے متداول نسخوں میں یہ دعا اسی طرح منقول ہے مگر کتب حدیث میں یہ الفاظ یکجا نظر نہیں آئے ۔ حدیث میں دل کے ثبات کے لیے دو طرح کی مشہور دعائیں ملتی ہیں ۔ سنن ابن ماجہ : کتاب المقدمة ۱: ۷۲، صحیح ابن حبان نے کتاب الرقائق ، باب الأدعية ۳:۲۲، مسند امام احمدؒ نے حديث النواس بن سمعان الكلابي الأنصاری ۵:۱۹۷ بروایت حضرت نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ "يامُثَبِّتَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قُلُوبَنَا على دينِكَ" ، .... بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عظیم شان اور اعلیٰ مقام کے باوجود یہ دعا کررہے ہیں تو ہمیں اس معاملہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی زیادہ ضرورت ہے۔ اسی معنی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاعْلَمُوْٓا أَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ﴾ [الأنفال ۸: ۲۴] (اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہوجاتا ہے) جیسا کہ اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

پانچویں بحث: جسم میں دل کی حیثیت

انسانی اعضاء اگرچہ سبھی دل کے تابع ہیں اور وہی ان سب کا حاکم اور سردار ہے مگر ظاہر و باطن کے مضبوط تعلق کی وجہ سے کبھی کبھی وہ بھی دیگر اعضاء سے متاثر ہوجاتا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے:

[۳۲۴] إن الرجل ليصدُقُ فتُنْكَتُ في قلبه نُكتة بيضاء وإن الرجل ليَكذِب الكذبة فيُسوَّدُ قلبُه۔

بقیہ حاشیہ از صفحۂ سابقہ ....

مصنف عبد الرزاق: کتاب الجامع، باب الدعاء ۱۰: ۴۴۲ بروایت ہشام بن عروہ عن أبیہ۔ مستدرک حاکم: کتاب التفسیر، باب تفسیر سورۃ آل عمران ۲: ۳۱۷ ''یامُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قُلُوبَنَا علی دِینِکَ'' بروایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ۔ اور کتاب الرقائق ۴: ۳۵۷ ''اللهم یامُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قُلُوبَنَا علی دِینِکَ'' بروایت حضرت نواس بن سمعان، مصنف عبد الرزاق: کتاب الجامع، باب الدعاء ۱۰: ۴۴۳ بروایت معمر عن رجل من أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ بوصیریؒ نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبیؒ نے ان کی تائید کی ہے۔ دیگر شواہد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس دعاء کی ایک اور عبارت صحیح مسلم: کتاب القدر، باب تصریف اللہ القلوب کیف شاء ۴: ۲۰۴۵ ''اللهمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ صَرِّفْ قُلُوبَنَا علی طَاعَتِکَ'' بروایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، مسند امام احمدؒ: مسند عبد اللہ بن عمرو بن العاص ۲: ۳۵۵ اور مسند بزار: مسند عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حدیث عبداللہ بن عمرو بن العاص ۶: ۴۴۰ میں ''اللهمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ اصْرِفْ قُلُوبَنَا إلی طَاعَتِکَ'' کے الفاظ منقول ہیں جب کہ صحیح ابن حبان کتاب الرقائق، باب الأدعیۃ ۳: ۱۸۴ میں انہی سے ''اللهمَّ اصْرِفْ قُلُوبَنَا إلی طَاعَتِکَ'' منقول ہے۔ واللہ أعلم۔

....

[۳۲۴] تلاشِ بسیار کے باوجود یہ حدیث متداول کتب حدیث و تفسیر میں نہیں مل سکی، ہوسکتا ہے کسی ایسی کتاب میں ہو جس تک ہماری رسائی نہیں ہوسکی اور یہ بھی ممکن ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ تفسیر قرطبی کے قلمی نسخوں کی تیاری کے دوران مختلف أحادیث کے الفاظ کو کسی نے ایک حدیث سمجھ کر یکجا کردیا ہو۔ ''إن الرجل ليصدق اور إن الرجل ليكذب'' کے الفاظ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''إن الصدق يهدي إلى البر وإن البر يهدي إلى الجنة، وإن الرجل ليصدق حتى يكون صديقا، وإن الكذب يهدي إلى الفجور وإن الفجور يهدي إلى النار، وإن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا'' میں موجود ہیں۔ صحیح بخاریؒ: کتاب الأدب، باب قول اللہ: ﴿ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ ﴾ ۵: ۲۲۶۱، صحیح مسلم: کتاب البر والصلة والآداب، باب قبح الكذب وحسن الصدق وفضله ۴: ۲۰۱۲،

.... بقیہ حاشیہ آئندہ صفحہ پر

آدمی سچ بولتا ہے تو اس کے دل میں سفید نقطہ لگا دیا جاتا ہے اور آدمی جھوٹ بولتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعاً درج ذیل حدیث نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے:

[۳۲۵] إن الرجلَ لیصیبُ الذنبَ فیَسوَدُّ قلبُهٗ فإن هوَ تابَ صَقل قلبُه۔

آدمی گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو اس کا دل

بقیہ حاشیہ از صفحہ سابقہ.........

سنن أبوداود: کتاب الأدب، باب التشدید فی الکذب ۴:۲۹۷ میں، سنن دارمی: کتاب الرقاق، باب فی الکذب ۲:۷۵۵، صحیح ابن حبان: کتاب البر والإحسان، باب الصدق والأمر بالمعروف والنهی عن المنکر ا:۵۰۸، مستدرک حاکم: کتاب العلم، فصل في توقیر العالم......ا:۲۱۷، مسند أبویعلیٰ: مسند عبدالله بن مسعود رضي الله عنه ۹:۷۱، سنن بیہقی: کتاب الشهادات، باب من کان منکشف الکذب مظهره غیر مستتر به لم تجز شهادته ۱۵:۲۶۲، باب الشاعر یمدح الناس بمالیس فیهم......۱۵:۳۷۲، شعب الإیمان، الرابع والثلاثون من شعب الإیمان......۴:۲۰۱ میں نقل کیا ہے۔ ''نکتة بیضاء'' اور ''یسودُّ قلبه'' یا اس کے ہم معنی الفاظ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی حدیث: ''تُعرضُ الفِتَنُ علی القلوب کا لحصیر عوداعودا. فای قلبٍ أُشرِبَهانُكِتَتْ فیه نکتة سوداء، وأی قلب أنکرها نُكِتَتْ فیه نکتة بیضاء حتی تصیر علی قلبین: علی أبیض مثل الصفا فلاتضره فتنة مادامت السموات والأرض، والآخر أسود مرباد کالکوز مجخیالایعرف معروفاولاینکر منکرا'' میں موجود ہیں جسے امام مسلمؒ، مستدرک حاکم، مسند امام احمدؒ اور دیگر محدثین نے نقل کیا ہے جیسا کہ اس کی تخریج عنقریب إن شاء اللہ آئے گی۔ واللہ أعلم۔

....

[۳۲۵] یہ الفاظ مجھے نہ جامع ترمذی میں ملے ہیں نہ حدیث کی کسی اور کتاب میں البتہ صحیح ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب ومن سورة ﴿وَيلٌ لِلمُطَفِّفِينَ﴾ ۵:۴۳۴ میں یہ حدیث منقول ہے: ''إنَّ العَبْدَ إذا أخطأَخطِیئَةً نُكِتَتْ في قلبِهٖ نکتةً سوداء، فإذاهونزع واستغفرَ وتاب صقل قلبه، وإن عاد زید فیها حتی تعلوقلبه وهوالران الذي ذکرالله ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ﴾''، یہی حدیث الفاظ کے تھوڑے بہت تغیر کے ساتھ صحیح ابن حبان: کتاب الصلاة، باب صلاة الجمعة ۷:۲۷ اور کتاب الرقائق، باب الأدعیة ۳:۲۱۰، سنن بیہقی: کتاب الشهادات، باب جماع أبواب من تجوز شهادته ومن لاتجوز......۱۵:۲۴۳، شعب الإیمان، السابع والأربعین من شعب الإیمان......، فصل فی الطبع علی القلب أوالرین ۵:۴۴۰ میں حضرت أبوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے منقول ہے۔ سنن ابن ماجہ: کتاب الزهد، باب ذکر الذنوب ۲:۱۴۱۸، مستدرک حاکم: کتاب التفسیر، باب تفسیر سورة المطففین ۲:۵۶۲ میں۔ امام ترمذیؒ نے اسے حسن صحیح اور محقق البانی نے صحیح ترمذي میں حسن کہا ہے۔ اس کی سند میں ابن عجلان بھی ہیں جو اگرچہ ثقہ ہیں اور امام مسلمؒ نے ان سے روایات نقل کی ہیں مگر حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت میں ان پر کلام کیا گیا ہے جیسا کہ میزان الإعتدال ۳:۱۰۲ میں اس کی وضاحت ہے اس طرح اس حدیث کو حسن قرار دینا ہی زیادہ صحیح ہے۔ واللہ أعلم۔

چمک جاتا ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: دل کی اس سیاہی سے مراد وہی زنگ ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے ارشاد: ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوا يَكْسِبُوْنَ﴾ [المطففین ۸۳: ۱۴] (ہرگز ایسا نہیں ۔ اصل یہ ہے کہ ان کے دلوں پر ان کے کرتوتوں کا زنگ بیٹھ گیا ہے) میں فرمایا ہے۔

مجاہدؒ کہتے ہیں: دل کی مثال ہتھیلی کی طرح ہے کہ ہر گناہ کے بدلے اس کی ایک انگلی بند کردی جاتی ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے مکمل طور پر بند کرکے اس پر مہر لگادی جاتی ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں مجاہد رحمہ اللہ کے اس قول میں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث مبارک :

[۳۲۶] إنَّ فِي الجَسدِ مُضغةً إذَا صلحَت صلح الجسدُ كلهُ وإذا فسدتُ فسدَالجسدُ كله ألا وهي القلب۔

بلاشبہ جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ صحیح ہوجائے تو پورا جسم صحیح ہوجاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم خراب ہوجاتا ہے، یقین رکھو وہ ٹکڑا دل ہے ۔

میں بھی اس بات کی دلیل ہے کہ دل پر لگنے والی مہر حقیقی مہر ہوتی ہے واللہ اعلم ۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ دل کی شکل صنوبر سے ملتی جلتی ہے۔ اس سے بھی مجاہد رحمہ اللہ کے قول کی تائید ہوتی ہے ۔

امام مسلمؒ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۔نے ہمیں دو باتیں بتائیں جن میں سے ایک میں نے دیکھ لی ہے اور دوسری کا انتظار کررہا ہوں ۔ ایک تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ:

---

[۳۲۶] صحیح بخاری :كتاب الإيمان ، باب فضل من استبرأ لدينِه ۱:۲۸، صحیح مسلم : كتاب المساقاة،باب أخذِ الحلالِ وترک الشبهات ۳:۱۲۱۹، سنن ابن ماجہ: كتاب الفتن،باب الوقوف عند الشبهات ۲:۱۳۱۸، سنن دارمی . كتاب البيوع،باب في الحلال بيّنٌ والحرام بيّن ۲:۶۹۵، صحیح ابن حبان :كتاب البرِّوالإحسان، باب الصدق والأمر بالمعروف والنهي عن المنكر ۱:۵۳۲، سنن بیہقی: كتاب البيوع، باب طلب الحلال واجتناب الشبهات ۸:۸۷، شعب الإيمان،التاسع والثلاثون من شعب الإيمان ...... الفصل الثالث فِي طيب المطعم والملبس...... ۵:۵۰ ۔ بروایت حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ ہیں۔

[۳۲۷] أن الأمانة نزلت في جِذرِ قُلوب الرجال ثم نزل القرآن فَعلِموا منَ القرآنِ وَعلِموا من السُّنة ، ثم حدثناعن رفع الأمانة قال: ينام الرجل النومة فتقبض الأمانة من قلبه فيظل أثرها مثلَ الوَكتِ ثم ينامُ فتُقبَضُ الأمانَةُ من قلبه فيَظَلُّ مثلَ المَجْل كَجَمْرٍ دحرجته على رجلك فَنَفِط فتراه مُنْتَبِراً وَ ليس فيه شيء۔ ثم أخَذَ حصىً فدحرجه على رجله۔ فيُصْبِح الناس يتبايعون لا يكاد أحدٌ يؤدّي الأمانةَ حتى يُقالَ إنّ في بني فلان رجلاً أميناً ، حتى يقال للرجل ما أجْلدَه ، ما أظرفه، ما أعقله وما في قلبه مثقال حبة من خردل من إيمان ولقد أتى عليّ زمانٌ وما أبالي أيّكم بايعتُ لئن كان صحيح مسلماً ليردّنّهٗ عليّ دينُهٗ ولئن كان نصرانياً أو يهودياً ليردّنهٗ عليّ ساعيهِ وأما اليوم فما كنت لأبايع منكم إلا فلاناً و فلاناً۔

امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتاری گئی ، پھر قرآن مجید نازل کیا گیا تو لوگوں نے قرآن مجید میں سے کچھ سیکھ لیا اور سنت میں سے بھی۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کے اٹھائے جانے کا ذکر کیا اور فرمایا: آدمی سوئے گا تو امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی مگر اس کا اثر ایک داغ کی طرح اس میں رہ جائے گا ، پھر وہ سوئے گا تو امانت اس کے دل سے نکالی جائے گی مگر اس کا اثر ایک آبلہ کے نشان کی طرح رہ جائے گا جو کسی کے پاؤں پر انگارہ گرنے کی وجہ سے پھول کر بن جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا، پھر وہ پتھر کا ایک کنکر لے کر اس پر لڑھکا دیتا ہے۔ اس طرح ایک وقت ایسا آجائے گا کہ لوگ ایک دوسرے سے خرید و فروخت تو کریں گے مگر امانت ادا کرنے والا کوئی نہیں ملے گا اور حال یہ ہوجائے گا کہ لوگ اشارہ سے بتا سکیں گے کہ فلاں قبیلہ میں ایک امانت دار آدمی ہے ۔ وہ وقت ایسا ہوگا کہ جس شخص کے بارے میں لوگ کہیں گے کہ یہ کس قدر محنتی ، کس قدر خوش اخلاق اور کس قدر عقل مند ہے مگر اس کے دل میں بھی ذرہ بھر ایمان نہیں ہوگا۔ میں نے تو ایسا وقت بھی

[۳۲۷] صحیح مسلم: كتاب الإيمان ، باب رفع الأمانة والإيمان من بعض القلوب۱:۱۲۶، صحیح بخاری: كتاب الرقاق، باب رفع الأمانة ۵ : ۲۳۸۲، كتاب الفتن باب إذابقى في حثالة من الناس۶:۲۵۹۶، سنن ترمذی : كتاب الفتن ،باب ماجاء رفع الأمانة ۴:۴۷۴، سنن ابن ماجہ: كتاب الفتن، باب ذهاب الأمانة۲:۱۳۴۶، صحیح ابن حبان: كتاب، التاريخ ، باب إخباره صلى الله عليه وسلم عمايكون في أمته من الفتن والحوادث۱۵:۱۶۴، مسند امام احمدؒ: حديث حذيفة بن اليمان......۶:۵۲۹، مصنف عبدالرزاق: كتاب الجامع،باب الأمانة وماجاء فيها۱۱:۱۵۷، سنن بیہقی: كتاب آداب القاضي،باب مسألة القاضي عن أحوال الشهود ففي الناس بر وفاجروأمين وخائن۱۵:۹ ۱۰،شعب الإيمان : الخامس والثلاثون من شعب الإيمان ......،باب في الأمانات ومايجب من أدائها إلى أهلها۴:۳۲۴

دیکھا ہے جب بلاخوف وخطر کسی بھی انسان سے خرید وفروخت کی جا سکتی تھی۔ اگر صاحب معاملہ شخص صحیح مسلمان ہوتا تو اس کا دین اسے میرے ساتھ امانت داری اپنانے کا پابند کرتا اور اگر وہ عیسائی یا یہودی ہوتا تو اس کا حاکم اسے خیانت سے باز رکھتا مگر آج یہ حال ہے کہ میں فلاں فلاں لوگوں کے علاوہ کسی سے خرید وفروخت کا معاملہ کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ (۱)

اس حدیث میں لفظ ''وکت'' استعمال ہوا ہے جس کا معنی معمولی اثر ہے۔ کچی کھجور کے کچھ حصے کا پکتے وقت رنگ بدلنے سے جو داغ سا نظر آتا ہے اسے بھی ''وکت'' کہتے ہیں۔ دوسرا لفظ ''المَجْل'' جس کا معنی جلد اور گوشت کے درمیان ہلکا سا پانی بھر جانا ہے جس کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پتھر کے زخم کے ساتھ دی جو لڑھک کر پاؤں پر لگ جانے سے بن جاتا ہے اور قدرے بلند نظر آتا ہے۔ ان سب احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ دل پر ایسے اثرات حسی ہوتے ہیں اور اسی طرح ''ختم'' اور ''طبع'' میں دل پر مہر لگنے اور دل کے دروازے بند ہو جانے کا جو ذکر ہے وہ بھی حسی ہے۔ واللہ اعلم۔ ایک اور حدیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، کہتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

[۳۲۸] تُعْرَضُ الفتن على القلوب كالحصير عُوداً عُوداً فأيُّ قلبٍ أُشْرِبَهانُكِتَ فيه نُكتةٌ سوداء وأيّ قلب أنكرها نكت فيه نكتة بيضاء حتى تصير على قَلْبين، على أبيضَ مثل الصَّفا فلا تضره فتنةٌ ما دامت السموات والأرض والآخرُ أسودُ

[۳۲۸] صحیح مسلم: كتاب الإيمان، باب بيان أن الإسلام بدأ غريبا وسيعود غريبا وأنه يأزر بين المسجدين: ۱: ۱۲۸، مسند امام احمدؒ: حديث حذيفة بن اليمان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۶: ۵۳۳، ۵۶۱۔

۱۔ اس حدیث میں امانت سے مراد شرعی احکام ہیں، بعض علماء کہتے ہیں کہ پورا دین ہی امانت ہے۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں: امانت سے مراد دین کے اوامر اور نواہی ہیں۔ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ امانت جب انسان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو تو وہ احکام شرعیہ کی صحیح پابندی کرتا ہے اور جو احکام اسے ملیں انہیں غنیمت سمجھتا ہے اور ان کو نافذ کرنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ یہ امانت لوگوں کے دلوں سے آہستہ آہستہ نکال لی جائے گی۔ جب اس کا پہلا حصہ نکالا جائے گا تو اس کا نور ختم ہو جائے گا مگر ایک داغ کی طرح سیاہ نشان باقی رہ جائے گا۔ پھر جب امانت کا دوسرا حصہ نکالا جائے گا تو اس کا اثر آبلہ کے داغ کی طرح باقی رہ جائے گا جسے مٹتے مٹتے کئی دن لگ جاتے ہیں۔ اس داغ کی سیاہی پہلے داغ سے زیادہ ہوتی ہے۔ انگارہ کا آبلہ اور پتھر کے زخم کا نشان دونوں امانت کا نور ختم ہو جانے کے بعد اس کی جگہ سیاہ داغ کو واضح کرنے کے لیے ذکر کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد خرید وفروخت کے معاملہ میں بتایا گیا کہ ایک وقت تو ایسا تھا کہ ہر آدمی میں امانت پائی جاتی تھی اور ایفائے عہد کا رواج عام تھا جس کی وجہ سے بلا خوف وخطر ہر ایک سے خرید وفروخت کی جا سکتی تھی مگر ایک وقت ایسا آجائے گا کہ بڑے بڑے دعووں کے باوجود لوگوں میں امانت کا نشان نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔ امام نووی: شرح صحیح مسلم ۱: ۱۶۸، ابن الأثير: النهاية ۱: ۲۵۰

مُرْبادٌ کالکوز مُجَخِّیاً لا یعرف معروفا ولا یُنکر منکراً إلّا ما اُشرِب من هواہ......۔

فتنے چٹائی کے تنکوں کی طرح ایک ایک کر کے تمام دلوں کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ جس دل نے کسی فتنہ کو قبول کرلیا اور اسے اپنے اندر جگہ دی اس میں ایک سیاہ نقطہ لگا دیا جائے گا اور جس دل نے اسے قبول کرنے سے انکار کیا اس میں ایک سفید نقطہ لگا دیا جائے گا یہاں تک کہ یہ نقطے لگتے لگتے دل دو طرح کے ہوجائیں گے، ایک صاف چٹان کی طرح بالکل سفید۔جب تک زمین وآسمان باقی رہیں گے اس دل کو کسی فتنہ کا اثر نہیں ہوگا۔ دوسرا دل زنگ آلود کوزے کی طرح گدلا اور جھکا ہوا ہوگا۔ اس دل سے اچھائی اور برائی کی تمیز ختم ہوجائے گی، وہ اپنی خواہش کے مطابق صرف وہی کچھ کرے گا جو اس کے اندر رچ بس چکا ہوگا)۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث پوری ذکر فرمائی۔ اس حدیث میں جو لفظ ''مُجَخِّیاً'' ذکر ہوا ہے اس کا معنی ''جھکا ہوا ہے۔

چھٹی بحث: ''قلب'' کے معانی اور مترادفات

''قلب'' (دل) کے لیے کبھی ''فؤاد'' اور ''صدر'' وغیرہ کے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿کَذٰلِکَ لِنُثَبِّتَ بِہٖ فُؤَادَکَ﴾[الفرقان ۲۵: ۳۲] (اسی طرح تا کہ ہم آپ کے دل کو اس کے ساتھ مضبوط کر دیں) اور: ﴿أَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ﴾ [الإنشراح ۹۴: ۱] (کیا ہم نے آپ کی خاطر آپ کا دل کشادہ نہیں کر دیا) میں فرمایا۔ان دونوں مقامات پر مراد دل ہی ہے۔کبھی خود لفظ ''قلب'' کو ''عقل'' کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿إِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ﴾ [قٓ ۵۰: ۳۷] (بیشک اس میں نصیحت ہے ایسے شخص کے لیے جس کے پاس دل ہو) یہاں دل سے مراد عقل ہے ۔ اکثر محققین کے قول کے مطابق دل اصل میں عقل کا مقام ہے، اور ''فؤاد'' ''قلب'' کا مقام ہے اور اسی طرح ''صدر'' ''فؤاد'' کا مقام ہے، واللہ اعلم۔

ساتویں بحث: کان اور آنکھ کی حسی قوت کا موازنہ

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ عَلٰی سَمْعِہِمْ﴾ (اور ان کے کانوں پر) کو وہ لوگ اپنی دلیل بناتے ہیں جو قوتِ سماعت کی قوتِ بصارت پر فضیلت کے قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چوں کہ اس آیت کریمہ میں لفظ

''سمع'' (کان) کا ذکر''بصر'' (آنکھ) سے پہلے ہوا ہے اس لیے وہی افضل ہے ۔اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ:﴿قُلْ أَرَءَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَ أَبْصَارَكُمْ ﴾ [الأنعام٦ :٤٦] (ان سے فرمایئے : ذرا یہ تو بتاؤ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری سماعت اور تمہاری بصارت تم سے چھین لے)اور﴿وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصٰرَ وَالْأَفْئِدَةَ﴾[النحل١٦ :٧٨] (اور اسی نے تم کو کان ، آنکھیں اور دل عطا کئے) میں بھی یہی ترتیب ہے۔پھر یہ بات بھی ہے کہ کان چھ سمتوں (آگے پیچھے ، دائیں بائیں اور اوپر نیچے) سے سنتا ہے اور اس میں اندھیرے یا روشنی کی بھی کوئی قید نہیں جب کہ آنکھ صرف سامنے سے دیکھ سکتی ہے اور سامنے سے دیکھنے میں بھی وہ روشنی اور شعاؤں کی محتاج ہے ۔ اکثر علماءِ کلام آنکھ کی افضلیت کے قائل ہیں ، ان کا کہنا ہے کہ کان تو صرف آوازیں اور باتیں سن سکتا ہے جب کہ آنکھ اجسام ، الوان اور اشکال سب کو دیکھتی ہے ۔ تو جب آنکھ کا تعلق نسبتاً زیادہ چیزوں سے ہے تو وہی افضل ہوئی ۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ آنکھ کے بھی چھ سمتوں سے دیکھنے کا امکان موجود ہے۔

آٹھویں بحث : ''سمع'' کو مفرد اور ''أبصار'' کو جمع لانے کی وجہ

اگر کوئی سوال کرے کہ اس آیت کریمہ میں''أبصار'' کو جمع اور''سمع'' کو مفرد کیوں لایا گیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ''سمع'' مصدر ہے اور مصدر میں قلت اور کثرت دونوں معانی پائے جاتے ہیں چناں چہ کہا جاتا ہے: ''سمعتُ الشیئَ أسمعُهُ سَمْعاً وسَماعاً''۔ اس طرح ''سمع'' ''سمعت'' کا مصدر بھی ہے اور ایک عضو کا نام بھی جس سے سنا جاتا ہے اور اس کے لیے لفظ وہی مصدر والا استعمال ہوا ہے۔ اس کے مفرد لانے کی دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ جب''سمع'' کی اضافت جمع کی طرف کی گئی (یعنی'' سمعهم ''کہا گیا) تو معلوم ہوگیا کہ اس سے مراد کئی لوگوں کے کان ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

بها جِيَفُ الحَسْرَى فأما عِظامُها فبيضٌ وأما جلدها فصَلِيب[1]

اس دور دراز مشکل گزار راستہ میں تھکے ہارے اونٹوں کے مردہ جسم پڑے ہیں جن کا گوشت پرندوں نے نوچ لیا ہے جس سے ان کی سفید ہڈیاں نظر آرہی ہیں اور ان کے چمڑے دھوپ کی شدت کی وجہ سے خشک اور سخت ہوچکے ہیں۔

یہاں شاعر نے بھی لفظ''جلدها'' مفرد استعمال کیا ہے جب کہ اس کی مراد جمع ہے کیوں کہ یہ بات تو واضح ہے کہ بہت سے اونٹوں کی ایک جلد نہیں ہوسکتی ۔ اسی طرح ایک اور شاعر نے کہا ہے :

۱۔ یہ شعر علقمہ بن عبدہ کا ہے ۔ کتاب سیبویہ ا: ۱۰۷، الشنتمری :شرح الشواهد ا: ۱۰۷

لا تُنكِرِ القتلَ وقد سُبينَا في حَلْقِكُمْ عَظْمٌ و قد شجينا(۱)

اب اس قتل سے تعجب نہ کر، ہم بھی قیدی رہ چکے ہیں، اب تمہارے حلق میں ہڈی پھنسی ہے ہم بھی تو دکھ اٹھا چکے ہیں۔

یہاں بھی ''حلقکم'' مفرد ذکر کر کے مراد جمع ''حلوقکم'' لی گئی ہے۔ ایک اور شاعر کا قول ہے:

كأنّه وجهُ تُرْكِيَّيْنِ قد غضبا مستهدَفٌ لطعان غير تذبيب(۲)

گویا کہ وہ دو ترکیوں کا چہرہ ہے جو غصے میں ہیں، اسے اس طرح نشانہ بنایا گیا ہے کہ اس کا دفاع بھی ممکن نہیں۔

یہاں ''وجه تُرْكِيَّيْنِ'' مفرد کہہ کر مراد تثنیہ ''وجهين'' لیا ہے کیوں کہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ دو بندوں کا ایک چہرہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح کی اور مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ بعض قراءات میں اسے ''وَعَلَى أَسْمَاعِهِمْ'' بھی پڑھا گیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد ''وَعَلَى مَوَاضِعِ سَمْعِهِمْ'' (ان کے سننے کی جگہوں پر مہریں لگادی گئیں) ہو اور مضاف کو حذف کر کے مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام کر دیا گیا ہو کیوں کہ مہر قوت سماعت پر نہیں لگائی جاسکتی سننے کی جگہ پر ہی لگ سکتی ہے۔ ایک احتمال یہ بھی ہے کہ ''سَمْعِهِمْ'' (سننے) سے مراد ''اسْتِمَاعِهِمْ'' (خوب غور سے سننا) ہو جیسے کہ کہا جاتا ہے: ''سَمْعُکَ حَدِيثِي يُعجِبُنِي'' (تم میری بات سنتے ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے) اس سے اصل مراد صرف سننا نہیں بلکہ ''اسْتِمَاعُکَ إلى حَدِيثِي يُعجِبُنِي'' (تم میری بات غور سے سنتے ہو تو مجھے اچھا لگتا ہے) ہے۔ اسی معنی میں ذوالرمہ کا درج ذیل شعر ہے جس میں ایک بیل کا حال بیان کیا ہے جس نے ایک شکاری اور کتوں کی آوازوں کو سنا تو اسی کی طرف متوجہ ہو گیا، چناں چہ وہ کہتا ہے:

وقد تَوَجَّسَ رِكْزاً مُقْفِرٌ نَدُسٌ بِنَبْأَةِ الصوتِ ما في سَمعِه كَذِبُ (۳)

کم بالوں والے ہوشیار بیل نے ایک ہلکی آواز سنی اور اس پر کان لگادیئے۔ اور جو کچھ اس نے سنا اس میں کچھ جھوٹ نہ تھا۔

مطلب یہ کہ اس نے جو کچھ سنا سچ سنا اس کے سننے میں کوئی جھوٹ نہیں کیوں کہ یہاں بھی ''ما في سَمعه'' سے مراد ''مافي استماعه'' (خوب غور سے سننا) ہے، ''ندس'' ماہر کو کہتے ہیں، ''نباة'' اور ''رِكزٌ''

۱۔ یہ شعر مسیّب بن زید الغنوی کا ہے۔ کتاب سیبویہ ۱: ۱۰۷

۲۔ ابن منظور نے اسے لسان العرب (طعن) میں ذکر کیا ہے مگر کسی شاعر کی طرف منسوب نہیں کیا۔

۳۔ جمهرة اشعار العرب ص ۱۸۳، لسان العرب (نبأ)

دونوں کامعنی ہلکی سی آواز ہے۔لفظ ''سَمعٌ'' کو اگر سین کے کسرہ اور میم کے سکون کے ساتھ ''سِمْعٌ'' کہا جائے تو اس کا معنی انسان کی اچھی شہرت ہے، جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''ذَهَبَ سِمْعُهُ في الناس'' یعنی لوگوں میں اس کا ذکر عام ہے۔ اس کے علاوہ ''سِمْعٌ'' بھیڑیئے کے اس بچے کو بھی کہتے ہیں جو بجو سے پیدا ہوا ہو۔ یہاں وقف ﴿وَعَلٰی سَمْعِهِمْ﴾ پر ہے اور ﴿غِشَاوَةٌ﴾ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے جس کی خبر اس سے پہلے والا جملہ ﴿وَعَلٰی أَبْصَارِهِمْ﴾ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿قُلُوْبِهِمْ﴾ میں ''هُمْ'' اور اس کے معطوفات کی ضمیریں ان کفار قریش کی طرف راجع ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ایسے منافقین کی طرف راجع ہیں جو اللہ کے علم کے مطابق ایمان لانے والے نہیں تھے۔ بعض کہتے ہیں یہود کی طرف راجع ہیں اور بعض کے نزدیک ان سب میں سے ایسے لوگوں کی طرف جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ایمان لانے والے نہ تھے اور یہی زیادہ صحیح ہے کیوں کہ اس میں سب شامل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی گئی اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔ ''غِشاءٌ'' پردے کو کہتے ہیں جس کی تحقیق درج ذیل ہے:

نویں بحث: ''غِشَاوَةٌ'' کی لغوی تحقیق

اسی سے ''غاشِيةُ السرج'' (زین کے اوپر کا پردہ) ماخوذ ہے اور اسی طرح کہا جاتا ہے: ''غَشِيتُ الشيئ أغشيه'' (میں نے چیز کو ڈھانپ لیا، میں اسے ڈھانپتا ہوں)۔ اسی معنی میں نابغہ کہتا ہے:

هلّا سألتَ بني ذُبيان ما حَسبِي إذاالدُّخانُ تَغَشَّى الأشمَطَ البَرَمَا[1]

کیا تو نے بنو ذبیان سے اس وقت میرا حسب نہیں پوچھا جب ادھیڑ عمر مفت خورے کو دھوئیں نے ڈھانپا ہوا تھا۔

ایک اور شاعر کا قول ہے:

صحبتُكَ إذ عيني عليها غشاوةٌ فلما انجلَتْ قطَّعتُ نفسي ألُومُها[2]

میں نے تمہیں اس وقت اپنا ساتھی بنالیا جب میری آنکھ پر پردہ تھا، جب یہ پردہ دور ہوگیا تو میں نے آپ کو کوس کوس کر دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر لیے۔

۱۔ جامع البیان ۱: ۸۹

۲۔ شاعر کا نام حارث بن خالد المخزومی ہے۔ لسان العرب (غشا)

ابن کیسان کہتے ہیں :''غِشاوَۃٌ'' کی جمع بغیر ہاء کے ''غِشاءٌ'' ہے اور فراء کہتے ہیں یہ ''غِشاوَی'' بروزن ''أَدَاوَی'' ہے۔ اسے ''جَعَلَ'' مقدرہ کا مفعول بنا کر نصب کے ساتھ ''غِشاوَۃً'' بھی پڑھا گیا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''عَلَفْتُهَاتِبْناً وَماءً بارداً'' (میں نے اسے گھاس اور ٹھنڈا پانی کھلایا) یہاں بھی دراصل ''ماءً بارداً'' (ٹھنڈا پانی) سے پہلے فعل ''وَسقیتُها'' (اور میں نے اس کو پلایا) محذوف ہے۔اسی طرح شاعر کا قول ہے :

یا لیتَ زوجَكَ قدغدا   متقلِّداً سیفاً و رُمْحا[1]

کاش کہ تیرا شوہر صبح صبح تلوار اور نیزہ لٹکا کر نکلتا

اس میں ''متقلداسیفا'' کے بعد ''رُمحاً'' سے پہلے ''حاملاً'' محذوف ہے کیوں کہ نیزہ لٹکایانہیں جاتا اٹھایا جاتا ہے۔ ابوعلی الفارسی کہتے ہیں :عام کلام میں یہ استعمال تقریبا ناپید ہے اس لیے یہاں رفع والی قراءت ہی بہتر ہے ۔ اس صورت میں واؤ ایک جملے کے دوسرے پر عطف کے لیے ہوگی ۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں نے ''غِشاوَۃٌ'' مصدر سے واؤ والا فعل (غَشایغشو) کبھی نہیں سنا۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت میں پردہ کا ذکر کان اور آنکھ دونوں کے لیے آیا ہے اوراس صورت میں وقف ''عَلٰی قُلُوبِهِمْ '' پر ہوگا۔ بعض کا خیال ہے کہ ان سب پر مہر ہی کا ذکر ہے اور ''ختم'' کے بعد ''غِشاوۃٌ'' کا لفظ بھی اسی مہر کے لیے استعمال ہوا ہے ۔ اس صورت میں وقف ''غِشَاوَۃٌ'' پر ہوگا ۔حسن بصری نے اسے غین کے ضمہ کے ساتھ ''غُشَاوَۃٌ'' اورابوحیوہ نے فتحہ کے ساتھ ''غَشَاوَۃٌ'' پڑھا ہے۔ ابوعمرو سے ''غِشْوَۃٌ'' منقول ہے ، انہوں نے اسے اصل مصدر کے مطابق پڑھا ہے۔ ابن کیسان کہتے ہیں: یہاں ''غَشْوَۃٌ'' اور ''غُشْوَۃٌ'' فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھنا جائز ہے مگر سب سے بہتر ''غِشَاوَۃٌ'' ہی ہے اور اہل عرب کے ہاں ہر اس چیز کے لیے جو کسی چیز کا احاطہ کرے یا اسے ڈھانپ لے یہی وزن استعمال ہوتا ہے جیسے: ''عِمامۃٌ'' (پگڑی) ''کِنانۃٌ'' (ترکش) ''قِلادۃٌ'' (ہار) اور ''عِصَابَۃٌ'' (گروہ ، پٹی ، پگڑی وغیرہ)۔

دسویں بحث : عذاب کی حقیقت

ارشادِباری تعالیٰ: ﴿وَلَهُمْ﴾ (اور ان کے لیے) یعنی کفار کے لیے جو جھٹلاتے ہیں ﴿عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ (بڑاعذاب ہے) یہاں ''عَظِیمٌ'' ''عَذَابٌ'' کی صفت ہے ۔اور عذاب ایسے عمل کو کہتے ہیں جس سے انسان کو تکلیف ہو جیسے کوڑے مارنا ، آگ سے جلانا اور لوہے سے کاٹنا وغیرہ۔ قرآن مجید میں ہے :﴿وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾[النور ۲۴ : ۲] (اوران دونوں کو سزا دیتے وقت مومنین کا ایک گروہ حاضر ہو) اور ''عذاب''

۱۔ یہ شعر عبداللہ بن الزبعری کی طرف منسوب ہے ۔ الکامل ۲۸۹، ۳۲۴، اورلسان العرب (قلد) میں غیر منسوب مذکور ہے۔

کا لفظی معنی روکنا اور بند کرنا ہے چناں چہ کہا جاتا ہے: ''اعذبه عن كذا اي أحبسه وامنعه'' (میں اسے فلاں چیز سے روکتا ہوں)۔اسی وجہ سے پانی کی مٹھاس کو''عذوبة الماء'' کہتے ہیں کیوں کہ اسے صاف شفاف کرنے کے لیے برتن میں بند کردیا جاتا ہے۔ اگر اس میں پہلے سے کوئی کدورت وغیرہ ہو تو وہ اس سے الگ ہوجاتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ''اعذِبُوانساء کُمْ عنِ الخروج'' (اپنی عورتوں کو نکلنے سے روک کر رکھو)۔آپ نے ایک جنگ پر اپنا لشکر روانہ کرتے ہوئے فرمایا: ''اعذبوا عن ذكر النساءِ أنفسكم فإن ذلك يكسر كم عن الغزو'' (اپنے آپ کو عورتوں کی یاد سے روکو کیوں کہ اس سے تم جنگ میں سست ہوجاؤ گے)۔ جس چیز سے بھی کسی کو روکا جائے اس کے لیے عربی میں لفظ ''عذاب'' ہی استعمال ہوتا ہے، مشہور مثال ہے: ''لألجمنّک لجاماً مُعَذِّباً'' (میں تمہیں ایسی لگام ڈالوں گا جو تمہیں لوگوں کے سامنے سرکش ہونے سے روک دے گی)۔ فعل ''أَعْذَبَ'' لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی چناں چہ ''أَعْذَبَ'' بمعنی رکنا اور روکنا دونوں طرح آتا ہے۔ عذاب کو سزا کے معنی میں بھی اسی لیے استعمال کیا جاتا ہے کہ وہ اس شخص کے جسم سے جسے سزا دی جارہی ہے اس کے مناسب اشیاء کو روک لیا جاتا ہے اور جو مناسب نہیں ہوتیں انہیں اس پر ڈال دیا جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور روز آخرت پر حالاں کہ وہ ایمان والے نہیں۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر سات مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث: ﴿النَّاس﴾ سے کون لوگ مراد ہیں؟

ابن جریج نے مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ سورۂ بقرہ کی چار آیات مومنین کے بارے میں نازل ہوئیں، دو کفار کے بارے میں اور تیرہ آیات منافقین کے بارے میں اتریں۔ اسباط [1] نے سدی سے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ﴾ کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اس سے مراد منافقین ہیں۔ علماءِ صوفیہ کہتے ہیں کہ ''النّاس'' اسم جنس ہے اور اسم جنس بول کر اولیاء کو خطاب نہیں کیا جاتا۔

۱۔ ابو یوسف یا ابو نصر اسباط بن نصر الہمدانی الکوفی اسماعیل بن عبدالرحمٰن سدی وغیرہ سے روایات نقل کرتے ہیں۔ ائمہ رجال امام ابوحاتم امام نسائی وغیرہ نے انہیں ضعیف جب کہ یحییٰ بن معین نے ثقہ کہا ہے۔تہذیب الکمال: تعارف نمبر ۳۴۸

دوسری بحث: ﴿النَّاس﴾ کی لغوی تحقیق

لفظ'' النَّاس '' کے بارے میں علماءِ نحو کی مختلف آراء ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم جمع ہے جو کہ انسان اور انسانة کی خلاف لفظ جمع ہے اوراس کی تصغیر'' نُوَیسٌ '' آتی ہے۔ اس طرح '' ناس '' نوس '' سے ماخوذ ہے اور اس کا معنی حرکت کرنا ہے۔ اسی معنی میں یہ حدیث ام زرع :

[۳۲۹] أَنَاسَ مِن حُلِيٍّ أُذُنَيَّ۔ اس نے میرے کان کے زیورات سے پکڑ کر ہلایا۔

میں بھی استعمال ہوا ہے ۔ ایک رائے یہ ہے کہ'' ناس '' اصل میں'' نَسِیَ'' سے ماخوذ ہے تقلیبات کے صرفی قانون سے اس کو پلٹا تو ''نَیسَ'' ہوگیا۔ اب یاء چوں کہ متحرک اور اس کا ماقبل مفتوح تھا اس لیے اسے الف سے بدل دیا گیا تو ''ناس'' ہوگیا پھر اس پر الف لام داخل کرکے'' الناس '' کہا گیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''نسِيَ آدَمُ عهدَ الله فسُمِّيَ انساناً'' (آدم علیہ السلام اللہ سے کیے ہوئے وعدہ کو بھول گئے تو انہیں انسان کہا جانے لگا)۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

[۳۳۰] نسي آدم فنسِيَتْ ذُرِّيَّتُه۔ آدم علیہ السلام بھول گئے تو ان کی اولاد بھی بھولنے لگی۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے : ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلٰى آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ﴾[طه۲۰ : ۱۱۵](اور ہم نے آدم علیہ السلام کو اس سے پہلے ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گئے)جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔ اس سے ثابت ہوا کہ لفظ''إنسان'' میں ہمزہ زائدہ ہے۔جیسا کہ شاعر نے بھی کہا ہے:

---

[۳۲۹] یہ ایک طویل صحیح حدیث کا حصہ ہے جوکہ حدیث ام زرع کے نام سے مشہور ہے ۔صحیح بخاری: كتاب النكاح ، باب حسن المعاشرة مع الأهل ۱۹۸۸:۵، صحیح ابن حبان : كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۲۵:۱۶،صحیح مسلم :كتاب فضائل الصحابة باب ذكر حديث أم زرع ۱۸۹۶:۴،مسندأبویعلی: مسند عائشة رضى الله عنها۸:۱۵۴،سنن نسائی: كتاب عشرة النساء ، باب شكر المرأة لزوجها......طبرانی: المعجم الكبير ،كتاب ذكر أزواج رسول الله صلى الله عليه وسلم۲۳: ۲۶۵، ۲۷۱،شمائل ترمذی : ۲۵۱ ۔بروایت ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا۔

[۳۳۰] یہ ایک طویل حدیث کا حصہ ہے سنن ترمذی : كتاب تفسير القرآن ،باب ومن سورة الأعراف ۲۶۷:۵،مسندأبویعلی: مسند أبي هريره رضى الله عنه ۸:۱۲، بروایت الأعرج عن أبي ہریرۃ رضی اللہ عنہ ۲۶۳:۱۱، مستدرک حاکم :كتاب تواريخ المتقدمين من الأنبياء والمرسلين ،باب ذكر نبى الله داود صاحب الزبور عليه السلام ۲:۶۴۰،كتاب التفسير ، تفسير سورة الأعراف ۲:۳۵۴۔بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نقل کرکے امام مسلمؒ کی شرط کے مطابق صحیح کہا ہے اور ذہبی نے بھی ان کی تائید کی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ہشام بن سعد کی وجہ سے حسن کے درجہ کی ہے کیوں کہ وہ صدوق ہیں۔

لا تَنْسَيَنَّ تِلكَ العُهودَ فإنَّما سُمِّيتَ إنساناً لأنَّك ناسِي

ان وعدوں کو ہرگز نہ بھول جانا۔ کیوں کہ تیرا نام انسان رکھا ہی اس لیے گیا کہ تو بھولنے والا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے :

فإنْ نَسِيتُ عُهودا منك سالفةً فاغفِرْ فأوّلُ ناسٍ أوّلُ الناس

میں اگر تجھ سے کئے گئے سابقہ وعدے بھول جاؤں تو مجھے معاف کرنا کیوں کہ سب سے پہلے بھولنے والا سب سے پہلا انسان تھا

ایک رائے یہ ہے کہ اسے انسان اس لیے کہا گیا کہ آدم علیہ السلام کو حضرت حواء کے ساتھ انس تھا۔ بعض اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اپنے رب کے ساتھ انس تھا۔اس لحاظ سے ''إنسان'' کا ہمزہ اصلی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے :

وما سُمِّيَ الإنسانُ إلّا لأُنْسِهِ و لَاالْقلبُ إلّا أنه يَتَقَلَّبُ

انسان کا نام صرف اس لیے انسان رکھا گیا کہ یہ انس رکھنے والا ہے ، اور دل کو قلب اس کہا گیا کہ وہ الٹ پلٹ ہوتا رہتا ہے۔

تیسری بحث: زبانی ایمان کی حقیقت اور فرقہ کرامیہ

جب اللہ تعالیٰ نے مومنین کی فضیلت اور ان کے شرف کے اظہار کے طور پر انہیں سب سے پہلے ذکر فرمایا تو ان کے متصل بعدان کے مدمقابل گروہ کفار کا ذکر فرما دیا کیوں کہ ایمان اور کفر دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ پھر ان کے بعد منافقین کا حال بیان فرما کر انہیں کفار کے ساتھ ملایا کیوں کہ خود باری تعالیٰ نے ان کے ایمان کی نفی فرمائی ۔ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:﴿وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ﴾ [البقرة ۲:۸] (وہ مومن نہیں ہیں)۔ اس ارشاد میں فرقہ کرّامیہ کا رد بھی ہے [۱]۔جو یہ کہتے ہیں کہ ایمان زبان سے اقرار کرنے کا نام ہے اگر چہ دل سے اس کی تصدیق نہ ہو اور دلیل کے طور پر ارشادِ باری تعالیٰ:﴿فَأَثَابَهُمُ اللَّهُ بِمَا قَالُوا﴾ [المائدة۵:۸۵](تو اللہ تعالیٰ اس قول کے بدلے میں انہیں......دے گا) پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ﴿ بِمَا قَالُوا﴾(اس کے

۱۔ یہ لوگ ابوعبد اللہ محمد بن کرّام جستانی کے پیروکار ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک جسم ہے اور اس پر حوادث کا اثر ہوتا ہے ۔یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات کے سمت اور مکان ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے کئی فرقے ہیں جن میں سے طرائقہ ، إسحاقیہ اور ھیصمیہ زیادہ مشہور ہیں۔ رازی : اعتقادات فرق المسلمین والمشرکین ص ۱۰۱

بدلے جو انہوں نے کہا) فرمایا ہے "بِمَا قَالُوا وَبِمَا أَضمَرُوا" (جو کہا اور جس کا اعتقاد دل میں رکھا) نہیں فرمایا۔ وہ درج ذیل حدیث شریف کو بھی اپنی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں:

[۳۳۱] أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله فإذا قالوها عَصَمُوا منّي دِمائهم وَأموالهم۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں یہاں تک کہ وہ لا اِلٰہ اِلَّا اللہ کہہ دیں، جب وہ یہ کہہ دیں تو ان کے خون اور ان کے اموال مجھ سے بچ جائیں گے۔

مگر یہ سب ان کی کم علمی، ہٹ دھرمی اور قرآن وسنت کی اصل تعلیمات میں غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ ان تعلیمات نے ایمان کے لیے نہ صرف یہ کہ قول اور دل کی تصدیق دونوں کو ضروری قرار دیا ہے بلکہ ان کے ساتھ عمل کا ذکر بھی کیا ہے جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

[۳۳۲] الإيمانُ معرفةٌ بالقلب و قولٌ باللسان و عملٌ بالأركان۔

ایمان دل سے پہچاننے، زبان سے بولنے اور ارکان پر عمل کرنے کا نام ہے۔ اسے امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں نقل کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جو عقیدہ محمد بن کرّام سجستانی اور اس کے پیروکاروں نے اختیار کیا ہے وہ سراسر منافقت اور حق کی مخالفت ہے، ہم اس رسوائی اور بد اعتقادی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

---

[۳۳۱] صحیح بخاری: کتاب الإيمان، باب ﴿فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ﴾ ۱: ۱۷، صحیح مسلم: کتاب الإيمان، باب الأمر بقتال الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله ۱: ۵۱۔ مشہور محدثین نے اپنی تصنیفات میں ایک سو تیس سے زائد مقامات پر اس حدیث کو مختلف الفاظ اور مختلف طرق کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس کے طرق پر ایک تجزیہ جامع کبیر ۱: ۱۳۶۸ میں نمبر ۲۳۰/۴۴۰۹ کے تحت موجود ہے۔

[۳۳۲] سنن ابن ماجہ: کتاب المقدمة ۱: ۲۵، شعب الإيمان: ذكر الحديث الذي ورد في شعب الإيمان، باب الدليل على أن الطاعات كلها إيمان ۱: ۴۷، صحیح ابن حبان: كتاب الإيمان، باب فرض الإيمان ۱: ۴۴۰ میں بروایت حضرت معاذ رضی اللہ عنہ ایک حدیث میں یہی تینوں لوازم ایمان کی بجائے عبادت کے لیے مذکور ہیں۔ ایمان والی یہ روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے مگر اس کے ایک راوی عبد السلام بن صالح الہروی متکلم فیہ ہیں۔ علامہ ابن الجوزی نے اسے اپنی موضوعات ۱: ۱۲۸-۱۲۹ میں نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد نہیں فرمائی، دارقطنی کہتے ہیں اس حدیث کی سند میں الزام ابوصلت الہروی پر ہے، یہی بات حافظ ذہبی نے میزان ۲: ۶۱۶ میں نقل کی ہے، کتاب المجروحین: تعارف علی بن موسیٰ رضا ۲: ۱۰۶ میں ابوصلت کی اس روایت کو ناقابل اعتماد شمار کیا گیا ہے، الكامل في الضعفاء، باب ماسرق العدوی من الحديث وألزقه على قوم آخرين ۳: ۱۹۸ میں بھی اس روایت پر اسی طرح جرح کی گئی ہے۔ علماء کی ایک کثیر تعداد کے نزدیک اعمال کی الگ اہمیت اور الگ حیثیت ہے ایمان ان کے ساتھ مشروط نہیں۔ (مترجم)

چوتھی بحث: ایمان اور کفر کا دارومدار خاتمہ پر ہے

مومنین کی دو قسمیں

ہمارے علماءِ کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ مومنین کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ مومن ہیں جس سے اللہ تعالیٰ محبت کرتے ہیں اور اسے دوست رکھتے ہیں ، دوسرے وہ مومن ہے جسے نہ تو اللہ تعالیٰ دوست رکھتے ہیں اور نہ اس سے محبت کرتے ہیں بلکہ اس سے ناراض رہتے ہیں اور اسے اپنے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کے علم میں آخر تک ایمان پر قائم رہنے والا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت بھی کرتے ہیں اور اسے دوست بھی رکھتے ہیں اور اس سے راضی بھی رہتے ہیں۔ اور جس کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق کفر پر ہونے والا ہے اللہ تعالیٰ کا اس پر غضب ہوتا ہے ، وہ اس سے ناراض بھی ہوتے ہیں اور اسے یقیناً اپنے دشمنوں میں بھی شمار کرتے ہیں۔ یہ معاملہ اس کے ایمان کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کے اس کفر وگمراہی کی وجہ سے ہوتا ہے جس پر اس کا خاتمہ ہوگا۔

کفار کی دو قسمیں

کافروں کی بھی دو قسمیں ہیں : ایک وہ کافر ہے جس کو یقیناً سزا ہوگی اور دوسرا وہ ہے جسے سزا نہیں ہوگی۔ وہ کافر جسے سزا ہوگی وہی ہے جس کا خاتمہ کفر پر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض بھی رہتے ہیں اور اسے اپنے دشمنوں میں بھی شمار کرتے ہیں ۔اور جس کو سزا نہیں ہوگی وہ ایسا کافر ہے جس کا خاتمہ ایمان پر ہوگا ، اللہ تعالیٰ نہ اس سے ناراض رہتے ہیں نہ اسے اپنے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں بلکہ اس سے محبت کرتے ہیں اور دوستی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ سلوک اس کے سابقہ کفر کی وجہ سے نہیں ہوگا بلکہ اس ایمان کی وجہ سے ہوگا جس پر اس کا خاتمہ ہوگا۔ اس لیے کسی شخص کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔ اس مسئلہ کی مزید تفصیل درج ذیل ہے :

پانچویں بحث: جزاء سزاء کا فیصلہ

اہل سنت کا موقف

یہ بات علی الإطلاق نہیں کہہ دینی چاہیے کہ ہر مومن ثواب کا مستحق ہے اور ہر کافر سزا کا بلکہ اس کے ساتھ خاتمہ کی شرط لگانا ضروری ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جب بتوں کی پوجا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ ان سے اس وقت بھی نہ صرف یہ کہ راضی تھے بلکہ انہوں نے ان کو ثواب عطا فرمانے اور جنت میں داخل کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ یہ فیصلہ ان کے بت پوجنے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ایمان کی وجہ سے تھا جس پر ان کا خاتمہ ہونے والا تھا۔

فرقہ قدریہ کا موقف اور اس کارد

فرقہ قدریہ والے اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نہ تو ابلیس سے اس وقت ناراض تھے جب وہ ان کی عبادت کیا کرتا تھااور نہ ہی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے اس وقت راضی تھے جب وہ بتوں کو پوجتے تھے ۔ان کا یہ موقف غلط ہے کیوں کہ یہ بات ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ ازل سے جانتے تھے کہ ابلیس ملعون کا خاتمہ کیسا ہونے والا ہے اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی وفات کس حال میں ہونے والی ہے۔ اسی بنا پر یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت بھی ابلیس سے اس کی عبادت کے وقت بھی ناراض تھے اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کوان کی بت پرستی کے وقت بھی محبوب رکھتے تھے۔ امت کااس بات پر اجماع بھی اسی کی تائید کرتاہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق جہنمی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں محبوب نہیں رکھتے بلکہ ان سے ناراض رہتے ہیں اور جو لوگ ان کے علم کے مطابق جنتی ہیں وہ ان کو محبوب رکھتے ہیں ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے :

[۳۳۳] وَإِنَّمَا الأعمال بالخواتیم۔

بے شک اعمال کا دارومدار ان کے خاتمہ پر ہے۔

صوفیہ کا موقف

اسی بناء پر علماءِ صوفیہ کہتے ہیں کہ ایمان اس قول وفعل کا نام نہیں جس سے بندہ اپنے آپ کو زینت بخشتا ہے بلکہ ایمان تو ازل سے سعادت مندی کا کسی کے نصیب میں آجاناہے۔ باقی رہااس کاانسانی اجسام واشکال پر ظاہر ہونا تو یہ حقیقی بھی ہوسکتا ہے اور عارضی بھی ۔

---

[۳۳۳] صحیح بخاری:کتاب القدر، باب العمل بالخَواتیم۶:۲۴۳۶، جامع ترمذی :کتاب القدر ، باب ماجاء أن الأعمال بالخواتیم(عنوان باب) ۴: ۴۴۶، صحیح ابن حبان:کتاب البرّ والإحسان ،باب ماجاء في الطاعات وثوابها۲:۵۲،۲:۵۱،مسندامام احمدؒ: حدیث ابي مالک سهل بن سعد الساعدي رضی الله عنه ۶:۵۵۸،سنن ابن ماجہ : کتاب الزهد،باب التوقي على العمل ۲:۱۴۰۴میں حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ سے اسی مفہوم کی حدیث :''إنماالأعمال كالوعاء ،إذاطاب أسفله طاب أعلاه ، وإذافسدأسفله فسد أعلاه''منقول ہے ،یعنی اعمال ایک برتن کی طرح ہیں ۔جب اس کانچلا حصہ صحیح ہوتواوپرکاحصہ بھی صحیح ہوتاہے اور اگر نیچے کا حصہ خراب ہوجائے تو اوپر کا حصہ بھی خراب قرار پاتاہے۔ البانی نے صحیح ابن ماجه میں اسے صحیح کہا ہے،مسند ابویعلیٰ:حدیث میمونة زوج النبی صلی الله علیه وسلم ۱۳:۲۹۰میں اور صحیح ابن حبان میں بھی دوسری روایت حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے''إنماالأعمال بخواتیمها'' کے ساتھ منقول ہے جس کے الفاظ امام ابن ماجہؒ کے الفاظ سے ملتے جلتے ہیں۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں اس کی تائید حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں اور دیگر محدثین نے بھی حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو سچے ہیں اورلوگ بھی ان کی سچائی کے گواہ ہیں:

[۳۳۴] إن أحدَكم يُجمع خَلقُه في بطن أمّه أربعين يوماً ثم يكون في ذلك عَلَقَة مثل ذلك ، ثم يكون في ذلك مُضغَة مثلَ ذلك، ثم يُرسِل الله المَلَك فيَنفُخُ فيه الرُّوحَ و يؤمَر بأربع كلمات بِكَتْبِ رزقه و أجله و عَمَله و شَقِيٌّ أو سعيد۔ فوالذي لا إله غيره إنَّ أحدَكم ليَعملُ بعملِ أهل الجنة حتى ما يكون بينه و بينها إلا ذراعٌ فيَسبِقُ عليه الكتابُ فيعمل بعمل أهل النار فيدخُلُها ۔وإن أحدَكم ليَعملُ بعمل أهل النارحتى ما يكون بينه و بينها إلا ذِراعٌ فيَسبُق عليه الكتابُ فيعمل بعمل أهل الجنة فيدخلها۔

انسان اپنی پیدائش کے ابتدائی مرحلہ میں ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک (نطفے کی صورت میں) رکھا جاتا ہے، پھر وہیں اسے جمے ہوئے خون کی طرح کردیا جاتا ہے اور چالیس دن اسی طرح رہتا ہے، پھر وہ گوشت کا ایک لوتھڑا بن جاتا ہے اور وہیں چالیس دن اس حال میں رہتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتے ہیں جو اس میں روح پھونکتا ہے ۔ پھر اسے چار چیزیں لکھنے کا حکم دیا جاتا ہے: اس کا رزق ، اس کی موت کا وقت، اس کا عمل اور یہ بات کہ وہ بدبخت ہوگا یا خوش بخت۔ اب اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں، تم میں سے کوئی شخص اہل جنت والے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور یہاں اس پر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے اور وہ اہل جہنم والے اعمال کرنے لگتا ہے اورجہنم میں چلا جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی شخص اہل جہنم والے عمل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کے اور جہنم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے اور یہاں

---

[۳۳۴] صحیح بخاری :كتاب بدأ الخلق، باب ذكر الملائكة وقال أنس :قال عبدالله بن سلام۳:۴ :۱۱۷۴، صحیح مسلم : كتاب القدر،باب كيفية خلق الآدمي في بطن أمه وكتابة رزقه ۴: ۲۰۳۶، جامع ترمذی :كتاب القدر،باب ماجاء في أن الأعمال بالخواتيم ۴:۲۴۴۶، مسندامام احمدؒ:مسند عبدالله بن مسعود رضى الله عنه۱:۶۳۲،۴۰۹، سنن بیہقی:كتاب الدعوى والبينات، باب مايستدل به على أن الولد الواحدلايكون مخلوقامن ماء رجلين۱۵:۴۲۱

اس پر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے اور وہ اہل جنت والے اعمال کرنے لگتا ہے اور اس میں داخل ہوجاتا ہے۔

چھٹی بحث: مومن کی پہچان

اگر کسی کو اشکال ہو کہ امام ابو محمد الحافظ عبد الغنی بن سعید المصری نے محمد بن سعید شامی سے جنہیں زندقہ کے الزام کی وجہ سے سولی چڑھایا گیا تھا اور جنہیں محمد بن ابوقیس بھی کہا جاتا ہے[1]۔ ان سے، انہوں نے سلیمان بن موسیٰ اشدق سے، انہوں نے مجاہد بن جبر سے، مجاہد نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ہم سے ابو رزین العقیلی رضی اللہ عنہ نے بیان کیا، وہ فرماتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے ارشاد فرمایا:

[۳۳۵] لأشربنّ أنا و أنت يا أبا رزين مِن لبنٍ لم يتغيّر طعمُه۔ قال قلت: كيف يحيي اللّٰه الموتى؟ قال:" أما مررتَ بأرض لك مُجْدبة ثم مررت بها مخصبة، ثم مررت بها مجدبة، ثم مررت بها مخصبة"۔ قلت: بلى! قال:" كذلك النشور"۔ قال قلت: كيف لي أن أعلم أني مؤمن؟ قال:" ليس أحد من هذه الأمة۔ قال ابن أبي قيس: أو قال من أمتي۔ عَمِلَ حسنةً و عِلِم أنها حسنةٌ وأن اللّٰه جازيه بها خيراً أو عَمِلَ سيئةً و عِلِمَ أنها سيئةٌ و أنّ اللّٰه جازيه بها شرّاً أو يغفرها إلا مؤمن۔

اے ابو رزین! میں اور تم دونوں یقیناً اس دودھ میں سے پئیں گے جس کا ذائقہ نہیں بدلا ہوگا۔ میں نے عرض کیا حضور! اللہ تعالیٰ مردوں کو کیسے زندہ کریں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم نے اپنی زمین کا کوئی بنجر حصہ ایسا دیکھا ہے کہ وہ کچھ عرصہ کے بعد زرخیز بن گیا ہو، پھر تمہارا گزر وہاں سے ہوا ہو تو وہ دوبارہ بنجر بن چکا ہو، اور یہی بنجر زمین

---

[۳۳۵] مسند امام احمدؒ :حديث أبي رزين العقيلي رضى الله عنه ۴: ۵۸۲۔ اس حدیث کے راوی محمد بن سعید شامی کو حافظ ابن حجر نے کذاب لکھا ہے اور امام احمدؒ بن صالح کہتے ہیں کہ اس نے چار ہزار احادیث اپنے پاس سے گھڑیں۔ تقریب التهذيب ۱: ۴۸۰۔

۱۔ یہ اَبوعبدالرحمٰن یا اَبوعبداللہ محمد بن سعید اسدی شامی ہیں جنہیں سولی چڑھایا گیا تھا۔ ان کو ابن سعید بن عبد العزیز، ابن ابی قیس، ابن ابی حسان، ابن الطبری اور ابوقیس وغیرہ کئی ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے سو نام تبدیل کئے گئے تاکہ بادشاہ سے چھپ رہیں مگر منصور نے پکڑوا کر انہیں زندقہ کی تہمت سے قتل کردیا۔ علماءِ رجال نے اسے کذاب کہا ہے۔ تقریب التهذيب ۱: ۴۸۰، كتاب المجروحين ۲: ۲۴۷، الجرح والتعديل ۷: ۲۶۲

کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ زرخیز ہوگئی ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں ! آپ نے فرمایا: اسی طرح مرنے کے بعد جی اٹھنا بھی ہوگا۔ میں نے پھر عرض کیا: مجھے یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ میں مومن ہوں ؟ آپ نے فرمایا: اس امت کا جو فرد- ابن ابی قیس کہتے ہیں : آپ نے یہ فرمایا، یا یوں فرمایا: میری امت کا جو فرد - نیکی کرے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے نیکی کا اچھابدلہ دیں گے ، یابرائی کرے اور یہ یقین بھی رکھے کہ اللہ تعالیٰ اسے اس برائی کا برابدلہ بھی دیں گے تو یہ کام صرف مومن ہی کرسکتا ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں:اگرچہ اس حدیث کی سند تو قوی نہیں مگر یہ معنی کے لحاظ سے صحیح ہے اورحضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی حدیث سے متعارض بھی نہیں ہے کیوں کہ اس کا دارومدار تو خاتمہ پر ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے : '' **وَإِنَّما الأعمال بالخواتيم** '' (اعمال کا دارومدار خاتمہ پر ہے)۔اور ابو رزین کی حدیث سے صرف یہ معلوم ہوتاہے کہ وہ اس وقت مومن تھے، واللہ اعلم۔

ساتویں بحث : منافق کی وجہ تسمیہ

علماءِ لغت کہتے ہیں کہ منافق کو منافق اس لیے کہاجاتاہے کہ وہ جو کچھ ظاہر کرتا ہے اس کے دل میں اس کے علاوہ کچھ اور ہوتاہے۔ اس لحاظ سے وہ اس چوہے کی طرح ہوتا ہے جس کے بل کو ''نافقاء'' (سرنگ کی طرح) اور ''قاصعاء'' (پیالے جیسا) کہاجاتاہے۔ وہ زمین کو اندر ہی اندر کھودتا رہتا ہے یہاں تک کہ جب اس کی اوپر والی سطح کے بالکل قریب پہنچ جاتاہے اورمٹی کی بالکل باریک سی تہہ باقی رہ جاتی ہے تو اسے اندر سے نرم کرکے اسی طرح چھوڑ دیتا ہے ۔ پھر جب بھی اسے کوئی خطرہ محسوس ہوتا ہے تو اس باریک تہہ کواپنے سر سے دھکیل کر نکل جاتاہے ۔یوں اس کے بل پر بظاہر تومٹی نظر آتی ہے مگر اندر سے سوراخ ہوتا ہے۔ اسی طرح منافق ہوتا ہے جو بظاہر ایمان والالگتاہے مگر اس کے اندر کفر ہوتا ہے۔ اس بات کا کچھ ذکر پہلے بھی ہوچکا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

يُخَٰدِعُونَ ٱللَّهَ وَٱلَّذِينَ ءَامَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّآ أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾

دھوکادینا چاہتے ہیں اللہ کو اور ایمان والوں کو ، حالاں کہ وہ حقیقت میں دھوکا کسی کو بھی نہیں دیتے سوائے اپنی ذات کے اور اس کا احساس بھی نہیں رکھتے۔

ہمارے علماءِ کرام فرماتے ہیں ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے زعم میں اللہ تعالیٰ کو دھوکا دیتے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ان کو دھوکا دینے والا اس لیے کہا گیا کہ ان کا رویہ دھوکا بازوں کا سا ہے۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ یہاں کلام میں کچھ الفاظ محذوف ہیں اور تقدیر عبارت یوں ہے: ''يُخَادِعُوْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ'' (یعنی وہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دیتے ہیں) یہ قول حسن بصری رحمہ اللہ اور بعض دیگر حضرات سے منقول ہے۔ یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دھوکا دینے کو ہی اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا قرار دیا گیا ہے کیوں کہ آپ نے اللہ تعالیٰ کا پیغام ہی ان لوگوں کو پہنچایا۔ اسی طرح اگر وہ مومنین کو دھوکا دیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کو دھوکا دینا ہی شمار ہوگا۔ اور ان کے دھوکے کی کیفیت یہ ہے کہ انہوں نے بظاہر ایمان لانے کا دعویٰ کیا مگر دلوں میں کفر چھپائے رکھا تاکہ ان کی جان اور ان کے مال محفوظ رہیں۔ اور یہ رویہ اپنا کر انہوں نے سمجھا کہ انہوں نے دھوکا دے لیا اور وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ یہ مفسرین کی ایک جماعت کا قول ہے۔

''خداع'' کی لغوی تحقیق

علماءِ لغت کہتے ہیں لفظ ''خدع'' کلامِ عرب میں خراب ہونے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ بات ثعلب نے ابن الأعرابی سے نقل کی ہے اور یہ شعر بھی پیش کیا ہے:

أَبْيَضُ اللَّوْنِ لذيذٌ طعمُه　　　طَيِّبُ الرِّيقِ إذا الرِّيقُ خَدَعُ [1]

سفید رنگ کے دانت ہیں جن کا ذائقہ مزیدار ہے۔ اور ان کا لعاب اس وقت بھی خوش ذائقہ ہوتا ہے جب وہ خراب ہوجائے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں اس معنی کے لحاظ سے یہاں بھی ﴿يُخَادِعُوْنَ اللّٰهَ﴾ سے مراد یہ ہوگا کہ وہ ریا کاری کر کے اپنے رب کے ہاں ایمان اور اعمال کی حیثیت خراب کرلیتے ہیں۔ اس کی تفسیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اسی طرح منقول ہے جیسا کہ آئندہ بیان ہوگا۔ قرآنِ مجید میں ایک اور مقام پر بھی آیا ہے: ﴿يُرَآءُوْنَ النَّاسَ﴾ [النساء۴: ۱۴۲] (وہ لوگوں کو دکھاتے ہیں)۔ ایک رائے یہ ہے کہ ''خدع'' کا اصل معنی چھپانا ہے، اس لیے گھر میں وہ جگہ جہاں خاص طور پر چیزیں حفاظت کے پیشِ نظر چھپا کر رکھی جائیں ''مِخْدَعٌ'' کہلاتی ہے۔ یہ ابن فارس نے نقل کیا ہے۔ اسی سے عرب لوگ کہتے ہیں: ''انخدع الضبُّ في جُحرِہ'' (بجو اپنے بل میں چھپ گیا)۔

---

[1] اس شعر کو سوید بن ابی کاہل نے ایک عورت کے دانتوں کی تعریف میں کہا ہے۔ لسان العرب (خدع)

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ مَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ﴾ میں نفی بھی ہے اور ایجاب بھی، جس سے حصر کا معنی پیدا ہوگیاہے -یعنی ان کے دھوکے کا نتیجہ خود انہیں ہی بھگتنا پڑے گا ۔ جیسا کہ کہا جاتاہے: ''مَن خَدع مَن لایُخدَعُ فإنماخدَعَ نفسَه'' (جو شخص کسی ایسی ہستی کو دھوکا دینے کی کوشش کرے جسے دھوکا نہیں دیاجاسکتا تو وہ صرف اپنے آپ کو ہی دھوکا دیتا ہے)۔ یہ بات ٹھیک ہے کیوں کہ دھوکا اس کو دیا جاسکتا ہے جودلوں کے حال نہ جانتا ہو، اور جو دلوں کے حال جانتا ہے اسے کوئی شخص دھوکا دینے کی کوشش بھی کرے تووہ اس کو کیا دھوکا دے گا اپنے آپ کو ہی دے گا۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین نے اللہ تعالیٰ کی ذات عالی کو پہچانا ہی نہیں ، اگر پہچان لیتے تو انہیں یہ بھی پتہ چل جاتا کہ اسے دھوکا نہیں دیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا درج ذیل ارشادگرامی گزر چکا ہے :

[۳۳۶] لا تخادِعِ اللّٰهَ فإنه مَن يخادِعِ اللّٰه يخدعهُ اللّٰهُ ، و نفسَه يخدع لو يشعر۔ قالو: يا رسول اللّٰه ! و كيف يُخادَعُ اللّٰهُ؟ قال: تعمل ما أمركَ اللّٰه به تطلب به غيره۔

اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش مت کر، جو شخص اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کی سزادیتے ہیں اور وہ شخص بھی اگر اس بات کو سمجھے تو دراصل اپنے آپ کو ہی دھوکا دیتاہے۔ صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ کو دھوکا دینے کی کوشش کیسے کی جاسکتی ہے ؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اس طرح کہ تم کام تووہی کرو جس کا اللہ نے حکم دیا مگر اس سے رضا کسی اور کی مطلوب ہو۔

اللہ کی طرف سے دھوکے کا بدلہ کیسے دیا جاتا ہے اس کی تفصیل ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ کے ضمن میں آئے گی۔ نافع ، ابن کثیراورابوعمرو نے دونوں مقامات پر ﴿يُخَادِعُوْنَ﴾ پڑھا ہے تاکہ دونوں جگہ الفاظ ایک جیسے ہوجائیں ۔ البتہ عاصم ،حمزہ ،کسائی اور ابن عامر نے دوسرے مقام پر ﴿يَخْدَعُوْنَ﴾ ہی پڑھا ہے ۔ اس کا مصدر خاء کے کسرہ کے ساتھ ''خِدْعٌ'' اور ''خَدِيعَة'' آتا ہے ۔یہ ابوزید نے نقل کیا ہے ۔مؤرّق العجلي نے اسے یاء کے ضمہ ، خاء کے فتحہ اورمعنی میں شدت پیدا کرنے کے لیے دال کی شد کے ساتھ ﴿يُخَدِّعُوْنَ اللّٰهَ﴾ پڑھا ہے جبکہ ابو طالوت عبد السلام بن شدّاداورجارود نے اسی دوسرے لفظ کو یاء کے ضمہ ، خاء

[۳۳۶] یہ حدیث علامہ قرطبیؒ نے اپنی تفسیر کے مقدمہ، باب تحذير أهل القرآن والعلم من الرياء وغيره میں امام ابن جریرطبریؒ کی کتاب آداب النفوس کے حوالہ سے نقل کی ہے ۔ اس حدیث کو علامہ سیوطی نے درمنثور ۱: ۳۰ میں نقل کرکے لکھاہے : اسے احمد بن منیع نے ضعیف سند کے ساتھ صحابہ میں سے ایک آدمی سے مرفوعا نقل کیا ہے ۔ حافظ ابن حجرؒ نے المطالب العالية ۳۲۰۲ میں ابن منیع کی طرف منسوب کیا ہے اور اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔

کے سکون اور دال کے فتحہ کے ساتھ ﴿یُخْدَعُوْنَ﴾ پڑھا ہے جس میں حرف جر محذوف ہے اور تقدیر عبارت ''ومَایُخدَعُونَ إلاَّ عَن أنفُسِھِمْ'' ہے۔(یعنی وہ اپنے آپ سے خود ہی دھوکا کھاتے ہیں)جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ:﴿وَاخْتَارَ مُوسٰی قَوْمَهٗ﴾[الأعراف۷:۱۵۵](اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو منتخب کیا) جوکہ دراصل''وَاختَارَ مُوسَیٰ مِنْ قَوْمِہٖ'' ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم میں سے (ستر آدمیوں کا)انتخاب کیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿وَمَا یَشْعُرُوْنَ﴾(اوروہ احساس نہیں رکھتے)سے مراد یہ ہے کہ انہیں اس بات کا ادراک نہیں ہوتا کہ ان کی دھوکا بازی کا وبال لوٹ کر انہی پر آنے والا ہے اوروہ یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم نے دھوکا دے کر اپنا مقصد حاصل کرلیا اور جان بچالی مگر ان کا یہ بھرم صرف دنیا کی زندگی میں باقی رہے گااور آخرت میں انہیں کہا جائے گا :﴿ارْجِعُوا وَرَآءَ کُمْ فَالْتَمِسُوا نُوْرًا﴾ [الحدید۵۷:۱۳](واپس لوٹ جاؤ اور روشنی تلاش کرو)جیسا کہ اس کا بیان اپنے مقام پر آئے گا۔علماءِ لغت کہتے ہیں :لفظ''شعرتُ بالشيئِ'' کا معنی ہے میں نے معاملہ کو بھانپ لیا اسی سے لفظ شاعر نکلا ہے کیوں کہ وہ بھی سمجھ بوجھ رکھتا ہے اور ایسے نئے نئے افکار اس کے ذہن میں آتے ہیں جو عام لوگوں کے ذہن میں نہیں آتے ۔ اسی سے کہا جاتا ہے :''لیتَ شِعرِی'' (کاش کہ مجھے معلوم ہوجاتا)۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ﴿۱۰﴾

ان کے دلوں میں مرض تھا۔اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض زیادہ کردیااور ان کے جھوٹ بولنے کے سبب ان کو دکھ دینے والاعذاب ہوگا ۔

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾مبتداء اور خبر ہیں اور لفظ مرض استعارۃً ان کے عقائد کی خرابی کے لیے استعمال کیا گیا ہے ۔ ان کا یہ مرض یا تو شک اور نفاق پر مبنی ہے یا انکار اور تکذیب پر اور یہاں ارشادباری تعالیٰ کا مفہوم یہ ہے کہ ان کے دل پاکیزگی ،حق کو ماننے کی توفیق ،اس کی طرف توجہ اوراس کی تائید سے خالی ہیں اس وجہ سے بیمار ہیں ۔ ابن فارس لغوی کہتے ہیں : مرض ہر اس عارضہ کو کہتے ہیں جس سے انسان صحت کی حد سے نکل جائے خواہ یہ بیماری کی وجہ سے ہو، نفاق کی وجہ سے ہو یا کسی معاملہ میں کوتاہی کی وجہ سے ۔اس کی قراء ت میں راء کی زبر کے ساتھ ﴿مَرَضٌ﴾ پڑھنے پر سب قراء کا اتفاق ہے ۔صرف ایک روایت اس کے خلاف ہے جسے اصمعی نے ابوعمرو سے نقل کیا ہے ۔ وہ اسے راء کے سکون کے ساتھ ﴿مَرْضٌ﴾ پڑھتے ہیں ۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ﴾(اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض بڑھادیا) میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ ان کے لیے بددعا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کرے ان کو کفر کی سزا ملے جس کی وجہ سے ان کا شک اور نفاق اور بڑھ جائے تاکہ یہ صحیح مسلمانوں کے مقابلے میں کمزور تر ہوتے چلے جائیں اور ان کے خلاف کوئی سازش کرنے کے قابل نہ رہیں۔جیساکہ شاعر نے کہا ہے:

یا مُرسِلَ الرِّیح جَنوباً و صَبَا　　　إذْ غَضِبَتْ زیدٌ فزِدْها غضبا

اے ہواؤں کے جنوباً شمالاً بھیجنے والے، جب بنو زید ناراض ہوں تو ان کے غصے میں اور اضافہ فرما۔

مطلب یہ کہ ان کو اتنا غصہ دے کہ اس کی وجہ سے انہیں اصل بات کا بدلہ لینے کا ہوش ہی نہ رہے۔اس طرح اس آیت کریمہ سے منافقین کے خلاف بددعا کرنے اوران کا پیچھا کرنے کا جواز بھی ملتا ہے کیوں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سب سے بُرے لوگ ہیں۔ آیت کی تفسیر میں ایک رائے یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے دلوں میں بیماری میں اضافہ کی خبر ہے۔ یعنی وہ پہلے تو بیمار تھے ہی، اللہ تعالیٰ نے ان کی بیماری پر اور بیماری دے دی جیساکہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ رِجْسِهِمْ﴾ [التوبة ۹: ۱۲۵] (اس نے ان کی گندگی میں ایک اور گندگی کا اضافہ کردیا)۔

علماءِ معانی کہتے ہیں:﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾(ان کے دلوں میں بیماری ہے) کا مطلب یہ ہے کہ ان کا دنیا میں انہماک، اس سے محبت، آخرت سے غفلت اورعدم توجہی نے جب ان کے دلوں میں بیماری کی شکل اختیار کرلی تو اس پر﴿ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ﴾ فرماکر یہ واضح کردیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کوانہی کے اپنے سپرد کردیااور ان پردنیا کےغم جمع ہونے دیئے جن سے انہیں فراغت ہی نہیں ملتی کہ دین کی طرف توجہ دیں۔

ارشادباری تعالیٰ: ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾ (اور ان کے لیے دکھ دینے والاعذاب ہوگا) کا مطلب یہ ہے کہ ان کے دنیا کے مزے ختم ہوجائیں گے اور آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔جنید بغدادی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:دلوں کی بیماریاں خواہشات نفس کی پیروی سے ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح دیگراعضاء کوتکلیفیں بدن بیماری سے آتی ہیں۔ ﴿وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾میں لفظ''أَلِيمٌ'' کامعنی لغت عرب میں''مُؤْلِمٌ''یعنی تکلیف دینے والااور دردناک ہوتاہے جیسے''سمیعٌ'' (سننے والا)بمعنی''مُسمِعٌ''(سنانے والا)استعمال ہوتا رہتاہے۔ ذوالرمہ نے ایک اونٹ کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

وَنَرفَعُ من صُدورِ شَمَرْدَلاتٍ　　　یَصُكُّ وجوهَها وهجٌ أليم (۱)

۱۔ دیوان ذی الرمہ ۵۹۲، لسان العرب (شمردل)

لمبی گردن والے خوبصورت اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے ہم ان کی رسیاں کھینچ کران کے سینوں کو بلند کرتے ہیں۔ جب کہ ان کے چہروں پر سخت اور بہت تکلیف دہ گرمی پڑ رہی ہوتی ہے۔

''اَلَمَ'' کا معنی درد پہنچانا یا درد کرنا ہے اور اس کا مصدر ''ایلامٌ'' ہے۔ ''اَلَمٌ'' درد کو کہتے ہیں اور اس کی تصریفات ''اَلِمَ یاْلَمُ اَلمأ'' آتی ہیں۔ ''تاَلُّم'' خود درد محسوس کرنے کو کہتے ہیں اور ''الیمٌ'' کی جمع ''کریمٌ، کُرَماءُ'' کی طرح ''اُلَمَاءُ'' اور ''شَرِیفٌ- اَشراف'' کی طرح ''آلَامٌ'' آتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ بِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ ﴾ (اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے) میں ''ما'' مصدریہ ہے یعنی ان کو یہ عذاب ان کے رسولوں کو جھٹلانے، اللہ کے دین کا انکار کرنے اور اس کی آیات کو جھٹلانے کی وجہ سے ہوگا۔ یہ ابوحاتم کا قول ہے۔ عاصم، حمزہ اور کسائی نے اسے تخفیف کے ساتھ ''یَکْذِبُونَ'' پڑھا ہے جس کا معنی ہے ان کے جھوٹ بولنے اور ایمان نہ ہونے کے باوجود اس کا دعویٰ کرنے کی وجہ سے ان کو یہ عذاب ہوگا۔

مسئلہ: منافقین کو قتل نہ کرنے کی وجہ

اس بارے میں علماء کی آراء مختلف ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو قتل کیوں نہیں کیا حالاں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے نفاق کا حال معلوم بھی تھا، اس بارے میں چار طرح کے اقوال ہیں۔

پہلا قول۔ قاضی کا اپنی معلومات کی بنا پر فیصلہ کرنا:

بعض علماء کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ چوں کہ کسی کو ان کے نفاق کا علم نہ تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قتل نہ فرمایا۔ ایک مسئلہ ایسا ہے جس پر اول سے آخر تک تمام علماء کا اتفاق ہے، اگرچہ دیگر تمام مسائل میں اختلافات رہتے ہیں اور وہ مسئلہ یہی ہے کہ قاضی صرف اپنی معلومات کی بنیاد پر کسی کے قتل کا فیصلہ نہیں کرسکتا۔ ابن العربی کہتے ہیں: یہ بات قابل تردید ہے کیوں کہ حارث بن سُوید بن صامت کو مجذّر بن زیاد [۱] کے بدلے میں قتل کیا گیا تھا کیوں کہ مُجَذَّر نے جنگ بُعاث کے موقع پر [۲] حارث کے والد سُوید کو

۱۔ حضرت مجذّر بن زیاد بن عمرو بن البلویؓ صحابی رسولؐ ہیں۔ ان کا شمار فارس کے شعراء میں ہوتا تھا۔ اعلام زرکلی ۶: ۱۶۳

۲۔ بعاث مدینہ کے نواح میں ایک مقام ہے جہاں اوس اور خزرج کے درمیان لڑائی ہوئی تھی۔ معجم البلدان ۱: ۵۳۴۔ حافظ ابن حجرؒ نے کلبی اور قاسم بن سلام وغیرہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ یہ واقعہ حارث بن سوید کے ساتھ نہیں بلکہ ان کے بھائی جلاس بن سوید کے ساتھ پیش آیا البتہ مشہور حارث کے بارے میں ہی ہے۔ الاصابۃ ۱: ۲۸۰، ۱۴۲۳ تعارف حارث بن سوید

قتل کیا تھا جس کا بدلہ انہوں نے جنگ احد میں لے لیا اور موقع پا کر مُجذّر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا۔ اس قتل کی خبر جبریل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دی تو آپ نے مُجذّر رضی اللہ عنہ کے بدلے حارث کو قتل کرنے کا حکم دیا کیوں کہ ان کا قتل چھپ کر ہوا تھا اور چھپ کر قتل کرنے پر شرعی حد جاری ہوتی ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: یہاں امام ابن العربیؒ کو غلطی لگی ہے کیوں کہ جب مذکورہ بالا اجماع ثابت ہو گیا تو جو دلیل انہوں نے دی ہے اس سے اس اجماع کی تردید نہیں ہوتی کیوں کہ اجماع کا انعقاد بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور وحی کا سلسلہ منقطع ہو جانے کے بعد ہی ہو سکتا ہے اور اس کا ثبوت بھی۔ اس لیے حارث بن سوید والے مقدمہ کی حیثیت خصوصی ہے جس کا فیصلہ وحی کی بنیاد پر ہوا، یا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ حکم اجماع کی وجہ سے منسوخ ہو گیا ہو واللہ اعلم (۱)۔

دوسرا قول۔ فقہاءِ شافعیہ کا موقف:

فقہاءِ شافعیہ فرماتے ہیں کہ منافقین کو اس لیے قتل نہیں کیا کہ زندیق کو قید کر کے توبہ کی ترغیب دی جاتی ہے اسے قتل نہیں کیا جاتا اور زندیق وہی ہوتا ہے جو بظاہر ایمان کا دعوی کرے مگر باطن میں کفر چھپائے رکھے۔ ابن العربیؒ کہتے ہیں: یہ محض ایک وہم ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں قید کر کے توبہ کی ترغیب نہیں دی۔ یہ بات نہ کسی سے منقول ہے، نہ یہ کسی کی رائے ہے کہ زندیق کو توبہ کی ترغیب دینا واجب ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا حال معلوم ہونے کے باوجود ان سے خود صرف نظر فرمائے رکھا۔ یہ متاخرینِ شافعیہ میں سے ایک صاحب کا اپنا قول ہے کہ زندیق کو توبہ کی ترغیب دینے کے لیے قید کرنا جائز ہے۔ کسی اور سے ثابت نہیں (۲)۔

تیسرا قول۔ تالیف قلوب کے لیے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تالیفِ قلوب کے لیے انہیں قتل نہیں فرمایا تاکہ لوگ ظاہری معاملہ دیکھ کر

۱۔ حکیم الامت تھانویؒ نے اس کی توجیہ یہ بیان فرمائی ہے کہ اس مقدمہ کا فیصلہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ بہت سے دیگر شواہد بھی آپ کے مؤید تھے۔ اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ خود اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی خبر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔ دوسری یہ ہے کہ حارث نے اپنے جرم کا اعتراف خود کر لیا تھا۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ حارث مرتد بھی ہو گیا تھا جس کی دلیل اس کا مکہ کے لوگوں کی طرف بھاگ جانا ہے۔ احکام القرآن ۱: ۱۰

۲۔ علماءِ حنفیہ کی ترجمانی کرتے ہوئے امام جصاص نے مرتد کو قید کرنے کا جواز ثابت کیا ہے۔ جصاص: احکام القرآن ۱: ۲۵

آپ سے متنفر نہ ہو جائیں جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

[۳۳۷] معاذ اللّٰہ أن یتحدّث الناسُ أني أقتُل أصحابي۔

اس بات سے اللہ کی پناہ کہ لوگ کہنے لگیں میں اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کرتا ہوں۔اس حدیث کو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے نقل کیا ہے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص لوگوں کی تالیف قلب کے لیے انہیں عطیات بھی عنایت فرمایا کرتے تھے جنہیں قرآن نے بھی ''مؤلفة قلوبهم'' کہا ہے حالاں کہ آپ کو ان کی بداعتقادی کا حال معلوم تھا۔ یہ ہمارے علماء (مالکیہ) اور بعض دیگر حضرات کا قول ہے۔مفسر ابن عطیہ کہتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منافقین کو قتل نہ کرنے کے بارے میں علماءِ مالکیہ کا یہی موقف ہے جس کی وضاحت محمد بن الجہم، قاضی اسماعیل، ابہری اور ابن ماجشون وغیرہم نے کی ہے اور ان کی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنَافِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ بِالْمَدِيْنَةِ، لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ،ثُمَّ لاَ يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَاۤ اِلَّا قَلِيْلاً مَلْعُوْنِيْنَ أَيْنَمَا ثُقِفُوْۤا أُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلاً﴾[الأحزاب ۳۳: ۶۰، ۶۱] (اگر منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور وہ لوگ جو مدینہ میں بری افواہیں اڑایا کرتے ہیں اپنے رویے سے باز نہ آئے تو ہم آپ کو ان پر مسلط کردیں گے پھر وہ لوگ آپ کے پڑوس میں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکیں گے۔وہ بھی اس حال میں کہ ان پر پھٹکار ہوگی۔ اور ان کا حال یہ ہوگا کہ جہاں کہیں مل گئے پکڑ لیے گئے اور ان کے ٹکڑے اڑا دیے گئے)۔قتادہ کہتے ہیں: یہ سزا اس وقت ہے جب وہ اعلانیہ منافقت کرنے لگیں۔

مالکیہ کا موقف:

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جو رویّہ نفاق کہلاتا تھا

---

[۳۳۷] صحیح مسلم: کتاب الزكاة، باب ذكر الخوارج وصفاتهم ۲: ۷۴۰۔ صحیح ابن حبان: کتاب السير، باب الغنائم وقسمتها ۱۱: ۱۴۷، مسند امام احمدؒ: مسند جابر بن عبدالله رضی الله عنه ۴: ۳۲۰، ۳۲۲، امام بخاریؒ نے یہ حدیث کتاب استتابة المرتدين المعاندين وقتالهم، باب من ترك قتال الخوارج للتألف ولئلاينفر الناس......۶: ۲۵۴۰، کتاب المناقب، باب علامات النبوة في الإسلام ۳: ۱۳۲۱، کتاب الأدب، باب ماجاء في قول الرجل ويلك ۵: ۱۲۸۱ میں اس کی ہم معنی حدیث نقل کی ہے مگر اس میں زیر نظر الفاظ موجود نہیں۔اس حدیث کا واقعہ یوں منقول ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! عدل کریں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تیرا ناس ہو اگر میں عدل نہیں کرتا تو کون کرے گا۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کا سر قلم کرنے کی اجازت چاہی تھی جس کے جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ بالا جملہ ارشاد فرمایا۔

وہی ہمارے دور میں زندقہ ہے۔ اس لیے اگر کسی کا گواہی کیساتھ زندیق ہونا ثابت ہوجائے تو اسے توبہ کئے بغیر قتل کیا جائے گا۔ امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی ایک قول میں یہی منقول ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کو اس لیے قتل نہیں فرمایا تا کہ امت کے لیے یہ واضح ہوجائے کہ حاکم اپنے علم کی بنا پر کسی کے قتل کا فیصلہ نہیں سنا سکتا۔ کیوں کہ منافقین کے نفاق کی گواہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی نے نہیں دی۔ قاضی اسماعیل کہتے ہیں: عبد اللہ بن ابی کے خلاف صرف حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے گواہی دی اور جلاس بن سوید کے خلاف صرف اس کے سوتیلے بیٹے عُمیر بن سعد نے۔ [1] اگر دو اشخاص ان دونوں کے کفر اور نفاق کی گواہی دے دیتے تو انہیں قتل کیا جاتا۔

شافعیہ، حنابلہ اور حنفیہ کا مشترکہ موقف:

امام شافعی رحمہ اللہ نے اپنے دوسرے قول کی دلیل یہ دی ہے کہ جس شخص کے زندیق ہونے کی گواہی دے دی جائے مگر وہ خود اس کا اقرار نہ کرے بلکہ اسلام کے علاوہ تمام ادیان سے براءت کا اعلان کرے تو سنت یہ ہے کہ اس کا خون نہ بہایا جائے۔ اصحاب رائے (علماءِ حنفیہ) کا بھی یہی قول ہے، امام احمدؒ کا بھی اور ابن جریر طبریؒ وغیرہ کا بھی۔ امام شافعی رحمہ اللہ اور ان کے علماءِ مذہب کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے نفاق کا حال معلوم ہونے کے باوجود ان کو قتل کرنے سے صرف اس لیے منع فرمایا کہ وہ ظاہر میں اسلام کا دعویٰ کرتے تھے۔ ان کا ظاہری دعویٰ ان کے باطنی حال پر غالب تھا۔ امام طبری فرماتے ہیں: جہاں تک بندوں کے درمیان بندوں کے ذریعے احکام کے نفاذ کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بنیاد ظاہر پر رکھی ہے اور دلوں کے حال کی ذمہ داری اپنے پاس رکھی ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا اس لیے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ ظاہری حالات کے خلاف کوئی فیصلہ کرے کیوں کہ اس کا یہ فیصلہ محض وہم وگمان کی بنیاد پر ہوگا۔ اگر یہ اختیار کسی کو ملتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا سب سے زیادہ حق رکھتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی منافقین کے ظاہری دعوے کے پیش نظر ان کے ساتھ صحیح مسلمانوں کا سا سلوک کیا اور ان کے دلوں کا حال اللہ کے سپرد کردیا۔ حالاں کہ خود اللہ تعالیٰ نے ان کے ظاہری دعویٰ کو جھوٹ پر مبنی قرار دیا اور ارشاد فرمایا: ﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ﴾ [المنافقون ۶۳: ۱] (اور اللہ گواہی دیتے ہیں کہ منافق جھوٹے ہیں)۔

۱۔ حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ جلاس بن سوید منافقین میں سے تھے مگر بعد میں توبہ کرلی اور سچے مسلمان بن گئے۔ الإصابة تعارف نمبر ۱۱۷۶

مالکیہ کا موقف اور مؤلف کی ذاتی رائے

حضرات مالکیہ جو کہ گواہی مل جانے پر منافق کے قتل کے قائل ہیں، اس آیت کے نزول کے باوجود ان کے قتل نہ کئے جانے پر اپنا دفاع یوں کرتے ہیں کہ اس آیت میں چوں کہ کسی منافق کا نام نہیں لیا گیا بلکہ اجمالی طور پر ہر ایسے شخص کے لیے تنبیہ ہے جس پر نفاق کا الزام ہو اس لیے فرداً فرداً ہر منافق کے پاس گنجائش رہ جاتی ہے کہ وہ کہہ دے : میں اس آیت کے زمرے میں نہیں آتا میں تو سچا مومن ہوں ۔ اگر یہاں ناموں کا تعین کردیا جاتا تو کسی کا جھوٹ موٹ کہہ دینا کہ میں مومن ہوں اس کے قتل میں رکاوٹ نہ بن سکتا ۔

میں کہتا ہوں:(حضرات مالکیہ کا) یہ قول محل نظر ہے کیوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان منافقین کو جانتے تھے ۔ سب کے نہ سہی بہت سوں کے نام آپ کو اللہ تعالیٰ کے بتا دینے کی وجہ سے معلوم تھے اور وہ ان کو ذاتی طور پر پہچانتے تھے ۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتا دینے کی وجہ سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی ان کا حال معلوم تھا یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے پوچھا کرتے تھے اے حذیفہ ! کیا میں ان میں سے ہوں تو وہ کہتے : آپ ان میں سے نہیں ہیں۔

چوتھا قول ۔عہد نبوی میں منافقین کو قتل نہ کرنے میں حکمت:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں کی حفاظت کا انتظام اس طرح فرمادیا تھا کہ ان کو ثابت قدمی کی دولت سے نوازا تھا جس کی وجہ سے منافقین نہ تو ان کا اپنا کچھ بگاڑ سکتے تھے نہ ان کے دین کے معاملے میں اثر انداز ہو سکتے تھے۔ اس طرح ان کو باقی رہنے دینے میں کوئی نقصان نہ تھا مگر آج حالت وہ نہیں رہی کیوں کہ ہم زنادقہ سے محفوظ نہیں ہیں اور وہ ہمارے عوام اور غیر تعلیم یافتہ طبقے کو خراب کر سکتے ہیں ۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ قَالُوا إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ﴿١١﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد پیدا نہ کرو تو کہتے ہیں: ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔

''إِذَا'' کی لغوی تحقیق

''إِذَا'' ظرفیت کی بناپر محل نصب میں ہے جس کا عامل ''قَالُوا'' ہے وہ آئندہ واقع ہونے والے فعل کی خبر دیتا ہے۔ علامہ جوہریؒ کہتے ہیں: ''إِذَا'' ایسا اسم ہے جو زمانۂ مستقبل پر دلالت کرتا ہے۔ یہ جب بھی استعمال ہوتا ہے جملہ کے ساتھ مل کر استعمال ہوتا ہے چنان چہ کہا جاتا ہے: ''أجیئُکَ إذااحمرَّ البُسرُ، وَإذاقَدِمَ فُلانٌ'' (میں آپ کے پاس اس وقت آؤں گا جب کھجوریں سرخ ہوجائیں گی یا جب فلاں شخص آئے گا)۔ اس کے اسم ہونے کی وضاحت اس مثال سے ہوجاتی ہے کہ ''أجیئُکَ إذاقَدِمَ فُلانٌ'' اور ''آتیکَ یومَ یقدِمُ فُلانٌ'' دونوں ایک ہی معنی (میں تیرے پاس آؤں گا جس دن فلاں شخص آئے گا) میں استعمال ہوتے ہیں یعنی یہاں ''إِذَا'' کا معنی ''یومَ'' والا ہے۔ یہ یہاں ظرف ہے اور اس میں جزاء کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ شرط کی جزاء تین طرح سے آتی ہے: کبھی فعل کے ساتھ، کبھی فاء کے ساتھ اور کبھی ''إِذَا'' کے ساتھ۔ فعل کے ساتھ جزاء کی مثال ''إنْ تأتني آتِکَ'' (اگر تم میرے پاس آؤ گے تو میں تمہارے پاس آؤں گا)، فاء کے ساتھ جزاء کی مثال: ''إن تأتني فأناأحسِنُ إلیکَ'' (اگر آپ میرے پاس آئیں گے تو میں آپ کے ساتھ اچھا سلوک کروں گا) اور ''إِذَا'' کے ساتھ اس کی مثال جیسے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ﴾ [الروم ۳۰:۳۶] (اور اگر ان کی بد اعمالیوں کے بدلے ان کو کوئی تکلیف پہنچے تو وہ ناامید ہوجاتے ہیں)۔ اسی طرح شعر میں اس کی مثال قیس بن خطیم کا یہ قول ہے:

إذا قَصُرَتْ أسیافُنا کانَ وصلُھا　　　خُطانا إلی أعدائنا فنُضارِبُ

جب ہماری تلواریں ٹوٹ کر چھوٹی ہوجاتی ہیں تو ان کو دشمن تک پہنچانے کے لیے ہم اپنے قدموں پر چل کر جاتے ہیں اور وہاں جاکر لڑتے ہیں۔

یہاں لفظ ''فنُضارِبُ'' جزم کے ساتھ اس لیے آیا ہے کہ اس کا عطف ''کانَ'' پر ہے جوکہ مجزوم ہے۔ اگر وہ مجزوم نہ ہوتا تو یہ بھی نصب ''فنُضارِبَ'' ہوتا[1]۔

''إِذَا'' کے ساتھ کبھی تاکید کے لیے ''ما'' کا اضافہ کرکے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس حالت میں بھی وہ جزم دیتا ہے جیسا کہ فرزدق کا قول ہے:

۱۔ علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا یہاں ''إِذَا'' کو جزاء اور ''کانَ'' کو مجزوم کہنا میری سمجھ میں نہیں آسکا کیوں کہ عام قاعدہ کے مطابق ''إِذَا'' شرط کے لیے اور ''کانَ'' فعل ماضی ہونے کی وجہ سے مبنی ہے۔ البتہ اگر انہوں نے جزاء سے مراد شرط اور ''کانَ'' کے مجزوم ہونے سے مراد مکمل جملہ محل جزم میں مراد لیا ہو تو اور بات ہے۔ مترجم

فقامَ أبو لَيلَى إليه ابنُ ظالمٍ   و كان إذا ما يسلُلِ السيفَ يضرِبِ[1]

ظالم کا بیٹا ابو لیلیٰ اس کی طرف لپکا۔ اور وہ ایسا ہے کہ جب تلوار سونت لیتا ہے تو ضرور مارتا ہے۔

سیبویہ کہتے ہیں، اس کی بہتر مثال کعب بن زہیر کا یہ شعر ہے[2]:

وإذا ما تشاءُ تبعثُ منها   مغربَ الشمسِ ناشِطاً مَذْعُوراً

اور جب تو اسے دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد سورج غروب ہوجانے کے بعد بھی لے جانا چاہو تو وہ اس طرح چست ہوگی جس طرح بدکا ہوا جنگلی بیل ہوتا ہے۔

سیبویہؒ کے قول کے مطابق ''إِذَا'' کا بہتر عمل یہ ہے کہ وہ جزم نہ دے جیسا کہ اس شعر میں اس نے جزم نہیں دی۔ مبردؒ سے منقول ہے کہ ''إِذَا'' کو مفاجئت کے لیے استعمال کرتے ہوئے اگر کہا جائے ''خرجتُ فإذَازيدٌ'' (میں نکلا تو اچانک زید......) تو یہاں ''إِذَا'' ظرف مکان ہوگا کیوں کہ اس میں ایک جسم کا وجود پایا گیا ہے۔ ان کی یہ رائے قابل اعتبار نہیں کیوں کہ یہاں اصل عبارت یوں ہے: ''خرجتُ فإذَاحضورُزيدٍ'' (میں نکلا تو اچانک زید کو حاضر پایا)۔ یہاں بھی ''إِذَا'' کے ساتھ مصدر محذوف کا معنی شامل ہے جیسا کہ دیگر ظروف مکان میں ہوتا ہے۔ اس کی مثال ''اليوم حمرٌ وغداً أمرٌ'' (آج شراب اور کل لڑائی ہے) کا معنی ''وجود خمر ووقوع أمر'' (شراب کا پایا جانا اور لڑائی کا پیش آنا ہے)۔

''قِيلَ'' کی لغوی تحقیق

یہاں ارشاد باری تعالیٰ میں لفظ ﴿قِيلَ﴾ ''قَولٌ'' سے ماخوذ ہے جو اصل میں ''قُوِلَ'' تھا۔ اس کی واوَ کے کسرہ کو قاف کی طرف منتقل کر کے واوَ کو یاء سے بدل دیا گیا تو ''قِيلَ'' بن گیا۔ یہاں ﴿قيل﴾ کے لام کو ﴿لَهُمْ﴾ کے لام میں مدغم کر کے ﴿قِيلُ لَهُمْ﴾ پڑھنا بھی جائز ہے اور اس میں دو ساکن حروف کو جمع کرنا اس

۱۔ دیوان فرزدق ص ۱۳۲۲۔ ابوفراس ہمام بن غالب التمیمی (م ۱۱۰ھ) المعروف فرزدق بصرہ کا مشہور شاعر اور جریر کا ہم عصر تھا۔ ان دونوں کے درمیان سخت ہجو گوئی کا تبادلہ رہتا تھا۔ اس کی شاعری کا بہت سا حصہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اور ان کی اولاد واحفاد کی مدح میں بھی ہے۔ تاریخ الأدب العربی ۱۷۹

۲۔ کعب بن زہیر مشہور صحابی ہیں جنہوں نے اسلام لانے کے موقع پر اپنا مشہور لامیہ قصیدہ ''بانت سعاد'' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں پیش کیا جس پر آپ کو فخر دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک انعام میں دی گئی جس سے یہ قصیدہ بردہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی کی طرز پر شیخ بوصیری نے اپنا مشہور قصیدہ بردہ کہا۔ اس شعر میں انہوں نے اپنی اونٹنی کی تعریف کی ہے۔

لیے جائز ہے کہ یاء "حرف مد ولین" ہے۔ اخفش کہتے ہیں : اسے قاف اور یاء دونوں کے ضمہ کے ساتھ ﴿قُيُلَ﴾ پڑھنا بھی جائز ہے۔ کسائی کہتے ہیں : قاف کے ضمہ میں اشمام کرکے پڑھنا بھی جائز ہے تاکہ معلوم ہوجائے کہ یہ صیغہ مجہول ہے اور یہ بنوقیس کا لہجہ ہے۔ اسی طرح الفاظ "جیٓئ"، "غیضَ"، "حیلَ"، "سِیقَ"، "سِیئَ"، "سِیئَتْ" کو خاص طور پر اس طرح پڑھا جاسکتا ہے۔ ہشام نے ابن عامر[1] سے اور رویس[2] نے یعقوب سے نقل کیا ہے۔ امام نافع نے "سِیئ"، "سِیئَتْ" کو بطور خاص اشمام کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابن ذکوان نے ان میں "حیلَ" اور "سِیقَ" کا بھی اضافہ کیا ہے۔ باقی سب قراء نے ان سب الفاظ کو کسرہ کے ساتھ ہی پڑھا ہے البتہ بنو اسد کی شاخ بنو ہذیل اور بنوفقعس میں سے بنو دُبَیر واو ساکنہ کے ساتھ اسے "قُوْلَ" پڑھتے ہیں۔

﴿لَا تُفْسِدُوْا﴾ کی تفسیر اور فساد کا مفہوم

یہاں ارشاد باری تعالیٰ ﴿لَاتُفْسِدُوْا﴾ میں "لا" نہی کے لیے ہے اور "فَسَاد" (خراب ہونا) "صلاح" (ٹھیک ہونا) کا متضاد ہے۔ اور "فساد" کی حقیقت یہ ہے کہ سیدھا راستہ چھوڑ دے اور اس کے برعکس الٹا راستہ اختیار کرلے۔ کہا جاتا ہے : "فسدَ الشیئُ یفسُدُ یفسِدُ فساداً وفُسوداً وھوفاسِدٌ وفسیدٌ"۔ اس آیت کریمہ میں اس کا معنی یہ ہے کہ خود کفر کرکے، کفار کے ساتھ دوستی کرکے اور تفرقہ کے ذریعے لوگوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لانے سے روک کر زمین میں فساد نہ کرو۔ ایک قول یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اس زمین میں فساد بپا اور گناہوں کا رواج تھا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو فساد ختم ہوگیا اور زمین کے حالات ٹھیک ہوگئے۔ اب اگر لوگ دوبارہ گناہ کریں گے تو حالات ٹھیک ہوجانے کے بعد زمین میں فساد کرنے کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا: ﴿وَ لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ [الأعراف۷: ۵۶] (اور ملک میں حالات درست ہوجانے کے بعد فساد نہ کرو)۔

"الْاَرْض" کی لغوی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ : ﴿فِی الْاَرْضِ﴾ میں لفظ "الْاَرْض" مؤنث ہے اور اسم جنس ہے۔ اس کی تانیث کا

۱۔ یہاں بعض نسخوں میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ذکر ہے اور بعض میں ابن عامر کا۔ ابن عامر سے مراد مشہور قاری عبد اللہ بن عامر شامی ہیں۔ ان سے قراء ات کی روایت ہشام بن نصیر القاضی الدمشقی (م ۲۴۵ھ) نے اور ابن ذکوان عبد اللہ احمد (م ۲۴۲ھ) نے کی ہے۔ البدور الزاھرہ فی القراء ات العشرۃ ص ۷

۲۔ محمد بن متوکل (م ۲۳۸ھ) بصرہ میں فوت ہوئے۔ مشہور قاری یعقوب بن اسحاق (م ۲۰۵ھ) سے قراء ات کی روایت کرتے ہیں۔

تقاضا تو یہ تھا کہ "أَرْضَةٌ" استعمال کیا جاتا مگر اہل عرب نے اس طرح استعمال نہیں کیا۔ اس کی جمع بھی "أَرْضَات" آسکتی تھی کیوں کہ بعض اوقات ایسے مؤنث الفاظ کی جمع بھی تاء تانیث کے ساتھ آتی ہے جس کے مفرد میں تاء نہ ہو جیسے "عُرسات" (عُرسٌ کی جمع) پھر اس کی جمع میں بھی واؤ نون کے ساتھ "أَرَضُونَ" کہا گیا حالاں کہ مؤنث کی جمع واؤ نون کے ساتھ صرف اس صورت میں آسکتی ہے جب مفرد ناقص ہو جیسے "ثُبَةٌ" (شہسواروں کی جماعت۔ جمع "ثُبَاتٌ، ثُبُونَ ثِبُونَ") "ظُبَةٌ" (تلوار اور خنجر وغیرہ کی دھار۔ جمع "ظُبَاتٌ، ظِبُونَ، ظُبُونَ") مگر اہل عرب الف اور تاء کو حذف کر کے ان کے بدلے میں واؤ اور نون کو لے آئے اور راء کے فتحہ کو اپنے حال پر باقی رہنے دیا۔ کبھی راء کو ساکن کر کے ("أَرْضُون") بھی کہہ دیا جاتا ہے۔ کبھی اس کی جمع "أُروض" بھی آتی ہے۔ ابو الخطاب کا خیال ہے کہ "أَرْضٌ" سے "آراض" بروزن "أَهْلٌ" اور "آهَالٍ" بھی آتا ہے۔ اسی طرح خلاف قیاس "أَرَاضِي" بھی آتا ہے۔ شاید یہ جمع "آرضاً" سے بنائی گئی ہو۔ ہر نیچی جگہ کو "أَرْضٌ" کہتے ہیں اور "أَرْضٌ أرِيضَةٌ" پاکیزہ اور زرخیز زمین کو کہتے ہیں۔ ہمزہ کے ضمہ کے ساتھ "أُرِضَتْ" کا معنی سنواری گئی ہے ابوعمرو کہتے ہیں: "نَزَلْنَا أَرضاً أَرِيضَةً" یعنی "مُعجِبَةً للعين" (ہم نظروں کو بھانے والے علاقے میں ٹھہرے) اور عربی میں جس طرح بددعا وغیرہ کے لیے "لاأمَّ لک" (تیری ماں مرے) کہا جاتا ہے اسی طرح کا محاورہ "لاأرضَ لکَ" (تیرا کوئی ٹھکانہ نہ رہے) بھی استعمال ہوتا ہے۔ سواری کے سموں کے نچلے حصے کو بھی "أَرْضٌ" کہا جاتا ہے۔ شاعر حُمید اپنی گھوڑی کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

ولم يُقَلِّب أرْضَها البَيْطَارُ و لا لحَبْلَيْهِ بِها حَبَارُ

اس کے پاؤں کو کبھی معالج نے الٹ کر نہیں دیکھا نہ ہی اس کے جسم پر رسیوں کے نشانات ہیں۔

یہاں "حَبارٌ" کا معنی اثر ہے۔ کانپنے اور جھرجھری لینے کو بھی "أَرْضٌ" ہی کہتے ہیں جیسا کہ حماد بن سلمہ نے قتادہ رحمہ اللہ سے اورانہوں نے عبد اللہ بن الحارث سے نقل کیا ہے وہ کہتے ہیں: ایک مرتبہ بصرہ میں زمین ہلنے لگی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "وَاللهِ ما أدري أَزُلزِلَتِ الأَرْضُ أم بِيَ أَرْضَةٌ" (اللہ کی قسم معلوم نہیں زمین ہل رہی ہے یا میں کانپ رہا ہوں) یہاں "أَرْضٌ" کانپنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ذوالرمہ نے ایک شکاری کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے:

وَإذا تَوَجّس رِكْزاً من سَنابِكِها أو كان صاحبَ أرضٍ أو به المُومُ

جب شکاری اپنے شکار کے قدموں کی آہٹ سنتا ہے یا اس کا جسم کانپتا ہے یا اسے چیچک کی بیماری ہوتی ہے ......

"أرض" کا ایک معنی زکام بھی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: "آرَضَهُ اللهُ إیراضاً" اللہ تعالیٰ نے اسے زکام میں مبتلا کردیا ہے۔ زکام والے شخص کو "مَأروض" کہا جاتا ہے۔ انگور کی بیل لگانے کے لیے جو قلمیں زمین میں لگائی جائیں انہیں "فسیلٌ مُستارِضٌ" اور "وَدِیَّةٌ مُستأرِضَةٌ" کہاجاتاہے جبکہ کھجور کے تنے پر اُگنے والی بیل کو "رَاکِبٌ" کہتے ہیں۔ ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ "إِرَض" کہا جائے تو اس کا معنی اون یا بالوں سے بُنی ہوئی بڑی چٹائی ہے۔ خوش اخلاق اور بھلے انسان کو "رَجُلٌ أَرِیضٌ" کہتے ہیں۔ اصمعی کہتے ہیں: "هُوَ آرَضُهُمْ أن یفعَلَ ذلک" کا معنی ہے: وہ یہ کام کرنے کا ان سب سے زیادہ حق دار ہے۔ بعض اوقات "أَرِیض" مہمل لفظ کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے: "شیئٌ عریضٌ أریضٌ" یہاں "عَرِیضٌ" کا معنی تو چوڑا ہے مگر "أریضٌ" کا استعمال مہمل ہے۔ بعض اوقات اکیلا لفظ "أَرِیضٌ" بھی موٹا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

"نَحنُ" کی لغوی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿نَحنُ﴾ اصل میں "نَحُنُ" تھا۔ حاء کی حرکت نون کو دیکر حاء کو ساکن کردیا گیا "نَحْنُ" ہوگیا۔ یہ ہشام بن معاویہ نحوی کا قول ہے۔ زجاج کہتے ہیں: "نَحْنُ" جمع کے لیے استعمال ہوتا ہے اور جمع کی علامت واو ہے اور ضمہ واو کی جنس سے ہے چناں چہ جب التقاء ساکنین کی وجہ سے "نَحْنُ" کو حرکت دینے کی ضرورت پیش آئی تو اسے وہی حرکت دی گئی جو جمع کے صیغوں کو دی جاتی ہے۔ انہوں نے مثال کے طور پر کہا کہ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ﴾ [البقرۃ ۲: ۱۶] (یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے گمراہی کو خریدا) میں بھی واو پر ضمہ ہی ہے۔ محمد بن یزید کہتے ہیں: "نَحْنُ" بھی "قَبْلُ" اور "بَعْدُ" کی طرح ہے کیوں کہ یہ دو یا دو سے زیادہ اشخاص کے بارے میں خبر دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "أنَا" ایک کے لیے اور "نَحْنُ" دو اور دو سے زیادہ کے لیے ہے۔ ہاں کبھی متکلم اکیلا بھی اپنے لیے "نَحْنُ" استعمال کرلیتا ہے جیسے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ﴾ [الزخرف ۴۳: ۳۲] (ہم نے ان کی روزی دنیا میں ان کے درمیان تقسیم کی ہے) میں فرمایا گیا ہے۔ اس میں مذکر اور مؤنث برابر ہیں جیسا کہ کوئی عورت کہے: "قُمتُ وذَهَبْتُ"، "قُمنَا وذَهَبنَا"، "أنَا فعلتُ ذاکَ" اور "نَحْنُ فعلنا ذاکَ" یہ سب کلامِ عرب ہے اسے اچھی طرح سمجھ لو۔

"مُصْلِحُونَ" کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مُصْلِحُونَ﴾ "أصلحَ" سے اسم فاعل ہے اور "صَلاح" "فساد" کا متضاد ہے۔ اس سے لام کے ضمہ کے ساتھ "صَلُحَ الشیئُ" (چیز درست ہوگئی) اور "صَلَحَ الشیئُ" دونوں طرح سے آتا ہے۔ ابن سکیت کا قول ہے۔ صاد کے ضمہ کے ساتھ "صُلوحٌ" لام کے ضمہ کے ساتھ "صَلُحَ" کا مصدر ہے، شاعر کہتا ہے:

فکیف بإطراقي إذا ما شتمتني و ما بعدَ شَتمِ الوالِدین صُلُوحُ

جب تو نے مجھے گالی دے دی ہے اور میرا سر شرم سے جھک گیا ہے تو اب تو ہی بتا والدین کو گالی دینے کے بعد اصلاح کیسے ممکن ہے۔

مکہ مکرمہ کے ناموں میں سے ایک "صَلاح" بھی ہے۔ صاد کے کسرہ کے ساتھ "الصِلح" ایک دریا کا نام ہے۔ منافقین نے یہ بات اپنے گمان کے مطابق کہی کہ وہ اصلاح کررہے ہیں، فساد نہیں کیوں کہ یہ فساد ہی ان کی نظروں میں اصلاح ہے۔ گویا وہ یہ کہتے ہیں :ہم جو کفار کی طرف مائل نظر آتے ہیں وہ اس وجہ سے ہے کہ شاید ہماری کوششوں سے ان کے اور مؤمنین کے درمیان صلح ہوجائے۔ یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ.﴿۱۲﴾﴾

دیکھو یہ بلا شبہ مفسد ہیں لیکن اس کا شعور نہیں رکھتے

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ میں ان کے خیال کی تردید اور دعوے کو جھوٹا ثابت کرنا ہے۔ علماءِ معانی کہتے ہیں: جس نے اعلانیہ کسی چیز کا دعویٰ کیا اس نے جھوٹ بولا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بارے میں خود فرمایاہے: ﴿أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ﴾ (دیکھو !یہ بلا شبہ مفسد ہیں) اور یہ بات صحیح ہے۔یہاں "إنَّ" کو مکسور اس لیے لایا گیا ہے کہ ابتداءِ جملہ میں ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے ۔علی بن سلیمان کہتے ہیں : اسے فتحہ کے ساتھ "أَنَّ" پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ سیبویہ نے اس جملے "حَقاًأَنَّکَ منطلِقٌ" میں جائز قرار دیا ہے، یہاں یہ "ألا" کے معنی میں ہے [1]۔ ﴿هُمْ﴾کو مبتدا بنا کر﴿ الْمُفْسِدُوْن﴾ کو اس کی خبر کہنا بھی صحیح ہے ۔ اس طرح یہ مبتدا اور خبر دونوں مل کر ﴿إِنَّ﴾ کی خبر ہوں گے۔ یہ صورت بھی جائز ہے کہ یہ ﴿هُمْ﴾ اس ﴿هُمْ﴾ کے لیے تاکید ہو جو ﴿إِنَّهُمْ﴾ میں ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ "إنَّ" کے اسم اور خبر کے درمیان فاصلہ کے لیے ہو۔ کوفہ کے علماءِ نحو اسے "عِماد" کہتے ہیں۔ ﴿الْمُفْسِدُوْنَ﴾ "إنَّ" کی خبر ہے ۔ اس طرح تقدیر عبارت "أَلَآ إِنَّهُمُ الْمُفْسِدُوْنَ" ہوگی جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ﴿وَأُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[البقرہ۲ : ۵] میں گزر چکا ہے۔

۱۔ اس عبارت میں کچھ غموض ہے شاید مؤلف کی مراد یہ ہے کہ اس کو مفتوح پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ سیبویہ نے ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں:"أماأنَّکَ منطلقٌ" کا معنی"حَقاًأَنَّکَ منطلقٌ" ہے اور یہاں "أما" بمعنی "ألا" ہے ۔اگر ان دونوں کے بعد"أنَّ" کو فتح دیا جائے تو وہ "حَقاًأَنَّکَ" کے معنی میں ہوتے ہیں اور اگر اسے کسرہ دیا جائے تووہ دونوں أدوات استفتاح شمار ہوں گے۔کتاب سیبویہ ۱: ۴۶۲طبع بولاق

لاعلمی میں فساد پھیلانے کا حکم

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾ (لیکن وہ اس کا احساس نہیں رکھتے) کی تفسیر میں ابن کیسان کہتے ہیں: بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جس شخص کو معلوم نہ ہو کہ وہ فسادی ہے تو وہ قابل مذمت نہیں۔ کوئی شخص قابل مذمت اس وقت ہوتا ہے جب وہ جانتا بھی ہو کہ فساد کر رہا ہے اور پھر علم کے باوجود یہ کام کرے۔ وہ کہتے ہیں اس اشکال کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب یہ ہے کہ منافقین اپنے دلوں میں تو یہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ فساد کر رہے ہیں مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا منصوبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔ اور دوسرا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ وہ فساد کے جو کام کرتے تھے انہیں اصلاح ہی سمجھتے ہوں اور انہیں یہ خبر نہ ہو کہ جو وہ کر رہے ہیں اس سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ خرابی پیدا ہوتی ہے اور اسی غلط فہمی میں وہ حق کا اعلان اور اس کی اتباع چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے مرتکب ہو رہے ہوں۔ ﴿لٰكِنْ﴾ حرف تاکید واستدراک ہے اور اس میں نفی اور اثبات دونوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ اگر اس سے پہلے نفی ہوگی تو بعد میں اثبات ہوگا اور اگر پہلے اثبات ہوگا تو بعد میں نفی ہوگی۔ اس سے پہلے اگر اثبات آجائے تو اس کے بعد ایک اسم کے ذکر پر اکتفاء کرنا جائز نہیں البتہ یہ ضروری ہے کہ اس سے قبل جو جملہ آیا ہے اس کے بعد والا جملہ معنی کے لحاظ سے اس کا متضاد ہو جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ہے۔ اسی طرح یہ کہنا کہ ''جاء نِي زيدٌ لكن عمرو لم يجئ'' (میرے پاس زید آیا لیکن عمرو نہیں آیا) صحیح ہے مگر ''جاء نِي زيدٌ لكن عمرو'' (میرے پاس زید آیا لیکن عمرو......) کہہ کر خاموش ہو جانا جائز نہیں کیوں کہ اگر یہاں جملہ ختم کر کے خاموش ہو جانا مقصود ہو تو ایسے جملہ میں ''لکن'' نہیں بلکہ ''بل'' استعمال ہوتا ہے۔ البتہ اگر ''لکن'' سے پہلے جملے میں نفی ہو تو اس کے بعد جملہ منقطع کر دینا جائز ہے جیسے: ''ماجاء نِي زيدٌ لكن عمرو'' (میرے پاس زید نہیں آیا لیکن عمرو......)۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُوا كَمَآ ءَامَنَ النَّاسُ قَالُوٓا أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ السُّفَهَآءُ ۗ أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ۔﴾ (۱۳)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں: کیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں؟ آگاہ رہو بے وقوف یہی لوگ ہیں لیکن یہ جانتے نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ﴾ سے مراد مقاتل اور دیگر مفسرین کے قول کے مطابق منافقین ہیں۔ اور ﴿ءَامِنُوا كَمَآ ءَامَنَ النَّاسُ﴾ کا معنی یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی شریعت کی اسی طرح تصدیق کرو جس طرح مہاجرین نے اور اہل یثرب میں سے مخلص لوگوں نے کی۔ یہاں ''ءَامِنُوا'' میں ہمزہ قطعی ہے کیوں کہ یہ ''یُؤْمِنُ'' میں بھی باقی رہتا ہے۔ اور ''كَمَا'' میں کاف محل نصب میں ہے کیوں کہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی ''إِيمَاناً كَإِيمَانِ النَّاس'' (ایسا ایمان جو دوسرے لوگوں کے ایمان کی طرح ہو)۔

منافقین نے ''سُفَهَاء'' کس کو کہا؟

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿قَالُوٓا أَنُؤْمِنُ كَمَآ ءَامَنَ السُّفَهَآءُ﴾ (کیا ہم اس طرح ایمان لے آئیں جس طرح بے وقوف ایمان لائے ہیں؟)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے یہ بات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو کہی۔ انہی سے ایک اور روایت میں منقول ہے کہ اس سے مراد اہل کتاب میں سے وہ حضرات تھے جو ایمان لے آئے۔ یہ باتیں منافقین خفیہ طور پر صحیح مسلمانوں کا مذاق اڑانے کے لیے کرتے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے مومنین کو اس سے مطلع کر دیا اور یہ تاکید بھی فرمادی کہ بے وقوفی، کم عقلی اور بصیرت کی کمزوری ان لوگوں کی اپنی صفات ہیں اور حقیقت میں بے وقوف یہ لوگ خود ہی ہیں مگر انہیں اس زنگ کی وجہ سے جو ان کے دلوں پر جما ہوا ہے اس بات کا احساس نہیں۔ کلبی نے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی اور اس کا معنی یہ ہے: جب یہود کو کہا جاتا ہے کہ اس طرح ایمان لاؤ جیسے دوسرے حضرات عبداللہ ابن سلام اور ان کے ساتھی ایمان لائے ہیں تو یہ کہتے ہیں: کیا ہم ایسے ایمان لائیں جیسے بے وقوف لوگ ایمان لائے ہیں؟ ''سفهاء'' سے مراد جاہل اور کم عقل لوگ ہیں۔

''سُفَهَاءُ'' کی لغوی تحقیق

لغتِ عرب میں ''سَفَه'' ہلکے پن اور باریکی کو کہتے ہیں جیسا کہ ''ثوبٌ سفيهٌ'' ایسے کپڑے کو کہا جاتا ہے جس کی بنائی زیادہ باریک اور بے کار ہو یا پرانا ہونے کی وجہ سے باریک ہو چکا ہو۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: ''تَسَفَّهَتِ الريحُ الشجرَ'' (ہوا نے درخت کو جھکا دیا) جیسا کہ ذوالرمۃ نے کہا ہے:

مَشَينَ كما اهتزَّتْ رماحٌ تَسفَّهَتْ ... أعالِيَهَا مَرُّ الرياحِ النَّواسِمِ[1]

یہ عورتیں اس انداز سے چلتی ہیں جیسے وہ نیزے حرکت کرتے ہیں جن کے اوپر کے سرے بادِ نسیم کے چلنے سے جھک جاتے ہیں۔

۱۔ کتاب سیبویہ ۱: ۲۵، ۳۳، لسان العرب (نسم)

''سَفَّهتُ الشيئ'' کا معنی ہے (میں نے اس چیز کو حقیر جانا)۔''سفه''(بے وقوفی) ''حُلم''(عقل مندی) کا متضاد ہے۔''سفه'' زیادہ پانی پینے اور سیر نہ ہونے کو بھی کہتے ہیں۔

﴿سُفَهَاءُ﴾ کے دونوں ہمزوں میں قراءت کی چار صورتیں ہیں جن میں بہترین صورت یہ ہے کہ پہلے ہمزہ کو تلفظ کے ساتھ ادا کیا جائے اوردوسرے کو واو بنادیا جائے۔ یہ اہل مدینہ کی قراءت اورابوعمرو کی مشہور روایت ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان دونوں ہمزوں کو خفیف کردیا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہمزہ کی آواز ہمزہ اور واو کی ملی جلی آواز کی طرح ہو اور دوسرا ہمزہ بالکل واو کی طرح ادا کیا جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ پہلے ہمزہ کو خفیف کردیا جائے اور دوسرے کو پورے تلفظ کے ساتھ ادا کیا جائے اور چوتھی صورت یہ ہے کہ دونوں کو پورے تلفظ کے ساتھ ادا کیا جائے (1)۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ﴾ اسی طرح ہے جس طرح ﴿وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ﴾ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ علم سے مراد کسی چیز کو اس کی حقیقت کے مطابق پہچاننا ہے چناں چہ کہا جاتا ہے: ''عَلِمتُ الشيئَ أعلَمُهُ- عرفتُهُ'' یعنی میں نے چیز کو پہچان لیا اور ''عالمتُ الرجلَ فَعَلَمْتُهُ أعْلُمُهُ''(مضارع میں لام کے ضمہ کے ساتھ) کا معنی ہے میں نے ایک شخص کے ساتھ علم کا مقابلہ کیا تو میں اس پر غالب آگیا اور میں اس پر غالب ہوجاؤں گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ ءَامَنُوْا قَالُوْٓا ءَامَنَّا وَ إِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ. ﴿۱۴﴾

اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لاچکے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم تو صرف ہنسی کررہے تھے۔

''لَقُوا'' کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَإِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ ءَامَنُوْا قَالُوْٓا ءَامَنَّا﴾ منافقین کے بارے میں نازل ہوا۔''لَقُوا''

۱۔ تفسیر قرطبی میں اسی طرح ﴿سفهاء﴾ کے دو ہمزوں کا ذکر ہے حالاں کہ اس میں تو ایک ہی ہمزہ ہے۔ شاید یہاں کچھ عبارت رہ گئی ہے۔ اوردوسرے ہمزہ سے مراد لفظ ﴿ألآ﴾ کا ہمزہ ہے۔ یہاں اصل عبارت اس طرح ہے: ''اورارشاد باری تعالیٰ ﴿السُّفَهَاءُ ألآ﴾ کے دونوں ہمزوں کے اعراب میں چار صورتیں ہیں ......'' البدور الزاهرة ص ۱۹ ارشاد باری تعالیٰ ﴿السُّفَهَاءُ ألآ ......﴾۔

اصل میں "لَقِيُوا" تھا۔ یاء کا ضمہ قاف کی طرف منتقل کر کے التقائے ساکنین کی وجہ سے یاء کو حذف کر دیا۔ محمد بن سُمیفع الیمانی نے اسے "لَاقُوا الَّذِينَ آمَنُوا" پڑھا ہے۔ اس کا اصل بھی "لَاقَيُوا" ہے۔ یاء متحرک تھی اور اس کے ماقبل پر فتحہ تھا اس لیے اسے الف سے بدل دیا گیا، اب الف اور واد دو ساکن ایک جگہ جمع ہو گئے تو الف کو حذف کر کے واو کو ضمہ دے دیا گیا(۱)۔ اگر یہ اشکال پیدا ہو کہ "لَاقُوا" کو اصل سے موجودہ حالت میں لاتے ہوئے واؤ کو ضمہ کیوں دیا گیا اور "لَقُوا" میں اس کو حذف کیوں کر دیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "لَقُوا" میں واو کا ماقبل مضموم تھا اور اگر اس واؤ کو بھی ضمہ دے دیتے تو پڑھنے میں ثقیل ہو جاتا اس لیے اسے ضمہ نہیں دیا گیا اور "لَاقَوُا" میں اس لیے دے دیا گیا کہ واو سے پہلے فتحہ تھا لہٰذا ثقل کی کوئی وجہ نہ تھی۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ إِذَا خَلَوْا إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا إِنَّا مَعَكُمْ﴾ (اور جب اپنے شیطانوں کے ساتھ اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں) میں اگر یہ اشکال پیش کیا جائے کہ ﴿خَلَوْا﴾ کا صلہ "إِلٰی" کیوں لایا گیا ہے حالاں کہ مشہور تو یہ ہے کہ اس کا صلہ "ب" آتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں "خَلَوْا" کا معنی "ذَهَبُوا وانصرَفُوا" (گئے اور لوٹے) ہے تو اس مناسبت سے اس کے ساتھ صلہ "إِلٰی" لگایا گیا۔ اسی معنی میں فرزدق کا درج ذیل شعر بھی ہے:

كيف تَرانِي قالباً مِجَنِّي   قد قتل الله زِياداً عَنِّي (۲)

تم مجھے کیسا پا رہے ہو کہ میں نے اپنی ڈھال کو الٹا کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود میری طرف سے زیاد کو قتل کر دیا ہے۔

یہاں "قَتَلَ" کو "صَرَفَ" کے قائم مقام استعمال کر کے اس کے لیے صلہ "عَنِّي" استعمال کیا ہے۔

ایک رائے یہ ہے کہ آیت کریمہ میں صلہ "إلی" "مع" کے معنی میں استعمال ہوا ہے مگر یہ رائے کمزور ہے۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ یہاں "إلی" بمعنی "ب" ہے مگر اس بات سے نہ خلیل کو اتفاق ہے نہ سیبویہ کو۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ اصل عبارت یوں ہے "وَ إِذَا خَلَوا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ" (اور جب وہ مومنین کو چھوڑ کر اپنے شیاطین کے پاس اکیلے جاتے ہیں) تو اس لحاظ سے "إلی" اپنے اصل معنی میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ جو صورت مؤلف رحمہ اللہ نے یہاں بیان کی ہے اس کے مطابق تو ابن سمیفع کی قراءت دو واؤں کے ساتھ "لَاقَوُوا الَّذِينَ آمَنُوا" بنتی ہے مگر تفسیر قرطبی کے تمام نسخوں میں اسی طرح ہے جس طرح متن میں ذکر کیا گیا۔

۲۔ تفسیر قرطبی کے اکثر نسخوں میں اسی طرح ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ بلفظ تفسیر ابن عطیہ ۱:۱۶۲ سے منقول ہے مگر کتاب النقائص میں اس کا دوسرا مصرع (أَضْرِبُ أَمْرِي ظَهْرَهُ لِبَطْنِ) یعنی: "......ایسے تلوار چلانا ایک الٹا کام ہے" اور تیسرا مصرع (قد قتل الله زِياداً عَنِّي) ہے اسی کے مطابق ہم نے اس کا ترجمہ ذکر کیا۔

’’شیاطین‘‘ سے مراد

’’شیاطین‘‘ ’’شیطان‘‘ کی جمع تکسیر ہے۔اس کے اشتقاق اور معنی کے بارے میں تفصیل استعاذہ میں گزر چکی ہے ۔ یہاں ’’شیاطین‘‘ سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں مفسرین سے مختلف آراء منقول ہیں۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور سدی کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد کافر سردار ہیں۔کلبی کہتے ہیں: جنات میں سے شیاطین ہیں اور مفسرین کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل ہے کہ یہاں ’’شیاطین‘‘ سے مراد کاہن ہیں ۔ اور لفظ ’’شَیطَنة‘‘میں جس کا معنی ایمان اور بھلائی سے دوری ہے مذکورہ بالا سب لوگ شامل ہیں ، واللہ اُعلم۔

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿إِنَّمَا نَحۡنُ مُسۡتَهۡزِءُونَ﴾ کا معنی ہے کہ جو ہمیں دعوت دی جاتی ہے اسے جھٹلانے والے ہیں اور ایک قول یہ ہے کہ ان سے مذاق کرنے والے ہیں ۔ مذاق اڑانے اور کھیل بنانے کے لیے عربی میں ’’هَزِئَ به اور استهزأ‘‘ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں ۔ شاعر کہتا ہے :

قد هَزِئتُ مِنّي أُمُّ طَيسَلَهْ قالتُ أراه مُعدَماً لا مال لَهُ (۱)

ام طیسلہ نے میرا مذاق اڑایا اور کہا میں اسے دیکھ رہی ہوں کہ اس کے پاس کوئی مال نہیں رہے گا اور وہ مفلس ہوجائے گا۔

ایک قول یہ ہے کہ ’’استهزاء‘‘ کا اصل معنی انتقام لینا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے :

قد استهزءوا منهم بألفي مُدَجَّجٍ سَرَاتُهُم وَسْطَ الصَّحَاصِحِ جُثَّم

انہوں نے دوہزار مسلح افراد لے کر ان سے یوں انتقام لیا کہ ان کے شیر بے آب وگیاہ چٹیل میدان میں بھی ڈٹے رہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿اَللّٰهُ يَسۡتَهۡزِئُ بِهِمۡ وَ يَمُدُّهُمۡ فِيۡ طُغۡيَانِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ. ﴿۱۵﴾﴾

اللہ تعالیٰ ان کو اس مذاق کی سزا دیتا ہے اور ان کو ڈھیل دیتا ہے تا کہ وہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔

۱۔ یہ شعر رجز گو شاعر صخر الغی الهلالی کا ہے ۔ لسان العرب (طسل) میں دوسرا مصرع ذرا مختلف ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی طرف "استہزاء" کی نسبت

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے انتقام لیتا ہے اور انہیں سزا دیتا ہے۔ گویا وہ بھی ان کے ساتھ مذاق کرتا اور انہیں ان کے مذاق کا بدلہ دیتا ہے۔ یہاں ان کے گناہ کی سزا کو بھی اس گناہ کے نام سے ذکر کیا گیا۔ یہی جمہور علماء کا قول ہے اور عرب بھی اپنے کلام میں اس طرح کے الفاظ کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں جیسا کہ عمرو ابن کلثوم کا قول ہے:

أَلَا لَا يَجهلَنْ أحدٌ علينا　　فنَجهلِ فوقَ جهلِ الجاهلينا(1)

خبردار کوئی ہمارے ساتھ جاہلانہ رویہ نہ اپنائے ورنہ ہم ان کے ساتھ جہلاء کی جہالت سے بڑھ کر جاہلانہ سلوک کریں گے۔

یہاں اس نے بھی اپنی فتح اور غلبے کو جہالت کا نام دیا ہے حالاں کہ جہالت پر تو کوئی بھی عقل مند آدمی فخر نہیں کرتا۔ یہ اس نے صرف کلام میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے کہا کیوں کہ ایسے موقع پر ایک جیسے الفاظ مختلف الفاظ کی نسبت زبان پر زیادہ خفیف ہوتے ہیں۔ عرب جب کوئی لفظ کسی دوسرے لفظ کے جواب کے لیے استعمال کرنا چاہتے تو وہی لفظ استعمال کرتے اگرچہ اس کا معنی مقصود کے مطابق نہ بھی ہوتا۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن وسنت میں بھی ملتی ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ [الشوری ۴۲: ۴۰] (برائی کا بدلہ اسی جیسی برائی ہے) اور ارشاد فرمایا: ﴿فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ﴾ [البقرۃ ۲: ۱۹۴] (تو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی اس نے تم پر زیادتی کی ہے) حالاں کہ بدلہ کبھی برائی شمار نہیں ہوتا اور نہ ہی قصاص حد سے تجاوز کہلاتا ہے کیوں کہ وہ تو ایک حق ہے جو برائی کے مرتکب پر واجب ہے۔ اسی طرح ﴿وَمَكَرُوْا وَ مَكَرَ اللّٰهُ﴾ [آل عمران ۳: ۵۴] (انہوں نے خفیہ تدبیر کی تو اللہ نے بھی خفیہ تدبیر کی)، ﴿اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا﴾ [الطارق ۸۶: ۱۵، ۱۶] (یہ لوگ طرح طرح کی تدبیریں کررہے ہیں اور میں بھی تدبیریں کررہا ہوں)، ﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ﴾ [البقرۃ ۲: ۱۴] (بے شک ہم تو مذاق کرنے والے ہیں) اور اس کے جواب میں ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ یہ سب ایک ہی طرح کے ارشادات ہیں۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نہ تو کسی کے ساتھ مکر کرتے ہیں نہ کسی کا مذاق اڑاتے ہیں اور نہ ہی فریب دینا ان کی شایانِ شان یہ سب الفاظ ان کے مکر، مذاق اور فریب کے بدلے میں استعمال کئے گئے ہیں۔ اسی اسلوب میں ارشادِ باری: ﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ﴾ [النساء ۴: ۱۴۲] (وہ لوگ اپنے خیال میں اللہ سے چال چل رہے

---

(1) یہ عمرو ابن کلثوم کے مشہور معلقہ کا شعر ہے۔ ابن النحاس: شرح المعلقات ۲: ۱۲۵، تفسیر ابن عطیۃ ۱: ۱۶۰

ہیں حالاں کہ اللہ ان کی چالوں کو ان پر الٹ دیتا ہے)اور﴿فَيَسْخَرُوْنَ مِنْهُمْ سَخِرَ اللّٰهُ مِنْهُمْ﴾ [التوبة۹: ۷۹] (وہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کو اس تمسخر کا ایسا ہی بدلہ دے گا)ہیں ۔ یہی انداز درج ذیل ارشاد نبوی میں اختیار فرمایا گیا ہے:

[۳۳۸] إن اللّٰه لا يَمَلّ حتى تَمَلّوا ولا يسأمُ حتّى تَسأمُوا۔

اللہ تعالیٰ نہیں تنگ پڑتے یہاں تک کہ تم تنگ پڑ جاؤ اور نہ وہ اکتاتے ہیں یہاں تک کہ تم اکتا جاؤ۔

---

[۳۳۸] یہ الفاظ تفسیر قرطبی کے علاوہ تفسیر یا حدیث کی کسی متداول کتاب میں ایک جگہ مجتمع مجھے نہیں مل سکے البتہ اس کے دونوں حصے الگ الگ احادیث میں ملتے ہیں ۔زیادہ احادیث میں پہلا حصہ:''إن اللّٰه لايَمَلُّ حَتّٰى تَمَلُّوا''ملتا ہے جسے مشہور ائمہ حدیث میں سے ہر ایک نے اپنی تصنیفات میں متعدد مقامات پر ذکر کیاہے جیسے صحیح بخاری: أبواب التهجد، باب مايكره من التشديد فی العبادة ۱:۳۸۶، صحیح مسلم :كتاب صلاة المسافرين وقصرها، باب فضيلة العمل الدائم من قيام الليل وغيره ۱:۵۴۰،سنن أبوداود: كتاب الصلاة ، باب مايؤمربه من القصد فی الصلاة ۲:۴۸،سنن نسائی: كتاب القبلة ،باب المصلي يكون بينه وبين الإمام سترة ۲:۶۸،سنن ابن ماجہ : كتاب الزهد، باب المداومة على العمل ۲:۱۴۱۷،مؤطاامام مالکؒ: كتاب صلاة الليل ، باب ماجاء في صلاة الليل ۱:۱۱۸،صحیح ابن حبان:كتاب البِرّوالإحسان،باب ماجاء في الطاعات وثوابها۲:۶۷،صحیح ابن خزیمۃ: كتاب الصلاة، باب الرخصة في الإقتداء بالمصلي الذي ينوي الصلاة منفردا...... ۳:۶۱،مسندامام احمدؒ:حديث السيدة عائشة رضي الله عنها۷:۶۱،مسندأبویعلیٰ: مسندجابرر ... الله عنه۳:۳۳۴،مصنف عبدالرزاق: كتاب العلم ،باب الرخص في الأعمال والقصد۱۱:۲۹۰،سنن بیہقی: كتاب الصلاة ،باب القصد في العبادة والجهد في المداومة۳:۱۰۳اکثر محدثین نے اسے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل کیا ہے۔امام ابن ماجہؒ، ابن حبانؒ اورأبویعلیٰؒ کے ہاں ایک ایک روایت حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے ، طبرانیؒ نے جلد۹،باب من اسمہ عثمان میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث قدرے مختلف الفاظ میں نقل کی ہے مگراس میں یہ الفاظ بھی ہیں ،انہوں نے معجم کبیر،باب عمران بن حصين يكنى ابانجيد من أخباره وذكرنسبته میں اسی طرح کی ایک حدیث حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے، امام مالک رحمہ اللہ نے یہی روایت اسماعیل بن أبی حکیم سے نقل کی ہے ، وہ کہتے ہیں مجھے یہ حدیث پہنچی ہے ،امام ابن عدی نے الكامل في الضعفاء، تعارف عمربن عبدالله بن أبي خثعم اليمامي ۶:۱۲۵میں ضعیف روایت سے ایک حدیث حضرت أبوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ موجود ہیں، علامہ سیوطی نے بھی الجامع الكبير ۱: ۱۶۴۹حدیث نمبر۵۱۰۹/۶۲۴ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ والی یہ روایت نقل کی ہے جس کی سند میں ایک متروک راوی خالد بن ایاس ہیں مگر دوسرے طرق سے اسے تقویت ملتی ہے ۔ علامہ قرطبی والی عبارت کادوسراحصہ:''وَلَايَسأمُ حتّٰى تَسأمُوا'' صحیح مسلم :كتاب صلاة المسافرين وقصرها،باب امر من نسي في صلاته أواستعجم عليه القرآن ۱:۵۴۲،مسندامام احمدؒ: حديث السيدة عائشة رضى الله عنها۷:۳۵۲، صحیح ابن حبان : كتاب الصلاة ، باب النوافل ۶:۳۲۲،سنن بیہقی : السنن الكبرى ،كتاب الصلاة ، باب القصد فی العبادة والجهد فی المداومة ۱۰۲:۱میں منقول ہے ،یہ الفاظ صرف ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے منقول ملے ہیں البتہ امام طبرانی نے معجم کبیر جلد۲۰، باب الصاد، صدي بن عجلان أبوأمامة الباهلي......میں حضرت أبوأمامۃ الباہلی رضی اللہ عنہ سے ایک مرسل روایت نقل کی ہے جس میں یہ الفاظ ملتے ہیں ، مجمع الزوائد۲: ۲۵۹میں بھی اس روایت پر بحث موجود ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں ''حتی'' ''واو'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی ''إن اللہ لا یَمَلّ و تَمَلّوا'' (اللہ تعالیٰ تنگ نہیں پڑتے کہ تم تنگ پڑجاؤ) اور بعض کہتے ہیں اس کا معنی ''إن اللہ لا یَمَلّ وَأنتم تَمَلّون'' (اللہ تعالیٰ تنگ نہیں پڑتے مگر تم تنگ پڑجاتے ہو) ہے۔ ایک اور قول کے مطابق اس کا معنی یہ ہے کہ وہ تمہارے اعمال کا ثواب اس وقت تک منقطع نہیں فرماتے جب تک تم اعمال منقطع نہ کردو۔اس آیت کریمہ کی تفسیر علماءِ کی ایک جماعت سے اس طرح منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کچھ ایسے معاملات فرمائیں گے جنہیں انسانوں کے خیال میں ٹھٹھہ، دھوکا اور خفیہ تدبیر شمار کیا جاتا ہے جیسا کہ منقول ہے کہ:

[۳۳۹] إنَّ النارَ تجمُدُ کما تجمُدُ الإهالَةُ فیمشونَ علیها فیظُنُّونَها مَنجاةً فتخسفُ بهم۔

آگ ایسے جم جائے گی جیسے پگھلی ہوئی چربی جم جاتی ہے اور یہ لوگ اس پر چلنے لگیں گے اور اس کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھیں گے مگر اچانک وہ اس میں دھنس جائیں گے۔

کلبیؒ نے ابوصالح سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ارشادِ باری تعالیٰ:﴿وَ إِذَا لَقُوا الَّذِينَ ءَ امَنُوا قَالُوا آمَنَّا﴾ (اور جب ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی تو ایمان لاچکے ہیں) کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا: یہ لوگ اہل کتاب میں سے منافقین ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا ذکر فرما کر ان کے ٹھٹے مذاق کا ذکر بھی فرمایا۔ پھر یہ بھی بیان کیا کہ یہ لوگ جب اپنے شیاطین کے پاس یعنی کفر میں اپنے رہنماؤں کے پاس اکیلے جاتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں اور تمہارے ہی دین پر ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے ساتھ تو ہم مذاق کرتے ہیں جیسا کہ پہلے اس کا بیان گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک کریں گے۔ ان کے لیے جہنم کا دروازہ جنت کی طرف سے کھول

---

[۳۳۹] ان الفاظ کے ساتھ حدیث تو مجھے نہیں مل سکی البتہ امام بیہقی نے شعب الإیمان ، التاسع من شعب الإیمان، فصل في قوله : فوربّک لَنَحشُرَنَّهُمْ وَالشَّیَاطِینَ......۱:۳۳۸ میں،علامہ ابن اثیر نے النهایة فی غریب الحدیث ۱: ۸۴ میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ سے اس کا ہم معنی قول نقل کیا ہے جس کے الفاظ اس طرح ہیں : ''یُجاءُ بجهنم یوم القیامَةِ کأنها متنُ إهالةحتی إذااستوت علیک أقدام الخلائق ،نادی منادٍ: خذي أصحابک ودعي أصحابي،قال: فیُخسَفُ باولئکَ''۔ امام بیہقیؒ نے اسی حدیث کے تحت خالد بن معدان کی یہ روایت نقل کی ہے:''لَمّاأُدخِلَ أهل الجنة قالوا: یاربناالم تکن وعدتناالورودقال: نعم ولکنکم مررتم بجهنم وهي جامدة'' (جب جنت والوں کو جنت میں بھیج دیا جائے گا تو وہ کہیں گے: اے ہمارے رب!کیا آپ نے ہمیں جہنم پرآنے کا نہیں فرمایا تھا؟اللہ تعالیٰ فرمائیں گے: تم لوگ اس وقت جہنم سے گزرآئے ہو جب وہ جمی ہوئی تھی)، علامہ ابن منظور نے لسان العرب (أهل) میں حضرت کعب رضی اللہ عنہ کی روایت کو ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:''تُمسَکُ النار یوم القیامة حتی تبصُّ کأنهامتن إهالة'' (قیامت کے دن آگ کو روک لیا جائے گا یہاں تک کہ وہ ایسی چمک دار نظر آئے گی جیسے چربی کی سطح ہو)۔

دیا جائے گا اور انہیں کہا جائے گا کہ آجاؤ۔ جب وہ جہنم میں غوطے کھاتے آگے بڑھیں گے اور مومنین اپنی سیجوں کے اندر مسہریوں پر بیٹھے ان کا نظارہ کررہے ہوں گے اور اسی حالت میں وہ جنت کے دروازے پر پہنچیں گے تو دروازہ بند کردیا جائے گا۔ یہاں مومنین ان کا حال دیکھ کر ہنسیں گے۔ اسی کا ذکر ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ﴾ میں ہے۔ یعنی آخرت میں ان کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے گا اور جب دروازے ان کے سامنے بند کردیئے جائیں گے تو مومنین ہنسیں گے۔ اسی کا ذکر ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ ءَ امَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ. عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ﴾ [المطففين ۸۳: ۳۴، ۳۵] (آج کے دن ایمان والے لوگ کفار پر ہنسیں گے۔ وہ تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے) یعنی جہنم والوں کو دیکھ رہے ہوں گے۔ ﴿هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُوْنَ﴾ [المطففين ۸۳: ۳۶] (واقعی کافروں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ خوب مل کررہا)۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے "خداع" اور "استهزاء" ان پر دنیا کی نعمتوں کی کثرت کی شکل میں ہے کہ بظاہر تو دنیا میں ان پر نعمتیں اور احسان فرما رہے ہیں مگر جو کچھ ان کے لیے پوشیدہ ہے وہ اس کے برعکس ہے اور آخرت کا عذاب بھی اللہ تعالیٰ نے ان سے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ ہم سے راضی ہے حالاں کہ اس ذات عالی نے ان کے لیے عذاب کا حتمی فیصلہ فرمادیا ہے۔ ان باتوں کو جب انسان سوچتے ہیں تو انہیں "استهزاء"، "مکر" اور "خداع" کا نام دیتے ہیں۔ اس تفسیر کی تائید درج ذیل ارشاد نبوی سے بھی ہوتی ہے:

[۳۴۰] إذا رأيتم الله عزّ وجلّ يعطي العبدَ ما يُحِبّ و هو مقيم على معاصيه فإنما ذلك منه استدراج ثم تلا رسول الله صلى الله عليه وسلم: ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ـ حَتّٰى إِذَا فَرِحُوا بِمَآ اُوْتُوْآ اَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ـ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

جب تم دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی بندے کے نافرمانی پر اصرار کے باوجود اس کو اس کی مرضی کی نعمتیں عطا فرماتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ استدراج یعنی آہستہ آہستہ گرفت کرنا ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ. حَتّٰى إِذَا فَرِحُوا بِمَآ اُوْتُوْآ اَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ. فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الأنعام ۶: ۴۴، ۴۵] (جب وہ

---

[۳۴۰] شعب الإيمان، الثالث والثلاثون من شعب الإيمان ......، باب في تعديد نعم الله عزوجل وما يجب من شكرها ۴: ۱۲۸، مسند امام احمدؒ: حديث عقبة بن عامر الجهني ۵: ۱۳۹۔ بروایت حضرت عقبہ ابن عامر رضی اللہ عنہ۔ امام احمدؒ والی سند میں رشدین بن سعد ضعیف ہیں مگر امام بیہقی کے ہاں اس کی متابعت موجود ہے اور اس کی اصل کے شواہد بھی ہیں۔

ہماری نصیحت کو بھلاتے رہے تو ہم نے ان کے لیے ہر چیز کے دروازے کھول دیئے۔ جب وہ ان نعمتوں پر خوب اترانے لگے جو ان کو دی گئی تھیں تو ہم نے اچانک انہیں پکڑلیا تو وہ مایوس ہوکررہ گئے۔ پھر ان ظالم لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی اور سب تعریفیں تو اللہ کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا رب ہے۔

بعض علماء نے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الأعراف۷:۱۸۲] (ہم ان کو آہستہ آہستہ یوں تباہی کی طرف لے جائیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہوگی) کی تفسیر یہ کی ہے کہ وہ جب بھی کوئی نیا گناہ کرتے ہیں تو انہیں ایک نئی نعمت دے دی جاتی ہے۔ اورارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ يَمُدُّهُمْ﴾ (اورانہیں مہلت دیتا ہے) کا مطلب یہ ہے کہ ان کی مدت بڑھاتے رہتے ہیں، انہیں مہلت دیتے ہیں اور ان کو پکڑنے میں تاخیر کرتے رہتے ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوا إِثْمًا﴾[آل عمران ۳ : ۱۷۸](ہم تو بس انہیں اس لیے مہلت دیتے ہیں تاکہ وہ اور گناہ کرلیں)۔

"مَدَّ" کی لغوی تحقیق

اس کا اصل معنی زیادہ کرنا ہے۔ یونس بن حبیب کہتے ہیں : جب شر میں اضافہ مقصود ہو تو "مَدَّ" اور خیر میں اضافہ بتانا ہو تو ہمزہ کے ساتھ "أَمَدَّ" کہا جاتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَمْدَدْنَاكُمْ بِأَمْوَالٍ وَ بَنِيْنَ﴾ [الإسراء۱۷: ۶] (اور ہم مال اور بیٹوں سے تمہاری مدد کریں گے)۔ نیز ارشاد فرمایا: ﴿وَأَمْدَدْنَاهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَ لَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ [الطور۵۲: ۲۲] (اور ہم ان کے لیے میوے اور گوشت ان کی پسند کے مطابق بڑھاتے رہیں گے)۔ اخفش سے منقول ہے کہ لام کے صلہ کے ساتھ "مَدَدْتُ لَهُ" کا معنی ہے: میں نے اسے چھوڑ دیا اور ہمزہ کے اضافہ کے ساتھ "أمددتُهُ" کا معنی ہے میں نے اس کو دیا۔ فراء اور لحیانی سے منقول ہے کہ ہمزہ کے بغیر "مَدَدتُ" اس وقت کہا جاتا ہے جب اضافہ اس چیز کی اپنی جنس سے ہو چناں چہ کہا جاتا ہے: "مَدَّالنهرُ النهرَ" (ایک دریا دوسرے دریا میں شامل ہوگیا)۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ م بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ﴾ [لقمان ۳۱: ۲۷] (اور سمندر جتنے ہیں ان کے علاوہ سات سمندر اور بڑھا دیئے جائیں)۔ شروع میں ہمزہ کے ساتھ "أَمْدَدْتُ" اس وقت کہا جاتا ہے جب اضافہ کے لیے اس میں کوئی اور چیز شامل کی گئی ہو جیسے کہا جائے: "أَمْدَدْتُ الجيشَ بمدد" (میں نے کمک بھیج کر لشکر میں اضافہ کیا)۔ اسی سے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ﴾ [آل عمران۳: ۱۲۵] (تمہارا رب پانچ ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کرے گا)۔ اوراسی طرح زخم زیادہ ہوجائے تو: "أَمَدَّالجُرحُ" کہا جاتا ہے کیوں کہ یہ اضافہ مزید زخم کے ساتھ ہوتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فِیْ طُغْیَانِهِمْ﴾ (اپنی سرکشی میں) سے مراد ان کا کفر اور گمراہی ہے۔ ''طغیان'' کا اصل معنی حدود سے تجاوز ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّا لَمَّا طَغَی الْمَآءُ﴾ [الحاقۃ ۶۹: ۱۱] (جب پانی میں طغیانی آجاتی ہے تو ہم ہی ......)۔ یہاں ''طَغٰی'' کا معنی یہ ہے کہ وہ بڑھ گیا، اس کی سطح بلند ہوگئی اور وہ اس حد سے گزر گیا جس کا اندازہ ذخیرہ کرنے والوں نے مقرر کیا ہوتا ہے۔ فرعون کے بارے میں ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّهٗ طَغٰی﴾ [النازعات ۷۹: ۱۷] (وہ سرکش ہوگیا ہے)۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے دعویٰ میں حد سے بڑھ گیا کیوں کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا: ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی﴾ [النازعات ۷۹: ۲۴] (میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں)۔ اس طرح زیرِ نظر آیت کریمہ کا معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ لمبی عمر دے کر ان کو ڈھیل دیتے ہیں تا کہ وہ لوگ اپنی سرکشی میں حد سے بڑھ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی سزا میں اضافہ کردیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿یَعْمَهُوْنَ﴾ (اندھے ہوئے پھرتے ہیں) کی تفسیر میں مجاہدؒ کہتے ہیں: اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کفر میں حیرانی اور تردُّد کا شکار ہیں۔ علماءِ لغت کہتے ہیں: ''عَمِهَ الرجلُ یَعْمَهُ عُموهاً وعَمَهاًفهوعَمِهٌ وعامِهٌ'' اس شخص کو کہتے ہیں جو حیران وسرگردان ہو۔ اسی سے متردد اور بھٹکے ہوئے شخص کو ''رَجُلٌ عامِهٌ وعمِهٌ'' کہا جاتا ہے جس کی جمع ''عُمَّهٌ'' آتی ہے۔ جب کسی کے اونٹ راستہ بھول جائیں اور اسے معلوم بھی نہ ہو کہ کہاں گئے تو کہا جاتا ہے: ''ذَهَبَتْ اِبِلُهُ العُمَّهَی''۔ اگر لفظ ''عَمَی'' استعمال ہو تو معنی یہ ہے کہ اسے آنکھوں سے نظر نہیں آتا اور اگر ''عَمَهٌ'' ہو تو معنی یہ ہے کہ اس کا دل بے نور ہو چکا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَ لٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ﴾ [الحج ۲۲: ۴۶] (اصل یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں)۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا کَانُوْا مُهْتَدِیْنَ. ﴿۱۶﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی اس طرح نہ ان کی تجارت نفع بخش ہوئی نہ ہی انہیں ہدایت ملی۔

''اشْتَرَوُا'' اور ''ضَلَالَةٌ'' کی لغوی تحقیق اور قراءات

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰی﴾ (یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی) میں سیبویہ کہتے ہیں کہ لفظ ''اشْتَرَوُ'' کی واو کو ضمہ اس لیے دیا گیا کہ اس کے اور اصل واو

کے درمیان فرق رہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ :﴿وَ اَلَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَى الطَّرِيقَةِ﴾[الجن ۷۲: ۱۶] (اور اگر یہ لوگ سیدھے راستے پر رہتے تو ہم ان کے پینے کو بہت سا پانی دیتے)۔ ابن کیسان کہتے ہیں : چوں کہ واو پر ضمہ دیگر حرکات کی نسبت زیادہ خفیف ہوتا ہے اس لیے ''اشْتَرَوُ'' کی واو کو ضمہ دیا گیا ۔ زجاج کہتے ہیں : یہاں ضمہ اسی قاعدے کے تحت دیا گیا جس کے تحت ''نَحْنُ'' میں دیا گیا ۔ ابن ابی اسحاق اور یحییٰ ابن یعمر نے اسے التقائے ساکنین کے تحت واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے ۔ ابوزید الأنصاری نے قعنب سے اور انہوں نے ابوالسمال العدوی سے نقل کیا ہے کہ وہ اسے واو کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے تھے کیوں کہ فتحہ ایک خفیف حرکت ہے اگر چہ اس کے ماقبل پر بھی فتحہ ہے ۔ کسائی نے ''اُدؤُر'' واو پر ہمزہ اور ضمہ لگا کر پڑھنے کو بھی جائز کہا ہے ۔ ''اشْتَرَوُ'' ''شِراء'' سے ماخوذ ہے اور ''شِراء'' یہاں استعارۃً استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کیا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى﴾[فصلت ۴۱: ۱۷] (انہوں نے ہدایت کے مقابلے میں اندھا دھند رہنا پسند کیا)۔ اسی طرح یہاں بھی لفظ ''شِراء''(خریدنا)اس لیے استعمال کیا کہ انسان وہی چیز خریدتا ہے جو اسے پسند ہوتی ہے۔ یہاں خریدنے سے مراد ''بدلے میں لینا'' نہیں ہے کیوں کہ منافقین تو سرے سے مومن تھے ہی نہیں کہ ایمان کو بیچ سکتے ۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : انہوں نے گمراہی لے لی اور ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اور اس سے مراد یہ ہے کہ انہوں نے تبدیلی کی اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو اختیار کیا جسے یہاں مجازاً ''شِراء''(خریدنے)کے لفظ سے تعبیر کیا گیا کیوں کہ خرید وفروخت تجارت میں تبادلے اور لین دین کا نام ہے اس لیے جہاں کہیں تبادلہ یا لینا دینا پایا جائے عرب اس کے لیے ''شِراء'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں ۔ ابو ذویب کہتا ہے :

فإن تَزْعُمِيني كنتُ أجهلُ فِيكم فإني شَرَيتُ الحلمَ بعدَكِ بالجَهل(۱)

اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمہارے عشق کی وجہ سے جہالت میں مبتلا تھا تو میں نے تمہارے بعد اس جہالت کو عقل مندی سے بدل لیا ہے۔

''ضلالۃ'' اصل میں تو حیرت زدہ ہونے کو کہتے ہیں مگر بھول جانے کے لیے بھی مجازاً یہ لفظ استعمال ہوتا ہے کیوں کہ اس میں بھی ایک طرح کی حیرت پائی جاتی ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿فَعَلْتُهَآ إِذًا وَ أَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾[الشعراء ۲۶: ۲۰] (ہاں مجھ سے اس وقت وہ غلطی ہوگئی۔ مگر میں نے یہ کام انجانے میں کیا)مطلب یہ کہ میں بھول کر یہ کام کر بیٹھا ۔ ''ضلالۃ'' کا ایک معنی ''ہلاکت'' بھی ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَ قَالُوٓا ءَ إِذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ﴾[السجدۃ ۳۲: ۱۰] (کہنے لگے جب ہم زمین میں ملیا میٹ ہوجائیں گے تو......؟)

۱۔ دیوان الهذليين ص۹۰، التبصرة والتذكرة ۱: ۱۱۴، کتاب سیبویہ ۱: ۶۱

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ﴾ (تو ان کی تجارت نفع بخش نہیں ہوئی) میں اللہ تعالیٰ نے عربوں کے عام محاورہ کے مطابق نفع کو تجارت کی طرف منسوب کر کے ذکر فرمایا جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''رَبِحَ بَيْعُكَ'' (تمہاری تجارت میں نفع ہوا) اور ''خَسِرَتْ صَفْقَتُكَ'' (تمہارے سودے میں نقصان ہوا) اور اسی طرح یہ الفاظ بھی مجازاً استعمال کئے جاتے ہیں ''ليلٌ قائمٌ'' (کھڑی ہونے والی رات) اور ''نهارٌ صائمٌ'' (روزہ رکھنے والا دن) حالاں کہ ان عبارات کا اصل معنی بالترتیب یہ ہے کہ ''تم نے تجارت میں نفع کمایا اور تم نے تجارت میں نقصان اٹھایا'' اور ''تم رات بھر کھڑے رہے اور تم نے دن کو روزہ رکھا''۔ اس لحاظ سے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ﴾ کا معنی بھی ''فَمَا رَبِحُوا فِي تِجَارَتِهِمْ'' (ان کو اپنی تجارت میں نفع نہیں ہوا ہوگا)۔ شاعر کہتا ہے:

نهارُكَ هائمٌ وليلُكَ نائمٌ كذلكَ فِي الدنيا تَعيشُ البهائمُ

تمہارا دن بھٹکا ہوا اور تمہاری رات سوئی ہوئی ہے۔ اس طرح تو دنیا میں جانور رہا کرتے ہیں۔

ابن کیسان کے نزدیک یہاں بصیغۂ مفرد ''تِجارةٌ'' اور جمع ''تَجائر'' اور اسی طرح ''ضلالةٌ'' اور ''ضلائل'' دونوں طرح پڑھنا جائز ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ (اور انہیں ہدایت نہ ملی) یعنی انہوں نے گمراہی کو اپنا کر ٹھیک کام نہیں کیا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اللہ کے علم کے مطابق وہ لوگ ہدایت یافتہ نہیں تھے۔ ''الاهتداء'' (ہدایت پانا) ''الضلال'' (گمراہ ہونا) کا متضاد ہے اور اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ أَضَآءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَ تَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ. ﴿۱۷﴾

ان کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی، پھر جب آگ نے اس کے اردگرد روشنی کر دی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا جن میں ان کو کچھ بھائی نہیں دیتا۔

نحوی ترکیب

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (ان کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی) میں ﴿مَثَلُهُمْ﴾ مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے اور اس کی خبر ''کاف'' میں ہے کیوں کہ وہ بھی اسم ہے[1] جیسا کہ اعشیٰ کے اس قول میں ہے:

أتنتهُونَ و لن يَنْهَى ذَوِي شَطَطٍ　　كالطعنِ يذهب فيه الزيتُ و الفُتُلُ[2]

کیا تم اپنا ہاتھ کھینچ لینا چاہتے ہو؟ حالاں کہ ظالم کو اس کے ظلم سے باز رکھنے کا صرف طریقہ ہے کہ اس کو ایسا زخم لگایا جائے جس میں تیل اور رسی دونوں ہی غائب ہو جائیں۔

اسی طرح امرؤ القیس کا شعر ہے:

وَ رُحْنَا بِكَابْنِ الماءِ يجنبُ وسطَنا　　تُصوّبُ فيه العينُ طَوْراً و تَرْتقِي

اور ہم ایسے تیز رفتار گھوڑے پر گئے، گویا کہ وہ پانی کا پرندہ ہے جس پر سواری سے عام طبقے کا آدمی کتراتا ہے۔ وہ اس قدر تیز ہے کہ نظر کبھی اس پر ٹک پاتی ہے اور کبھی خطا ہو جاتی ہے۔

ان دونوں اشعار میں ''کالطعن'' سے مراد ''مثل الطعن'' اور ''کابن الماء'' سے مراد ''مثل ابن الماء'' ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ''مَثَلُهُمْ'' کی خبر محذوف ہو۔ اس لحاظ سے تقدیر عبارت یوں ہوگی: ''مَثَلُهُمْ مُسْتَقِرٌّ كَمَثَلِ......'' اس صورت میں کاف حرف شمار ہوگا۔ ''مَثَل، مِثْل اور مَثِيل'' سب ''مشابہ'' کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی سے ''مُتَشابِهان'' ایک جیسی دو چیزوں کو کہا جاتا ہے، علماءِ لغت نے یہی کہا ہے۔

﴿الَّذِي﴾ مفرد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور جمع کے لئے بھی۔ ابن الشجری ہبۃ اللہ بن علی کہتے ہیں: اہل عرب میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسے بلفظ واحد بول کر مراد جمع لیتے ہیں جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

وإنَّ الذي حانَتْ بفَلْجٍ دماؤهم　　هُمُ القومُ كلُّ القوم يا أُمَّ خالدِ[3]

۱۔ یعنی کاف بمعنی مثل ہے جو کہ اسم ہے اور خبر بن سکتا ہے جب کہ خود کاف حرف ہونے کی وجہ سے خبر نہیں بن سکتا۔ مترجم

۲۔ ابن النحاس: شرح المعلقات ۲: ۱۵۲، تفسیر ابن عطیه ۱: ۱۸۲

۳۔ شاعر کا نام اشہب بن رمیلہ ہے اور یہ شعر اس نے ان لوگوں کے مرثیہ میں کہا جو مقام فلج پر قتل ہوئے تھے۔ یہ مکہ مکرمہ کے راستے میں بصرہ اور حمی ضریۃ کے درمیان ایک وادی کا نام ہے جہاں بنوعدی رہائش پذیر تھے۔ یاقوت الحموی: معجم البلدان ۴: ۳۰۸، کتاب سیبویہ ۱: ۹۶، نحاس: معانی القرآن ۱: ۱۲، تفسیر ابن عطیة ۱: ۱۸۵

اے ام خالد وہ لوگ جن کے خون مقام فلج میں بہہ گئے ہیں وہی ہماری قوم کا اصل سرمایہ تھے۔

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾[الزمر ۳۹: ۳۳](اور جو شخص سچی بات لے کر آیا وہ اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی متقی لوگ ہیں)کے بارے میں بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اس میں بھی یہی اسلوب استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح یہاں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِی﴾ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کا معنی بھی ﴿ كَمَثَلِ الَّذِیْنَ اسْتَوْقَدُوا﴾(ان لوگوں کی طرح -بصیغہ جمع- جنہوں نے آگ جلائی)ہے۔ اسی لئے اس کے بعد ﴿ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ﴾(اللہ تعالیٰ نے ان کی روشنی سلب کرلی) بصیغہ جمع ارشاد فرمایا۔ چناں چہ یہاں کلام کا پہلا حصہ مفرد کے لئے استعمال ہوا اور دوسرا جمع کے لئے۔ باقی جہاں تک ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَخُضْتُمْ كَالَّذِیْ خَاضُوْا﴾[التوبۃ ۹: ۶۹](اور تم بھی ویسی ہی بحثوں میں پڑگئے جیسی بحثوں میں وہ پڑے تھے) کا تعلق ہے تو اس میں ''الَّذِی''مصدر محذوف کے لئے آیا ہے جس کے مطابق عبارت اس طرح ہے: ''وَ خُضْتُمْ كَالخوض الَّذِی خَاضُوا''(اور تم بھی انہی کے گھسنے کی طرح گھسے)۔ ایک قول یہ ہے کہ یہاں''الذی'' اور''اسْتَوْقَدَ'' دونوں کو اس لئے مفرد لایا گیا کہ آگ جو جلائی گئی وہ بھی ایک تھی اور بہت سے لوگوں کی طرف سے جلانے میں نمائندگی کرنے والا بھی ایک شخص تھا۔ مگر جب روشنی ختم ہوئی تو سب کی آگ یک دم ختم ہوگئی اس لئے ﴿بِنُوْرِهِمْ﴾ میں جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ یہاں ﴿اسْتَوْقَدَ﴾ کا معنی ''أوقَدَ'' والا ہی ہے جیسا کہ ''أجابَ'' کی جگہ ''استجابَ'' کہہ دیا جاتا ہے۔ ان دونوں میں الف اور نون زائد ہیں۔ یہ بات اخفش نے کہی ہے۔ اسی طرح شاعر کا یہ قول بھی ہے:

وداعٍ دَعَا یا مَن یُجیبُ إلی النَّدَی فلَم یَستجبْه عندَ ذاكَ مُجیبُ (۱)

ایک پکارنے والے نے پکارا! اے وہ شخص جو قبر کی ترمٹی کی طرف آرہا ہے تو اس وقت کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔

یہاں بھی ''یَستجِبْه'' کا معنی ''یُجِبْه'' ہے۔ آیت کریمہ میں لفظ ''لَمَّا'' کے جواب اور ﴿نُوْرِهِمْ﴾ کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں علماءِ نحو کی آراء مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں: ﴿لَمَّا﴾ کا جواب محذوف ہے جو کہ ''طَفِئَتْ'' ہے اور ﴿نُوْرِهِمْ﴾ کی ضمیر منافقین کی طرف راجع ہے۔

۱۔ یہ شعر کعب بن سعد الغنوی کا ہے جو اس نے اپنے بھائی ابوالمغوار کے مرثیہ میں کہا۔ شرح ابن عقیل نمبر ۱۹۶، تفسیر ابن عطیۃ ۱: ۱۸۳

منافقین کے انجام کی مثال

آگ کی اس مثال سے آخرت میں منافقین کا حال بتانا مقصود ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهُ بَابٌ﴾[الحدید۵۷: ۱۳] (پھر ان کے درمیان ایک دیوار قائم کردی جائے گی جس کا ایک دروازہ ہوگا)۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿لَمَّا﴾ کا جواب ﴿ذَهَبَ﴾ ہے اور ﴿نُوْرِهِمْ﴾ کی ضمیر ﴿الَّذِي﴾ کی طرف راجع ہے۔ اس قول کے مطابق ہی آگ جلانے والے کی مثال منافق پر صادق آتی ہے کیوں کہ آگ جلانے والے کا اندھیروں میں اس طرح رہ جانا کہ اسے کچھ نظر نہ آئے منافق ہی کی طرح ہے جو حیرت اور تردّد کی کیفیت میں رہتا ہے۔ آیت میں یہ ارشاد فرمانے سے اصل مقصود بھی منافق کی مثال پیش کرنا ہے جو ایمان ظاہر کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے لئے نکاح، وراثت، مال غنیمت کا حصہ اور جان و اولاد کا تحفظ وغیرہ جیسے مسلمانوں والے تمام احکام ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح ہیں جس طرح کسی نے اندھیری رات میں آگ جلائی جس سے اسے روشنی ملی اور اس روشنی میں اس نے وہ چیزیں دیکھ لیں جو اس کے لئے خطرہ بن سکتی ہیں اور ان سے بچنے کی تدبیر بھی کر لی مگر جونہی آگ بجھی یا ختم ہوگئی تو جو تکلیف آنے والی تھی آگئی اور وہ حیرت میں ڈوبا کھڑا رہ گیا۔ اسی طرح منافقین کا حال ہے کہ اسلام کا نام استعمال کر کے وہ دھوکے میں پڑے رہے مگر موت کے بعد تو انہیں دردناک عذاب کی طرف لے جایا جائے گا جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ﴿إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾[النساء۴: ۱۴۵] (منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے) وہاں جا کر ان کا نور بھی چھن جائے گا جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ﴾[الحدید۵۷: ۱۳] (ہمارا انتظار کرلو کہ ہم بھی تمہارے نور میں سے کچھ حاصل کرلیں)۔ اس آیت کی ایک تفسیر یہ بیان کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے پاس منافقین کے آنے اور گفتگو کرنے کو آگ سے تشبیہ دی گئی ہے اور مسلمانوں کا ان کی دوستی سے منہ پھیر لینا اور ان کو حقیر سمجھنا آگ کا چلا جانا شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح اور بھی کئی اقوال منقول ہیں۔

”نَارًا“ اور ”أَضَاءَتْ“ کی لغوی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿نَارًا﴾ میں ”النار“ مؤنث ہے اور ”نورٌ“ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی چمکنا اور روشن ہونا بھی ہے۔ یہ اجوف واوی ہے کیوں کہ اس کی تصغیر میں ”نُوَيْرَةٌ“ کہا جاتا ہے اور جمع میں ”نُوَرٌ، أنوارٌ اور نیرانٌ“ کہتے ہیں۔ اس کی واو اپنے ماقبل مفتوح کی وجہ سے یاء بنادی گئی۔ ”ضاءَتْ اور أضاءَتْ“ دونوں ایک ہی لفظ کی مختلف قراءتیں ہیں۔ چاند روشن ہو تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے: ”ضَاءَ القمرُ يَضُوءُ ضَوءًا“ اور ”أَضَاءَ يُضِيءُ“، یہ لازم بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بھی۔ محمد بن السمیفع نے بغیر الف ”ضَاءَتْ“ پڑھا ہے اور جمہور قراء الف کے ساتھ ”أَضَاءَتْ“ پڑھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے:

أضاءت لهم أحسابُهم ووُجوهُهم دُجَى الليلِ حتى نَظَّم الجِزْعَ ثاقِبه (۱)

ان کے حسب نسب اور ان کے چہروں نے رات کی تاریکیوں کو روشن کردیا یہاں تک کہ اس کی چمک نے سیاہ وسفید مہرے پرودیئے۔

﴿مَا حَوْلَهُ﴾ کی نحوی ترکیب

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿مَا حَوْلَهُ﴾ میں ''ما'' زائدہ ہے اور تاکید کے لئے آیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ''أضاءَتْ'' کا مفعول ہے اور ''حَوْلَهُ'' ظرف مکان ہے اور اس کی ''ھاء'' مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہے۔ ''ذَهَبَ'' اور ''أَذْهَبَ'' یہاں دولہجات ہیں جو کہ مصدر ''ذھاب'' سے ماخوذ ہیں۔ اس کا معنی کسی چیز کا ہٹ جانا ہے۔ ''تَرَكَهُمْ'' کا معنی ہے: ان کو باقی رہنے دیا۔ ﴿فِي ظُلُمٰتٍ﴾ ''ظُلْمَةٌ'' کی جمع ہے۔ اعمش نے اس کے اصل کی بنا پر اسے لام کے سکون کے ساتھ ''ظُلْمَاتٌ'' پڑھا ہے۔ جو لوگ اسے لام کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں ان کا مقصود اسم اور صفت کے درمیان فرق واضح کرنا ہے۔ اشہب عقیلی نے اسے لام کے فتحہ کے ساتھ ''ظُلَمَاتٌ'' پڑھا ہے۔ علماءِ بصرہ کہتے ہیں: یہاں ضمہ کو فتحہ سے اس لئے تبدیل کیا گیا ہے کہ فتحہ نسبتاً خفیف ہے۔ کسائی کہتے ہیں ''ظُلَمَاتٌ'' جمع الجمع ہے اور اصل جمع ''ظُلَمٌ'' ہے۔ ﴿لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ فعل مضارع ہے اور حال کے معنی میں ہے گویا باری تعالیٰ نے یہاں ''غَيْرُ مُبْصِرِيْنَ'' (وہ لوگ دیکھنے والے نہیں) ارشاد فرمایا ہے۔ اس لئے ''ظُلُمَاتٌ'' پر وقف جائز نہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ. ﴿۱۸﴾

وہ بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں اس لئے وہ لوٹ نہیں سکتے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ (بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں) میں ''صُمٌّ'' اصل میں ''هُمْ صُمٌّ'' (وہ بہرے ہیں) ہے۔ اس طرح یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما کی قراءت کے مطابق یہ نصب کے ساتھ ''صُمًّا بُكْمًا عُمْيًا'' ہیں اس لئے انہیں فعل مذمت کے مفعول کے طور پر منصوب پڑھنا بھی جائز ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا﴾ [الأحزاب ۳۳: ۶۱] (وہ پھٹکارے ہوئے ہیں۔ جہاں پائے گئے......)۔ نیز ارشاد فرمایا: ﴿وَامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ

۱۔ علامہ ماوردیؒ نے اپنی تفسیر میں یہ شعر ذکر کرکے اسے ابوطمحان کی طرف منسوب کیا ہے۔

الْحَطَبِ﴾[اللھب ۱۱۱ : ۴] (اور اس کی بیوی لکڑیاں لاد کر لانے والی)۔ اسی طرح شاعر نے کہا ہے:

سَقَوْنِي الخمرَ ثم تكنَّفُوني عُدَاةَ اللّٰهِ من كَذِبٍ و زُورِ (۱)

ان اللہ کے دشمنوں نے پہلے مجھے دھوکے سے شراب پلائی اور پھر جھوٹ اور دھوکے سے گھیرے میں لے لیا۔

یہاں بھی ''عُدَاةَ اللّٰهِ'' کا نصب فعل ذم کی وجہ سے ہے۔ اس قول کے مطابق ﴿يُبْصِرُوْنَ﴾ پر وقف نہ صرف جائز ہوگا بلکہ مستحسن ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ﴿صُمٌّ﴾ کا نصب ارشاد باری تعالیٰ: ﴿تَرَكَهُمْ﴾ کی وجہ سے ہو گویا کہ اصل ارشاد گرامی اس طرح ہے: ''وَتَرَكَهُمْ صُمّاً بُكماً عُمْياً'' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کو اس حال میں چھوڑ دیا کہ وہ بہرے، گونگے اور اندھے تھے۔ اس قول کے مطابق ﴿يُبْصِرُوْنَ﴾ پر وقف مستحسن نہیں ہوگا۔ ''صمم'' کلام عرب میں بند ہونے کو کہتے ہیں۔ چناں چہ کہا جاتا ہے: ''قَنَاةٌ صَمَّاءُ'' اس نیزے کو کہتے ہیں جو اندر سے کھوکھلا نہ ہو۔ اور ''صممتُ القارُورةَ'' کا معنی ہے: میں نے شیشی کو بند کردیا۔ اسی سے لفظ ''أصم'' ہے جو اس شخص پر بولا جاتا ہے جس کی سماعت بند ہو چکی ہو اور ''ابکم'' وہ ہوتا ہے جو نہ بول سکے نہ سمجھ سکے۔ جو سمجھ سکے مگر بول نہ سکے اسے ''أخرس'' کہتے ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ ''أبكم'' اور ''أخرس'' دونوں ایک ہی ہیں۔ جو شخص پوری طرح گونگا ہو اور کچھ سمجھ بھی نہ سکے اسے ''أبكم'' بھی کہتے ہیں اور ''بكيم'' بھی۔ شاعر کہتا ہے:

فَلَيْتَ لِسانِي كانَ نِصْفَينِ منهما بَكيمٌ و نِصفٌ عند مَجْرَى الكواكب

کاش کہ میری زبان دو حصوں پر مشتمل ہوتی، ایک حصہ گونگا ہوتا اور دوسرا اتنا بلند کہ ستاروں کی گزرگاہ کے پاس ہوتا۔

''عَمَى'' نظر ختم ہو جانے کو کہتے ہیں۔ اسی سے فعل ''عَمِيَ'' (وہ اندھا ہو گیا)، صفت ''أعمىَ'' (اندھا) اور اس کی جمع ''قومٌ عُميٌ'' (اندھے لوگ) ماخوذ ہیں۔ نیز کہا جاتا ہے: ''أعماه الله'' (اللہ تعالیٰ نے اسے اندھا کردیا)، ''تعامَى الرَّجُلُ'' اس شخص کے بارے میں کہتے ہیں جو جان بوجھ کر نہ دیکھے۔ اور ''عَمِيَ عليه الأمر'' کا معنی ہے: اس پر معاملہ خلط ملط ہو گیا۔ اسی معنی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَعَمِيَتْ عَلَيْهِمُ الْأَنْبَآءُ يَوْمَئِذٍ﴾ [القصص ۲۸ : ۶۶] (اس دن سارے مضامین ان کے دلوں سے گم ہو جائیں گے)۔ یہاں جو باتیں ہم نے ذکر کی ہیں ان سے مراد حواس (کان، زبان اور آنکھ) کا مکمل طور پر بے کار ہو جانا نہیں بلکہ کسی ایک پہلو سے ان کے ادراک کی نفی مقصود ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''فلان أصم عن الخنا'' (فلاں شخص بدزبانی والی باتیں نہیں سن سکتا)۔ اس معنی کو شاعر نے اپنے اس قول میں خوب واضح کیا ہے:

۱۔ یہ عروہ ابن الورد کا شعر ہے۔ کتاب سیبویہ ۱: ۲۵۲

أَصَمُّ عمّا سَاءَهُ سَمِيعُ

اسے جو بات بری لگے اس سے بہرہ ہوتا ہے۔اور اس کے علاوہ خوب سننے والا ہے۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

و عَوراءِ الكلامِ صَمَمتُ عنها و لو أني أشاء بها سمِيعُ

بدزبان عورت کے سامنے میں بہرا بن گیا اوراگر میں چاہتا تو اس کی باتیں پوری طرح سن سکتا تھا۔

داریؒ کا ایک شعر ہے:

أعْمَى إذا ما جارتي خرجت حتى يوارِي جارتي الجُدُرُ

جب میری پڑوسن باہر نکلتی ہے تو میں اندھا بن جاتا ہوں، یہاں تک کہ وہ دیواروں کی اوٹ میں پہنچ کر چھپ جاتی ہے۔

ایک شاعر نے بادشاہوں کے پاس کثرت سے آنے جانے والے شخص کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

أُدخُلْ إذا ما دخلتَ أعمَى واخرُجْ إذا ما خرجتَ أخرس

جب بھی ان کے دربار میں جاؤ تو اندھے بن کر اندر داخل ہو اور جب وہاں سے نکلو تو گونگے بن کر نکلو۔

قتادہؒ کہتے ہیں: اس آیت کریمہ میں ﴿صُمٌّ﴾ سے مراد حق بات سننے سے بہرے، ﴿بُكْمٌ﴾ سے مراد حق کہنے سے گونگے اور ﴿عُمْيٌ﴾ سے مراد حق کو دیکھنے سے اندھے ہیں۔

مؤلف کی رائے

حدیث جبریل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری زمانہ کے حکمرانوں کا جو حال بیان فرمایا اس سے مراد بھی یہی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۴۱] وإذا رأيتَ الحُفاةَ العُراةَ الصُّمَّ البُكمَ ملوك الأرض فذاك من أشراطها۔

اور یہ کہ تم ننگے پاؤں، ننگے بدن، بہرے اور گونگے لوگوں کو دیکھو گے کہ زمین کے بادشاہ بنے بیٹھے ہوں گے۔یہ بھی قیامت کی نشانیوں میں سے ہے۔

---

[۳۴۱] حدیث جبریل متفق علیہ ہے اور اس کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ﴾ کا معنی یہ ہے کہ وہ حق کی طرف واپس نہیں لوٹ سکتے ۔ یہ اس لئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا حال پہلے سے معلوم تھا ۔ یہ فعل لازم ''رَجَعَ بنفسِهٖ رُجوعاً'' (وہ خود واپس لوٹا) اورمتعدی ''رَجَعَهٗ غیرُہ'' (اسے کسی اور نے واپس لوٹایا) دونوں طرح استعمال ہوتا ہے ۔ البتہ بنو ہذیل متعدی فعل کے طور پر ''أرجعَهٗ غیرُہ'' (مزید فیہ ۔ باب افعال سے) استعمال کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿يَرْجِعُ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ الْقَوْلَ﴾ [سبا ۳۴: ۳۱] (یعنی وہ بات کو آپس میں ایک دوسرے کی طرف لوٹائیں گے) کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے۔ جیسا کہ سورۂ سبا میں اس کی وضاحت موجود ہے ۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيهِ ظُلُمٰتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصٰبِعَهُمْ فِيٓ ءَاذَانِهِم مِّنَ الصَّوٰعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌۢ بِالْكٰفِرِينَ. ﴿۱۹﴾

یا پھر ایسے جیسے آسمان سے زور کا مینہ برس رہا ہو جس میں اندھیرے ہوں ، گرج ہو اور بجلی بھی ۔ ایسے میں یہ اس کڑک سے ڈر کر موت کے خوف سے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں حالاں کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرے ہوئے ہیں۔

لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ میں امام طبری فرماتے ہیں: ''أو'' بمعنی واو ہے ۔ یہی فراء کا قول بھی ہے۔ انہوں نے اس کے شاہد کے طور پر درج ذیل شعر بھی پیش کیا ہے:

و قَدْ زَعَمَتْ لیلَی بأنِّيَ فاجرٌ لنفسي تُقَاها أوعلیها فُجورُها[1]

لیلیٰ سمجھتی ہے کہ میں بدکردار ہوں ۔ اگر میرے دل میں تقوی ہے تو وہ بھی میرے اپنے کام آئے گا اور اگر میں گناہ گار ہوں تو اس کا وبال بھی میرے اپنے اوپر ہوگا۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

نَالَ الخلافةَ أو كانتْ له قَدَراً كما أتى ربَّه موسى على قَدَرِ[2]

۱۔ یہ شعر توبہ بن حمیر الخفاجی کے قصیدہ میں سے ہے جسے انہوں نے لیلی الأخیلیہ کے بارے میں کہا ۔ أمالی القالی ۱: ۸۸، المغنی ۶۲، شرح شواهد المغنی ص ۷۰

۲۔ یہ شعر جریر بن عطیہ کا ہے جو اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی شان میں کہا۔

انہوں نے خلافت حاصل کرلی اور وہ تقدیر میں انہی کے لئے مقرر تھی ۔جیسے موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے مقرر کردہ وقت پر پہنچ گئے۔

یہاں بھی ''او'' بمعنی واو استعمال ہوا ہے ۔ایک رائے یہ ہے کہ :''او'' یہاں اختیار کے لئے استعمال ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ منافقین کا حال پہلی مثال کے مطابق سمجھ لو یا اس مثال کے مطابق ،دونوں میں کسی ایک کی قید نہیں۔ ﴿أو کَصَیِّبٍ﴾ کا معنی :''أو کأصحابِ صَیِّبٍ'' ہے ۔''صَیِّبٌ'' بارش کو کہتے ہیں اور وہ ''صَابَ یصُوبُ'' سے مشتق ہے۔ علقمہ کہتا ہے :

فَلَا تَعْدِلِي بَيني و بين مُغمَّرٍ سَقَتْكِ رَوايَا المُزْنِ حيث تَصُوبُ (۱)

مجھے اور ایک نا تجربہ کار شخص کو برابر نہ سمجھو ۔گھنے بادل جب بھی برسیں تمہیں سیراب کریں ۔

''صَیِّبٌ'' اصل میں ''صَیْوِب'' تھا ، واو اور یاء ایک جگہ جمع ہوگئیں ۔ ان دونوں میں سے جو ساکن تھی وہ پہلے واقع ہوئی اس لئے واو کو یاء سے بدل کر پہلی یاء میں ادغام کردیا گیا جیسا کہ ''میِّت''، ''سیِّد''، ''هَيِّنٌ'' اور ''لَيِّنٌ'' میں ہوا۔ بعض علماءِ کوفہ کا خیال ہے کہ ''صَیِّبٌ'' اصل میں ''صَوِیبٌ'' بروزن ''فَعِیلٌ'' تھا۔ نحاس کہتے ہیں: اگر یہ بات صحیح ہوتی تو اس میں ادغام اسی طرح جائز نہ ہوتا جیسے ''طَوِیلٌ'' میں جائز نہیں ہے۔ ''صَیِّبٌ'' کی جمع ''صَیَایِبُ'' ہے۔ عرب کے اسلوب کے مطابق آیت کریمہ میں تقدیر عبارت یوں ہوگی: ''مَثَلُهم کمثَلِ الَّذِی اسْتَوقَدَ نارًا أو کمثلِ صَیِّبٍ'' (ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی یا اس کی مثال بارش کی طرح ہے)۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مِنَ السَّمَآءِ﴾ میں ''السماء'' مذکر بھی استعمال ہوتا ہے اور مؤنث بھی اور اس کی جمع ''أسمِیَة'' بھی آتی ہے ''سمٰوَات'' بھی اور ''فُعولٌ'' کے وزن پر ''سُمِيٌّ'' بھی۔ عجاج کہتا ہے :

تَلُفُّهُ الرياحُ و السُّمِيُّ (۲) (اسے ہواؤں اور بارشوں نے گھیرا ہوتا ہے)۔

عربی میں ہر ایسی چیز کو ''السماء'' کہتے ہیں جو تم سے بلند ہو اور تجھ پہ سایہ کئے ہو۔ اسی سے گھر کے چھت کو بھی ''السماء'' کہا جاتا ہے۔ بارش کو بھی اس لئے ''السماء'' کہہ دیتے ہیں کہ وہ آسمان کی طرف سے اترتی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ایک شعر ہے :

دیارٌ من بَنِي الحَسْحاسِ قَفْرٌ تُعَفِّیها الرَّوامِسُ و السماءُ

بنو حسحاس کے گھر ویرانہ بن چکے ہیں۔ ہوائیں اور بارش آکر ان کے نشانات مٹاتی رہتی ہیں۔

۱۔ دیوان علقمہ ص ۳۴، مفضلیات ضبی ۷۸۴، ۷۶۹۔ لسان العرب (غمر)

۲۔ دوسرا مصرع : ''في دِف ءِ أرطاةٍ لها حَنِيٌّ'' ہے اور لسان العرب (سما) میں یہ رؤبہ کی طرف منسوب ہے ۔

ایک اور شاعر نے کہا ہے (۱):

إذا سَقَط السماءُ بأرض قومٍ رَعَيناه وإن كانوا غِضابًا

جب کسی قوم کی زمین پر بارش ہوتی ہے تو ہم اس کے پانی اور اس سے پیدا ہونے والی فصلوں کی حفاظت کرتے ہیں اگرچہ وہ لوگ خود ہم سے ناراض ہی کیوں نہ ہوں۔

گھاس پھوس کو بھی ''السماء'' کہتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''مازلنا نطأ السماء حتی أتیناکم'' (ہم گھاس اور مٹی پر چلتے رہے یہاں تک کہ تم تک پہنچ گئے)۔ یہاں ''السماء'' سے مراد گھاس اور مٹی ہے۔ گھوڑے کی پیٹھ کو بھی بلند ہونے کی وجہ سے ''السماء'' کہہ دیتے ہیں جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وأحمرُ كالدّيباج أمّا سماؤه فَرَيّا وأمّا أرضُه فمُحُولُ (۲)

اس گھوڑے کا رنگ ریشم کی طرح سرخ ہے۔ اس کی کمر بہت خوبصورت اور اس کا نچلا حصہ بالکل خشک ہے۔

''السماء'' ہر بلند جگہ کو اور ''الأرض'' ہر پست جگہ کو کہتے ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فِيهِ ظُلُمٰتٌ﴾ مبتدا اور خبر ہیں اور ﴿وَ رَعْدٌ وَ بَرْقٌ﴾ معطوف علیہ ہے۔ یہاں صیغہ جمع کے ساتھ ﴿ظُلُمَاتٌ﴾ اس لئے فرمایا کہ رات کا اندھیرا اور بادلوں کا اندھیرا دونوں کی طرف اشارہ ہو جائے۔ اور چوں کہ یہ اندھیرے شدت کی وجہ سے تہہ بہ تہہ جمع ہو جاتے ہیں اس لئے ان کے لئے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا۔ اس میں جس قدر قراءات اور لہجات ہیں ان کا ذکر گزر چکا ہے اس لئے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ اور اس کے علاوہ بھی جس چیز کا ذکر ایک مرتبہ ہو جائے گا اسے ان شاء اللہ دوبارہ دہرایا نہیں جائے گا۔

''رعد'' کی علمی تحقیق

''رعد'' (بادلوں کی گرج) کے بارے میں علماء سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث نقل کی ہے، فرماتے ہیں:

[۳۴۲] سألتِ اليهودُ النبيَّ صلى الله عليه وسلم عن الرعد ما هو؟ قال: مَلَكٌ من الملائكة موَكَّل بالسحاب معه مخاريق من نار يسوق بها السحاب حيث

۱۔ یہ شعر معاویہ بن مالک کا ہے۔ لسان العرب (سما)

۲۔ یہ شعر طفیل الغنوی کا ہے۔ لسان العرب (سما)

شا ء اللّٰہ۔ فقالوا فما هذا الصوت الذي نسمع؟ قال: زجره بالسحاب إذا زجره حتى ينتهي إلى حيث أمر اللّٰہ۔ قالوا: صدقت۔

یہود نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ''رعد'' کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ ایک فرشتہ ہے جس کے ذمہ بادلوں کا کام لگایا گیا ہے۔ اس کے پاس لوہے کے کوڑے ہوتے ہیں جن سے یہ بادلوں کو ہانک کر وہاں لے جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا: یہ آواز جو ہم سنتے ہیں یہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جب فرشتہ بادلوں کو ہانکتا ہے تو یہ آواز نکلتی ہے یہاں تک کہ وہ اس مقام پر پہنچ جائیں جہاں اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں۔ یہ سن کر یہود کہنے لگے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔ اس حدیث میں پوری تفصیل ہے۔

اکثر علماء کی بھی ''رعد'' کے بارے میں یہی رائے ہے۔ اس طرح ''رعد'' وہ آواز ہے جو بادلوں کے اندر سے سنائی دیتی ہے۔ یہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور یہی لغت عرب میں مشہور ہے جیسا کہ لبید نے زمانہ جاہلیت میں کہا:

فَجَّعَني الرعدُ والصواعقُ بِالْ　　　فَارِسِ يومَ الكريهةِ النَّجِدِ (۱)

سخت لڑائی کے دن بجلی اور کڑک نے مجھے اس شہسوار کے غم میں مبتلا کر دیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''رعد'' وہ ہوا ہے جو بادلوں کے درمیان پھنس کر چلتی ہے تو اس سے آواز نکلتی ہے۔ ''برق'' کے بارے میں بھی مختلف اقوال منقول ہیں: حضرات علی، ابن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ اس سے مراد لوہے کا کوڑا ہے جس سے فرشتہ بادلوں کو ہانکتا ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: یہی امام ترمذیؒ والی حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اور قول بھی منقول ہے کہ یہ نور کا ایک کوڑا ہے جو فرشتے کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ اس سے بادلوں کو ہانکتا ہے۔ انہی سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس سے مراد ایک فرشتہ ہے جو خود نظر آتا ہے۔

---

[۳۴۲]　جامع ترمذی: کتاب تفسیر القرآن، باب من سورۃ الرعد ۵: ۳۹۴، مسند امام احمدؒ: مسند عبداللہ بن عباس بن عبدالمطلب عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ۱: ۴۵۲۔ امام ترمذی نے اسے حسن غریب کہا ہے۔ اس کے رجال سب ثقہ ہیں صرف بُکیر بن شہاب مقبول ہیں جیسا کہ تقریب میں لکھا ہے۔ امام ذہبی نے المیزان میں کہا ہے کہ یہ عراقی ہیں اور صدوق ہیں۔

۱۔　تفسیر ابن عطیہ ۱: ۱۹۱

رعد کی سائنسی تحقیق

علماءِ فلسفہ کہتے ہیں : ''رعد'' وہ آواز ہے جو بادلوں کے مختلف حصوں کے آپس میں رگڑ کھانے سے پیدا ہوتی ہے اور ''برق'' وہ چمک ہے جو ان کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر یہ بات قابل قبول نہیں کیوں کہ اس کے بارے میں کوئی صحیح نص منقول نہیں ، واللہ اعلم(۱)۔

ایک رائے یہ ہے کہ ''رعد'' کا اصل معنی حرکت ہے اسی لئے بزدل آدمی کو ''الرِّعدید'' (زیادہ کانپنے والا) کہتے ہیں۔ اور ''ارتَعَدَ'' مضطرب و بے چین ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ اسی سے یہ حدیث بھی ہے :

[۳۴۳] فَجِيءَ بِهِمَا تُرْعَدُ فَرَائِصُهما۔

ان دونوں کو اس حال میں لایا گیا کہ ان کے پہلو کانپ رہے تھے۔ اس حدیث کو امام ابو داؤد نے نقل کیا ہے۔

برق کی تحقیق

''برق'' اصل میں چمک اور روشنی سے ماخوذ ہے اور اسی سے وہ سواری براق مشہور ہے جس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج والی رات سوار ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل دیگر انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی اس پر سواری کی۔ اسی ''رعد'' کی نسبت سے : ''رَعَدَتِ السماء'' (آسمان کڑکا) اور ''برق'' کی نسبت سے ''برقَتِ السماءُ'' (آسمان چمکا) کہا جاتا ہے۔ نیز جو عورت زیب و زینت اختیار کئے ہو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے :

---

[۳۴۳] سنن ابو داؤد : كتاب الصلاة، باب فيمن صلى في منزله ثم أدرك الجماعة يصلي......۱:۱۵۶، جامع ترمذیؒ : كتاب الصلاة، باب ماجاء في الرجل يصلي وحده ثم يدرك الجماعة ۱:۲۲۴، سنن نسائی : كتاب الإمامة، باب إعادة الفجر مع الجماعة لمن صلى وحده ۲: ۱۱۲، سنن دارمی : كتاب الصلاة، باب إعادة الصلوات في الجماعة بعد ما صلى في بيته ۱:۳۲۷، صحیح ابن حبان : كتاب الصلاة، باب مواقيت الصلاة ۴:۴۳۴، مستدرک حاکم : كتاب الإمامة وصلاة الجماعة، باب التأمين ۱:۳۷۲۔ اس حدیث کے راوی یزید بن اسود ہیں اور اس کی سند صحیح ہے امام ترمذی اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اور ذہبی نے ان کی تائید کی ہے۔ اس حدیث میں ان دو آدمیوں کا ذکر ہے جنہوں نے جماعت چھوڑ کر خود ہی نماز پڑھ لی تھی۔

۱۔ فلاسفہ کا یہ قول ذکر کرنا علامہ قرطبیؒ کی تمام مروجہ علوم پر گہری نظر کا واضح ثبوت ہے اور یہ نظریہ آج کے سائنس دانوں میں بھی مروج ہے۔ البتہ مصنف کا اسے قابل قبول نہ سمجھنا ان کے زمانے کے لحاظ سے تھا کہ سائنس نے زیادہ ترقی نہ کی تھی، بعد میں یہی نظریہ بعض سائنس دانوں نے بھی اختیار کیا۔ سب نظام اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چل رہا ہے اس لئے اگر فلاسفہ کی اس رائے کو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تابع کر کے دیکھا جائے تو اس کا امکان موجود ہے۔ واللہ اعلم۔ مترجم

"رعدَتِ المراۃ وبرَقَتْ"۔ اور اگر یہی بات "رعدَ الرجُلُ وبرَق" کسی مرد کے بارے میں کہا جائے تو اس کا معنی ہے: اس نے دھمکی دی اور ڈرایا۔ ابن احمر کہتا ہے:

یا جُلَّ ما بَعُدَتْ علیك بِلادُنا وَطِلابُنا فَابْرُقْ بأرضِك وارعُدِ[1]

ہمارا علاقہ اور تیرے چاہنے والے تجھ سے اب بہت دور ہوگئے ہیں۔ اب تو اپنے ہی علاقہ میں دھاڑتا دھمکاتا رہ۔

اگر ان الفاظ کی نسبت انسانوں کی طرف کرکے کہاجائے: "أرعَدَ القومُ وأبرَقُوا" تو اس کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ بادلوں کی کڑک اور بجلی کا شکار ہوگئے۔ ابوعبیدہ اور ابوعمرو نے "أرعدت السماء وأبرقت" اور "أرعدَالرجل وأبرق" دھمکی دینے اورڈرانے کے معنی میں نقل کیا ہے مگر اصمعی نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ اس معنی کی تائید میں کمیت کا یہ شعر بھی پیش کیا گیا ہے:

أبرِقْ وأرعِدْ یا یزِیـ ـدُ فما وعِیدُكَ لي بِضائر[2]

اے یزید! تم خوب غصہ کرو اور دھمکیاں دو۔ تمہاری دھمکیوں کا مجھے کوئی نقصان نہیں۔

اصمعی کہتے ہیں ہمارے لئے کمیت کا قول حجت نہیں ہے۔

فائدہ: بجلی کڑکنے کے وقت کی دعا

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں: ہم ایک مرتبہ مدینہ اورشام کے درمیان سفر پر تھے۔ ہمارے ساتھ کعب احبار بھی تھے۔ پھر انہوں نے فرمایاکہ تیز ہوا چلنے لگی، بادل گرجنے لگے، پھر سخت بارش شروع ہوگئی اور اولے پڑنے لگے جس سے لوگ ادھر اُدھر منتشر ہوگئے۔ کعب رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا: جوشخص بادلوں کی کڑک سن کر یہ الفاظ کہتا ہے: "سبحَانَ مَنْ یُسَبِّحُ الرعدُ بحَمدِهِ والملائكة من خِیفَتِهِ" (پاک ہے وہ ذات جس کے خوف سے رعد اور دوسرے تمام فرشتے اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں) تو وہ ہر اس مصیبت سے محفوظ رہے گا جوان بادلوں، ان اولوں اوران بجلیوں میں ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میں نے اور کعب نے یہ الفاظ کہہ لئے۔ جب صبح ہوئی اور سب لوگ جمع ہوگئے تو میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے

۱۔ لسان العرب (جلل)

۲۔ کمیت بن زید الاسدی (م ۱۲۶ھ) بنونضر کا مشہور شاعر اور نمائندہ ہے۔ بڑا خطیب اور تاریخ عرب کا ماہر تھا۔ وہ بنو ہاشم کی طرفداری میں مشہور تھا اسی وجہ سے اس کے کئی قصائد ہاشمیات کے نام سے مشہور ہوئے۔ المنتخب من ادب العرب ۴: ۱۳۸

امیر المومنین! مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کل ہماری حالت دوسرے تمام لوگوں سے مختلف تھی ۔ آپ نے فرمایا: وہ کیسے؟ تو میں نے انہیں کعب رضی اللہ عنہ والی بات سنادی ۔ وہ فرمانے لگے : سبحان اللہ! آپ لوگوں نے ہمیں بھی یہ بات بتا دی ہوتی تو ہم بھی اسی طرح کہہ لیتے جس طرح آپ لوگوں نے کہا تھا ۔ایک روایت میں ہے کہ اولوں کا ایک دانہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ناک پر لگا تو انہیں زخم سا ہوگیا ۔ اس روایت کی تفصیل سورۂ رعد میں اِن شاء اللہ آئے گی۔ ان دونوں روایتوں کو ابوبکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب نے صحابہ اور تابعین رحمہم اللہ کی روایات کے ضمن میں ذکر کیا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ جب کبھی بادلوں کی کڑک اور بجلی کی آواز سنتے یہ دعا کیا کرتے :

[۳۴۴] اللّٰھُمّ لا تقتُلنا بغضبِك و لا تُھلِکنا بعذابِك وعافِنا قبل ذلك۔

اے اللہ! ہمیں اپنے غضب سے نہ مارنا ، اپنے عذاب سے ہلاک نہ کرنا اوراس سے پہلے ہی ہمارے لئے عافیت کا فیصلہ فرمادینا۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿یَجۡعَلُوۡنَ اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ﴾(اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں)۔ وہ کانوں میں انگلیاں اس لئے ڈالتے ہیں کہ کہیں قرآن مجید کی آواز کانوں میں پڑ جائے تو اس پر اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانا پڑ جائے۔ یہ ایمان لانا ان کے نزدیک کفر ہے اور کفر موت ہے ۔

’’أصابع‘‘ کی لغوی تحقیق

’’أصابع‘‘ کے مفرد (اصبع) کو پانچ طرح سے پڑھا جاسکتا ہے: ہمزہ کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ ’’إصبَع‘‘ ، ہمزہ کے فتحہ اور باء کے کسرہ کے ساتھ ’’أصبِع‘‘ ، دونوں کے فتحہ کے ساتھ ’’أصبَع‘‘ ، دونوں کے ضمہ کے ساتھ ’’أُصبُع‘‘ اور دونوں کے کسرہ کے ساتھ ’’إصبِع‘‘۔ یہ لفظ مؤنث استعمال ہوتا ہے ۔ اسی طرح ’’أذن‘‘ بھی۔ اس سے تخفیف ، تثقیل اور تصغیر تینوں صورتیں بنائی جاسکتی ہیں ۔تصغیر کی صورت میں اسے ’’أذینة‘‘ کہا جائے گا

---

[۳۴۴] جامع ترمذی : کتاب الدعوات ، باب مایقول إذا سمع الرعد۵: ۵۰۳،مستدرک حاکم: کتاب الأدب ۴: ۴،۱۸، مسند امام احمد:مسندعبداللہ بن عمر بن الخطاب۲: ۲۳۶ ۔ امام نوویؒ نے اپنی کتاب الأذکار میں اسے ضعیف کہا ہے مگر حافظ ابن حجرؒ نے امام نووی سے اتفاق نہیں کیا ،امام ترمذی فرماتے ہیں :حدیث غریب ہے اور اس کی سند میں حجاج ابن أرطاۃ ضعیف ہے مگر حاکمؒ اور نسائیؒ کے ہاں اس کی متابعت موجود ہے اور اسی طریق سے امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اورحافظ ذہبیؒ نے بھی ان کی تائید کی ہے حالاں کہ ان دونوں طرق کا دارومدار ابو مطر پر ہے اور ان کوخود حافظ ذہبیؒ نے غیر معروف شخص کہا ہے ۔ حافظ ابن حجرؒ نے بھی تقریب میں انہیں مجہول کہا ہے، اس حدیث کوالبانی نے ضعیف کہا ۔ ۔ ۔ واللہ اعلم۔

اور اگر کسی کا نام "اُذُنٌ" رکھ کر اس کی تصغیر بنائی جائے تو یہ "اُذَینٌ" بن جائے گا۔ اس صورت میں تذکیر کی طرف منتقل ہوجانے اور تانیث زائل ہوجانے کی وجہ سے یہ بطور مؤنث استعمال بھی نہیں ہوسکے گا۔ اگر "اُذَینَۃ" کہیں بطور عَلَم استعمال کیا جائے تو اس کی صورت یہ ہوگی تو وہ صیغہ تصغیر ہی بطور علم استعمال ہوا ہوگا اور اس کی جمع "آذانٌ" آتی ہے۔ "آذَنتُہٗ" کا معنی ہے: میں نے اسے کان پر مارا۔ "رَجُلٌ اُذُنٌ" اس شخص کو کہتے ہیں جو ہر ایک کی بات پر یقین کرلے اس میں واحد اور جمع دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے، بڑے کانوں والے شخص کو "آذانِيٌّ" کہتے ہیں اسی طرح بڑے کانوں والی بکری کو "نعجۃٌ اُذناء" اور لمبے کانوں والے چھترے کو "کبشٌ آذن" کہتے ہیں۔ جوتے وغیرہ کے اگر کان بنائے جائیں تو کہتے ہیں: "اُذَّنتُ النعلَ وغیرھا تاذینا"۔ اور "اُذَّنتُ الصبيَّ" بچے کے کان کو رگڑنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مِنَ الصَّوَاعِقِ﴾ (بجلی سے) کا معنی ہے بجلی کی وجہ سے۔ "صَواعق" جمع ہے جس کا مفرد "صَاعِقَۃٌ" ہے۔

آسمانی بجلی کیا ہے؟

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ، مجاہد بن جبر رحمہ اللہ اور دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ جب رعد فرشتے کا غصہ تیز ہوجاتا ہے تو اس کے منہ سے آگ کے چنگارے اڑتے ہیں انہی چنگاروں کو "صَاعِقَۃٌ" (آسمانی بجلی) کہا جاتا ہے۔ خلیلؒ کی رائے بھی اس طرح ہے، وہ فرماتے ہیں: اس سے مراد رعد کی سخت کڑک دار آواز ہے جس کے اندر کبھی آگ کا ٹکڑا بھی ہوتا ہے۔ یہ آگ جس چیز پر پڑتی ہے اسے جلا دیتی ہے۔ ابو زید کہتے ہیں: "صَاعِقَۃٌ" ایک ایسی آگ ہے جو سخت کڑک کے ساتھ آسمان سے گرتی ہے۔ خلیلؒ نے کچھ لوگوں سے سین کے ساتھ "سَاعِقَۃٌ" بھی نقل کیا ہے۔ ابو بکر النقاش کہتے ہیں: "صَاعِقَۃٌ" کو "صَعْقَۃٌ" اور "صَاقِعَۃٌ" بھی کہا جاتا ہے اور ان تینوں کا معنی ایک ہی ہے۔ حسن رحمہ اللہ نے اسے قاف کی تقدیم کے ساتھ "مِنَ الصواقِعِ" پڑھا ہے۔ اسی لہجہ میں ابو النجیم کا یہ شعر ہے:

يَحْكُون بالمَصْقُولةِ القواطِعِ تَشَقُّقَ البَرْقِ عن الصّواقِعِ

وہ چمکدار تیز دھار تلواروں کو ایسے چلاتے ہیں جیسے بادلوں کی کڑک سے بجلی نکلتی ہے۔

نحاس کہتے ہیں: یہ بنو تمیم اور بنو ربیعہ کی بعض شاخوں کا لہجہ ہے۔ اگر کسی پر آسمان کی طرف سے بجلی آگرے تو عرب کہتے ہیں: "صَعَقتهُم السماءُ"۔ اور عذاب کے وقت جو چیخیں نکلیں گی انہیں بھی "صَاعِقَۃٌ" کہا گیا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ﴾ [فصلت ۱۷:۴۱] (اور انہیں ذلت آمیز عذاب کی کڑک نے آلیا) اور جب کوئی شخص غش کھا کر گر پڑے تو کہا جاتا ہے: "صَعِقَ الرجلُ صَعْقَۃً

وتَصُعافاً'' اسی معنی میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَ خَرَّ مُوسٰى صَعِقًا﴾[الأعراف۷: ۱۴۳](اور موسیٰ علیہ السلام غش کھا کر گر پڑے)۔ اس سے متعدی بنانا مقصود ہوتو کہا جاتا ہے: ''أَصعقهٗ غيرُه'' (اسے کسی دوسرے نے بے ہوش کردیا)۔ ابن مقبل کا ایک شعر ہے:

تری النُّعَرات الزُّرْقَ تحت لَبانِهِ　　أُحادَ وَ مثنى أَصْعَقَتْها صَواهِلُهُ (۱)

تم دیکھتے ہو کہ نیلے رنگ کی موٹی کھیاں اس کے سینے کے نیچے چمٹی ہوتی ہیں مگر جب وہ ہنہناتا ہے تو وہ ایک ایک دو دو کر کے گرجاتی ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْأَرْضِ﴾[الزمر۳۹: ۶۸](تو جولوگ آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب بے ہوش ہوکر گر پڑیں گے) میں بھی یہی معنی مراد ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے منافقین کے حالات کو ان اندھیروں، کڑک، چمک اور بجلی سے تشبیہ دی ہے جو بارش میں ہوتے ہیں۔ اندھیرے ان کے کفریہ عقائد کی مثال ہیں اور کڑک اور بجلی سے مراد وہ باتیں ہیں جو ان کے انجام کے بارے میں سنا کر انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی مثال بارش سے دی ہے کیوں کہ اس میں وہ تعلیمات ہیں جن کے بارے میں وہ شک وشبہ میں مبتلا ہیں، ان کے اندھے ہونے سے مراد اندھیرے ہیں، قرآن مجید میں جو وعیدیں اور تنبیہات ہیں ان کی مثال کڑک کی سی ہے، اس میں جو نور اور واضح دلائل ہیں جن سے بعض اوقات ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں وہ برق ہیں اور صواعق سے مراد قرآن مجید کے وہ احکام ہیں جن میں دنیا میں ان کے ساتھ قتال کرنے کے لئے کہا گیا ہے اور آخرت میں ان کے لئے وعیدیں سنائی گئی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ صواعق سے مراد جہاد اور زکاۃ وغیرہ ایسے شرعی احکام ہیں جو انہیں دیئے گئے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿حَذَرَ الْمَوْتِ﴾(موت کے ڈر سے)

''حَذَرَ'' کی لغوی تحقیق

''حَذَرَ'' اور ''حِذَارَ'' دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور یہ انہیں دونوں صورتوں میں پڑھا بھی گیا ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں: یہ منصوب ہے کیوں کہ یہ مفعول لأجله ہے اور اصل میں یہ مصدر ہے۔ سیبویہ نے اس پر یہ شعر بھی پیش کیا ہے:

۱۔　لسان العرب (نعر)

وَأغفِرُ عَوْرَاءَ الكريم ادِّخارَهُ وأعْرِضُ عن شتمِ اللئيم تكرُّما(۱)

معزز آدمی سے نامناسب بات ہوجائے تو میں اسے اس لئے معاف کردیتاہوں کہ اس سے تعلق قائم رہے اور کمینے کی گالیاں سن کر اس لئے توجہ نہیں دیتا کہ اسے جواب دینا میرے شایان شان نہیں۔

فراء کہتے ہیں یہ تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ''موت'' زندگی کا متضاد ہے۔ اس کا باب ''ماتَ یموتُ'' بھی آتا ہے اور ''ماتَ یَماتُ'' بھی جیسا کہ رجز گو شاعر نے کہا ہے:

بُنَيّتي سَيِّدةِ الْبناتِ عِيشي ولا يؤْمَن أن تَماتِي (۲)

اے میری پیاری بیٹی، سب لڑکیوں کی سردار! تم سلامت رہو اگر چہ تمہاری موت سے بھی فرار ممکن نہیں۔

اس سے اسم ''مَیِّتٌ'' اور ''مَیْتٌ'' آتا ہے جس کی جمع کے طور پر ''قومٌ موتیَ، أموات، مَیِّتُون اور مَیتُونَ'' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور میم کے فتحہ کے ساتھ ''مَوات'' اس چیز کو کہتے ہیں جس میں روح نہ ہو۔ ''مَوات'' اس زمین کو بھی کہتے ہیں جس کا کوئی انسان مالک نہ ہو اور نہ وہ کسی کے زیر استعمال ہو۔ واو کے فتحہ کے ساتھ ''مَوَتان'' (مردہ چیز) ''حَیَوان'' (زندہ چیز) کا متضاد ہے جیسا کہ کہاجاتاہے: ''اشتَرِ المَوَتَان ولاتشتَرِ الحَیَوَان'' (مردہ چیز خریدو اور زندہ چیز نہ خریدو) مراد یہ ہے کہ زمینیں خریدو اور جانور یا غلام وغیرہ نہ خریدو۔ اگر یہی لفظ میم کے ضمہ کے ساتھ ''مُوتان'' استعمال ہوتو اس کا معنی موت کی وبا ہے جو جانوروں میں پھیل جاتی ہے چناں چہ کہا جاتاہے: ''وَقَعَ في المال مُوتان'' (مویشیوں میں موت کی وبا پھیل گئی)۔ متعدی ہونے کی صورت میں اسے ''أماته الله'' اور ''مَوّته'' (اللہ تعالیٰ نے اسے موت دے دی) کہاجاتاہے۔ اس پر تشدید مبالغہ کی وجہ سے لائی گئی ہے، شاعر کہتا ہے:

فَعُرْوةُ ماتَ مَوتاً مستريحاً فهاأنذا أُمَوَّتُ كلَّ يومٍ (۳)

عروہ تو مرکر آرام پا گیا اور میں ہوں کہ مجھے ہر روز موت دی جاتی ہے۔

اگر کسی اونٹنی کا بچہ مرجائے تو کہاجاتاہے: ''أماتت فهيمُمِيتٌ وَ مُمِيتَةٌ''۔ ابو عبید کہتے ہیں: اگر کسی عورت کا بچہ مر جائے تو بھی یہی کہاجاتاہے، اور اس کی جمع ''مَمَاوِیت'' ہے۔ ابن سکیت کہتے ہیں: جب کسی کا

۱۔ شاعر کا نام حاتم طائی ہے۔ کتاب سیبویہ ا: ۱۸۴، معجم شواهد العربیة ص ۳۲۸

۲۔ الصحاح ا: ۲۶۷، لسان العرب (موت)

۳۔ حوالہ بالا (موت)

ایک بیٹا مرجائے یا کئی بچے مر جائیں تو کہاجاتاہے :''أماتَ فلانٌ''اور ریاکاری کرنے والے عبادت گزار کو ''مُتَماوِت'' کہاجاتاہے ۔ لفظ ''مَوت'' سے تاکید لانامقصود ہوتواسی سے دوسرا لفظ اخذ کرکے کہاجاتاہے : ''مَوتٌ مائتٌ'' بروزن ''لیلٌ لائلٌ'' اگر کوئی شخص کسی معاملے کوڈھیلا چھوڑ دے اور اس کی طرف پوری توجہ نہ دے تو کہاجاتاہے :''مُستَمِیتٌ للأمر''۔ اسی معنی میں رؤبہ کا ایک شعر ہے :

وزَبدُ البحرِ لهٗ كَتِيت والليل فوق الماءِ مُستَميت[1]

سمندر کی جھاگ کا اپنا ایک شور ہے اور رات پانی کے اوپر بے خبر پڑی ہے ۔

''مُستَمِیت'' ایسے جنگ جوکو بھی کہتے ہیں جولڑائی میں موت کی پرواہ نہ کرے ۔ حدیث میں آتا ہے :

[۳۴۵] أرَى القومَ مُستَمِيتِينَ۔

میں دیکھتا ہوں کہ لوگ موت کی پرواہ کئے بغیرلڑنے کے لئے تیارہیں۔

میم کے ضمہ کے ساتھ ''مُوتة''ایک قسم کا جنون اور مرگی ہے جس میں انسان مبتلا ہوجاتاہے۔ اور جب اس سے افاقہ ہوتا ہے تو مریض کی عقل مکمل طور پر اسی طرح بحال ہوجاتی ہے جس طرح سوکر اٹھنے یا نشہ کے بعد ہوش میں آنے سے ہوجاتی ہے ۔اگر میم کے ضمہ اور واو پر ہمزہ کے ساتھ ''مُؤتة'' کہاجائے تو یہ ایک جگہ کانام ہے جہاں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شہید ہوئے تھے ۔

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿وَاللّٰهُ مُحِيطٌم بِالْكَافِرِيْنَ﴾(اور اللہ تعالیٰ کافروں کو گھیرے ہوئے ہیں) مبتدا اورخبرہیں۔ اس کامعنی یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے بھاگ نہیں سکتے۔جب بادشاہ کسی شخص کو ہرطرف سے مکمل طور پرگھیرے میں لے لے تو کہاجاتاہے :''أحاطَ السلطانُ بفلان'' (بادشاہ نے فلاں شخص کا احاطہ کرلیا)، شاعرکہتا ہے :

أحطنَا بهم حتى إذا ما تَيَقَّنُوا بما قد رأوا مالوا جميعاً إلى السِّلْمِ

ہم نے ان کو پوری طرح گھیرلیا یہاں تک کہ جب انہیں ان تمام چیزوں کا یقین آگیا جنہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے تو سب کے سب صلح کے لئے تیار ہوگئے۔

---

[۳۴۵] مسند امام احمدؒ:مسند علي بن أبي طالب رضي الله عنه ۱:۱۸۸۔ یہ ایک لمبی حدیث کاحصہ ہے جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جنگ بدر کا حال بیان فرمایااور یہ الفاظ عتبہ بن ربیعہ کے ہیں جواس نے اپنی قوم کوجنگ سے روکنے کی کوشش میں کہے تھے:''یاقوم! إني أرى قوماً مُستَمِيتِين''۔

۱۔ الصحاح ۱: ۲۶۷، لسان العرب (موت)

اسی معنی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ﴾ [الكهف ۱۸: ۴۲] (اور اس کے میووں کو عذاب نے آگھیرا)۔ ''مُحِيطٌ'' دراصل حاء کے سکون اور یاء کے کسرہ کے ساتھ ''مُحْيِطٌ'' تھا، یاء کی حرکت حاء کی طرف منتقل کرکے اسے ساکن کردیا گیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے پوری مخلوقات کا احاطہ کیا ہوا ہے، وہ سب اس کے قبضے اور اس کے دائرہ اختیار میں ہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالْأَرْضُ جَمِيعًا قَبْضَتُهُ يَوْمَ الْقِيمَةِ﴾ [الزمر ۳۹: ۶۷] (اور اس دن ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی)۔ ایک اور رائے کے مطابق ﴿مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ﴾ سے مراد یہ ہے کہ ان کا حال اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَأَنَّ اللَّهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا﴾ [الطلاق ۶۵: ۱۲] (اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر شے کو اپنے علم سے گھیرے ہوئے ہے)۔ ایک اور رائے کے مطابق اس کا معنی ہے: اللہ تعالیٰ انہیں ہلاک کرنے والے اور پھر اٹھا کر جمع کرنے والے ہیں جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ﴿إِلَّا أَنْ يُحَاطَ بِكُمْ﴾ [يوسف ۱۲: ۶۶] (سوائے اس کے کہ تم سب ہلاک ہوجاؤ)۔ یہاں احاطہ کو کافروں کے ساتھ خاص اس لئے فرمایا کہ آیت کریمہ میں پہلے انہی کا ذکر گزرا ہے، واللہ اعلم۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۰﴾

قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اچک لے جائے۔ جہاں ذرا بجلی نے ان کے لئے روشنی کردی تو وہ اس روشنی میں چلنے لگے اور جب ان پر تاریکی ہوئی تو کھڑے رہ گئے۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی بینائی سلب کرلیتا، بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

لغوی تحقیق اور قراءات

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ﴾ (قریب ہے کہ بجلی ان کی بینائی ہی اچک لے جائے) میں ''يَكَادُ'' سے مراد ''يُقَارِبُ'' یعنی قریب ہونا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''يَكَادُ يفعلُ كذا'' یعنی قریب تھا کہ وہ ایسا کرتا مگر اس نے کیا نہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ ''يَكَادُ'' ''أن'' کے ساتھ ''يَكَادُ أن يفعل'' بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ رؤبہ کا ایک شعر ہے:

قد كادَ من طُول البِلَى أن يَمْصَحا

مصائب کی کثرت کی وجہ سے قریب تھا کہ اس کا نشان مٹ جاتا۔

یہ ''مَصحٌ'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی مٹ جاتا ہے۔ ''یَکَادُ'' کا ''اَن'' کے بغیر آنا زیادہ فصیح ہے کیوں کہ اسے حال کا قرب ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے اور اگر اس کے ساتھ ''اَن'' لگا دیا جائے تو اس سے مستقبل کا اشارہ ملتا ہے جو کہ اصل مقصود سے متعارض ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿یَکَادُ سَنَا بَرْقِہٖ یَذْھَبُ بِالْاَبْصَارِ﴾ [النور ۲۴: ۴۳] (قریب ہے کہ بجلی کی چمک ان کی آنکھوں کو لے جائے)۔ کلام عرب میں بھی کہا جاتا ہے: ''کاد النعام یطیر'' (قریب تھا کہ شتر مرغ اڑنے لگے) اور ''کاد العروس أن یکون أمیرا'' (قریب تھا کہ دولہا شہزادہ بن جاتا)۔ ان دونوں عبارتوں میں بھی ''کاد'' اسی لئے استعمال ہوتا ہے کہ ان کا حال مذکورہ حالت کے قریب ہوتا ہے۔ ''کَادَ'' فعل متصرف ہے جو کہ ''فَعِلَ یَفْعَلُ'' کے وزن پر آتا ہے۔ کبھی اسم کو اس کی خبر کے طور پر بھی لایا جاتا ہے مگر اس کا یہ استعمال بہت کم ہے۔ اور اس کی مثال یہ ہے:

وَمَا کِدتُ آئِباً [1]۔ اور میں واپس آنے والا نہیں تھا۔

''کَرُبَ ، جَعَلَ ، قَارَبَ اور طَفِقَ'' بھی ''کَادَ'' ہی کی طرح استعمال ہوتے ہیں اور ان کی خبر بھی ''اَن'' کے بغیر ہی آتی ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْھِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّۃِ﴾ [الأعراف ۷: ۲۲ ، طہ ۲۰: ۱۲۱] (اور ان دونوں نے جنت کے پتوں کے ساتھ اپنے جسموں کو ڈھانپنا شروع کر دیا) کیوں کہ یہ سب حال اور قرب کے معنی میں آتے ہیں اور یہ سمجھ لو کہ حال پر دلالت کرنے والے الفاظ کے ساتھ ''اَن'' نہیں لگایا جاتا۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿یَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ﴾ (ان کی بینائی اچک لے جائے) میں ''الخطف'' کا معنی تیزی سے لے جانا ہے، ایک پرندے کا نام بھی ''خُطاف'' ہے جسے اس کی تیزی ہی کی وجہ سے یہ نام دیا گیا ہے۔ جن مفسرین نے اس مثال سے مراد قرآن مجید لیا ہے ان کے قول کے مطابق اس عذاب کے خوف سے ان کی آنکھیں بے نور ہونے کے قریب ہو چکی ہیں جو ان منافقین پر نازل ہونے والا ہے۔ جنہوں نے اس سے مراد قرآن مجید کی تعلیمات لی ہیں ان کے قول کے مطابق اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے بیان کی عظمت دیکھ کر ان کی آنکھیں چندھیائی جاتی ہیں۔ یہاں ''یَخْطَفُ'' اور ''یَخْطِفُ'' دونوں طرح سے پڑھنا جائز ہے۔ البتہ ماضی میں طاء کے کسرہ کے ساتھ ''خَطِفَہ یَخْطَفُہُ خَطْفاً'' ہی بہتر ہے اگرچہ اس میں دوسری صورت ''خَطَفَ یَخْطِفُ'' بھی اخفش سے منقول ہے۔ جوہری کہتے ہیں: یہ دوسری صورت بے کار اور غیر معروف ہے اور شاذ و نادر ہی استعمال ہوئی ہے۔ یونس نے اسی ارشادِ باری تعالیٰ میں اسے: ﴿یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطِفُ اَبْصَارَھُمْ﴾ پڑھا ہے۔ نحاسؒ کہتے

۱۔ یہ تابط شرا کے ایک شعر کے الفاظ ہیں جس کے مکمل الفاظ یہ ہیں: ''فَأُبْتُ إلی فَھمٍ وَمَا کِدْتُ آئباً وکم مثلھا فارقتُھا وھو تصفر''۔ لسان العرب (کید) اور حماسۂ ابوتمام ۱: ۷۰ میں بھی یہ غیر منسوب مذکور ہے۔

ہیں: ''یَخطَفُ'' میں سات صورتیں جائز ہیں مگر قراءت فصیحہ ''یَخطَفُ'' ہی ہے۔ علی بن حسین اور یحییٰ وثاب نے اسے طاء کے کسرہ کے ساتھ ''یَخطِفُ'' پڑھا ہے اور سعید الأخفش کہتے ہیں یہ بھی ایک لہجہ ہے۔ حسن، قتادہ، عاصم الجَحْدَرِی اور ابورجاء العُطارِدی نے اسے یاء کے فتحہ اور خاء اور طاء دونوں کے کسرہ کے ساتھ ''یَخِطِفُ'' پڑھا ہے۔ حسن رحمہ اللہ ہی سے ایک اور روایت میں خاء کے فتحہ کے ساتھ بھی منقول ہے[1]۔ فراء کہتے ہیں: بعض قراء مدینہ نے خاء کے سکون اور طاء کی شد کے ساتھ پڑھا ہے[2]۔ کسائی، اخفش اور فراء کہتے ہیں: یاء، خاء اور طاء تینوں کے کسرہ کے ساتھ ''یِخِطِفُ'' بھی جائز ہے[3]۔

یہ چھ صورتیں ہیں جو کہ اس کے طریقہ کتابت کے مطابق بنتی ہیں اور ساتویں صورت عبد الوارثؒ نے بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں: میں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ''یَتَخَطَّفُ'' لکھا ہوا دیکھا ہے۔ سیبویہ اور کسائی کا خیال ہے کہ جو لوگ اسے خاء اور طاء دونوں کے کسرہ کے ساتھ ''یَخِطِفُ'' پڑھنے کے قائل ہیں ان کے نزدیک یہ اصل میں ''یَختَطِفُ'' ہے جس تاء کو طاء میں مدغم کردیا گیا جس کی وجہ سے دو ساکن ایک جگہ جمع ہو گئے اس التقائے ساکنین کو ختم کرنے کے لئے خاء کو کسرہ دے دیا گیا۔ سیبویہ کہتے ہیں: جن قراء نے اسے خاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے تاء کی حرکت خاء کو دی ہے۔ کسائی کہتے ہیں: جنہوں نے یاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے انہوں نے اس وجہ سے پڑھا ہے کہ اس کے اصل ''اختطف'' میں الف مکسور تھا۔ البتہ خاء کے سکون اور تاء کے طاء میں ادغام والی جو قراءت فراء نے بعض اہل مدینہ سے نقل کی ہے وہ غیر مشہور بھی ہے اور اس طرح پڑھنا جائز بھی نہیں کیوں کہ اس میں دو ساکن حروف کو ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے۔ یہ بات نحاس اور دیگر علماء نے کہی ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: حسن اور ابو رجاء سے ''یَخِطُّفُ'' بھی نقل کیا گیا ہے جس کے بارے میں ابن مجاہد کہتے ہیں کہ میرے خیال میں یہ غلط ہے۔ انہوں نے دلیل یہ دی ہے کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿خَطِفَ الْخَطْفَةَ﴾ [الصافات ۳۷: ۱۰] کو کسی نے فتحہ کے ساتھ نہیں پڑھا۔ ﴿أَبْصَارَهُمْ﴾ ''بَصَرٌ'' کی جمع ہے جو کہ دیکھنے کی حس کو کہتے ہیں۔ آیت کریمہ میں اس سے مراد یہ ہے کہ: قرآن کے روشن دلائل اور واضح ثبوت کو حیران کردیں۔ اس

۱۔ تفسیر ابن عطیہ ۱: ۱۹۳ میں بھی یہ دونوں قراءتیں مذکور ہیں۔

۲۔ فراء: معانی القرآن ۱: ۱۸

۳۔ حوالہ بالا

کی بنا پر جن علماءِ نے ''الْبَرْق'' کو منافقین کے ڈرانے کے لئے مثال قرار دیا ہے ان کے قول کے مطابق اس ارشاد باری کا معنی یہ ہوگا کہ قریب ہے کہ آنے والے عذاب کے خوف سے ان کی بینائی جاتی رہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿كُلَّمَآ أَضَآءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ﴾ (جب بجلی ان پر روشنی ڈالتی ہے تو اس میں چل پڑتے ہیں) میں ﴿كُلَّمَا﴾ ظرف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور جب ''كُلَّمَا'' ''إِذَا'' کے معنی میں استعمال ہو تو یہ موصول ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہاں اس میں عامل ﴿مَشَوا﴾ ہے اور یہی اس کا جواب ہے، اس میں ﴿أَضَاءَ﴾ کا کوئی عمل نہیں کیوں کہ وہ ''مَا'' کے صلہ میں ہے۔ مبرّد کہتے ہیں: یہاں مفعول محذوف ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: ''كلَّمَا أضاء لهم البرقُ الطريقَ'' (جب بھی بجلی نے ان کے لئے راستہ روشن کیا)۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ہوسکتا ہے یہاں وزن'' فَعَل ''(مجرد) اور ''أَفْعَلَ'' (مزید فیہ) دونوں کا ایک ہی معنی ہو جیسا کہ ''سَكَتَ'' اور ''أَسْكَتَ'' میں ہے۔ اس طرح ''ضَاءَ'' اور ''أَضَاءَ'' دونوں ایک جیسے ہوجائیں گے اور مفعول محذوف ماننے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔ فراء کہتے ہیں: یہاں ''ضَاءَ'' بھی کہا جاتا ہے اور ''أَضَاءَ'' بھی جیسا کہ پہلے گزرا ہے۔

بارش والی مثال کا خلاصہ

اس ارشاد باری تعالیٰ کا معنی یہ ہوا کہ وہ لوگ جب قرآن مجید سنتے ہیں اور اس کے دلائل ان کے سامنے آتے ہیں تو مانوس سے ہوجاتے ہیں اور قرآن کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کردیتے ہیں اور جب قرآن میں ایسی آیات نازل ہوتی ہیں جن سے یہ آنکھیں بند کئے بھٹکتے پھر رہے ہوتے ہیں اور ان پر عمل کو اپنے لئے مشقت سمجھتے ہیں تو کھڑے ہوجاتے ہیں یعنی اپنے نفاق پر ڈٹ جاتے ہیں۔ یہ بات حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے[1]۔ اسی کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ جب ان کے کھیتوں اور مال مویشی کے لحاظ سے حالات درست ہوجاتے ہیں اور نعمتوں کی فراوانی ہوتی ہے تو کہتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین بڑا برکت والا ہے اور جب کوئی تکلیف آجاتی ہے یا کسی سختی کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو ناراض ہوجاتے ہیں اور اپنے نفاق پر پختہ ہورہتے ہیں۔ یہ قول حضرات ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور قتادہ رحمہ اللہ سے منقول ہے۔ نحاس کہتے ہیں: یہ اچھی تفسیر ہے اور اس کی تائید اس ارشاد باری تعالیٰ سے بھی ہوتی ہے: ﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ أَصَابَهُ خَيْرُ اطْمَأَنَّ بِهِ ۚ وَ اِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهِ﴾ [الحج ۲۲: ۱۱] (اور انسانوں میں کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو اللہ کی پرستش کنارہ پر کھڑا ہوکر کرتا ہے۔ پھر اگر اسے کوئی نفع پہنچ گیا تو وہ اس پر جما رہا اور کہیں اس پر کوئی آزمائش آپڑی تو وہ منہ اٹھا کر واپس چل دیا)۔

۱۔ تفسیر ابن عطیۃ ۱: ۱۹۵

منافقین کی مثال میں صوفیہ کی رائے

علماءِ تصوّف کہتے ہیں: یہ مثال اللہ تعالیٰ نے اس شخص کے بارے میں دی ہے جس کے حالات ابتداء ارادت سے بطور مرید بھی اچھے نہ تھے مگر اس نے ان حالات کی درستگی پر توجہ دینے کی بجائے بڑوں جیسے احوال کے دعوے شروع کردیئے۔ اب اگر وہ ارادت والے آداب کی پابندی کرتے ہوئے اپنے حالات درست کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے لئے روشنی ہوجاتی مگر جب اس نے ان احوال کے ساتھ اپنے دعوے شامل کر لئے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے ارادت والے انوار بھی ختم کردیئے اور وہ اپنے دعوؤں کے اندھیروں میں بھٹکتا رہ گیا اور اسے کہیں نکلنے کا راستہ نہ ملا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ اس مثال سے مراد یہود ہیں: چناں چہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنگ بدر کے موقع پر فتح نصیب ہوئی تو یہود لالچ میں آگئے اور کہا: اللہ کی قسم یہ وہی نبی ہے جس کی بشارت حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے ہمیں دی تھی ان کا کوئی جھنڈا ناکام ہوکر واپس نہیں جائے گا مگر جب جنگ احد کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آزمائش سے گزرنا پڑا تو یہی لوگ مرتد ہوگئے اور شک میں پڑ گئے، یہ رائے کمزور ہے۔ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے صحیح روایت میں ثابت بھی یہی ہے اور جہاں آیت کے عمومی معنی کا تعلق ہے تو اس میں یہ سب لوگ آجاتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ﴾ (اور اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی بینائی سلب کرلیتا)۔ یہاں ''لو'' حرف تمنی ہے اور اس میں شرطیت کا معنی بھی پایا جاتا ہے جس کا جواب ''لام'' سے ہے۔ اس ارشاد باری تعالیٰ کا معنی یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو مسلمانوں کو ان کی نشان دہی فرمادیتے اور مسلمان ان پر قابو پالیتے، انہیں قتل کردیتے یا اپنے درمیان سے نکال دیتے جس سے ان کا وہ بھرم ختم ہوجاتا جو اسلام کے نام پر قائم تھا۔ یہاں ''سمع'' اور ''بصر'' کا ذکر خصوصیت سے اس لئے فرمایا کہ اس سے پہلے آیت میں ان کا ذکر گزر چکا تھا، یا اس لئے کہ قوتِ سماعت اور قوتِ بصارت انسانی اعضاء میں سب سے اشرف ہیں۔ اسے جمع کے صیغے میں ''بِاَسْمَاعِهِمْ'' بھی پڑھا گیا ہے جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے) میں عموم پایا جاتا ہے (جس میں ہر طرح کی قدرت شامل ہے)۔ علماءِ کلام کے نزدیک اس سے مراد ان چیزوں پر قدرت ہے جن کی نسبت ذات باری کی طرف کرنا جائز ہے مگر اس بات پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اسم صفاتی ''قدیر'' سے پکارنا جائز ہے۔ وہ ذات ''قادر'' بھی ہے، ''قدیر'' بھی اور ''مقتدر'' بھی۔ زجاجی کہتے ہیں کہ معنی کے لحاظ سے صفت ''قادر'' کی نسبت ''قدیر'' زیادہ بلیغ ہے۔ ہرویؒ کہتے ہیں: ''قدیر'' اور ''قادر'' دونوں کا

ایک ہی معنی ہے چناں چہ کہا جاتا ہے: ”قَدَرتُ علی الشیئِ، اَقْدِرُ قَدْراً وَقَدَراً وَمَقْدِرَةً وَمَقْدُرَةً وقُدْراناً“ یہ سب ”قدرة“ کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب ”الإقتدار علی الشیئ“ کہا جائے تو اس کا معنی بھی اس چیز پر قدرت رکھنا ہی ہوتا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ ہر ممکن پر جس پر وجود اور عدم کے حالات آسکتے ہوں ”قادر“ بھی ہیں ”مقتدر“ بھی ہیں اور ”قدیر“ بھی۔ لہٰذا ہر مکلف کے لئے یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر ہیں اور ان کی قدرت ایسی ہے جس سے اپنے اور اختیار کے مطابق انہوں نے جو چاہا کیا اور جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ اور اسی طرح یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ بندے کو بھی قدرت حاصل ہے جس سے وہ ایسے کام کرسکتا ہے جن کی طاقت اللہ تعالیٰ اسے حسب معمول دیتے ہیں اور وہ اس قدرت میں خود مختار نہیں کہ جب چاہے اسے استعمال کرلے۔ یہاں باری تعالیٰ کی دیگر صفات کو چھوڑ کر صفت قدرت کا خصوصیت سے اس لئے ذکر فرمایا کہ اس سے قبل ایسا ارشاد باری تعالیٰ گزر چکا ہے جس میں وعید اور ڈراوے کا مفہوم پایا جاتا تھا اوراس کے ساتھ لفظ قدرت ہی زیادہ مناسب تھا، واللہ اعلم۔ یہاں تک علماءِ کوفہ کی گنتی کے مطابق بیس آیات مکمل ہوئیں جن میں سے چار مومنین کی صفات کے بارے میں ہیں۔ اس کے بعد دو آیات میں کفار کا ذکر ہے اور باقی تمام آیات منافقین سے متعلق ہیں۔ اس بارے میں ابن جریج سے بھی ایک روایت ذکر کی جا چکی ہے اور امام مجاہدؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ. ﴿۲۱﴾

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم بچ جاؤ

مکی اور مدنی آیات کی پہچان

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ﴾ (اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو)۔ علقمہ اور مجاہد رحمہما اللہ کہتے ہیں کہ ہر وہ آیت جس کی ابتداء ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ سے ہو سمجھ لو کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی اور ہر وہ آیت جس کے شروع میں ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ہو سمجھ لو کہ وہ مدنی ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں اس بات کی تردید اس سے ہوجاتی ہے کہ یہ سورت اور سورۂ نساء دونوں مدنی ہیں حالاں کہ ان دونوں میں ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ﴾ آیا ہے البتہ یہ بات صحیح ہے کہ جن سورتوں میں ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ آئے

وہ مدنی ہوتی ہیں ۔عروہ ابن زبیر کہتے ہیں کہ جن سورتوں میں کسی حد کا بیان ہو یا کسی فرض کا ذکر ہو وہ مدنی ہوتی ہیں اور جن میں سابقہ امتوں اور عذاب کا ذکر ہو وہ مکی ہوتی ہیں اور یہ بات واضح ہے ۔

لغوی تحقیق

ارشاد باری تعالیٰ :﴿یٰاَیُّھَا﴾ میں ''یا ء'' حرفِ ندا ہے ، ''أيّ'' منادیٰ مفرد مبنی علی الضمہ ہے کیوں کہ وہ منادیٰ لفظی ہے اور لفظ ''ھا'' تنبیہ کے لئے ہے ۔''النَّاس'' مرفوع ہے اور علامہ مازنی کے علاوہ علماءِ نحو کی ایک جماعت کے نزدیک ''أيُّ'' کی صفت ہے ۔ ان کے نزدیک اس پر نصب بھی جائز ہے جیسا کہ ''یَا ھٰذا الرَّجُل'' میں جائز ہے ۔ایک رائے یہ ہے کہ ''أيٌّ'' پر اسی وجہ سے ضمہ ہے جس وجہ سے مقصود بالندا ء مفرد پر ہوتا ہے اور یہاں ''ھا'' کو ایک دوسری ''یاء'' کے بدلے میں لایا گیا ہے اور خود ''یاء'' کو اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ اس پر کلام منقطع نہ ہوجائے اوراس کی جگہ ''ھاء'' کو اس لئے لایا گیا کہ کلام میں اتصال رہے ۔سیبویہ کہتے ہیں : یہ اسی طرح ہوگیا جیسا کہ آپ نے ''یاء'' کو دو مرتبہ ذکر کیا اور ان دونوں کے درمیان میں اسم آگیا جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''ھا ھو ذا''۔ ایک رائے یہ ہے کہ چونکہ دوحروفِ تعریف کوایک جگہ لانا مشکل تھااس لئے بظاہر حرفِ تعریف کے بغیر منادیٰ کو ذکر کرکے اس کو معرّف باللام مقصود بالندا ء کا حکم دے دیا اور اس کے رفع کو اس لئے باقی رہنے دیا کہ وہ مقصود بالندا ء ہے ۔اس کا اعراب اسی طرح حرکت کے ساتھ لایا گیا جس طرح اس صورت میں آتا جب اس کے ساتھ حرف نداء موجود ہوتا۔ اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ یہ منادیٰ ہے ۔اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔

''النَّاس'' سے کون لوگ مراد ہیں ؟

''اَلنّاس '' سے کون لوگ مراد ہیں اس بارے میں علماءِ سے دو اقوال منقول ہیں: ایک یہ کہ اس سے مراد کافر ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت ہی نہیں کرتے تھے اور اس کی دلیل یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ﴾[البقرۃ ۲ :۲۳](اور اگر تم شک میں ہو)اوردوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مرادمومن وکافر سب لوگ ہیں ۔مومنین کو خطاب سے مراد یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہو، اور کفار سے خطاب اس طرح ہے کہ تم اللہ کی عبادت شروع کردو اور یہی بہتر تفسیر ہے ۔

عبادت کیا ہے؟

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿اعۡبُدُوۡا﴾ میں اس بات کا حکم ہے کہ اس کی عبادت کرو اور عبادت سے مراد یہاں

اللہ تعالیٰ کو ایک ماننا اور اس کے دین کی تعلیمات اور شریعت کے احکام کی پابندی کرنا ہے ۔اصل میں عبادت عاجزی اور کمتری کو کہتے ہیں۔ جب کوئی راستہ زیادہ چلنے کی وجہ سے بالکل ہموار ہوجائے تو کہا جاتا ہے:"طَرِيقٌ مُعَبَّدَةٌ" (ہموار کیا ہوا راستہ) ۔ اسی معنیٰ میں طرفہ کا ایک شعر ہے :

وظِيفاً وظيفاً فوق مَورٍ مُعَبَّدِ (۱)

اور وہ تیز چلتے ہوئے اپنے پچھلے پاؤں کی ہڈیوں کو اگلے پاؤں کی ہڈیوں کے ساتھ ملاتی جاتی ہے۔

اسی طرح عبادت فرماں برداری کو اور "تَعَبُّد" شعائر کی ادائیگی کو کہا جاتا ہے اور "عَبَّدْتُ فُلاَنًا" کا معنیٰ ہے : میں نے فلاں آدمی کو غلام بنالیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام صفات کو چھوڑ کر خصوصیت سے صفتِ خالقیت کواس لئے بیان فرمایا کہ عرب بھی اس بات کو مانتے تھے کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے ہی پیدا کیا ہے ۔چناں چہ اس صفت کا ذکر کرنے سے ان پر حجت بھی قائم ہوگئی اورانہیں یاد دہانی بھی ہوگئی۔ایک رائے یہ ہے کہ صفتِ خالقیت ان کو اپنی یہ نعمت یاد دلانے کے لئے ذکر فرمائی۔ اور لفظ "خلق" لغت میں دو معانی کے لئے استعمال ہوتا ہے: اس کا ایک معنیٰ اندازہ لگانا ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے"خَلَقْتُ الأَدِيمَ للسقّاءِ" (یعنی میں نے سقا کے لئے چمڑا کاٹنے سے پہلے اس کی پیمائش کی)، شاعر کہتا ہے(۲) :

وَلأنتَ تَفْرِي ما خَلقتَ و بَعْـ　　　ـضُ القومِ يَخْلُقُ ثم لا يَفْرِي

تم جب کسی کام کاارادہ بنالیتے ہوتو اسے کرگزرتے ہواور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ عزم تو کرتے ہیں مگرکام کرنہیں سکتے۔

حجاج کاایک قول ہے :"ما خلقتُ إلا فريتُ ،ولا وعدتُ إلا وفيتُ "(میں جو ارادہ کرتا ہوں اس پرعمل کرتا ہوں اور جووعدہ کرتا ہوں پورا کرتاہوں)۔"خلق" دوسرا معنیٰ بنانا ،ایجاد کرنا اورکسی سابقہ مثال کے بغیر پیدا کرنا ہے ۔جیساکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا﴾ [العنکبوت ۲۹ :۱۷](اور تم جھوٹ گھڑ لیتے ہو)۔

۱۔　یہ شعرکا دوسرا مصرع ہے ۔ اس کا پہلامصرع اس طرح ہے: تباري عتاق الناجيات وأتبعت (یعنی میری اونٹنی اعلیٰ نسل کی تیز رفتار اونٹنیوں کے ساتھ مقابلہ کرتی ہے)ابن النحاس : شرح المعلقات، معلقة طرفة ابن العبد: ۶۰، ۶۱

۲۔　یہ شعرزہیرابنِ ابی سُلمیٰ نے ہرم بن سنان کی تعریف میں کہا ۔لسان العرب (فری)، کتاب سیبویہ: ۲۸۹، ۳۰۰

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ میں اشکال پیدا ہوسکتا ہے کہ جب کفار کے ہاں یہ بات مسلّم تھی کہ انہیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے تو یہ بھی بدیہی طور پر معلوم ہوگا کہ دوسروں کو بھی اسی نے پیدا کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس طرح کا کلام تنبیہ اور یاددہانی کے لئے لایا جاتا ہے تاکہ نصیحت کا حق ادا ہوجائے چناں چہ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو پہلے لوگ یاد دلائے تاکہ انہیں معلوم ہوجائے کہ جس ذات نے ان لوگوں کو پہلے پیدا کیااور پھر موت دے دی، وہی ذات انہیں بھی موت دے گی۔ یہ اس لئے بھی فرمایا کہ وہ اپنے سے پہلے لوگوں کے بارے میں سوچیں کہ وہ کیسے لوگ تھے؟ اور جن لوگوں کو سزا کے طور پر ہلاک کردیا گیا ان کے جرائم میں کون سے جرم میں یہ لوگ مبتلا ہیں ، مزید اس لئے بھی کہ انہیں معلوم ہوجائے کہ جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو آزمایا گیا انہیں بھی آزمایا جائے گا۔واللہ اعلم۔

''لَعَلَّ'' کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو) میں ''لَعَلَّ'' کا تعلق لفظ ''اُعْبُدُوا'' سے ہے ''خَلَقَكُم'' سے نہیں کیوں کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے جہنم کے لئے پیدا کیا ہے انہیں اس لئے نہیں بنایا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں ۔اس ارشاد اور اس جیسے دوسرے ارشاداتِ باری تعالیٰ ﴿لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾، ﴿ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾، ﴿ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ اور ﴿لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ وغیرہ کی تین صورتیں بیان کی جاتی ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ ''لَعَلَّ'' اپنے اصل معنیٰ میں'' توقع اور امید'' کے لئے استعمال ہوا ہے اور توقع اور امید کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ دونوں انسان کے اپنے بس میں ہیں ، گویا کہ ان کو کہا گیا کہ یہ کام تم اس امید اور توقع پر کرتے رہو کہ تم بات کو سمجھ سکو، نصیحت حاصل کرسکو اور تقویٰ اختیار کرسکو ۔یہ سیبویہ اور دیگر ائمہ لغت کا قول ہے ۔سیبویہ نے ارشادِ باری تعالیٰ:﴿اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى.فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى﴾ [طٰہٰ ۲۰ : ۴۳، ۴۴](تم دونوں فرعون کے پاس جاؤ وہ سرکش ہو چکا ہے مگراس کے ساتھ بات نرم لہجہ میں کرو ہوسکتا ہے وہ نصیحت حاصل کرے یا ڈر جائے) کی تفسیر میں کہاہے کہ تم دونوں اس امّید اور اس توقع کے ساتھ جاؤ کہ شاید فرعون نصیحت حاصل کرلے یا ڈر جائے ۔ابوالمعالیؒ نے بھی اسی تفسیر کو پسند کیا ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ اہلِ عرب ''لَعَلَّ'' کو شک کے معنیٰ کے بغیر بھی صرف'' لامِ كَيْ'' کی جگہ (یعنی تعلیل کے لئے) بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان ارشاداتِ باری تعالیٰ کا معنیٰ یہ ہوگا: تاکہ وہ بات کو سمجھیں، تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں اور تاکہ وہ ڈر جائیں۔ اسی معنیٰ میں شاعر کا قول بھی ہے :

وَ قُلتم لنا كُفُّوا الحروبَ لعلّنا نَكُفُّ ووَثَّقتم لنا كلَّ مَوْثِقِ

فلما كففنا الحرب كانت عهودكم كَلَمْعِ سَرابٍ في المَلا مُتألِّقِ

تم لوگوں نے خود ہمیں کہا کہ جنگ روک دو تاکہ ہم بھی اسے روک دیں اور تم نے ہمیں ہر طرح سے یقین بھی دلایا، مگر جب ہم نے جنگ سے ہاتھ کھینچ لیا تو تمہارے وعدوں کا حال ایسا نظر آیا جیسے دھوپ میں صحراء کی ریت چمکتی ہے۔

یہاں اصل عبارت یوں ہی ہے: ''كُفُّواالحروبَ لنكُفَّ'' (تم لوگ جنگ روک دو تاکہ ہم بھی روک دیں) اور اگر ''لعلّ'' یہاں بھی شک کے معنی میں ہوتا تو عہدوپیان کا ذکر نہ آتا۔ یہی رائے قُطرب اور طبریؒ سے بھی منقول ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ''لعَلَّ'' کسی چیز کواختیار یا طلب کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ اس لحاظ سے مذکورہ بالا آیات کریمہ سے مراد یہ ہوگا کہ تم یہ کام سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے لئے کرو، نصیحت حاصل کرنے کے لئے کرو یا بچنے کے لئے کرو۔اورارشادباری تعالیٰ: ﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ کا معنی یہ ہوگا کہ تم اللہ تعالیٰ کے احکام کو اس مقصد کے تحت قبول کرلو کہ وہ تمہارے آگ سے بچنے کا ذریعہ بن جائیں۔کلام عرب میں بھی یہ اس طرح استعمال ہوتا ہے اورکہاجاتا ہے: ''اتقاه بحقه إذااستقبله به''(اس نے اس کے حق کے ذریعے اپنے آپ کو اس سے بچایا)مراد یہ ہے کہ اس کا حق اداکر کے اپنے آپ کواس کے مطالبے سے بچالیا۔ اسی معنی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

[۳۴۶] كناإذااحمرَّ البأسُ اتقينابالنبيِ صلى الله عليه و سلم۔

جب جنگ میں شدت آجاتی تو ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اوٹ میں ہوکر اپنے آپ کو دشمن سے بچایا کرتے تھے۔

اسی معنی میں عنترہ کا قول ہے:

وَلقد كَرَرْتُ المُهْرَ يَدْمَى نَحْرُه حتى اتّقتني الخيلُ بابني حِذْيَم

میں اپنے نوعمر گھوڑے پر سوار پلٹا تو گھوڑوں نے میرے بیٹے حذیم کی اوٹ میں آکر جان بچائی حالاں کہ میرے گھوڑے کا سینہ لہولہان تھا۔

[۳۴۶] صحیح مسلم: كتاب الجهادوالسير، باب في غزوة حنين ۳:۱۴۰۱،مسندامام احمدؒ: مسند على بن أبي طالب رضى الله عنه ۱:۲۵۳،مسندأبویعلی: مسند على بن أبي طالب رضى الله عنه ۱:۲۵۸،مستدرک حاکم: كتاب قسم الفيء، قسم الفئ والأصل من كتاب الله عزوجل ۲:۱۵۵

ارشادِ باری تعالیٰ:

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرٰشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

وہ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور آسمان سے مینہ برسا کر تمہارے کھانے کے لئے انواع واقسام کے میوے پیدا کئے۔ پس کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہمسر نہ بناؤ اور تم جانتے تو ہو۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرٰشًا﴾ (وہ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا) کی تفسیر چھ مباحث پر مشتمل ہے [۱]:

پہلی بحث: "جَعَلَ" کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿الَّذِیْ جَعَلَ﴾ (وہ جس نے بنایا) میں "جَعَلَ" کا معنیٰ "صَیَّرَ" (بنانا، کرنا) ہے کیوں کہ یہ دو مفعولوں کی طرف متعدی ہے۔ اس کا معنیٰ "خَلَقَ" (پیدا کرنا) بھی آتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ م بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ﴾ [المائدۃ۵: ۱۰۳] (اللہ تعالیٰ نے نہ تو بحیرہ کی کوئی حیثیت بنائی ہے اور نہ ہی سائبہ کی) نیز ارشاد فرمایا: ﴿وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ [الأنعام۶: ۱] (اور اندھیرے اور روشنی بنائی)۔ اور یہ نام رکھنے کے معنیٰ میں بھی آتا ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿حٰمٓ. وَالْکِتٰبِ الْمُبِیْنِ. اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا﴾ [الزخرف۴۳: ۱-۳] (حٰمٓ، روشن کتاب کی قسم کہ ہم نے اس کو قرآن عربی بنایا ہے۔) نیز فرمایا: ﴿وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا﴾ [الزخرف۴۳: ۱۵] (اور انہوں نے ان بندوں میں سے اس کے لئے اولاد مقرر کی؟)۔ اور ﴿وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِکَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا﴾ [الزخرف۴۳: ۱۹] (اور انہوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ اللہ کی بیٹیاں مقرر کرلیا)۔ ان سب آیات میں "جَعَلَ" کا معنیٰ نام رکھنا ہے۔ اس کا ایک معنیٰ لینا بھی آتا ہے جیسا کہ شاعر کا قول ہے:

وَقد جَعلتُ نَفسي تَطیبُ لِضَغْمَةٍ لضَغْمِهِما ھا یَقْرَعُ العظمَ نابُها [۲]

ان دونوں کے ہڈیوں تک کو پہنچ جانے والے زخم ایسے سخت ہیں کہ ان کے بعد جو زخم بھی آتا ہے میرا دل اس سے سکون ہی پاتا ہے۔

۱۔ دراصل اس میں سات مباحث ہیں شاید چھ کا ذکر نساخ کی غلطی کی وجہ سے ہوگیا ہو۔

۲۔ شاعر کا مُغَلّس بن لقیط الاسدی نے اس شعر میں اپنی قوم کے دو آدمیوں کی مصیبت کا حال بیان کیا ہے۔ کتاب سیبویہ ۱: ۳۸۴

اور کبھی ''جَعَلَ'' زائدہ بھی آتا ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

وقد جعلتُ أری الاثنین أربعةً والواحد أثنینِ لمَّا هدّني الكِبَر

جب بڑھاپے نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تو مجھے دو دو کے چار چار اور ایک ایک کے دو دو نظر آنے لگے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّورَ﴾ [الأنعام۶: ۱] (اور اندھیرے اور روشنی بنائی) کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس میں بھی ''جَعَلَ'' زائدہ آیا ہے۔ ''جَعَلَ'' اور ''اِجْتَعَلَ'' دونوں ایک ہی معنیٰ میں آتے ہیں، شاعر کہتا ہے:

ناط أَمْرَ الضِّعافِ واجتعل اللیـ ـلَ كَحَبْلِ العادِيَّةِ المَمدُودِ(۱)

اس نے کمزور لوگوں کے معاملہ کو معلق کر دیا اور خود رات کو اس طرح مستقل سفر پر روانہ ہو گیا جیسے پرانے کنویں میں رسی لٹکی رہتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فِرَاشًا﴾ (بچھونا) کا معنیٰ ایسا بچھونا ہے جو چلنے اور بیٹھنے کے لئے استعمال کیا جائے اور زمین میں جو چیزیں بچھانے کے زمرے میں نہیں آتیں جیسا کہ پہاڑ، صحرا اور سمندر تو یہ چیزیں بچھانے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں کیوں کہ پہاڑ میخوں کی طرح ہوتے ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا. وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا﴾ [النبا۷۸: ۶، ۷] (کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا، اور پہاڑوں کو میخیں نہیں ٹھہرایا) اور سمندروں میں سفر کیا جاتا ہے جس سے انسان کو مفادات حاصل ہوتے ہیں اس بات کو اللہ تعالیٰ نے یوں ارشاد فرمایا ہے: ﴿وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِىْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ﴾ [البقرة۲: ۱۶۴] (اور ان کشتیوں میں جو دریا میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر رواں ہیں)۔

دوسری بحث: قسم میں عرف عام کا اعتبار؟

فقہاءِ شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے قسم کھائی کہ وہ کبھی بچھونے پر رات نہیں گزارے گا اور نہ ہی کبھی چراغ کی روشنی سے فائدہ اٹھائے گا پھر اس نے زمین پر رات گزار دی اور سورج کی روشنی میں بھی بیٹھا تو اس کی قسم نہیں ٹوٹے گی کیوں کہ یہ بچھونا اور چراغ عام محاورہ میں زمین اور سورج کے لئے استعمال نہیں ہوتے۔ فقہائے مالکیہ نے قسموں کے بارے میں اپنے بنیادی اصول کے تحت اسے بھی انسان کی نیت، سبب اور اس بچھونے کی نوعیت پر محمول کیا ہے جس کے بارے میں قسم کھائی گئی ہو۔ اور اگر ان سب میں سے کوئی چیز نہ پائی جائے تو عرف عام کا لحاظ کیا جائے گا۔

۱۔ شاعر کا نام ابو زبید طائی ہے اس شعر میں اس نے اپنے بھانجے جلاج کا مرثیہ کہا ہے۔ لسان العرب، جمهرة اشعار العرب ص ۱۳۸، ابن قتیبہ: تاویل مشکل القران ص ۲۶۶

تیسری بحث: ''سماء''، ''بِناء'' اور ''ماء'' کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَالسَّمَآءَ بِنَآءً﴾ (اور آسمان کو چھت) کا مطلب یہ ہے کہ آسمان زمین کے لئے ایسے ہے جیسے گھر کے لئے چھت ہوتا ہے اسی لئے ارشاد فرمایا اور سچ فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا﴾ [الأنبیاء ۲۱: ۳۲] (اور ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنایا۔) ہر وہ چیز جو بلند ہو اور سایہ مہیا کرے اسے ''سَماء'' (آسمان) ہی کہا جاتا ہے جس پر بحث پہلے گزر چکی ہے ۔اس آیتِ کریمہ میں ﴿تَتَّقُوْنَ﴾ کی بجائے ﴿بِنَاءً﴾ پر وقف کرنا زیادہ بہتر ہے کیوں کہ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا﴾ (وہ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا) میں اللہ تعالیٰ کی شان قدرت بیان کی گئی ہے ۔کہا جاتا ہے ''بَنٰی فُلَانٌ بَیْتًا'' (فلاں شخص نے گھر بنایا) اور ''بَنٰی عَلٰی اَھْلِه'' (اس نے اپنی اہلیہ کے پاس گیا) ان دونوں میں مصدر ''بِنَاءً ''ہی آتا ہے عام لوگ یہ جملہ ''بَنٰی بِاَھْلِه'' بولتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ اس میں اصل یہ معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ شادی کی پہلی رات دولہا پے دلہن کے پاس جانے کے لئے ایک خیمہ لگایا جاتا تھا اسی بناپر اس موقع کے لئے یہی الفاظ استعمال ہونے لگے ۔''بَنٰی'' سے صیغہ اسم فاعل ''بَانٍ'' آتا ہے۔ اسی معنی میں کثرت پیدا کرنے کے لئے شد کے ساتھ ''بَنّٰی'' کہاجاتا ہے۔ ''اِبْتَنٰی'' اور ''بَنٰی'' دونوں گھر بنانے کے معنی میں برابر ہیں، اسی سے دیوار کی بنیاد کو'' بنیان'' کہتے ہیں اور بنیاد بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک اینٹ پر دوسری رکھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک یہ وہ مضبوط ہو جاتی ہے۔

﴿مَاء﴾ اصل میں ''مَوَہٌ'' تھا اس کی واؤ کو متحرک تھی اس کو الف سے بدل دیا گیا اور اس کا ماقبل متحرک ہی رہا جس سے یہ ''مَاہٌ'' ہو گیا، اب دو خفیف حرف ایک جگہ جمع ہو گئے تو ان میں سے ہاء کو ہمزہ کے ساتھ بدل دیا گیا کیوں کہ وہ نسبتاً سخت آواز والا ہے اور الف کے ساتھ اس کی مشابہت بھی زیادہ ہے اس سے یہ لفظ ''مَاءٌ'' بن گیا جس میں پہلا الف تو فعل کا عین کلمہ ہے ، اس کے بعد والا ہمزہ ہاء سے بدلا ہوا ہے اور ہمزہ کے بعد جو الف ہے وہ کہ تنوین کے بدلے میں ہے۔ ابوالحسن کہتے ہیں: علماءِ بصرہ کے نزدیک اسے دو الف کے ساتھ لکھنا ضروری اور تین کے ساتھ لکھنا جائز ہے ۔ جمع اور تصغیر میں اسے اصل کی طرف لوٹا کر ''جِمَالٌ اور اَجْمَالٌ'' کے وزن پر'' مُوَیْہٌ ، اَمْوَاہٌ اور مِیَاہٌ'' کہا جاتا ہے ۔

چوتھی بحث: ''ثَمَرات'' کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّکُمْ﴾ (پھر تمہارے کھانے کے لئے انواع واقسام کے میوے پیدا کئے۔) میں ''اَلثَّمَرَات'' ''ثَمَرَۃٌ'' کی جمع ہے ،اسے ''شَجَرٌ'' کے وزن پر ''ثَمَرٌ'' بھی کہاجاتا ہے

اور اس کی جمع ''خُشُبٌ'' کے وزن پر ''ثُمُرٌ''، ''بُدْنٌ'' کے وزن پر ''ثُمْرٌ'' اور ''اِکَامٌ'' کے وزن پر ''ثِمَارٌ'' آتی ہیں ۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۂ انعام میں آئے گی۔ چابک کے اطراف پر پائی جانے والی گرہوں کو ''ثِمَارُ السِّيَاط'' کہتے ہیں ۔ اس آیتِ کریمہ کا معنیٰ یہ ہے کہ ہم نے تمہارے لئے قسم قسم کے پھل اور کئی طرح کی نباتات پیدا کی ہیں تاکہ تم انہیں اپنے کھانے اور جانوروں کے چارے کے لئے استعمال کرو۔ یہ بات باری تعالیٰ نے اپنے اس ارشادِ گرامی میں وضاحت سے فرمائی ہے :﴿أَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا. ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا. فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا.وَعِنَبًا وَقَضْبًا. وَزَيْتُونًا وَنَخلاً. وَحَدَآئِقَ غُلْبًا. وَفٰكِهَةً وَأَ بًّا.مَّتٰعًا لَّكُمْ وَ لِأَنْعٰمِكُمْ﴾ [عبس ۸۰: ۲۵-۳۲] (بے شک ہم ہی نے پانی برسایا ، پھر ہم ہی نے زمین کو چیرا پھاڑا، پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا، اور انگور اور ترکاری، زیتون اور کھجوریں ، گھنے باغات ، اور میوے اور چارا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چارپایوں کے لئے بنایا۔) اور الحمدُ للہ رزق کا تفصیلی بیان گزر چکا ہے ۔

پانچویں بحث: محنت وقناعت کی عظمت اور گداگری کی مذمت

میں کہتا ہوں اس آیت میں اس بات کی دلیل بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر مخلوق سے بے نیاز کردیا ہے۔ اسی بات کی طرف درجِ ذیل ارشادِ نبوی میں اشارہ کیا گیا ہے :

[۳۴۷] وَاللّٰه لأنْ يأخذَ أحدُكم حَبلَه فَيَحْتطِبَ على ظهره خيرٌ له مِن أن يسأل أحداً أعطاه أو منعه۔

اللہ کی قسم تم میں سے کوئی شخص اپنی رسی پکڑ لے اور کمر پر ایندھن اُٹھا کر لائے تو یہ اس کے لئے دوسروں سے مانگنے سے بہتر ہے خواہ کوئی اسے دے یا نہ دے۔ اسے امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے ۔

صنعتیں اور دیگر تمام کاروبار بھی ایندھن لانے کے معنی میں شامل ہیں۔ اب جو شخص کسی لالچ، امید یا دنیا کی زیب و زینت کے شوق میں اپنے آپ کو اپنے ہی جیسے انسان کا محتاج بناتا ہے تو وہ اُس شخص کا پلو پکڑنے والا ہے جو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے۔

---

[۳۴۷] مسند امام احمدؒ:مسند أبي هريره رضي الله عنه۲:۲۴۶ کے الفاظ قرطبی رحمہ اللہ کے الفاظ سے قریب ترین ہیں ،امام احمد رحمہ اللہ نے اس کے علاوہ مسند أبي هريره رضي الله عنه۲:۱۴۶ میں بھی اس کے ہم معنی حدیث نقل کی ہے،امام مسلم رحمہ اللہ کے الفاظ اگرچہ مکمل طور پر وہ نہیں جو مصنفؒ نے ان کی طرف منسوب نقل کئے ہیں مگر انہوں نے اپنی صحیح :كتاب الزكاة ، باب كراهة المسالة للناس ۲: ۷۲۱ میں اس سے ملتے جلتے الفاظ نقل کئے ہیں،صحیح بخاری :كتاب الزكاة ، باب الاستعفاف عن المسالة۲:۵۳۵،كتاب الزكاة ، باب قوله:﴿ لايَسْأَلُونَ النَّاسَ اِلْحَافاً......﴾۲:۵۳۸،جامع ترمذی : كتاب الزكاة ، باب ماجاء في النهي عن المسالة ۳:۶۴،سنن نسائی: كتاب الزكاة ، باب الاستعفاف عن المسالة۵:۹۶،اور بہت سی دیگر کتب حدیث میں مختلف طرق سے ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ یہ حدیث منقول ہے۔ اور اکثر اس جملہ کی ابتداء ''وَالّذِی نَفْسِي بِيَدِه '' سے ہے۔

علماءِ تصوف کی تفسیر

علماءِ تصوف کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فقر کا راستہ بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اپنا بچھونا زمین کو بناؤ، چھت آسمان کو سمجھو، پانی کو اپنے لئے پاکیزہ مشروب اور گھاس پھوس کو کھانا سمجھو اور دنیا کی خاطر دنیا کی کسی مخلوق کے بندے نہ بنو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ضروریات کا انتظام اس طرح فرما دیا ہے کہ تم پر کسی کا احسان بھی نہیں۔ نوف البکالی [1] کہتے ہیں میں نے ایک دن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ باہر نکلے، ستاروں کی طرف دیکھا اور فرمانے لگے: اے نوف! تم سوئے ہوئے ہو یا دیکھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا: امیر المومنین! میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے فرمایا: سعادت مند ہیں وہ لوگ جو دنیا میں زُہد اختیار کرتے اور آخرت کا شوق رکھتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے زمین کو بچھونا بنایا، اس کی مٹی کو اپنا بستر اور اس کے پانی کو پاکیزہ مشروب سمجھا، قرآن اور دعا کو اپنی چادر اور اپنا لباس بنایا اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح دنیا کو ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے پوری روایت بیان کی جس کا ذکر اِن شاء اللہ تعالیٰ اسی سورت میں ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ﴾ [البقرۃ ۲: ۱۸۶] (میں پکارنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں) کے تحت آئے گا۔

چھٹی بحث: "أَندادًا" کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فَلَا تَجْعَلُوا﴾ (پس نہ بناؤ) میں نہی ہے اور ﴿لِلَّهِ أَندَادًا﴾ کا معنیٰ: اللہ تعالیٰ کے برابر کے، اس جیسے اور اس کے مثل ہے۔ اس کا مفرد "نِدٌّ" ہے۔ محمد بن سمیفع نے بھی اسے "نِدًّا" ہی پڑھا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

نَحْمَدُ اللّٰه و لا نِدَّ له　　　　عنده الخيرُ و ما شاء فعلْ

ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ اُسی کے پاس بھلائی ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

حضرت حسّان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں [2]:

۱۔ نوف بن فضالہ البکالی (م بعد ۹۰ھ)، کعب شامی کے سوتیلے بیٹے تھے۔ عام طور پر کتب قدیمہ سے روایات نقل کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہل کتاب سے ان کی روایات کو جھوٹ قرار دیتے تھے۔ تقریب التھذیب ۱: ۵۶۷

۲۔ یہ شعر آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو سُفیان ابن حرب کے بارے میں کہا تھا جنہوں نے اسلام لانے سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ اشعار کہے تھے، حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے رد میں مکمل قصیدہ کہا جس سے یہ شعر لیا گیا ہے، قصیدہ کا پہلا شعر اس طرح ہے: هَجَوتَ مُحَمَّدًا فَأَجَبْتُ عَنهُ- وَ عِندَاللّٰه فِي ذَاكَ الجَزاءُ (یعنی تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخانہ اشعار کہے تو میں نے ان کی طرف سے تمہیں جواب دیا اس میں میرے لئے اللہ کے ہاں جزاء ہے۔ دیوانِ حسّان ص نمبر ۸

أتهجوه ولستَ له بِنِدٍّ فَشرُّ كما لخيرِ كُمَا الفِداء

کیا تم ان کی ہجو کرتے ہو حالاں کہ ان کے برابر نہیں ہو۔تم دونوں میں جو بُرا ہے وہ اچھے پر قربان ہے۔

''نِدٌّ'' میں مبالغہ کے لئے ''نَدِيدٌ'' اور ''نَدِيدَةٌ'' آتا ہے جیسا کہ لبید نے کہا ہے:

لكيلاَ يكونَ السَّنْدَرِيّ نَدِيدَتِي وَأجعلَ أقواما عُموماً عَمَاعِمَا(1)

میں اس سے مقابلہ اس لئے نہیں کرتا کہ شاعر سَندری میرے برابر نہ کھڑا ہو اور میں اتّفاق سے بسنے والے لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا نہ کردوں۔

ابو عبیدہ کہتے ہیں ''أَنْدَادًا'' کا معنیٰ مدمقابل ہے۔نحاس کہتے ہیں ''أَنْدَادًا'' مفعولِ اول ہے اور ''لِلّٰهِ'' مفعولِ ثانی کے قائم مقام ہے۔جوہری نے نون کے فتحہ کے ساتھ ''نَدٌّ'' لکھا ہے اور اس کا معنیٰ بہت اونچا ٹیلہ بتایا ہے جو اونچائی میں آسمان کے قریب پہنچا ہو۔''نَدٌّ'' ایک طرح کی خوشبو کو بھی کہتے ہیں جو کہ عرب میں نہیں پائی جاتی۔اگر اونٹ بے مہار ہو کر بھاگ جائے تو اس کے لئے ''نَدَّ الْبَعِيرُ يَنِدُّ نَدًّا و نِدَادًا و نُدودًا'' کہا جاتا ہے، اسی سے بعض قراء نے ﴿يَوْمَ التَّنَادِ﴾[غافر ۴۰: ۳۲] (پکار کا دن) پڑھا ہے۔''نَدَّدَ بِه'' کا معنیٰ ہے اس کو اعلانیہ بتادینا اور مشہور کردینا۔

ساتویں بحث: منافقین کی طرف علم کی نسبت کی وجہ

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (اور تم جانتے تو ہو) مُبْتَدا اور خبر ہیں اور یہ جملہ محل حال میں ہے اور اس میں خطاب کفار اور منافقین کے لئے ہے۔یہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے۔

اشکال اور اس کا جواب:

اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں علم کو ان کی طرف کیسے منسوب کردیا حالاں کہ اس سے پہلے ان کی صفات اس کے برعکس مُہر لگانا، دِلوں کا بند ہوجانا نیز بہرا اور اندھا ہونا بیان کی گئی ہیں؟ تو اس دو جواب ہیں:

ایک یہ کہ ﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (اور تم جانتے تو ہو) سے اللہ تعالیٰ نے خاص عِلم مراد لیا ہے جس کی وضاحت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو پیدا کیا، پانی نازل فرمایا اور رزق اگایا جس کا انہیں علم ہے اور وہ یہ بھی

۱۔ سَندری ایک شاعر کا نام ہے جو علقمہ بن علاثہ کے ساتھ تھا جب کہ لبید عامر بن طفیل کے ساتھ تھا۔عامر نے لبید کو ہجو میں سَندری کا مقابلہ کرنے کی دعوت دی تو اس نے اس سے انکار کردیا اور یہ شعر کہا۔لسان العرب (ندد)، الصحاح ۲: ۵۴۳۔

جانتے ہیں کہ یہ نعمتیں انہیں دینے والی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اس کے شرکاء نہیں۔اور دوسرا جواب یہ ہے کہ تم اس کی قدرت اور طاقت کے مظاہر کو دیکھو اور غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے اور یہ سب کچھ اسی کے بس میں ہے واللہ اعلم۔

عقلی دلائل کا حکم

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اندھی تقلید کرنے کی بجائے عقلی دلائل کو بھی استعمال کرنے کا حکم دیا ہے۔ ابن فورکؒ کہتے ہیں: یہ بھی احتمال ہے کہ اس آیت میں مومنین بھی شامل ہوں۔اس لحاظ سے اس کا معنیٰ یہ ہوگا کہ اے مومنو! جب تمہیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے اور تمہاری جہالت دور ہو چکی ہے تو اب اپنے اس عقیدے کو چھوڑ کر دوبارہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ ٹھہرانا۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ. ﴿۲۳﴾

اور اگر تم کو اس کتاب میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے کچھ شک ہے تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جو تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ﴾ (اور اگر تم کو کچھ شک ہے) میں ''ریب'' کا معنیٰ شک ہے، ﴿مِّمَّا نَزَّلْنَا﴾ (اس سے جو ہم نے نازل کیا) سے مراد قرآنِ مجید ہے اور خطاب ان مشرکین کو ہے جن کو مقابلے کی دعوت دی گئی ہے کیوں کہ انہوں نے جب قرآن مجید کو سنا تو کہنے لگے کہ یہ تو اللہ کا کلام نہیں معلوم ہوتا اور ہمیں تو اس میں شک ہے، اسی پر یہ آیت نازل ہوئی۔اور اس کا گزشتہ آیت کے ساتھ ربط یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں اپنی وحدانیت اور قدرت کے دلائل ذکر فرمائے اور اس کے بعد زیرِ نظر آیت میں اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے دلائل ذکر فرما دیئے اور یہ بھی فرما دیا کہ جو کچھ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں وہ ان کا اپنا بنایا ہوا نہیں ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿عَلٰى عَبْدِنَا﴾ (اپنے بندے پر) سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور لفظِ ''عبد'' ''تَعَبُّد'' سے ماخوذ ہے جس کا معنیٰ عاجزی ہے اسی لئے غلام کو بھی ''عبد'' کہا جاتا ہے کیوں کہ وہ بھی اپنے آقا کے سامنے عاجزی کے ساتھ اس کے احکام بجا لاتا ہے طرفہ کہتا ہے:

إلى أن تحامَتْني العشيرة كلها　　　　وَ أُفرِدْتُ إفرادَ البعير المُعَبَّدِ(۱)

یہاں تک کہ پوری قوم نے ہی مجھے چھوڑ دیا اور مجھے ایسا اکیلا کردیا گیا جیسے ایک کمزور اونٹ کو کردیا جاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت ''عبدیت'' کا امتیاز

بعض علماء کہتے ہیں: چونکہ عبادت افضل ترین خصلت ہے اور اس نام سے پکارا جانا سب سے بڑا شرف ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ''عبد'' فرمایا اس پر یہ اشعار بھی پیش کئے گئے ہیں:

يا قومِ قلبي عند زهراءَ　　　　يعرفه السامعُ والرّائي

لا تَدْعُني إلا بِياَ عبدَها　　　　فإنه أشرف أسمائي

اے میری قوم میرا دل تو زہراء کے پاس ہے جسے ہر سننے اور دیکھنے والا جانتا ہے۔ مجھے اس کے غلام کے علاوہ کسی اور نام سے نہ پکارو کیوں کہ وہی میرا افضل ترین نام ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَأْتُوا بِسُورَةٍ﴾ (تو تم بھی ایک سورت بنالاؤ) میں فاء جوابِ شرط کے لئے ہے، ''ائتوا'' مقصور ہے کیوں کہ اس کا تعلق ''مَجِيئ'' سے ہے، یہ ابنِ کیسان کا قول ہے اس آیت میں یہ حکم کفار کو لاجواب کرنے کے لئے دیا گیا ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو تو پہلے سے علم تھا کہ وہ اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ''سورَة'' مفرد ہے جس کی جمع ''سُوَرٌ'' ہے۔ اس کا ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے اور مزید تفصیل اعجاز القرآن میں ہے اس لئے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مِنْ مِّثْلِهٖ﴾ (اسی طرح کی) میں ''مِن'' زائدہ ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر اس کے بغیر ارشاد فرمایا: ﴿فَأْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ [یونس ۱۰: ۳۸] (تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنالاؤ)، ''مِثلِه'' کی ضمیر قتادہ، مجاہد اور دیگر جمہور علماء کے نزدیک قرآن کی طرف راجع ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس کا مرجع تورات اور انجیل ہیں اور اس کا معنیٰ یہ ہے کہ تم اس جیسی کسی اور کتاب میں سے کوئی سورت لے آؤ تو وہ سورت بھی اسی کے مضامین کی تصدیق کرے گی۔ ایک اور قول یہ ہے کہ اس ضمیر کا مرجع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے اس لحاظ سے اس کا معنیٰ یہ ہے کہ ان جیسے کسی اُمّی انسان سے جو نہ لکھتا ہو نہ پڑھتا ہو ایسی سورت بنوا کر لے آؤ۔ ان دونوں تفسیروں کے لحاظ سے یہاں لفظ ''مِن'' تبعیض کے لئے ہوگا۔ ''مِثْله'' پر وقف کرنا وقفِ تام نہیں ہوگا کیوں کہ ﴿وَادْعُوْا﴾ (اور بلالو) بھی اسی سے متعلق ہے۔

۱۔ المنتخب من أدب العرب ۴: ۴۳، ابن النحاس ۱: ۷۸

''شُهَدَاء'' کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَ کُمْ﴾ (اور اپنے مددگاروں کو بلالو) سے مراد یہ ہے کہ اپنے مددگاروں اور ساتھیوں کو بلا لو۔ فراء کہتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے معبودوں کو بلا لو۔ ابن کیسان کہتے ہیں کہ اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ ''شُهَدَاء'' ذکر فرمایا ہے حالاں کہ ''شُهَدَاء'' (گواہ) ان کو کہا جاتا ہے جنہیں کوئی معاملہ دیکھنے کی دعوت دی جائے یا ایسے معاملے کی خبر دینے کے لئے بلایا جائے جسے وہ پہلے دیکھ چکے ہوں جبکہ ان کو تو ﴿فَأْتُوا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ﴾ (تو اسی طرح کی ایک سورت تم بھی بنالاؤ) کہہ کر مقابلے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ اس ارشادِ باری تعالیٰ کا معنیٰ یہ ہے کہ جو تمہیں اپنے ہاں اہلِ علم ملتے ہیں ان سب سے مدد لے لو اور انہیں اپنے ساتھ بھی لے آؤ تا کہ جو تم لاؤ وہ بھی اسے دیکھ لیں اس طرح ان سب کا رد بھی ہوجائے گا اور حجت بھی مکمل ہوجائے گی۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: مجاہدؒ کے قول کا بھی یہی معنیٰ ہے، وہ کہتے ہیں ﴿وَادْعُوْا شُهَدَآءَ کُمْ﴾ (اور اپنے مددگاروں کو بلالو) سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو بلا لاؤ جو تمہاری گواہی دیں اور لوگوں کو یہ بتا سکیں کہ تم نے اس قرآن کا مقابلہ کرلیا ہے۔ نحاس کہتے ہیں ﴿شُهَدَآءَ کُمْ﴾ میں ہمزہ پر نصب فعل کی وجہ سے ہے اور یہ ''شَهِيدٌ'' کی جمع ہے اور اس کے لئے ''قَادِرٌ'' اور ''قَدِيرٌ'' کی طرح ''شَاهِدٌ'' اور ''شَهِيدٌ'' دونوں استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کا معنیٰ (اللہ کے سوا) ہے، ''دُوْنَ'' (نیچے) ''فَوْقَ'' (اوپر) کا متضاد ہے اور اسے آخری حد سے کم کے لئے بولا جاتا ہے، یہ بطور ظرف استعمال ہوتا ہے۔ ''دُوْنَ'' کا ایک معنیٰ حقیر اور ذلیل بھی ہوتا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے[1]:

إذا ما علا المرء رام العلاء　　　وَ يقنع بالدّون من كان دُونا

جب انسان بلند ہوتا ہے تو بلندیوں کے ارادے ہی کرتا ہے اور جب کوئی حقیر ہوتا ہے تو وہ بلندی کے بغیر بھی راضی رہتا ہے۔

اس سے کوئی فعل مشتق نہیں ہوتا۔ بعض اہلِ لغت کہتے ہیں کہ اس سے ''دَانَ يَدُوْنُ دَوْنًا'' فعل بھی آتا ہے۔ یہ (قریب) کے معنیٰ میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ''هٰذا دُوْنَ ذٰلِكَ'' کا معنیٰ ہے یہ اس کی نسبت

۱۔ یہ ابنِ جابرؒ کا شعر ہے۔ العکبری: شرح دیوان المتنبي ۳:۳۴۵

قریب تر ہے، کسی چیز کی طرف رغبت ولانے کے لئے ''دُونَکَه'' کہا جاتا ہے چناں چہ جب حجاج بن یوسف نے صالح[1] کو سولی چڑھا دیا تو بنو تمیم نے اسے کہا ''اَقْبِرنَا صَالِحًا'' (ہمیں صالح کو دفن کرنے دو) تو اس نے جواب دیا ''دُونَکُمُوهُ'' (اسے لے جاؤ)۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ﴾ (اگر تم سچے ہو) سے مراد یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ قرآن کا مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتے ہو جیسا کہ دوسرے مقام پر ان کا یہ دعویٰ مذکور ہے: ﴿لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ﴾ [الأنفال ۸: ۳۱] (اگر چاہیں تو اسی طرح کا کلام ہم بھی کہہ دیں)۔ ''صِدق'' (سچائی) ''کِذب'' (جھوٹ) کا متضاد ہے کہا جاتا ہے: ''صَدَقَ فِی الْحَدِیثِ'' (اس نے سچی بات کی)، ٹھوس نیزوں کو ''صَدقٌ'' کہا جاتا ہے، لڑائی کے موقع پر یوں کہا جاتا ہے: ''صَدَقُوهُمُ الْقِتَالَ'' (انہوں نے خوب جم کر لڑائی کی) اور ''صِدّیق'' ایسے شخص کو کہتے ہیں جو ہمیشہ سچ بولنے والا ہو۔ سچے آدمی کو ''رَجُلٌ صِدقٍ'' کہا جاتا ہے جیسا کہ اچھے آدمی کو ''نِعمَ الرَّجُلُ'' کہتے ہیں ۔ دوستی کے لئے لفظ ''صَدَاقَة'' بھی محبت اور خیر خواہی میں سچا ہونے کی بنا پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ. ﴿۲۴﴾

لیکن جب تم نے ایسا نہیں کیا اور ہرگز کر بھی نہیں سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ (لیکن جب تم نے ایسا نہیں کیا) یعنی ماضی میں تم ایسا نہیں کر سکے۔ ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ (اور ہرگز کر بھی نہیں سکو گے) یعنی آئندہ بھی ایسا کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لحاظ سے ﴿صَادِقِیْنَ﴾ پر وقف تام ہے۔ مفسرین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ آیت کریمہ کا معنی اس طرح ہے: ''وادعوا شهداء کم من دون الله اِنْ کُنْتُمْ صَادِقِیْنَ وَلَنْ تَفْعَلُوا، فَاِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا النَّار'' (اگر تم سچائی پر ہو تو اللہ کے سوا اپنے مددگاروں کو بلاؤ مگر تم ایسا ہرگز نہیں کر سکو گے، اب جب تم ایسا نہیں کر سکتے تو آگ سے ڈرو)۔ اس لحاظ سے ﴿صَادِقِیْنَ﴾ پر وقف تام نہیں ہوگا۔

۱۔ ابوالولید صالح بن عبد الرحمن تمیمی (م تقریباً ۱۰۳ھ) بچپن میں سجستان سے قید ہو کر آیا اور بنو نزال میں پرورش پائی۔ عربی اور فارسی کا ماہر تھا۔ عراق کے گورنر حجاج بن یوسف کا کاتب مقرر رہا اور خراج وغیرہ کے مکمل حسابات کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا ۔ پھر عربی کی مستقل دفتری اصطلاحات متعارف کرائیں۔ اس دور کے تمام کاتبین اس کے شاگرد ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے: اسے حجاج نے سولی نہیں چڑھایا بلکہ یزید بن عبد الملک کے دور میں عمر بن ہبیرہ نے اسے دھوکے سے بلایا اور قتل کروا دیا۔ أعلام زرکلی ۳: ۱۹۲

نحوی عامل کا دوسرے عامل پر داخل ہونا

اگر یہ کہا جائے کہ یہاں ﴿إِنْ﴾ ﴿لَمْ﴾ پر کیسے داخل ہوگیا حالاں کہ قواعد کے مطابق کوئی عامل کسی دوسرے عامل پر داخل نہیں ہوسکتا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں ﴿إِنْ﴾ لفظ میں اپنا عمل کرنے کے لئے نہیں آیا اس لئے اس کا ﴿لَمْ﴾ پر داخل ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ عام ماضی پر داخل ہونا اور ﴿لَمْ﴾ میں بھی اس کا عمل اسی طرح نہیں ہے جس طرح ماضی میں نہیں ہوتا، اس طرح ﴿ إِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا﴾ کا معنیٰ ''إِن تَرَكتُمُ الْفعلَ'' ہوگا۔

لغوی تحقیقات

ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوْا﴾ (اور ہرگز نہیں کرسکو گے) میں نصب ﴿لَنْ﴾ کی وجہ سے ہے، بعض اہل عرب ''لَنْ'' سے جزم دینے کے قائل بھی ہیں جیسا کہ نابغہ کا ایک شعر ہے:

فلن أُعَرِّضْ أَبَيْتَ اللّعْنَ بالصَّفَدِ (۱)

آپ کا اقبال بلند رہے! میں انعام کے لالچ میں آپ کی تعریف چھوڑ کر کسی اور سے وابستہ نہیں ہوں گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بھی اسی طرح استعمال ہوا ہے، وہ فرماتے ہیں جب خواب میں مجھے آگ کی طرف لے جایا گیا تو کسی نے کہا:

[۳۴۸] لَنْ تُرَعْ (ڈرو نہیں)

---

[۳۴۸] یہ لفظ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سے ہے جس میں انہوں نے اپنا خواب بیان کیا کہ دو فرشتے انہیں لے کر جہنم کی طرف چل دیئے تو انہوں آگ سے اللہ کی پناہ مانگنا شروع کی، اسی اثناء میں ایک اور فرشتہ آیا اور اس نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ڈرو نہیں، پھر اس خواب کی تعبیر کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تہجد کی ترغیب دی جس کے بعد وہ رات کو برائے نام ہی آرام کیا کرتے تھے......، مصنف عبدالرزاق: كتاب الصلاة، باب الوضوء في المسجد ۱: ۴۱۹ میں اسی لفظ ''لَنْ تُرَعْ'' کے ساتھ ہے جب کہ صحیح بخاری: كتاب فضائل الصحابة، باب مناقب عبدالله بن عمربن الخطاب رضى الله عنهما ۳: ۱۳۶۷، مسند امام احمدؒ: مسند عبدالله بن عمربن الخطاب رضى الله عنهما ۲: ۲۱۵ اور صحیح ابن حبان: كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ۱۵: ۵۴۷ میں راء اور عین کے درمیان الف کے ساتھ ''لَنْ تُرَاعُ'' منقول ہے۔ صحیح بخاری: ابواب التهجد، باب فضل قيام الليل ۱: ۳۷۸، صحیح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل عبدالله بن عمر رضى الله عنهما ۴: ۱۹۶۷ اور سنن بیہقی: كتاب الصلاة، باب الترغيب في قيام الليل ۴: ۶۸ میں ''لَمْ تُرَعْ'' کے الفاظ ہیں۔

۱۔ نابغہ کا شعر ہے جس کا پہلا مصرع: هذا الثناء فإن تسمع به حَسَناً۔ یا ''فإن تسمعُ لقائله'' ہے۔ ابن النحاس ۲: ۱۷۵

یہ بھی اسی لہجہ کے مطابق ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوا﴾ (اور ہر گز نہیں کر سکو گے) میں ان کو جھنجھوڑنا اور ان کے جذبات کو بھڑکانا مقصود ہے تاکہ اسے وہ اپنے لئے چیلنج سمجھ کر زیادہ ہاتھ پاؤں ماریں اور جب اس کے باوجود کچھ نہ کر سکیں تو ان کی بے بسی پوری طرح کھل کر سامنے آجائے۔ اور ارشاد الٰہی غیب کی خبروں میں سے ایک ہے جن کے بارے میں قرآن مجید نے ان کے ظاہر ہونے سے پہلے خبر دے دی۔ ابن کیسان کہتے ہیں: ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوا﴾ (اور ہر گز نہیں کر سکو گے) میں انہیں یہ یقین دلانا ہے کہ یہ قرآن سچی کتاب ہے اور اس کے جھوٹا ہونے، یا جادو ہونے، یا شعر ہونے، یا گزشتہ اقوام کے قصوں کہانیوں پر مشتمل ہونے کا جو وہم ان لوگوں کو ہوا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ وہ لوگ علم کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر اس جیسی کوئی سورت بنا کر نہیں لاتے۔ اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَاتَّقُوا النَّارَ﴾ (تو اس آگ سے ڈرو) میں ﴿وَلَنْ تَفْعَلُوا﴾ (اور ہر گز نہیں کر سکو گے) کا جواب ہے، اور مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اختیار کر کے اپنے آپ کو آگ سے بچالو۔ ''تقویٰ'' کی وضاحت پہلے گزر چکی ہے اس لئے دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ بنو تمیم اور بنو اسد نے اسے ''فَتَقُوا النَّارَ'' پڑھا ہے۔ سیبویہ نے اس مادہ کو ''قَضَی يَقْضِي'' کے وزن پر ''تَقَي يَتْقِي'' بھی نقل کیا ہے۔

''التي'' کی مفصل تحقیق

''النَّارَ'' مفعول ہے اور ''التي'' اس کی صفت کا یک جزء ہے اور اسے تین طرح سے بولا جاتا ہے: ''التي''، تاء کے کسرہ کے ساتھ ''اللتِ'' اور تاء کے سکون کے ساتھ ''اللَّتْ''۔ یہ اسم مبہم (موصول) ہے جو کہ معرفہ ہے اور مؤنث کے لئے آتا ہے، اور اس معرفہ کو نکرہ بنانے کے لئے اس کا الف لام دور نہیں کیا جاسکتا اور اس کا مفہوم صلہ کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس کا تثنیہ تین طرح سے آتا ہے: ''اللَّتَانِ''، نون تثنیہ کے بغیر ''اللَّتَا'' اور نون کی تشدید کے ساتھ ''اللَّتَانّ''۔ اور اس کے جمع میں پانچ صورتیں آتی ہیں: ''اللَّاتِي'' اور یہی قرآن کی زبان ہے، تاء کے کسرہ کے ساتھ یاء کے بغیر ''اللَّاتِ''، ''اللَّوَاتِي''، یاء کے بغیر ''اللَّوَاتِ''۔ ان میں سے بعض کو ابو عبید نے اس شعر میں جمع کیا ہے:

مَن اللّواتي واللّتي واللّاتي　　زعمن أن قد كَبِرتُ لِداتي [1]

کون ہیں وہ، اور وہ، اور وہ جو سمجھتی ہیں کہ میرے ہم عمر بوڑھے ہو چکے ہیں۔

اور تاء کے بغیر ''اللَّوَا''۔ یہ وہ پانچ صورتیں ہیں جنہیں جوہری نے ذکر کیا ہے۔

۱۔ صحاح الجوہری ۶: ۲۴۷۹

ابن شجری نے مزید ہمزہ اور یاء دونوں کے ساتھ ''اللائي''، ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ یاء کے بغیر ''اللاءِ''اور ہمزہ کو بھی حذف کر کے ''اللا'' نقل کی ہیں ۔ ان کی جمع بنانا مقصود ہو تو ''اللائي'' میں ''اللواتي'' اور ''اللائي'' میں ''اللوائي'' کہا جائے گا۔ جوہری کہتے ہیں : ''اللّتي'' کی تصغیر تاء کے فتحہ اور یاء کی تشدید کے ساتھ آتی ہے۔ رجز گوشاعر کہتا ہے :

بَعد اللُّتَيّاوَ اللُّتَيّا والّتِي إذا عَلَتْهَا أنفسٌ تَرَدَّتِ [۱]

جب تکالیف اور شدتیں حد سے گزر گئیں اور موت کی سختیاں غالب آ گئیں تو کئی لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

بعض شعراء نے ''اللّتي'' پر حرف ندا بھی داخل کیا ہے حالاں کہ عام طور پر لفظ جلالت ''اللہ'' کے علاوہ کسی ایسے لفظ پر حرف نداء داخل نہیں ہوتا جس کے شروع میں الف لام موجود ہو ۔شاید انہوں نے ''اللّتي'' کو بھی لفظ جلالت پر اس وجہ سے قیاس کیا ہے کہ اس کا الف لام بھی دائمی ہے اور اس کا بھی۔ شاعر کہتا ہے :

من أجلِكِ يا الّتي تَيَّمْتِ قلبي وأنت بخيلةٌ بالوُدّ عَنّي [۲]

اے وہ کہ جس نے میرے دل کو مریض بنا دیا تیری وجہ سے ہمارا یہ حال ہوا اور تو ہے کہ ہم سے محبت کرنے میں بخیل بنی بیٹھی ہے۔

سخت مصیبت کو بھی ''اللّتيا'' اور ''اللّتِي'' کہا جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو کہا جاتا ہے: ''فلان وقعَ في اللّتيا وَاللّتِي''۔ ﴿وَقُودُ﴾ اگر واو کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ایندھن اور اگر ﴿وُقُودُ﴾ واو کے ضمہ کے ساتھ ہو تو معنی جلنا ہے ۔﴿النَّاسُ﴾ میں یوں تو سب لوگ داخل ہیں مگر یہاں اس سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں تقدیر کا یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ وہ جہنم کا ایندھن بنیں گے ، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اپنی پناہ میں رکھیں ۔اس طرح اس لفظ میں دراصل عموم ہے اور یہاں استعمال کے لحاظ سے خصوص ہے ۔

پتھر کی تحقیق جو جہنم کا ایندھن ہوگا

﴿الحِجَارَةُ﴾ سے مراد گندھک کا سیاہ پتھر ہے ۔ یہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اور فراء سے منقول ہے۔ یہاں خصوصیت سے اس پتھر کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ باقی تمام پتھروں کی نسبت یہ پانچ طرح سے زیادہ

۱۔ یہ شعر مشہور شاعر عجاج کا ہے ۔ لسان العرب (لتی)، کتاب سیبویہ ۱: ۳۷۶، ۲: ۱۴۰

۲۔ کتاب سیبویہ ۱: ۳۱۰، صحاح الجوہری ۶: ۲۴۸۰ ۔شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔

تکلیف دہ ہوتا ہے: ایک یہ کہ جلدی آگ پکڑتا ہے، دوسرے یہ کہ جب جلتا ہے تو سخت بدبودار ہوتا ہے، تیسرے یہ کہ اس کا دھواں زیادہ ہوتا ہے، چوتھے یہ کہ بدن کے ساتھ سختی سے چپک جاتا ہے اور پانچویں یہ کہ جب گرم ہوجاتا ہے بہت سخت گرمی پہنچاتا ہے۔ اورارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ﴾ (جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے) اس بات کی دلیل ہے کہ جہنم میں صرف انسان اور پتھر ہی ہوں گے اور کچھ نہ ہوگا مگر دیگر کئی مقامات پر مذکور ہے کہ جن اور شیاطین بھی اس میں ہوں گے۔ ایک رائے یہ ہے کہ ﴿الْحِجَارَةُ﴾ سے مرادبُت ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ [الأنبياء ۲۱:۹۸] (بے شک تم اورجن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہودوزخ کا ایندھن ہوں گے) ﴿حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ کا معنی جہنم کا ایندھن ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اور پتھر دونوں جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ ان دونوں کا ذکر کرنے سے مقصود آگ کی شدت کا انداز بتانا ہے کہ وہ انسانوں کو تو جلائے گی ہی ان کے ساتھ ساتھ پتھروں کو بھی جلادے گی۔ پہلی تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ جہنم میں ان لوگوں کو آگ سے بھی عذاب دیا جائے گا اور پتھروں سے بھی۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۳۴۹] كُلُّ مُؤْذٍ في النار۔

ہر تکلیف دینے والا آگ میں جائے گا۔

اس حدیث کے دومفہوم ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ جوکوئی دنیا میں لوگوں کو تکلیف پہنچائے گا اللہ تعالیٰ اسے آخرت میں آگ سے عذاب دیں گے۔ دوسرا معنی یہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی جانور اور کیڑے پتنگے انسانوں کو تکلیف دیتے ہیں قیامت کے دن انہیں جہنمیوں کوسزا دینے کے لئے مقرر کیا جائے گا۔

بعض علماءِ تفسیر کہتے ہیں: پتھروں والی یہ مخصوص قسم کی آگ صرف کفار کے لئے مقرر ہے، واللہ اعلم۔
امام مسلمؒ نے حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا:

---

[۳۴۹] سیوطی: الجامع الکبیر ۳: ۲۱۵، حدیث نمبر ۱۶۶۴۳/۲۵۰ بحوالہ خطیب بغدادی، الجامع الصغیر نمبر ۶۳۴۴، تاریخ بغداد ۱: ۲۹۹ تعارف عثمان الأشج۔ مناوی نے خطیب کا قول نقل کیا ہے کہ یہ عثمان میرے نزدیک قابل اعتماد نہیں ہے، حافظ ذہبیؒ نے بھی اس کا ذکر متروکین میں کیا ہے اور اس حدیث کو غریب بتایا ہے۔ ابن عساکر نے اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منسوب نقل کیا ہے اور ضعیف بتایا ہے، علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر ۱: ۶۵ میں کہتے ہیں: یہ حدیث محفوظ نہیں نہ ہی معروف ہے، علامہ قرطبی نے اپنی کتاب: التذكرة في أحوال الموتى وأمور الآخرة، باب ماجاء في قوله تعالى: ﴿وَقُوْدُهَاالناس وَالْحِجَارَةُ﴾ میں بھی اسے نقل کیا ہے۔

[۳۵۰] یا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ! إنَّ أبا طالب کان یَحُوطُکَ و ینصرُکَ، فھل نفعه ذلك؟ قال: نعم وجدتُه في غمرات من النار فأخرجته إلی ضَحْضَاحٍ۔ في روایة۔ ولولا أنا لکان في الدَّرْكِ الأسفل من النار۔

اللہ کے رسول !ابوطالب جوآپ کی حفاظت اور مدد کیا کرتے تھے کیا انہیں اس کا کچھ فائدہ ہوا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں ! وہ آگ کی گہرائیوں میں تھے تو میں انہیں وہاں سے نکال کر معمولی آگ میں لے آیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اگر میں نہ ہوتا تو وہ آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوتے۔

﴿وَقُودُھَا﴾ مبتدا ہے اور ﴿النَّاسُ﴾ اس کی خبر ہے جبکہ ﴿الْحِجَارَةُ﴾اس کا معطوف ہے۔ حسن، مجاہد اور طلحہ بن مصرّف نے اسے واو کے ضمہ کے ساتھ ﴿وُقُودُھَا﴾ پڑھا ہے اور عبید بن عمیر کہتے ہیں کہ یہ ﴿وَقِیْدُ ھَا النَّاسُ﴾ ہے۔ کسائی اور اخفش کہتے ہیں: یہ واو کے فتحہ کے ساتھ ﴿وَقُودُھَا﴾ ہوتو اس کا معنی ایندھن ہے اور اگر واو کے ضمہ کے ساتھ ﴿وُقُوْدُ﴾ ہوتو فعل (مصدر) ہوگا جیسا کہ آگ جلنے کے لئے کہا جاتا ہے: ''وَقَدَتِ النارُتَقِدُ وُقُوداً(ضمہ کے ساتھ) وَقَداً وِقْدَةً وَوَقِیداً وَوَقُداً ووَقَدَاناً'' (آگ جلی یا جلتی ہے)اور اسی سے مزید فیہ''أوقَدتُھااَنا واستوقَدتُھا'' (میں نے جلائی)استعمال ہوتا ہے، ''اتقاد اور توقُّد'' دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور آگ جلانے کی جگہ کو''موقِد''بر وزن ''مجلِس'' کہتے ہیں، جلنے والی آگ ''مُوْقَدَة''کہلاتی ہے اور ''وَقْدَة'' سخت گرمی کو کہتے ہیں جو کہ دس سے پندرہ دن ہوتی ہے۔ نحاس کہتے ہیں: اس بنا پر تو یہ معلوم ہوا کہ واو کے فتحہ کے ساتھ ﴿وَقُودُھَا﴾ پڑھنا ہی ضروری ہے اس کے علاوہ کوئی صورت درست نہیں کیوں کہ اسی کا معنی ایندھن ہے مگر اخفش نے بعض اہل عرب سے نقل کیا ہے کہ وہ واو کے فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ ''وَقُود''اور ''وُقُود''دونوں کو مصدر بھی استعمال کرتے ہیں اور ایندھن کے معنی میں بھی لیتے ہیں۔ نحاس کہتے ہیں مگر اخفش بھی اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ زیادہ استعمال پہلی صورت ہی کا ہے جیسا کہ واو کے فتحہ کے ساتھ ''الوَضُوء'' پانی کو کہتے ہیں اور واو کے ضمہ کے ساتھ ''الوُضُوء'' مصدر ہے۔

---

[۳۵۰] صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب شفاعة النبیّ صلی اللہ علیہ وسلم لأبي طالب والتخفیف عنه بسببه ۱: ۱۹۵، مستدرک حاکم: کتاب الأھوال ۴: ۶۲۵، مسند ابویعلیٰ: مسند العباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنه ۱۲: ۵۴۔ اور دوسری روایت جس کا علامہ قرطبی نے ذکر کیا ہے وہ صحیح بخاری: کتاب فضائل الصحابة، باب قصة أبي طالب ۳: ۱۴۰۸، کتاب الأدب، باب کنیة المشرک وقال مسور سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول ...... ۵: ۲۲۹۳، صحیح مسلم: کتاب الإیمان، باب شفاعة النبی صلی اللہ علیہ وسلم لأبي طالب والتخفیف عنه بسببه ۱: ۱۹۴، مسند امام احمدؒ: مسند بني ھاشم، حدیث العباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنه ۱: ۳۴۱ میں نیز عبدالرزاق صنعانی، بزار، بیہقی اور ابن ابی شیبہ وغیرہ بہت سے محدثین کے ہاں ملتی ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿أُعِدَّتْ لِلْكَـٰفِرِينَ﴾ (کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے) سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے علاوہ اس میں اور کوئی داخل نہیں ہوگا مگر حقیقتاً یہ بات نہیں ہے کیوں کہ کئی مقامات پر گناہ گاروں کے لئے وعید کا ذکر ہوا ہے اور شفاعت کے بارے میں وارد شدہ صحیح احادیث میں بھی اس کا ذکر آیا ہے جس کی تفصیل آئندہ ان شاء اللہ آئے گی۔

جہنم کی موجودگی کا ثبوت

اس میں اہل حق کے اس موقف کی دلیل بھی ہے کہ آگ پہلے سے پیدا ہوچکی ہے اور موجود ہے۔ اسی میں اہلِ بدعت کے اس قول کی تردید بھی ہے کہ ابھی تک آگ کو پیدا نہیں کیا گیا یہی وہ قول ہے جس کا شکار قاضی منذر بن سعید البلوطی الأندلسی بھی ہوگئے۔امام مسلمؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، آپؓ فرماتے ہیں :

[۳۵۱] كنا مع رسول الله صلى الله عليه وسلم إذ سمع وَجْبَةً؛ فقال النبي صلى الله عليه وسلم : تدرون ما هذا؟، قال قلنا: الله ورسوله أعلم؛ قال: هذا حَجَر رُمِيَ به في النار منذ سبعين خَرِيفاً فهو يَهْوِي في النار الآن حتى انتهى إلى قعرها۔

ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ اچانک کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی ، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگ جانتے ہو یہ آواز کیسی ہے ؟ ہم نے عرض کیا : اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: یہ ایک پتھر کی آواز ہے جو ستر سال پہلے جہنم میں پھینکا گیا تھا ، وہ مسلسل اس کی گہرائیوں کی طرف بڑھتا رہا یہاں تک کہ آج جا کر اس کی تہہ میں پہنچا ۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۳۵۱] صحیح مسلم : كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها ، باب شدة حر نار جهنم وبُعد قعرها وماتأ خذ من المعذبين ۴: ۲۱۸۴، صحیح ابن حبان : كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ،باب صفة النار وأهلها ۱۶: ۵۱۰، مسند امام احمد : مسند أبي هريرة رضي الله عنه ۳: ۶۴ بروایت حضرت أبوہریرہ رضی اللہ عنہ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے یہ حدیث مجھے نہیں ملی۔

[۳۵۲] احتجّت النارُ والجنة فقالت هذه: يدخلني الجبارون والمتكبرون وقالت هذه: يدخلني الضعفاء والمساكين فقال الله عزّ وجلّ لهذه أنتِ عذابي أعذّبُ بكِ مَن أشاءُ وقال لهذه: أنتِ رَحْمَتِي أرْحَمُ بكِ مَن أشاء ولكل واحدة منكما ملؤها۔
جنت اور جہنم کی آپس میں بحث ہوئی تو جہنم نے کہا کہ میرے اندر بڑے بڑے جابر اور متکبر لوگ داخل ہوں گے ۔ جنت نے جواب دیا: میں کمزور اور مسکین لوگوں کا ٹھکانہ بنوں گی ۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جہنم سے مخاطب ہوکر فرمایا: تم میرا عذاب ہو میں جسے چاہوں گا تمہارے اندر ڈال کر عذاب دوں گا اور جنت کو فرمایا: تم میری رحمت ہو تمہارے ذریعے جس کو چاہوں گا اپنی رحمت سے نوازوں گا اور تم دونوں کو اپنی اپنی وسعت کے مطابق بھرا جائے گا۔ امام مسلمؒ نے بھی اسی معنی کی ایک حدیث نقل کی ہے ۔

ایک رائے یہ ہے کہ اس حدیث پاک میں "احتجّت" (بحث کی) کا معنی ہے "تَحتَجُّ" (بحث کریں گی) جیسا کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ والی گزشتہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اس لئے بھی کہ:

[۳۵۳] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دونوں مقامات صلاۃ الکسوف کے دوران بھی دکھائے گئے ۔

[۳۵۴] اور معراج کے سفر کے دوران بھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت میں قدم رنجہ بھی فرمایا۔

---

[۳۵۲] یہ الفاظ امام مسلم کے ہیں اور امام بخاری نے الأدب المفرد اور اپنی صحیح دونوں میں اس سے ملتے جلتے الفاظ نقل کئے ہیں ۔ صحیح مسلم : كتاب الجنة وصفة نعيمها وأهلها، باب النار يدخلها الجبارون والجنة يدخلها الضعفاء ۴: ۲۱۸۶، ۲۱۸۷ (تین طرق سے تین روایات)، صحیح بخاری: كتاب التفسير ، سورة "ق" ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَتَقُولُ هَلْ مِن مَّزِيدٍ﴾ ۴: ۱۸۳۶، الأدب المفرد : باب البغي ۱: ۱۶۷، باب الكبر ۱: ۱۵۸۔ اس کے علاوہ صحیح ابن حبان، مصنف عبدالرزاق، مسند ابویعلیٰ اور مسند امام احمد بن حنبلؒ میں بھی یہ حدیث مختلف طرق سے منقول ہے۔

[۳۵۳] صحیح مسلم: كتاب الكسوف، باب ماعرض على النبي صلى الله عليه وسلم في صلاة الكسوف من أمر......، بروایت جابر رضی اللہ عنہ قال: انكسفت الشمس في عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم يوم مات إبراهيم...... ۲: ۶۲۳، سنن بیہقی: كتاب الصلاة ، باب من تقدم أو تأخر في صلاته من موضع إلى موضع ۳: ۱۵۷، صحیح ابن حبان : كتاب الصلاة ، باب صلاة الكسوف ۷: ۸۷، صحیح ابن خزیمۃ : كتاب الصلاة ، باب التسوية بين كل ركوع وبين القيام الذي قبله من صلاة الكسوف ۲: ۳۱۸، سنن أبوداؤد: كتاب الصلاة ، باب من قال أربع ركعات ۱: ۳۰۶

[۳۵۴] صحیح بخاری: كتاب الصلاة ، باب كيف فرضت الصلوات في الإسراء ، عن أبي ذر رضى الله عنه أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: فرج عن سقف بيتي وأنابمكة ...... ۱: ۱۳۵، كتاب الأنبياء ، باب ذكر إدريس عليه السلام ...... ۳: ۱۲۱۷، صحیح مسلم: كتاب الإيمان ، باب الإسراء برسول الله صلى الله عليه وسلم إلى السمٰوٰت...... ۱: ۱۴۸، صحیح ابن حبان : كتاب إخباره صلى الله عليه وسلم عن مناقب الصحابة ، باب وصف الجنة وأهلها ۱۶: ۴۱۹، مسند امام احمدؒ: حديث المشايخ عن أبيّ بن كعب رضى الله عنه ۶: ۱۷۴

اس لئے اس کے وجود میں اختلاف کرنے کا کوئی جواز نہیں اور توفیق دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہی ہیں۔

﴿أُعِدَّتْ﴾ (تیار کی گئی ہے) ہوسکتا ہے کہ یہ ﴿النَّارُ﴾ سے حال ہو اور اس کا معنی ''مُعَدَّةٌ'' ہو جس کے ساتھ لفظ ''قَدْ'' محذوف ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿أَوْ جَآءُ وْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ﴾ [النساء۴ : ۹۰] (اوراس حال میں وہ تمہارے پاس آجائیں کہ ان کے دل تمہارے ساتھ یا اپنی قوم کے ساتھ لڑنے سے رک گئے ہوں)۔ اس کا معنی بھی یہ ہے: ''قد حصِرَت صدورهم'' (ان کے دل رُک چکے ہوں) یہاں بھی '' حصِرَت '' سے پہلے ''قد '' محذوف ہے کیوں کہ ماضی کی حالٰ کے ساتھ تخصیص ''قد '' کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اس لحاظ سے ﴿الْحِجَارَةُ﴾ پر وقف نہیں ہوسکتا ۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ یہ پہلے جملے سے منفصل ایک مستقل جملہ ہو جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ میں ہے : ﴿وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ أَرْدٰىكُمْ﴾ [فصلت ۴۱ : ۲۳] (اوراسی خیال نے جو تم اپنے پروردگار کے بارے میں رکھتے تھے تم کو ہلاک کردیا)۔ بجستانی کہتے ہیں کہ ﴿أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے) ﴿الَّتِيْ﴾ کا صلہ ہے جیسا کہ سورۂ آل عمران میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاتَّقُوْا النَّارَ الَّتِيْٓ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ [آل عمران ۳ : ۱۳۱] (اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے) ابن الأنباری کہتے ہیں : یہ رائے صحیح نہیں ہے کیوں کہ سورہ بقرہ میں ﴿الَّتِيْ﴾ کا صلہ ﴿وَقُوْدُهَا النَّاسُ﴾ (جس کا ایندھن آدمی ہیں) پہلے سے موجود ہے ، اس کا دوسرا صلہ نہیں لایا جاسکتا جبکہ سورہ آل عمران میں اس کا صلہ ﴿أُعِدَّتْ﴾ کے بغیر اور کوئی نہیں بن سکتا ۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ ءَامَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ أَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَأُتُوْا بِهِ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَآ أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ. ﴿۲۵﴾

اور جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان کو خوشخبری سنادو کہ ان کے لئے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ جب بھی انہیں ان میں سے کسی قسم کا میوہ کھانے کو دیا جائے گا تو کہیں گے یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا۔ اور ان کو ایک دوسرے کے ہم شکل میوے دیئے جائیں گے اوروہاں ان کے لئے پاک بیویاں ہوں گی اور وہ بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

﴿وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ ءَامَنُوْا﴾ (اور جو لوگ ایمان لائے ان کو خوشخبری سنادو) کی تفسیر تین مباحث پر مشتمل ہے :

پہلی بحث: ''تبشیر'' کی لغوی تحقیق

جب اللہ تعالیٰ کفار کی سزاء کا ذکر فرما چکے تو مومنین کے ثواب کا ذکر بھی فرمایا۔ اور''تبشیر'' کا معنی ایسی خبر دینا ہے جس کا اثر چہرے پر ظاہر ہو کیوں کہ جونہی انسان پہلی بار کوئی خبر سنتا ہے اس کا اثر اس کے چہرے پر ظاہر ہوجاتا ہے۔ بعد میں یہ لفظ زیادہ تر خوشی کی خبر کے لئے استعمال ہونے لگا جس کے ساتھ کبھی خوشی کی وجہ بھی ذکر کردی جاتی ہے اور کبھی نہیں کی جاتی ،اور اگر کہیں بری اور تکلیف دہ خبر کے لئے اسے استعمال کیا بھی جائے تو اس کے ساتھ اس تکلیف دہ امر کا ذکرضرور کیا جاتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ [آل عمران ۳:۲۱، التوبة ۹:۳۴، الإنشقاق ۸۴:۲۴] (تو انہیں دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنادو) اس میں فعل شد کے ساتھ ''بَشَّرَ'' بھی آتا ہے اور بغیر شد''بَشَرَ'' بھی ، اور مصدر باء کے کسرہ کے ساتھ ''بِشَارَةٌ'' آتا ہے ۔ خوش خبری سن کر خوش ہونے کے لئے ''أَبشَرَ'' اور''استبشَرَ'' دونوں استعمال ہوتے ہیں، ''بَشِرَ يَبْشَرُ'' خوش ہونے کے معنی میں آتا ہے ، جس شخص کا چہرہ کھلا کھلا ہو اور اس پر ہمیشہ رونق چھائی رہے اسے ''وجهٌ بشيرٌ'' کہتے ہیں، ''بُشرَی'' وہ خوش خبری ہے جو کسی کو سنائی جاتی ہے اور''تباشیر الشيئ'' ہر چیز کی ابتداء کو کہتے ہیں۔

دوسری بحث: ''تبشیر'' کے ضمن میں احکام شرط

اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ اگر کسی مکلّف انسان نے یہ کہا کہ میرے غلاموں میں سے جو کوئی مجھے فلا ں بات کی خوش خبری دے گا وہ آزاد ہے ، چناں چہ یہ خوش خبری اسے ایک سے زیادہ غلاموں نے سنادی تو اس صورت میں صرف وہ غلام آزاد ہوگا جس نے سب سے پہلے خبر سنائی ، اس کے بعد والے آزاد نہیں ہوں گے البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر اس نے خوش خبری کا لفظ استعمال نہیں کیا صرف یہ کہا کہ جس نے مجھے اس بات کی خبر دی وہ آزاد ہے تو کیا اس میں پہلے خبر دینے والا اور بعد میں دینے والے برابر ہوں گے؟۔ علماءِ شافعیہ کہتے ہیں : جی ہاں وہ سب برابر ہوں گے کیوں کہ ان میں سے ہر ایک نے خبر دی ہے ، مگر ہمارے علماءِ (مالکیہ) کہتے ہیں کہ وہ دونوں برابر نہیں ہوں گے کیوں کہ کہنے والے کا مقصود ایسی خبر تھا جو خوش خبری ہو اور خوش خبری پہلی پہلی خبر ہی ہوتی ہے اس لئے پہلے شخص کے ساتھ خاص ہوگی۔ یہ بات عرف عام میں سب جانتے ہیں اس لئے اسے عرف کی روشنی میں ہی سمجھنا ضروری ہے ۔ محمد بن الحسن نے دونوں الفاظ ''أَخْبَرَنِي'' (جس نے مجھے خبر دی) اور''حَدَّثَنِي'' (جس نے مجھ سے بات کی) میں فرق کرتے ہیں، ان کہنا ہے کہ اگر اس شخص نے یہ کہا کہ ''جس کسی نے مجھے فلاں بات کی خبر دی یا جو کوئی فلاں بات میرے علم میں لایا وہ آزاد ہے'' اور یہ کہتے ہوئے

اس نے اپنے دل میں اس خبر کو کسی شرط کے ساتھ مقید بھی نہیں کیا، پھر کسی غلام نے تحریری شکل میں، یا زبانی، یا کسی اور شخص کے ذریعے اسے یہ خبر پہنچادی تو وہ غلام آزاد ہوجائے گا کیوں کہ خبر کا معنی صرف اطلاع دینا ہی ہے۔ اب اگر اس کے بعد کوئی دوسرا غلام بھی اسے یہی بات بتا دیتا ہے تو وہ بھی آزاد ہوجائے گا کیوں کہ اس نے یہ کہا تھا کہ جو کوئی غلام مجھے اس بات کی اطلاع دے گا وہ آزاد ہے۔ اسی طرح اگر اس کے سب غلام اسے یہی خبر دیتے ہیں تو سب آزاد ہوجائیں گے۔اور اگر اس نے یہ بات کہتے وقت اپنے دل میں اس سے مراد خودآ کر زبانی بتانا لیا تھا تو ان غلاموں میں سے اس وقت تک ان میں سے کوئی بھی آزاد نہیں ہوگا جب تک اسے خودآ کر خبر نہیں دے گا۔ امام محمد کہتے ہیں: اگر اس نے الفاظ ہی خبر کے بجائے''حدَّثَنِي'' (مجھ سے بات کی) استعمال کئے تھے تو چونکہ یہ الفاظ خود ہی زبانی بات کرنے پر دلالت کرتے ہیں اس لئے ان میں سے صرف وہی آزاد ہوگا جو خود اپنی زبان سے بتائے گا اس کے علاوہ کوئی نہ ہوگا۔

تیسری بحث: ایمان کے ساتھ اعمال صالحہ کی اہمیت

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾(اور نیک اعمال کئے)میں ان لوگوں کا رد ہے جو یہ کہتے ہیں کہ صرف ایمان کے ذکر سے اعمال کا حکم ثابت ہوجاتا ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو ﴿وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کو الگ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی اور جنت بھی ایمان اور اعمال صالحہ دونوں سے ملتی ہے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ جنت تو ایمان کے ساتھ ملتی ہے اور درجات نیک اعمال سے حاصل ہوتے ہیں، واللہ اعلم۔

لغوی تحقیقات

﴿اَنَّ لَهُمْ﴾(کہ ان کے لئے)﴿بَشِّرِ﴾کے عمل سے محل نصب میں ہے اوراصل عبارت یوں تھی :''وَبَشِّرِالَّذِيْنَ آمَنُوا بِاَنَّ لَهُمْ '' (اور ایمان والوں کو یہ خوش خبری دے دیں کہ ان کے لئے) یا''لِاَنَّ لَهُمْ ''(کیوں کہ ان کے لئے)چناں چہ جب حرف جر حذف ہوگیا تو فعل نے اپنا عمل کیا(جس سے یہ منصوب ہوگیا)۔کسائی اور بصرہ کے علماءِ نحو کہتے ہیں کہ یہاں باء محذوف ہونے کی بناپر'' اَنَّ''کو محل جر میں تصور کیاجائے گا۔﴿جَنّٰتٍ﴾ (باغات) '' اَنَّ'' کا اسم ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور'' اَنَّ''اور اس کا معمول مل کر مفعول ثانی کی جگہ ہیں۔﴿جَنّٰتٍ﴾ کا معنی باغات ہے اور انہیں اپنے اصل معنی''ڈھانپنا'' کی وجہ سے''جَنّٰات''کہا گیا ہے کیوں کہ ان میں جو بھی جاتا ہے وہ اس کو اپنے درختوں سے ڈھانپ لیتے ہیں۔ اسی مادہ سے الفاظ''مِجَن'' ''جَنِين''اور''جُنَّة'' بھی ہیں۔﴿تَجْرِيْ﴾ (چلتی ہیں) میں''جَنّٰات''کا وصف بیان ہوا ہے، یہ فعل مضارع ہونے کی وجہ سے مرفوع

ہے اور یاء کا ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے ۔﴿مِنْ تَحْتِهَا﴾ (ان کے نیچے)سے مراد اس کے درختوں کے نیچے سے ہے اور درختوں کا ذکر اس لئے نہیں کیا گیا کہ لفظ "جَنّٰت"(باغات)سے خود بخود اس کی سمجھ آجاتی ہے ۔ ﴿الْأَنْهَارُ﴾ (نہریں) سے مراد نہروں کا پانی ہے اور جاری ہونے کی نسبت نہروں کی طرف مجازی ہے کیوں کہ چلتا تو پانی ہی ہے نہریں نہیں مگر اختصار کے پیش نظر ان کا ذکر نہیں کیا گیا جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ﴾[یوسف ۱۲: ۸۲](اور بستی سے پوچھو)یعنی بستی والوں سے پوچھو۔ شاعر کہتا ہے :

نُبِّئتُ أنَّ النارَ بعدكَ أُوقِدت وآستبَّ بعدكَ يا كليبُ المجلِسُ [1]

اے کلیب مجھے بتایا گیا ہے کہ تیرے بعد آگ بھڑک اٹھی اور پوری مجلس نے ایک دوسرے کو گالیاں دیں ۔

یہاں بھی اہل مجلس مراد ہیں مگر ان کا ذکر نہیں کیا گیا۔"نَهر""أنهَرت" سے ماخوذ ہے جس کا معنی وسیع کرنا ہے جیسا کہ قیس بن خطیم نے کہا ہے :

مَلَكْتُ بها كَفّي فأنهرتُ فَتقَها يَرى قائماً من دونها ما وراءَ ها [2]

میں نے اس زخم کو اپنے ہاتھ سے مضبوط پکڑا تو اس سے اس کا سوراخ اور وسیع ہوگیا یہاں تک کہ ایک طرف کھڑا شخص اس میں سے دوسری طرف دیکھ سکتا تھا۔یعنی میرے ہاتھ نے نیزے کے اس زخم کو اور وسیع کردیا۔

اسی معنی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادگرامی ہے :

[۳۵۵] ما أنهرَ الدّمَ و ذُكِر اسمُ اللّٰه عليه فَكُلُوه۔

جس جانور کا خوب خون بہے اور اس پر اللہ کا نام بھی لیا گیا ہو تو اسے کھالو

[۳۵۵] صحیح بخاری : كتاب الشركة ، باب قسمة الغنم ۲:۸۸۱،باب من عدل عشرا من الغنم بجذور في القسم ۲:۸۸۶،صحیح مسلم : كتاب الأضاحي ، باب جواز الذبح بكل ما أنهر الدم إلا السن...... ۳: ۱۵۵۸ بروایت حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ،سنن ابوداؤ د : كتاب الضحايا،باب في الذبيحة بالمروة ۳:۱۰۲، جامع ترمذی : كتاب الأحكام والفوائد،باب ماجاء في الذكاء بالقصب وغيره ۴:۸۱، سنن نسائی : كتاب الضحايا، باب في الذبح بالسن ۷:۲۲۶۔مشہور محدثین نے اس حدیث کو تیس سے زائد مقامات پر مختلف طرق سے نقل کیا ہے۔

۱۔ شاعر کا نام مہلہل ہے اور یہ شعر اس نے اپنے بھائی کلیب کے مرثیے میں کہا. تفسير ابن عطية ۱: ۲۰۸

۲۔ یہ شعر قیس بن خطیم نے نیزے کے ایک زخم کے بارے میں کہا۔ لسان العرب (نهر)، تفسير ابن عطية ۱۵: ۲۰۷

اس سے مراد اس جانور کا گوشت ہے جسے اچھی طرح ذبح کیا جائے یہاں تک کہ اس کا خون نہر کی طرح بہہ نکلے۔ ''نَهَرٌ'' کی جمع ''نُهُرٌ'' اور ''أَنْهَارٌ'' ہے اور ''نَهَرٌ نَهِرٌ'' زیادہ پانی والے دریا کو کہتے ہیں۔ ابو ذؤیب کہتا ہے:

أقامت به فابتَنَتْ خَيْمَةً علی قَصَبٍ و فُرَاتٍ نَهِرِ

اس نے وہاں قیام کیا تو ایک چشمے کے کنارے خیمہ لگایا جہاں سے میٹھا پانی بہت کثرت سے بہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جنت کی نہریں زمین کے اندر راستے بنا کر نہیں بہتی ہوں گی بلکہ زمین کے اوپر کی سطح پر ٹھیک ٹھیک بہتی ہوں گی اور جنت والے ان کا رخ جس طرف موڑنا چاہیں گے مڑ جائے گا۔ ﴿أَنْهَارٌ﴾ پر وقف حسن تو ہے تام نہیں کیوں کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ﴾ (اور جونہی انہیں ان میں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا) بھی جنتوں کے وصف میں شامل ہے۔ ﴿رِّزْقًا﴾ (کھانے کو) مصدر ہے۔ رزق کا مفصل ذکر پہلے گزر چکا ہے۔

جنت کے پھلوں کا دنیوی پھلوں سے تقابل

﴿مِن قَبْلُ﴾ (پہلے بھی) سے مراد دنیا کی زندگی میں ہے اور اس کی دو صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ وہ کہیں گے: ''یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم سے دنیا میں کیا گیا تھا''۔ اور دوسری یہ کہ: ''یہ وہی ہے جو ہمیں دنیا میں کھانے کو دیا گیا'' کیوں کہ ان پھلوں کا رنگ دنیا والے پھلوں سے ملتا ہوگا مگر جب وہ انہیں کھائیں گے تو ذائقہ ان سے مختلف پائیں گے۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ ﴿مِنْ قَبْلُ﴾ سے مراد جنت میں ہی ان پھلوں کا ملنا ہے کیوں کہ یہ چیزیں انہیں وہاں بار بار پیش کی جائیں گی چناں چہ جب وہ دن کے پہلے حصہ میں پھل کھا چکیں گے تو دن کے دوسرے حصہ میں انہیں پھر پیش کیے جائیں گے جن کی ظاہری شکلیں اور رنگ دیکھ کر وہ کہیں گے: یہ تو وہی ہیں جو ہمیں پہلے دیے گئے، یہ تو ہم دن کے پہلے حصہ میں کھا چکے ہیں۔ یہ بات وہ پھلوں کے رنگ دیکھ کر کہیں گے مگر جب کھانے کی باری آئے گی تو ان پھلوں کا ذائقہ پہلے والوں کے ذائقے سے مختلف پائیں گے۔ ﴿وَأُتُوا﴾ (اور دیئے جائیں گے) فعل ''أُتِيتُ'' سے ''فُعِلُوا'' کے وزن پر ہے۔ جمہور اسے ہمزہ اور تاء دونوں کے ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں جبکہ ہارون الأعور نے ان دونوں کے فتحہ کے ساتھ ''أَتَوا'' پڑھا ہے۔ پہلی قراءت کے لحاظ سے اس کی ضمیر اہل جنت کی طرف راجع ہے اور دوسری قراءت کے لحاظ سے جنت میں میزبانی کے فرائض سرانجام دینے والے خادموں کی طرف ہے۔ ﴿بِهٖ مُتَشَابِهًا﴾ (ایک دوسرے سے ملتے جلتے) ''به'' کی ضمیر سے حال ہے اور

مطلب یہ ہے کہ وہ دیکھنے میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہوں گے اور ذائقے میں مختلف ہوں گے ، یہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ، مجاہد، حسن اور کئی دیگر حضرات کا قول ہے۔عکرمہ کہتے ہیں:وہ پھل دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے مگراپنی اکثر خصوصیات میں ان سے مختلف ہوں گے ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں : اہل جنت یہ بات تعجب کی بنا پر کہیں گے ورنہ جنت کی ایسی کوئی چیز نہیں جودنیا میں بھی موجود ہو ، البتہ ان کے نام ملتے جلتے ہوں گے۔گویا کہ اہل جنت جب ان پھلوں کے حسن وخوبی اور بڑی جسامت کو دیکھیں گے تو حیران ہوں گے۔قتادہ کہتے ہیں : وہ اعلیٰ قسم کے پھل ہوں گے جن میں کوئی بھی کم درجہ کا پھل شامل نہ ہوگا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ:﴿كِتَاباً مُتَشَابِهًا﴾[الزمر ۳۹:۲۳] (باہم ملتی جلتی کتاب) میں ہے ۔ یہ پھل دنیا کے پھلوں کی طرح نہ ہوں گے کہ جن میں اس طرح کی باہمی مشابہت نہیں پائی جاتی بلکہ اچھے برے سب ملے ہوتے ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ : ﴿وَ لَهُمْ فِيهَآ أَزْوَاجٌ ﴾(اور ان کے لئے اس میں بیویاں ہوں گی)مبتدا او رخبر ہیں۔''أَزْوَاج'' ''زَوجٌ'' کی جمع ہے ، مرد عورت کا زوج ہوتاہے اورعورت مرد کا زوج ہوتی ہے ۔ اصمعی کہتے ہیں: عرب لوگ بہت کم ہی''زوجة '' کا لفظ استعمال کرتے ہیں، البتہ فراء نے کہاہے کہ''زوجة '' بھی استعمال ہوتا ہے جیسا کہ فرزدق نے کہا ہے :

وإنَّ الذي يَسْعَى لِيُفسِدَ زَوجَتي كساعٍ إلى أُسْدِ الشَّرَى يستبيلها[1]

یقیناً جو شخص میری بیوی کا ذہن بگاڑنے کی فکر میں سرگرداں ہے وہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی مقام ''شَرَی'' کے شیروں کی شرمگاہیں پکڑ کران کا پیشاب نکالنے کی کوشش کرے۔

اورحضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی شان میں کہاتھا:

[۳۵۶] وَاللّٰهِ إني لأعلمُ أنها زوجته في الدنيا والآخرة، ولكنَّ اللّٰه ابْتَلاكُم۔
اللہ کی قسم میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ وہ دنیاوآخرت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کا امتحان لیاہے ۔اسے امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے اور کسائی نے بھی یہی رائے اختیار کی ہے ۔

[۳۵۶] صحیح بخاری : كتاب المناقب، باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا ۳:۱۳۷۵، جامع ترمذی : كتاب المناقب ،باب فضل عائشة رضی اللہ عنہا ۵:۷۰۷، مسندابویعلی:مسند عماربن ياسر رضی اللہ عنہ ۳:۲۱۰۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمار رضی اللہ عنہ کوکوفہ کی طرف بھیجاتوانہوں نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا......

۱۔ لسان العرب(بول)، تفسیر ابن عطیة ۱۵: ۲۱۰

پاکیزہ بیویوں کے اوصاف

﴿مُّطَهَّرَةٌ﴾ (پاکیزہ) ﴿اَزْوَاجٌ﴾ کی صفت ہے اور لغت عرب میں "طاھرۃ" کی نسبت ﴿مُّطَهَّرَةٌ﴾ زیادہ جامع اور زیادہ بلیغ ہے۔ اور ان کی اس طہارت سے مراد حیض، تھوک وغیرہ تمام انسانی آلائشوں سے پاک ہونا ہے۔ عبد الرزاق کہتے ہیں: مجھے سفیان ثوری نے بتایا، انہوں نے ابن ابی نجیح سے اور انہوں نے مجاہد رحمہم اللہ سے نقل کیا، وہ فرماتے ہیں: ﴿مُّطَهَّرَةٌ﴾ کا معنی یہ ہے کہ وہ نہ پیشاب پاخانہ کرتی ہوں گی، نہ ان کے بچے پیدا ہوں گے، انہیں حیض بھی نہیں آئے گا، وہ منی سے بھی پاک ہوں گی اور تھوک سے بھی۔ ہم نے ان تمام چیزوں کی تفصیل الحمد للہ اپنی کتاب "التذکرۃ" میں اہل جنت کے حالات، جنت کے بیان اور اس کی نعمتوں کے تذکرہ کے ضمن میں بیان کردی ہے۔

﴿وَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) میں ﴿هُمْ﴾ مبتدا ہے اور ﴿خٰلِدُوْنَ﴾ اس کی خبر ہے جبکہ ظرف (﴿فِيْهَا﴾) کا کوئی اعراب نہیں ہے۔ قرآن کے علاوہ "خالِدین" کو حال بنا کر نصب دینا بھی جائز ہے، "خلود" باقی رہنے کو کہتے ہیں اور اسی سے "جنة الخلد" ماخوذ ہے، کبھی اس مجازاً لمبے عرصے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے جیسا کہ بادشاہوں کو دعا دیتے وقت کہا جاتا ہے: "خلَّدَ اللّٰهُ مُلكَهٗ" (اللہ تعالیٰ ان کی حکومت کو زیادہ عرصہ تک قائم رکھے)، اسی معنی میں زہیر کا درج ذیل شعر بھی ہے:

أَلَا لَا أَرَى على الحوادث باقيًا وَلا خالدًا إلا الجبالَ الرواسيَا

سنو! میرا خیال نہیں کہ یہ حادثات میرے لئے ہمیشہ باقی رہیں اور نہ ہی بلند و بالا پہاڑوں کے علاوہ کوئی چیز زیادہ عرصہ باقی رہنے والی ہے۔

البتہ اس آیت کریمہ میں یہ لفظ اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے جو کہ ہمیشہ رہنا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۚ فَأَمَّا الَّذِيْنَ ءَامَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ أَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۚ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾

اللہ تعالیٰ اس بات سے عار نہیں کرتے کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال بیان فرمائیں، جو مومن ہیں وہ یقین کرتے ہیں کہ وہ ان کے پروردگار کی طرف سے سچ ہے اور

جو کافر ہیں وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کی مراد ہی کیا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے"۔ اور گمراہ بھی کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيِۦٓ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا﴾ (اللہ تعالیٰ عار نہیں کرتے) کی تفسیر میں ابوصالحؒ کی روایت سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ارشاد منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے منافقین کا حال بیان فرمانے کے لئے یہ دونوں مثالیں بیان فرمائیں، یعنی ﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا﴾ (ان کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے آگ جلائی) اور ارشاد باری تعالیٰ: ﴿أَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ﴾ (یا اس بارش کی طرح جو آسمان کی طرف سے اترتی ہے) تو وہ لوگ کہنے لگے کہ اللہ کی شان تو اس سے بلند تر اور عظیم تر ہے کہ مثالیں بیان کرے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ آیت نازل فرمائی۔ اور عطاء نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے نقل کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشرکین کے معبودوں کا ذکر فرمایا ﴿وَإِن يَسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنقِذُوهُ مِنْهُ﴾ [الحج ۲۲ : ۷۳] (اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین کر لے جائے تو اسے اس سے چھڑا نہیں سکتے) اور ان کی چالوں کو مکڑی کا جالا قرار دیا تو وہ کہنے لگے: تم نے دیکھا اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو قرآن نازل کیا ہے اس میں مکھی اور مکڑی کا ذکر بھی اتارا ہے تو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا کہتے ہیں؟ تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ حسن اور قتادہ کہتے ہیں: جب اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مکھی اور مکڑی کا ذکر فرمایا اور انہی سے مشرکین کی مثال بیان فرمائی تو یہود نے اس کا مذاق اڑایا اور کہا کہ یہ تو اللہ کا کلام نہیں لگتا تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی(۱)۔

قراءات اور صرفی تعلیلات

﴿يَسْتَحْيِۦٓ﴾ (عار نہیں کرتا) اصل میں "يَسْتَحْيِيُ" تھا جس کا عین کلمہ اور لام کلمہ دونوں حروف علت تھے چناں چہ لام کلمہ کو تعلیل کے عمل سے اس طرح گزارا گیا کہ یاء پر ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے اس کو ہٹا کر یاء کو ساکن کر دیا گیا۔ اس لحاظ سے اس کا صیغہ اسم فاعل "مُسْتَحْيِي" بنے گا جس کی جمع "مُسْتَحْيُونَ" اور "مُسْتَحْيِينَ" آتی ہے۔ ابن محیصن نے اسے حاء کے کسرہ اور ایک یاء ساکنہ کے ساتھ "يَسْتَحِي" پڑھا ہے۔ ابن کثیر سے منقول ہے کہ یہ قراءت بنو تمیم اور بکر بن وائل کے لہجہ کے مطابق ہے جس میں پہلی یاء کی حرکت حاء کی طرف منتقل کر کے اسے ساکن کر دیا گیا، پھر دوسری یاء کا ضمہ ثقیل ہونے کی وجہ سے دور کر دیا گیا جس سے وہ بھی ساکن ہوگئی اور اس کے بعد دو ساکن حروف کے یکجا ہو جانے کی وجہ سے دو یاؤں میں سے ایک کو حذف

۱۔ الواحدی: أسباب النزول ص ۱۴

کردیا گیا۔اس صورت میں اسم فاعل ''مُسْتَحٍ'' آتا ہے اور اس کی جمع ''مُسْتَحُونَ'' اور ''مُسْتَحِینَ'' آتی ہے، یہ علامہ جوہری کا قول ہے۔اور اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ ﴿یَسْتَحْیٖ﴾ کی تفسیر میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی مثالیں دینے سے نہیں ڈرتا اور اسی معنی کو طبری نے ترجیح دی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ﴾ [الأحزاب ۳۳:۳۷](اور تم لوگوں سے ڈرتے ہو حالاں کہ اللہ تعالیٰ اس کا زیادہ حق دار ہے کہ تم اس سے ڈرو)۔ یہاں اس کا معنی ''تَسْتَحِیْ'' ہے یعنی لوگوں سے حیا کی وجہ سے تم ایسا کرتے ہو۔دیگر مفسرین کا خیال ہے کہ اس کا معنی ''لایَترُک'' (اللہ تعالیٰ نہیں چھوڑے گا) ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد ''لایَمتنِعُ'' (نہیں رُکے گا) ہے۔اور حقیقتاً ''اِستِحیاءٌ'' کا اصل معنی بھی اس خوف سے کسی چیز سے ہٹ جانا اور کسی کام کو کرنے سے باز رہنا ہے کہ مبادا اس کی وجہ سے کوئی بُرا کام ہوجائے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سے ایسا تصور محال ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ ام سلیم ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور اپنی بات کی ابتداء اس طرح کی:

[۳۵۷] یا رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم! إن اللّٰه لا يستحي من الحق......

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ حق بات سے نہیں شرماتے......

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کو بیان کرنے میں شرم محسوس کرنے کا حکم نہیں فرماتے نہ ہی خود اسے ذکر کرنے سے باز رہتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا﴾ (کہ مثال بیان فرمائیں) یہاں ﴿یَضْرِبَ﴾ کا معنی ''یُبَیِّنُ'' (بیان کرتا ہے) ہے اور ﴿أَنْ﴾ فعل کے ساتھ مل کر محل نصب میں ہے اور اس سے پہلے حرف ''مِنْ'' مقدر ہے۔﴿مَثَلًا﴾ ﴿یَضْرِبَ﴾ کی وجہ سے منصوب ہے۔

﴿بَعُوضَةً﴾ کا اعراب

لفظ ﴿بَعُوضَةً﴾ (مچھر) کے منصوب ہونے کی تین صورتیں ہیں: پہلی یہ کہ ﴿مَّا﴾ زائدہ ہے اور ﴿بَعُوضَةً﴾ ارشاد باری تعالیٰ ﴿مَثَلًا﴾ سے بدل ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ ﴿مَّا﴾ نکرہ ارشاد باری تعالیٰ

[۳۵۷] صحیح بخاری: کتاب الغسل، باب إذا احتلمت المرأة:۱۰۸، صحیح مسلم: کتاب الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأة بخروج المني منها: ۲۵۱۔ ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا، وہ فرماتی ہیں: ابوطلحہ کی بیوی ام سلیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: اللہ تعالیٰ حق بات سے نہیں شرماتے، کیا عورت کو بھی احتلام ہوجائے تو غسل کرنا پڑتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں جب وہ پانی دیکھے۔

﴿مَثَلًا﴾ سے بدل ہونے کی بنا پر محل نصب میں ہے اور ﴿بَعُوضَةً﴾ اس ﴿مَّا﴾ کی صفت ہے۔ اور یہاں ﴿مَّا﴾ کی صفت اسم جنس نکرہ اس لئے لائی گئی ہے کہ یہ خود قلیل کے معنی میں ہونے کی وجہ سے مبہم ہے۔ یہ فراء، زجاج اور ثعلب کا قول ہے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ ﴿بَعُوضَةً﴾ سے پہلے لفظ ﴿بَینَ﴾ کو ساقط مانا گیا ہے جو اگر موجود ہوتا تو اسے جر دیتا اس لحاظ سے تقدیر عبارت یوں ہے: "أن یضرِبَ مَثَلاً مَابینَ بَعُوضَة"۔ چناں چہ ﴿بَینَ﴾ کو حذف کرکے اس کا اعراب ﴿بَعُوضَةً﴾ کو دے دیا گیا۔ یہاں "فاء" بمعنی "إلی" ہے یعنی "إلی ما فوقها" (اس سے اوپر کی چیزوں تک)۔ یہ کسائی کا اور روایت میں فراء کا بھی قول ہے، ابو العباس نے بھی اس کے شاہد کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے:

یا أَحْسَنَ النَّاسِ ما قَرْنًا إِلی قَدَمٍ ولا جِبالَ مُحِبٍّ واصلٍ تَصِلُ

اے سر سے لے کر پاؤں تک افضل ترین انسان! کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا جو محب کو وصال کا شرف بخش دے۔

یہاں بھی "مابین قرن" مراد ہے مگر جب "بَینَ" کو حذف کردیا گیا تو "قَرناً" منصوب ہوگیا۔ ﴿بَعُوضَةً﴾ کے نصب کی چوتھی صورت یہ ہے کہ یہاں "یَضرِبُ" کا معنی "یَجعَلُ" ہے اور ﴿بَعُوضَةً﴾ مفعول ثانی ہے۔ ضحاکؒ، ابراہیم بن ابی عبلہؒ اور رؤبہ بن العجاجؒ نے اسے رفع کے ساتھ ﴿بَعُوضَةٌ﴾ پڑھا ہے اور یہ بنو تمیم کا لہجہ ہے۔ ابو الفتح کہتے ہیں ﴿بَعُوضَةٌ﴾ کو مرفوع پڑھنے کا جواز یہ بنتا ہے کہ ﴿ما﴾ یہاں "الَّذی" کے معنی میں بطور اسم استعمال ہوا ہے اور ﴿بَعُوضَةٌ﴾ مبتداء محذوف ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے۔ اس لحاظ سے تقدیر عبارت یوں ہے: "لایَستَحیِي أن یضرِبَ الَّذی هوَبَعُوضَةٌ مَثَلاً"۔ اس میں موصول کے صلہ "هُوَ" کو حذف کردیا گیا اور وہی مبتدا تھا۔ بعض قراء کے ہاں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿تَمَامًا عَلَى الَّذِيٓ أَحْسَنَ﴾ [الأنعام ۶: ۱۵۴] (نیکی کرنے والوں پر نعمتوں کی تکمیل کے لئے) میں بھی اسی طرح کی قراءت ہے جس میں تقدیر عبارت "عَلَی الَّذِیَ هُوَ أَحْسَنُ" ہے۔ سیبویہ کہتے ہیں: "ماأنا بالذی قائل لک شیئا" میں بھی اصل عبارت "هوَ قائل" ہے۔ نحاس کہتے ہیں "ما" کے بعد کسی چیز کا محذوف ہونا "الذی" کے بعد محذوف ہونے سے زیادہ بُرا ہے کیوں کہ "الذی" کی ایک ہی صورت ہے اور اس کے ساتھ اسم بھی قدرے لمبا ہوتا ہے۔ "ضَربتُ له مثلاً" میں ایک قول یہ ہے کہ اس کا معنی "مَثَّلتُ له مثلاً" ہے اور یہ سب ایک ہی قسم کی بنائیں ہیں، ان کی ایک ہی مثال ہے اور ایک ہی قسم ہے۔ اور "ضرب" بھی "نوع" ہی کو کہتے ہیں۔ ﴿بَعُوضَةً﴾ "فَعُولَةٌ" کے وزن پر ہے اور "بَعَضَ" سے ماخوذ ہے جس کا معنی کسی کے گوشت کو (دانت سے) کاٹنا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ "بَعَضَ" اور "بَضَعَ" دونوں کا ایک ہی معنی ہے، اور "بَعَّضتُه تبعیضاً" کا معنی ہے "جَزَّأتُهُ فَتَبَعَّضَ" یعنی میں

نے اس کے ٹکڑے کئے تو وہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔اور''بَعُوضٌ'' کھٹل کو بھی کہتے ہیں جس کا مفرد''بَعُوضَۃ'' آتا ہے۔ یہ باتیں جوہری اور دیگر علماء نے بیان کی ہیں[1]۔

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾(اور جو اس سے بڑھ کر ہو)کے بارے میں یہ بات تو گزر چکی ہے کہ اس میں''فاء'' ''إلى'' کے معنی میں ہے اور جن علماءِ کے نزدیک پہلی ﴿ما﴾ صلہ زائدہ ہے ان کے نزدیک دوسری ﴿مَا﴾معطوفہ ہے۔ کسائی ، ابوعبیدہ اور دیگر علماء فرماتے ہیں کہ ﴿فَمَا فَوْقَهَا﴾ کا معنی ''ماذُونَها'' ہے یعنی جو چھوٹا ہونے میں ان سے بھی بڑھ کر ہے۔کسائی کہتے ہیں اس کی مثال اسی طرح ہے جیسے کوئی پوچھے کہ:''أتراه صغيراً''(کیا وہ تمہیں چھوٹا نظر آتا ہے؟) تو جواب میں اسے کہاجائے : ''أوفوق ذلک''(بلکہ اس سے بھی بڑھ کر)یعنی جس قدروہ تمہیں نظر آرہا ہے وہ اس سے بھی چھوٹا ہے۔ قتادہ اور ابن جریج کہتے ہیں : اس کا معنی بڑائی میں زیادہ ہونا ہے۔﴿أَنَّهُ﴾ کی ضمیر﴿مَثَلًا﴾ کی طرف راجع ہے یعنی جو مثال دی گئی ہے وہ حق ہے اور''حق'''' باطل'' کا متضاد ہے اور اس کی جمع''حقوق'' ہے اور کاف کے فتحہ کے ساتھ ''حقَّة'' میں اس کی نسبت زیادہ تخصیص کا معنی پایاجاتا ہے چناں چہ کہاجاتا ہے:''هٰذِه حَقَّتِي''اورمطلب اس کا بھی یہی ہے کہ یہ میرا حق ہے۔

ارشادباری تعالیٰ:﴿وَ أَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ (اور جوکافر ہیں)میں''امّا'' کی شد کو ناپسند کرتے ہوئے اس کی ایک میم کو یاء سے بدل دیتے ہیں اور''اَيْمَا'' کہتے ہیں۔عمر ابن ابی ربیعہ کے درج ذیل شعر کو اسی لہجہ کے مطابق پڑھا جاتا ہے :

رأتْ رجلاً أيما إذاالشمسُ عارضَتْ　　　فَيَضْحَى و أيمَابالعشِيِّ فَيَخصِرُ[2]

اسے ایک ایسا شخص نظر آیا کہ جب سورج بلند ہوجاتا ہے تو وہ بھی سامنے نکل آتا ہے اور جب شام ہوتی ہے تو ٹھنڈ کی وجہ سے پسلیوں میں درد محسوس کرنے لگتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿فَيَقُوْلُوْنَ مَا ذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا﴾(وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کی مراد ہی کیاہے؟)میں ﴿ مَا ذَا﴾ کے بارے میں علماءِ نحو کا اختلاف ہے بعض کہتے ہیں یہ ایک اسم کے قائم مقام ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے : ''ای شیئ أراد الله''۔ اس طرح یہ ﴿أَرَادَ﴾ کے عمل کی وجہ سے محل نصب میں ہوگا۔ ابن کیسان کہتے ہیں یہی صورت بہتر ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ''مَا''اسم تام ہے جو کہ مبتدا ہونے کی وجہ سے

۱۔ صحاح الجوہری ۳: ۱۰۶۶

۲۔ یہ شعر اس نے اپنے جسم کی کمزوری اور رنگ پھیکا پڑجانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ العقد الفرید۶: ۲۴۸، المساعد علی تسهيل الفوائد ،۴: ۲۱۷

محل رفع میں ہے اور "ذا" بمعنی "الَّذِي" ہے جو کہ اس مبتدا کی خبر ہے اور اس طرح تقدیر عبارت یوں ہے: "ماالذی أراد الله بهذا مثلاً" (یہ مثال دے کر اللہ تعالیٰ چاہتے کیا ہیں؟) اور ان کے لفظ استفہام سے مراد انکار ہے۔ ﴿مَثَلًا﴾ منصوب ہے اور اصل عبارت "أرادمثلاً" ہے۔ یہ ثعلب کا قول ہے، اور ابن کیسان کہتے ہیں: یہ تمییز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جو کہ حال کی جگہ واقع ہوئی ہے۔

ہدایت وگمراہی کا مفہوم

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ (اس سے اللہ تعالیٰ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت بخشتا ہے) کی تفسیر میں ایک قول یہ ہے کہ یہ کفار کے قول کا حصہ ہے، گویا وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہ مثال دے کر کیا چاہتے ہیں جس سے لوگ دو فریقوں میں تقسیم ہوگئے ہیں ایک فریق گمراہ اور دوسرا ہدایت یافتہ۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے خبر ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے کیوں کہ وہ اس بات کو تو مانتے تھے کہ ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ انہیں بتا دیں کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ یہاں ہدایت وگمراہی سے مراد توفیق دینا اور توفیق کا سلب کر لینا ہے۔

معتزلہ کا رد

اس سے معتزلہ وغیرہ کی تردید بھی ہوگئی جو یہ کہتے ہیں کہ ہدایت یا گمراہی کے خالق اللہ تعالیٰ نہیں ہیں جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ (اس سے اللہ تعالیٰ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے) سے مراد صرف ان پر اس لفظ کا اطلاق ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو گمراہ کہہ کر پکارتے ہیں جیسا کہ کہا جاتا ہے: "فَسَّقتُ فلاناً" یعنی میں نے فلاں شخص کو فاسق کہا کیوں کہ اللہ تعالیٰ تو کسی کو گمراہ نہیں کرتے۔ یہ بھی ان کی ایک چال ہے جس سے وہ لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں اور ان کا یہ قول دیگر مفسرین کے اقوال کے خلاف ہے اور لغت عرب سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی کیوں کہ کسی کو صرف گمراہ کہنا مقصود ہو تو اس کے لئے "ضَلَّلَه" (باب تفعیل کے وزن پر) استعمال ہوتا ہے نہ کہ "اَضَلَّهٗ" (باب إفعال کے وزن پر)۔ اس ارشاد باری تعالیٰ کا معنی وہی ہے جو اہل حق مفسرین اور ماہرین علوم قرآن نے بتایا ہے اور وہ یہ کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کے کفر کی سزا کے طور پر ان سے توفیق سلب کر لیتے ہیں۔ اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ ﴿وَ مَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ﴾ (اور گمراہ بھی کرتا ہے تو نافرمانوں ہی کو) ذات باری تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے۔ اور

﴿الْفَاسِقِينَ﴾ پر نصب ان پر فعل واقع ہونے کی وجہ سے ہے جس کی بنا پر تقدیر عبارت اس طرح ہے: ''ومايُضِلُّ به أحداً إلاالفاسقين الذين سبق في علمه أنه لايهديهم''یعنی وہ ان لوگوں کے علاوہ کسی کو گمراہ نہیں کرتا جن کے بارے میں اسے پہلے سے معلوم ہے کہ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہوگی ۔ اسے استثناء کی وجہ سے منصوب کہنا ٹھیک نہیں ہے کیوں کہ استثناء تو بات مکمل ہونے کے بعد آتا ہے ۔نوف البکالی کہتے ہیں:

> حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنے رب سے مناجاۃ کرتے ہوئے عرض کیا: ''إلهي تخلق خلقاً فتُضِلُّ مَن تشاءُ وتَهدِي مَن تشاء ''(اے میرے اللہ! آپ لوگوں کو پیدا کرتے ہیں اور پھر جسے چاہتے ہیں گمراہ کردیتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں ہدایت دے دیتے ہیں)تو اس پر انہیں جواب ملا: ''یاعُزیر أعرِض عن هذا ! لَتُعرِضَنَّ عن هذا أو لأمحُوَنَّك من النبوَّة، إني لاأُسألُ عماأفعَلُ وهُمْ يُسألونَ'' (اے عزیر! یہ باتیں کرنا چھوڑ دو ، اگر تم نے یہ نہ چھوڑا تو میں انبیاء کی فہرست سے تمہارانام خارج کردوں گا۔میں جوکچھ کرتا ہوں اس کے بارے میں مجھ سے پوچھنے والاکوئی نہیں اور جوکچھ یہ لوگ کرتے ہیں ان سے اس کے بارے میں سوال کیاجائے گا)۔

لغوی تحقیقات

کہاجاتاہے : ''ضَلَّ الماءُ في اللبنِ''(پانی دودھ کے اندر گم ہوگیا)یعنی اس کے اندر مکمل طور پر گھل مل گیا، اسی معنی میں یہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿أَءِ ذَا ضَلَلْنَا فِي الْأَرْضِ﴾[السجدة ۳۲: ۱۰](کیا اس وقت جب ہم زمین میں ملیامیٹ ہوجائیں گے)۔اوراس کا ذکرسورہ فاتحہ میں بھی گزر چکاہے ۔کلام عرب میں ''فِسق''کا اصل معنی کسی چیز سے نکل جانا ہے چناں چہ کہاجاتاہے''فسَقَت الرطبة'' (کھجور اپنے چھلکے سے نکل گئی) اور ''فسَقَت الفارةمن جحرها''(چوہیا اپنے بل سے نکل گئی)اوراسی بنا پر چوہیا کو''فُوَيسِقَة'' بھی کہاجاتاہے ، حدیث پاک میں آتا ہے :

[۳۵۸] خمسٌ فواسِقُ يُقتَلْنَ في الحِلّ والحَرَم الحيّةُ والغراب الأبقعُ والفارةُ والكلب العَقُور والحُدَيّا۔

[۳۵۸] صحیح بخاری:کتاب البدأ الخلق ،باب خمس من الدواب فواسق يُقتَلنَ في الحرم ۳: ۲۰۴،صحیح مسلم: کتاب الحج ، باب مايندب للمحرم وغيره قتله من الدواب في الحل والحرم ۲: ۸۵۶، ۸۵۷ ،جامع ترمذی:کتاب الحج ،باب مايقتل المحرم من الدواب ۳: ۱۹۷۔اس کے علاوہ بھی محدثین نے متعدد سیاقات میں اسے نقل کیا ہے جن میں دونوں روایات والے الفاظ موجود ہیں ۔

پانچ چیزیں حد سے نکلنے والی ہیں یہ حرم میں ملیں یا حرم سے باہر، انہیں مارڈالا جائے ، وہ پانچوں سانپ ، سیاہ وسفید کوا ، چوہا، کاٹنے والا کتااور مقابلہ کرنے والی چیل)۔اسے امام مسلمؒ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل کیا ہے۔

ایک روایت میں ''الحية'' (سانپ) کی جگہ ''العقرب'' (بچھو) کا ذکر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو فاسق اس لئے فرمایا کہ یہ اذیت دینے والے ہیں جیسا کہ اس کا مفصل بیان اس کتاب میں ان شاء اللہ آئے گا۔''فَسَقَ يَفسِقُ فِسقاً وفسوقاً: أي فَجَرَ'' (''ضَرَبَ يَضرِبُ'' کے وزن پر) بھی اخفش سے منقول ہے جس کا معنی گناہ کرنا ہے۔ البتہ ارشادِ باری تعالیٰ:﴿فَفَسَقَ عَنْ أَمْرِ رَبِّهٖ﴾[الکھف۱۸: ۵۰](تو وہ اپنے پروردگار کے حکم سے باہر ہوگیا) میں معنی باہر نکلنا ہی ہے۔ ابن الأعرابی[1] کا خیال ہے کہ انہوں نے کلام جاہلیت میں لفظ ''فاسق'' کبھی نہیں سنا ، وہ کہتے ہیں: یہ عجیب بات ہے حالاں کہ ''فاسق'' خالص عربی لفظ ہے اور اسے ابن فارس اور جوہری نے بھی ذکر کیا ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں ابوبکر الأنباری نے اپنی کتاب ''الزاهر'' میں ''فسق'' کے معنی پر بحث کرتے ہوئے یہ شعر بھی ذکر کیا ہے:

يَذْهَبْنَ في نَجْدٍ و غَوراً غائراً فَواسقاً عن قَصْدِها جَوائرا[2]

کبھی وہ بلند زمین پر چلتی ہیں اور کبھی اپنے اصل مقصد سے نکل کر گہری وادیوں میں چلی جاتی ہیں۔اور بے مقصد چلتی چلی جاتی ہیں۔

''فِسِّيق'' دائمی گناہ گار کو کہتے ہیں اور فاسق کو آواز دینے کے لئے ''يافُسَقُ'' اور ''يا خُبَثُ'' کہا جاتا ہے جس سے مراد ''ياأيها الفاسِقُ'' اور ''ياأَيُّهاالْخَبِيثُ'' ہے۔شریعت کی اصطلاح میں ''فِسق'' اللہ عز وجل کی اطاعت سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ یہ اس اس شخص پر بھی بولا جاتا ہے جو کفر کرکے اللہ کی اطاعت سے نکلے اور اس پر بھی جو کفر کے علاوہ کوئی نافرمانی کرکے نکلے۔

۱۔ ابن الأعرابي: ابوعبد اللہ محمد بن زیاد (م ۲۳۱ھ) کسائی کے شاگرد۔ کتاب اللغۃ کے مؤلف ہیں۔ ثعلب اور حربی ان کے تلامذہ میں سے ہیں۔ اعلام زرکلی: ۶: ۱۳۱

۲۔ یہ عجاج کا شعر ہے اور اس میں ''غوراً'' پر نصب فعل محذوف کی وجہ سے ہے۔ کتاب سیبویہ ۱: ۴۹

ارشادِ باری تعالیٰ:

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ ۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾

جو اللہ تعالیٰ کے اقرار کو مضبوط کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں اور جس چیز کے جوڑے رکھنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اس کو قطع کئے ڈالتے ہیں اور زمین میں خرابی کرتے ہیں، یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر سات مباحث پر مشتمل ہے:

پہلی بحث: ﴿الَّذِيْنَ﴾ کا اعراب

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿الَّذِيْنَ﴾ (وہ لوگ جو) ''فَاسِقِيْن'' کی صفت ہونے کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ اور اسے مبتدا محذوف کی خبر بنا کر مرفوع بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس لحاظ سے تقدیر عبارت ''هم الذين'' ہوگی جیسا کہ اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

دوسری بحث: ﴿يَنْقُضُوْنَ﴾ کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿يَنْقُضُوْنَ﴾ (توڑ دیتے ہیں) میں ''نَقض'' کا معنی کسی چیز کو بنالینے کے بعد توڑ دینا ہے جیسے عمارت کو بنانے، رسی کو تیار کرنے اور عہد کرلینے کے بعد توڑ دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ ''نُقاضة'' بالوں سے بنی ہوئی اس رسی کو کہتے ہیں جسے توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا جائے۔ اور کلام میں ''مناقضت'' ایسی بات کو کہتے ہیں جو قائل کی اپنی ہی بات کی نفی کرتی ہو۔ شعری اصطلاح میں ''نقيضة'' اس شعر کو کہتے ہیں جو کسی کے شعر کے جواب میں کہا جائے۔ جبکہ ''نِقض'' توڑی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔

عہد اور نقض عہد کا تصور

مفسرین سے اس بارے میں مختلف آراء منقول ہیں کہ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے؟ بعض کہتے ہیں: اس سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی آدم سے اس وقت لیا جب انہیں آدم علیہ السلام کی پیٹھ سے

نکالا[۱]۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی نصیحت ہے جو انہوں نے اپنی مخلوق کو کی۔ اس نصیحت میں انہوں نے مخلوق کو اپنی اطاعت کا حکم دیا اور اپنی نافرمانی کے کاموں سے باز رہنے کا حکم دیا جن سے وہ پہلی کتابوں اور پہلے رسولوں کے ذریعے بھی منع کر چکے ہیں، اس طرح نقض عہد سے مراد اس پر عمل نہ کرنا ہے۔ ایک اور قول یہ ہے کہ اس سے مراد توحید کے تکوینی دلائل آسمان، زمین اور دیگر مظاہر قدرت ہیں اور اس لحاظ سے نقض عہد لوگوں کا ان مظاہر قدرت میں غور نہ کرنا ہے۔ ایک اور قول کے مطابق اس سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام اہل کتاب سے لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے معاملہ کو واضح طور پر بیان کریں اور اس کو ہرگز نہ چھپائیں، اس لحاظ سے یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے۔ ابواسحاق زجاج کہتے ہیں: اس سے مراد اللہ عزوجل کا وہ عہد ہے جو اس نے تمام انبیاء اور ان کے پیروکاروں سے لیا کہ میرے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار نہ کرنا۔ اس کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّيْنَ﴾[آل عمران ۳ : ۸۱](اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے عہد لیا) سے لے کر ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَأَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ إِصْرِيْ﴾ [آل عمران ۳ : ۸۱] (اور تم نے اس اقرار پر مجھے ضامن بنایا) اس میں ﴿إِصْرِيْ﴾ سے مراد بھی میرا عہد ہی ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: آیت کریمہ کے ظاہری سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے۔ اس طرح یہ کل پانچ اقوال ہوگئے جن میں سے دوسرا قول ان سب کا مجموعہ ہے۔

تیسری بحث: میثاق کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿مِنْ م بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ﴾ (اس کو مضبوط کرنے کے بعد)۔ ''میثاق'' اس عہد کو کہتے ہیں جسے قسم کے ساتھ زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ یہ مصدر ''وثاقة'' سے ماخوذ ہے، ''معاهدة'' بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ''وثاقة'' کا معنی گرہ لگانے، باندھنے اور اسی طرح کے دیگر امور میں سخت مضبوطی سے کام لینا۔ ''میثاق'' کی اصل ''مِوْثاق'' ہے اور اسی بنا پر اس کی جمع ''مواثیق'' آتی ہے۔ اس کی واو کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یاء سے بدل دیا گیا۔ ''مِوَاثِيق'' کے علاوہ اس کی جمع ''میاثق'' اور ''میاثیق'' بھی آتی ہے۔ ابن الأعرابی نے اس کے شاہد کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے:

۱۔ جیسا کہ سورۂ اعراف ۷ : ۱۷۲ میں ہے کہ: ''یاد کرو اس وقت کو جب تمہارے رب نے بنی آدم کی ذریت کو ان کی پیٹھ سے نکالا اور اپنی ذات کے بارے میں ان کو گواہ بنا کر عہد لیا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو انہوں نے جواب دیا: ہاں! کیوں نہیں، ہم اس بات کے گواہ ہیں۔

حِميً لا يُحَلّ الدهرَ إلَّا بإذننا و لا نسأل الأقوامَ عَهْدَ المياثِقِ (۱)

وہ ایسی چراگاہ ہے جس میں ہماری اجازت کے بغیر کبھی کوئی داخل نہیں ہوسکتااور ہماری شان یہ ہے کہ ہم دوسری قوموں سے معاہدے اور اجازت کی درخواست نہیں کرتے۔

''موثِق''، ''میثاق'' اور ''مواثقة'' سب ''معاهدة'' کے معنی میں آتے ہیں ، اور اسی معنی میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے : ﴿وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖ﴾[المائدۃ۵ :۷](اور اس عہد کو بھی جس کا تم سے قول لیا تھا)۔

چوتھی بحث: ﴿قطع﴾ کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿وَ يَقْطَعُوْنَ﴾(اورتوڑ دیتے ہیں)میں''قطع'' (کاٹنا)کا معنی مشہور ہے اور جہاں قطع رحمی مراد ہو وہاں مصدر''قطيعة'' استعمال ہوتا ہے ،چناں چہ کہا جاتا ہے : ''قَطَعَ رَحِمَهٗ قطيعَةً'' اور قطع رحمی کرنے والے کو''رجلٌ قُطَعٌ'' اور ''قُطَعَةٌ'' بر وزن ''هُمَزَةٌ'' کہاجاتا ہے۔ رسی وغیرہ کاٹنے کے لئے ''قطَعتُ الحبلَ قَطعاً''، دریا وغیرہ کوعبور کرنے کے لئے ''قطَعتُ النهرَ قُطوعاً''اور پرندے جب جھنڈ بنا کر ایک سے دوسرے علاقے میں جائیں تو اس کے لئے ''قَطَعَتِ الطيرُ قُطُوعاً وقُطاعاًوقِطاعاً'' کہاجاتا ہے ۔ اگر کسی علاقہ میں پانی کی کمی واقع ہوجائے تو کہاجاتا ہے: ''أصاب الناسَ قُطْعَةٌ''اور کسی شخص کو سانس لینے میں دقت کی تکلیف ہوتوایسے موقع پر''رَجُلٌ به قُطْعٌ'' کہاجاتا ہے ۔

پانچویں بحث: نحوی ترکیب

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ﴾(وہ جس کے جوڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے) میں لفظ''ما'' فعل ''يَقْطَعُونَ'' کی وجہ سے محل نصب میں ہے اور''أنْ'' کو''ما'' کا بدل بھی کہاجاسکتا ہے اور''به'' کی ضمیر کا بھی اور یہی بہتر ہے ۔''أن يوصَلَ ''سے مراد''لِئَلاَّ يوصَلَ'' بھی لیاجاسکتا ہے یعنی اسے جوڑنے کو ناپسند کرنے کی وجہ سے ۔

''وَصل'' کیا ہے؟

مفسرین سے اس بارے میں مختلف آراء منقول ہیں کہ آیت کریمہ میں جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا

۱۔ شاعر کا نام عیاض بن درة الطائی ہے اور لسان العرب میں شعر کے الفاظ اس طرح ہیں : حِميً لا يُحَلّ الدهرَ إلَّا بإذننا و لا نسل الأقوامَ عَقْدَ المياثِقِ

گیا وہ کیا ہے؟اس بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد صلہ رحمی ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ باتوں کے ساتھ عمل ملا نا مراد ہے جسے ان لوگوں نے منقطع کر دیا چناں چہ باتیں تو کیں مگر ان پر عمل کر کے نہ دکھایا۔ بعض کہتے ہیں : اس سے مراد تمام انبیاء کی مجموعی طور پر تصدیق کرنا جسے انہوں نے یوں منقطع کیا کہ بعض کی تصدیق کی اور بعض کو جھٹلایا۔ ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس سے اللہ کی زمین میں اس کے دین اور اس کی عبادت ، اس کی شریعت کے نفاذ،اور حدود کی حفاظت کی طرف اشارہ مراد ہے۔ یہ ایک جامع تفسیر ہے جس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جنہیں آپس میں ملانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے ۔ یہی جمہور کا قول ہے اور اسی میں رحم بھی شامل ہے ۔

چھٹی بحث: فساداور خسارے کا مفہوم

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ﴾(اور زمین میں خرابی کرتے ہیں)سے مراد یہ ہے کہ غیراللہ کی عبادت کرتے اور اپنے افعال میں حدود سے اس طرح تجاوز کرتے ہیں کہ انہیں اپنی خواہشات نفسانی کے مطابق بجالاتے ہیں اور یہ فساد کی انتہاء ہے ۔

﴿أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخَاسِرُوْنَ﴾(یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں)مبتدا اور خبر ہیں ۔ اور اس میں ''ھم''زائدہ ہے ، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''ھم'' مبتدا ثانی ہو اور'' الخاسرون'' اس کی خبر ہو ، اور مبتدا ثانی اپنی خبر کے ساتھ مل کر مبتدا اول کی خبر ہو جیسا کہ اس کا ذکر گزر چکا ہے ۔''خاسِر''وہ ہوتا ہے جو کامیابی وکامرانی سے اپنے نفس کو حصہ دلانے میں نقصان اٹھائے اور''خُسران'' ناپ تول وغیرہ میں کمی واقع ہوجانے کو کہتے ہیں ، جریر کہتا ہے :

إنَّ سَلِيطاً في الخَسَارِ إنَّهُ أولادُ قَومٍ خُلِقوا أقِنَّهْ

ان کے قبیلے کا سردار نقصان میں ہے کیوں کہ وہ ایسے لوگوں کی اولاد ہیں جو پیدائشی طور پر خاندانی غلام ہیں۔

یہاں ''خَسَار'' سے مراد ان کے حسب نسب اور نصیب کا خسارہ ہے ۔جوہری کہتے ہیں :سین کے فتحہ کے ساتھ ''خَسِرتُ الشيئَ أخسَرہ'' کا معنی کمی واقع ہونا ہے اور''خَسار'' ،''خَسارَة'' اور''خَيسَرَى'' گمراہی اور ہلاکت کو کہتے ہیں۔ ہلاک ہوجانے والے کو بھی ''خَاسِر'' اس لئے کہتے ہیں کہ وہ قیامت کے دن اپنااور اپنے اہل خانہ کا نقصان کردے گا اور جنت میں جگہ پانے سے محروم ہوجائے گا ۔

ساتویں بحث: معاہدے کے احکام

اس آیتِ کریمہ میں اس بات کی دلیل ہے کہ ہر جائز معاہدے کو پورا کرنا اور ہر عہد کی پابندی کرنا جسے انسان نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہو ضروری ہے اور اس کو توڑنا جائز نہیں خواہ یہ معاہدہ مسلمانوں کے اپنے درمیان ہو یا مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ ہو۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے معاہدہ توڑنے والے کی مذمت فرمائی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا: ﴿أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ [المائدۃ۵: ۱] (اپنے اقراروں کو پورا کرو)، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرمایا: ﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ﴾ [الأنفال۸: ۵۸] (اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا خوف ہو تو ان کا عہد انہی کی طرف پھینک دیں جیسے انہوں نے خود کیا ہے) اس طرح اللہ تعالیٰ نے خیانت کرنے سے منع فرمایا اور یہاں خیانت کی صورت عہد شکنی ہی ہے۔ اس کا مفصل بیان اِن شاء اللہ مناسب موقع پر آئے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ۔ ﴿۲۸﴾

تم اللہ تعالیٰ سے کیسے منکر ہوسکتے ہو کہ تم بے جان تھے اور اس نے تم کو جان بخشی، پھر وہی تم کو مارتا ہے، پھر وہی تم کو زندہ کرے گا، پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

﴿كَيْفَ﴾ حال کے بارے میں سوال کرنے کے لئے آتا ہے، یہ اسم ہے اور ﴿تَكْفُرُونَ﴾ کے عمل کی وجہ سے محل نصب میں ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ یہ ساکن ہوتا کیوں کہ اس میں استفہام کا معنی پایا جاتا ہے جس سے تعجب کا فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے اور اس وجہ سے یہ حروف کے مشابہ ہے مگر فتحہ کے خفیف ہونے کی وجہ سے اسے فتحہ دے دیا گیا اور اسے مبنی علی الفتح قرار دیا گیا۔ اس طرح ارشاد باری تعالیٰ کے مطابق یہ لوگ اس قابل ہیں کہ ان سے تعجب کیا جائے کیوں کہ انہوں نے حجت قائم ہوجانے کے بعد بھی کفر اختیار کیا ہے۔

اہل کتاب کو کافر کہنے کی وجہ

اگر کوئی کہے کہ یہ خطاب اہل کتاب کو کس طرح ہوسکتا ہے حالاں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا انکار نہیں کیا؟ تو اس کا جواب وہی ہے جو پہلے گزر چکا ہے کہ جب انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول

نہیں کیا اور جو کچھ وہ لائے تھے اس کی تصدیق نہیں کی تو انہوں نے شرک کیا کیوں کہ انہوں نے اس بات کا اقرار نہیں کیا کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ قرآن مجید انسان کا کلام ہے وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے اور عہد کو توڑنے والا اقرار پاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿كَيْفَ﴾ کا لفظ تو استفہام کے لئے ہے مگر یہاں اس میں معنی استفہام کا نہیں پایا جاتا بلکہ یہ تاکید اور زجر کا مفہوم دیتا ہے یعنی تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اس کی اس قدرت کا انکار کیسے ممکن ہے۔ واسطی کہتے ہیں: اس جملہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو سخت انداز میں ڈانٹا کیوں کہ بے جان اور ٹھوس چیزیں اپنے بنانے والے کے ساتھ کوئی اختلاف نہیں کرتیں بلکہ اختلاف تو ذی روح اجسام کی خاصیت ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا﴾ (کہ تم بے جان تھے) میں واو حالیہ ہے اور اس کے بعد ''قَدْ'' محذوف ہے۔ زجاج کہتے ہیں: تقدیر عبارت اس طرح ہے: ''وَقَدْ كُنْتُمْ'' مگر اس میں سے ''قَدْ'' کو حذف کردیا گیا۔ فراء کہتے ہیں: ﴿أَمْوَاتًا﴾ ﴿كُنْتُمْ﴾ کی خبر ہے۔ ﴿فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ﴾ (اور اس نے تم کو جان بخشی، پھر وہی تم کو مارتا ہے) ابوحاتمؒ کہتے ہیں یہاں وقف تام ہے۔ پھر ارشاد فرمایا: ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾ (پھر وہی تم کو زندہ کرے گا)۔

انسانی زندگی اور موت کے تعدّد کا مسئلہ

مفسرین سے ان دو موتوں اور دو زندگیوں کی ترتیب کے بارے میں مختلف آراء منقول ہیں اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ اس کی زندگیوں اور موتوں کی تعداد کیا ہے:

حضرت ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: اس کی تفسیر یہ ہے کہ تم موجود نہ ہونے کی وجہ سے مردہ تھے تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا کرکے زندگی بخشی، پھر تمہاری مدت حیات ختم ہوجائے گی تو وہ تمہیں موت دے دے گا اور پھر قیامت کے دن زندہ کردے گا۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: اس آیت سے مراد بھی یہی ہے اور کفار کو بھی اس سے انکار کی مجال نہیں کیوں کہ وہ موت اور زندگی دونوں کو مانتے ہیں۔ چناں چہ جب کفار کے دل عدم کی حالت پر غور کرنے کے لئے متوجہ ہوگئے جسے اللہ تعالیٰ نے موت کہا ہے، پھر زندہ ہوکر دنیا میں آنے والی بات بھی ان کے دل کو لگ گئی اور اس کے بعد دنیا کی زندگی ختم ہونے پر موت والی بات بھی سمجھ میں آگئی تو اس کے بعد زندہ ہونے سے انکار کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ اس کے باوجود انہوں نے اس زندگی کا جو انکار کیا ہے وہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی دلیل نہیں۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس تفسیر کی بنا پر قبر والی زندگی

بھی دنیا کی زندگی ہی کا حصہ ہے۔اور بعض کہتے ہیں کہ قبر کی زندگی کو شمار نہیں کیا گیا جیسا کہ اس شخص کی زندگی کا ذکر نہیں کیا گیا جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں موت دے کر دنیا ہی میں دوبارہ زندہ کردیا۔

اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ تم آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں مردہ حالت میں تھے جہاں سے اس نے تمہیں باریک چیونٹیوں کی طرح نکالا، پھر تمہیں دنیاوالی موت دے گا اور اس کے بعد پھر زندہ کرکے اٹھائے گا۔

﴿وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا﴾ کی ایک اور تفسیر یہ ہے کہ تم مردوں کی پیٹھوں اور عورتوں کے رحموں میں نطفوں کی شکل میں بے جان تھے ، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان رحموں سے منتقل کرکے زندہ کیا پھر تمہیں اس زندگی کے بعد موت دے گا ، پھر قبر میں سوال وجواب کے لئے زندہ کرے گااور اس کے بعد حشر میں جمع ہونے کے لئے دوبارہ زندہ کرے گااور یہ ایسی زندگی ہوگی جس کے بعد موت نہیں آئے گی۔

مؤلف کی رائے

میں کہتاہوں : اس تفسیر کی بناپر تو موتوں کی تعداد تین بنتی ہے اور تین ہی زندگیاں ہوتی ہیں۔ اور آدم علیہ السلام کی پیٹھ میں ان کا بے جان ہونا پھر انہیں وہاں سے نکال کر ان سے شہادت کالیاجانا یہ مردوں کی پیٹھوں اورعورتوں کے رحموں میں ان کے موجود ہونے کے علاوہ ہے ۔ اس لحاظ سے چار موتیں اور چارزندگیاں بنتی ہیں۔ایک رائے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے سے پہلے مٹی کے ذرات کی صورت میں پیدا کیا، پھر انہیں موت دے دی ۔ اس طرح شمار کرنے سے زندگیوں اور موتوں کی تعداد پانچ پانچ بنتی ہے اور چھٹی موت امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں سے نافرمانوں کو اس وقت آئے گی جب وہ آگ میں داخل ہوں گے جیسا کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے ، وہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۵۹] أَمّا أهل النار الذين هم أهلها فإنهم لا يموتون فيها و لا يَحْيون ولكنُ ناسٌ أصابتهم النارُ بذنوبهم۔ أو قال بخطاياهم۔ فأماتهم الله إماتةً حتى إذا كانُوا

[۳۵۹] صحیح مسلم: كتاب الإيمان ، باب اثبات الشفاعة وإخراج الموحدين من النار۱:۱۷۲، صحیح ابن ماجہ:کتاب الزهد،باب ذكر الشفاعة ۲:۱۴۴۱، صحیح ابن حبان: كتاب الإيمان ،باب فرض الإيمان ۱:۴۱۱، مسند احمد: مسند أبي سعيد الخدری رضی الله عنه ۳:۳۸۲،۵۱۵، مسند ابویعلیٰ:مسندأبي سعيد الخدری رضی الله عنه ۲:۴۴۷،۵۱۸،شعب الإيمان ،الثامن من شعب الإيمان وهو باب في حشر الناس بعدمايبعثون......،فصل في أصحاب الكبائر من أهل القبلة ......۱:۲۹۲،سنن دارمی:کتاب الرقاق، باب مایخرج اللہ من النار برحمته ۲:۷۸۸

فَحماً أذِن في الشفاعة فجيء بهم ضَبَائِرَ ضَبَائِرَ فَبُثُّوا على أنهار الجنة ثم قيل يا أهل الجنة أفيضوا عليهم فَيَنْبُتُون نباتَ الحِبَّةِ تكون في حَمِيل السَّيل۔ فقال رجل من القوم: كأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قد كان بالبادية۔

جہاں تک جہنمیوں کا تعلق ہے جن کے جہنمی ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے تو وہ اس آگ میں نہ مریں گے نہ جیئیں گے ہاں کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اپنے گناہوں یا غلطیوں کی وجہ سے جہنم میں ڈالے جائیں گے تو ان پر ایک طرح سے موت کی کیفیت طاری ہو جائے گی یہاں تک کہ جب وہ جل کر کوئلہ ہو جائیں گے تو شفاعت کی اجازت دے دی جائے گی جس کے نتیجہ میں انہیں مجموعوں کی صورت میں لایا جائے گا اور جنت کی نہروں کے پاس پھیلا دیا جائے گا اور اہل جنت کو کہا جائے گا کہ ان پر پانی پھینکیں۔ جب وہ ان پر پانی پھینکیں گے تو وہ ایسے اُگیں گے جیسے دانہ نالی کے بہاؤ میں اگتا ہے۔ ایک شخص کہنے لگا: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان معلومات سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیہات میں وقت گزارا ہو۔ اس حدیث کو امام مسلمؒ نے نقل کیا ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں حدیث شریف کے الفاظ ''فَأماتهم الله'' سے حقیقی موت مراد ہے کیوں کہ اس کے ساتھ مصدر لا کر اس کی مزید تاکید کر دی گئی ہے۔ اور انہیں یہ موت ان کی عزت افزائی کے طور پر دی جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ''أماتهم'' سے مراد ان پر نیند وغیرہ طاری کر کے انہیں آگ کی تکالیف محسوس کرنے سے بچانا ہو، اس طرح یہ حقیقی موت نہیں ہوگی مگر پہلی رائے زیادہ صحیح ہے۔ اس بات پر علماءِ نحو کا بھی اتفاق ہے کہ اگر فعل کے ساتھ مصدر لا کر اس کی تاکید کی جائے تو یہ مجاز نہیں ہوتا بلکہ اس سے حقیقی معنی مراد ہوتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ [النساء ۴: ۱۶۴] (اور موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے باتیں بھی کیں) میں ہے جس کا بیان ان شاء اللہ آئندہ آئے گا۔

ایک اور تفسیر یہ ہے کہ تم گمنامی کی وجہ سے مردوں کی طرح تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس طرح زندہ کیا کہ تمہارا ذکر ہونے لگا اور اس دین کی بدولت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو تمہارے پاس تشریف لائے تمہیں شرف حاصل ہو گیا، پھر اللہ تعالیٰ تمہیں ماریں گے تو تمہارا ذکر بھی ختم ہو جائے گا، پھر تمہیں قبروں سے اٹھانے کے لئے زندہ کیا جائے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (پھر تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے) سے مراد یہ ہے کہ تمہیں اس کے عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا جو کہ تمہارے کفر کی وجہ سے تمہارا ٹھکانہ قرار دیا جا چکا ہوگا۔ ایک قول یہ ہے کہ تمہیں دوبارہ زندگی اور سوال وجواب کی طرف لوٹایا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿كَمَا بَدَأْنَآ أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ﴾ [الأنبياء ۲۱: ۱۰۴] (جس طرح ہم نے اول بار پیدا کرتے وقت ابتدا کی تھی اسی طرح دوبارہ پیدا کر دیں گے) چناں چہ ان کا دوبارہ بنانا بھی پہلے بنانے کی طرح ہی ہے اور یہی رجوع ہے۔ اس میں جمہور کی قراءت تو "تُرْجَعُونَ" ہی ہے مگر یحییٰ بن یعمر، ابن ابی اسحاق، مجاہد، ابن محیصن اور سلام بن یعقوب اس بات کے قائل ہیں کہ جیم جہاں بھی واقع ہو اس کے ساتھ حرف مضارعت کو مفتوح پڑھا جائے گا اور جیم کو کسرہ دیا جائے گا۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ثُمَّ اسْتَوٰۤى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾

وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا پھر آسمان کی طرف قصد کیا اور ان کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنا دیا اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا) کی تفسیر دس مباحث پر مشتمل ہے۔

پہلی بحث: ﴿خَلَقَ﴾ کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿خَلَقَ﴾ کا معنی کسی سابقہ مثال کے بغیر بنانا اور عدم سے وجود میں لانا ہے۔ انسان بھی پہلی مرتبہ کوئی کام کرے تو اس کے لئے بھی کبھی "خَلَق" کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ اسی معنی میں شاعر کا قول ہے:

مَن كان يَخلُق ما يقو   لُ فحيلَتي فيه قَليلَهٗ [۱]

جو شخص جب بھی بات کرتا ہے تو نئی بات ہی نکال کر لاتا ہے تو اس شخص کے بارے میں میرا کوئی بس نہیں چلتا۔

۱۔ شاعر کا نام اسماعیل بن منصور بن عمر التمیمی المصری ہے۔ وہ نابینا ہونے کے باوجود بڑے ادیب، شاعر اور فقہ شافعی کے ائمہ میں سے تھے۔ معجم الأدباء ۵: ۵۲۸، تفسیر ابن عطية ۱: ۲۲۲

اس معنی کا ذکر پہلے بھی گزر چکا ہے ۔ابن کیسان کہتے ہیں :﴿خَلَقَ لَكُمْ﴾ کا معنی تمہاری خاطر پیدا کیا ہے ، ایک قول یہ ہے کہ زمین میں جوکچھ ہے چونکہ وہ تم پر اللہ کا انعام ہے اس لئے وہ تمہارے ہی لئے ہے۔ایک قول یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلیل اور انسان کے لئے سبق ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں:یہی بات صحیح ہے جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہاں ﴿خَلَقَ لَكُمْ﴾ سے مراد انسانی ضرورت کی اشیاء ہوں ۔

دوسری بحث: اشیاء میں اصل اباحت کا مسئلہ؟

مؤیدین کے دلائل:

جو علماء انسانی استعمال کی چیزوں میں اصل حکم اباحت کے قائل ہیں اور جن کا خیال ہے کہ جب تک ان کے ممنوع ہونے کی کوئی دلیل سامنے نہ آئے ان کا استعمال جائز ہے ان کی دلیل یہ اور اس جیسی دیگر آیات کریمہ ہیں جیسا کہ ارشادباری تعالیٰ ہے :﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثیة۴۵: ۱۳] (اور آسمان و زمین کی ہر ہر چیز کو بھی اس نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کردیاہے)۔ اس بات کو مزید تقویت دینے کے لئے وہ یہ دلیل دیتے ہیں کہ یہ مزیداراور دل کو لگنے والی کھانے پینے کی اشیاء کو جب پیدانہ کرنے کے امکان کے باوجود پیدا کیا گیا ہے تواس سے معلوم ہوتا ہے ان کا بنانافضول نہیں اور ان کاضرور کوئی نہ کوئی فائدہ ہے ۔ اب یہ کہنا کہ یہ فائدہ اللہ تعالیٰ کی اپنی ذات کے لئے ہے صحیح نہیں کیوں کہ وہ بے نیاز ذات ہے لہذایہی بات صحیح ہے کہ یہ سب ہمارے فائدے کے لئے ہیں۔ اب ہمارے لئے اس سے فائدہ اٹھانے کی تین صورتیں ہیں: ایک تو یہ کہ ہم ان سے لطف اٹھائیں ، یا یہ کہ ان سے بچیں تا کہ اس میں ہماری آزمائش بھی ہوجائے ، اور تیسری صورت یہ ہے کہ ہم ان سے سبق حاصل کریں ۔ یہ تینوں کا م ایسے ہیں کہ صرف ان چیزوں کو چکھنے کے بعد ہی ان میں سے کسی ایک کا فیصلہ کیاجاسکتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ بنیادی طور پر تمام چیزوں کااستعمال مباح ہو۔

مخالفین کے دلائل:

وہ اباحت کے جواز کوتسلیم نہیں کرتے ۔ان کے خیال میں یہ ضروری نہیں کہ اگرکسی چیز کو فائدے کے

لئے پیدا نہ کیا جائے تو وہ لازمی طور پر بے کار تصور ہو بلکہ اشیاء کے اس طرح پیدا کرنے کا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے اندر ذاتی طور پر فائدہ نہ پایا جائے مگر وہ کسی دوسری جگہ فائدے کا سبب بن جائیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ انسانی مصالح ومفادات صرف وہی نہیں جو اباحت اشیاء کے قائلین نے ذکر کئے ہیں ۔ان کا یہ موقف بھی درست نہیں کہ مفادات کا حصول صرف ان اشیاء کے آزمائشی استعمال کا مرہون منت ہے بلکہ کسی چیز کا ذائقہ معلوم کرنے کے اور ذرائع بھی ہیں جیسا کہ ماہرین علوم طبیعیہ کے ہاں معروف ہے ۔ پھر یہ حقیقت بھی اس نظریہ کو رد کرتی ہے کہ بعض چیزیں زہریلی اور مہلک بھی ہوتی ہیں (لہذا چکھنے سے نقصان ہوسکتا ہے) پھر ایک طبقہ وہ بھی ہے جو ہر معاملہ میں محتاط رویہ اپنانے کا قائل ہے ، ان کے اشکالات بھی اس اباحتی رائے کے صحیح ہونے میں رکاوٹ ہیں۔

توقف کے قائلین :

ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس کا موقف یہ ہے کہ ہوسکتا ہے چیز جس کی اچھائی یا برائی ہمیں معلوم نہیں دراصل اس میں اچھائی پائی جاتی ہو مگر اس کے بارے میں شرعی حکم آنے سے پہلے ایسا کوئی پیمانہ نہیں ہے جس سے اس کی اچھائی یا برائی کا تعین کیا جاسکے اس لئے یہی بات طے ہے کہ کسی بھی چیز کے بارے میں شرعی حکم آنے سے پہلے توقف اختیار کیا جائے۔

یہ تینوں اقوال معتزلہ کے ہیں۔ شیخ ابوالحسن[1]، ان کے ہم خیال علماء ، اکثر علماءِ مالکیہ اور علامہ صیرفی[2] اس مسئلہ میں مطلقاً توقف اختیار کرنے کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک اس قول کا مطلب یہ ہے کہ ان اشیاء کا اس وقت تک کوئی حکم نہیں ہوگا جب تک شریعت کی طرف سے اس کی حیثیت کا تعین نہیں کر دیا جاتا اور ایسا کرنے کا اختیار صرف شریعت کو ہے ۔ باقی جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو اس کا کام وجوب اور عدم وجوب کا حکم صادر کرنا نہیں بلکہ صرف اشیاء کی حقیقت کی پہچان کرنا ہے ۔ ابن عطیہؒ کہتے ہیں: ابن فورکؒ[3] نے ابن

۱۔ شیخ ابوالحسن علی بن اسماعیل بن اسحاق اشعری (م ۳۲۴ھ) بصرہ میں پیدا ہوئے۔علم کلام کے ماہر ،مشہور عالم، مجتہد اور اشاعرہ کے شیخ تھے ۔مشہور صحابی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے ۔ انہوں نے موافقین اور مخالفین میں معرکۃ الآراء حیثیت پائی ۔ان کی تصنیفات کی تعداد تین سو سے متجاوز ہے ۔ اعلام زرکلی ۴: ۲۶۳

۲۔ فقہ شافعی کے امام اور ماہر اصول علامہ ابوبکر محمد بن عبداللہ البغدادی (م ۳۳۰ھ)۔ علامہ ابوبکر قفال کہتے ہیں : وہ امام شافعی رحمہ اللہ کے بعد اصول فقہ کے سب سے زیادہ ماہر تھے۔اعلام زرکلی ۶: ۲۲۴

۳۔ ابوبکر محمد بن حسن بن فورک انصاری (م ۴۰۶) ماہر کلام ، اصولی ، ادیب ،فقہ شافعی کے علامہ اور نحوی تھے ۔ بصرہ اور بغداد میں کسب علم کیا اور نیشاپور میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی اور فقہ اصول فقہ میں سو کے قریب کتب تصنیف کیں ۔اعلام زرکلی ۶: ۸۳

الصائغ"(۱) سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے کہا: عقل کا فیصلہ کبھی نقل سے خالی نہیں ہوتا اور جو مسئلہ بھی پیش آتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ منقول مواد ضرور میسر آجاتا ہے یا منقول معلومات کے ساتھ اس کا کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوتا ہے یا کم ازکم اس میں سیاق وسباق کا لحاظ ضرور رکھا جاتا ہے، ابن الصائغ کہتے ہیں: کسی چیز کا حکم بیان کرنے کے لئے ان چیزوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے اس طرح اباحت، عدم اباحت یا توقف کے مفروضے قائم کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی(۲)

تیسری بحث: مظاہرِ قدرت میں نصیحت کا سامان

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ﴾ (جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لئے پیدا کیا) کی صحیح تفسیر تو یہی ہے کہ اس سے مراد عبرت کا سامان ہے۔ اس کی دلیل ارشاد باری تعالیٰ کا سیاق وسباق ہے جہاں زندہ کرنا، موت دینا، پیدا کرنا، آسمان کی طرف متوجہ ہونا اور اسے بنادینا سب چیزوں کا ذکر ہے۔ گویا کہ باری تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: جس ذات نے اپنی قدرت سے تمہیں زندہ کردیا، تمہیں پیدا کرلیا اور اس سے بڑھ کر زمین وآسمان بنالئے اس کے لئے ان چیزوں کو دوبارہ بنانا کوئی مشکل نہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ ﴿لَكُمْ﴾ کا معنی تو ''انتفاع'' ہے یعنی اس نے یہ چیزیں اس لئے بنائیں تا کہ تم ان سے فائدہ اٹھاؤ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں فائدہ اٹھانے سے مراد بھی نصیحت حاصل کرنا ہے جیسا کہ ہم ذکر کرچکے ہیں۔ اور اگر کوئی یہ کہے کہ بچھوؤں اور سانپوں میں عبرت کا کون سا پہلو ہے؟ تو ہم کہتے ہیں: ہوسکتا ہے انسان ان تکلیف دہ چیزوں کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا سکے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم میں کفار کے لئے کس کس طرح کے عذاب تیار کئے ہوئے ہیں۔ اور یہی بات کسی کے ایمان لانے اور نافرمانیاں چھوڑ دینے کا سبب بن جائے، اس صورت میں یہ عظیم ترین درس عبرت ہوگا۔ ابن العربی کہتے ہیں: ان تمام امور پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی خبر دینے میں کوئی ایسا پہلو نہیں جس سے اباحت، عدم اباحت یا توقف وغیرہ کے تعین کی ضرورت نظر آتی ہو۔ یہ آیت کریمہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل کے ضمن میں آئی ہے، تا کہ سننے والے متوجہ ہوں اور اس سے توحید باری تعالیٰ کا سبق سیکھیں(۳)۔

۱۔ ابوالفضل یحیی بن علی بن عبدالعزیز المنتجب القرشی الدمشقی (م۵۳۵ھ) بغداد میں علامہ شاشی سے کسب فیض کیا اور دمشق کے قاضی بنے۔ ان کا شمار شافعی مسلک کے بڑے علماء میں ہوتا ہے۔ ابن العماد: شذرات الذهب

۲۔ تفسیر ابن عطیہ ۱: ۲۲۳

۳۔ احکام القرآن ۱: ۱۴

علماءِ معانی کی رائے

علماءِ معانی کہتے ہیں کہ ارشاد باری تعالیٰ ﴿خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ سے مقصود یہ ہے کہ تم لوگ ان چیزوں کو استعمال کر کے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے طاقت حاصل کرو نہ یہ کہ انہیں اس کی معصیت اور نافرمانی کے کاموں میں لگاؤ۔ ابوعثمان کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ سب کچھ تمہیں اس لئے دیا اور اسے تمہارے بس میں اس لئے کر دیا کہ تم اس سے اللہ تعالیٰ کی وسعت جود وسخا کا اندازہ لگا سکو اور باری تعالیٰ نے آخرت میں تمہیں جو انعامات واعزازات دینے کا وعدہ فرمایا ہے اس کے بارے میں تمہیں تسلی ہوجائے اور تو یہ نہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ میرے تھوڑے سے اعمال پر اس قدر زیادہ انعامات کیسے دیں گے۔ وہ تو ایسی ذات ہے جس نے تمہارے کسی بھی عمل کے وجود میں آنے سے پہلے تمہیں اپنی بہت بڑی نعمت سے نوازا ہے جو کہ اس کی وحدانیت پر ایمان ہے۔

چوتھی بحث: فقیر کا صدقہ اور اس کی برکات

زید بن اسلم اپنے والد سے اور وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کچھ مدد کی درخواست کی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۳۶۰] ما عندي شيء ولكنِ ابتَعْ عَليّ فإذا جَاء شيءٌ قَضَينا" فقال له عمر: هذا أعطيت إذا كان عندك فما كلفك الله مالا تقدر۔ فكره رسول الله صلى الله عليه وسلم قول عمر، فقال رجل من الأنصار: يارسول الله صلى الله عليه وسلم! "أنفِقْ ولا تخشَ من ذي العرش إقلالا" فتبسم رسول الله صلى الله عليه وسلم وعُرِفَ السرور في وجهه لقول الأنصاري، ثم قال: "بذلك أُمِرتُ۔

اس وقت تو میرے پاس دینے کو کچھ نہیں، تم جا کر اپنی ضرورت کی چیز میرے کھاتے میں کسی سے خرید لو، جب میرے پاس کچھ آجائے گا تو میں اس کی ادائیگی کر دوں گا۔
یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: حضور کے پاس کچھ ہوتا تو اسے دے

---

[۳۶۰] مصنف عبدالرزاق: كتاب الجامع، باب وصية عمر بن الخطاب رضي الله تعالى عنه ۱۱:۱۰۸، مسند بزار: مسند عمر بن الخطاب رضي الله عنه، أسلم مولى عمر عن عمر ۱:۳۹۶۔ امام بزار والی روایت میں "ابتَعْ" (خرید لو) کی بجائے "استَقْرِضْ" (قرض لے لو) کے الفاظ ہیں۔ امام ترمذی نے شمائل میں، اور حکیم ترمذی نے نوادر الحکم میں بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے [illegible] ۔ قرطبی والے الفاظ نقل کئے ہیں۔ امام بزار کہتے ہیں: میرے علم کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ روایت صرف اسی سند سے منقول ہے اور ہشام بن سعد سے اسے صرف اسحاق بن ابراہیم نے نقل کیا ہے اور ان کا حافظہ قابل اعتماد نہیں تھا۔ دیگر متعدد علماءِ رجال نے ضعیف کہا ہے۔ اس موضوع کی اور بھی بہت سی احادیث ہیں اگرچہ سند کے اعتبار سے ان میں سے اکثر کمزور ہیں۔

دیتے، اب جب کچھ نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا مکلف تو نہیں بنایا جو آپ کے بس میں نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات ناگوار گزری، اس پر ایک انصاری صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ خرچ کیجئے اور عرش والے کی طرف سے کمی کا کوئی خوف نہ کیجئے۔ انصاری صحابی کی اس بات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے یہاں تک کہ خوشی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رُخِ انور سے ظاہر ہونے لگی، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے یہی حکم دیا گیا ہے''۔

ہمارے علماءِ کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ کمی کا خوف اللہ تعالیٰ کی ذات پر بدگمانی کے مترادف ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو ان تمام چیزوں سمیت جو اس کے اندر ہیں بنی آدم کے لئے پیدا فرمایا ہے اور قرآن کریم میں فرمایا ہے: ﴿خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ [البقرۃ ۲ : ۲۹] (وہ اللہ جس نے وہ سب کچھ جو زمین کے اندر ہے تمہارے لئے بنایا) اور فرمایا: ﴿وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ﴾ [الجاثیۃ ۴۵ : ۱۳] (اور آسمان و زمین کی ہر ہر چیز کو بھی اس نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کر دیا چناں چہ یہ تمام چیزیں انسان کے لئے مسخر ہیں تاکہ اسے اللہ تعالیٰ کا ایسا بندہ بننے میں کوئی عذر نہ رہے جیسا کہ اس نے اسے بندہ پیدا کیا ہے اور اس پر حجت بھی پوری ہو جائے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ سے اچھا گمان رکھتا ہو تو کبھی کمی سے نہیں ڈرتا کیوں کہ وہ جو کچھ خرچ کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے اس کا بدلہ دے دیتے ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ۖ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِينَ﴾ [سبا ۳۴ : ۳۹] (تم جو کچھ بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرو گے اللہ اس کا پورا پورا بدلہ دے گا، اور وہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے) نیز یہ بھی ارشاد فرمایا: ﴿فَإِنَّ رَبِّي غَنِيٌّ كَرِيمٌ﴾ [النمل ۲۷ : ۴۰] (میرا پروردگار غنی ہے اور بڑا کرم کرنے والا ہے) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

[۳۶۱] سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي۔ يَابْنَ آدم أَنْفِقْ أُنْفِقْ عليكَ، يَمِينُ اللّٰه ملأى سَحًّا لَا يغيضُها شيءٌ الليلَ والنهارَ۔

[۳۶۱] یہ مکمل عبارت مجھے حدیث کی کسی متداول کتاب میں یکجا نہیں ملی۔ اس کا پہلا حصہ: ''سَبَقَتْ رَحْمَتِي غَضَبِي'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول حدیث کا ایک حصہ ہے جس کے الفاظ صحیح بخاری میں: ''لمّاقضی الله الخلق کتبَ [illegible] غا[illegible] أوقال: سَبَقَتْ رَحْمَتِي غضَبِي فهو عنده فوق العرش'' ہیں۔ بعض دیگر کتب میں یہی اور بعض میں [illegible] الفاظ جب کہ بعض میں طویل حدیث منقول ہے جس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ صحیح بخاری: کتاب التوحید، باب قول الله: ﴿بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ﴾ ۶: ۲۷۴۵، .... بقیہ آئندہ صفحہ پر

میری رحمت میرے غضب سے آگے ہے، اے آدم کی اولاد تو خرچ کر میں بھی تجھ پر خرچ کروں گا ، اللہ تعالیٰ کا دایاں ہاتھ بھرا ہوا اور موسلادھار بارش کی طرح عطا کرنے والا ہے اور رات دن گزرتے جاتے ہیں مگر اس کے خزانے میں کوئی کمی نہیں آتی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا:

[۳۶۲] مَا من یوم یُصبحُ العبادُ فیه إلا و ملكان ینزلان فیقول أحدهما اللّٰهُمَّ أَعْطِ مُنفقاً خَلَفاً و یقول الآخر اللّٰهم أَعْطِ مُمسكاً تَلَفاً۔

ہر روز جب بندے صبح اٹھتے ہیں تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں ۔ ان میں سے ایک کہتا ہے : اے اللہ جو خرچ کرتا ہے اسے اس کے بدلے اور عطا فرما اور دوسرا کہتا ہے : اے اللہ جو روک کر رکھتا ہے اس کے مال کو تباہ کردے۔

اسی طرح ہر شام کو غروب آفتاب کے وقت دو فرشتے اسی طرح آواز لگاتے ہیں۔ یہ سب صحیح احادیث سے ثابت ہے جنہیں الحمد للہ ائمہ حدیث نے نقل کیا ہے ۔ اب جو شخص اپنے سینے کو روشن کرلیتا ہے اور اسے اپنے رب کے غنی ہونے کا یقین ہوجاتا ہے وہ خرچ کرتا ہے اور کمی سے نہیں ڈرتا ۔ اسی طرح جس شخص کی دنیوی ہوس

بقیہ از صفحہ گزشتہ.........

صحیح مسلم: کتاب التوبة ،باب في سعة رحمة اللہ وأنهاسبقت غضبه ۴:۲۱۰۷۔ یہاں "إِنَّ رحمتي تغلب غضبي" ہے، صحیح ابن حبان: کتاب التاریخ ، باب بدأ الخلق ۱۴:۱۳،مسند امام احمد: مسند أبي هريرة رضي الله عنه ۲: ۴۸۰،۳: ۸۱وغیرہ میں طویل حدیث بروایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، جب کہ اس عبارت کا دوسرا حصہ ایک الگ حدیث ہے جیسا کہ صحیح بخاری: کتاب التفسیر، سورہ هود، ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ ۴:۱۷۲۴ ،کتاب التوحید باب قوله تعالى ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ ۶:۲۶۹۹،صحیح مسلم: کتاب الزكاة، باب" الحث على النفقة وتبشير المُنفِق بالخَلَف" ۲: ۶۹۰، ۶۹۱، جامع ترمذی: کتاب تفسير القرآن،باب ومن سورة المائدة ۵:۲۵۰،سنن ابن ماجہ: کتاب المقدمة ۱:۷۱،مسند امام احمدؒ:مسند أبي هريرة رضي الله عنه ۲:۴۸۰، ۶۰۰،۳: ۲۹۲،صحیح ابن حبان: کتاب الرقائق ، باب الورع والتوكل ۲:۵۰۳ میں منقول ہے اور بعض مقامات پر یہ حدیث اس سے زیادہ مفصل موجود ہے ۔

....

[۳۶۲] صحیح بخاری: کتاب الزكاة ، باب قوله تعالیٰ : ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى﴾ ۲:۵۲۲بروایت حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ، صحیح مسلم: کتاب الزكاة ، باب في المنفق والممسك ۲: ۷۰۰، سنن بیہقی: کتاب الزكاة ،باب كراهية البخل والشح والإقتار ۶:۱۵۱،صحیح بن حبان: کتاب الزكاة ،باب صدقة التطوع ۸:۱۲۱بروایت ابی الدرداء رضی اللہ عنہ،مصنف عبدالرزاق: کتاب الجامع، باب منادی السحر ۱۰:۴۴۴بروایت مجاہد مرسلا، حاکم: کتاب الأهوال ۴:۶۰۴ بروایت ابی سعید الخدري رضی اللہ عنہ ۔

ختم ہوجاتی ہے اور وہ اپنے نفس کے لئے تھوڑی بہت میسر خوراک پر قناعت کرلیتا ہے اوراس کے دل کی چاہتیں ختم ہوجاتی ہیں ایسا شخص بھی تنگی ہو یا وسعت ہر حال میں خرچ کرتا ہے اور بھوک سے نہیں ڈرتا۔ بھوک اور افلاس سے تو وہ لوگ ڈرتے ہیں جن کے دلوں کی چاہت چیزوں میں لگی رہتی ہے۔ ایسے لوگ اگر ایک دن کچھ خرچ کرنے لگتے ہیں اوردوسرے دن ان کے پیش نظر کوئی کام ہوتا ہے تو ان کو پہلے دن ہی فکر دامن گیر ہوجاتی ہے کہ کہیں کل ضرورت کے وقت مال کم نہ پڑجائے اور اس طرح وہ کمی کے خوف سے اسی دن کڑھنا شروع کردیتے ہیں۔ امام مسلم نے حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے، فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا:

[۳۶۳] انفَحِي أو انضَحِي أو أنفقي ولا تُحصِي فيُحصِي اللّٰهُ عليكِ ولا تُوعِي فيُوعِي اللّٰه عليكِ۔

سخاوت کیا کرو اور مال خرچ کیا کرو، اسے گِنانہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں گن گن کر دیں گے۔ کنجوسی کرکے مال جمع بھی نہ کیا کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے ہاتھ کھینچ لیں گے۔

امام نسائیؒ نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے، آپؓ فرماتی ہیں: ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں تشریف فرماتھے کہ ایک سائل آگیا، میں نے اسے دینے کے لئے کوئی چیز منگوائی اور پھراسے اپنے پاس منگواکر دیکھاتواس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۳۶۴] أما تريدين ألا يدخل بيتك شيء ولا يخرج إلا بعلمك، قلت: نعم؛ قال: مَهْلاً يا عائشة لا تُحْصي فيُحصي اللّٰه عزّوجل عليك۔

کیاتم یہ چاہتی ہو کہ تمہارے گھر میں تمہارے علم کے بغیر نہ کوئی چیز آئے نہ جائے ؟میں نے عرض کیا: جی ہاں ؛ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: چھوڑو عائشہ! چیزوں کو گنانہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں گن گن کر دیں گے۔

---

[۳۶۳] صحیح مسلم: كتاب الزكاة ، باب الحث على الإنفاق وكراهة الإحصاء ۲: ۷۱۳ ،صحیح بخاری: كتاب الهبة وفضلها،باب هبة المرأة لغيرزوجهاوعتقهاإذاكان لها...... ۲:۹۱۵۔متن تفسیر کے الفاظ امام مسلم کے ہیں جب کہ ان کے علاوہ امام احمدؒ، بیہقیؒ ،ابن حبان وغیرہ متعدد محدثین نے اس سے ملتے جلتے الفاظ نقل کیے ہیں۔

[۳۶۴] متن نسائی:السنن الكبرى، كتاب الزكاة ،باب الإحصاء في الصدقة ۵: ۷۳ ، شعب الإيمان ،الثاني والعشرون ...... ، باب في الزكاة......،فصل في الاختيار في صدقة التطوع ۳:۲۴۲۔ اس حدیث کے راوی امیہ بن ہند المزنی مقبول ہے جیسا کہ تقریب میں ہے۔

پانچویں بحث:﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى﴾ کی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى﴾میں ''ثم''صرف ترتیب ذِکری کے لئے ہے نفس معاملہ میں ترتیب بتانے کے لئے نہیں۔''استواء''لغت میں کسی چیز کے اوپر چڑھ جانے کو کہتے ہیں جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿فَإِذَا اسْتَوَيْتَ أَنْتَ وَ مَنْ مَّعَكَ عَلَى الْفُلْكِ﴾ [المؤمنون۲۳: ۲۸] (جب تم اور تمہارے ساتھی کشتی پر با اطمینان بیٹھ جاؤ)، نیز فرمایا:﴿لِتَسْتَوُوا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ﴾ [الزخرف۴۳: ۱۳](تاکہ تم ان کی پیٹھ پر جم کر سوار ہوا کرو)۔ اسی معنی میں شاعر کا یہ قول ہے:

فأوردتُهم ماء بقَيفاء قَفرة وقد حلّقَ النجمُ اليمانيّ فَاستوى

میں ان کو لَق ودَق صحراء میں اس وقت پانی کے چشمہ پر لے گیا جب نجم یمانی حلقہ بناکر بلند ہوچکا تھا۔

یہاں بھی ''استوی''کا معنی بلند ہونا ہی ہے۔ جیسا کہ کہاجاتا ہے : ''استوت الشمس على رأسي'' (سورج بلند ہوکر برابر میرے سرپر آگیا)اور''استوت الطير على قمةِ رأسي'' (پرندہ اتنا اونچا چلاگیا کہ میرے سر کے عین اوپر آگیا) ان دونوں مثالوں میں بھی''استوی''کا معنی بلند ہونا ہی ہے۔

استواء کی کیفیت پر بحث

یہ آیت متشابہات میں سے ہے۔ اس کے اور اس کی ہم معنی دیگر آیات کے بارے میں تین طرح کے اقوال منقول ہیں:

پہلاقول :علماء کی ایک جماعت کہتی ہے : ہم اس ارشاد باری تعالیٰ کو پڑھتے ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں مگر اس کی تفسیر نہیں جانتے ، یہ رائے ائمہ دین کی ایک کثیر تعداد سے منقول ہے۔امام مالک رحمہ اللہ نے کسی شخص نے ارشادِ باری تعالیٰ:﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ۲۰: ۵](وہ رحمان عرش پر قائم ہے)کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا:

الإستواء غير مجهول، والكيف غير معقول ، والإيمان به واجب ، والسؤال عنه بدعة ، وأراک رجل سَوء! أخرِجُوه

نفسِ استواء تو معلوم ہے مگر اس کی کیفیت عقل میں آنے والی نہیں ہے ، اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے ۔ مجھے تم بُرے آدمی معلوم ہوتے

ہو! اسے یہاں سے نکال دو(۱)۔

دوسرا قول : بعض لوگ کہتے ہیں : ہم اسے پڑھتے بھی ہیں اور ظاہری لغوی معنی کے مطابق اس کی تفسیر بھی کرتے ہیں ۔ یہ شبہات میں پڑنے والے لوگوں کا قول ہے ۔

تیسرا قول: تیسرا قول یہ ہے کہ ہم اسے پڑھتے بھی ہیں اور اس کی تفسیر بھی کرتے ہیں مگر اس کے مفہوم کو اس کے ظاہری معنی پر چھوڑ دیتے ہیں ۔

''استواء'' کی لغوی تحقیق

ارشادِ باری تعالیٰ:﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى إِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ﴾(پھر آسمان کی طرف قصد کیا اور ان کو ٹھیک ٹھاک بنا دیا) کے بارے میں فراء کہتے ہیں کہ کلام عرب میں ''استواء'' کے دو معانی آتے ہیں : ایک اس کا اطلاق اس وقت ہوتا ہے جب کسی انسان کی جوانی اور طاقت ختم ہوجائے اور اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آجائے ۔ دوسرے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی چیز ٹیڑھے پن کے بعد درست حالت میں آجائے۔ اور اس کا ایک تیسرا معنی ''قصد کرنا ، متوجہ ہونا ، لپکنا'' بھی ہے چناں چہ کہا جاتا ہے : ''كان فلان مُقبِلاعلى فلان ثم استوى عليَّ

۱۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے امام ابوالقاسم لالکائی کی کتاب السنۃ کے حوالہ سے حسن بصری رحمہ اللہ کے طریق سے نقل کیا ہے ، وہ اپنی والدہ سے نقل کرتے ہیں ، ان کی والدہ نے ام المؤمنین حضرت اُم سلمۃ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:''الإستواء غير مجهول، والكيف غير معقول ، والإقرار به إيمان والجحود به كفر '' ۔ انہوں نے امام بیہقی کے حوالہ سے بسند جید عبداللہ بن وہب سے نقل کیا ہے، وہ کہتے ہیں: ہم امام مالک رحمہ اللہ کی خدمت میں تھے کہ ایک شخص اندر داخل ہوا اور سوال کیا :اے ابوعبدالرحمٰن !﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ میں استواء کی کیفیت کیا ہے؟ آپ نے سر جھکا لیا اور پسینہ پسینہ ہوگئے۔ پھر آپ نے سر اٹھایا اور فرمایا: ''﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ كماوصف به نفسه ،ولايقال كيف! وكيف عنه مرفوع،وماأراك إلاصاحب بدعة .أخرجوه'' اور یحیی بن یحیی کے طریق سے امام مالک رحمہ اللہ سے حضرت ام سلمۃ رضی اللہ عنہا والے الفاظ منقول ہیں اور اس میں یہ اضافہ ہے : ''والإقرار به واجب والسؤال عنه بدعة'']اسی سے ملتے جلتے اقوال دیگر علماء سلف سے بھی منقول ہیں ۔حافظ ابن حجر: فتح الباری،باب ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾﴿وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ﴾،امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنے فتاوی ۶:۲۳۶ میں اس پر مفصل بحث کی ہے اور سلف کے اقوال نقل کئے جس کا خلاصہ یہی ہے،ابن قدامۃ المقدسی: لمعة الإعتقاد:۲۶،إبراہیم بن موسی الشاطبی: الاعتصام،فصل الوجه السادس من النقل:۲۱۸،امام ابن تیمیۃ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب درأ تعارض العقل والنقل،معنى لإستواء على العرش۱:۲۲۴ میں امام مالک رحمہ اللہ کا یہ قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے : ''الإستواء معلوم ، والكيف مجهول ، والإيمان به واجب ، والسؤال عنه بدعة ''،اور امام مالک رحمہ اللہ سے قبل ان کے شیخ ربیعہ بھی کہہ چکے ہیں :''الإستواء معلوم ، والكيف مجهول ،ومن الله البيان ،وعلى الرسول البلاغ ،وعلينا الإيمان ''اسی طرح ان کی کتاب الرسالۃ التدمریۃ :۱۶ میں بھی منقول ہے ۔

وَلَيَّ يشاتمني: علي معنى أَقْبَلَ إِلَيَّ وَعَلَيَّ'' (فلاں شخص فلاں کی طرف جارہا تھا مگر اچانک میری طرف لپک پڑا اور مجھے گالیاں دینے لگا)۔ اس معنی کے لئے ''استوی'' کے ساتھ صلہ ''علیٰ'' اور ''إلیٰ'' دونوں طرح آتا ہے۔ یہی معنی ارشاد باری تعالیٰ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی إِلَی السَّمَآءِ﴾ (پھر آسمان کی طرف قصد کیا) کا ہے، واللہ اعلم۔ فراء کہتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد یہ بھی ہے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی إِلَی السَّمَآءِ﴾ کا معنی ''صَعِدَ'' یعنی (پھر آسمانوں پر چڑھ گئے) ہے۔ جیسا کہ کہا جاتا ہے: ''كان قاعداً فاستوى قائما'' (وہ بیٹھا تھا، پھر سیدھا کھڑا ہوگیا) اور ''كان قائماثم استوى قاعداً'' (وہ کھڑا تھا پھر سیدھا بیٹھ گیا)، یہ سب معانی لغت عرب میں مستعمل ہیں[1]۔

ابوبکر احمد بن علی بن الحسین البیہقی کہتے ہیں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اسْتَوٰی﴾ کا معنی ''اقبل'' (قصد کیا) صحیح ہے کیوں کہ ''إقبال'' کا معنی آسمان پیدا کرنے کا قصد کرنا ہے اور قصد ارادے کو کہتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی صفت بنانا جائز ہے۔ جہاں تک لفظ ''ثم'' کا تعلق ہے تو اس کا تعلق ''خلق'' کے ساتھ ہے ''إرادہ'' کے ساتھ نہیں۔ باقی یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ کا جو قول نقل کیا ہے وہ کلبی کی تفسیر سے ماخوذ ہے اور کلبی ضعیف ہے[2]۔

۱۔ فراء: معانی القرآن ۲: ۲۵

۲۔ محدث عبدالرزاقؒ نے سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ارشاد باری تعالیٰ ﴿وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ﴾ کے بارے میں سوال کرتے ہوئے عرض کیا کہ دیگر اشیاء کے پیدا ہونے سے پہلے پانی کس چیز پر تھا؟ تو آپ نے فرمایا: وہ ہوا کے دوش پر ہوتا تھا، ابن جریج کہتے ہیں: سعید بن جبیر نے کہا کہ پھر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آسمانوں کی طرف ایک ایسا بخار اٹھتا تھا جیسے نہروں سے اٹھتا ہے، پھر وہ بخار جم گیا اور یہی ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ثم استوى إلى السماء وهي دخانٌ﴾ کا مفہوم بھی ہے۔ ابن جریج کہتے ہیں: عمرو اور عطاء کا کہنا ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا بھیجی جس نے پانی کو پھیلا دیا اور بیت اللہ کی جگہ ایک گنبد نما خشک ٹیلا ظاہر ہوا، اسی جگہ آج بیت اللہ ہے۔ ابن جریج کہتے ہیں، عطاء کا کہنا ہے کہ پھر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو کھونٹے بنادیا تا کہ اس جگہ کا وزن برابر رہے۔ اسی لئے اس جگہ کو اُم القری کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ظاہر ہونے والا پہاڑ اَبُوقبیس تھا۔ عبدالرزاق: كتاب المناسک، باب بنيان الكعبة ۵: ۹۰۔ اس روایت سے تو ''استوی'' کا معنی ''صَعَد'' قطعاً نہیں بنتا کیوں کہ یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال ''استواء'' کے بارے میں نہیں ہوا بلکہ پانی کے بارے میں ہوا ہے کہ دیگر اشیاء کی پیدائش سے پہلے وہ کہاں ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے جواب بھی اسی کا دیا ہے جس میں یہ بتایا ہے کہ پہلے پانی بخارات کی صورت میں ہوتا تھا اور آسمانوں کی طرف یوں اٹھتا رہتا تھا جیسے دریاؤں سے بخارات اٹھتے ہیں۔ پھر اس کی دلیل کے طور پر ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ثم استوى إلى السماء وهي دخانٌ﴾ پیش فرمایا ہے یعنی پھر اللہ تعالیٰ آسمان کی طرف متوجہ ہوئے جو کہ اس وقت دھواں دھواں تھا چناں چہ انہی بخارات کو یہاں دھویں سے تعبیر کر دیا گیا۔ اس کی تائید خود ''فكان يصعد إلى السماء بخار كبخار الأنهار'' میں ''يَصعَدُ'' صیغہ مضارع سے بھی ہوتی ہے جس سے یہی بات واضح ہوتی ہے اور ''باری تعالیٰ کے استواء'' کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ باقی جہاں تک اس روایت کے ابن الکلبی سے منقول ہونے کی وجہ سے کمزور ہونے کا تعلق ہے تو امام عبدالرزاق کی سند میں ابن الکلبی نہیں ہیں .... بقیہ آئندہ صفحہ پر

سفیان بن عیینہ اور ابن کیسان کہتے ہیں: ارشاد باری تعالیٰ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ﴾ کا معنی یہ ہے کہ (اس نے آسمان کو پیدا کرنے اور بنانے کا قصد کیا) چناں چہ یہ بھی ایک قول ہے۔ ایک اور قول یہ ہے کہ "استواء" تو صحیح ہے مگر اس کی کیفیت اور حدود وصف وبیان سے بالاتر ہیں، یہی قول امام طبری نے بھی اختیار کیا ہے۔ ابوالعالیہ الریاحی سے منقول ہے کہ اس آیت کریمہ میں "استوٰی" کا معنی "ارتفعَ" بلند ہوا بھی منقول ہے [1]۔ امام بیہقیؒ کہتے ہیں: ابوالعالیہ کے اس قول سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے نتیجے میں اس پانی کے بخارات بلند ہوئے جن سے آسمان پیدا کیا گیا، واللہ اعلم۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ جس چیز کے بلند ہونے کا ذکر ہے وہ "دھواں" ہے۔ ابن عطیہ کہتے ہیں: سیاق کلام سے اس معنی کی تائید نہیں ہوتی۔ ایک اور قول یہ ہے کہ "استوٰی" کا معنی "استولی" (قابض ہوگیا) ہے جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

قد اسْتَوٰی بِشْرٌ علی العِراقِ مِن غیرِ سَیْفٍ و دَمٍ مُھْراق [2]

بشر نے تلوار چلائے اور خون بہائے بغیر ہی عراق پر قبضہ کرلیا۔

ابن عطیہؒ کہتے ہیں: یہ معنی تو ارشادِ باری تعالیٰ ﴿الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ [طٰہٰ ۲۰: ۵] (وہ رحمان عرش پر قائم ہے) کے مطابق ہے۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: فراء کا قول گزر چکا ہے کہ فعل "استوٰی" میں صلہ "علیٰ" اور "إلیٰ" دونوں کا ایک ہی معنی ہے۔ اسی مسئلہ پر مزید بحث ان شاء اللہ سورۃ "الأعراف" میں آئے گی۔ البتہ جہاں تک اس لفظ کے بنیادی معنی کا تعلق ہے تو اس آیت کریمہ اور اس جیسی دیگر آیات میں "استوٰی" کا بنیادی معنی (نقل وحرکت کا ختم ہوجانا ہے)۔

بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ ....

بلکہ ان کی سند: عبدالرزاق عن معمر عن الأعمش عن المنھال بن عمرو عن سعید بن جبیر قال: سألت ابن عباس رضی اللہ عنہ عن قولہ: ﴿وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ﴾...... ہے۔ واللہ أعلم۔

....

۱۔ ابوالعالیہ کی اس رائے کو امام بخاری نے کتاب التوحید، باب ﴿وكان عرشه على الماء﴾، ﴿وهو رب العرش العظيم﴾ ......۶: ۲۶۹۸ کے ترجمۃ الباب میں ذکر کی ہے اور اس کے ساتھ مجاہد سے "استوی" کا معنی "علا" بھی نقل کیا ہے۔

۲۔ یہ شعر ابومالک غیاث بن غوث التغلبی المعروف اخطل (م ۹۵ھ) اپنے دور کے تین مشہور شعراء میں سے ایک ہے۔ اس کی نشوونما عیسائیت کے ماحول میں ہوئی۔ تاریخ الأدب العربی ص ۱۷۶، تفسیر ابن عطیہ ۱: ۲۲۴

چھٹی بحث: تخلیق ارض وسما کے مراحل اور مدت تکمیل

اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زمین کو آسمان سے پہلے پیدا کیا اور یہی بات سورۂ ''حم سجدہ'' میں بھی ہے جبکہ سورۂ نازعات میں ارشاد باری تعالیٰ: ﴿ءَ أَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا﴾ [النازعات ۷۹: ۲۷] (کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے یا آسمان کا؟ جسے اللہ تعالیٰ نے بنایا) چناں چہ یہاں پہلے آسمان کی پیدائش کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد فرمایا: ﴿وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَآ﴾ [النازعات ۷۹: ۳۰] (اور اس کے بعد زمین کو بچھا دیا) تو گویا اس آیت کریمہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ آسمان کو زمین سے پہلے بنایا گیا، اسی طرح ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ﴾ [الأنعام ۶: ۱] (تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لائق ہیں جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا)۔ اور یہی بات قتادہ رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ آسمان ہی کی پیدائش پہلے ہوئی، اس قول کو طبری رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے۔

تخلیقی مواد اور کیفیت

امام مجاہدؒ اور دیگر مفسرین کہتے ہیں کہ جس پانی پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا عرش تھا اسے انہوں نے خشک کردیا اور اس سے زمین بنادی، پھر اس زمین سے دھواں اٹھا جو بلند ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اس سے آسمان بنادیا، اس طرح زمین کی تخلیق آسمان سے پہلے ہوئی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے حکم سے اس آسمان کا قصد فرمایا اور اسے ایک سے سات آسمان بنادیا۔ پھر جو زمین پہلے بنائی تھی اسے بچھا دیا کیوں کہ جب وہ پیدا کی گئی تھی تو بچھی ہوئی نہ تھی۔

مؤلف کی رائے

میں کہتا ہوں: قتادہؒ کا قول ہی ان شاء اللہ صحیح ثابت ہوگا اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے آسمان کے دھوئیں کو پیدا فرمایا، اس کے بعد زمین کو بنایا، پھر آسمان کے لئے جو دھواں تیار تھا اس کا قصد کیا اور اسے برابر کردیا اس کے بعد پھر زمین کو بچھانے کا کام کیا۔ اور اس بات کی دلیل کہ دھویں کو زمین سے پہلے پیدا کیا گیا سدی کی یہ روایت ہے جو انہوں نے ابو مالک اور ابو صالح سے نقل کی ہے اور انہوں نے اسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ یہ روایت انہوں مرہ ہمدانی سے بھی نقل کی ہے جنہوں نے اسے حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور کئی دیگر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِى الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوٰٓى إِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا پھر آسمان کی طرف قصد کیا اور ان کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنادیا) کی تفسیر میں

ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کا عرش پانی پر تھا اور اس نے پانی سے پہلے کسی اور چیز کو پیدا بھی نہیں کیا تھا، پھر جب اس نے مخلوق کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو اس پانی کو دھوئیں کی شکل میں باہر نکالا جو کہ بلند ہوتے ہوتے پانی سے اوپر آ گیا، اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ''سما'' (بلند) رکھ دیا، پھر اس پانی کو خشک کیا اور اس سے ایک زمین بنادی۔ پھر اس ایک زمین کو پھاڑ کر اس سے دو دنوں کے عرصے میں سات زمینیں پوری کردیں یہ دو دن اتوار اور پیر کے دن تھے۔ پھر اس زمین کو ایک بڑی مچھلی پر رکھ دیا۔ یہ وہی مچھلی ہے جسے قرآن مجید میں ''نون'' کہا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿نٓ ج وَالْقَلَمِ﴾[القلم۶۸: ۱] (ن، اور قسم ہے قلم کی)، پھر اس مچھلی کو پانی میں ڈال دیا، پانی کو ایک صاف چٹان پر ٹھہرا دیا، یہ چٹان ایک فرشتے کی کمر پر رکھی، فرشتے کو پھر ایک چٹان پر جگہ دی اور اس چٹان کو ہوا کے دوش پر رکھ دیا۔ یہ وہی چٹان ہے جس کا ذکر کرتے ہوئے حضرت لقمان علیہ السلام نے کہا تھا کہ وہ نہ آسمانوں میں ہے اور نہ زمین میں۔ چناں چہ اس مچھلی نے حرکت کی اور مسلسل ہلنے لگی تو تو زمین میں زلزلہ آ گیا جس پر اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو بھیج دیا، پہاڑوں کے آنے سے زمین ٹھہر گئی، یہی وجہ ہے کہ پہاڑ زمین پر فخر کرتے ہیں۔ اس بات کا ذکر ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ اَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ﴾ [النحل۱۶: ۱۵] (اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیئے ہیں تاکہ تمہیں لے کر یہ نہ ہلے) میں بھی ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے اس میں پہاڑ پیدا فرمائے، اسی میں اہل زمین کا رزق رکھ دیا، درخت پیدا کردیئے اور اس کی ضرورت کی دوسری چیزیں ودیعت فرمادیں۔ یہ صرف دو دنوں ''منگل اور بدھ'' میں بنایا۔ اس بات کا ذکر ارشاد باری تعالیٰ ﴿قُلْ اَئِنَّکُمْ لَتَکْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ تَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ج ذٰلِکَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ.وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بٰرَکَ فِیْهَا وَ قَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ﴾ [فصلت ۴۱: ۹، ۱۰] (تم تو اس ذات کے منکر ہو اور اس کے ساتھ شریک ٹھہرا رہے ہو جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کردیا۔ وہی تو سارے جہاں کا مالک ہے۔ اور اسی نے زمین میں اوپر کی طرف پہاڑ بنادیئے اور اس میں برکت رکھی، اور اس میں سب سامان معیشت مقرر کردیا۔ یہ سب چار دن میں پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے) مطلب یہ کہ جو کوئی اس کے بارے میں پوچھے تو اس کی حقیقت یہی ہے۔ پھر فرمایا: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ﴾ [فصلت ۴۱: ۱۱] (پھر آسمان کی طرف توجہ کی اس حال میں کہ وہ دھواں تھا) اور یہ دھواں جو کہ پانی کے سانس لینے سے پیدا ہوا تھا اللہ تعالیٰ نے اس سے ایک آسمان بنادیا، پھر دو دنوں کے اندر اسے پھاڑ کر سات آسمان بنادیئے۔ یہ دو دن جمعرات اور جمعہ تھے اور جمعہ کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق کو جمع کیا تھا، پھر فرمایا: ﴿وَ اَوْحٰی فِیْ کُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا﴾ [فصلت ۴۱: ۱۲] (اور اس نے ہر آسمان میں اس کے مناسب حکم بھیج دیا) مطلب یہ کہ ہر آسمان میں اس سے متعلقہ مخلوق فرشتے، سمندر اور اولوں کے پہاڑ وغیرہ پیدا کئے جن کے

بارے میں کوئی نہیں جانتا، پھر سب سے نچلے آسمان کو ستاروں سے سجادیا جوکہ اس کے لئے سجاوٹ بھی ہیں اورشیاطین سے اس کی حفاظت بھی کرتے ہیں۔جب اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ بنالیا جو بنانا چاہتے تھے تو عرش پر جاٹھہرے۔ راوی کہتے ہیں اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد فرمایا: ﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِيْ سِتَّةِ أَيَّامٍ﴾ [الحدید ۵۷: ۴، الأعراف ۷: ۵۴] (آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا) اور ﴿كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا﴾ [الأنبیاء ۲۱: ۳۰] (یہ باہم ملے جلے تھے پھر ہم نے انہیں جدا کیا)، اس کے بعد انہوں نے آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ بیان کیا جس کی تفصیل آئندہ ان شاء اللہ آئے گی۔

وکیع نے اعمش سے نقل کیا ہے، انہوں نے ابوظبیان سے اور انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جو چیز پیدا فرمائی وہ ''قلم'' ہے، اسے پیدا کرنے کے بعد فرمایا کہ لکھو، اس نے عرض کیا: اے میرے مالک! میں کیا لکھوں؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: تم تقدیر لکھو، چناں چہ اس وقت سے لیکر قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا قلم نے اسے لکھ دیا۔ راوی کہتے ہیں: پھر اللہ تعالیٰ نے نون مچھلی کو پیدا فرمایا اور اس پر زمین کو بچھادیا جس سے پانی کے بخارات دھویں کی شکل میں اڑنے لگے۔ ان بخارات سے اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو بنادیا، پھر نون مچھلی ہلنے لگی تو زمین میں زلزلہ آگیا، اللہ تعالیٰ نے پہاڑ بنا کر زمین کو ٹھہرا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پہاڑ قیامت تک زمین پر فخر کرتے رہیں گے۔اس روایت میں پہلی روایت کے برعکس پانی کے بخارات دھویں کی شکل میں اڑنے سے پہلے زمین کی پیدائش کا ذکر ہے مگر پہلی روایت اس سے اور اس کے علاوہ دیگر روایات سب سے بہتر ہے جس کی تائید ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَآ﴾ [النازعات ۷۹: ۳۰] (اوراس کے بعد زمین کو ہموار کرکے بچھا دیا) سے بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود ہی بہتر جانتے ہیں کہ انہوں نے کیا کیا۔ اس میں روایات مختلف ہیں اوراس میں اجتہاد کی گنجائش نہیں۔ابونعیم نے کعب احبار رحمہ اللہ (۱) سے نقل کیا ہے کہ ابلیس اس مچھلی کے اندر گھس گیا جس کی پیٹھ پر ساری زمین رکھی ہوئی ہے، اور اس کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا: اے لوثیا! کیا تمہیں معلوم ہے تمہاری پیٹھ پر کتنی قومیں، کتنے درخت، کتنے جانور، کتنے لوگ اور کتنے پہاڑ ہیں! اگر تم ان سب کو جھٹک دو تو سب تمہاری پیٹھ سے گر جائیں گے۔یہ سن کر لوثیا نے ایسا کرنے کا ارادہ کیا مگر اچانک اللہ تعالیٰ نے ایک ایسا جانور بھیج دیا جو اس کے نتھنوں میں گھس گیا۔ مچھلی نے رودھو کر اللہ تعالیٰ سے فریاد کرنا شروع کی تو وہ جانور نکل گیا۔کعب کہتے ہیں: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ جانور اب تک اس مچھلی کے سامنے ہے اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں تاکہ اگر پھر کبھی مچھلی کو ایسا خیال آئے تو وہ پھراس کے نتھنوں میں گھس جائے۔

۱۔ کعب احبار رحمہ اللہ اکثر کتب قدیمہ سے روایات نقل کرتے تھے اور صحیح بخاری میں ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی روایات کو نا قابل اعتماد قرار دیا تھا۔

ساتویں بحث: تخلیق کائنات کے بنیادی عناصر

تمام اشیاء کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے جیسا کہ امام ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اپنی سنن میں اور ابوحاتم بُستی نے اپنی مسند صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! میری نظر جب آپؐ کے چہرہ انور پر پڑتی ہے تو دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے اور آنکھیں ٹھنڈی ہوجاتی ہیں۔ آپ مجھے ہر چیز کے بارے میں بتادیجئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

[۳۶۵] كل شيء خُلق من الماء،قلت أخبرني بشيئ إذاعلمت به دخلت الجنة۔
قال:'' أطعِم الطعامَ وأفِش السّلامَ وَصِلِ الأرحام و قُم الليل والناسُ نيام تدخل الجنة بسلام۔

ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی ہے ۔ میں نے عرض کیا : مجھے کوئی ایسا عمل بتادیں جسے میں بجالاؤں اور جنت میں داخل ہوجاؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں کو کھانا کھلایا کرو، سلام کو پھیلایا کرو، صلہ رحمی کیا کرو، اور رات کو اس وقت اٹھ کر اللہ کے حضور قیام کیا کرو جب لوگ سوئے ہوں تو تم سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہوجاؤ گے ۔

ابوحاتمؒ کہتے ہیں :حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے اس قول کہ ''مجھے ہر چیز کے بارے میں بتادیجئے'' سے مراد ''ہر ایسی چیز کے بارے میں سوال کرنا ہے جو پانی سے پیدا کی گئی ہے''۔ اور اس کی دلیل حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب ارشاد فرمانا ہے کہ ''ہر چیز پانی سے پیدا کی گئی ہے''۔اگر وہ چیز ابھی تک وجود میں نہ بھی آئی ہو[1]۔

---

[۳۶۵] صحیح ابن حبان: کتاب الصلاۃ ،باب النوافل ۲: ۲۹۹،مسند امام احمدؒ:مسند أبي هريرة رضي الله عنه۲: ۲۲۱،۵۷۱،مستدرک امام حاکمؒ: کتاب البر والصلة ۴: ۱۷۶، شعب الإيمان ، السابع والخمسون......باب في حسن الخلق ، فصل في طلاقة الوجه وحسن البشر لمن يلقاه من المسلمين ۶: ۲۵۲۔اس کی سند شیخین کی شروط کے مطابق ہے سوائے ابومیمونہ کے اور وہ بھی ثقہ ہے جیسا کہ تقریب میں ہے۔

۱۔ یہاں تک ابن حبان کی عبارت ہے جس میں مؤلف رحمہ اللہ نے کچھ اختصار بھی کیا ہے ۔یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی :''كل شيء خُلق من الماء'' نقل کرنے کے بعد مؤلف نے ''وإن لم يكن مخلوقا'' لکھا ہے ، ارشاد نبوی کے سیاق میں اس عبارت کا معنی مجھ پر کوئی زیادہ واضح نہیں ہوسکا،اپنے غالب اندازے کے مطابق ''اگر وہ چیز ابھی تک وجود میں نہ بھی آئی ہو'' لکھ دیا ہے ۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے مراد غیر ذی روح مخلوقات ہوں۔واللہ اعلم

سعید بن جبیر رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۶۶] إن أوّل شيء خلقه اللّٰه القَلم وأمره فكتب كلّ شيء يكون۔
اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس چیز کو پیدا کیا وہ قلم ہے، اسے پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے اسے لکھنے کا حکم دیا چناں چہ اس نے وہ سب کچھ لکھ دیا جو ہونے والا تھا۔

[۳۶۷] یہی حدیث حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ سے بھی مرفوعاً منقول ہے۔ بیہقی کہتے ہیں: سب سے پہلے قلم کو پیدا کرنے سے مراد یہ ہے کہ پانی، ہوا اور عرش کو پیدا کرنے کے بعد تمام چیزوں سے پہلے اسے پیدا کیا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت عمران بن حصین کی حدیث کے یہ الفاظ بھی اس کی واضح دلیل ہیں:

[۳۶۸] ثم خلق السموات والأرض...... (پھر اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان بنائے)

---

[۳۶۶] مستدرک حاکم: كتاب التفسير، باب تفسير سورة ﴿نٓ وَالْقَلَمِ﴾ ۲: ۵۴۰، مسند ابویعلیٰ: مسند ابن عباس رضی اللہ عنہ ۴: ۲۱۷، سنن بیہقی: كتاب السير، باب مبدأ الخلق ۱۳: ۱۸۷، حافظ سیوطیؒ نے الجامع الكبير ۱: ۲۱۴۱، حدیث نمبر ۶۳۵۲/۱۸۶۶ میں اسے ابونعیم، ابویعلیٰ، بیہقی، اور ابن نجار کے حوالہ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں اور اس کے بعد آنے والی حدیث اس کی مؤید ہے۔

[۳۶۷] سنن ابوداؤد: كتاب السنة، باب في القدر ۴: ۲۲۵، جامع ترمذی: كتاب القدر، باب ...... ۴: ۴۵۷ بروایت ولید بن عبادة بن الصامت رضی اللہ عنہ عن أبیہ۔ امام ترمذی کہتے ہیں: یہ حدیث اس صیغہ کے ساتھ غریب ہے، سنن بیہقی: كتاب الشهادات، باب ماترد به شهادة أهل الأهواء ۱۵: ۲۸۲، امام بیہقی نے كتاب السير، باب مبدأ الخلق ۱۳: ۱۸۷ میں بھی اس حدیث کا ذکر کیا ہے، البانی نے صحیح ترمذی: ۱۷۴۹ میں اسے صحیح کہا ہے۔ اس میں حضرت عبادة رضی اللہ عنہ کی اپنے بیٹے ولید کو وصیت کا ذکر ہے جس کے آخر میں قلم کی سب سے پہلے پیدائش اور تقدیر لکھنے کا ذکر ہے۔

[۳۶۸] صحیح بخاری: كتاب التوحيد، باب وكان عرشه على الماء وهو ربُّ العرش العظيم ۶: ۲۶۹۹، كتاب بدأ الخلق، باب ماجاء في قول الله: وهو الذي يبدأ الخلق ثم يعيده...... ۳: ۱۱۶۶، صحیح ابن حبان: كتاب التاريخ، باب بدأ الخلق ۱۴: ۷، ۱۰، سنن بیہقی: كتاب السير، باب مبدأ الخلق ۱۳: ۱۸۶، حدیث کی تفصیل میں حضرت عمران بن حصین فرماتے ہیں: میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور دروازے کے پاس اپنی اونٹنی باندھ دی، اس کے بعد بنوتمیم کے کچھ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا: اے اہل یمن تم لوگوں کو خوشخبری ہو...... پھر اس حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں: "كان الله ولم يكن شيئ غيره، وكان عرشه على الماء، وكتب في الذكر كل شيئ، وخلق السموات والأرض" (اللہ تعالیٰ موجود تھے اور ان کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا، ان کا عرش پانی کے اوپر تھا۔ پھر انہوں نے لوح محفوظ میں سب کچھ لکھا اور پھر آسمان وزمین کو بنایا) اور بیہقی کی روایت میں ہے: "ثم خلق السموات" کے الفاظ ہیں جن کا معنی پھر آسمان وزمین بنائے ہے۔

عبدالرزاقؒ نے عمر بن حبیب بن عمرو بن مکی سے نقل کیا ہے، انہوں نے حُمید بن قیس الأعرج سے اور انہوں نے طاؤس سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

[۳۶۹] ایک آدمی حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اوران سے پوچھا: مخلوق کس چیز سے پیدا ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا: پانی، روشنی، اندھیرے، ہوا اورمٹی سے۔ اس نے پوچھا: پھر یہ چیزیں خودکس سے بنی ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے معلوم نہیں۔ راوی کہتے ہیں: اس کے بعد یہ شخص حضرت عبد اللہ بن زبیر کے پاس آیا اور ان سے بھی یہی سوال کیا۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو عبد اللہ بن عمرو نے دیا تھا۔ کہتے ہیں: پھروہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اوران سے پوچھا: مخلوق کس چیز سے پیدا ہوئی ہے؟ انہوں نے کہا: پانی، روشنی، اندھیرے، ہوا اورمٹی سے۔ اس نے کہا: یہ چیزیں خود کس سے بنی ہیں؟اس پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿وَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾[الجاثیۃ ۴۵: ۱۳] (اور آسمان و زمین کی ہر ہر چیز کو بھی اس نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کردیا۔ یہ سن کر وہ شخص کہنے لگا: یہ جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کا کوئی فرد ہی دے سکتا تھا۔ امام بیہقیؒ کہتے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے آیت تلاوت کرنے سے مقصود یہ بتانا تھا یہ تمام چیزیں اسی ذات کی پیدا کردہ اور اسی کی ایجاد ہیں۔ اس نے پہلے پانی کو پیدا کیا، یا پانی اور اس کے ساتھ جو چاہا پیدا کیا جن کی کوئی سابقہ مثال یاوجود نہیں تھا، پھر ان چیزوں کو بعد کی مخلوق کی بنیاد بنادیا۔ وہی ایجاد کرنے والااور سابقہ نمونوں کے بغیر پیدا کرنے والا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں نہ ہی کوئی خالق ہے، اس کی ذات پاک، شان بلند اور قدرت سب سے اعلیٰ ہے۔

آٹھویں بحث: زمینوں اور آسمانوں کی تعداد

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (پھر ان کو ٹھیک ٹھاک سات آسمان بنادیا) یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ تو ذکر فرمایاہے کہ آسمان سات ہیں مگر قرآن مجید میں زمینوں کی تعدا کے بارے میں کوئی اتنی واضح رہنمائی نہیں ملتی جس میں تاویل کی گنجائش موجود نہ ہو۔ صرف ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ مِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ [الطلاق ۶۵: ۱۲]

---

[۳۶۹] مستدرک حاکم: کتاب التفسیر، باب تفسیر سورہ حمٓ الجاثیۃ .وعند أهل الحرمين حمٓ الشريعة ۲: ۴۹۰

(اوراسی کے مثل زمینیں بھی) سے ایسا معلوم ہوتا ہے مگر اس میں بھی مفسرین کا اختلاف ہے ۔ بعض کہتے ہیں اس سے مراد آسمانوں کے ساتھ تعداد میں مماثلت ہے کیوں کہ زمینوں کی بناوٹ اور کیفیت تو ظاہراً بھی آسمانوں سے مختلف نظر آتی ہے اور روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے لہذا اس ارشاد باری تعالیٰ سے زمینوں کی تعداد کا تعین ہوجاتا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ ﴿وَ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾ سے مراد ان کی موٹائی اور درمیانی فاصلہ ہے ۔ ایک اور رائے یہ ہے کہ زمینوں کی تعداد تو سات ہی ہے مگر انہیں ایک دوسری سے نہیں بنایا گیا۔ یہ مفسر داؤدیؒ کا قول ہے مگر صحیح پہلا قول ہی ہے اور وہ یہ کہ ان کی تعداد بھی آسمانوں کی تعداد کی طرح سات ہی ہے جیسا کہ امام مسلم نے حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے، آپؓ فرماتے ہیں: میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:

[۳۷۰] مَن أخذ شبراً من الأرض ظُلماً طُوِّقه إلى سبع أرضين۔
جو شخص زیادتی سے کسی کی ایک بالشت زمین بھی چھینے گا اسے اسی زمین کے سات طبقات کا طوق پہنایا جائے گا۔

[۳۷۱] یہ روایت حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی اسی طرح کے الفاظ کے ساتھ منقول ہے، فرق صرف یہ ہے کہ وہاں ''إلى'' کی بجائے ''مِن'' کے الفاظ ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں اس حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

[۳۷۲] لا يأخذُ أحَدٌ شِبراً من الأرض بغير حقّه إلا طَوّقَه اللّٰه إلى سبع أرضين يوم القيامة۔

---

[۳۷۰] صحیح بخاری: كتاب ابدأ الخلق، باب ماجاء في سبع أرضين وقول الله: الله الذي......۳: ۱۱۶۸، صحیح مسلم: كتاب المساقات، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها ۳: ۱۲۳۰، ۱۲۳۱۔ امام دارمیؒ، احمد بن حنبلؒ، ابویعلی، بزار، طبرانی، بیہقی، عبدالرزاق اورامام ترمذیؒ نے بھی اسے نقل کیا ہے۔

[۳۷۱] صحیح بخاری: كتاب المظالم، باب إثم من ظلم شيئا من الأرض ۲: ۸۶۶، كتاب بدأ الخلق، باب ماجاء في سبع أرضين وقول الله: الله الذي......۳: ۱۱۶۷، صحیح مسلم: كتاب المساقات، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها ۳: ۱۲۳۱، مسند امام احمدؒ: حديث السيّدة عائشة رضى الله عنها ۷: ۱۱۷، سنن بیہقی: كتاب الغصب، باب التشديد في غصب الأراضي وتضمينها بالغصب ۸: ۵۰۲

[۳۷۲] صحیح مسلم: كتاب المساقاة، باب تحريم الظلم وغصب الأرض وغيرها ۳: ۱۲۳۱، صحیح ابن حبان: كتاب الغصب ۱۱: ۵۶۶، مسند امام احمد: مسندأبي هريرة رضي الله عنه ۳: ۹۴، ۱۷۰، سنن بیہقی: كتاب الغصب، بب التشديد في غصب الأراضي وتضمينها بالغصب ۸: ۵۰۲، مصنف عبدالرزاق: كتاب الجامع، باب سرقة الأرض ۱۱: ۱۰۰۔ اس حدیث کو طیالسی اورابن ابی شیبہؒ نے بھی نقل کیا ہے۔

جو بھی شخص کسی کی بالشت بھر زمین ناحق لے لے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسے اس مقام سے سات زمینوں کا طوق پہنائیں گے۔

امام نسائیؒ نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

[۳۷۳] قال موسى عليه السلام: يا ربّ علِّمني شيئاً أذكرك به وأدعوك به قال: يا موسىٰ قل: لا إله إلا الله قال موسى يا ربِّ كل عبادك يقول هذا، قال قل لا إله إلا الله قال لا إله إلا أنت، إنما أريد شيئاً تخصّني به قال يا موسى: لو أنّ السموات السّبع وعامرهن غيري والأرضين السبع في كِفّةٍ وَلا إله إلاالله في كِفّةٍ مالت بهنّ لا إله إلا الله۔

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے پروردگار! مجھے کوئی ایسی چیز سکھا دیجئے جس سے میں آپ کو یاد کیا کروں اور آپ سے دعا کیا کروں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ ''لا إله إلا الله'' کہا کریں، انہوں نے عرض کیا میرے پروردگار! یہ تو آپ کے سب بندے کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لا إله إلا الله'' کہا کریں۔ موسیٰ علیہ اسلام نے عرض کیا: تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ میرا مقصد یہ ہے کہ ایسے کلمات ہوں جن سے آپ صرف مجھے نوازیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اگر مجھے چھوڑ کر ساتوں آسمان اور جو کچھ ان کے اندر ہے اور اسی طرح ساتوں زمینیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیئے جائیں اور ''لا إله إلا الله'' دوسرے پلڑے میں رکھ دیا جائے تو ''لا إله إلا الله'' والا پلڑا ان سب کے باوجود جھک جائے گا۔

امام ترمذیؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ان پر بادل کا ایک ٹکڑا آیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

---

[۳۷۳] سنن نسائی:۶:۲۰۸ حدیث نمبر ۹۷۱۳۶، مستدرک حاکم: كتاب الدعاء والتكبير والتهليل والتسبيح والذكر ۱:۷۱۰، صحیح ابن حبان: كتاب التاريخ، باب بدأ الخلق ۱۴:۱۰۲، مسند ابویعلیٰ: مسند أبي سعيد الخدري رضى الله عنه ۲:۵۲۸، ان حضرات نے درّاج سے نقل کیا ہے، انہوں نے ابوالہیثم سے اور ابوالہیثم نے ابوسعید رضی اللہ عنہ سے اسے مرفوعاً نقل کیا ہے۔ امام حاکم نے اسے صحیح کہا ہے اورحافظ ذہبیؒ نے ان کی تائید کی ہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری ۱۱:۲۰۸ میں اسے صحیح کہا ہے مگر تقریب میں ''دراج'' کے تعارف کے ضمن میں لکھا ہے کہ یہ صدوق ہیں اور جب ابوالہیثم سے روایت نقل کرتے ہیں تو وہ ضعیف ہوتی ہے۔ میزان میں ہے: یحییٰ کہتے ہیں: اس میں کوئی حرج نہیں اوراس کا راوی ثقہ ہے، امام نسائی کہتے ہیں: یہ منکر الحدیث ہیں، ابوحاتم نے بھی انہیں ضعیف کہا ہے اور ابن عدی کہتے ہیں: عام طور پر ان کی احادیث قابل اعتماد نہیں ہوتیں، اس طرح یہ شخص ثقہ نہیں ہے اور اس کی حدیث حسن کے درجہ کو نہیں پہنچتی بلکہ شبہ حسن ہے۔ باقی جن ماہرین فن نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے شاید ان کی مراد اس کے متن کا اچھا ہونا ہے۔

[۳۷۴] هَل تدرون ما هذا؟ فقالوا: اللّٰه و رسوله أعلم؛ قال: هذا العَنان هذه روايا لأرض يسوقه إلى قوم لا يشكرونه ولا يدْعونه۔قال: هل تدرون ما فوقكم؟ قالوا: اللّٰه و رسوله أعلم؛ قال: فإنها الرَّقيع سقفٌ محفوظٌ و مَوج مكفوف۔ ثم قال: هل تدرون كم بينكم وبينها؟ قالوا: اللّٰه ورسوله أعلم؛ قال: بينكم و بينها مسيرة خمسمائة عام۔ ثم قال: هل تدرون ما فوق ذلك؟ قالوا اللّٰه ورسوله أعلم؛ قال: فإن فوق ذلك سماء ين بُعْدُ مابينهما مسيرة خمسمائة سنة۔ ثم قال: كذلك حتى عدّ سبع سموات ما بين كل سماء ين ما بين السماء والأرض۔ ثم قال: هل تدرون ما فوق ذلك؟ قالوا: اللّٰه ورسوله أعلم؛ قال: فإن فوق ذلك العرش و بينه وبين السماء بُعْدُ ما بين السماء ين۔ ثم قال: هل تدرون ما الذي تحتكم؟ قالوا: اللّٰه و رسوله أعلم؛ قال: فإنها الأرض۔ ثم قال:۔ هل تدرون ما تحت ذلك؟ قالوا: اللّٰه ورسوله أعلم؛ قال: فإن تحتها الأرض الأخرى بينهما مسيرة خمسمائة سنة حتى عدّ سبع أرضين، بين كل أرضين مسيرة خمسمائة سنة؛ ثم قال: والذي نفس محمد بيده لو أنكم دُليتم بحبل إلى الأرض السُّفلى لهبط على اللّٰه۔ ثم قرأ:﴿**هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ**﴾[الحديد۵۷:۳]

کیاتم جانتے ہو یہ کیا ہے ؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:یہ بادل ہے جو زمین کو سیراب کردیتا ہے ، اسے اللہ تعالیٰ چلا کر ایسی قوم کی طرف لے جاتے ہیں جونہ اس کے شکرگزار ہیں اور نہ اس سے دعائیں کرتے ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیاتم جانتے ہوتمہارے اوپر کیاہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ آسمان دنیا ہے جو ایک محفوظ چھت اور پانی کاایک رُکاہوا ریلاہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیاتم جانتے ہو اس کے اور تمہارے درمیان

[۳۷۴] جامع ترمذی :کتاب تفسیر القرآن ، باب تفسیر سورة الحديد۵:۴۰۳،۴۰۴ ۔ترمذی میں اس کے الفاظ"لو انكم دُليتم بحبل إلى الأرض السُّفلى لهبط......" کی بجائے"لو أنكم دَلَيتُم رَجُلاً بحبل إلى الأرض السُّفلى" ہیں ، مسند امام احمدؒ:مسند أبي هريرة رضي الله عنه ۳:۶۱، درمنثور ۶: ۱۷۰ بحوالہ عبد بن حمیدوابن منذر ۔امام ترمذی نے اس حدیث کواس سند کے ساتھ غریب کہا ہے۔ وہ مزید فرماتے ہیں کہ ایوب ، یونس بن عبید اور علی بن زید سے منقول ہے کہ حسن رحمہ اللہ کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے۔ حالاں کہ یہاں تو یہ عنعنہ سے منقول ہے ،اس طرح یہ روایت مدلس معلوم ہوتی ہے ۔ واللہ اعلم۔

کتنا فاصلہ ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارے اور اس کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے اوپر دو آسمان ہیں جن میں سے ہر دو آسمانوں کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت ہے، پھر آپ نے اسی طرح فرمایا یہاں تک کہ گنتے گنتے پورے سات آسمان گنوا دیئے جن میں سے ہر دو آسمانوں کے درمیان اس قدر فاصلہ بتایا جس قدر زمین اور آسمان کے درمیان ہے، پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو ان کے اوپر کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان سے اوپر عرش ہے جس سے لے کر آسمان تک اس قدر فاصلہ جس قدر دو آسمانوں کا درمیانی فاصلہ۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو تمہارے نیچے کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ زمین ہے۔ پھر فرمایا: کیا تم جانتے ہو اس سے نیچے کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی بہتر جانتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کے نیچے ایک اور زمین ہے اور ان دونوں زمینوں کے درمیان پانچ سو برس کی مسافت ہے، ایسی ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات زمینیں گنوا دیں جن میں سے ہر دو کے درمیان فاصلہ پانچ سو برس کی مسافت بتایا اور اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اگر تم لوگوں کو رسی کے ساتھ باندھ کر سب سے نچلی زمین تک لٹکا دیا جائے تو تم اللہ تعالی کے ساتھ جا کر اترو گے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت کریمہ تلاوت فرمائی: ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ صلے وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [الحدید۵۷: ۳] یعنی وہ ہے سب سے پہلے اور سب سے پیچھے اور وہی ظاہر و مخفی بھی اور وہی ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے۔

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ آیت تلاوت فرمانے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں "لهبط على الله" (وہ اللہ تعالیٰ پر جا کر اترے گا) کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ اس کا اترنا اللہ تعالی کے علم میں ہوگا، اس کی قدرت اور اس کے دائرہ اختیار کے اندر ہوگا۔ اللہ تعالی کا

علم ، اس کی قدرت اور اس کادائرہ اختیار تو اپنی شان کے مطابق اپنے عرش عظیم پر ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ محیط ہے جیسا کہ اس ذات عالی نے خود کلام مجید میں بیان فرمایا ہے۔امام ترمذی فرماتے ہیں : یہ حدیث غریب ہے اور حسن، رحمہ اللہ کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے[1]۔ اس بارے میں بہت سی روایات ہیں کہ زمینوں کی تعداد سات ہے مگر ہم یہاں صرف مذکورہ روایات کونقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ابوالضحیٰ جن کا نام مسلم ہے [2]، وہ بھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ارشاد باری تعالیٰ: ﴿اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ﴾[الطلاق ۶۵: ۱۲] (اللہ کی ذات وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور انہی کے مثل زمینیں بھی بنائیں) کی تفسیر میں ارشاد فرمایا:

[۳۷۵] سَبع أرضين في كل أرض نبي كنبيكم ، وآدم كآدم ، ونوح كنوح ، وإبراهيم كإبراهيم ، وعيسى كعيسى۔ قال البيهقي : إسناد هذا عن ابن عباس صحيح ، وهو شاذ بمرة لاأعلم لأبي الضحى عليه دليلا۔ والله أعلم۔

---

[۳۷۵] مستدرک حاکم: كتاب التفسير ،تفسير سورة الطلاق ۲: ۵۳۵۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول کو علامہ سیوطیؒ نے الدر المنثور میں ، آلوسی نے روح المعانی میں سورۂ طلاق، آیت نمبر۱۲ کے تحت ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ ، حاکمؒ اور بیہقیؒ کی اسماء وصفات اور شعب الإیمان کے حوالہ سے ، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بیہقی کے حوالہ سے ابوالفرج ابن الجوزیؒ نے زاد المسیر میں بلا حوالہ نقل کیا ہے ،امام طبری کی تفسیر میں صرف ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے،حافظ ابن کثیرؒ نے بھی مفصل روایت ذکر کرنے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر والی مختصر روایت نقل کی ہے ۔تفسیر طبری میں مجاہد بن جبر رحمہ اللہ سے حضرت ابن عباس کا یہ قول بھی منقول ہے کہ ''لوحدثتكم بتفسيرها لكفرتم ، وكفركم تكذيبكم بها'' (اگر میں تمہیں اس آیت کی تفسیر بتادوں تو تم انکار کردو گے ، اور تمہارے انکار کی صورت یہ ہوگی کہ تم اس تفسیر کو جھٹلا دو گے)۔اسی میں قمی کا یہ قول بھی منقول ہے کہ جس طرح ہر زمین میں ایک ابراہیم ہیں اسی طرح ہر آسمان میں بھی ہیں۔ان تمام مفسرین نے یہ روایت ذکر کرنے کے بعد امام بیہقی کا یہ قول نقل کیا ہے'' إسناد هذا عن ابن عباس صحيح وهو شاذ بمرة لاأعلم لأبي الضحى عليه متابعا . والله أعلم'' (اس کی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تک سند صحیح تو ہے مگر شاذ ہے اور مجھے اس روایت میں ابو الضحیٰ کا متابع کوئی نہیں ملا۔ واللہ أعلم) بعض روایات میں ''شاذ بمرة'' کے الفاظ ہیں اور بعض میں صرف ''شاذ'' کے ۔ علامہ قرطبیؒ والے الفاظ ''لاأعلم لأبي الضحى عليه دليلا'' (مجھے ابوالضحیٰ کی اس روایت کی دلیل کہیں نہیں مل سکی) مجھے کہیں نہیں مل سکے۔ علامہ ابن الجوزیؒ نے لکھا ہے کہ کہیں تو یہ روایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تک مرفوع ملتی ہے اور کہیں ابوالضحیٰ تک موقوف مگر اکثر مفسرین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تک اس کی سند کو صحیح کہا ہے سوائے علامہ ابن حیان الأندلسیؒ کے جنہوں نے البحر المحيط :۸: ۲۸۷ میں اس روایت کو اپنے تبصرہ کے ساتھ یوں لکھا ہے : ''وعن ابن عباس من رواية الواقدي الكذاب ، قال : ''في كل أرض آدم كآدم......وهذا حديث لا شک في وضعه'' (اورواقدی کذاب نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ہر زمین میں آدم کی طرح ایک آدم ہے ...... اور اس حدیث کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں) ۔علامہ آلوسیؒ نے ان کے قول کو ذکر کرکے اس کا دفاع یوں کیا ہے: ''واقول لامانع عقلاً ولاشرعاً من صحته'' ....

بقیہ آئندہ صفحہ پر

کل سات زمینیں ہیں جن میں سے ہر زمین میں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح ایک نبی ، آدم علیہ السلام کی طرح ایک آدم، نوح علیہ السلام کی طرح ایک نوح ، ابراہیم علیہ

بقیہ حاشیہ از صفحہ گزشتہ ....

(میں تو کہتا ہوں کہ اس روایت کی صحت میں نہ عقلاً کوئی رکاوٹ ہے، نہ اس میں شرعاً کوئی قباحت ہے) ۔ائمہ حدیث میں سے امام حاکم نے مستدرک ،طبع مکتبۃ المعارف . الریاض ، کتاب التفسیر ، تفسیر سورہ طلاق ج ۲، ص ۴۹۳ میں ان دونوں روایات کو نقل کر کے لکھا ہے : " هذا حديث صحيح على شرط الشيخين ولم يخرجاه" (یہ حدیث حضرات شیخین امام بخاری وامام مسلم کی شروط کے مطابق صحیح ہے مگر انہوں نے اسے نقل نہیں کیا)،علامہ شوکانی نے بھی نیل الأوطار ۱: ۴۸۷ میں اسے امام بیہقی سے نقل کر کے اس کی سند کو صحیح مگر عدیم المتابعت لکھا ہے ۔باقی اس کے معنی ومفہوم کی متعدد علماءِ تفسیر و حدیث نے تاویل کی ہے: ابن الجوزیؒ کہتے ہیں :"اس کا معنی وہی ہے جو ابو سلیمان نے نقل کیا ہے کہ: ہر زمین میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق بستی ہے جن کے اپنے اپنے رہنما بھی ہیں ۔ان میں سے سب سے پہلے آنے والا بڑا رہنما ہمارے حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ہے اور اس کی اولاد عمر اور زمانے کے لحاظ سے نوح علیہ السلام کی طرح ہے اور اسی پر ان سب کو قیاس کیا جاسکتا ہے ۔علامہ آلوسیؒ اس کو عقلاً اور شرعاً درست لکھنے کے بعد کہتے ہیں :"اس سے مراد یہ ہے کہ ہر ہر زمین میں علیحدہ علیحدہ مخلوق ہے ، ہر زمین کے لوگوں کی بنیاد اپنے اصل پر ہے جو ان کے لئے اسی طرح ہے جس طرح ہمارے لئے حضرت آدم علیہ السلام ۔ ان کے اندر اور بھی صاحب امتیاز شخصیات ہیں جو ہمارے اندر حضرت نوح علیہ السلام ،حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی طرح ہیں" ۔ اس کے بعد یہ فرق دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ایک طرف امام بیہقیؒ اس روایت کو صحیح قرار دے رہے ہیں ، علماءِ رجال اس کے راوی کی ثقاہت پر متفق ہیں اور کسی کو ان پر کلام نہیں،امام حاکم بھی اسے شروط شیخین کے مطابق قرار دے رہے ہیں۔ دوسری طرف تمام مفسرین جنہوں نے اس روایت کو ذکر کیا ہے امام بیہقی کے اس تبصرہ کو بھی نقل کر رہے ہیں کہ اس کی سند صحیح مگر شاذ ہے اور راوی ابوالضحی کی متابعت مجھے کہیں نہیں ملی۔ امام حاکم اپنی کتاب معرفة علوم الحديث ، النوع الثامن والعشرين ، معرفة الشاذ من الروايات میں فرماتے ہیں : حدیث شاذ وہ ہوتی ہے جسے کوئی ثقہ راوی اکیلا ذکر کرے اور اسے کسی دوسرے راوی کی روایت سے تائید حاصل نہ ہو ۔ اس کے مقابلے میں حدیث معلل ہوتی ہے جس میں روایت کو دیگر راویوں سے تائید ملتی ہے ، اسی تائید کا نام متابعت ہے ۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے شاذ کی جو تعریف کی ہے وہ اس سے قدرے مختلف ہے ، آپ فرماتے ہیں :شاذ روایت وہ نہیں کہ کوئی ثقہ راوی ایسی بات نقل کرے جسے کسی اور نے نقل نہ کیا ہو بلکہ شاذ وہ ہے جس میں ثقہ راوی کوئی ایسی بات نقل کرے جو دوسرے لوگوں کی روایت کے خلاف ہو۔

۱۔ " لهبط على الله" (وہ اللہ تعالیٰ پر جا کر اترے گا) کی یہ تاویل اور حسن بصری رحمہ اللہ کا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہ ہونا امام ترمذی کا اپنا نہیں بلکہ ایوب، یونس بن عبید اور علی بن زید کا قول ہے جو امام ترمذی نے انہی سے نقل کیا ہے ، مؤلف رحمہ اللہ نے اسے امام ترمذی رحمہ اللہ کی طرف منسوب ذکر فرمادیا ہے۔

۲۔ ابوالضحیٰ مسلم بن صُبَیح الھمدانی الکوفی العطار (م ۱۰۰ھ) ثقہ اور عالم تھے ۔ائمہ ستہ نے ان سے روایات نقل کی ہیں۔ ان کی وفات حضرت عمر بن عبد العزیز یا عبد الملک بن مروان کے دور میں ہوئی۔ انہیں یحیی بن معین اور ابوزرعہ اور ابن حبان نے ثقہ کہا ہے ۔ تهذيب الكمال : تعارف نمبر ۷۳۰۸، ۹۴۱۶،الجرح والتعدیل: تعارف نمبر ۶۳۳

السلام کی طرح ایک ابراہیم اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرح ایک عیسیٰ ہیں ۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں : اس روایت کی سند حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ تک صحیح ہے مگر وہ قطعی طور پر شاذ ہے، مجھے ابوالضحیٰ کی اس روایت کی اور دلیل کہیں نہیں مل سکی ۔ واللہ اعلم۔

نویں بحث: نحوی تراکیب اور قراءات

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ﴾ (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی تمام چیزوں کو پیدا کیا) مبتداء اور خبر ہیں ، ﴿مَا﴾ محل نصب میں ہے ، ﴿جَمِیْعًا﴾ سیبویہ کے نزدیک حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے ، ﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤى﴾ کی آواز کو اہل نجد مائل کر کے پڑھتے ہیں تاکہ اس کی اصل ''یاء'' پر دلالت کرے جبکہ اہل حجاز اس کو پُر آواز میں پڑھتے ہیں، ﴿سَبْعَ﴾ ہاء اور نون کا بدل ہونے کی وجہ سے منصوب ہے جس سے تقدیر عبارت یوں بنتی ہے: ''فَسَوّٰی سَبْعَ سَمَاوَات'' (یعنی اس نے سات آسمان بنادیئے)، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ مفعول ہونے کی بنا پر منصوب ہو جس سے تقدیر عبارت یوں ہوگی: ''یُسَوِّي بینهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَات'' (وہ ان کے درمیان سات آسمان بنادیئے) جیساکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِیْنَ رَجُلًا﴾ [الأعراف۷: ۱۵۵] (اور موسیٰ علیہ السلام نے ستر آدمی اپنی قوم میں سے ہمارے وقتِ معیّن کے لئے منتخب کیے) یہاں ''قَوْمَهٗ'' سے مراد ''مِن قومِه'' ہے۔ یہ نحاس کا قول ہے ، اخفش کہتے ہیں: یہ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے ۔ ﴿وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ (اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے) مبتدا اور خبر ہیں۔ ''هُوَ'' میں اصل تو واو متحرک ہی ہے اور جہاں سے ساکن پڑھا گیا ہے وہاں تخفیف کو پیش نظر رکھا گیا ہے ۔ ''سَمَاء'' (آسمان، وزن ''عَنَان'' عام طور پر واحد مؤنث ہی استعمال ہوتا ہے اس کا بطور مذکر استعمال شاذ ہے ۔ اخفش کہتے ہیں : ''سَمَاء'' ''سَمَاوة'' کی جمع ہے اور زجاج کے خیال میں ''سَمَاء ة'' کی جمع ہے اور اس کی جمع الجمع ''سَمَاوات'' اور ''سَمَاء ات'' آتی ہے ۔ اس لحاظ سے ﴿سَوّٰىهُنَّ﴾ مؤنث کی ضمیر یا تو اس لئے ہے کہ لفظ ''سَمَاء'' (غیر ذوی العقول) ہے یا پھر اس لئے کہ یہ اسم جنس مفرد ہے ۔ اور اس طرح ﴿سَوّٰىهُنَّ﴾ کا معنی یہ ہے کہ ان کی سطحوں کو ہموار کر کے برابر کردیا اور یہ قول بھی ہے کہ انہیں ایک جیسا بنادیا۔

دسویں بحث: علمِ باری تعالیٰ

ارشادِ باری تعالیٰ: ﴿وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ (اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے) یعنی اس نے جو کچھ پیدا کیا وہ اسے جانتا بھی ہے ، اور چونکہ وہ ہر چیز کا خالق ہے اس لئے ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے جیسا کہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ﴾ [الملک۶۷:۱۴] (کیا وہی آگاہ نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟) چناں چہ وہ عالم بھی ہے علیم بھی ہے (جاننے والا ہے اور خوب جاننے والا ہے) اور اس کا علم قدیم ہے، ازلی ہے، اکیلا ہے اور قائم بذاتہ ہے۔معتزلہ ہمارے اس عقیدے میں باری تعالیٰ کی عالمیت پر تو متفق ہیں علیمت پر متفق نہیں۔ فرقہ جہمیہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ''وہ عالم بلاعلم'' ہے اور ''قائم بلامحل'' ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بہت بلند وبرتر ہے جو کچھ منحرفین گمراہ لوگ کہتے ہیں۔ان فرقوں کی تردید مذاہب کے موضوع پر کتابوں میں موجود ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تو اپنی صفت علم یوں بیان فرمائی ہے: ﴿أَنْزَلَهُ بِعِلْمِهِ وَالْمَلَٰٓئِكَةُ يَشْهَدُونَ﴾ [النساء۴: ۱۶۶] (اس نے اسے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور فرشتے بھی گواہی دیتے ہیں)، نیز یہ فرمایا:﴿فَاعْلَمُوٓا أَنَّمَآ أُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ﴾ [ھود۱۱: ۱۴] (پس تم یقین سے جان لو کہ یہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے)، ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ﴾[الأعراف۷:۷] (پھر ہم اپنے علم سے ان کے روبرو سب بیان کردیں گے)، یہ بھی فرمایا: ﴿وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنْثٰى وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ﴾[فاطر ۳۵: ۱۱] (عورتوں کا حاملہ ہونا اور بچوں کا پیدا ہونا سب اس کے علم ہی سے ہے) اور﴿وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ إِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام۶: ۵۹] (اور اس ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا)۔ ہم اِن شاء اللہ اسی سورت میں آگے چل کر ارشاد باری تعالیٰ﴿يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرۃ۲:۱۸۵] (اللہ تعالیٰ کا ارادہ تمہارے ساتھ آسانی کا ہے سختی کا نہیں) کے تحت باری تعالیٰ کی صفت علم اور دیگر صفات کے مزید دلائل بیان کریں گے۔

قراءات

کسائی اور قالون نے ''هُوَ'' اور ''هِيَ'' کو امام نافع سے اس صورت میں ''ہاء'' کے سکون کے ساتھ نقل کیا ہے جب ان سے پہلے ''فاء''، ''واو''، ''لام'' یا ''ثم'' میں سے کوئی ہو۔ یہی رائے ابوعمرو کی بھی ہے، البتہ وہ ''ثم'' کو اس میں شامل نہیں کرتے۔ ابوعون نے حلوانی سے اور انہوں نے قالونؒ سے ارشاد باری تعالیٰ :﴿أَنْ يُمِلَّ هُوَ﴾ [البقرۃ۲: ۲۸۲] میں بھی ''ہاء'' کا سکون نقل کیا ہے۔ باقی سب کے نزدیک یہ متحرک ہی پڑھی جاتی ہے۔

اشاریہ

شخصیات

ابن

ب

ت

ث

ش

ص

ن

اقوام و قبائل

ادیان، فِرَق، مکاتبِ فکر

مقامات

کتب

سورتوں کے حوالہ جات

فہرستِ فقہی مسائل

قرطبه

بأربع فاقت الأمصار قرطبة
هاتان ثنتان والزهراء ثالثة

منهن قنطرة الوادي وجامعها
والعلم أعظم شيئ وهو رابعها

چار چیزوں میں قرطبہ دوسرے شہروں سے بازی لے گیا۔ان میں سے ایک اس کے دریا کا پل ہے ،ایک اس کی جامع مسجد ہے ۔یہ دو ہوئے اور تیسرا قصرِ زہراء ہے ۔ ان سب سے اعلیٰ وہاں کا علم ہے جوشمار میں چوتھا ہے ۔

کتب خانہ

قرطبہ کے تمام خلفاء علم کے بہت قدر دان تھے مگر خلیفہ الحکم ثانی مستنصر باللہ کا کتب خانہ بھی عجائب روزگار میں سے تھا۔ وہ خود بھی علامہ اور اہل علم کا بہت بڑا قدردان تھا ۔ اس نے شاہی لائبریری کو اس قدر ترقی دی کہ اس میں چار لاکھ کتب جمع ہوگئیں۔ ہرنئی کتاب کے حصول کے لیے کثیر تعداد میں اہلِ کار مختلف ممالک کے سفر پر مامور تھے۔ نئی کتاب کا سب سے پہلے مطالعہ کرنا خلیفہ کی ترجیحات میں شامل تھا۔ کتب خانہ میں انتظام ، تحقیق وتالیف ، ترجمہ وتدوین اور جلد وتزئین کے الگ الگ شعبے قائم تھے۔ کتب بردار اور صفائی وترتیب والے ملازمین اس کے علاوہ تھے۔ شعبۂ ترجمہ میں یونانی اور لاطینی وغیرہ مختلف زبانوں میں تصنیف شدہ مختلف علوم وفنون خصوصاً طب، ہندسہ ، فلک اور دیگر سائنسی علوم کی کتب کا عربی میں ترجمہ کیاجاتاتھا۔ عبداللہ الصقلی ، محمدالنباتی، محمد بن سعید، عبدالرحمٰن بن اسحاق بن الہیثم وغیرہ نے اس شعبہ میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔

امام قرطبیؒ اور ان کی تفسیر

امام قرطبیؒ کی یہ کاوش حددرجہ لطیف ہے۔ مؤرخ فخرالدین الکتبی

قرطبیؒ اپنی تفسیر میں آزادوتحقیق ، بے لاگ تنقیداورغیر جانبدارانہ استدلال کے اصولوں پر کاربند نظر آتے ہیں۔ انہوں نے تفسیر کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا اور جس موضوع پر بحث شروع کی اسے نہایت مہارت سے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ڈاکٹر محمد حسین ذہبی